اردو کا کلاسیکی ادب

محاسن الاخلاق

از

شمس العلماء مولانا محمد ذکاء اللہ

مرتبہ

احمد رضا

مجلسِ ترقّیِ ادب ۰ لاہور

محاسن الاخلاق

طبع اول : جون ۱۹۷۵ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
ناظم مجلسِ ترقیٔ ادب ، لاہور

مطبع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ ریلوے روڈ ، لاہور

طابع : محمد زرین خاں

سرورق وغیرہ : مطبعِ عالیہ ، ۱۲۰ ٹمپل روڈ ، لاہور

قیمت : ۳۵ روپے

بعونِ صناعِ مکین و مکان و بفضلِ خلاقِ زمین و زمان

۱۳۳

اردو کا کلاسیکی ادب

محاسن الاخلاق

از:-

مولانا ذکاء اللہ

ناشر

مجلسِ ترقیِ ادب ۲- نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

فہرست

محاسن الاخلاق، حصہ دوم

✡ ✡ ✡

مقدمہ

شمس العلما خان بہادر مولوی محمد ذکاء اللہ، اپریل ۱۸۳۲ء میں دہلی کے کوچۂ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے جا ملتا ہے اور اسی نسبت سے ان کا خاندان شیخ صدیقی کہلاتا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کے ابتدائی دور میں ان کے مورثِ اعلیٰ غزنیں سے ہجرت کر کے واردِ لاہور ہوئے اور کچھ عرصے کے بعد دہلی منتقل ہو گئے جہاں انھیں شاہی گھرانے کے اتابک کا عہدہ تفویض ہوا۔

مولوی ذکاء اللہ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا اہتمام اسی انداز سے ہوا جو ایک صدی قبل کے خالص مسلمان گھرانوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ مولوی صاحب کے والد مولوی ثناء اللہ اور دادا مولوی محمد بقاء اللہ حافظِ قرآن تھے اور یہ خانوادہ چونکہ عرصۂ دراز سے امیر تیمور گورگانی کے شاہی خاندان کا اتالیق چلا آ رہا تھا، لہٰذا مولوی ذکاء اللہ کے لیے بھی اسی قسم کی تعلیم و تربیت درکار تھی جو انھیں آیندہ چل کر اس عہدے کا اہل ثابت کر سکتی۔ ان کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ چھ برس کی عمر میں شیخ سعدی کی مشہورِ عالم کتاب ''گلستان'' پڑھنی شروع کر دی تھی۔ بارہ سال کی عمر تک گھریلو تعلیم کا یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر ۱۸۴۴ء میں دہلی کالج میں داخل ہو گئے جہاں انھیں چھ سال تک تعلیمی وظیفہ ملتا رہا۔ اسی کالج میں مولوی محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد بھی زیرِ تعلیم تھے جو مولوی ذکاء اللہ کے

اچھے دوست ثابت ہوئے ۔ تمام علوم میں انھیں ریاضی ، سائنس اور علم ادب سے زیادہ شغف تھا ۔ فارسی ادب میں مولوی امام بخش صہبائی اور ریاضی میں ماسٹر رام چندر ان کے استاد تھے اور اپنے اِس لائق شاگرد پر خاص توجہ دیتے تھے ۔ چنانچہ ان شفیق اساتذہ کی توجہ اور اپنی محنت کی بدولت سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی انھوں نے دہلی کالج کی تعلیم مکمل کر لی ۔

تعلیم سے فارغ ہو کر اِسی کالج (دہلی کالج) میں معلّمِ ریاضی تعینات ہوگئے ۔ پھر آگرہ کالج میں سات برس تک معلّمِ فارسی و اُردو رہے ۔ ۱۸۵۵ع میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بنائے گئے اور گیارہ سال یہ فرائض انجام دے کر ۱۸۶۶ع میں نارمل سکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے ۔ تین سال کے بعد اورینٹل کالج میں لیکچرر کے طور پر تقرری کے لیے پروانہ آیا مگر اس کے ساتھ ہی میور سنٹرل کالج الہ آباد کی پروفیسری بھی آپ کو پیش کی گئی ۔ چنانچہ آپ نے الہ آباد کو ترجیح دی اور پندرہ سال اس کالج میں پروفیسر فارسی رہ کر ۱۸۸۵ع میں پنشن حاصل کی ۔ ریٹائرمنٹ سے کچھ عرصہ پہلے انھیں ''خان بہادر'' اور ''شمس العلما'' کے خطاب دیے گئے ۔ مولوی ذکاء اللہ کی محنت اور فرائضِ منصبی کے ساتھ لگن کا یہ عالم تھا کہ چھتیس برس کی پوری مدتِ ملازمت میں وہ صرف سولہ دن رخصت پر رہے ۔

ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد مولوی ذکاء اللہ ایک سال تک سرسیدؒ کے ہاں علی گڑھ میں مقیم رہے اور مجوزہ کالج کے معاملات میں ان کی مدد کرتے رہے ۔ بعض تذکرہ نگار یہاں تک لکھتے ہیں کہ سرسید کو انگریزی کتابوں کے ترجمے شائع کرنے کا مشورہ بھی مولوی ذکاء اللہ نے دیا تھا ، جس کے نتیجے میں سائنٹفک سوسائٹی کا

قیام عمل میں آیا ۔ مولوی ذکاء اللہ کے بیٹے مولوی عنایت اللہ کو سرسید نے عرصۂ دراز تک اپنے پاس رکھا اور اپنے بیٹوں کی طرح ان کی تربیت کی ۔ سرسید کے ساتھ مولوی ذکاء اللہ کے عقیدت مندانہ اور دوستانہ روابط ان کی آخری عمر تک برقرار رہے ۔ جب تک سرسید زندہ رہے ، مولوی ذکاء اللہ کسی نہ کسی حیثیت سے ان کے عظیم مشن سے وابستہ رہے اور سرسید نے بھی ان کی عقیدت کا جواب محبت سے دیا ۔

مولوی ذکاء اللہ کی تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے ۔ انہوں نے متعدّد موضوعات پر قلم اٹھایا اور ہزاروں صفحات لکھے لیکن ان کے سوانح نگاروں کی متّفقہ رائے ہے کہ مولوی صاحب کے تصنیفی کام میں افکارِ عالیہ کی چمک اور روشنی کم ہے ۔ ان کے دوسرے ہم عصر مصنّفین نے علم و ادب کی دنیا میں جو شہرت اور ناموری حاصل کی وہ مولوی ذکاء اللہ کے حصے میں نہ آ سکی ۔ انہیں خود بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ وہ ہر لحاظ سے ایک اوسط درجے کے مصنّف ہیں ۔ انہوں نے ریاضیات ، تاریخ و جغرافیہ ، ادب ، اخلاقیات ، طبیعیات ، سیاستِ مُدن ، ہیئت وغیرہ متنوّع موضوعات پر قلم اٹھایا ۔ موضوعات کے اسی تنوع کے پیشِ نظر مولانا حالی کہا کرتے تھے کہ ذکاء اللہ کی مثال بنیے کی دکان کی ہے ۔ جس نے جو چیز مانگی ، مل گئی ۔

مولوی ذکاءاللہ نے سب سے پہلے ہندوستانی کھیلوں ، یعنی تاش ، شطرنج وغیرہ پر ایک کتاب لکھی ۔ دوسری تصنیف حساب کی ایک چھوٹی سی کتاب تھی جو چھپ کر تین دن کے اندر دہلی میں بِک گئی ؛ اُس وقت ان کی عمر اُنیس سال سے کم تھی ۔ مجموعی طور پر انہوں نے ستّر ہزار صفحات کے قریب لکھے جو ڈیڑھ سو جلدوں میں چھپے ۔

دس ہزار صفحات مضامین و مقالات کی شکل میں الگ شائع ہوئے جو کئی ضخیم جلدوں کے برابر ہیں ۔ انھوں نے ''حسن'' حیدر آباد ، ''تہذیب الاخلاق'' ''سائنٹفک گزٹ'' علی گڑھ ، ''ادیب'' خیر آباد ، ''معارف'' علی گڑھ ، ''مخزن'' لاہور اور ''زمانہ'' کانپور کے علاوہ متعدد رسائل میں مضامین لکھے ۔ اردو کے مصنّفین میں یہ واحد شخص ہیں جن کی زبان نے ان کی تالیفات و تراجم کے کم و بیش ستّر ہزار صفحات میں ایک لفظ کے لحاظ سے بھی لغزش نہیں کی اور بیس برس کی عمر سے پچھتّر سال کی عمر تک یہ علمی شغل جاری رہا ۔ جس دیوار کے ساتھ سر کی ٹیک لگا کر لکھا کرتے تھے وہاں ایک گڑھا پڑ گیا تھا ۔ انھوں نے ریاضیات کے موضوع پر ستاسی ، تاریخ و جغرافیہ پر اٹھارہ ، علمِ ادب پر سولہ ، علمِ اخلاق پر چھ ، طبیعیات و ہیئت پر نو اور سیاستِ مُدن پر سات کتابیں لکھیں ۔ ابھی کئی ہزار صفحات پر مشتمل مسودات صندوقوں میں غیر مطبوعہ رکھے تھے کہ نومبر ۱۹۱۰ع میں ان کا انتقال ہوگیا ۔

مولوی ذکاء اللہ کے تمام تصنیفی کام میں ان کی کتاب ''تاریخِ اسلام'' کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ اردو زبان میں اسلامی تاریخ کی یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو دس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے ۔ اس میں ابتدائے اسلام سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے حالات و کوائف نہایت شرح و بسط کے ساتھ ، تمام فارسی اور انگریزی تاریخوں سے لے کر تحریر کیے گئے ہیں ۔ ان میں سے بعض جلدیں ہزار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں ۔

راقم نے مولوی ذکاء اللہ کی ایک اور کتاب ''مکارم الاخلاق'' ۱۹۶۷ع میں مرتّب کی تھی جو مجلسِ ترقیِ ادب ہی نے شائع کی ہے ۔ اس کتاب کا سوانحی مقدمہ چالیس صفحات پر مشتمل ہے جس

میں مولوی ذکاء اللہ کے سوانحِ حیات تفصیل کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں اور ان کی کم و بیش ایک سو تصنیفات کے ناموں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ زیر نظر مقدمے کے ماٰخذ اور مزید تفصیل کے لیے مذکورہ کتاب کے مقدمے سے رجوع کرنا چاہیے۔

محاسن الاخلاق :

مولوی ذکاء اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انھوں نے اخلاقیات کے موضوع پر سب سے پہلے تین کتابیں سپرد قلم کی تھیں۔ ان میں سے پہلی ''تہذیب الاخلاق'' ہے جو ہندومت کی علمِ اخلاق کی کتابوں کا نچوڑ ہے۔ دوسری ''مکارم الاخلاق'' ہے (یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں مجلسِ ترقیِ ادب نے شائع کر دی ہے) جو اخلاقیات پر اعلیٰ درجے کی اسلامی کتب سے ماخوذ ہے۔ تیسری کتاب کا نام ''محاسن الاخلاق'' ہے جو سب سے زیادہ ضخیم ہے اور اس کے دو حصے ہیں۔ اس کا مأخذ علمِ اخلاق کی انگریزی زبان کی کتابیں ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ نے ان تینوں کتابوں کے مجموعے کو ایک کتاب ظاہر کیا ہے۔ بعد ازاں اخلاق ہی کے موضوع پر انھوں نے تین اور رسالے تعلیم الاخلاق، تعلیم الخصال اور تعلیم الانتظام بھی سپردِ قلم کیے۔

مولوی ذکاء اللہ نے اخلاقیات پر یہ کتابیں حکومت کے ایک اعلان سے متاثر ہو کر لکھی تھیں جس میں اخلاقیات پر بہترین کتاب کو نصاب میں شامل کرنے کے علاوہ مصنّف کو معقول معاوضہ دینے کا وعدہ بھی کیا گیا تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب اپنی ایک کتاب کے دیباچے میں رقم طراز ہیں :

''جب سے گورنمنٹ کا ریزولیوشن یہ پاس ہوا ہے کہ

مدارسِ سرکاری میں ایسے علمِ اخلاق کی کتابوں کا درس
جاری ہو جو کسی خاص مذہب و ملت سے مخصوص نہ
ہوں ، بلکہ عموماً کل مذاہب کے طلبہ ان کو بخوشی پڑھ
سکیں تو میں نے اس قسم کی تین کتابیں تہذیب الاخلاق
و مکارم الاخلاق و محاسن الاخلاق ہندوؤں اور مسلمانوں
اور انگریزوں کی اعلیٰ درجے کی کتبِ اخلاق سے مضامین
انتخاب کر کے تحریر کیں جن کے مضامین گیارہ سو نو ہیں
اور ان کے صفحے ۱۲۲۸ ہیں ، ان کو چھاپ دیا ۔ بعد ازاں
تین رسالے تعلیم الاخلاق ، تعلیم الخصال ، تعلیم الانتظام
لکھے ۔" (تعلیم الاخلاق)

اگرچہ یہ کتابیں انھوں نے درسی ضروریات کے پیش نظر قلم بند
کی تھیں مگر وہ اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے ۔ وہ چاہتے
تھے کہ چاہے یہ کتابیں نصاب میں شامل نہ ہوں مگر پھر بھی طلبہ
انھیں اپنے طور پر پڑھیں اور مستفید ہوں ۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

"مجھے ان کتابوں کی تصنیف میں یہ خیال نہیں آیا کہ
مدارسِ سرکاری کے اندر درس و تدریس میں وہ داخل
ہو جائیں گی ۔ مجھے یقین ہے کہ ان کتابوں کو بہت سے
طلبہ ، خواہ کسی مدرسے یا مکتب کے اور کسی مذہب
کے ہوں ، ضرور مطالعہ کریں گے ۔"

جیسا کہ "مکارم الاخلاق" کے مقدمے میں صراحت کی جا چکی
ہے ، مولوی ذکاء اللہ کی بیشتر تصانیف کے ناشر ان کے بیٹے تھے
جن کا نام منشی عطاء اللہ تھا ۔ چنانچہ "محاسن الاخلاق" کے سرورق
پر بھی مہتمم کی حیثیت سے انھی کا نام موجود ہے ۔ یہ کتاب بھی ان
کی دوسری بیشتر تالیفات کی طرح مطبع چشمۂ فیض میں چھپی ہے اور

سالِ اشاعت ۱۸۹۱ء درج ہے۔ چونکہ اس کتاب کا دوسرا کوئی ایڈیشن دستیاب نہیں ہوا لہٰذا یہی فرض کرنا پڑتا ہے کہ یہ ایک ہی مرتبہ شائع ہوئی ہوگی۔ کتاب کے دو حصے ہیں اور دونوں یکجا مجلّد ہیں۔ اس کتاب کا ایک نسخہ یونیورسٹی لائبریری میں بھی موجود ہے مگر وہ بھی ۱۸۹۱ء والا ایڈیشن ہے۔

کتاب کے سرورق پر ایک عبارت درج ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ "اِس کتاب میں سات سو پچیس مضامینِ اخلاق، انگریزی کی اعلیٰ درجے کی اخلاق کی کتابوں سے انتخاب کر کے لکھے ہیں۔" لیکن کتاب کے متن سے ان اعداد و شمار کی تائید نہیں ہوتی۔ ۱۸۹۱ء والے ایڈیشن میں تمام مضامین کے ساتھ مسلسل نمبر موجود ہیں (یہ نمبر چونکہ کہیں کہیں مکرّر درج ہو گئے تھے لہٰذا زیرِ نظر اشاعت میں انہیں درست کر دیا گیا ہے)۔ چنانچہ اگر ہر نمبر کو ایک مضمون فرض کیا جائے تو دونوں حصوں کے کل مضامین کی تعداد صرف ۲۷۷ بنتی ہے۔ البتہ اگر نمبر ۹۵ کے بعد کے ضمنی عنوانات کو بھی الگ مضمون شمار کر لیا جائے تو یہ تعداد خاصی بڑھ جاتی ہے۔

"محاسن الاخلاق" کے ۱۸۹۱ء والے ایڈیشن میں دونوں حصوں کے اختتام پر اغلاط نامے بھی شامل تھے۔ زیرِ نظر ایڈیشن میں چونکہ ان کی تصحیح کر دی گئی ہے لہٰذا انہیں شامل نہیں کیا گیا۔ مگر کتاب کے متن کی تصحیح و ترتیب کے دوران معلوم ہوا کہ اغلاط ناموں میں جن غلطیوں کی نشان دہی کی گئی ہے وہ اُن غلطیوں کے مقابلے میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں جو اب بھی کتاب میں موجود ہیں۔ چنانچہ ان اغلاط کی تصحیح بھی پوری احتیاط سے کی گئی ہے اور جہاں پوری کوشش کے باوجود بھی کوئی لفظ یا عبارت سمجھ

میں نہیں آ سکی وہاں تصحیح قیاسی سے کام لیا گیا ہے ۔ غیر معروف اور مشکل الفاظ کے معانی ، جو دستیاب ہو سکے ہیں ، متعلقہ صفحات کے حواشی میں درج کر دیے گئے ہیں اور اس سلسلے میں بیشتر نوراللغات سے مدد لی گئی ہے ۔

محاسن الاخلاق چونکہ انگریزی زبان کی کتابوں سے ماخوذ ہے لہٰذا روما و یونانِ قدیم کے معلمینِ اخلاق کے علاوہ انیسویں صدی کے بعض انگریز مصنّفین کے حوالے بھی اس میں موجود ہیں ۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان میں سے جس جس شخصیّت کے متعلق سوانحی مواد دستیاب ہو سکے اسے نہایت اختصار اور جامعیّت کے ساتھ حواشی میں جگہ دے دی جائے ۔ چنانچہ اس سلسلے میں عربی زبان کی مشہور لغت ''المنجد فی الادب والعلوم'' سے مدد لی گئی ہے ۔ تاہم مجھے اعتراف ہے کہ بعض شخصیّات اور مقامات کے ناموں میں توارد کی وجہ سے متعلقہ حواشی اصلاح کے محتاج ہیں ۔ ''المنجد'' سے منقول بعض اعلام کے عربی املا کے ساتھ رومن حروف میں بھی نام درج کر دیا گیا ہے ۔ یہ رومن املا فرانسیسی زبان کا ہے ، اسے انگریزی نہ سمجھا جائے ۔ ''منجد'' کے علاوہ بعض ہم عصر مصنّفین کی کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے مگر افسوس کہ اسی قسم کی ایک کتاب سے افلاطون پر جو نوٹ بعینہ نقل کیا گیا ہے اس میں ارسطو کی مشہور تصنیف ''بوطیقا'' کو افلاطون کی کتاب ظاہر کیا گیا ہے ۔ یہ نوٹ صفحہ ۲۵ پر موجود ہے ، قارئین تصحیح فرمالیں ۔

فاضل مصنّف نے ''محاسن الاخلاق'' کے مآخذ کے متعلق لکھا ہے کہ ''اس کتاب میں مضامینِ اخلاق انگریزی کی اعلیٰ درجے کی اخلاق کی کتابوں سے انتخاب کر کے لکھے ہیں'' لیکن کتاب کا متن اس دعوے کی مکمل تائید نہیں کرتا ۔ یہ درست ہے کہ کتاب کے

بیشتر مضامین یورپی یا انگریز علما و مصنّفین کے اقوال و تالیفات پر مشتمل ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ بعض ایسے نام بھی جگہ جگہ نظر آتے ہیں جن کا یورپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً صفحہ ۳۶ پر علامہ جلال الدین دوانی کی مشہور کتاب ''اخلاقِ جلالی'' کے حوالے سے حکیم فیثا غورث کا یہ قول درج کیا گیا ہے:

''حکیم فیثاغورث کی حکمت کا یہ مسئلہ ہے، جیسا کہ ''اخلاق جلالی'' میں لکھا ہے کہ ہر فضیلت کی ایک حد معیّن ہے۔ جب اس سے تجاویز ہوگا، خواہ افراط کی طرف خواہ تفریط کی طرف، تو وہ فضیلت رذیلت بن جائے گی، یعنی نیکی برائی ہو جائے گی۔''

اسی طرح انسان کی خوش حالی اور بدحالی کے موضوع پر شاہجہاں بادشاہ کے ادبار اور غدر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے قتل و غارت کی مثال سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ (صفحہ ۴۷)

علاوہ ازیں ایرانی بادشاہ داریوش، حکیم بو علی سینا اور ان کی کتاب القانون، برہان الدین سمرقندی کی کتاب شرح اسباب، ایران کے معروف شاعر نظامی اور مولانا روم کا ذکر اور ان کے اقوال کا حوالہ بھی جابجا آیا ہے۔ مولانا روم، نظامی، شیخ سعدی اور فردوسی کے فقط اقوال ہی درج نہیں کیے گئے بلکہ مختلف موضوعات پر ان کے اشعار بھی کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ مگر افسوس کہ ان میں سے بیشتر اشعار کاتب کے سہو کی نذر ہو گئے ہیں۔

اس کے علاوہ ہندوستانی اقوام کی رسوم و عادات کو بھی کثرت کے ساتھ حوالے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں کسی انگریزی کتاب سے مدد لینے کی بجائے مصنّف نے

ذاتی مشاہدات کو کتاب میں درج کیا ہے۔

مولانا ذکاء اللہ نے اخلاقیات کے موضوع پر چھوٹی بڑی چھ کتابیں تالیف کی ہیں مگر "محاسن الاخلاق" ان سب میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ نہ صرف اپنی ضخامت اور موضوعات کی کثرت کی وجہ سے اسے فوقیت حاصل ہے بلکہ اس کا طرزِ بیان اور اندازِ پیشکش بھی اسے دوسری کتابوں پر فوقیت دیتا ہے۔ عام طور پر مولانا ذکاء اللہ کا اندازِ بیان مبلّغانہ ہے اور وہ براہِ راست اپنے مافی الضمیر کا ابلاغ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس "محاسن الاخلاق" میں انھوں نے علاماتی اور استعاراتی انداز اختیار کیا ہے اور طرزِ استدلال زیادہ فلسفیانہ اور سائنٹفک ہے۔ اور اسی بالواسطہ اور فلسفیانہ اندازِ تحریر کی وجہ سے بیشتر مقامات پر کتاب عام فہم نہیں رہی اور اس کے مطالب ایک عام قاری کی گرفت میں نہیں آتے۔

آخر میں اپنے کرم فرمائے مکرّم پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم و مغفور اور جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اس کتاب کی ترتیب کا کام سپرد کر کے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اپنے فاضل دوست محمد سلیم الرحمٰن صاحب کے لیے بھی سراپا تشکّر ہوں جن کی عالمانہ رہنمائی قدم قدم پر میرے لیے چراغِ راہ ثابت ہوئی۔

احمد رضا

۲۴ جون ۱۹۷۵ء

محاسن الاخلاق[1]

حصه اول و دوم

خان بہادر شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ فیلو الہ آباد یونیورسٹی

نے

اس کتاب میں سات سو پچیس مضامینِ اخلاق انگریزی
کی اعلیٰ درجے کی اخلاق کی کتابوں سے انتخاب کر کے
لکھے ہیں

۱۸۹۱ع

مطبعِ چشمۂ فیض دہلی میں منشی محمد عطاء اللہ
کے اہتمام سے مطبوع ہوئی

۱- ''محاسن الاخلاق'' کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۹۱ع کے سرورق کی عبارت - (مرتب)

اشتہار

کتبِ اخلاق مصنّفۂ خان بہادر شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ فیلو الہٰ آباد یونیورسٹی، لیکچرار مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ۔

اِن مضامین میں نہ علومِ ریاضیہ کے کسی مسئلے کا ذکر ہے، نہ علومِ طبیعیہ کے رموز کا بیان ہے، نہ علومِ الٰہیہ کے اسرار کا انکشاف ہے، نہ علومِ فلسفہ کے مذاہب و اعتقادات و یقینیات کا حال مرقوم ہے۔ نہ زمین کا ذکر ایسا ہے کہ جس سے معادن سے جواہر نکالنے کے طریقے معلوم ہوں، یا اُن حیوانات کے استخوانِ بوسیدہ کی حقیقت کُھلے کہ جن کی نسلیں معدوم ہو گئی ہیں۔ نہ آسمان کا ذکر ایسا بیان ہوا ہے کہ جس سے کواکب کی تاثیرات اور ثوابت و سیّارات کی سکنات و حرکات کی کیفیت ظاہر ہو۔ بلکہ ان میں سچّا، اچھا، سیدھا سادہ بیان انسان کے عالمِ اخلاق کا ہے۔ وہ یہ بتلاتا ہے کہ بشر کیا کیا کام کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے؟ اس کے کرنے میں اس کی نیّت کیا ہوتی ہے؟ اپنی تلوّن مزاجی سے کاموں کے کیا کیا رنگ دکھاتا ہے اور اس نیرنگی سے کیا کیا تعجّب دلاتا ہے۔ بے سر و پا و بیہودہ حرکات سے کیسا کیسا ہنساتا ہے، کیا خیالات اور توہّمات رکھتا ہے۔ وہ سمجھاتا ہے کہ زمانہ انسان پر کیسا اپنا دباؤ ڈالتا ہے اور کیسے کیسے تغیُّر و انقلاب اس کے کاموں میں پیدا کرتا ہے اور کتنے عرصے تک اپنا اثر اس پر رکھتا ہے۔ وہ انسان کی ایسی

ذری ذری سی باتوں کی ، جیسے لباس ، کتابیں ، گفتگو ، نشست و برخاست ، خیالات و افعال ہیں ، تشریح کرتا ہے ۔ انسان کی زندگی کے سارے رنگ اور بہروپ بھر کے وہ تماشا کرتا ہے ۔ وہ یہ تحقیق کرتا ہے کہ انسان کی زندگانی کیا ہے اور وہ کیا رہی ہے اور کیا ہونی چاہیے ۔ خلاصہ یہ کہ وہ آئینے کی طرح دکھاتا ہے کہ انسان کیا ہے اور کیا نہیں ہے ۔ پس جس طالب علم کو عالمِ اخلاق کی سیر کا شوق ہو ، وہ اِن مضامین کو پڑھے ، جن کی تعداد ''الف لیلہ[1]'' کی کہانیوں سے بھی زیادہ ہے ۔ گو وہ ''الف لیلہ[2]'' کی داستانوں اور افسانوں کی برابر مفرّح و دلکش و دلچسپ نہیں ہیں مگر خرد افروز اس سے زیادہ ضرور ہیں ۔ افسوس ہے کہ انسان اپنے عالمِ اخلاق کی سیر نہ کرے ، خصوصاً جب کہ وہ ایسی ارزاں ہے ۔

۱- طبع اول (۱۸۹۱ع) میں ''الف لیلیٰ'' غلط چھپا ہے ۔ صحیح ''الف لیلہ'' ہے ۔ (مرتّب)

الف لیلہ : اس کتاب کا پورا نام ''الف لیلۃ و لیلۃ'' ہے ۔ حکایات کا یہ مجموعہ عربی میں ہے جس میں مختلف ممالک اور شہروں سے منسوب حکایات درج ہیں ؛ مثلاً ایرانی ، ہندوستانی ، بغدادی اور مصری ۔ یہ کتاب تیرھویں چودھویں صدی عیسوی میں تالیف ہوئی ۔ ۲۶۴ کہانیاں ہیں ۔ شہزادی شہرزاد اپنی بہن شہزادی دینا زاد کو یہ کہانیاں سناتی ہے ۔ ان کہانیوں میں تاریخی واقعات کے علاوہ اس زمانے کے اخلاق و عادات پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ اس کے مشہور قصے سند باد ، قمرالزماں اور علی بابا ہیں ۔ یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے اور متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے ۔ (مرتّب)

۲- یہاں بھی اصل میں ''الف لیلہ'' کی بجائے ''الف لیلیٰ'' غلط چھپا ہوا ہے ۔ (مرتّب)

محصول دے کر تین طرح سے حاصل ہو سکتی ہے ؛ ایک ہندوانی ، دوسری مسلمانی ، تیسری انگریزی طور سے ۔ تفصیل ان کی یہ ہے :

تہذیب الاخلاق آریائے ہند : ہندوؤں کی کتابوں سے ۱۳۷ مضامین ۔

مکارم الاخلاق[1] : مسلمانوں کی کتابوں سے ۲۴۶ مضامین ۔

محاسن الاخلاق : انگریزی کتابوں سے ۱۱۰۷ /۲۵۷ مضامین ۔

☆ ☆ ☆

۱۔ 'مکارم الاخلاق' مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے ۱۹۶۷ع میں شائع ہو چکی ہے ۔ اسے بھی راقم الحروف نے مرتّب کیا ہے ۔ (احمد رضا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نامہ سیاہ محمد ذکاء اللہ ، ملقّب بہ شمس العلماء ، خان بہادر ، اربابِ علم کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ دنیا میں سچّے ، نیک ، مفید خیالات کا مجموعہ ایسا ہے کہ جس نے بنی آدم کو تاریکیِ جہالت سے نکال کر روشن دماغ اور روشن ضمیر بنایا ہے ، اور وہ کسی اور سچّے خیالات کے اثر کا مخالف و مزاحم نہیں ہے ، بلکہ اس مجموعے کے تمام خیالات کی اصل واحد ہے ؛ اور وہ باہم موافقت اور اتّحاد رکھتے ہیں اور باہم کھٹ پھٹ نہیں کرتے ہیں ۔ ان کا حال مینہ کی بُوندیوں کا سا ہے کہ گو وہ جُدا جُدا برستی ہیں مگر سب آپس میں مل کر دریا میں ایک ہو جاتی ہیں اور بڑی دھار کے چلانے میں مدد کرتی ہیں ۔

اسی طرح یہ خیالات گو مختلف قوموں اور مذہبوں اور طریقوں کے ہیں مگر وہ انسان کی تہذیبِ نفس و تکمیلِ عقل کے لیے یکساں اثر رکھتے ہیں ، کسی خاص مذہب اور گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں ۔ تفصیل اس اجمال کی اِن کے پڑھنے سے معلوم ہوگی کہ ہر انسان ، خواہ وہ کوئی مذہب اور طریقہ رکھتا ہو ، ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔

ہر ملک میں ایسے اربابِ عقل و ہوش و نامور و صاحبِ کمال گزرے ہیں کہ اُنھوں نے پہلے خیالات کے خزانے میں اپنے نیک

خیالات کا سرمایہ بڑھایا ہے - اس طرح خیالات کا مخزن ہمیشہ بڑھتا رہا ہے اور بڑھتا رہے گا - جیسے سمندر سے پانی کے بخارات اوپر جانے میں اپنی تلخی اور کھاری پن کو نیچے چھوڑ جاتے ہیں اور ستھرے میٹھے ہو کر صاف پانی کی جھڑی برسا کر ہم کو نہال کرتے ہیں ، ایسے ہی جب انسان کے نیک اور سچے خیالات بلند ہوتے ہیں تو وہ تمام خباثتوں کی کدورتوں سے الگ ہو کر نفیس ، لطیف ، لذیذ ہو جاتے ہیں اور انسان کے دل و دماغ پر اپنی جھڑی برسا کے اُن میں دین و دنیا کی نیکیوں کی پود کو شاداب کرتے ہیں - جیسے آتشی شیشے کے نقطۂ ماسکہ پر حرارت اور روشنی کے جمع ہونے کا اثر ہوتا ہے ، ایسا ہی دلوں کے منوّر کرنے میں اِن نیک خیالات کا اثر ہوتا ہے - جب تک کہ انسان کا دماغ دانائی کے خیالات کا مختصر مجموعہ نہیں بنتا ، وہ روشن دماغ اور روشن ضمیر نہیں بن سکتا -

نیک سچّے خیالات کیا ہیں ؟ سچّی دولت کے خزانے ، آبِ حیات کے چشمے ، نور کے فرشتے ، جواہر کے حقّے[1] جن کی چمک کبھی ماند نہیں ہوتی - خوش نما و معطّر پھولوں کے گلدستے جن پر کبھی پژمردگی نہیں آتی - خصائل و عاداتِ انسانی کی سپر ، ساری قوموں کے حصنِ حصین[2] ، دل و دماغ کے زیور ، علم و عمل کے بیجوں کی اصل ، تہذیبِ اخلاق کے سانچے ، انسان کو اشرف المخلوقات کے تخت پر بٹھانے والے ، سیرت و طینت و نیّت کو پاک بنانے والے - اِن سے زیادہ عمدہ کوئی ورثہ زمانے کے ہاتھ سے انسان کو اب تک نہیں ملا -

---

۱- حقّہ = ڈبیا -
۲- حصنِ حصین = مضبوط قلعہ -

نیک اور حق خیالات پر سیاہی کے قطرے بھی اعجاز کرتے ہیں ۔ جب وہ الفاظ کا لباس زیبِ تن کرکے ہوا میں اُڑتے ہیں تو یہ قطرے اوس کی طرح پڑ کر ان کی صورت کو ایسا پائدار کر دیتے ہیں کہ وہ ایسے اَن مِٹ ہو جاتے ہیں کہ جن کی مدتوں تک زمانہ زیارت کیا کرے اور اربابِ خیال اپنے ذہن کو ان سے پُر کیا کریں ۔

جب میں نے دیکھا کہ انسان کی تعلیم و تہذیب کی تکمیل جب تک نہیں ہوتی کہ اس کا دماغ سچّے ، حق خیالات کا مخزن نہ ہو ، تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ اپنی زبان میں ان خیالات کو بیان کروں ۔ اِس اپنے مطلب کے واسطے میں نے مشہور کتابوں کا باغ اپنے ذہن کی آنکھوں کے روبرو لگایا کہ جن کے اندر ایسے خیالاتِ بلند موجود تھے کہ جن کو زمانۂ دراز سے بے شمار آدمی پڑھتے چلے آتے ہیں اور معلوم نہیں کب تک پڑھتے چلے جائیں گے ۔ جب یہ باغ مرتّب ہو گیا تو میں نے اول اپنے ذہن سے کہا کہ 'تو اس باغ میں باغبان بن کے جا اور جو پھول تجھ کو پسند آئیں ، ان کو مع شاخ اور پتّوں کے قلم کرکے اپنے تاگے سے باندھ کے ان کا گلدستہ بنا دے (یعنی اصلی خیالات کو انتخاب کرکے اپنی زبان میں نقل کر دے) ۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ اب 'تو گل فروش بن کر اس باغ میں جا اور اپنے پسند کے پھول توڑ اور ان کا گہنا ، بُدھنی ، سہرا ، ہار ، گجرا بنا (یعنی خیالات کی کچھ صورت بدل) ۔ بعد ازاں میں نے کہا کہ 'تو شہد کی مکھّی بن کے جا اور خوب گلگشت کرکے پھولوں کا رس چُوس اور اپنے معدے میں شہد بنا (یعنی خیالات کی ایسی نئی صورت بنا دے کہ کوئی پہچانے نہیں کہ پہلے ان کی کیا صورت تھی) ۔ مگر مجھے معلوم نہیں کہ اس نے

شہد بنایا یا موم - اہلِ مذاق اس کو انگلی لگا کے زبان پر رکھیں - اگر ان کو لذیذ معلوم ہو تو اس سے لذت اٹھائیں ، نہیں تھوک دیں -

ذہن نے مجھ سے یہ فرمائش بھی کی کہ اب مجھے مکڑی بن کے جانے کی اجازت دیجیے کہ میں اپنے معدے سے مادہ نکال کر جال پھیلاؤں - میں نے اسے منع کیا کہ جو جالا تُو خود تنے گا ، وہ ہوا کے جھوکوں میں اڑ جائے گا ، خود اس میں پھنس کر مُردے کی طرح لٹکے گا - مکھیاں بھی معلوم نہیں اس میں پھنسا سکے گا یا نہیں (کوئی خیال اپنا اصلی میں نے نہیں لکھا) - میں نے اِن خیالات کے باغ میں مضامین کی قلمیں تراشیں (یعنی پڑھا) ، پھر اِن کو ہضم کیا (دل بہلایا) ، اِن کا ذخیرہ اپنے حافظے میں ایک بلند مقام پر جمع کیا اور اس کی شیرینی کے ایسے مزے اڑائے کہ جس سے میری زندگانی کی تلخیاں کم ہوگئیں - پس یہ ثمرہ مجھے اپنی ریاضت کا مل گیا - اسی پر قناعت کرتا ہوں - کچھ اور زیادہ طمع نہیں کرتا -

خلاصہ یہ ہے کہ میں نے اِن خیالات کے بیج بتا دیے ہیں کہ جن سے اہلِ خیال نئے خیالات کے کھیت کے کھیت ، ہرے بھرے ، پُھولے پھلے ، جتنے بڑے اور زرخیز چاہیں ، لگائیں -

میں نے اِس کتاب میں مشرقی و مغربی خیالات کی دو تصویریں ایسی بنائی ہیں کہ پیٹھ سے پیٹھ لگائے بیٹھی ہیں - ایک مشرق کی طرف دیکھ رہی ہے ، یعنی پیچھے کی طرف ، اور دوسری مغرب کی طرف ، یعنی آگے - یوں وہ دونوں اپنی صورتوں سے اگلے پچھلے خیالات کو بیان کر رہی ہیں - گو خیالات بہت سے اقسام کے ہو سکتے ہیں مگر میں اپنی کتاب کا آغاز اُن خیالات سے[1] کرتا ہوں

۱- طبع اول : ''کتاب کا آغاز اُن خیالات سے شروع کرتا ہوں'' - ''آغاز'' اور ''شروع'' ہم معنی تھے لہذا لفظ ''شروع'' حذف کر دیا گیا - (مرتب)

جو اخلاق کی تہذیب و تحسین سے متعلق ہیں - اور ان کے وہ آصول بیان کرتا ہوں کہ جن میں قانونِ قدرت اور سنّتِ الٰہی کی طرح تبدیل اور تحویل نہیں - نہ کبھی زمانہ آن کو بدل سکا ، نہ بدل سکے گا - تہذیبِ اخلاق کے خیالات بد اخلاق پر لعنت کرتے ہیں اور خوش اخلاق کی نخوت پر ملامت کرتے ہیں - اس لیے انسان کو باطبع وہ ایسے ناگوار معلوم ہوتے ہیں جیسے کہ عیب بتلانے والے آدمی - مگر جب تک انسان اپنے بچپنے کی بے وقوفیوں کی جوانی میں اور جوانی کی شہوت پرستیوں کی بڑھاپے میں اِصلاح نہیں کرتا ، وہ پیرانہ سالی میں لڑکوں کا سا احمق اور جوانوں کا سا شہوت پرست رہتا ہے - اس لیے تہذیبِ نفس اور تزکیہ‌ٔ قلب کے لیے ان خیالات کی تقدیم ضرور ہے -

تہذیبِ اخلاق میں مذہب کو بڑا دخل ہے - ہر قوم کا اخلاق اس کے مذہب کا نتیجہ ہوتا ہے - میں نے مذہب کو چھوڑ دیا اور نتیجے کو لے لیا - آم کھائے اور پیڑ نہیں گنے - اصل درختوں کو چھوڑ دیا ، پھلوں کو لے لیا ؛ یعنی احکام و عقائدِ مذہبی بیان کرکے دوزخ و بہشت کی راہ نہیں بتلائی - نہ کسی کو جنّت میں بھیجا ، نہ کسی کو دوزخ میں ڈالا - بلکہ بدیوں کی برائیاں اور نیکیوں کی خوبیاں بیان کیں اور یہ بتلایا کہ مَن کی کُٹلتا[1] دور ہونے سے اس سنسار میں آدمی کو کیا ہاتھ لگتا ہے -

اس کتاب کے پہلے حصّے کا نام ''تہذیب الاخلاق آریاے ہند'' ہے - اس میں آریاے ہند یعنی ہُنود کی مقدّس و معتبر و مستند کتابوں سے ایک سو اڑتیس مضمون انتخاب کرکے لکھے ہیں -

دوسرے حصّے کا نام ''مکارم الاخلاق'' ہے - اس میں مضامین مسلمانوں کی کتابوں سے انتخاب کرکے لکھے ہیں -

---

۱- کُٹلتا = کدورت -

تیسرے حصّے کا نام "محاسن الاخلاق" ہے۔ اس میں مضامین اہلِ فرنگ کی کتابوں سے اخذ کر کے لکھے ہیں۔

ہر حصّے کے آخر میں ضمیمے لکھے ہیں جن میں متفرّق مضامین ہیں۔ یہ حصّے علاحدہ ہیں، کچھ ایک دوسرے پر موقوف نہیں اور وہ ایک مجموعے میں بھی شامل ہیں۔ مضامین کے بزرگ مصنّفوں کا نام[1] بھی میں نے اول لکھ دیا ہے جس سے مضامین کی عظمت ہو۔ جب تک لوگ مضمون کے مصنّف کو نہیں جانتے، اس کی قدر و منزلت نہیں کرتے۔

اس میں تو شبہہ نہیں کہ خیالات ایسے مقدّس بزرگوں کے ہیں کہ وہ لوگوں کے دلوں پر تاثیر ضرور کریں گے، مگر کلام اِس میں ہے کہ میں نے بھی ان کا حق اپنی زبان میں ادا کیا یا نہیں۔ میں نے خواہ حق ادا کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر طالب العلموں کو ان مضامین کے پڑھنے سے ایک طرح کی بصیرت حاصل ہوگی کہ ہزاروں تشبیہات و استعارات و تمثیلات و محاورات مشرقی و مغربی زبانوں کے ایسے معلوم ہوں گے جو پہلے کبھی اُن کے کانوں نے نہ سنے ہوں گے۔ اور مشرقی و مغربی خیالات اور طرزِ ادا پر[2] علم ہوگا۔ وہ ان کے ازدواج سے عمدہ اولاد مضامین کی پیدا کر سکتے ہیں، کیوں کہ قاعدہ ہے کہ مختلف نسلوں کے اِختلاط سے اچھی اولاد پیدا ہوتی ہے۔ فقط

☆ ☆ ☆

۱- کتاب کے مطالعے سے اس دعوے کی تصدیق نہیں ہوتی۔ نہ باقاعدگی کے ساتھ ماخذ کے حوالے دیے گئے ہیں اور نہ مصنفین کا ذکر اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں مصنف یا کتاب کا کوئی نام آ جاتا ہے۔ (مرتّب)

۲- کذا۔

محاسن الاخلاق

۱- خدا تعالیٰ کی حمد

اے جہان آفریں ! تُو ہی اِس عجیب و غریب جہان کی جان اور روشنی ہے۔ یہ تیری ہی پرتو افگنی ہے کہ دن کو دنیا چمکتی ہے اور رات کو مسکراتی ہے۔ اے فلک آرا ! یہ تیرا ہی رنگِ شہود ہے کہ جب آفتاب شام کو شفق میں اپنی شعاعوں کو رخصت کرتا ہے، تُو اپنے رنگِ تاباں، لطافت اور نزاکت کے ساتھ دکھاتا ہے۔ اے انجم افروز ! یہ تیرا ہی ظہور ہے کہ جب طاؤسِ شب اپنے بازوؤں پر سارے تاروں کو لے کر رقص کرتا ہے تو تُو پاک تاریکی اور بے شمار روشنیوں کو دکھاتا ہے۔ اے بہار پیرا ! یہ تیری ہی چمن آرائی ہے کہ بہارِ نوخیز اپنی خوشبوؤں سے ہواؤں کو معطّر کرتی ہے اور اپنے ہاتھوں سے پھولوں کو گوندھتی ہے۔ غرض جس جا نظر جاتی ہے، وہاں تیری ہی شانِ کبریائی آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ اور جو چیز نگاہ تلے آتی ہے، وہ تیرے ہی نورِ لایزالی کو دکھاتی ہے، سب جگہ تُو ہی تُو ہے۔

۲- خدا تعالیٰ کا ہونا

اگر دریا رواں ہو تو کون اس کے منبع سے، اور اگر پانی کے تلاطُم کا غل مچ رہا ہو تو کون دریا و سمندر کے ہونے سے (انکار کر سکتا ہے)۔ کوئی چیز بنی ہوئی دکھائی دے جائے تو کون

اس کے بنانے والے سے انکار کر سکتا ہے ؟ اگر قفس میں کسی غلام کو کوئی ظالم بند کر کے بھوکا پیاسا مارے ، غلام سو جائے اور پھر آنکھ کھلے اور وہ اپنے چاروں طرف دیکھے کہ موت کدھر کھڑی ہے ، مگر بجائے موت کے اُس کو یہ نظر آئے کہ طرح طرح کے کھانے اُس کے آگے چُنے ہوئے ہیں کہ جن سے وہ اپنے بھوکے پیٹ کو بھرے ، مٹّی کے کورے برتنوں میں ٹھنڈا پانی بھرا ہوا ہے کہ وہ اپنے سوکھے ہونٹ تر کرے ، تو وہ کب اِس سے انکار کر سکتا ہے کہ یہ نیک سلوک میرے ساتھ کسی رحم دل ، فیّاض نے کیا ہے جو موت کے سامان کی جگہ یہ خوانِ پُر الوان میرے سامنے چُنا ہے - وہ تہِ دل سے اپنے اُس محسن کا شکریہ ادا کرے گا - پس ایسا ہی حال ہمارے ساتھ اُس کریمِ بے منّت کا ہے کہ کوئی اس کی محبّت کے کاموں اور اس کی صنعت کے کاموں کو دیکھ کر اُس واجب الوجود کی ہستی کا انکار نہیں کر سکتا -

جب کوئی کل یا عمارت ایسی نظر آتی ہے کہ جس میں ارادہ ، منصوبہ ، تدبیر اور اُس کے ہر جزو کی علّتِ غائی موجود ہو ، تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کل کو کسی کاریگر نے اور اس عمارت کو کسی معمار نے نہیں بنایا ؟

پس یہ تمام عالم جس میں ہر شے ، خواہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ ، چھوٹی ہو یا بڑی ، تدبیر ، منصوبے ، ارادے ، ہر جزو کی علّتِ غائی کے کمال سے ایسی بھری ہوئی ہو کہ جس سے بہتر سمجھ میں نہ آتی ہو ، تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا مدبّر ، خالق ، صانع نہیں ہے ؟ ہرگز ہرگز نہیں - صحیفۂ فطرت میں کوئی شے اس سے زیادہ صاف ، موٹے حرفوں میں نہیں لکھی ہے کہ اِس مخلوق کا خالق ایسا ہے جس کے سارے کام کمال کے ساتھ ہیں - وہ وُہ

خالقِ موجودات ہے کہ اُس کے نزدیک زحل کے گِرد ایک لاکھ میل قطر کا حلقہ بنا دینا یا کسی چھوٹے کیڑے کے ڈنک کی نوک کا ڈھال دینا، جو بغیر خوردبین نظر نہ آئے، ایک ہی بات ہے۔ ادنیٰ ادنیٰ کیڑوں میں وہ کمالِ صنعت اُس صانعِ کامل کا پایا جاتا ہے کہ انسان کی صنعت اس کے مقابلے میں ہیچ و پوچ ہے۔ آدمی جو سوئی کی نوک بناتا ہے وہ خوردبین سے ناہموار و کوڈول[1] نظر آتی ہے، لیکن خدا نے جو کیڑوں کے ڈنکوں کی نوکیں بنائی ہیں، وہ خوردبین میں بھی مُجلّا و مُصفّا و ہموار و سوڈول[2] نظر آتی ہیں۔

۳۔ مدبّرِ عالم کا ہونا ضروری ہے

جب ہم بہت زوروں[3] کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپس میں متّحد اور متّفق ہو کر تناسب و اندازہ کے ساتھ اپنا عمل کر رہے ہیں تو ہم کو یقین ہوتا ہے کہ کسی کی عقلِ مدبّر نے ان کو جمع کیا ہے اور ایسی تدبیریں اِن میں کی ہیں کہ وہ باہم اتفاق کے ساتھ کام دے رہے ہیں۔ پس جب ہم اس عالم میں دیکھتے ہیں کہ بہت زور[4] آپس میں مل کر صدہا اثر اپنے عمل سے ایسے پیدا کر رہے ہیں جو نہایت بکار آمد اور مفید ہیں، اور وہ یہ عمل بھی اتنی مدّتوں[5] سے کرتے ہیں کہ جن کی تعداد کا شمار اعداد کے احاطے سے پرے ہے، تو ہم کو مدبّرِ عالم کا یقین ہوتا ہے۔ اور یہ اُس کے ہونے کی شہادت ایسی ہے کہ کوئی شہادتِ مخالف اُس پر غلبہ نہیں کر سکتی۔

۱۔ کوڈول = بے ڈول۔ ۲۔ سوڈول = موزوں، سڈول۔

۳۔ بہت زوروں کو: یعنی بہت سی قوّتوں کو۔

۴۔ بہت زور: یعنی بہت سی قوّتیں۔ ۵۔ اصل میں ''مدت'' ہے۔

آدمی یہ خیال ہرگز نہیں کر سکتا کہ میں تھیلی میں ٹائپ کے حرف بھر کر اُن کو زمین پر پھینک دوں تو نظم و نثر کی ایک چھوٹی سی کتاب تالیف و تصنیف ہو جائے گی ۔ پس جب ایسی چھوٹی کتاب یوں نہیں تصنیف ہو سکتی تو اِس عالم جیسی بڑی مجلّد کتاب کیونکر بغیر مصنّف کے تصنیف و تالیف ہو سکتی ہے ؟ کب آدمی یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ کوئی شخص دیوار پر یوں ہی رنگوں کے چھینٹے دیا کرے تو اس سے خود بخود ایک آدمی کی تصویر عین مین بن جائے گی ؟ جب یہ تصویر بغیر مصوّر نہیں بن سکتی تو خود بغیر بنانے والے کے کیسے بن سکتا ہے ؟

اگر ہندوستان کے دُور کے اضلاع سے بیس ہزار اندھے چلیں تو کیا یہ خیال میں آ سکتا ہے کہ وہ برسوں کے بعد دہلی کی چھاؤنی میں میدانِ قواعد کے درمیان سپاہ کی طرح جمع ہو جائیں گے اور قواعد اور صف بندی لشکر کی سی کریں گے ؟ کبھی نہیں ۔ پس جب اِن جان دار اندھوں کی نسبت یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تو یہ کب سمجھ میں آ سکتا ہے کہ بے جان مادے کے بے شمار اجزا اس طرح جمع ہو جائیں کہ جس سے عالم کی ترتیب و ترکیب اس کمال کے ساتھ ہو جائے ؟

ہر ادنٰی مزدور اور اہلِ حرفہ کے گرد قدرتی اشیا اتنی کثرت سے جمع ہیں کہ وہ جس صنعت پیشے سے اپنی روزی پیدا کرتا ہے وہ ان کو اس میں دیکھ سکتا ہے ۔ ملّاح دیکھ سکتا ہے کہ جو میں صنعت پانی پر کشتی چلانے میں چپّو سے کرتا ہوں ، وہی مچھلی اپنی دُم سے پانی کے اندر تیرنے میں کرتی ہے ۔ گلہ بان ملاحظہ کر سکتا ہے کہ میں اپنے گلّے کی حفاظت جن تدبیروں سے کرتا ہوں کہ درندے آن کر اس کو چیر پھاڑ نہ ڈالیں ، اس

سے زیادہ شعورِ فطرتی یا عقلِ حیوانی سے جانور اپنے گتّوں کی چوکسی خود کر لیتے ہیں (جیسے کہ ہرن) - وہ ایسے ہوشیار رہتے ہیں کہ جہاں ذرا سا بھی خوف کا کھٹکا ہوا ، وہ چوکنّے ہوئے - رات کو وہ ایسے پہرہ چوکی لگا کے سوتے ہیں کہ کچھ خطرہ اُن کو نہیں رہتا - شکاری کے پیچھے جب کوئی جانور پڑتا ہے تو وہ اپنے بچانے کے لیے بہت سے حیلے و حکمتیں کرتا ہے - وہ دیکھ لے کہ اُس سے زیادہ یہ جانور اپنے بچانے کی حکمتیں قدرتی دشمنوں سے جانتے ہیں -

معمار آسانی سے دیکھ سکتا ہے کہ تعمیر عمارت میں جن اصول کو کام میں لاتا ہوں وہ سب درختوں کی بناوٹ میں اور جانوروں کے اُستخوانوں کی بندش میں موجود ہیں - جہاں زیادہ بوجھ اٹھانے اور سہارنے کی ضرورت ہے ، وہاں استحکام و استواری ہے اور جہاں یہ ضرورت نہیں ہے ، وہاں نزاکت ہے - درختوں کی جڑوں کو دیکھو ، کیسی مضبوط ہیں کہ برسوں ہوا کے جھکّڑوں سے ہلتی نہیں - پمپ چلانے والا دیکھ سکتا ہے کہ جس طرح میں پانی کو اوپر چڑھاتا ہوں ، اُس سے زیادہ عمدہ اصول کے موافق درختوں میں جڑ سے پانی پھننگوں کی شاخ و برگ میں چڑھتا ہے -

ہر عضوِ انسانی کی بناوٹ شہادت دیتی ہے کہ وہ جس کام کے واسطے بنایا گیا ہے ، اُس کا سب اسبابِ مناسب اس میں مہیّا ہے - گوشت خور جانوروں کے واسطے جس زور کی ضرورت ہے ، وہ اُن کے نیچے کے جبڑے اور دانتوں میں کُترنے ، پیسنے ، چبانے کے لیے موجود ہے - جہاں ایک جانب میں حرکت درکار ہے ، وہاں ایسا ہی جوڑ لگایا ہے کہ ایک ہی سمت میں حرکت ہوتی ہے ، جیسے انگلیوں میں ، اور جہاں سب طرف حرکت کرنے کی ضرورت ہے وہاں چُول بنائی

ہے ، جیسے کہ مونڈھے اور کُولھے میں ۔

سارے شہر کے مکانوں میں جو نلوں اور نلیوں کے ذریعے سے پانی پہنچتا ہے ، اُس میں وہ صنعت کہاں ہے جو انسان کی رگوں اور شریانوں میں خون کے دورے کے لیے رکھی گئی ہے ۔ پس یہ سارے منصوبے اور تدبیریں مدبّرِ عالم کی شہادت دیتی ہیں جن میں کسی آدمی کو ، جو ذرا بھی عقل سے بہرہ رکھتا ہے ، شبہ نہیں ہو سکتا ۔

۴۔ سب جگہ اللہ ہی اللہ ہے

وہ فلسفہ و مذہب کس کام کا ہے جو یہ نہ بتلائے کہ سب کچھ وہی ذاتِ پاک ہے اور اُس کے سوا خاک ہے ۔ یہ سارا عالم اُسی کی عبادت گاہ ہے ۔ نہ اس سے باہر ہم ایک قدم رکھ سکتے ہیں ، نہ ایک دم لے سکتے ہیں ۔ کہیں جاؤ ، کہیں آؤ ، جہاں کسی شے کو دیکھو ، اُس میں اُسی کی صنعتِ کاملہ اور قدرتِ بالغہ جلوہ گر نظر آئے گی ۔ یہ جو ہزاروں نورانی عالم (ستارے سیّارے) نہایت منضبط و باقاعدہ ایک مناسب اندازے کے ساتھ دائروں میں دائمی دورہ کر رہے ہیں ، ان سے پوچھو کہ تمھارا ان راستوں پر اس طرح پھرانے والا کون ہے ؟ تو وہ کہیں گے کہ وہی ایزدِ کارساز ہے ۔ پہاڑوں کو دیکھو کہ ان کی کوئی چوٹی بادلوں سے سرگوشی کرتی ہے ، کوئی کالی گھٹا سے اپنا رنگ ملاتی ہے ، کوئی برف کا لبادہ اوڑھے برفستان بن رہی ہے ۔ ان سے پوچھو کہ کس نے تم کو ایسا بنایا ؟ تو وہ کہیں گے کہ اُسی قیّوم و دانا نے ہماری گہری بنیادیں قائم کی ہیں جو ہم یوں اٹل کھڑے ہیں ۔

سمندر کے پانیوں کو دیکھو کہ جن کے بے انتہا تلاطم کا غل شور مچ رہا ہے ۔ ان سے پوچھو گے تو وہ کہیں گے کہ ہم اس

کنارے سے اُس کنارے تک اُسی مالک الملک کی مناجات کا شور مچاتے ہیں جس نے ہم کو حکم دے رکھا ہے کہ بس یہاں تک آؤ اور اس سے آگے قدم نہ بڑھاؤ - دریاؤں کو دیکھو کہ وہ چل کر سمندر سے جا ملتے ہیں اور چستی کو چھوڑتے نہیں ، سستی کو پاس آنے دیتے نہیں - ان سے پوچھو تو وہ بولیں گے کہ یہ مستعدی ہم کو اُسی کریمِ بے منّت نے بخشی ہے جس نے ہم کو چشموں سے نکال کر وادیوں میں بہایا ہے -

زمین کو دیکھو کہ اُس کی کوئی اقلیم خطِ اِستوا پر گرمی کے مارے آگ ہو رہی ہے ، کوئی اقلیم قطبوں پر سردی کے مارے برف بن رہی ہے - کہیں پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے ، کہیں سرسبز و شاداب میدانوں سے بھری ہوئی ہے - اُس سے پوچھو تو وہ یہ کہے گی کہ میرے پاس جو کچھ جمع پونجی ہے ، وہ اُسی مصوّرِ عالم کی عطا کی ہوئی ہے جس نے مجھ پر بے شمار یہ نقش و نگار بنائے ہیں -

ایسے ہی اُن سب انواع کے حیوانات و نباتات سے پوچھو تو وہ بھی یہ کہیں گے کہ ہماری حیات اُسی واجب الوجود نے عطا کی ہے جس کے قبضۂ قدرت میں سارا عالم ہے - مخلوق کے ہر ذرے سے اور ہر کارخانے سے خدا کے نام کی ایک ہی صدا کان میں آ رہی ہے - ہر جگہ اُسی کی محبّت کا نشان پاؤ گے - سارے عالم کے طول و عرض ، عُمق و ارتفاع میں اُسی کا جلوہ دیکھو گے - بغیر اس کے عالم تاریک اور اندھا ہے - غرض سارے زمان و مکان میں وہ صاحبِ لامکان موجود ہے - ہماری کہاں زبان ہے جو کچھ بھی اُس کا بیان ہو -

۵- اہلِ دنیا کا خدا سے جدا رہنا

اہلِ دنیا زبان سے خدا کا اقرار کرتے ہیں مگر کام وہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا سے انکار رکھتے ہیں - ادنٰی، اعلٰی، بوڑھا، جوان، لڑکا، بیکار، کاہل، نکمّا، کام کرنے والا، یہ سب اللہ سے ایسے بچتے ہیں کہ جب ان کے سامنے خدا کا نام لیا جاتا ہے تو وہ یا تو جانتے ہی نہیں کہ کس کا نام لیا گیا، یا منہ ایسا بگاڑتے ہیں کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں کوئی بے چینی پیدا ہوگئی ہے - اگر کم عمروں کے سامنے خدا کا نام لیا جائے تو وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ کیا معمّہ ہے اور اس کا مسمّٰی کون ہے - اس سے اُن کو تکلیف معلوم ہوتی ہے - وہ یہ جانتے ہیں کہ ابھی ہمارا عنفوانِ شباب ہے، اُس کے نام سے تکلیف نہ دی جائے تو بہتر ہے - اگر بوڑھے سے کہتے ہیں ”بڑے میاں! اب تمھارے رہنے کا زمانہ تھوڑا رہ گیا ہے، خدا کو یاد کرو“ تو وہ بھی اِس یاد دلانے سے چِڑ جاتا ہے - اگر اقبال مند، دولت والوں سے خدا کا ذکر کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے عیش و عشرت میں خلل نہ ڈالو - اگر اُمرائے عظیم اور حکمائے فخیم کے سامنے خدا کا نام لیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ایسے ذکر کسی مفلس جاہلوں کے روبرو کرنا چاہیے - جب مفلس محنتی جاہلوں کے روبرو اس کا نام لیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں ”جن کو زمانے نے فرصت دی ہے اور جو اُس کو اچھی طرح سمجھتے اور جانتے ہیں اُن سے کہو -“

بنی آدم کا بڑا حصہ ہر قسم کا ایسا ہے کہ جو کام وہ کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کو دل سے جدا رکھتا ہے اور اپنی زندگی اس طرح بسر کرتا ہے کہ گویا خدا ہی نہیں - ایسے

آدمی بڑے احمق اور خارج از عقل ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ خدا کے خیال سے زیادہ کوئی چیز دل کو اطمینان اور تسلّی دینے والی نہیں۔
[تنبیہ: ہم نے اوپر جو لکھا ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد ان کے زبان سے کہنے سے نہیں ہے بلکہ ان کے کاموں کے کرنے[1] سے ہے]

۶- غم

ہمارے پاس غم کس کس رنگ سے آتا ہے اور کیا کیا رنگ اپنے دکھاتا ہے اور ہمارے بناتا ہے؟ کوئی بشر زندہ ایسا نہ ہوگا جو اس سے خالی ہو۔ جب محبوب دور ہو، مطلوب پاس نہ ہو، لذائذِ جسمانی، حرص، شہواتِ نفسانی کی ہوس پوری نہ ہوتی ہو، مرادیں بر نہ آتی ہوں، اِن سب صورتوں میں کاہشِ جان کے لیے غم ہمارے پاس موجود ہے۔ بعض خدا شناس جو عشقِ الٰہی کا غم رکھتے ہیں وہ اس کو محمود جانتے ہیں۔ ان کو دانائی اور نیکی کا لباس پنہا کے خوب صورت بناتے ہیں اور اس کا نام غمِ غم زدا رکھتے ہیں؛ یعنی ایسا غم جو دنیا کے تمام غموں سے آزاد کرتا ہے۔ مگر غم کوئی غم ہو، کسی بھیس میں ہو، وہ ہماری جان کا تکلیف دینے والا ہے، ہمارا دشمن ہے، ہم کو احمق اور سست بناتا ہے، ہماری نامردی اور کمینگی اور کم ظرفی ظاہر کرتا ہے۔

اپنے تئیں غم سے آزاد کرنا بڑی جواں مردی اور ثبات اور استقلال کا کام ہے۔ ہر شخص کا ظرف غم کی برداشت کا جدا جدا ہوتا ہے۔ بعض جواں مردوں کو غم پر غم واقع ہوتے ہیں،

۱- اصل: کہنے۔

صبر و استقلال سے ایک حد تک اُس کی برداشت کرتے ہیں ، مگر جب اِس حد سے پرے نوبت پہنچتی ہے تو وہ اضطرار اور اضطراب کے گرداب میں ڈوب جاتے ہیں ۔

ایک شاہِ ایران کا ذکر ہے کہ جب اس کو شاہِ مصر نے شکست دے کر قید کر لیا ، اُس کی بیٹی میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ، پانی کھینچنے کی ڈولچی ہاتھ میں لیے ہوئے قیدیوں کے ساتھ بندھی ہوئی اُس کی نگاہ کے روبرو گزری جس کے دیکھنے سے اس کے دوستوں کا کلیجا پھٹنے لگا اور وہ چِلّا چِلّا کر رونے لگے ۔ مگر اُس بادشاہ کے تیور نہ بدلے ۔ پھر اس کا بیٹا قتل گاہ میں قتل ہونے کے لیے آنکھوں کے سامنے سے گیا ۔ اس پر بھی آثارِ ملال چہرے پر ظاہر نہ ہوئے ۔ مگر جب اُس کے جانی دوست اور نوکر چاکر قتل کے لیے اس کی نگاہ کے سامنے سے گزرے تو پھر بے اختیار آٹھ آٹھ آنسو رونے لگا ، بال نوچنے ، چھاتی پیٹنے لگا ۔ سبب اس کا یہ تھا کہ غم کی برداشت کا ظرف پُر ہو گیا تھا ۔ اُس میں جگہ نہ تھی کہ اور غم سماتا ، اس لیے اس میں سے آنسو چھلکنے لگے ۔ جب اس سے لوگوں نے پوچھا کہ بیٹی کی خستہ حالی پر اور بیٹے کے مرنے پر تجھ کو رونا نہ آیا ، دوستوں کے قتل پر یہ پتلا حال کیوں ہوا ؟ تو اس نے کہا "وہ پہلے غم ایسے تھے جن کا اظہار آنسوؤں سے نہیں ہو سکتا تھا ۔ پچھلا الم ایسا تھا کہ آنسوؤں نے اس کو ظاہر کر دیا ۔"

چھوٹے چھوٹے غم تو اپنے بیان کرنے کی اجازت دیتے ہیں مگر بڑے بڑے غم تو ہم کو گونگا بنا دیتے ہیں ۔ جب وہ دفعۃً ہم پر ایسے واقع ہوتے ہیں کہ ان کا تحمّل ہمارے اختیار سے باہر ہوتا ہے ، اس سے سارے ہوش و حواس ہمارے باختہ ہو جاتے ہیں ۔

ایک سکتے کا عالم ہو جاتا ہے - یہ معلوم ہوتا ہے کہ روح جسم سے نکل گئی یا وہ کسی گہرے سوچ بچار کے دریا میں ڈوب گئی ہے -

غرض عجب حال ہوتا ہے کہ آنکھوں کے تلے اندھیرا چھا جاتا ہے ، پاؤں کے تلے کی زمین نکل جاتی ہے ، سارے بدن کی رگ رگ میں آگ لگی معلوم ہوتی ہے - ایسا غم زیادہ تر عشق کی حالت میں پیدا ہوتا ہے - یوں بھی جب کوئی خبر کسی عزیز کے مرنے کی یا کسی اور حادثۂ عظیم کی ہم سنتے ہیں تو اُس وقت ہمارے سارے قوائے عقلیہ معطّل ہو جاتے ہیں ، غم کے مارے ہم بُت بن جاتے ہیں - ہمارا چہرہ ایسا بگڑ جاتا ہے کہ کوئی مصوّر بھی اس کا نقشہ نہیں بنا سکتا ہے - جب ہم خوب رو چکتے ہیں تو دل اتنا ہلکا ہو جاتا ہے کہ کچھ غم کا حال بیان نہیں ہو سکتا ہے -

بعض واقعات یکایک ایسے غم آلودہ رونما ہوتے ہیں کہ ہم مر جاتے ہیں - عشق و محبت کی حکایتوں و روایتوں میں تم نے بارہا پڑھا ہوگا کہ عاشق کے پاس معشوق کے مرنے کی خبر آتے ہی اُس کا دم آخر ہو گیا - محبت وہ غضب کا جذبۂ انسانی ہے کہ شدّت کی حالت میں الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا - مگر ہاں خفّت کی حالت میں اس کا ذکر ہو سکتا ہے - جب معشوق عاشق کے سامنے ہوتا ہے تو عشق سارے ہوش و حواسِ عقل کو معطّل کر دیتا ہے - زبان گنگی ، کان بہرے ، آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں - غرض دردِ عشق کا غم وہ بلا کا ہوتا ہے کہ جس کا سہنا[۱] نہایت دشوار ہوتا ہے -

جیسا کہ غم کی ناگہانی خبر[۲] سننے سے انسان کا حال ہوتا ہے

۱- اصل : غم سہنا -   ۲- اصل میں لفظ "خبر" نہیں ہے -

کہ اوسان ٹھکانے نہیں رہتے ، اور کبھی جان نکل جاتی ہے ، اسی طرح خوشی کی خبر جو یکایک آتی ہے تو انسان ایسا بے خود ہو جاتا ہے کہ کوئی کام اُس وقت نہیں کر سکتا ، اور بعض وقت مر جاتا ہے جس کو شادی مرگ کہتے ہیں ۔

عاقل ، ہوشیار ، دانشمندوں کے دلوں پر نہ غم کا ایسا اثر ہو نہ شادی کا ۔ ان کے دلائلِ عقلیہ کا زور اِس شادی و غم کے جذبوں کو کمزور کر دیتا ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز اور حالت ایسی نہیں ہے کہ جس کے لیے غم و الم کا بار جان پر سوار کیا جائے ۔ اُن کی فرطِ نشاط اور قلّتِ حزن اس سبب سے رہتی ہے کہ وہ کسی چیز کے ساتھ ایسے دل بستہ نہیں ہوتے کہ اس کے فوت ہونے سے اندوہ گیں ہوں ۔ واقعاتِ ناگوار پر اضطرار و اضطراب کا اظہار زنانہ پن ہے یا کمینہ پن ہے یا حماقت ۔ تم اپنے تئیں اس برائی سے بچاؤ ۔ جب غم سامنے آئے تو جواں مردانہ اُس کا مقابلہ کر کے اپنے سامنے سے ہٹا دو ۔

۷۔ زمانۂ آیندہ کے افکارِ دنیوی

انسان بھی کیا خوش گزران ہوتا اگر اُس کی جان کے پیچھے زمانۂ آیندہ کے افکار کا عذاب نہ ہوتا ۔ کہتے ہیں کہ جو زمانۂ آیندہ کا فکر زیادہ رکھتا ہے وہی خوش کم رہتا ہے ۔ انسان پر بعض یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ اس کی نادانی اور غلطی ہے کہ وہ حال کی موجود نعمتوں سے متمتّع نہیں ہوتا اور ان پر قناعت نہیں کرتا اور یہ نہیں سمجھتا کہ جیسا زمانۂ گزشتہ میرے اختیار سے باہر ہے ، ایسے ہی زمانۂ آیندہ بھی میرے اقتدار سے پرے ہے ؛ اس امر کا نام غلطی و نادانی رکھو یا کچھ اور رکھو مگر وہ تو خدا نے ہی

مقتضائے طبع بنایا ہے - بھلا یہ کب ممکن ہے کہ ہم اپنے خوفوں، آمیدوں، خواہشوں سے ایسے الگ ہو جائیں کہ آیندہ کے افکار اور سوچ بچار کو چھوڑ بیٹھیں - ان سے تو مرنے کے پیچھے بھی چھٹکارا نہیں ہوتا - آیندہ زمانے کی فکریں جو کی جاتی ہیں، وہ دو طرح کی ہوتی ہیں: ایک حق و بجا، دوسری ناحق و فضول -

افلاطون[1] کی یہ نصیحت جو بار بار اس نے لکھی ہے: "تو اپنا کام کر اور اپنے تئیں پہچان" ایسی ہے کہ صرف آبِ زر سے ہی لکھنے کے لائق نہیں بلکہ دل پر نقش کالحجر بنانے کے لائق ہے - اگرچہ اس میں صرف سہ لفظی انشائیہ جملے دو ہیں - مگر انسان کے کل فرائضِ زندگی اس کے کسی ایک نہ ایک جملے سے متعلق ہیں - اس کے ایک جملے میں دوسرا جملہ شامل ہے - اس لیے کہ جو شخص صحیح اور درست اپنا کام کرے گا، وہ اول یہ سبق پڑھے گا کہ میں کیا ہوں اور کس لائق ہوں اور کیا کر سکتا ہوں، تو اس

۱- افلاطون: (۴۲۷ ق م — ۳۴۷ ق م) یہ سقراط کا شاگرد تھا - اس نے سقراط کے نظریات کو مرتّب کیا - ایتھنز میں ایک درس گاہ قائم کی جس کا نام "اکادمی" رکھا - اس کے مکالمات اور مکتوبات کو کئی کتابوں کی شکل دی گئی ہے - ان میں سے "جمہوریت" اور "بوطیقا" بہت مشہور ہیں - افلاطون کے نزدیک اعیان یا تصورات ہی حقیقی وجود رکھتے ہیں اور کائنات کی تمام اشیا انھی کی ناقص نقلیں ہیں - علامہ اقبال نے افلاطون کے نظریۂ اعیان پر سخت تنقید کی ہے اور کہا ہے:

راہبِ دیرینہ افلاطوں حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت — خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است — مردہ دل را عالمِ اعیاں خوش است

(اسرارِ خودی، صفحہ ۳۴)

سے وہ اپنے تئیں سمجھے گا اور[1] ضرور دوسرے کے کام میں ہاتھ ڈالنے کے اندر غلطی نہیں کرے گا۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے گا وہ سب سے زیادہ اپنے ہی سے محبت کرے گا، اپنی ترقی کرے گا اور کوئی فضول کام اپنے ذمے نہیں لے گا۔ تمام بے فائدہ خیالوں اور قضیوں سے احتراز کرے گا۔ غرض وہ آیندہ زمانے کے افکار اپنے پیچھے نہیں لگائے گا۔

نادانی اور دانائی میں بڑا فرق ہے۔ نادانی کی تمام آرزوئیں پوری ہوں تو بھی وہ مسرور نہیں کرتیں۔ زمانۂ آیندہ کی ادھیڑ بُن اس کو چلی جاتی ہے۔ دانائی، جو چیز بالفعل حاصل ہو، اس پر قناعت کرتی ہے اور راضی رہتی ہے۔ بعض آدمی عاقبت اندیشی اور آیندہ کے فکر کرنے کو کفر سمجھتے ہیں۔ انسان نے زمانۂ آیندہ کا فکر[2] اپنی حیات تک ہی نہیں کیا بلکہ اس کو اور آگے بھی وسعت دی ہے، اور اس کے واسطے یہ باتیں چاہتا ہے کہ میرے بعد میرا نام نیکی کے ساتھ یاد کیا جائے، کوئی بات میری یادگار باقی رہے۔ میری تجہیز و تکفین بڑی دھوم دھام سے ہو۔ نیک نامی کا بڑا خیال بادشاہوں اور امرا کو ہوتا ہے۔ تختِ سلطنت پر جو بادشاہ جلوہ افروز ہو، خواہ اچھا یا بُرا، سب کی برابر تعظیم اور اطاعت رعایا بظاہر کرتی ہے، کیونکہ یہ امور تو اس کے عہدے سے متعلق ہیں، کچھ اس کی ذات سے نہیں۔ مگر رعیت کے دل میں عزت و محبت ایسے بادشاہ کی ہوتی ہے کہ جو عادل ہو۔

بعض ملکوں میں رسم اچھی تھی کہ جب بادشاہ مرتا تو دفن

۱۔ اصل: تو۔
۲۔ اصل میں ''فقر'' ہے۔

کرنے کے وقت قبر پر اُس کی خوبیوں اور برائیوں کا اعلان کیا جاتا تاکہ اس کے قائم مقاموں کے لیے ایک عمدہ نصیحت ہو۔ برخلاف اس کے بعض ملکوں میں یہ بُری رسم ہے کہ سب بادشاہوں کی یکساں ماتم داری کی جاتی ہے اور کوئی اس کی بُرائی علی الاعلان نہیں بیان کر سکتا۔

بادشاہ کے خوشامدی درباریوں کا دستور ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی تعریف ایسی مبالغے سے کرتے ہیں کہ جس سے معلوم ہو کہ دنیا میں اور کوئی بادشاہ اس کے برابر نہیں۔ اور اگر کسی خاص رکنِ سلطنت پر بادشاہ کا کوئی خاص احسان ہے تو پھر وہ اس کو آسمان پر چڑھا دیتا ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ جب بادشاہ مرتا ہے تو بادشاہ اور رعایا کے درمیان فرماں روائی اور فرماں بری کا تعلق منقطع ہوتا ہے۔ اس لیے اصل حال جو بادشاہ کے اوصاف کا ہو وہ بیان کیا جائے کہ اُن سے رعایا کی آزادی پر کیا اثر ہوا، اس کی عدالت نے کیا کیا کام کیے، جس سے آئندہ ایک مثالِ عمدہ قائم مقام کے روبرو رہے۔

حکیم سولن[1] کا ایک مقولہ تھا کہ آدمی جب تک مرے نہیں اس کو خوش حال نہیں کہہ سکتے۔ اس پر ارسطو[2] نے یہ اور

۱۔ حکیم سولن: (Solon) یونان کے سات قدیم حکما میں سے ایک۔ اس نے اپنے اہلِ ملک کے لیے ایسے قوانین وضع کیے جن کی بدولت وہ بہت سے جابرانہ قیود سے آزاد ہوگئے۔ ۶۳۰ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۵۵۸ قبلِ مسیح میں وفات پائی۔ (مرتّب)

۲۔ ارسطو: (۳۸۴ ق م—۳۲۲ ق م) یونانِ قدیم کا مشہور فلسفی جو افلاطون کا شاگرد تھا۔ اس نے اپنے استاد کی تخیّل پرستی کے برخلاف

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

حاشیہ چڑھایا کہ اگر آدمی مر جائے اور بدنام ہو ، اس کی اولاد خراب و خستہ حال ہو ، تو کیا ایسے آدمی کو بھی ہم خوش حال کہہ سکتے ہیں ؟ نہیں - پس اس کے نزدیک سولن کا مقولہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم انسان کو خوش حال کبھی نہیں کہہ سکتے ، اگرچہ اس کی تمام دلی آرزوئیں زندگی میں بر آئی ہوں ، وہ مر بھی گیا ہو - انسان اس بات پر بھی مرتا ہے کہ آیندہ روزگار میں اس کی کوئی یادگار رہے ، اس کی صدہا حکایتیں اور روایتیں مشہور رہیں -

ایڈورڈ اول شاہِ انگلستان ، سکاٹ لینڈ کے بادشاہ رابرٹ سے جب لڑا اور ہر لڑائی میں میدان اس کے ہاتھ رہا تو اس نے اپنے بیٹے کو وصیّت کی کہ جب میں مر جاؤں تو میرا گوشت ابال کر ہڈیوں سے جدا کر لینا اور کہیں اس کو دفن کر دینا - اور ہڈیوں کو ، جب سکاٹ لینڈ والوں سے لڑنے جانا ، تو میدانِ جنگ میں ساتھ لے جانا کہ تم کو اس کی برکت و یُمن سے ہمیشہ فتح نصیب ہو - اسی طرح اور قوموں میں بھی بزرگوں کے تبرّکوں کی یادگاریں سپاہ کے ساتھ چلتی ہیں -

بعض آدمیوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہماری تجہیز و تکفین بڑی دھوم دھام سے ہو - وہ قبر اپنی بڑی کشادہ کھدواتے ہیں ، مقبرہ ذی شان بنواتے ہیں ، اس کے گرد باغ روح افزا لگواتے ہیں ،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

مشاہدے اور تجربے پر زور دیا - اپنی درس گاہ میں فلسفے اور ریاضی کے علاوہ حیاتیات اور نباتات جیسے طبیعی علوم کے شعبے بھی قائم کیے اور تجربہ و تحقیق کے لیے وافر مواد فراہم کیا - اس نے مختلف علوم کے بنیادی اصول مرتّب کیے اور کم و بیش ایک سو بیس کتابیں تصنیف کیں - (مرتّب)

اس میں رہنے کی حویلی سے بھی زیادہ روپیہ خرچ کرتے ہیں ، اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہاں ہمیشہ رہنا ہے -

ایک شخص کا ذکر ہے کہ وہ بستر پر حالتِ نزع میں پڑا تھا - جو دوست ذی رتبہ اس کی عیادت کو آتا اُس سے کہتا کہ میری دلی آرزو یہ ہے کہ آپ اپنے کنبے سمیت مجھے مٹّی دیں - برخلاف اس کے بعض آدمی جُز رس ، کفایت شعار ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنا روپیہ مرنے پر بھی نہیں چاہتے کہ ضائع ہو - وارثوں سے کہہ دیتے ہیں کہ کہیں تم ہم کو گڑھے میں دبا دینا ، زمانے کی رسم و رواج کے موافق ہماری عزاداری نہ کرنا - غرض امیر و غریب کو تھوڑا بہت اپنی تجہیز و تکفین کا خیال ہوتا ہے - بعض تو اپنی ماتم داری کے تمام مراتب اپنے وارثوں کو لکھا دیتے ہیں ، اس کے واسطے ایک سرمایے کی رقم جدا رکھ دیتے ہیں - یہ قبر و مقبرہ کا عظیم الشان بننا ، تجہیز و تکفین کا بڑی دھوم دھام سے ہونا البتہ زندوں کے لیے تو عزّت و تسلی کا سبب ہے مگر مُردوں کو تو اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا - جب جسم سے جان نکل گئی تو جسم اپنی غمخواری سے چھُوٹ گیا ، وہ کہیں پڑا رہے -

سقراط[۱] کا جب وقتِ مرگ قریب پہنچا تو کیٹو نے اس سے پوچھا کہ آپ کی تجہیز و تکفین کیوں کر ہو ؟ اس نے جواب دیا کہ جس طرح تمھاری مرضی ہو - اگر میں اس معاملے میں اپنی

۱- سقراط : (۴۶۸ ق م — ۳۹۹ ق م) یونانی فلسفی جو ایتھنز میں پیدا ہوا اور یہیں تعلیم حاصل کی - اس کی بیشتر تعلیمات اس کے شاگرد افلاطون کے ذریعے عام ہوئیں اور لوگوں تک پہنچیں - توہم پرستی اور جہالت کے خلاف جہاد کیا جس کے نتیجے میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور بالآخر حکامِ وقت نے اسے زہر پینے پر مجبور کر دیا - (مرتّب)

طبیعت کو آئندہ زمانے سے متعلق کروں تو میں اُن آدمیوں کا مقلّد ہوں جو اپنی زندگی میں بڑی خوشی اس میں سمجھتے ہیں کہ ان کی تجہیز و تکفین بڑی کرّوفر سے ہو۔ مقبرہ عالیشان بنے، وہ اپنے مُردہ چہرے کو سنگِ مرمر کے اندر دیکھیں۔ مبارک، سعادت مند وہ لوگ ہیں جو مردہ ہو کر زندہ رہتے ہیں اور اپنی بے حواسی کو حواس سے ادراک کر کے مسرور ہوتے ہیں۔

حکیم سینیکا[1] سے کسی شخص نے پوچھا تھا کہ مر کر کہاں جاؤ گے؟ تو اس نے جواب دیا ''وہاں جہاں وہ چیزیں ہیں کہ جو اب تک نہیں پیدا ہوئیں اور نہ وجود ان کا ہوگا۔''

۸- کاہلی

ہم دیکھتے ہیں کہ اگر زمین اُفتادہ[2] بے تردد کے مدت تک پڑی رہے اور اُس میں کچھ بویا جوتا نہ جائے تو وہ اپنی قوّتِ نمو سے اس بے تردد حالت میں سرسبز ہو جائے گی۔ ہزاروں طرح کی گھاس پھوس، جھاڑی بُوٹی پیدا کر دے گی جن سے انسان کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ زمینوں کا اصلی کام جو ہے اگر وہ لینا چاہیں تو اُن

۱- حکیم سینیکا : (Seneque) (۲ع—۶۶ع) رومن فلسفی جو قرطبہ (اندلس) میں پیدا ہوا۔ یہ رومن بادشاہ نیرو کا معلّم اور مؤدب تھا۔ جب تک حکیم سینیکا زندہ رہا، اس بادشاہ نے ظلم سے ہاتھ روکے رکھا۔ جب حکیم موصوف وفات پا گیا تو اس نے عیسائیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا یہاں تک کہ اپنی بیوی اور ماں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بالآخر ۶۸ عیسوی میں خود بھی نہایت بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔

۲- اصل : زمین افتادہ بے چین و تردد۔

کو جوتیں اور ان کو تیار کر کے بیج بوئیں جن کے پھل ہمارے کام آئیں۔ ایسے ہی ہم عورتوں کو دیکھتے ہیں کہ جب تک[1] وہ مرد سے آشنا نہیں ہوتیں تو گوشت کے لوتھڑے، بے جان اور بے ڈول وہ جنتی ہیں۔ اب اگر ان سے فطرت کے موافق کامل اولاد جنوانی چاہیں تو ایک اور قسم کا تخم ان کے اندر ڈالیں۔

پس بعینہ یہی حال انسان کے دلوں کا ہے کہ اگر ان کو خاص مطالعوں میں، جو ان کو مقیّد و پابستہ کر دیں، نہ لگاؤ تو وہ ہزاروں طرح کے بیہودہ خیالات میں دوڑتے ہیں۔ عالمِ خیالات میں، جس کی انتہا کہیں نہیں ہے، آوارہ و سرگرداں پڑے پھرتے ہیں۔ جیسے سورج چاند کا پرتو بھرے پانی کے برتن میں چاروں طرف پڑا پھرتا ہے، کبھی نیچے اتر گیا، کبھی اونچی چھت پر جا چمکا، اسی طرح دل ڈانواں ڈول رہتا ہے۔ اگر وہ کسی مقصد پر قائم نہیں ہوتا تو آوارہ و سرگرداں پھرتا ہے، کہیں اس کو قیام نہیں ہوتا۔ اس کا حال ایسا ہے جیسا کہتے ہیں کہ جو چیز سب جگہ رہتی ہے وہ کسی جگہ نہیں رہتی۔ وہ بیماروں کے سے خواب دیکھتا ہے جس سے نکمّے خیالات و تصوّرات پیدا ہوتے ہیں۔ جب مجھے کوئی کام نہیں ہوتا اور فرصت ملتی ہے تو اس فرصت میں طبیعت کے اندر بہت سے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ طبیعت کا حال ایسا ہو جاتا ہے جیسا اس گھوڑے کا جو باگ تڑا کر سوار کے تلے سے بھاگ جائے۔ وہ مطلق العنان ہو کر خود ایسا دوڑتا ہے کہ کوئی شہسوار اس کو اتنا تیز رو نہیں دوڑا سکتا۔ پس ایسی طبیعت کی جولانیاں خیالات کے عالم میں ہوتی ہیں جہاں سے اس کو ڈراونے، اوبہت خیالات بعد ایک دوسرے کے ذہن میں آتے ہیں۔ اگر ان کو لکھ لوں اور پھر

۱۔ اصل میں "جب تک" نہیں ہے۔

پڑھوں تو شرم کے مارے پسینے پسینے ہو جاؤں -

۹- جھوٹے آدمی

ایک ضرب المثل مشہور ہے کہ ''دروغ گو را حافظہ نباشد''۔ مگر عقل یہ کہتی ہے کہ جب آدمی کا حافظہ اچھا نہ ہو ، وہ جھوٹ کا بنج بیپار نہیں کر سکتا اور دروغ کو فروغ نہیں دے سکتا - خواہ اول صورت ہو یا دوسری ، دونوں میں جھوٹ اور حافظے میں ایک تعلق ہے - حافظہ ایسی قوت ہے جس کو افلاطون نے تمام قوائے عقلیہ کا دیوتا کہا ہے ؛ یعنی تمام ملکاتِ نفسانی کا رئیس ہے اور سب اس کے خادم ہیں - اہلِ فرانس کو جب کسی پرلے درجے کا کودن کہنا ہوتا ہے تو اس کو کہتے ہیں کہ وہ حافظہ نہیں رکھتا ہے - حافظے کے نہ ہونے سے آدمی کو اپنے وعدے یاد نہیں رہتے اور باتیں بھول جاتا ہے - ایک ہی کہانی کو بار بار اتنی دفعہ کہتا ہے کہ خواہ وہ کیسی دلچسپ ہو ، اس سے دل پھر جاتا ہے - ایک ہی کتاب خواہ کتنی دفعہ پڑھی ہو ، وہ اس کو ہر دفعہ نئی کتاب معلوم ہوتی ہے - ایک چیز کو خواہ کتنی دفعہ دیکھا ہو ، وہ اس کو انوکھی معلوم ہوتی ہے -

اب سنو کہ ایک جھوٹے تو وہ ہوتے ہیں کہ بات تو جھوٹ کہتے ہیں مگر وہ اپنے صدقِ دل سے اس کو سچا جانتے ہیں - دوسرے وہ جھوٹے ہیں کہ جھوٹی بات کہتے ہیں اور اس کو خود دل میں جھوٹ جانتے ہیں ، اور یہ چاہتے ہیں کہ اور لوگ اس کو سچ جانیں - ہم آگے اسی قسم کے جھوٹوں کا ذکر کرتے ہیں - ان جھوٹوں کی بھی دو قسمیں ہیں ؛ ایک یہ کہ اپنے دماغ سے ایک جھوٹی بات کو سر سے پاؤں تک تراش کر ایجاد اور اختراع کریں - دوسرے یہ کہ

ایک سچی حکایت کا بھیس بدل کر اپنے خیال کے موافق بدل بدل کر اس طرح بیان کریں کہ وہ جھوٹ ہو جائے ۔ اس صورت میں مشکل ہے کہ ان کا جھوٹ چھپا رہے اور کسی نہ کسی دن ان کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے ۔ اس لیے کہ جنھوں نے سچی حکایت کو جھوٹ بنایا ہے ، اس کی بنا راستی پر ہے جس کا نقشِ اول ان کے حافظے پر جما ہے اور جس کی بنیاد دل میں زیادہ مستحکم اور اُستوار ان کے اختراعی جھوٹ سے پڑی ہے ۔ قاعدہ ہے کہ سچ کی برابر جھوٹ کی بنیاد مستحکم نہیں ہو سکتی ۔ اس لیے ضرور ہے کہ ان کے دروغ میں راستی اپنا فروغ دکھائے اور جس سچ پر جھوٹا ملمع[1] چڑھایا ہے ، اس کی قلعی کھل جائے ، اور وہی راستی جو ان کے دل کے اندر دوڑ رہی ہے ، اُن کے ذہن سے اس اختراعی جھوٹ کو بُھلا دے ۔

دوسری صورت جس میں ایک جھوٹی بات کو نئے سر سے گھڑ کر اختراع کرتے ہیں ، اس کے متضاد کوئی سچی بات ایسی دل پر منقش نہیں ہوتی کہ وہ اس سے جنگِ زرگری کرے ۔ پہلی صورت میں تو سچ کو جھوٹا لباس پہنایا تھا ، اُس کا لباس اُتار کر اصل حقیقت کا دیکھ لینا آسان تھا ۔ مگر دوسری صورت میں جھوٹ کا پُتلا بنایا ہے ، یہاں جھوٹ کے پکڑے جانے کا خوف کم ہے ۔ مگر اس کے ساتھ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اگر حافظے میں اس پُتلے کے بنانے کی ترکیب خوب جانشیں نہیں ہے تو وہ ذہن سے نکل جائے گی ، پھر قلعی کھل جائے گی ۔

تم نے بہت سے آدمی دیکھے ہوں گے کہ وہ جیسا وقت اور

۱۔ اصل میں "طمع" غلط چھپا ہے ۔

موقع دیکھتے ہیں ، ویسی باتیں بنا دیتے ہیں ، کچھ جھوٹ سچ کا خیال نہیں کرتے ۔ ایک ہی معاملے میں ایک شخص سے کچھ کہہ دیتے ہیں ، اُس کی جانبِ مخالف سے کچھ اور فرما دیتے ہیں ۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں کوئی بات ایمان اور صداقت کے ساتھ متمکّن نہیں ہوتی ۔ فقط یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کی مرضی کے موافق باتیں بنا کے ان کا دل خوش کر دیں ۔ ایسی باتوں کے کرنے سے وہ اپنا نام صلح کُل رکھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں ۔ اگر کوئی شخص ان کی ساری باتوں کو ، جو ایک معاملے میں کرتے ہیں ، لکھ لے اور اس کو غور سے دیکھے تو معلوم ہوگا کہ ان کی باتیں کیسی فریب اور دغا سے بھری ہوئی ہیں ۔ جس کا نام انھوں نے صلح کُل رکھا ہے ، وہ سراسر نفاق ہے ۔ جب ایک آدمی کسی ایک ہی معاملے میں مختلف اوقات میں ، مختلف پیرایوں میں اظہارِ رائے کرتا ہے اور اصل حقیقت اس کے دل میں کچھ نہیں ہوتی ، تو ان سب کا یاد رکھنا حافظے کی قدرت سے باہر ہو جاتا ہے ، اس لیے وہ اپنی کہی ہوئی بات کو بھول جاتا ہے اور اس کی حقیقت کھل جاتی ہے ۔ اسی معنی کو کہا کرتے ہیں کہ ''دروغ گو را حافظہ نباشد'' ۔

سیدھی سادھی سچی باتوں میں جھوٹ بولنے کی برابر کوئی لعنت کی ماری ہوئی بُرائی نہیں ہے ۔ ہم انسانوں میں جو باہم رشتہ مندی ہے ، وہ فقط نُطق کے سبب سے ہے ۔ جب اِس نُطق میں کذب شامل ہو تو انسانوں کے باہمی تعلقات میں کوئی ایسی بات نہ ہوگی کہ جو فساد سے خالی ہو ۔ جن قوموں میں جھوٹ کا رواج ہو گیا ہے ، اُن میں کوئی بُرائی باقی نہیں جو نہ ہو ۔ یہ جھوٹ ، آگ اور تلوار سے زیادہ ان کا نقصان کر رہا ہے ۔

اکثر ماں باپ اپنے بچوں کو ان کی معصوم خطاؤں پر اور بے باک شوخیوں اور گستاخیوں پر خوب گوشمالی کرتے ہیں، مگر وہ یہ یاد رکھیں کہ بچوں کو صرف اِن دو قصوروں پر سزا دینی چاہیے ؛ ایک جھوٹ پر اور دوسری سرکشی پر۔ جب تک کہ اِن دونوں بُرائیوں سے ان کو وہ نہ چھٹائیں، سزا دینے سے ہاتھ کو نہ اٹھائیں۔ اگر جھوٹ کا چسکا اِس عمر میں زبان کو لگ گیا تو وہ بڑے ہونے پر اور بڑھے گا۔

بعض بھلے مانسوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ جھوٹ بولنے سننے کی بیماری ان کے پیچھے لگی ہوتی ہے۔ اپنے تشخّص[1] و تعلّی کی داستانیں نثر[2] میں ایسی ہی گھڑا کرتے ہیں جیسے کوئی شاعر اشعار میں جھوٹا مضمون گانٹھتا ہے۔ اگر یہ عیب ان میں نہ ہو تو پھر ان کے بے عیب ہونے میں کچھ شبہ نہیں رہتا۔

بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، مگر ہاں وہاں جہاں اُن کو کچھ فائدہ ہو۔ یہ بات زیادہ تر دکان داروں اور اہلِ پیشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سب طرح بھلے مانس ہوتے ہیں مگر اپنے پیشے میں اپنے فائدے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں۔ مثلاً دکاندار چیزوں کا بھاؤ جھوٹا بتلاتے ہیں، وکلاء مقدّمات جھوٹے لڑتے ہیں۔ ایسے جھوٹ کو نہ وہ خود بولنے والے بُرا جانتے ہیں، نہ اس کو لوگ برا سمجھتے ہیں۔

حکیم فیثاغورث[3] کی حکمت کا یہ مسئلہ ہے، جیسا کہ

۱۔ اصل میں ''اپنی تشخیص'' ہے۔
۲۔ اصل میں ہے ''روز نثر میں''۔
۳۔ حکیم فیثا غورث : (Pythagore) معروف یونانی حکیم۔ بچپن سے فلسفے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

''اخلاقِ جلالی[1]'' میں لکھا ہے کہ ہر فضیلت کی ایک حد معیّن ہے - جب اس سے تجاوز ہوگا ، خواہ افراط کی طرف خواہ تفریط کی طرف ، تو وہ فضیلت رذیلت بن جائے گی ، یعنی نیکی برائی ہو جائے گی - فضائل بمنزلۂ اوساط کے ہیں اور رذائل بمنزلۂ اطراف کے - دائرے کا مرکز معیّن ہوتا ہے اور محیط سے سب سے زیادہ وہی نقطہ بعید ہوتا ہے اور اور نقطے غیرمتناہی محیط سے قریب تر ہوتے ہیں - پس اسی طرح ہر فضیلت کے مقابل رذائل غیرمتناہی ہیں اور ایسے ہی طریقِ فضیلت پر چلنے کی استقامت خطِ مستقیم پر حرکت کرنے کے مشابہ ہے ، اس سے انحراف رذیلت ہے - دو نقطوں کے درمیان ایک ہی خطِ مستقیم ہوتا ہے ، اور خطوط غیر مستقیم غیر متناہی - پس استقامت طریق کمال پر ایک ہی نہج سے ہو سکتی ہے اور اس کے اطراف کے مناہج غیر متناہی - پس اگر جھوٹ کی صورت سچ کی طرح ایک ہی ہوتی تو جھوٹ سے سچ کا جان لینا کچھ مشکل نہ ہوتا - ہم اس کی صورتِ واحد کو معکوس کرکے

(بقیہ حاشیۂ گزشتہ صفحہ)

کی تعلیم پر مائل ہوا اور اس کی طلب میں مصر ، شام اور بابل تک کا سفر کیا - یہ تناسخِ ارواح کا قائل تھا - تقریباً ٦۰۰ قبل مسیح میں جزیرۂ ساموس میں وفات پائی -

۱- اخلاقِ جلالی : (۱۴۲٦ع-۱۵۰۱ع) یہ جلال الدین محمد دوانی کی مشہور کتاب ہے جو دوان (خازرون فارس) میں پیدا ہوئے - یہ مدرسۂ شیراز کے مدرس اور ایران کے قاضی تھے - فلسفۂ اخلاق اور ادب میں ان کی شرحیں مشہور ہیں - عربی زبان میں فلسفے اور تصوف پر انھوں نے متعدد رسائل قلم بند کیے - ان کی دوسری کتابوں میں ''رسالہ فی اثبات الواجب'' مشہور ہے جو بیشتر علوم کے مسائل کو محتوی ہے - یہ رسالہ انھوں نے سلطان محمود غزنوی کی خدمت میں پیش کیا تھا -

سچ معلوم کر لیتے ۔ مگر اصولِ مذکور کے موافق تو جھوٹ کی ہزاروں صورتیں ہیں ، اس لیے اس سے سچ کا دریافت کرنا بڑا مشکل ہے ۔ جھوٹ ایسی برائی ہے کہ خدا جھوٹ کے سائے سے بچائے ۔

ایک حکیم کا قول ہے کہ جو شخص ہماری زبان نہ جانتا ہو ، اس کی صحبت سے کتّے کی صحبت اچھی ہے ۔ غیر زبان کا آدمی صحبت میں آدمی کا قائم مقام نہیں ہو سکتا ہے ۔ ایسے ہی جھوٹے کی صحبت سے خاموش آدمی کی صحبت اچھی ہے ، بلکہ وہ جانوروں کی صحبت سے بدتر ہے ۔

۱۰- سپیچ یعنی تقریر

خدا ساری خوبیاں کسی انسان کو نہیں دیتا ہے ۔ ایسے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ کسی مقرّر کی تقریر میں ساری بلاغت و فصاحت کی خوبیاں نہیں ہوتیں ۔ ہم تقریریں دو قسم کے آدمیوں کی زیادہ تر سنتے ہیں ؛ ایک واعظین کی جو بازاروں میں کھڑے ہو کر یا ممبروں پر بیٹھ کر وعظ یا سنگھاسن پر براج کر کتھا سناتے ہیں ۔ دوسری وکلا کی جو سب قسم کی عدالتوں میں مقدمات کے اندر تقریریں کرتے ہیں ۔ کبھی کبھی مجالسِ قومی میں بھی ان دونوں قسم کے آدمیوں میں سے کسی کی یا کسی غیر آدمی کی تقریریں سنتے ہیں ۔ اب بعض مقرّروں کو تو یہ دیکھتے ہیں کہ اُن میں وہ بلا کا تقریر کا ملکہ ہوتا ہے کہ ہر وقت ہر موقع پر تقریر کرنے کو آمادہ ہیں ۔ ان کو کچھ تامّل کی ضرورت ہے ، نہ پہلے سے تیار ہونے کی حاجت ہے ۔ وہ بے تکلف تقریر کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ نہ ان کے چہرے پر کوئی تشویش ہوتی ہے ، نہ ان کی زبان میں لکنت ۔ نہایت خوش بیانی کے ساتھ تقریر شروع کرتے ہیں ، نہ کہیں بیچ میں

ٹھہرتے ہیں - یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا اُمڈا چلا آتا ہے جو کہیں نہیں رکتا -

دوسرے وہ مقرر ہیں کہ جب تک پہلے سے خوب سوچ بچار کر کے اور بہت محنت اور مشقّت اٹھا کر تیار نہ ہوں تو کوئی بول منہ سے نہیں نکال سکتے - پہلی قسم کی تقریر وکلا کی اور دوسری قسم کی واعظین کے لیے مناسبِ حال ہے - واعظین کو فرصت زیادہ رہتی ہے - اوقات اور مضامینِ وعظ متّعین ہوتے ہیں - ان میں کوئی امر خلل انداز نہیں ہوتا - پس ایسی صورت میں وہ فراغت سے اپنے وعظ کے لیے تقریر کو تیار کر سکتے ہیں - برخلاف اس کے وکلا کم فرصت ہوتے ہیں - ان کے کام کی قلّت اور کثرت کا وقت متّعین نہیں ہوتا اور عدالت کی فہرستِ مقدمات میں اُن کا نام چڑھا ہوتا ہے - وہ پہلے سے نہیں جانتے کہ طرفِ ثانی ہم پر کیا اعتراض کرے گا، ہماری اثبات کے رد کرنے میں کیا کیا دلائل لائے گا - اس لیے ضرور ہے کہ ان میں ذکاوتِ طبع[1]، سرعتِ فہم، انتقالِ ذہنی اور حاضر جوابی ایسی ہو کہ اُدھر طرفِ ثانی کے منہ سے اعتراض پورا نہ نکلنے پائے کہ ان کے ذہن میں اُس کا جواب آجائے - غرض جب تک وکیل میں یہ مادۂ تقریر نہ ہو، اُس پر یہ پیشہ نہیں پھبتا -

ہم اپنے ملک میں، اِس سبب سے کہ وکالت دولت کمانے کا بڑا ذریعہ ہے، جیسا وکلا کو تقریر میں بڑا زبردست وچست، صاحبِ علم و لیاقت دیکھتے ہیں، ایسا واعظین کو نہیں دیکھتے - ان کی تقریر میں رزانت و متانت کم ہوتی ہے - کوئی معقول اعتراض اُن پر ہوتا ہے تو جواب دینا مشکل پڑتا ہے - بہت محنت و مشقّت

۱- اصل میں صرف ''ذکاوت'' ہے -

سے اس کے جواب کو تیار کرتے ہیں۔ جیسے پانی اپنے دباؤ کے زور سے جلدی جلدی بوتل یا لوٹے کی ٹونٹی سے زیادہ نہیں نکل سکتا، اسی طرح تقریر ان کے منہ سے بہ نسبت تنگیِ ذکاوت کے نہیں نکل سکتی۔

بعض آدمیوں کا بیان جیسا صاف اور فصیح ہوتا ہے، ایسی تحریر نہیں۔ اگر کسی مضمون کو کہیں[1] تو مرغوبِ طبائع ہو اور لکھیں تو کسی کو پسند نہ آئے۔ بعض آدمیوں کی تقریروں میں چراغ کی سی چراند ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہی گرد پھیلتی ہے۔ بعض اوقات موقعے ایسے پیش آ جاتے ہیں کہ تقریر میں خود بخود بلاغت پیدا ہو جاتی ہے اور مقرّر کو خبر نہیں ہوتی کہ تقریر کے زور نے میرے منہ سے کیا نکلوا دیا۔

۱۱- تقریر میں فصاحت سے زیادہ طرزِ ادائے سخن و شیریں آوازی اثر پیدا کرتی ہے

بعض فصحا[2] اپنے الفاظ کے ساتھ وہ حرکاتِ خوش نما کرتے ہیں کہ بہروں کی سمجھ میں بھی[3] اُن کا مطلب آ جاتا ہے۔ فصاحتِ کلام بعض اوقات بدآوازی کے سبب سے خاک میں مل جاتی ہے۔ بعض فصحا کے کلام نے پہلے ہزاروں کے دلوں پر اثر کیا، اب وہ اثر نہیں کرتے تو اِس کا سبب یہ ہے کہ ہم اُس فصیح کی حرکات کو اُس کے کلام کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے، یعنی پوری نقل نہیں اُتار سکتے۔ فصاحتِ کلام کے ساتھ اس کا اندازِ بیان بھی ہو تو

۱- یعنی کسی مضمون کو پڑھیں تو مرغوبِ طبائع ہو۔
۲- اصل میں جملہ یوں تھا: "بعض فصحاء بلاغت کلام اپنے الفاظ کے ساتھ"۔
۳- "بھی" اضافۂ مرتّب۔

کلام کا اثر پورا ہو - غرض اول کلامِ فصیح کی لیاقت حاصل کرنی اور پھر اس کے ساتھ وہ حرکات کرنی کہ جس سے سامعین کے دل میں کلام سحر کا اثر کر جائے ، نہایت ہی مشکل ہے -

آدمی کو چاہیے کہ کلام کو اس خوبی سے ادا کرے کہ اس کے سننے میں پڑھنے سے زیادہ لطف آئے - جو کچھ زبان سے کہے ، اُس کی تصویر اپنی حرکات میں آتارتا جائے - افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں نہ ایسی تقریریں سننے میں آتی ہیں ، نہ اس کے ساتھ وہ حرکاتِ شیریں دیکھنے میں[1] کہ کلام کا اثر دلوں پر ایسا ہو کہ اس کے موافق اعمال سرزد ہونے لگیں - ہمارے ہاں سے اس فن کا رواج ہی آٹھ گیا ہے - شاید اس کے جاننے والے ڈھونڈنے سے دو چار ملیں گے -

۱۲- غیب دانی

اگر ہم زمانے کی تاریخ لے کر یہ لکھنا شروع کریں کہ انسان نے اپنی غیب دانی کے لیے کیا کیا علم مثل جفر و رمل ایجاد کیے ، کیسے کیسے فال نامے اور تعبیر نامے و جنتریاں و جنم پترے تصنیف کیے ، پرندوں کے اڑنے سے اور ان کے پر آکھیڑنے سے ، جانوروں کی زباں دانی سے ، ان کی قربانی سے ، ان کے خون سے ، ان کے دل اور جگر سے اور آور اعضا سے ، مُردوں کی روحوں سے کیا کیا شگون لیے ، آسمان پر ستاروں کے مقامات اور آور چیزیں اپنے لیے سعد و نحس ٹھہرائے ، تو رِم کے رِم کاغذ سیاہ ہوں اور مضمون ختم نہ ہو -

انسان زمانۂ ماضی کو جانتا ہے آنچہ گزشت گزشت - حال میں

۱- اصل میں ''دیکھتے ہیں'' ہے -

جو ہے اُس کے پیشِ نظر ہے۔ مگر استقبال کا حال معلوم نہیں کہ کیا ہوگا۔ اس لیے اس کے جاننے کا شائق نہایت اضطراب و اضطرار کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی لیے ہر زمانے میں غیب دانی کے علم اور طریقے ایجاد ہوتے رہے۔ ہمیشہ سے ان پر اعتقاد چلا آیا ہے اور سدا چلا جائے گا۔

اب ہم اپنے زمانے میں دیکھتے ہیں کہ ہزاروں آدمی اسی غیب دانی کی بدولت لاکھوں روپے کماتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جیسی اپنی پیشِ نظر چیزوں کو دیکھتے ہیں، ایسے ہی ہم اپنی ودیا کے بل سے استقبال کا غائب حال دیکھتے ہیں۔ انسان بھی کیا چیز ہے کہ ناحق یہ وبال استقبال کے حال جاننے کا اپنے پیچھے لگاتا ہے اور اس سے ناحق تکلیفیں اُٹھاتا ہے۔ آدمی وہی خوش رہتا ہے جو اپنی حالتِ موجودہ کو اچھا جانتا ہے۔ آیندہ کا خیال نہیں کرتا کہ کیا ہوگا۔ یہ سمجھتا ہے کہ آج خدا نے مجھے زندہ رکھا، اس سے کیا کام ہے کہ کل مطلع صاف ہوگا یا مکدّر۔ ہماری بہت سی کتابیں مضامینِ غیب دانی سے بھری پڑی ہیں جن کو ہم پڑھتے ہیں یا سنتے ہیں۔ روزمرہ ہماری صحبتوں میں ان کا چرچا رہتا ہے۔ بزرگوں سے انھی باتوں کو سنتے ہیں۔ کوئی علم نہیں سیکھتے کہ جس سے ان کو غلط جانیں۔ پھر ان سب سے بڑھ کر اپنا تجربہ بھی ہوتا ہے۔ جب اتنی باتیں موجود ہوں تو فقط سمجھانے سے ان جھوٹے خیالات کا دل سے اُٹھنا مشکل ہے۔

میں فقط اتنی بات تم سے کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ بڑا حکیم دانا ہے۔ اُس نے اپنی حکمتِ بالغہ سے عالمِ غیب کو ایسے گھیرے اور اندھیرے میں رکھا ہے کہ وہاں انسان کی عقل کی رسائی ناممکن ہے۔ یہ جو تم کہتے ہو کہ سینکڑوں آدمی موجود ہیں جو غیب

کی باتیں بتاتے ہیں ، وہ سچے ہوتے ہیں ۔ یہ محض تمھارے اعتقاد کی بات ہے کہ ان لوگوں کی ہزاروں باتیں جھوٹی ہوتی ہیں جن پر تم خیال نہیں کرتے ہو ، ان میں سے دو چار باتیں جو سچی ہوتی ہیں ، تم یاد رکھتے ہو ۔ ان کا تعجّب و حیرت کے ساتھ جابجا چرچا کرتے ہو ۔ سوائے اس کے ان کے اقوال متضاد ہوتے ہیں ۔ جب ایک کام کے لیے ان میں دو سے پوچھتے ہو تو ایک کہتا ہے کہ خاطر خواہ ہوگا ، دوسرا کہتا ہے کہ تم ناکام رہوگے ۔ ظاہر ہے کہ دو حال سے تمھارا کام خالی نہیں ہوگا ، اس لیے تمھارا اعتقاد ان میں سے کسی نہ کسی طرف راسخ ہوگا ۔

بعض اوقات آئندہ کا حال ایسی عبارت میں بتاتے ہیں کہ وہ تنگ و تاریک ہوتی ہے اور کئی معنی اُس کے ہو سکتے ہیں ۔ محقّقین نے تحقیق کر لیا ہے کہ یہ سارے کرشمے ان کے دھوکے اور فریب کے ہوتے ہیں ۔ ان کی دو چار باتوں کا سچا ہونا ایسا ہے جیسے کوئی شخص سارے دن بڑ ہانکا کرتا ہے ، ان میں سے دو تین باتیں سچی ہو جاتی ہیں ۔ ایک اناڑی آدمی چاند ماری پر سارے دن نشانے لگایا کرے ، اس میں سے دو چار ٹھیک لگ ہی جایا کرتے ہیں ۔ اگر تم یوں ہی اپنا حال لکھ لو کہ اس مہینے میں یہ واقعات ہم کو پیش آئیں گے تو ان میں سے بھی دو تین باتیں صحیح ہوں گی ، جیسے کسی جوتشی سے پوچھ کر لکھتے ۔

ایک میرے اُستاد ایسی باتوں کے معتقد نہ تھے ۔ ایک دفعہ اُنھوں نے شاگردوں کو لکھا دیا کہ جولائی کے مہینے میں فلاں فلاں تاریخ کو بارش ہوگی ۔ اتفاق سے انھی تاریخوں میں مینہ برسا ۔ تواریخ میں لکھا دیکھا ہے کہ کسی ہیئت داں کو نجومی سمجھ کر بادشاہ نے بلایا ۔ اُس سے کچھ سوال پوچھے ۔ جب اُس نے انکار کیا کہ

میں اپنے علمِ ہیئت سے آپ کے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتا تو بادشاہ نے اُس کو قید خانے میں بھجوا دیا ۔ جب اس نے دیکھا کہ میں ناحق مصیبت میں گرفتار ہوا تو اُس نے یوں ہی اناپ شناپ اٹکل پچّو بادشاہ کے سوالوں کا جواب لکھ کر بھجوا دیا ۔ اتفاق سے ساری باتیں اس کی سچ ہوئیں ۔ وہ لکھتا ہے کہ میں علمِ نجوم کو پہلے سے بھی غلط جانتا تھا ، اب اس کے غلط ہونے کا مجھے خود تجربہ ہو گیا ۔ اگر تم یہ ٹھہرا لو کہ جب ہم جوتی اُچھالیں اور وہ چت پڑے گی تو ہم اپنے کام میں کامیاب ہوں گے اور جب پٹ تو ناکام ۔ اس کے موافق تم کامیابی اور ناکامی لکھتے جاؤ تو اس کا حال ایسا پاؤ گے جیسے کوئی جوتشی ، رمّال یا فال گو تم کو بتلاتا ۔

۱۳- جو خدا کی قدرت کے قائل ہیں وہ ان ستارہ شناسوں کی ان باتوں کو ، جو ستاروں کا حساب لگا کر بتاتے ہیں ، کب یقین کرتے ہیں کہ اس سال وبا آئے گی ، اناج مہنگا ہوگا ، قحط پڑے گا ۔ احمق ہی یقین کریں گے کہ ستاروں کے مقامات سے زمین پر نحوست پھیلے گی ۔ نباتات بغیر ان کے حکم کے زمین سے سر نہ نکالیں گے ۔ عاقل تو یہ جانتا ہے کہ ستاروں سے پہلے خدا تعالیٰ نے نباتات پیدا کیے ہیں ۔ تم بھول کر بھی نجومیوں ، رمّالوں ، جفّر والوں ، فال گویوں ، خواب کی تعبیر دینے والوں کے پاس نہ جاؤ ۔ وہ خالی ابلہ فریب ، بے اصل ڈھکوسلے بناتے ہیں ، بھولے بھالوں کو دام میں پھنساتے ہیں ۔ تم سے چھ پیسے لے کر جب یہ مژدہ تم کو سنائیں کہ تمھارے ہاتھ بہت دولت آئے گی تو ان سے ہنس کر کہو کہ آج مہربانی فرما کر ہمارے چھ پیسے واپس کیجیے اور جب دولت آئے تو ساری آپ لے لیجیے ۔

۱۴- خوف

اس مضمون میں خوفِ الٰہی کا ذکر نہیں کروں گا ۔ نہ جاہل گنواروں کا خوف بیان کروں گا جو بھوت پلید ، چڑیلوں ، مُردوں کی ارواحوں کے چمٹنے سے اور جنّ و آسیب کے سر پر چڑھنے سے پیدا ہوتا ہے ۔ یہاں فقط اُس خوف کا بیان ہے جو انسان کو انسان ہونے کے سبب سے پیدا ہوتا ہے ۔ خوف بھی کیا حیرت انگیز اور تعجب خیز چیز ہے کہ کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ کون سی کہانیاں دبا دیتا ہے کہ جس سے سارے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ، وہ کون سا پھندا گلے میں ڈال دیتا ہے کہ ہماری آواز نہیں نکلتی اور نکلتی ہے تو لڑکھڑاتی ہوئی ۔ وہ کون سی کل چلا دیتا ہے کہ دل دہلنے ، چھاتی اچھلنے لگتی ہے ۔ وہ کون سا پمپ لگا دیتا ہے کہ آنکھوں سے ، اور کیا کہوں ، کہاں سے ، پانی بہنے لگتا ہے ۔ وہ کون سی جوکیں لگا دیتا ہے کہ خون ہمارا سوت کے چہرے کو ہلدی سا زرد بنا دیتی ہیں ۔ وہ کون سی آگ بدن میں لگا دیتا ہے کہ خون خشک ہو جاتا ہے ۔ وہ کون سی برف جسم پر چھڑک دیتا ہے کہ بدن پر لرزہ چڑھ آتا ہے ۔ وہ کون سے پر لگا دیتا ہے کہ میدانِ جنگ سے ہم پرندوں کی طرح اُڑ جاتے ہیں کہ دشمن کے ہاتھ نہیں آتے ۔ وہ کون سی میخیں ہمارے پاؤں میں جڑ دیتا ہے کہ پاؤں نہیں ہلا سکتے ۔ بِن ہاتھ پاؤں ہلائے اپنا سر دشمن کے ہاتھ سے کٹواتے ہیں ۔ وہ کون سا صدمہ دل و دماغ پر پہنچاتا ہے کہ عقل و ہوش نہیں رہتے ۔ باولوں کی طرح بھاگنے لگتے ہیں یا مُردہ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ خوف کی جلوہ گاہ رزم ہے ، وہاں وہ بڑے تماشے دکھاتا ہے ۔ سپاہیوں کا برا حال کرتا ہے ۔ چہرے

کا رنگ آن کا رنگ برنگ کا رنگتا ہے - بندوقوں کی آوازیں اور توپوں کی دھؤاں دھوں سے کسی کا دل دہلا جاتا ہے ، کسی کو تلواروں کی دمک ، تیروں کی چمک سے سہما جاتا ہے ، کسی کو گولوں کے آنے سے لڑکاتا ہے - کبھی میدانِ جنگ میں سپاہِ کثیر کو سپاہِ قلیل سے شکست دلاتا ہے - ایک دشمن کا دل دوسرے دشمن سے ہراتا ہے - بھاگنے میں بھی یہ اندیشہ پیچھے لگا رہتا ہے کہ معلوم نہیں اپنے ہی افسر کیا سلوک کریں - توپ کے منہ چھچھڑے اڑائیں ، جیل خانے میں بھجوائیں ، عورتوں کا لباس پہنا کر چکّی پسوائیں ، چرخا کتوائیں -

جب سپاہ دشمن کے خوف سے بھاگتی ہے تو اس کا عجب حال ہوتا ہے کہ نہتّی عورتیں ان کے ہتھیار رکھوا لیتی ہیں ، بچے ان کو روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں - سپاہی ایسے سٹپٹاتے ہیں کہ بھیڑوں کے گلے ان کو دشمن کے سوار نظر آتے ہیں اور سرکنڈوں کے درخت نیزے معلوم ہوتے ہیں اور جھاڑیاں برچھیاں دکھائی دیتی ہیں - دوست دشمن معلوم ہوتے ہیں - رات کو سوتے سوتے دشمن کے خوف سے چونک اٹھتے ہیں - مأمن میں بھی ایمن نہیں ہوتے - کبھی ایسے بدحواس ہو کر بھاگتے ہیں کہ کنویں سے بچ کر کھائی میں جا پڑتے ہیں - کبھی ہاتھ پاؤں ان کے ایسے پھول جاتے ہیں کہ اپنی جگہ سے تلواریں بھی سر پر پڑیں تو ہل نہیں سکتے - اس خوف سے خدا کی پناہ ہے - کوئی مصیبت اس سے زیادہ نہیں ہے - جن لوگوں کو اپنی جائداد کے جاتے رہنے کا ، غلام بننے کا ، غریب ہو جانے کا ، جلاوطن ہونے کا ، قید ہونے کا خوف لگا رہتا ہے ، ان کو دن کا کھانا ، رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے - وہ ہر وقت ایسے رنج و الم میں مبتلا ہوتے ہیں کہ جو حقیقت میں غلام ، غریب ، قیدی ، جلا وطن

ہیں ، وہ بھی کہیں زیادہ ان سے خوش رہتے ہیں ۔

۱۵۔ لڑائیوں میں جو احمق سپاہی ہوتے ہیں ، وہ پھر دوسرے روز میدانِ کارزار میں اپنے جوہر دشمن کے مقابلے میں دکھاتے ہیں ۔ مگر جن کے دل میں دشمن کا خوف بیٹھ جاتا ہے ، اُن سے دشمن کی طرف منہ بھی نہیں ہو سکتا ۔ بعض دفعہ جب آدمی کے پیچھے خوف بہت پڑتا ہے تو وہ اپنے تئیں ہلاک کر ڈالتا ہے ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خوف کی مصیبت موت کی آفت سے بھی زیادہ تکلیف دیتی ہے ۔ یہ ایک بڑا وسیع مضمون ہے کہ دنیا میں خوف کے سبب سے کن کن کارخانوں کا انتظام ہو رہا ہے ۔ اگر لڑکوں کو اُستاد کا ، رعایا کو بادشاہ کی سیاست کا ، سپاہ کو سپہ سالار کا ، شریروں کو حاکم کا ، اشرافوں کو اپنی عزت و آبرو کا خوف نہ ہو تو پھر انتظامِ ملکی کو دیکھو کیسا درہم برہم ہو جاتا ہے ۔

جہاں خوف نہیں ، وہاں اُمید نہیں ۔ معاملاتِ ملکی میں جہاں خوف آیا ، حماقت اس کے ساتھ آئی ۔ خوف ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے ۔ خوف ہی شرارت اور تکبّر کا بادشاہ ہے ۔ خوف ہی تمام برائیوں کا انجام ہے ۔ جس چیز سے خوف ہوتا ہے اُس سے نفرت ہوتی ہے ۔ خوف اگرچہ اندھا ہے ، مگر چالاک اور مضبوط بہت ہے ۔ اکثر وہ چھپا رہتا ہے ۔ بہادر کو موت وہ تکلیف نہیں دیتی جو نامرد کو خوف رنج پہنچاتا ہے ۔ خوف بالطبع ایجاد ، شجاعت ، سخاوت کا مانع ہے ۔ غلاموں کی قوم میں اور مشرقی سلطنتوں میں مشہور اور نیک نام ہونا خوف سے خالی نہیں ۔ جو شخص خوف نہیں رکھتا وہ دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتا ۔ خطا کی ٹیکس خوف ہے جو دل ادا کرتا ہے ۔ انسان خود بخود خوفوں کے آسیبوں کو سر پر چڑھاتا ہے ۔ ان کی بنیاد سوائے خیال کے اور کہیں نہیں ہوتی ۔ وہ ان کو بھوت پلید

کی طرح اپنے تئیں چمٹاتا ہے جن کا آثار مشکل ہے ۔ معلوم نہیں ہوتا کہ بھوت لپٹا ہے یا خالی خوف ہے ۔

۱۶۔ جب تک ہم مریں نہیں ، یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ ہم خوش حال ہیں یا بدحال

جس خجستہ فال کو عقل سے بہرہ ہے ، وہ یہ کہتا ہے کہ میں اپنے تئیں جب خوش نصیب و صاحبِ اقبال جانوں کہ میرا خاتمہ بالخیر ہو ۔ یہ جو کچھ مجھ کو جاہ و عزت و دولت حاصل ہے ، وہ اعتبار اور بھروسے کے قابل نہیں ۔ آج ہے کل نہیں ۔ زمانے کا رنگ یکساں رہتا نہیں اور ہزاروں بنتے اور بگڑتے ہیں ۔ تواریخ واقعات سے بھری پڑی ہیں کہ آج ایک شخص کے سر پر تاج تھا کہ کل وہ گھر گھر بھیک مانگنے لگا ، دشمن کی ٹھوکروں سے پائمال ہو گیا ۔ وہی شاہجہاں[1] جس نے برسوں کس جاہ و جلال کے ساتھ ہندوستان میں سلطنت کی ، وہ آخر عمر میں بیٹے کے ہاتھ میں گرفتار اور امورِ سلطنت میں بالکل ساقط الاختیار ہو گیا ۔ تواریخ میں دور کیوں جاؤ ، ایامِ غدر ۱۸۵۷ع[2] کا حال دیکھ لو کہ جو انگریز

۱۔ شاہجہان : ابن ابوالمظفر نور الدین محمد جہانگیر بن جلال الدین محمد اکبر بن نصیر الدین محمد ہمایوں بن ظہیر الدین محمد بابر بن عمر شیخ بن سلطان ابو سعید بن سلطان محمد بن (جلال الدین) میراں شاہ بن قطب الدین صاحبقراں امیر تیمور گورگان ۔ (ولادت ۱۰۰۰ھ مطابق ۱۵۹۰ع ۔ حکومت : ۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ مطابق ۱۶۲۷ تا ۱۶۵۷ع) ۔

۲۔ غدر ۱۸۵۷ع : مسلمانانِ ہند کی جدوجہدِ آزادی کا مشہور واقعہ جسے انگریز غدر کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ یہ سانحہ آخری مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر کے عہد میں رونما ہوا جس میں ہزار ہا مسلمانانِ ہند شہید ہوئے اور بیشتر مغل شہزادوں کو تہِ تیغ کر دیا گیا ۔ انگریز بھی اچھی خاصی تعداد میں قتل ہوئے تھے ۔

فرمانروا کچہریوں میں بیٹھے حکمرانی کر رہے تھے ، وہ چند گھنٹے میں اپنے ہی نوکروں کے ہاتھ میں مع اہل و عیال گرفتار ہو کر طرح طرح کی بلاؤں میں مبتلا ہوئے - پھر جب انگریزی سلطنت قائم ہوئی تو ہندوستانی پشتینی امیرزادے ، شہزادے ، راجے ، نواب گرفتار ہوئے - پھولوں کے ہاروں کی جگہ پھانسی کی رسّی گلے کا ہار ہوئی - کیا گھوڑے بگھیوں میں سوار ہوتے تھے یا اوندھے منہ مردہ کرانچی میں پڑے ہیں - نہ گور ہے ، نہ کفن ہے - کھیتوں میں ڈلاؤ کی طرح پڑے سڑتے ہیں - اگر پھانسی کی رسّی سے بچے تو جیل خانے میں لوہے کی بیڑیاں نازک پاؤں میں پہنی پڑیں ، چکیاں نرم ہاتھوں سے پیسنی پڑیں - ایک پرانی حکایت چلی آتی ہے جس کے سبب سے حکیم سولن کا یہ مقولہ مشہور ہوا کہ ہماری خوش حالی کا فیصلہ ، جب تک ہم مرتے نہیں ، آدمی نہیں کر سکتے -

۱۷- **حکایت :** جب شاہ کریسیس کو سائی رس نے گرفتار کیا اور قتل کا حکم دیا تو وہ قتل گاہ کو چلا - راہ میں وہ سولن سولن چِلّایا - سائی رس کو اس کی خبر فوراً پہنچی - اس نے کریسس سے سبب اس کا پچھوایا تو یہ جواب پایا کہ سولن نے مجھے یہ سبق سکھایا تھا جس کو آج میں نے پڑھا کہ آدمی خواہ کیسا ہی خوش اقبال فی الحال ہو مگر جب تک اِس دنیا سے انتقال نہ ہو ، ہم اس کو خوش حال نہیں کہہ سکتے ، کیونکہ انسان کے حال میں ایسے انقلاب غیر متوقع واقع ہوتے ہیں کہ جن کا پہلے سے سان و گمان بھی نہیں ہوتا - سب کچھ بات کی بات میں ہی بدل جاتا ہے - اقبال کو ادبار بننے میں کچھ دیر نہیں لگتی - جیسے عماراتِ عالی شان کے طوفانِ بادوباراں دشمن ہیں کہ ہمیشہ ان کی بیخ کنی کے درپے رہتے ہیں ، ایسے ہی کوئی قوت مخفی ہے کہ انسان کی امارت و عزت و شان کی دشمن

ہے کہ ہمیشہ اس کے گھٹانے اور مٹانے کے درپے رہتی ہے - اقبال جو مدتوں میں عزّ و جاہ کے سامان جمع کرتا ہے ، وہ ذرا سی دیر میں اس کو برباد کر دیتی ہے - آناً فاناً میں پاؤں میں زنجیرِ طلائی کو اور گردن میں طوقِ زریں کو آہن بنا دیتی ہے - برسوں کی کمائی کو ایک دن میں آگ لگا کر خاک بنا دیتی ہے - تم یہ نہ سمجھنا کہ یہ سولن کا مقولہ انھی اقبال مندوں سے متعلق ہے جو دنیا کی دولت و حشمت و شان و شوکت رکھتے ہیں - نہیں ، وہ اُن بزرگوں سے بھی متعلق ہے جو دنیا کی دولت پر لات مارتے ہیں اور اس کے آنے کی نہ خوشی کرتے ہیں ، نہ جانے کا غم ، نفسِ مطمئنہ سے کام رکھتے ہیں - وہ بھی بعض دفعہ موت کے وقت ایسے بھک جاتے ہیں کہ ساری ریاضت و عبادت ان کی کی کرائی اکارت جاتی ہے -

مرنے کا وقت سب وقتوں سے زیادہ نازک ہوتا ہے - انسان کی زندگی کی کسوٹی یہی دن ہوتا ہے کہ آدمی نرا آدمی رہ جاتا ہے - سارا لباسِ ظاہری اتر جاتا ہے ، عریاں رہ جاتا ہے - جو دل کے اندر اُس کی بات ہوتی ہے ، وہ باہر آتی ہے - جو بات وہ کہتا ہے ، زبان سے نہیں کہتا بلکہ دل سے - جن باتوں کو برسوں چھپائے رکھتا ہے ، وہ ان کو آپ ظاہر کیے بغیر نہیں رہتا - بعض آدمی جن کو سب نیک جانتے تھے ، مرتے وقت وہ خباثتیں اپنی ظاہر کرتے ہیں کہ پھر کوئی ان کو نیک نہیں کہتا - برخلاف اس کے بعض آدمی مرتے وقت وہ خوبیاں ظاہر کرتے ہیں کہ زندگی میں جن باتوں میں بدنام تھے ان کو مٹا دیتے ہیں - خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کا خاتمہ بالخیر جب ہو جائے تو یہ جانیں کہ وہ بڑا خوش اقبال اور صاحبِ نصیب تھا -

بعض عاقلوں نے اس مضمون کو یہاں تک بڑھایا ہے کہ وہ

مرنے کے بعد بھی کسی کو خوش اقبال جب تک نہیں کہتے کہ اس کا نام نیکی کے ساتھ زندہ نہ رہے - مرنے کے بعد بعض آدمیوں کے وہ کرتوت اور کوتک کھلتے ہیں کہ جس سے کوئی ان کا نام تعظیم کے ساتھ نہیں لیتا ، وہ بھی خوش اقبال نہین ہوتے -

۱۸- ایک آدمی کا نفع دوسرے آدمی کے نقصان یا خرچ سے زیادہ ہوتا ہے

پیشہ ور جن کا پیشہ آدمیوں کی تجہیز و تکفین سے متعلق ہے ، جیسے گورکَن[۱] ، مہا برہمن[۲] ، غسّال[۳] ، کفن‌دوز[۴] ، یہ سب حقارت سے دیکھے جاتے ہیں - ان کی منفعت آدمیوں کے مرنے پر موقوف ہے - اس لیے وہ بدخواہِ خلائق سمجھے جاتے ہیں اور ان کی کمائی کو بے برکت کہتے ہیں - لیکن اگر انصاف سے دیکھو تو جو الزام ان کی منفعت پر لگتا ہے ، وہ علی العموم سب کی منفعت پر عائد ہو سکتا ہے - دنیا میں کسی کو کوئی سود ایسا نہیں حاصل ہوتا کہ جس میں دوسرے کا زیان یا حرج نہ ہوتا ہو - سوداگروں کا نفع مُسرفوں سے ، زراعت پیشوں کا فائدہ اناج کی گرانی سے ، معماروں کی منفعت مکانوں کے گرنے سے ، وکیلوں و ججوں کا نفع ناحق کے باہمی قضایا و فسادوں کی نالشوں سے ، مذہبی پیشواؤں کو منفعت عصیاں کاری اور موت سے ، حکیموں (جو اپنے دوست کی صحّت سے بھی خوش نہیں ہوتے) کو فائدہ بیماروں کی کثرت

۱- گورکَن : قبر کھودنے والا -

۲- مہا برہمن : بڑا برہمن ، اچارج ، مُردوں کی کریا کرم کرنے والا ، یعنی ہندوؤں کے مُردے جلانے والا -

۳- غسّال : میت کو غسل دینے والا - ۴- کفن دوز : کفن سینے والا -

سے ، سپاہیوں کو (جو اپنے ملک کے امن سے بھی خوش نہیں رہتے) جنگ و پیکار سے حاصل ہوتا ہے - ہر شخص اپنے دل میں سوچ لے کہ کوئی نفع مجھ کو نہیں حاصل ہوتا ہے جس میں دوسرے کا خرچ یا نقصان نہیں ہوتا - یہ تو نیچر کا کلّیہ قاعدہ ہے کہ جب تک ایک چیز فنا نہ ہو ، دوسری چیز پیدا نہیں ہوتی - غذا نشوونما نہیں پاتی - جب تک وہ دوسری چیز کو تحلیل و فنا نہیں کرتی - جب کوئی چیز اپنی حد سے پرے نکل کر بدلتی ہے تو اس کی صورتِ سابق فنا ہو جاتی ہے - ایک کی فنا میں دوسرے کی بقا ہے - ایک کے فائدے میں دوسرے کا زیان ہے -

۱۹- عادات و رسم و رواج

عادت کا مادہ 'عود' ہے جس کے معنی پھر آنے کے ہیں - پس جس چیز پر آدمی پھر کر بار بار آتا ہے ، اسے عادت کہتے ہیں - عادت کا قانون وہ ہے کہ جس کو ہم نے ایسا مان رکھا ہے کہ اس میں تبدیلی کرنی آسان نہیں بلکہ نہایت مشکل ہے -

عادت کی معلّمی و کارفرمائی : عادت انسان کی بڑی معلّم اور کارفرما ہے - وہ اپنی معلّمی اور کارفرمائی کے کاموں کے کرنے میں بڑی متفنّنی ہے - اپنے کام کی ابتدا ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے سہج سہج شروع کرتی ہے کہ جن پر کسی کی نظر نہیں پڑتی ہے - وہ بہت ہولے ہولے اپنے قدم رکھتی ہے کہ کسی کو اس کے آنے کی خبر نہیں ہوتی - اس کے آگے بڑھانے میں زمانہ معاون ہوتا ہے - رفتہ رفتہ منزلِ مقصود پر اس کے قدموں کو پہنچا دیتی ہے - پھر وہ اپنے چہرے سے نقاب اٹھا لیتی ہے - غالب ، جابر ، قہرمان کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور انسان کی تمام قوتوں سے کہتی ہے

کہ اگر کسی میں بوتہ بل ہو تو میرے سامنے آ جائے - کسی میں مقابلہ کرنے کا یارا تو کیا ، یہ مقدور بھی نہیں ہوتا کہ اس کے سامنے آنکھیں کرے - سر جھکا کر اُس کی قدرت کو تسلیم کر لیتے ہیں - نیچے ایک مثال لکھتے ہیں جس سے اوپر کے بیان کی توضیح ہوتی ہے : کہ ایک گنوار کے گھر میں گائے نے بچھڑا دیا - اس کی لڑکی نے بچھڑے کو کاندھے پر چڑھا کر روز پھرانا شروع کیا - ایک مدت کے بعد لڑکی جوان ہوئی ، بچھڑا سانڈ ہو گیا - اسے جوانی میں گردن پر لیے اس طرح وہ پھرتی جس طرح لڑکپن میں - دیکھا ! عادت نے کیا بیل کو ہلکا بنا دیا ہے کہ اس طرح لیے پھرتی تھی -

۲۰- غذا میں عادت کو بڑا دخل ہے

طبابت کی کتابوں میں کھانے پینے ، سونے جاگنے اور سب کاموں کے واسطے ہدایتیں لکھی ہیں - مگر ان سب ہدایتوں پر عادت غالب رہتی ہے - اگر طبیب لکھے کہ فلاں چیز کھانی زہر ہے تو عادت اس کو جھوٹا کر کے دکھا دیتی ہے کہ دیکھو میں زہر کھلا کر کیسا اس کو جیتا جاگتا رکھتی ہوں - سنکھیا زہرِ قاتل ہے مگر عادت اس کو غذا بنا دیتی ہے - تم نے بعض آدمی دیکھے ہوں گے کہ سیروں سنکھیا کھا جاتے ہیں - ایک بادشاہ نے سوائے زہروں کے کچھ اور کھایا نہیں - ایک عورت ساری عمر صرف مکڑیاں کھایا کی - بہت سی قومیں مختلف اقالیم میں رہتی ہیں کہ جن کی غذا وہ اشیا ہیں جن میں سے ہر ایک کو ہم زہر سمجھتے ہیں - اگر ایک وقت ہم ان کے ساتھ کھائیں تو کھا کر پھر پانی نہ مانگیں ، طعمۂ اجل ہو جائیں - کنجڑوں کو دیکھو کہ کیا کیا زہریلے جانور پکا

پکا کر مزے سے کھاتے ہیں ؛ موسل ، سانڈے ، بِسکھپرے ، گوہیں ، سانپ وغیرہ - بعض قومیں وہ ہیں کہ وہ ہماری غذا کو زہر جانتی ہیں - جس طرح ہم گوشت اناج وغیرہ کو کھاتے ہیں ، اگر وہ کھائیں تو فوراً مر جائیں -

۲۱- عادت حواس کو بیوقوف بناتی ہے اور احساس موقوف کرتی ہے

عادت موسم کی سختیوں سے بے حس کر دیتی ہے - شکاریوں کو دیکھو کہ وہ بعض جگہ ساری ساری رات برف میں اور بعض جگہ پہاڑوں پر تمام دن دھوپ میں پڑے رہتے ہیں مگر اُن کے بدن کو خبر نہیں ہوتی - گھونسے لڑنے والے گھونسوں سے کچھ ایذا نہیں پاتے - ایک چیز خواہ کیسی ہی تعجب خیز ہو ، اگر اس کے دیکھنے کی عادت ہو جائے تو وہ پھر کچھ تعجب نہیں پیدا کرتی - دریاؤں کے آبشار اس زور شور کی آواز سے گرتے ہیں کہ کانوں کے پردے پھٹے جاتے ہیں - اہلِ مصر کو جو اس کے سننے کی عادت ہو گئی ہے ، تو اس آواز کا احساس اُن کے کانوں پر نہیں ہوتا - اسی پر قیاس کر کے فیثاغورث[1] نے یہ ایک مسئلہ بے سُرا گھڑا تھا کہ

۱- فیثا غورث : یونانی حکیم - تقریباً ۶۰۰ قبل مسیح میں وفات پائی - جب حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام کے اصحاب شام سے مصر میں آئے تو اس نے حکمت سیکھی - علم ہندسہ یہ پہلے ہی مصریوں سے سیکھ چکا تھا - مشہور ہے کہ علمِ ہندسہ یونان میں فیثاغورث کی وساطت سے پہنچا - فیثا غورث موسیقی کا بھی موجد تھا - اس نے نغموں کو عددی ہندسوں سے متوازن بنایا تھا - وہ کہا کرتا تھا کہ میں نے یہ روشنی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

آسمانی مجسّم کرّے باہم ملصق[1] ہیں اور وہ آپس میں رگڑتے ہیں کہ جن سے اصواتِ موسیقیہ پیدا ہوتی ہیں ، اور ان میں ایسے تال سُر ہوتے ہیں کہ جن پر ستارے ناچتے ہیں - یہاں زمین پر جو ہم کو اُن کی آواز نہیں سنائی دیتی ، اُس کا سبب یہ ہے کہ وہ بڑے زور شور سے ہمیشہ نکلتی رہتی ہے کہ اس کا احساس ہمارے کانوں میں ایسا ہی نہیں ہوتا جیسا مصر کے آبشاروں کی آواز کا اہلِ مصر کے کانوں کو - لُہاروں ، ٹھٹیروں ، چکی پیسنے والوں کے کانوں پر اُن کے کاموں کی آوازیں اپنا اثر کرتیں تو وہ بہرے ہو جاتے - مگر عادت ان آوازوں کا احساس کانوں پر نہیں ہونے دیتی - ریل گاڑیوں کے چلنے کی گھڑگھڑاہٹ کی آواز ہوتی ہے - مندروں اور گرجاؤں میں گھنٹے کس زور شور سے بجتے ہیں - ان کے آس پاس جو لوگ رہتے ہیں ، ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ ان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ کب گاڑیاں آئیں اور کہاں گھنٹے بجے - باوجودیکہ یہ گاڑیاں نہ مسلسل آتی ہیں ، نہ گھنٹے برابر بجتے ہیں - ان کے آنے اور بجنے میں ایک وقفہ اور عرصہ ہوتا ہے مگر یہ عرصہ و وقفہ کچھ عادت میں خلل نہیں ڈالتا بلکہ خود اس میں داخل ہوتا ہے - ہم اپنے کپڑوں کو عطر میں بساتے ہیں تو دو تین روز تک تو ان کی خوشبو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

چراغِ نبوت سے حاصل کی ہے - ترتیبِ عالم اور خواصِ اعداد کے متعلق اس نے عجیب و غریب انکشافات کیے - یومِ آخرت کے متعلق وہ کہا کرتا تھا کہ اس مادی عالم سے آگے ایک لطیف روحانی و نورانی دنیا ہے جہاں صرف ایسے لوگوں کی رسائی ہو سکتی ہے جو تمام عیوب سے پاک ہوں گے -

۱- مُلصق : ملے ہوئے -

ہمارے ناک تک آتی ہے مگر پھر عادت قوتِ شامہ کو اس کا احساس نہیں ہونے دیتی - ہماری خوشبو سے اور لوگ اپنا دماغ معطّر کرتے ہیں ، وہ ہم کو محسوس نہیں ہوتی -

۲۲- عادت کے باب میں افلاطون کی رائے

لٹّوؤں سے ایک لڑکا کھیل رہا تھا - افلاطون[1] نے بہت سخت سست اس کو کہا - اس پر لڑکے نے کہا کہ جناب ! کیوں ایسی ذرا سی بات پر اتنا گُھرکتے جھڑکتے ہیں ؟ افلاطون نے کہا کہ اس کو ذرا سی بات سمجھنا تیری غلطی ہے - کوئی عادت چھوٹی بات نہیں ہوتی - انسانوں میں جو بڑی بڑی برائیاں ہم دیکھتے ہیں ، ان کی ابتدا چھوٹی عمر میں ایسی ہی ذرا ذرا سی باتوں کی طرف میلان سے ہوتی ہے - اس لیے بچوں کی تادیب کا آغاز ماں کی گود سے ہونا چاہیے - وہ مائیں بڑی خطا پر ہیں جو اپنے بچوں کی ایسی شوخیوں سے خوش ہوتی ہیں کہ انھوں نے کتّے کے تاک کر پتّھر مارا ، بلی کے ایک ڈنڈا جمایا ، مرغی کے بچے کی گردن مروڑ دی - وہ باپ بڑا احمق ہے جو اپنے لڑکے کے دلیر اور دلاور ہونے کی نشانیاں یہ سمجھتا ہے کہ وہ لوگوں سے ہیکڑی سے بولتا ہے ، لوگوں کے بُرے بُرے نام لے کر پکارتا ہے ، غریب نوکروں کے لڑکوں کو دبا لیتا ہے ، جو لحاظ کے سبب سے اس سے نہیں بول سکتے - یا وہ ذکاوت اور ذہانت کی علامت اپنے لڑکے میں یہ جانیں کہ وہ اپنے ساتھ کے کھیلنے والوں کو خوب فریب دیتا ہے اور ان سے چالیں

۱- افلاطون : مشہور یونانی فلسفی جو سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا - (۴۲۷ ق م—۳۴۷ ق م) -

چلتا ہے - ان کو یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ یہ باتیں ظلم و ستم، دغا فریب کے درختوں کے بیج ہیں، جن کو عادت نشوونما دے کر بڑا تناور درخت بنائے گی اور اس کے زہریلے پھل چکھائے گی - اس کو بڑی کم بختی سمجھو جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بچوں کو ایسی چھوٹی چھوٹی ُبری باتوں سے کیوں روکیں، وہ بڑے ہونے پر خود چھوڑ دیں گے - ان کو خوب یاد رکھنا چاہیے کہ جو بچپنے میں چٹیوں یا کوڑیوں سے جؤا کھیلتا ہے، وہ بڑے ہونے پر روپیوں سے جؤا کیوں نہ کھیلے گا - جو آج الائچیوں سے بازیاں بدتے ہیں، وہ روپیوں سے کیوں نہ بدیں گے -

بچوں کی تادیب اول ہی سے ایسی ہونی چاہیے کہ ان کے دل میں برائیوں سے نفرتِ قلبی ہو جائے - برائیوں کی جو قدرتی مکروہ صورت ہے، وہ ان کے سامنے اس طرح لائی جائے کہ وہ اس کے خیال سے بھاگنے لگیں - خواہ وہ کیسی ہی خوبصورت بن کر آئیں مگر یہ ان کو منہ نہ لگائیں، بلکہ دل میں ان کا تصوّر بھی نہ لائیں - لڑکے جو کھیل کھیلیں، اُن میں وہ چیند نہ کریں - بچوں کا اخلاق ان کھیلوں ہی میں دیکھا جاتا ہے - وہی ان کے سنجیدہ کام ہوتے ہیں - جن لڑکوں کی تادیب اچھی ہوتی ہے، کھیل کے اندر ان کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ کوئی چھل فریب کریں، چیند کر کے بازی جیتیں - جو لڑکے کھیل میں چیند کرتے ہیں، وہ بڑے ہونے پر معاملات میں دغا فریب ضرور کرتے ہیں - غرض جو گناہِ صغیرہ کو حقیر جانتے ہیں، وہ گناہِ کبیرہ کرنے لگتے ہیں -

۲۳- عادت ایک اعضا کے کام دوسرے اعضا سے لے سکتی ہے

بعض آدمی ایسے دیکھنے میں آتے ہیں کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے بعض اعضا لے کر نہیں نکلتے - مگر اعضاے معدوم کا کام اعضاے موجود کو عادت نے سکھا دیا - ایک شخص کا ذکر ہے کہ وہ بِن ہاتھوں کے پیدا ہوا تو وہ ہاتھوں کے سارے کام پاؤں سے کرتا تھا اور ان پیروں کو اپنے ہاتھ کہتا تھا - ان سے وہ سیتا تھا، سوئی پروتا تھا، کپڑا قطع کرتا تھا، چوسر گنجفہ[1] کھیلتا تھا، پستول چھوڑتا تھا، ٹوپی اوڑھ لیتا تھا، بالوں میں کنگھی کر لیتا تھا - یہ سارے کام وہ ایسی پُھرتی سے کرتا تھا جیسے کہ اور آدمی ہاتھوں سے کرتے ہیں - یہ اپنے کرتب جابجا دکھاتا پھرتا تھا - جب کوئی اس کو کچھ دیتا تھا تو وہ پاؤں سے اس کو ایسا لپک لیتا تھا جیسے کہ ہم ہاتھوں سے لپکتے ہیں -

ایک اور شخص بِن ہاتھوں کے پیدا ہوا جو اپنی گردن اور کندھوں سے دو دھاری تلوار چلاتا تھا، جس کو وہ ہوا میں اُچھال دیتا تھا اور پھر لپک لیتا تھا - خنجر مار دیتا تھا، کوڑا ایسا ہی لگاتا تھا جیسا کوئی کوچوان مارتا ہے -

۲۴- اعتقادات اور عقلی احکام پر عادت کا سبقت لے جانا

جب عادت کا مقابلہ ضعیف ہو جاتا ہے تو وہ دل پر اپنے خوب

۱- گنجفہ : فارسی میں ''گنجیفہ'' بھی ہے - اُردو میں فصحا کی زبانوں پر گنجفہ ہی ہے — ایک کھیل کا نام جو تاش کی طرح کھیلا جاتا ہے :

نام کو بھی کوئی محتاج نہیں دنیا میں
گنجفہ کھیلیں تو آتی نہیں بازی نادار (نوراللغات)

خوب نقش جماتی ہے اور یہ نقش بہت دل کھول کر اپنے اثر دکھاتے ہیں - اعتقادات اور عقلی ارادوں اور عزموں کی گردن پر عادت سوار ہوتی ہے - جدھر چاہتی ہے، آدھر لے جاتی ہے - بڑی بڑی قوموں اور سمجھ دار آدمیوں کو جیسی عادت احمق بناتی ہے، ایسی کوئی رائے وہمی، خیالی[1] نہیں بناتی، مگر ہاں مذہبی مکاریاں اس سے مستثنیٰ ہیں - جہاں دنیا میں عادت کا بس چلا، وہاں وہ خود آئین و قوانین بن گئی - عقلِ انسانی کی رسائی اس تک نہیں ہو سکتی اور مذہبی روشنی اس کی تاریکی کو دور نہیں کر سکتی - اسی لیے یہ فیصلہ میں نے کیا ہے کہ جو حکیم نیچر کا مشاہدہ کرتا ہے، نیچر ہی کا شکار کھیلتا ہے - اُس کو بڑی شرم کی بات ہے کہ وہ حق و صداقت کے واسطے استشہاد اُن لوگوں سے کرے کہ جن کا دل عادت کے بس میں پھنس رہا ہے -

۲۵- عادت نے جو رسوم میں ندرت پیدا کی ہے

انسان کے تصوّر میں کوئی بیہودہ سے بیہودہ بات مضحکہ کی نہ گزری ہوگی جس کو عادت نے کہیں نہ کہیں آدمیوں کے افعال میں نہ داخل کر دیا ہو - ہم اس کی مثالوں کا ذکر کرتے ہیں - بعض جگہ ایسے آدمی ہیں کہ ان کے سلام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جس کو تعظیماً سلام کرتے ہیں اُس کی طرف پہلے پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور اس کی صورت نہیں دیکھتے ہیں اور سلام کرتے ہیں - ایک جگہ ایسی ہے کہ جہاں بادشاہ تھوکتا ہے تو اُس کے دربار میں

۱- اصل میں جملہ یوں تھا: ”ایسی کوئی رائے وہمی، خیالی الادہند نہیں بناتی -“

شاہزادیاں ، امیر زادیاں اپنا ہاتھ اس کے لینے کے لیے دوڑاتی ہیں۔ ایک اور قوم ہے کہ جس میں یہ رسم ہے کہ بڑے بڑے امرا ریشمی کپڑے لے کر بادشاہ کے پیخانے لینے کے لیے دوڑے جاتے ہیں۔ ایسی ایک قوم ہے کہ جس میں بادشاہ سے باتیں لوگ نلیوں کے اندر سے کرتے ہیں۔ صرف بیوی بچے بادشاہ کے اس سے بغیر نلی کے کلام کر سکتے ہیں۔

بعض قوموں میں عورتیں اپنے خاوندوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں جاتی ہیں اور لڑتی ہیں اور افسری کی عزت حاصل کرتی ہیں۔ بعض قومیں ہیں جن میں ناک ، ہونٹ ، گال میں زیور پہنتے ہیں اور پستانوں اور سُرینوں پر بڑے بڑے ڈلے سونے کے لٹکاتے ہیں۔ بعض قوم میں رانوں اور پیروں کے تلووں سے بھری ہوئی انگلیوں کو صاف کرتے ہیں۔ بعض قوم میں سوائے بادشاہ کے اور سب کی اولاد محروم الارث ہوتی ہے۔ بھائی بھانجوں کو وراثت ملتی ہے۔ کہیں صرف بھانجوں کو۔ بعض قوموں میں جائداد اور اسباب کا یہ انتظام ہے کہ بادشاہی مجسٹریٹ تمام زراعت کی نگاہداشت اور تقسیمِ پیداوار لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ہر شخص بحسبِ ضرورت پیداوار لے لیتا ہے۔

کسی قوم میں بچوں کے مرنے پر روتے ہیں۔ بوڑھوں کے مرنے پر دعوتوں کے جلسے کرتے ہیں۔ لیکن عورتیں خاوندوں کی بےوفائی کے سبب سے انھیں چھوڑ دیتی ہیں اور اور خاوند کر لیتی ہیں۔ لیکن عورتوں کی وہ حالت[1] ہوتی ہے کہ مرد اپنے دیس کی تمام

۱۔ اصل میں ''حالت'' کی جگہ لفظ ''دردشا'' چھپا تھا۔

عورتوں کو مار ڈالتے ہیں اور ہمسایے سے اور عورتیں لے کر بیاہ کر لیتے ہیں ۔ کہیں مرد بے سبب بیوی کو طلاق دے سکتا ہے ، مگر بیوی خواہ کیسا ہی سببِ قوی ہو ، مرد کو طلاق نہیں دے سکتی ہے ۔ خاوند کو اختیار ہوتا ہے کہ اگر بیوی بانجھ ہو تو اسے بیچ ڈالے ۔ کسی قوم میں مُردوں کی لاشوں کو اُبال کر کچلتے ہیں اور اس کا ایک لوندا بنا لیتے ہیں اور شراب میں ملا ملا کر کھاتے ہیں ۔ بعض قوموں میں مُردوں کو کتّوں اور پرندوں کے کھانے کے لیے رکھ دیتے ہیں اور اِسی کو اچھا سمباده جانتے ہیں ۔ بعض قومیں یہ یقین کرتی ہیں کہ ارواحیں کھلے میدانوں میں آزاد پھرتی ہیں ، اس لیے وہاں ان کے لیے ہمہ نعمت کا سامان تیار رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان کی آواز کی گونجیں جو ہوتی ہیں وہ اُن کی باتوں کا جواب ارواحیں دیتی ہیں ۔ بعض قومیں یہ سمجھتی ہیں کہ ارواحیں پانی پر تیرتی ہیں اور تیرتی جاتی ہیں اور تیرِ جگر دوز مارتی جاتی ہیں ۔

بعض قومیں کندھوں کے اونچا کرنے اور سر کے جھکانے کو نہایت اطاعت کی علامت جانتی ہیں ۔ بعض قومیں بادشاہوں کے دربار میں جوتیاں اُتار کر جاتی ہیں ۔ بعض جگہ بادشاہی محلوں میں جو خواجہ سرا رہتے ہیں ، ان کی ناک اور ہونٹ کاٹ کر بدصورت بنا دیتے ہیں کہ محل کی کوئی عورت ان پر عاشق نہ ہو جائے ۔ بعض قوموں میں پیشوائے دین آنکھیں اپنی نکال ڈالتے ہیں کہ مراقبے میں شیطانوں کو اچھی طرح دیکھیں اور پیشین گوئیوں کے لیے باتیں ذہن میں اچھی طرح آئیں ۔ ہر شخص اپنے پیشے اور شوق کے موافق اپنا معبود مقرر کرتا ہے ؛ سپاہی شیر یا لومڑی کو ، مچھوے کسی مچھلی کو اور علیٰ ھذا القیاس اَور اہلِ پیشہ ۔

بعض قوموں میں قسم کھانے کا یہ طریقہ ہے کہ نیچے زمین

کو چھوتے ہیں اور اوپر آسمان کو دیکھتے ہیں ۔ بعض قومیں گوشت و مچھلی دونوں کچا کھاتے ہیں ۔ بعض قوموں میں قسم کھانے کا یہ طریقہ ہے کہ متبرک آدمیوں کی قبر پر انگلی رکھتے ہیں ۔ بعض قوموں میں یہ دستور ہے کہ ہر سال نوروز کو بادشاہ ہر شاہزادے اور امیر اور اپنے متوسلین کے گھر تحفتاً آگ بھیجتا ہے ۔ اس کے آنے پر پہلی آگ ساری بجھا دی جاتی ہے ۔ آس پاس کے ہمسایے کے لوگ سب کے سب اس نئی آگ کو لیتے ہیں ۔ اگر نہ لیں تو بادشاہ کے بڑے بدخواہ سمجھے جاتے ہیں ۔

بعض قوموں میں یہ دستور ہے کہ اگر کوئی بادشاہ تختِ سلطنت سے ہاتھ اٹھا کر تارک الدنیا ہو جائے تو ضرور ہے کہ جو اس کا قائم مقام ہو ، وہ بھی سلطنت کو چھوڑ کر تارک الدنیا ہو اور کوئی تیسرا شخص سلطنت کرے ۔ بعض قومیں بحسبِ ضرورت و منفعت سلطنت کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں ۔ کبھی بادشاہ کو معزول کر کے کسی بڑے بوڑھے کو بادشاہ بنا دیتے ہیں ، کبھی سلطنت جمہوری قائم کر لیتے ہیں ۔ بعض قوموں میں عورت اور مرد دونوں کا اصطباغ اور ختنہ ہوتا ہے ۔ بعض قوموں میں اگر سپاہی لڑائیوں کے میدانوں میں فتحیں پا کر دشمنوں کے سات سر بادشاہ کے روبرو پیش کرے تو وہ امرا میں داخل ہو جاتا ہے ۔

بعض قوموں میں سلام کرنے کا یہ دستور ہے کہ زمین پر ایک انگلی ٹیکتے ہیں اور پھر اس کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں ۔ بعض قوموں میں مرد سر پر اور عورت کندھے پر بوجھ اٹھاتے ہیں ۔ بعض قوموں میں عورتیں کھڑی ہو کر اور مرد پالتی مار کر پیشاب کرتے ہیں ۔ بعض قوموں میں دوست آپس میں ایک دوسرے کو تحفتاً اپنا خون بھیجتے ہیں ، یہ کمالِ اتحاد کی نشانی ہے ۔ بعض قوموں

میں چار گوتھ بچا کر شادی کرتے ہیں - بعض قوموں میں بچوں کو دودھ مائیں چار برس تک اور اکثر بارہ برس تک پلاتی ہیں - بعض قوموں میں بچے کو پیدائش کے روز دودھ پلانا زہرِ قاتل سمجھا جاتا ہے -

بعض قومیں سب طرح کے نباتات کھاتی ہیں جن میں بدبو نہ ہو - بعض قومیں اپنی سب چیزوں کو کھلا رکھتی ہیں - مکانات ان کے بڑے تکلّف کے ہوتے ہیں - ان کا ساز و سامان بیش بہا ہوتا ہے مگر دروازہ ، کھڑکی ، صندوق قفل لگانے کے لیے نہیں ہوتا - وہاں چوروں کو سخت سزا ہوتی ہے - بعض قومیں جُوؤں کو بندر کی طرح[۱] دانتوں کے تلے دبا کر مارتی ہیں - ناخونوں پر مارنے کو عیب سمجھتی ہیں - بعض قومیں ساری عمر میں نہ بال منڈوائیں ، نہ ناخن ترشوائیں - بعض قومیں دائیں ہاتھ کے ناخن کترواتی ہیں اور بائیں ہاتھ کے ناخن بڑھاتی ہیں - اس کو ایک آلۂ حرب سمجھتی ہیں اور بہادری کی نشانی اور خوبصورتی جانتی ہیں -

کہیں سر کے آدھے بال دائیں طرف کے بڑھاتی ہیں اور بائیں طرف کے آدھے بال منڈاتی ہیں - اور انھی کے پاس کے اضلاع کے آدمی آگے پیچھے کے بال سر پر بڑھاتے ہیں ، ادھر اُدھر کے بال منڈاتے ہیں - بعض قوموں میں والدین اپنے بچوں کو اور خاوند اپنی جوروؤں کو مہمانوں کے حوالے کر دیتے ہیں اور ان سے کچھ روپیہ لے لیتے ہیں - بعض قوموں میں جلسوں میں بغیر کسی تعلق و قرابت کے بچوں کو آپس میں بدل لیتے ہیں -

بعض قوموں میں آدمیوں کا گوشت کھاتے ہیں - بعض قومیں

۱- یعنی جس طرح بندر جُوئیں پکڑ کر دانتوں کے تلے دبا لیتا ہے -

اس کو برا نہیں جانتیں کہ بیٹا باپ کو ایک خاص عمر میں مار ڈالے - بعض قومیں اپنے بچوں کو ماؤں کے پیٹ کے اندر ہی بیچ ڈالتی ہیں اور جب وہ پیدا ہوتے ہیں تو مائیں کبھی پال پوس کر ان کو دیتی ہیں اور کبھی یوں ہی حوالے کر دیتی ہیں -

اب تک عادت نے یہ نہیں سکھایا کہ عورتوں کی سلطنت جمہوری ہو اور وہ میدانِ جنگ میں صف آرا ہوں - ان کی فوجیں آپس میں لڑ رہی ہوں -

عادت بعض وقت وہ کام کرتی ہے کہ نہ علم کام کرے ، نہ حکمت - بعض جاہل گنواروں میں وہ وہ دانائی کی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں کہ اگر حکیم اپنا سر مارتے اور ساری حکمت خرچ کرتے تو بھی وہ نہ پیدا ہوتیں - بعض قومیں ایسی ہیں کہ وہ موت کو حقارت سے نہیں دیکھتیں بلکہ مر جانے کو اپنی عزت سمجھتی ہیں - وہ غضب کا استقلال ہوتا ہے کہ سات برس کے بچے پر اتنے کوڑے پڑیں کہ وہ مر جائے مگر اس کے چہرے کا رنگ متغیّر نہیں ہوتا - دولت کو ایسا ناچیز جانتے ہیں کہ کیسۂ زر اگر پڑا ہوا ہو تو اس کے اٹھانے کے لیے نہیں جھکتے -

بعض اضلاع میں ساری خدا کی نعمتیں پیدا ہوتی ہیں مگر وہاں کے باشندے صرف ساگ روٹی پانی پر گزارا کرتے ہیں ، اور کسی چیز کو نہیں کھاتے - یہ عادت ہی کا معجزہ تھا کہ ایک مقام میں سات سو برس تک کسی عورت کی ایسی کوئی حرکت نہیں معلوم ہوئی کہ وہ عصمت کے خلاف ہو -

۲۶- دنیا کا کوئی بُرا بھلا کام ایسا نہیں ہے کہ جس کو عادت نے نہ کیا ہو ، یا وہ نہ کرتی ہو ، یا وہ آیندہ نہ کرے - اسی لیے ایک حکیم نے اس کو خطاب ملکۂ جہان یا شہنشاہِ عالم کا دیا ہے -

ایک شخص باپ کو مار رہا تھا - جب لوگوں نے اُسے لعنت ملامت کی تو اُس نے کہا کہ یہ ہمارے خاندان کی عادت ہے - اسی طرح میرے باپ نے میرے دادا کو اور میرے دادا نے میرے پردادا کو مارا تھا - اور پھر اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ جب اس کی عمر میرے برابر ہوگی تو وہ مجھے مارے گا - جب یہ بیٹا باپ کو گلی میں گھسیٹتا ہوا لے جاتا تھا تو باپ نے کہا کہ ٹھہر جا - یہ دروازہ جو تیرے سامنے ہے، یہیں تک میں نے اپنے باپ کو گھسیٹا تھا - یہی حد ہمارے ہاں باپ کے گھسیٹنے کی ہے -

ارسطو[1] کا قول ہے کہ طبیعت کو بھی عادت ضعیف کر دیتی ہے اور اس کے خلاف کام کراتی ہے - خِلقت کے سبب سے آدمی ایک دوسرے کو اتنا برا نہیں کہتے جتنا کہ عادت کے سبب سے -

۲۷- عادت کی ایک حکایتِ ظرافت آمیز

اس حکایت کے لکھنے کے لیے ہم نے تھوڑی سی جگہ کاغذ میں سے چُرائی ہے - اہلِ فرانس کا قاعدہ ہے کہ اُنگلیوں سے ناک کو سنک کر رینٹھ پھینکنے کو غچلی پن سمجھتے ہیں - اُس کو رومال میں

۱- ارسطو : (۳۸۴ ق‌م — ۳۲۲ ق‌م) یونان قدیم کا معروف فلسفی جو افلاطون کا شاگرد تھا - اس نے اپنے استاد کی تخیّل پرستی کے برخلاف مشاہدے اور تجربے پر زور دیا - اپنی درس گاہ میں فلسفے اور ریاضی کے علاوہ حیاتیات اور نباتات جیسے طبیعی علوم کے شعبے بھی قائم کیے اور تجربہ و تحقیق کے لیے وافر مواد فراہم کیا - اس نے مختلف علوم کے بنیادی اصول مرتّب کیے اور کم و بیش ایک سو بیس کتابیں تالیف کیں -

نکال کر جیب میں رکھتے ہیں ۔ ایک شخص ظریف اور حاضر جواب بڑا تھا ، اُس نے یہ اپنی عادت ڈالی کہ انگلیوں سے ناک سنکتا اور رینٹھ کو نکال کر پھینک دیتا ۔ اس پر بہت سے آدمی اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے اور اس کو بڑا غلیظ سمجھتے ۔ ایک دن اس نے کہا کہ مجھے تعجب ہے کہ میری اس نفاست کے کام کو لوگ غلیظ جانیں اور اپنے غلیظ کام کو نفیس سمجھیں ۔ بھلا یہ کیا نفاست ہے کہ ایک پاکیزہ رومال میں یہ ناک کی غلاظت لی جائے اور پھر تہہ کرکے جیب میں رکھی جائے اور اس کا بوجھ ہر وقت ساتھ رکھا جائے ۔ یہ غلاظت کا کام ہے یا میرا کام غلیظ ہے کہ میں ناک کی غلاظت کو ایسا ہی بدن سے دور کر دیتا ہوں جیسے کہ اور غلاظتیں دور کی جاتی ہیں ۔ باوجودیکہ دلیل اس کی لاجواب تھی مگر عادت اس دلیل کو کب سننے دیتی تھی ۔ لوگ اس کی اس حرکت سے کراہیت ہی کرتے رہے مگر وہ بھی مجبور تھا کہ اپنی عادت نہ چھوڑ سکا ۔

۲۸- خرقِ عادت

نیچر کی جہالت سے ، نہ اس کی اصالت سے ، انسان میں یہ بات پیدا ہوئی ہے کہ وہ خرقِ عادت کو نہیں مانتا ۔ عادت نے ، یعنی ایک چیز کو ایک ہی طرح ہمیشہ دیکھنے نے ، عقل کو اندھا کر دیا ہے کہ وہ دوسری طرح دیکھ ہی نہیں سکتی ۔ یہ دلیل برخلاف اُن لوگوں کے بیان کی جاتی ہے جو معجزات اور خرقِ عادت کے قائل نہیں ۔ یہ عادت ہے کہ ہم وحشیوں کو جس تعجب کی نظر سے دیکھتے ہیں ، اُسی تعجب کی نگاہ سے وہ ہمیں دیکھتے ہیں ۔ ہم ان کو اور وہ ہم کو دیکھ کر متعجّب ہوتے ہیں ۔ اگر آدمی انصاف

کی نظر سے دیکھے تو دونوں کے تعجّب کے لیے ایک ہی دلیل ہے۔ عقلِ انسانی کا ایک رنگ ہے جو سب انسانوں کی رایوں اور طریقوں میں رچا ہوا ہے، خواہ وہ کسی صورت کی ہوں۔ اُس کا مادہ بے انتہا ہے، اس کی بوقلمونی بے حد ہے جس کو تم اوپر کے بیان سے سمجھ سکتے ہو۔

۲۹۔ جن قوانین کو کونشنس کہتے ہیں کہ وہ نیچر (فطرت) سے پیدا ہوئے ہیں، وہ عادت سے پیدا ہوتے ہیں۔ جن عادتوں کا رواج اقوام میں مروج ہے، اُن کا ادب اس قوم کے ہر فرد میں موجود ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ان کے اختیار کرنے میں میری عزت و آبرو ہے، اس لیے وہ کبھی ان سے بطیبِ خاطر جدا ہونا نہیں چاہتا۔ کریٹ میں جب کسی پر لعنت بھیجتے تھے تو دیوتاؤں سے یہ دعا اُس کے لیے کرتے تھے کہ وہ بُری عادتوں میں مبتلا ہو۔ عادت کی زبردست قوت نے اپنے جال کے پھندوں میں ایسا پھنسایا ہے کہ اس سے نکل کر یہ سوچنا مشکل ہے کہ اس کے ارشادات اور ہدایات کے اچھے بُرے ہونے کا وزن کریں اور سوچیں کہ وہ کیا ہیں۔ جب سے پیدا ہوئے، ہم نے ماں کے دودھ کے ساتھ اس قُوت کی عادت کو چوسا۔ باپ کے نُطفے کے اثر نے اس کو ہمارے دلوں میں موجود کیا۔ آنکھ کھول کر جو دنیا کو دیکھا تو اس کی ہر صورت میں عادت کا غلبہ اور جلوہ دیکھا۔ چاروں طرف اسی کی تعریف کا غلغلہ سنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے طریق پر چلنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ پس اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو چیز ہماری عادت سے دور ہے، وہ عقل سے بھی دور ہے۔ گو اِس استدلال کا بہت سا حصہ نامعقول ہے مگر واللہ اعلم بالصواب کیوں وہ عالم کو مقبول ہے۔ ہر قوم اپنی ہی عادتوں سے خوش رہتی ہے

اور ان کو پسند کرتی ہے ۔ انھی کو بھلا جانتی ہے اور سب قوموں کی عادت کو برا ۔

دارا[1] نے یونانیوں سے کہا تھا کہ جو قومیں مردم خوار رہتی ہیں آن کی (جن کا یہ مقولہ تھا کہ آدمی کے پیٹ سے زیادہ کوئی عمدہ مدفن آدمی کے لیے نہیں ہے) عادت کو تم کیوں نہیں چھڑا دیتے ؟ تو یونانیوں نے جواب دیا کہ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ وہ ان کو دی جائے جس سے وہ اپنی یہ عادت چھوڑ دیں ۔ جب بتدریج ان کو یہ فہمائش کی گئی کہ تم یونانیوں کی طرح مُردوں کو جلایا کرو تو اس تحریک کو انھوں نے نہایت خوفناک سمجھا ۔ ہر ایک آدمی ایک ہی کام کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کیونکہ عادت نے اصل صورت چیزوں کی ہم سے چھپا دی ہے ۔ قوانینِ عادت کی پابندی کے لیے کوئی وجہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ۔ بغیر سوچے سمجھے اس پر عمل کرتے ہیں ۔ تمام خانگی امور میں ، شادیوں میں ، بیاہوں میں ، تحفہ تحائف دینے میں ، وصیت ناموں میں ، خرید و فروخت میں ، یہ وہ قوانین ہیں ، نہ ان کے چھاپنے کی ضرورت ہے ، نہ زبان سے کہنے کی حاجت ہے ، بغیر اس کے سب بسر و چشم قبول کرتے ہیں ۔

۳۰- علم کا اظہار بیہودہ طور پر

بعض عالم علم کا اظہار ایسا بیہودہ طور سے کرتے ہیں کہ

۱- دارا : یہاں دارا سے (ملکِ فارس کے داریوش سلاطین کے سلسلے کا) غالباً تیسرا داریوش یعنی دارائے سوم مراد ہے جس کا نام کودومان تھا (۳۳٦ ق م — ۳۳۰ ق م) - یہ اس سلسلے کا آخری بادشاہ تھا جس پر سکندرِ اعظم نے غلبہ حاصل کیا اور ملکِ فارس کو محکوم بنا لیا ۔

جس سے معلّم کی قدر و منزلت کم ہوتی ہے ، اس سے نفرت پیدا ہوتی ہے ، اہلِ علم کی حقارت ہوتی ہے ، عالم کہلانے سے غیرت آنے لگتی ہے - اِس سبب سے دنیا میں بہت سے آدمیوں کی یہ رائے ہو گئی تھی اور ہے کہ آدمی میں علم کی وجہ سے وہ لیاقت کم ہو جاتی ہے جو فرماں روائی اور حکومت کے عہدوں اور سپاہ کی افسری اور حکمرانی کے لیے درکار ہے - اب تم پوچھو گے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس شخص کا دل علم کی دولت سے مالا مال ہو ، اس میں تیزیِ عقل و فہم اتنی بھی نہ ہو جتنی کہ ایک جاہل گنوار میں ہوتی ہے ، جس سے وہ اپنی اصلاح اور ترقی کر لیتا ہے - میں تمھارے جواب کے لیے بعض بڑے بڑے عاقل ، عالم حکیموں کی رایوں اور مباحثوں کا خلاصہ لکھتا ہوں -

جب کسی عالم کے ذہن میں بیگانہ خیالات اور بڑے بڑے مضامین جمع ہو جائیں تو اس کے دماغ میں لغات اور علوم کا ہجوم اصل دماغ کو بھینچ کر چھوٹا کر دیتا ہے اور یوں اپنے لیے جگہ خالی کر لیتا ہے - جیسے جڑ میں بہت پانی دینے سے درخت بالکل جل جاتا ہے یا ڈوب جاتا ہے ، اور بہت تیل پڑنے سے چراغ بجھ جاتا ہے ، اِسی طرح بہت مطالعے کی شدت سے فہم کی جودت کند ہو جاتی ہے - ہزاروں خیالات اور مضامین ایسا سمجھ کو آن کر گھیرتے ہیں اور دق کرتے ہیں کہ اس کو ان قیدوں سے رہائی اور آزادی نصیب نہیں ہوتی کہ وہ خود اپنی حدّت اور جودت دکھائے - دماغ علوم اور لغات کے بوجھ کے تلے دب کر ضعیف و ناتواں ہو جاتا ہے - مگر بعض عاقل اِس بات کو نہیں مانتے - وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دماغ میں جتنی چیزیں آتی جاتی ہیں ، اتنا ہی وہ پھولتا اور پھلتا جاتا ہے - اسی لیے پہلے زمانے میں اکثر عالم فاضل ،

منتظم ِ کامل اور افسری ِ سپاہ کے قابل ہوتے تھے ۔

علما و حکما کا فرقہ ایک ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی تکمیل ِ نفس کے خیال میں ایسا پھنسا رہتا ہے کہ وہ دنیا کے معاملات و مقدمات پر التفات نہیں کرتا ۔ وہ ایسا بے خبر ہوتا ہے کہ اگر اس کے ہمسائے کا حال اس سے پوچھیے تو وہ یہ نہیں جانتا کہ کیا کام وہ کرتا ہے ۔ مشکل سے بتا سکتا ہے کہ وہ انسان ہے یا کوئی اور حیوان ہے ۔ بادشاہ اور گڈریے ، چرواہے ، گوالیے میں کچھ تمیز نہیں کرتا ۔ وہ جانتا ہے کہ کامل گڈریا دودھ دوہنے ، اپنی بھیڑوں کے گلے کی اُون کترنے میں مصروف رہتا ہے ۔ مگر گڈریے سے زیادہ سخت اور ناہموار ان کاموں میں بادشاہ ہے ۔ اگر کوئی شخص اس سے یہ کہے کہ میرے پاس دو سو دیہات ہیں تو وہ اپنے تئیں یہ سمجھ کر کہ میں دنیا کا مالک ہوں ، اس جائداد پر ایک قہقہہ لگائے گا اور کہے گا کہ کیا یہ بھی کوئی جائداد ہے ۔ اگر کوئی شخص اس کے سامنے یہ شیخی کرے کہ میرے خاندان میں امارت اور شرافت سات پیڑھی سے چلی آتی ہے تو وہ کہے گا کہ نیچر کی تصویر کا تصوّر تمھارے ذہن میں درست نہیں ۔ ہر شخص کے باپ دادا دولت مند ، غریب ، باشادہ ، غلام ، مہذّب ، وحشی ہوتے آئے ہیں ۔ اگر تم کسی پیغمبر کی پندرھویں نسل میں بھی ہو تو تم کو اِس پر کچھ فخر اور غرور کرنا نہیں چاہیے ۔ اس کو بخت و اتفاق جاننا چاہیے ۔ ایسے حکیموں کو بھی لوگ احمق جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ کسی کام کے نہیں ۔ نہ وہ مجسٹریٹی کے ڈھب کے ہیں ، نہ ججی کے ، نہ کپتانی کے ۔ ان کو ایک نرالی قسم کا آدمی سمجھ کر ان کے اوضاع اور اطوار پر ہنستے ہیں ۔ بعض اہل ِ دنیا ان کو نہایت ذلیل اور خوار سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ دنیا کی ادنیٰ اور معمولی چیزیں

بھی نہیں سمجھتے ہیں اور اپنے پندار اور غرور پر مرتے ہیں۔

ایک وہ عالم ہیں کہ جو اپنے تشخّص اور تعزّز پر مرتے ہیں۔ بات بات میں علمیّت کا اظہار کرتے ہیں۔ رات دن اِس بتلانے اور جتلانے میں بسر کرتے ہیں کہ ہم دنیا کے معمولی عہدوں اور کاموں کے سرانجام کرنے کے لیے نہیں پیدا ہوئے بلکہ اُن کاموں کے اِنصرام کرنے کے واسطے جو اَوروں سے سر انجام نہیں ہو سکتے۔ اپنی ذات کو اَوروں سے برتر جانتے ہیں۔ طرزِ معاشرت بھی اپنی نرالی رکھتے ہیں۔ گفتگو بھی ان کی انوکھی ہوتی ہے۔ اَوروں کی طرح بولنے سے اُن کو ننگ و عار آتا ہے۔ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں، بڑی لفّاظی خرچ کرتے ہیں۔ وہ موٹے موٹے لفظ بولتے ہیں کہ لغت میں بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتے ہیں۔ ایسے لوگ حکومت اور فرمانروائی کے عہدوں اور سرداری کے لیے سزاوار نہیں ہوتے۔ خود ان کے اوضاع و اطوار سے کمینگی اور رذالت ٹپکی پڑتی ہے۔ ان کو لوگ سفلہ اور اوچھا اور چھچھورا جانتے ہیں۔

جو لوگ اپنی حکمت میں بک بک کرتے ہیں اور کام کچھ نہیں کرتے، وہ حقارت کے قابل ہوتے ہیں۔ علم و حکمت میں انھی حکما کو فخر حاصل ہوتا ہے جو علمِ صناعت میں اپنا ہنر و جوہر دکھاتے ہیں۔

مہندس ارشمیدس[1] کو یہ خیال آیا کہ مجھ پر لازم ہے کہ میں اپنے علم کو اپنے ملک کی حفاظت کے کام میں لاؤں۔ اسی

۱- ارشمیدس: (۲۸۷ ق م — ۲۱۲ ق م) مشہور یونانی عالم جو سرقوسا (صقلیہ) میں پیدا ہوا اور یہیں وفات پائی۔ قانونِ ارشمیدس کے علاوہ بہت سے علمی اکتشافات اس کی طرف منسوب ہیں۔

سوچ بچار میں رہتا تھا کہ یکایک اُس کے ذہن نے ایسی کلیں اختراع کیں جن کو اس نے بنایا تو وہ ملک کی حفاظت میں ایسی کام آئیں کہ جو کسی کے خیال میں بھی نہیں آئی تھیں ۔ باوجودیکہ یہ کام ایسی عظمت و شان کا تھا مگر وہ اس کو ہمیشہ لڑکوں کا کھیل سمجھتا تھا اور اپنا ادنٰی تجربہ بتلاتا رہا ۔ جب حکیم اپنی حکمت کو عملاً دکھاتا ہے تو لوگوں پر کھلتا ہے کہ اس کا ذہن کس رتبے اور شان کا ہے اور وہ کس بلندی پر چڑھا ہے ۔ اشیا کا علم اس کا کیسا وسیع ہے ۔

حکیم تھلیز نے باتوں باتوں میں کہہ دیا تھا کہ دولت جیسی حقیر اور ذلیل چیز کے واسطے کیوں اتنے لوگ محنت و مشقّت اٹھاتے ہیں ۔ اس پر ایک شخص نے طنزاً کہا کہ آپ کی بھی حالت لومڑی کی سی ہے کہ جو چیز ہاتھ نہ آئے ، اُس میں عیب بتلائے ۔ اس طعن آمیز سخن کو سن کر اُس حکیم نے اپنی ساری توجّہ اس طرف مصروف کی کہ دولت کسی طرح پیدا کیجیے ۔ پھر اُس نے اس سلیقے سے تجارت کی کہ دولت تھوڑے دنوں میں وہ کمائی کہ کوئی دوسرا شخص اس کی برابر نہیں کما سکتا تھا ۔ غرض معاملات دنیا کے کسی قسم کے ہوں ، وہ حکمت اور علم کے ذریعے سے بہت خوبصورتی سے طے ہو سکتے ہیں ۔

۳۱- جو خرابیاں علم اور حکمت سے پیدا ہوتی ہیں ، وہ اس سبب سے پیدا ہوتی ہیں کہ ہم ان کا مطالعہ اور پڑھنا بری طرح سے شروع کرتے ہیں ۔ وہ طرزِ تعلیم اختیار کر رکھی ہے کہ جس سے نہ معلّم ، نہ متعلّم کبھی دانشمند ، قابل ، عالم بڑا ہو ۔ ماں باپ اپنی اولاد کی تعلیم میں ساری دولت اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ اس کو علم حاصل ہووے ۔ اس کی پروا نہیں ہوتی کہ وہ عقل اور نیکی

کی الف بے تے بھی پڑھ جائے۔

اگر لوگوں میں سے ایک شخص کو عالم کہو، دوسرے شخص کو نیک، تیسرے شخص کو احمق، تو اول شخص کی تعظیم کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے، دوسرے کو پوچھیں گے بھی نہیں، تیسرے شخص کو کہیں گے کہ اس نے عربی، فارسی، سنسکرت کیوں نہیں سیکھی، نظم و نثر کیوں نہیں لکھی۔ غرض علم کیوں نہیں سیکھا جو احمق رہا۔ مگر اصلی بات جو عقل و ہوشیاری سے متعلق ہے، اُس کا ذکر نہیں کریں گے۔ ہم کو زیادہ تر نظر اِس پر چاہیے کہ عالم نیک و عاقل ہو، نہ یہ کہ وہ بڑا ہو جس نے خوب محنت کر کے علم کو اپنے حافظے میں ٹھوس ٹھوس کر بھر لیا ہو، عقل و فہم اور کوشش کو خالی رکھا ہو۔ غرض اس طرف خیال نہیں ہے کہ علم ہماری عقل بڑھائے، دل کو نیکی کا خیال دلائے۔

ہمارا حال اُن چڑیوں کا سا ہے کہ وہ کھیت پر دانہ چُگنے کے لیے گئیں، وہاں سے چونچ میں دانہ لے کر اپنے گھونسلے میں آئیں اور دانہ جوں کا توں اپنے بچوں کے منہ میں رکھ دیا اور کوئی مزہ اس کا خود نہ چکھا۔ ایسے ہی ہم علم فقط مشیخت[1] کے لیے پڑھتے ہیں۔ کتابوں میں سے کہیں یہاں سے، کہیں وہاں سے علم کو چگتے ہیں اور اس کو نوکِ زباں کرتے ہیں اور سننے والوں کے منہ پر تھوک دیتے ہیں۔ ہم کتابیں چند جمع کر کے مطالعہ کرتے ہیں۔ ان میں سے جو فقرات پسند آئے، اگر حافظہ اچھا ہوا تو ان کو یاد کر لیا، نہیں اُن کو لکھ لیا۔ گویا کہ ایک کیاری کی پود آ کھیڑ

۱۔ مشیخت: شیخی، بڑائی۔

کر دوسری کیاری میں لگا دی اور اس کو اپنی تصنیف بتلانے لگے ، حالانکہ جیسی وہ پہلے پرائی تصنیف تھی ، اب بھی ویسی ہے - نقل اتارنے سے تو اپنی تصنیف نہیں ہو جاتی - غرض اپنی گرہ کی پونجی کچھ نہیں رکھتے ، کوئی بات اپنے دماغ سے نہیں پیدا کرتے ، پرائی باتیں اور کہانیاں کہی ہوئی طوطے کی طرح دہراتے ہیں - جھوٹے سکّوں کی طرح صرف گننے کے کام کے ہیں ، چلنے کے کام کے نہیں -

ہم یہ بھی بکا کرتے ہیں کہ اس بات میں افلاطون کا یہ ارشاد ہے ، ارسطو کا یہ قول ہے ، بو علی سینا[1] کا یہ مقولہ ہے ، بطلیموس[2] کا یہ مسئلہ ہے - ہمارا حال ایسا ہوتا ہے جیسے کسی علم کے شوقین امیر کا کہ وہ ہر علم کے صاحب کمالوں کو نوکر رکھ لیتا ہے -

---

۱- بُو علی سینا : (۹۸۰ع — ۱۰۳۷ع) عظیم فلسفی ، حساب دان اور طبیب جن کا شمار وقت کے آئمہ مفکرین میں ہوتا ہے - بخارا کے قریب اخشنہ کے مقام پر پیدا ہوئے اور ہمدان میں وفات پائی - انہوں نے ارسطو کے فلسفے پر عمیق نگاہ ڈالی اور جدید فلاطونیت کے بانی ہوئے - ابنِ سینا نے تصوف پر بھی عبور حاصل کیا تھا - ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں : ''القانون فی الطب'' ، ''الشفا'' (یہ فلسفے کی کتاب ہے) ، ''الاشارات و التنبیہات'' (یہ منطق کے مباحث پر مشتمل ہے) ، اور ''النجاۃ'' -

۲- بطلیموس : مصر میں پیدا ہوا اور ۱۶۷ عیسوی کے قریب سکندریہ میں وفات پائی - تاریخ و جغرافیہ اور ہیئت کا جیّد عالم تھا - اس کا ایک نظریہ ، ''نظریۂ بطلیموسیہ'' کے نام سے معروف ہے - اس کا کہنا تھا کہ زمین سورج کے گرد گردش نہیں کرتی بلکہ سورج زمین کے گرد گردش کرتا ہے - اس کے اس نظریے کا ابطال کوپر نیکس نے کیا تھا - ''المجسطی'' اور ''آثار البلاد'' اس کی مشہور کتابیں ہیں -

اس کے علاوہ مصر کے (۱۶ سلاطین پر مشتمل) ایک قدیم خاندان کے بادشاہوں کو بھی ''بطلیموس'' کہا جاتا تھا جنھوں نے ۳۰۹ ق‌م سے ۳۰ ق‌م تک حکومت کی -

اگر دوست احباب سے کسی علم کے مسئلے میں بحث آن پڑی تو وہ اُس علم کے عالم سے خود پڑھ کر اُسے سمجھ لیتا ہے - پھر بحث کرنے کے لیے تیار ہو بیٹھتا ہے - یا ایک بڑا کتب خانہ جمع کرتا ہے - کوئی سوال اس سے پوچھیے ، وہ کتب خانے سے کتابیں نکال کر اس پر بحث کرنے کے لیے ہو بیٹھتا ہے - کوئی لغت کی تحقیق ہو ، کتابیں کی کتابیں موجود ہیں - غرض اپنا دماغ خالی ہے مگر کتب خانہ کتابوں سے پُر ہے - اسی کے سہارے سے چلتے ہیں - یہی حال ہمارا ہے کہ ہم اپنے حافظے کے بل پر چلتے ہیں -

ہماری عادت ہے کہ غیروں کے علم اور رایوں پر بھروسا اور اعتماد کرتے ہیں ، مگر ایسا علم عمیق کچھ نہیں ہوتا - رائیں بھی پُھس پُھسی اور تھوتھی ہوتی ہیں ، انھی کو ہم اپنا علم اور اپنی رائے کہنے لگتے ہیں - ہمارا حال بعینہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم کو آگ کی ضرورت ہوئی ، ہمسائے کے ہاں اسے لینے گئے ، مگر وہاں جا کر چولھے کے پاس اپنے تئیں گرم کرنے کے لیے ہو بیٹھے اور آگ لانی بھول گئے - اس سے کیا فائدہ ہے کہ گوشت سے پیٹ بھرا ہو مگر وہ ہضم ہو کر جزوِ بدن نہ ہوتا ہو ، نہ مایتحلّل کا بدل ہوتا ہو - پس ایسا ہی اُس علم کا حال ہے کہ وہ ہمارے حافظے میں بھرا ہوا ہو مگر ہماری نہ عقل کو بڑھاتا ہو ، نہ نیکی کے خیال کو پیدا کرتا ہو -

ہم اَوروں کے بازوؤں پر اتنا بھروسا کرتے ہیں کہ اپنے بازوؤں کی قوّت کھو بیٹھتے ہیں - اگر موت کا خوف پیدا ہو تو اس کے علاج کو ''اخلاقِ جلالی''[1] کی ورق گردانی کریں گے اور اُس

۱- اخلاقِ جلالی کے لیے دیکھیے حاشیۂ سابق -

صفحے کو پڑھیں گے جس میں علاج خوفِ موت کا لکھا ہو۔ اگر ہم کو اپنی عقل و فہم کے استعمال کا طریقہ نیک معلوم ہوتا تو ہم خود ہی خوفِ موت کا علاج اپنے ذہن سے جان جاتے۔ ہم عالم تو غیر آدمی کے علم سے بن سکتے ہیں، مگر عاقل اوروں کی عقل سے نہیں بن سکتے۔ جو شخص اپنی ذات کے معاملات میں عاقل نہیں، اُس کی عقل حقارت کے قابل ہے۔ جو شخص اپنی ذات کو اپنی عقل سے فائدہ نہیں پہنچا سکتا، وہ عاقل نہیں ہے، جاہل ہے۔

اگر طلبہ کی طبیعت کی اصلاح اور عقل کی ترقی تحصیلِ علم سے نہ ہو تو بجائے علم حاصل کرنے کے بہتر ہے کہ وہ گُلی ڈنڈا کھیلا کریں جس سے بدن کی تو اصلاح ہوگی، اعضا میں چُستی چالاکی تو پیدا ہوگی۔

ایک شخص پندرہ سولہ برس تعلیم پا کر مدرسے سے باہر نکلا۔ اب اُس کو کوئی ایک زبان آتی ہے، بعض علوم کے اجزا معلوم ہیں، اب وہ اپنے اس علم پر پُھولا نہیں سماتا۔ جانتا ہے کہ میں نے بہت کچھ حاصل کر لیا ہے۔ ہر جا اپنے علم کی نمود ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ علم کچھ علم نہیں ہے۔ میرا حال ایسا ہے جیسا پہلے مدرسے میں داخل ہونے سے تھا۔ علم پر جب فخر ہو کہ عقل بڑھے، نیکوکاری کی طرف خیال ہو، کوئی بات اپنے دماغ سے پیدا کرے۔

۳۲۔ بعض عالموں کو یہ خبط ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم سے زیادہ کوئی نوعِ انسان کا فائدہ پہنچانے والا نہیں۔ گمراہوں کو راہِ مستقیم پر لانا ہمارا کام ہے، اہلِ ضلالت کی ہدایت و دلالت ہم پر منحصر ہے۔ اگر غور کر کے دیکھیے تو ان سے اتنا فائدہ بھی نہیں ہوتا جیسا کہ راج مزدور اور موچی لُہار سے ہوتا ہے۔

کسان اور موچی جس کام کو کرتے ہیں ، اُسے جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں - جو کچھ وہ اپنے کام کی نسبت بیان کرتے ہیں ، درست ہوتا ہے - مگر یہ عالمِ مصنوعی تو فقط آپس میں لڑنے کے لیے مورچہ بندیاں کرنی جانتے ہیں - دماغ کے باہر جو علم ان کے تیر رہا ہے ، اُسی کو اِترا اِترا کے بے معنی طور پر بیان کرتے ہیں اور اپنی مشیخت بگھارتے ہیں - اُن کا حال تو ایسا ہے جیسے کہ گدھے پر کتابیں لاد دیں یا کسی چیز پر مارتول[1] سے ٹھپّے اُٹھا دیے - ''قانون''[2] و ''شرحِ اسباب''[3] ازبر ہے مگر کسی مریض کا علاج نہیں کر سکتے - قوانینِ دیوانی و فوج داری نوکِ زباں ہیں ، مگر فیصلہ نہیں لکھ سکتے - اسی لیے گورنمنٹ نے اپنے تمام اعلیٰ عہدوں کے لیے جو امتحان مقرر کیے ہیں ، اُن میں مقدمات میں رائے بھی

۱- مارتول : ہتھوڑا ، موگرا ، ٹھونکنے کا آلہ - (نوراللغات)

۲- قانون : ابن سینا کی مشہور کتاب جس کا پورا نام ''القانون فی الطب'' ہے - یہ نظری اور عملی طب کے مسائل و قوانین پر مشتمل ہے اور اس میں ادویہ کے خواص سے بھی بحث کی گئی ہے - یہ سب سے پہلے روم میں ۱۵۹۳ع میں طبع ہوئی -

۳- شرح اسباب : پورا نام ''شرح الاسباب و العلامات'' ہے - اس کے شارح حکیم برہان الدین نفیس بن عوض بن حکیم الطبیب الکرمانی متوفی بعد ۸۵۲ھ ہیں - یہ کتاب ''الاسباب والعلامات'' کے نام سے نجیب الدین ابو حامد محمد بن علی السمرقندی نے تصنیف کی تھی جو فتنۂ تاتار میں ۶۱۹ھ میں شہید ہوئے - شارح حکیم نفیس بن عوض کرمانی نے اس کتاب پر کامل شرح لکھی اور ۸۲۷ھ میں شاہزادہ اُلغ بیگ بن شاہ رخ مرزا بن امیر تیمور کی خدمت میں پیش کر دی - یہ اپنے زمانے کی مقبول شرح تھی اور حکمائے وقت کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی تھی - نیز فنِ طب کے طلبا کو درساً پڑھائی جاتی تھی - کئی بار ہندوستان میں بھی شائع ہو چکی ہے -

لکھانا داخلِ امتحان کیا ہے - علم اور عمل دونوں کا امتحان لینا عینِ دانائی ہے - علم تو بغیر عمل کے حاصل ہو سکتا ہے مگر عمل بغیر علم کے نہیں آ سکتا ہے ، اس لیے امتحان میں مقدمات کی رائے لکھنے پر زیادہ توجہ چاہیے - علم بے عمل عقیم[1] اور عمل بے علم سقیم[2] اور ازدواجِ علم و عمل منتج بہ نتائجِ عظیم -

خلاصہ اس تمام مضمون کا یہ ہے کہ علم اس کا نام نہیں کہ پرائی باتیں یاد کر لیں اور ان کو لکھنے لگے اور اپنے تئیں عالم سمجھ کر بِن پر کی آڑانے لگے - نمود ، شیخی ، غرور کرنے لگے - علم وہ ہے جو عالم ، عاقل ، نیک کردار بنائے - جب تک یہ تین صفتیں علم ، عقل ، نیکی کی آدمی میں نہ ہوں وہ گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدوں کے لائق نہیں ہوتا - جو عالم عاقل اور نیک کردار نہ ہو ، اُس کے واسطے علم ایسا ہے جیسے کسی اناڑی کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار دے دیا جائے کہ وہ اُس کو اس طرح پکڑے جس سے وہ خود زخمی ہو جائے - جیسا یہ ہتھیار اُس آدمی کے واسطے دہشت ناک ہے ، ایسا ہی علم اُس عالم کے واسطے ہے-

۳۳- انسان اپنے نفس پر اُوروں کا قیاس کرتا ہے

''المرء یقیس علیٰ نفسہ'' یعنی انسان اپنے نفس پر اَوروں کا قیاس کرتا ہے - کیا سچی اور اچھی بات ہے - مگر افسوس یہ ہے کہ آدمی اَوروں کے نفس پر اپنے نفس کی برائیوں کا زیادہ تر قیاس کرتا ہے اور نیکیوں کا کم تر - اس مرض میں اکثر آدمی مبتلا ہیں - ان کو اس سے بچنا چاہیے اور اَوروں پر اپنا سا قیاس نہ کرنا

۱- عقیم = بانجھ -   ۲- سقیم = بیمار -

چاہیے - سب آدمیوں کا نفس ایک سا نہیں بنا ، بلکہ ان میں ایسا اختلاف ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں - ہو سکتا ہے کہ کسی کام کے کرنے میں جو میری نیّت ہو ، اُس کی ضد دوسرے آدمی کی اُسی کام کے کرنے میں ہو -

انسان کے خصائل اور عادات اور طبائع و طرزِ معاشرت ہزاروں طرح کی ہوتی ہیں - اُن میں جیسا اختلاف ہوتا ہے ، ایسا اتفاق نہیں ہوتا - ہم کو اپنی بدنفسی کے سبب سے نیک نیت آدمیوں پر برائی کا قیاس نہیں کرنا چاہیے ، بلکہ اُن کی تعظیم اور عظمت کرنی چاہیے ، اور یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم اپنی شامت سے بدنیتی کی بلا میں مبتلا ہیں - اَوروں کے پیچھے ناحق یہ بلا کیوں لگائیں -

غرض آدمی کو ہرگز یہ زیبا نہیں کہ وہ اَوروں کے کاموں کی برائی بھلائی کا فیصلہ اپنے نفس پر قیاس کر کے کرے - گو یہ کنویں[1] کی بھنگ ہے ، تھوڑے بہت سب ہی اس کے نشے میں مبتلا ہیں - چور ساری دنیا کو چور جانتا ہے ، بے دیانت کے خیال ہی میں نہیں آتا کہ دنیا میں کوئی دیانت دار بھی ہوتا ہے - یہ کیسی صریح غلطی ہے کہ جو چیز اپنے میں نہ ہو ، دوسرے میں یقین نہ کرے - آپ لامذہب ہو تو کسی کو بامذہب نہ مانے - اُس کو یقین کرنا چاہیے کہ اَوروں میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ مجھ میں نہیں - ساری دنیا میری ہی تقلید تو نہیں کر رہی ہے کہ جو میں

۱- اصل میں ''کنوے کے'' غلط معلوم ہوتا ہے - یہ لفظ ''کنویں کی'' ہونا چاہیے اور اسی کو ترجیح دی گئی ہے -

کروں ، وہی اور کریں ۔ اس قیاس پر رائے قائم کرنے کی جگہ عدالت اور صداقت پر رائے مبنی کرنی چاہیے ۔ یہی اوروں کے کاموں کے فیصلے کرنے کا شاہانہ طریقہ ہے ۔ مگر جب زمانہ کسی قوم کی بداخلاق کا آتا ہے تو وہاں نیکی کا مفہوم دل سے اٹھ جاتا ہے ۔ نیک کام (خود) کرنا تو درکنار رہا ، دوسرے کا نیک کام کرنا سمجھ میں نہیں آتا ۔ خیر کا خیال کرنا بےوقوفی سمجھا جاتا ہے ۔ جیسے اور گپ شپ اڑاتے ہیں ، ایسے ہی کبھی نیکی کا ذکر مسخرگی کے ساتھ کر دیتے ہیں ۔ جیسے پتھر کو بت سمجھ کر پرستش کرتے ہیں ، مجاز سے حقیقت پر نہیں پہنچتے ، اسی طرح وہ نیکی کو فقط الفاظ میں ذکر کرکے نکوکاری کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ ان کی نوکِ زباں پر ذکر ایسا ہوتا ہے جیسے طاق میں کھلونے ، جو محض زیبائش اور آرائش کے واسطے رکھے جاتے ہیں ۔ ایسی بدنفسی پھیل جاتی ہے کہ دل میں کسی نیکی کا خیال اور ادب نہیں رہتا ۔ نکوکار کی نیکی کی تاویلیں کرکے بدی بنا دیتے ہیں ۔ کسی بزرگ ، شجاع ، سخی نے خواہ کیسی ہی نیک نیتی کے سبب سے کام کیے ہیں ، وہ اس کی وجوہ بیہودہ بتائیں گے ۔ اگر کسی بڑے عالم کے علم کا بیان ہو تو کہہ دیں گے کہ واللہ اس کو علم سے بہرہ نہیں ہے ، فقط چند مسائلِ علمیہ یاد کر رکھے ہیں ۔ ان کا حال حیوانات کا سا ہے جو افعال اور اقوالِ انسانی کی نقل اتارتے ہیں ، جیسے طوطے اور بندر ۔ ایسے ہی زاہد متبرّک کو ریاکار اور عابدِ مقدّس کو مکّار بتلا دیں گے کہ انھوں نے تزویر کا جال عوام کے شکار کرنے کے لیے پھیلا دیا ہے ۔ غرض وہ اپنے اوپر

قیاس کر کے ساری دنیا کو بدافعال اور زشت کردار جانتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہی بہت سے کام اخلاق ، عدالت ، شجاعت کے کرتے ہیں جو عوام کی نظر میں نیک معلوم ہوتے ہیں ۔ مگر ان کی محرّک خود غرضی ہوتی ہے ، نیکی نہیں ہوتی ۔ ان کے کرنے میں مطلبِ سعدی دیگر است ۔ معلوم نہیں فقیر کیا ڈالتا ہے اور کیا نکالتا ہے ۔ ایسا ہی حال ساری دنیا میں اُن کا ہے جو نیکی کر رہے ہیں یا کر چکے ہیں ۔ ان کو ریا کاری میں ایسا ملکہ ہوتا ہے کہ اپنے حبِّ جاہ اور شہرت اور ناموری کے اغماض کو رفاہِ عام اور جمہورِ انام کے فائدۂ عام کے لباس میں بالکل چھپا دینا اُن کے نزدیک کوئی بات نہیں ہوتی ۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس قوم میں لوگ اپنی بدکاریِ نفس پر قیاس کر کے ساری دنیا کو اپنا ہی سا سمجھتے ہیں ، بلکہ اپنے سے بھی بدتر ، وہ ادبار کے گڑھے میں روز بروز گرتے جاتے ہیں ۔ نہ آپس میں یک رنگی اور یک جہتی پیدا کرتے ہیں ، نہ ایک دوسرے کی عزت دل میں رکھتے ہیں اور نہ دوسری قوموں میں عزّت اور اعتبار پیدا کرتے ہیں ، بلکہ اور زیادہ ذلیل اور خوار ہوتے ہیں ۔ اس لیے اپنے نفس پر قیاس کرنا چھوڑو چھوڑو ۔

۳۴۔ ہم ایک ہی چیز کے لیے روتے اور ہنستے ہیں

کیا تماشا ہے کہ ہم ایک ہی چیز کے واسطے گریہ و خندہ کرتے ہیں ۔ اس کو شادی اور غمِ توام کہتے ہیں ۔ تاریخ میں صدہا مثالیں دیکھتے ہیں کہ بادشاہوں کی میدانِ جنگ میں معرکہ آرائیاں ہو رہی ہیں اور طرفین سے اپنے ہمسروں کے سر کاٹنے کے لیے لاکھوں روپے کے انعام کے اشتہار دیے جا رہے ہیں ۔ مگر جب ہمسر دشمن

کے سر کٹ کر آ گئے تو روتے ہیں ۔ سکندر[1] جب دارا[2] کے (پاس) نزع کی حالت میں گیا ہے تو اُس کا حال ان اشعارِ نظامی[3] سے معلوم ہوتا ہے :

سکندر بنالید کاے تاجدار
سکندر منم چاکرِ شہریار

چہ بودے کہ مرگ آشکارا شدے
سکندر ہم آغوشِ دارا شدے

سکندر بر آں شاہِ فرّخ نژاد
شباں گاہ بگریست تا بامداد

درو دید بر خویشتن نوحہ کرد
کہ او را ہماں زہر بایست خورد

انسان کے نفس کی عجب کیفیّت ہے کہ وہ اپنے ایک جذبے پر ایسا دورنگا نقاب ڈالتا ہے جس کے اوپر رنگ خوش نما اور

۱- سکندر : (۳۵۶ ق م— ۳۲۳ ق م) سکندر اعظم مقدونی جسے ذی القرنین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ۔ ارسطو کا شاگرد ، یونانی ریاست مقدونیہ کے بادشاہ فلپ کا بیٹا ۔ دنیا کا عظیم فاتح جس نے صرف ۳۳ سال کی عمر میں یونان ، ایشیائے کوچک ، فینیقیہ ، بابل ، مصر او فارس و ہند کی عظیم سلطنتوں کو فتح کرکے تاریخ میں نام پیدا کیا ۔

۲- دارا : یہاں دارا سے فارس کا قدیم بادشاہ دارائے سوم مراد ہے جسے سکندر مقدونی نے شکست دی تھی ۔ اس کا نام کودومان تھا ۔ یہ سلسلۂ داریوش کا آخری فرمانروا تھا (۳۳۶ ق م— ۳۳۰ ق م) ۔

۳- نظامی : (۱۱۴۰ع—۱۲۰۲ع) مشہور ایرانی شاعر جس کی شاعری نے فارسی ادب پر گہرے اثرات مرتّب کیے ۔ اس کے مشہور مجموعۂ کلام ”خمسۂ نظامی“ میں یہ پانچ مثنویاں شامل ہیں : مخزن الاسرار ، خسرو شیریں ، لیلیٰ مجنوں ، اسکندر اور ھفت پایکر ۔

روح افزا اور اُس کے نیچے رنگ غم افزا اور جاں گزا ہوتا ہے۔ جب دولت مند کے مُورث مرتے ہیں تو ان کے وارثوں کے آنسو نقاب کے اندر مسکراتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں نفس میں ایسی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں کہ متضاد جذبات جوش و خروش میں آتے ہیں۔ بعض واقعات کے پیش آنے سے، جیسا کہ ہمارے چہرے کا حال ہوتا ہے کہ ایک رنگ اس پر آتا ہے، دوسرا رنگ جاتا ہے، اور پھر حالتِ اصلی پر آ جاتا ہے، وہی حال ہمارے نفس کا ہوتا ہے کہ وہ رنگ بدلتا ہے، مگر کسی رنگ کو ثبات نہیں ہوتا ہے۔ ہر چیز بہت سے رخ رکھتی ہے اور صورتیں بھی اس کی کچھ کم نہیں ہوتیں۔ پس نفس ابھی ایک رخ دیکھ رہا تھا تو اس کی اور کیفیت تھی کہ وہ دوسرے رخ کو دیکھنے لگا تو اس کی کیفیت بدل گئی۔ بچوں کو، جو نیچر کی خالص اطاعت کرتے ہیں، دیکھو کہ وہ ایک ہی چیز کے لیے ابھی ہنستے تھے، ابھی رونے لگے۔

ہم جب کبھی ایسے سفر میں جاتے ہیں جس کی صدہا تمنائیں اور آرزوئیں دل میں رکھتے ہیں، تو اپنے عزیز اور اقربا اور دوست احباب سے رخصت ہوتے ہیں، تو آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آتے ہیں۔ بسورتے ہوئے گھر سے سفر میں جاتے ہیں۔ ایسے ہی مدّت کی مفارقت کے بعد جب کہ عزیز آپس میں ملتے ہیں تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ جاہل گنواروں میں تو عورتیں آپس میں مل کر ایک رونے کا تار باندھ دیتی ہیں۔ پھر آپس میں ہنسی خوشی کی باتیں ہونے لگتی ہیں۔

میکے سے نئی دلھنیں برات کو دولھا کے گھر جاتی ہیں۔ یہ دن ان کی خوشی کا وہ ہوتا ہے جو عمر بھر میں دوسرا نہیں ہوتا۔ جس کی رات کو تخت کی رات یا جشن کی رات کہتے ہیں۔ وہ رخصت

کے وقت دولھا کے گلے میں ہاتھ ڈال کر جو گودی میں چڑھتی ہیں تو روتی ہوئی سواری تک جاتی ہیں -

محرّم کی مجلسِ عزا میں جو ہزاروں آدمی آہ و بکا کرتے ہیں، اگر ان کے دل میں یقین ہو کہ یہاں کا ہمارا زار زار رونا وہاں جنّت کی بہار دکھائے گا تو یہ غم کسی مبارک خوشی سے کم نہیں - یہ سارے رونے خوشی کے رونے کہلاتے ہیں - ابھی ہم اپنے نوکر کو گالیاں دیتے تھے، اس پر کوئی غصّے کی حد نکالنے کی باقی نہیں تھی کہ تھوڑی دیر کے بعد میاں بھائی کہہ کر اس سے باتیں کرنے لگتے ہیں - ابھی نوکر کو غصّے میں آن کر سؤر گدھا کہا تھا مگر ان ناموں کی دُم آن کے پیچھے ہمیشہ نہیں لگاتے - پھر بھلے مانس اشراف کہہ کر پکارتے ہیں - ابھی بیوی سے سرد مِہری تھی کہ جانتے بھی نہ تھے کہ کون ہے، یا تھوڑی دیر میں گرم اختلاط ہونے لگے -

نیرو[1] نے ماں کو دریا میں ڈبونے کے لیے بھیجا تھا - جب وہ ملنے آئی تو چہرہ غمگین بن گیا - بعض حکیم کہتے ہیں کہ سورج روشنی کا مخزن ہے - اس سے سارا عالم منوّر ہوتا ہے - وہ نت نیا اپنے تئیں بناتا ہے - پہلی شعاعوں کی جگہ نئی شعاعیں نکالتا رہتا ہے -

---

۱- نیرو: [۳۷ع-۶۸ع] - ایک مشہور رومی بادشاہ جس نے ۵۴ع سے ۶۸ع تک حکومت کی - مشہور فلسفی حکیم سینیکا اس کا معلّم و مؤدب تھا - جب تک حکیم سینیکا زندہ رہا اس نے ظلم و تعدی سے ہاتھ روکے رکھا - حکیم مذکور کے فوت ہوتے ہی اس نے بے گناہوں پر ظلم ڈھانا شروع کر دیا - اس نے اپنی ماں اور بیوی کو موت کے گھاٹ اتارا اور عیسائیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا - بالآخر خود بھی اذیت ناک موت مرا -

غرض اُن کے نزدیک شعاعیں علی الاتصال متواتر نکلتی رہتی ہیں۔ بلکہ شعاعوں کی وہ ریل پیل کرتا ہے کہ ان کے نکلنے میں جو وقفہ ہوتا ہے ، وہ ہم کو معلوم نہیں ہوتا ہے ۔ پس یہی حال ہمارے نفس کا ہے کہ وہ جذبات کے بھالے ایسے جلد چلاتا ہے کہ ہم کو خبر نہیں ہونے دیتا ۔

زرگریس شاہِ ایران اپنی فوج کو دیکھ رہا تھا کہ وہ یونانیوں سے لڑنے کے لیے دریاے ہلیپانٹ سے عبور کر رہی تھی ۔ خوشی سے چہرہ بشّاش بشّاش تھا کہ لاکھوں آدمیوں کا میں حکمران ہوں ۔ مگر دفعۃً چہرہ بدل گیا ۔ آنکھوں میں آنسو اِس خیال سے بھر آئے کہ سو برس کے اندر اندر ان آدمیوں میں سے کوئی زندہ نہ رہے گا ۔ غرض نفس اپنی آنکھ بدل کر چیزوں کے ایک رُخ کو چھوڑ کر دوسرے رخ کو دیکھنے لگتا ہے ۔ عزیز اور اقربا ، دوستوں کے ساتھ اپنے خیالات کو دیکھو کہ نفس اُن کی تواضع میں کیا کیا رنگ بدلتا ہے ۔ غرض نفس جب کسی کام کرنے کا اظہار کرتا ہے یا اُس کو شروع کرتا ہے تو بہت سُرتیا اور ہوشیار چالاک ہو جاتا ہے جس سے زیادہ کوئی اور شے چالاک نہیں ہے ۔ وہ ایک جذبے کو دوسرے جذبے سے جلدی جلدی بدلتا جاتا ہے ۔ اگر اس تواترِ جذبات کو ہم ایک چیز خیال کریں تو ہم اپنے تئیں فریب دیتے ہیں ۔

۳۵ - آدمی کو اپنے پیشہ و ہُنر و عہدہ و منصب کے متعلق اوصاف پیدا کرنے مقدم ہیں

بعض آدمیوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ جو اوصاف اُن کو اپنے منصب اور پیشے کے متعلق سیکھنی چاہئیں ، وہ اُن پر توجّہ نہیں

کرتے ۔ بلکہ اَور اوصاف ، گو فی نفسہ اچھے ہوں ، حاصل کرتے ہیں ، مگر وہ ان کے مناسبِ حال نہیں ہوتے ۔ یہ بلا زیادہ تر اِسی ملک کے رؤسا ، اُمرا ، راجاؤں ، نوابوں ، والیانِ ملک کے پیچھے لگی ہوئی ہے ۔ ایک والیِ ملک ہے ، اُس کی تعریف کیا ہوتی ہے کہ وہ گانا خوب ہے ، شکار کھیلتا خوب ہے ، گھوڑے پر چڑھنے میں تو جواب نہیں رکھتا ۔ یہ ساری خوبیاں اُس کی ذات میں جب محمود سمجھی جائیں کہ عدالت اور سیاست کا علم اُس کو ہوتا ہو اور رعایا کو ہر حال میں خوش حال رکھنا جانتا ہو ۔

بابر[۱] اپنی سلطنت کے کاموں میں خوب ماہر تھا ، اس لیے ''طبقاتِ بابری[۲]'' میں جو اُس نے فطرت کی چیزوں کے بیان میں فصاحت و بلاغت ترکی زبان میں دکھائی ہے ، کمال اس کا سمجھا جاتا ہے ۔

فلپ[۳] کے دربار میں جو سفیر گئے تھے ، اُنھوں نے ڈیموستھینز[۴]

۱۔ بابر : ظہیر الدین محمد (۱۴۸۳ع — ۱۵۳۰ع) ہندوستان میں مغل حکومت کا بانی ۔ نہایت جری اور بہادر بادشاہ ، جس نے سمرقند پر صرف ۲۴۰ جانثاروں کی مدد سے قبضہ کیا تھا ۔ اس کے تصنیفات میں ''دیوان ترکی'' ''بابر نامہ'' اور ''طبقاتِ بابری'' مشہور کتابیں ہیں ۔

۲۔ طبقاتِ بابری : ظہیر الدین بابر بادشاہ کی کتاب جو بقول مولانا ذکاء اللہ ترکی زبان میں لکھی گئی تھی اور اس میں فطرت کی چیزوں کا بیان ہے ۔

۳۔ فلپ : یہاں فلپ سے سکندر اعظم کا باپ فلپ مقدونی مراد ہے جس نے ایتھنز کے خطیب و حاکم ڈیموستھینز پر چڑھائی کی تھی ۔ ۳۳۶ ق م میں قتل ہوا ۔

۴۔ ڈیموستھینز : (Demosthene : ۳۸۴ ق م — ۳۲۲ ق م) ایتھنز کا عظیم یونانی خطیب ۔ سکندر اعظم کے باپ فلپ مقدونی نے ایتھنز پر قبضہ کرنے کے لیے اس پر حملہ کیا تھا ۔

کو لکھا کہ بادشاہ بہت خوبصورت ہے ، فصیح و بلیغ بڑا ہے ، شراب خوب پیتا ہے ۔ تو اُس دانش مند نے کہا کہ ان تعریفوں میں سے ایک تعریف عورت کی ہے ، دوسری سفیر یا وکیل کی ، تیسری اسفنج کی ۔ بادشاہ میں جو اوصاف ہونے چاہئیں ، اُن میں سے کوئی نہیں ہے ۔ بادشاہ وہ ہے جو میدانِ جنگ میں دشمن کو مغلوب کرے اور مغلوب کرنے کے بعد اُس پر رحم کرے ۔ وکیل عدالت میں تقریریں کرے ، نجومی فلکی کرّات اور سیّارات کا بیان کریں ، مگر بادشاہ قوموں پر فرماں روائی کے ڈھنگ جانے ۔

جو شخص اپنے اعلیٰ درجے کے کام کے تعلّقات چھوڑ کر ، ادنیٰ کاموں پر متوجّہ ہو کر کوئی خوبی پیدا کرتا ہے تو وہ خود یہ شہادت دیتا ہے کہ میں نے اپنا وقت ، جو ضروری اور فائدہ مند کاموں میں لگانا چاہیے تھا ، وہ اَور کاموں میں بُری طرح صرف کر دیا ۔

فیلقوس[1] شاہِ مقدونیہ نے جب ایک دفعہ سنا کہ اس کا بیٹا سکندرِ اعظم[2] کسی مجلس میں خوب گایا تو اُس کو بہت لعنت ملامت کی اور کہا کہ تجھ کو اس مجلس میں اچھا گانے سے شرم نہیں آئی ؟ یہی سکندر جب ایک گویّے سے کسی موسیقی کی بات پر زیادہ اُلجھنے لگا تو اُس گویّے نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ خدا وہ دن نہ دکھائے کہ حضور ان موسیقی کی باتوں میں مجھ سے زیادہ ماہر ہو جائیں ۔

ایک فصیح بیان ، تیز زبان نے ایک بادشاہ کو طنزاً یہ سنایا کہ آپ میں وصف کیا ہے ؟ بہادر بڑے ہیں ، تیر انداز ، نیزہ باز یا

۱۔ فیلقوس : یعنی سکندر اعظم کا باپ فلپ مقدونی ۔
۲۔ سکندر اعظم کے لیے دیکھیے حاشیہ سابق ۔

کوئی اور ہتھیار چلانا خوب جانتے ہیں ؟ بادشاہ نے نہایت ملائمت سے جواب دیا کہ میں ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوں ، مگر فرماں روائی کرنی خوب جانتا ہوں - یہ سن کر وہ قائل ہو گیا -

روزمرہ دیکھتے ہیں کہ لوگ اپنے کام سے غفلت اختیار کر کے اور اور کاموں میں محنت کرتے ہیں - ڈپٹی کلکٹر ہیں ، شعر خوب کہتے ہیں ، مرثیے خوب پڑھتے ہیں - وہ یہ نہیں سمجھتے کہ مرثیے پڑھنے سے کوئی ہمارا درجہ اور نہیں بڑھ جائے گا ، بلکہ اُلٹی آہ اُن غریب بھوکے بھلے مانسوں کی ہم پر پڑے گی جو محرّم کی بدولت سال بھر کی روٹیاں کما لیتے ہیں - جن کاموں میں ہم دن رات مصروف رہتے ہیں ، وہ ہم کو اپنے کام میں نالائق بناتے ہیں ، ترقی ہو تو کیونکر ؟ مصنف ہیں ، گنجفہ[1] خوب کھیلتے ہیں - وکیل ہیں ، چوسر شطرنج میں دن رات لگے رہتے ہیں اور پھر جھینکتے[2] ہیں کہ وکالت نہیں چلتی ، منصفی میں نالائقوں کا درجہ بڑھتا ہے - آدمی اپنے اوپر یہ فرض سمجھے کہ جو اُس کا کام ہو ، پہلے اُسے اچھی طرح جانے ، پھر دوسرے کام کو ہاتھ لگائے -

۳۶- بچوں کی تعلیم ، یعنی قوائے عقلیّہ و جسمانیّہ کا اُستوار ہونا

تمام علوم میں کوئی مسئلہ ایسا مشکل نہیں جیسا کہ بچوں کی تعلیم کا کہ جس کے حل کرنے میں ہزار ہا ، صدہا عقلا و حکما و علما نے اپنا دل و دماغ خرچ کیا ، مگر ان کی اختلافِ آرا کے سبب

۱- گنجفہ : تاش کی طرح کا ایک کھیل (دیکھیے حاشیۂ سابق) -

۲- جھینکنا : شاکی ہونا ، دکھڑا بیان کرنا ، مصیبت دہرانا ، افسوس کرنا ، پچھتانا -

سے وہ ایسا حل نہ ہؤا کہ جس میں کوئی ایسی گرہ نہ باقی رہتی کہ جس کے کھولنے میں آیندہ نیک نہاد عاقلوں کو مشکل نہ پڑتی۔ میں ان دانش مندوں کی رایوں میں سے وہ چند رائیں منتخب کرتا ہوں کہ جن کو اپنے اہلِ ملک کے لیے مناسب جانتا ہوں۔

یوں تو تعلیم کا اطلاق ہر پیشہ و ہُنر و علم و فن کے سیکھنے پر ہوتا ہے، مگر لکھنے پڑھنے کی تعلیم پر زیادہ تر۔ وہی سب سے زیادہ عمدہ قسم اس کی سمجھی جاتی ہے، اگر شائستہ طور پر ہو، ورنہ وہی سب سے بدتر ہے کہ جو انسان کو پڑھا لکھا حیوان بناتی ہے۔ یہ بات ہر کسان کے لیے آسان ہے کہ کھیت میں بیج بکھیر دیتا ہے، مگر جب بیج پُھوٹ کر پود نکلتی ہے تو اس کو یہ تردّدات پیش آتے ہیں کہ کیونکر ان کو غذا کھلائے، پانی پلائے، کس طرح بیماریوں کی ہوا سے بچائے اور دشمنوں کے سائے کو پرے ہٹائے۔ صدہا طرح کی آفاتِ ارضی و سماوی ان کے پیچھے لگی ہوئی ہیں جن میں سے بعض کو اپنے علم و ہُنر سے وہ دور کر سکتا ہے، مگر بعض وہ ہیں کہ جن سے بچانا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ غرض بہت سے تردّد اور فکر کے بعد اس کو یہ دن نصیب ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کے بوئے ہوئے بیجوں کا پھل کھاتا ہے۔ پس بعینہٖ کسان کا سا حال انسان کا ہے کہ اولاد کا جنوا دینا اس کو آسان ہے، ہر کوئی جانتا ہے، مگر اس کا پالنا، تعلیم دینا، تربیت کرنا سخت دشوار ہے۔ بہت سی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں، جب وہ پروان چڑھتی ہے۔

آدمی کے بچے ریچھ اور بندر کے بچے تو ہوتے نہیں کہ بچپنے ہی سے ان کا مقتضائے طبیعت اور میلانِ خاطر معلوم ہو جائے کہ اس کے موافق ان کی تعلیم و تربیت شروع ہو۔ گو بچوں کے بُشرے

سے ، صورت کے قیافے سے عاقل تفرّس[1] کرتے ہیں کہ کس تعلیم کا مادہ اس میں ہے ۔ پنڈت جی بھی اپنی پوتھی سے بِدھ[2] ملا کے جنم پترے میں لکھ دیتے ہیں کہ کن گُنوں میں گُنوان[3] اور وِدیاؤں[4] میں بِدمان[5] ہوگا ۔ نجوسی مولود کے طالع[6] سے ، نجوم کے حساب کے موافق ، بتلاتے ہیں کہ ان کی طبیعت کا میلان کس کس طرف ہوگا اور کون سا علم و ہُنر ان کو آئے گا ۔ مگر تجربہ ان سب کو غلط ثابت کر دیتا ہے ۔

صدہا بچے ایسے ہوتے ہیں کہ جو ابتدا میں اُن کی طبیعت کی علامات ظاہر ہوتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان اصول اور قوانین کو اختیار کریں گے ، مگر بڑے ہونے پر وہ سب علامتیں مٹ جاتی ہیں ، (ان کو) اس اصول اور قوانین سے کوئی تعلق نہیں رہتا ۔ بہت سے صاحبِ کمال ایسے گزرے ہیں جنھوں نے وہ اپنی خوبیاں اور نیکیاں ، کمال ہنر بڑے ہونے پر دکھلائے جن کے کچھ آثار ایامِ طفلی میں نمایاں نہ تھے ۔ غرض بچپنے میں طبیعت کی قدرتی اہلیت مدتوں تک پردے میں رہتی ہے اور کوئی اعتماد اُن پر اور بھروسا نہیں ہوتا ، اس لیے بچے مدتوں تک اس بے خبری میں ایسی تعلیم پاتے رہتے ہیں کہ جس کے لیے اُن کی طبیعت موضوع

۱۔ تفرّس : اول نظر میں دیکھتے ہی کسی شے کو اس کے علامات اور آثار سے پہچان جانا ۔ قیافے سے پہچان لینا ۔ دانائی ۔ (نور اللغات)

۲۔ بِدھ ملانا : زائچہ مطابق کرنا ، جنم پتریاں ملانا ۔ (نور اللغات)

۳۔ گُنوان : ہنرمند ، گُنی ۔

۴۔ وِدیا : علم ، ہنر ۔

۵۔ بِدمان یا وِدوان : عالم و فاضل ۔

۶۔ طالع : ستارہ ۔ نیک ستارہ ۔

اور موزوں نہیں ہوتی -

کیا یہ امر دشوار ہے کہ ہم ابتداے عمر ہی سے بچوں کے لیے تعلیم کی وہ راہِ مستقیم اختیار کریں کہ جو ان کے مقتضاے طبیعت اور میلانِ خاطر کے موافق ہو - اس لیے ہم ان کی وہ تعلیم شروع کر دیتے ہیں جس کو ہم در حقیقت فائدہ مند جانتے ہیں ، گو یہ نہ معلوم ہو کہ بچوں کی طبیعت میں کس تعلیم کی فطرتی قابلیت اور جبلّی اہلیت ہے -

۳۷- معلّم اور طالب العلم

لڑکوں کی تعلیم کا سارا مدار معلّم پر ہے - معلّم کا فقط صاحبِ علم ہونا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ لازم ہے کہ وہ نیک کردار ، راست گفتار ، خوش اطوار ، نیک وضع ہو ، طریقۂ تعلیم سے ماہر ہو - اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے معلّم شاگردوں کے کان میں اپنی آوازِ بلند اِس طرح ڈال رہے ہیں جیسے کوئی بوتل میں کیفی[1] سے سرکہ بھرتا ہے - ان کا حکم طالب العلموں کو ہے کہ وہ ہماری سنیں اور اپنی نہ کہیں - جو سبق لیں اُسے بار بار پڑھیں - مگر یہ حقیقۃً[2] معلّموں کی غلطی ہے اور طلبہ کی ترقی کو روکتی ہے - معلّم پر لازم ہے کہ وہ فقط اپنے ہی ذہن کی مخترع باتوں کا بیان نہ کیا کرے بلکہ وہ طلبہ کو اجازت دے کہ جو بات انھوں نے اپنے مطالعے اور ذہن سے نکالی ہو وہ بیان کریں - جب وہ بیان کریں ، اگر اُن کے بیان میں غلطیاں ہوں تو اُن میں سے بعض کو خود

۱- کیفی = کیف - مائع چیز بوتل میں ڈالنے کے لیے استعمال ہونے والا آلہ -
۲- اصل (ص ۵۲) میں ''حکومت'' ہے -

درست کر دے ، بعض کو کہہ دے کہ وہ خود صحیح کر لیں ۔

جو اچھے معلّم ہوتے ہیں ، جب طلبہ اُن کے آگے سبق لے کر بیٹھتے ہیں تو وہ خود کچھ نہیں بولتے بلکہ طلبہ خود بیان کرتے ہیں کہ آج اپنے مطالعے میں اِن باتوں کو نکال کر لائے ہیں ۔ جب وہ سب سن لیتے ہیں تو اپنی تقریر کرتے ہیں ۔ غرض بغیر مطالعے کے علم میں ترقی نہیں ہو سکتی ۔

معلّم کو چاہیے کہ وہ طلبہ کو مطالعے کی عادت ڈلوائے ، جس کا رواج روز بروز کم ہوتا جاتا ہے ۔ جو کچھ اُستاد سکھاتا ہے وہ بہت تھوڑا ہوتا ہے ۔ مطالعہ ہی اس تھوڑے کو بہت بناتا ہے ۔ جو آدمی کسی علم و ہنر و فن و کام میں پایۂ بلند حاصل کرتا ہے اُس کو دو طرح کی تعلیم کا فیض ہوتا ہے : ایک اُستاد کی تعلیم کا جو زیادہ نہیں ہوتا ہے ، دوسرا اپنے مطالعے کا ، اپنی تعلیم میں کوشش کا ۔ جو کوئی کامل اُستاد ہوا ہے ، وہ اپنے اِس مطالعے کی بدولت ہوا ہے ۔

معلّموں کی یہ حرکت نہایت نازیبا و نامناسب ہے کہ وہ طالب علموں کو مشفقانہ نصیحت اور مربّیانہ موعظت و شریفانہ طور سے علم کی طرف رغبت نہیں دلاتے بلکہ وہ ڈنڈے ، تسمے ، بید ہاتھ میں رکھتے ہیں ۔ سبق پڑھانے کے (وقت) چہرہ غضب ناک بناتے ہیں ۔ مدرسوں کو جیل خانہ (بناتے ہیں) اور لڑکوں کو بندھوا کے بیدوں سے ان کی اصلاح کے درپے ہوتے ہیں ۔ وہ بڑی خطا کرتے ہیں ۔ اس کا اثر لڑکوں پر یہ ہوتا ہے کہ وہ مدرسے میں داخل ہونے کے وقت ایسے برے نہیں ہوتے جیسے کہ خارج ہونے کے وقت ہو جاتے ہیں ۔ ساری اُن کی فطرتی جودت و ذکاوت مر جاتی ہے ، انسان سے حیوان ہو جاتے ہیں ۔

بعض اُستاد لڑکوں پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ بار بار وہ لگاتے

ہیں کہ ان کو جھڑکی گھُرکی سب مساوات ہو جاتی ہے - حیا و شرم جاتی رہتی ہے ، چکنے گھڑے بن جاتے ہیں - استاد کا چہرہ غصّے سے بنانا اور ہاتھ میں لکڑی کا ہلانا چھوٹے لڑکوں کو دہشت دلاتا ہے - اور چھوٹے بچے کے دل میں رعب اور خوف کا سمانا ایسا برا ہے جیسا کہ ایک نرم اور نازک پودے پر بادِ صرصر کا تند جھوکا یا پھول پر لُو کا چلنا -

لڑکوں کو شیریں کلامی کی چاٹ نہیں چکھائی جاتی بلکہ تلخ کلامی کا زہر چکھایا جاتا ہے - حسنِ خلق کے گلدستوں سے ان کا دماغ معطّر نہیں کیا جاتا بلکہ معصوموں کے نازک رخساروں پر مار کے نیلے و سرخ نشانوں سے لالہ و نافرمان کھلائے جاتے ہیں - اِس طرح تعلیم ، جو آزادی اور عزت کے لیے ہوتی ہے ، ہرگز نہیں ہو سکتی - جن قوموں کے بچے مکتب میں جوتیاں کھائیں گے ، وہ کیا خاک فرماں روائی کر سکیں گی -

مدرسے کو تو ایک انبساط و نشاط کی تصویر بنانا چاہیے کہ جس کی طرف بچوں کی آنکھیں شوق سے لگی رہیں - جہاں ان کو فائدہ حاصل ہوتا ہے ، وہاں خوشی بھی ہونی چاہیے - جو کھانا ان کو ہضم ہوتا ہو ، اس میں مصری کی ڈلیاں ملانی چاہییں ، نہ یہ کہ زہر - اگر گانا ناچنا معیوب گنا جائے تو خوش الحانی سے غزل خوانی کی اجازت دی جائے - ہر قسم کی ورزش کی ، کھیلنے کودنے ، دوڑنے ، اُچھلنے ، پھلانگنے ، زقندیں مارنے کی اجازت دینی چاہیے - ان کو سردی ، گرمی ، ہوا اور سورج کی تکالیف کے متحمّل ہونے کی عادت ڈلوانی چاہیے - غرض فرزانگی کے ساتھ مردانگی پیدا کرنی چاہیے جس سے وہ کسی خوف سے نہ ڈریں - کھانے پینے میں ، مکان میں ، اوضاع و اطوار میں وہ باتیں جس سے ایک نامردی اور بزدلی اور

زنانہ پن آئے ، ان سے دور رکھنا چاہیے - غرض وہ عادتیں اُن میں پیدا کرو کہ زورآوری اور تنومندی ان کی بڑھے ، سختی اٹھانے کی عادت ہو ، حوادثِ روزگار سے متأثر و متاذّی[1] نہ ہوں - کوئی تلخ دارو پینی پڑے تو اسے کشادہ پیشانی سے پیئیں - غرض اصل شائستگی کی بنیاد ان میں قائم ہو -

بعض اوقات طلبہ اپنی عادات عجیب و غریب ایسی بنا لیتے ہیں کہ سیب کی بو سے دماغ پھٹا جاتا ہے ، ملائی کی صورت سے جی متلاتا ہے ، پھریریاں آتی ہیں ، مرغ کی آواز سے وحشت ہوتی ہے ، گلبدن[2] کی توشک بغیر سو نہیں سکتے ، پھول جب تک سرہانے نہ رکھے جائیں نیند نہیں آتی ، پاؤں کی چپّی جب تک نہ ہو پلک سے پلک نہیں جھپکتی - ذرا سی آواز چڑیا کی کان میں آئی تو ذہن میں مضمون آیا ہوا اڑ جائے - روز دوا اور چورن نہ کھائیں یا سوڈا واٹر کی بوتل نہ اڑائیں تو غذا پیٹ میں امانت کی امانت رہے - کھچڑی کھاتے پھونچا اترے - معلّم کو اس پر نظر رکھنی چاہیے کہ ایسی دیوانہ وار عادتیں اُن میں نہ پیدا ہوں کہ عمر بھر ان کی ہنسی لوگ اڑایا کریں اور چھیڑا کریں -

طالب علموں کو کتابوں کا غلام بنانا نہیں چاہیے - نہ اُن پر چودہ گھنٹے کے پڑھنے کی تاکید کرنی چاہیے - بڑی تعطیلوں میں اُن کو مطالعے سے باز رکھنے کی ہدایت کرنی چاہیے اور سمجھانا چاہیے کہ وہ صرف تمھاری تفریح کے لیے ہیں - کتابوں کو بالائے طاق رکھ کر خوب سیر تماشے سے دل بہلاؤ ، پڑھنے کو بھول جاؤ ، ہفتے میں ایک روز ضرور تعطیل مناؤ -

---

۱- متاذّی : ایذا رسیدہ -

۲- گلبدن : ایک قسم کا دھاری دار ریشمی کپڑا - (نور اللغات)

۳۸- کتاب بینی

کتاب بینی کی دو صورتیں ہیں : اول صورت یہ کہ کتابوں کے کیڑے بن جاتے ہیں اور مطالعے میں سرتاپا ڈوب جاتے ہیں۔ بن مانس کی سی صورت بناتے ہیں کہ ناخن بڑھے ہوئے، بال پریشان بکھرے ہوئے۔ نہ کبھی اصلاحِ خط کرائیں، نہ کبھی سر میں کنگھی کریں، نہ بدن پر پانی ڈالیں، نہ میلے کپڑے بدن سے جدا کریں۔ غرض نہ تن کا ہوش ہے، نہ بدن کی خبر ہے۔ مجذوب و مسلوب الحواس بن گئے۔ کچھ فقر و فاقہ و افلاس کا بھی فکر نہیں۔ نہ گورنمنٹ کی نوکری ہو سکتی ہے، نہ تمنّا ہے۔ نہ اپنے تئیں کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں، نہ دوسرے کو فیض۔

دوسری صورت یہ ہے کہ غیروں کے نفع و نقصان کو خوب سمجھتے ہیں مگر اپنے فائدہ نقصان سے باخبر نہیں ہوتے۔ معاملات کے کلیات تو ذہن میں ہیں مگر جزئیات میں ان کا عمل نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی قوم کی ترقی و تنزّلی کے اسباب پوچھیے تو خوب اس کے کلیات برزبان ہیں، مگر شخصی معاملات، جو اپنی ذات سے متعلق ہیں، انھیں پوچھیے تو بغلیں جھانکتے ہیں۔ وہ اکثر حکمت و فلسفہ و تصوّف کی کتابوں میں خیالی مضامین پڑھتے ہیں جن کا عملی ہونا دشوار ہے۔ مثلاً انھوں نے دنیا کی بے ثباتی اور فقر و افلاس کے مضامین کو کتاب میں پڑھا، جو بڑے فصاحت و بلاغت سے لکھے ہوتے ہیں، اور ان کا اثر دل پر ایسا ہوا کہ وہ افلاس کو اچھا جاننے لگے، اور سمجھنے لگے کہ دولتِ دنیا کی جستجو میں ذلیل و خوار پھرنا حماقت ہے۔ فقر و درویشی میراثِ پیغمبراں ہے۔ خدا ہم کو وہ شے عطا کرے جس سے ہم بھی خاصانِ خدا میں داخل ہوں۔

مگر جس وقت افلاس آن کر گھیرتا ہے تو سارا یہ علم ناک کے رستے نکل جاتا ہے ۔ آٹے دال کے لیے گھی کو روغنِ زرد کہنا پڑتا ہے اور معلوم نہیں کہ کیا کیا اور کام کرنے پڑتے ہیں ۔

بعض وقت جو تم دیکھتے ہو کہ بڑے بڑے عالم متبحّر ترکِ دنیا کر کے گوشہ گزیں ہو گئے ، تو اس کا سبب یہ ہے کہ کتاب بینی کی کثرت نے ان کو دنیا کے کام کا نہیں رکھا ۔ دنیا کی ناتجربہ کاری نے ان کو سمجھایا کہ تم دنیا میں کیوں احمق بن کر رہو ۔ مسجد ، خانقاہ کا کونہ آباد کرو ۔ وہاں تمھارا گزارا خاصا ہو جائے گا ۔

غرض کتابوں کے مطالعے کا یہ نتیجہ ہونا چاہیے کہ طالب علم یہ سمجھے کہ دنیا کے اندر کیا کیا معاملات پیش آتے ہیں ، وہ کیوں کر فیصل ہوتے ہیں ۔ نہ یہ کہ دنیا کے کاموں سے ایسا دل و جان سے بیزار ہو جائے کہ ذرا سا کام پہاڑ معلوم ہو ۔ ایسا شخص علم کی راہ سے دنیاداری کی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچے گا اور بہت سی ٹھوکریں کھائے گا ۔ سارا توکل اور صبر خاک میں مل جائے گا ۔ وہ فقر و افلاس کا جمال ، جس نے فریفتہ کیا تھا ، وہ اب وبالِ جان ہو جائے گا ۔ ان طلبہ کا حال ایسا ہوتا ہے کہ جیسے کسی جوان شخص کو مشاطہ جُل دے کر یہ یقین کرا دے کہ تو اُس عورت سے شادی کر لے جس کا حسن و جمال حور و پری سے کم نہیں ۔ مگر جب وہ بیاہ کر کے دلھن کو دیکھے تو ایک چڑیل ، بدصورت ، کج اخلاق ایسی ہو کہ دنیا ہی میں جہنم کا مزہ چکھا دے ۔ پس وہ جو کتاب بینی سے خیالی پلاؤ پکائے تھے ، کہ فقر و فاقہ اختیار کر کے جو ہم گزاریں گے تو بادشاہ ہمارے آگے دست بستہ کھڑے ہوں گے ، وہ سب کافور ہو جاتے ہیں ۔ دل اپنا ہی اپنی حالت

پر ملامت کرتا ہے کہ یہ کیا کیا - مگر مجبوراً اس کو افشا بھی نہیں کرتے ، اس لیے مکر اختیار کرتے ہیں -

غرض یہ دونوں صورتیں بری ہیں - اسی لیے بعض عقل مندوں کی یہ رائے ہے کہ جو کتابوں سے علم حاصل ہوتا ہے ، وہ چنداں بکارآمد نہیں ہوتا - طالب علموں کو چاہیے کہ جلد تحصیلِ علم سے فارغ ہو کر عقل و فرہنگ بڑھائیں اور دنیا کے معاملات و کاروبار میں ان کو کام میں لائیں - جو دماغ میں علم ہے وہ اس لیے نہیں ہے کہ اس کو معطّل کر دیں ، جس سے وہ زنگ آلود ہو کر کسی کام کا نہ رہے - بلکہ اس کو اپنے احتظاظ[1] اور اَوروں کے التذاذ[2] میں خرچ کرنا چاہیے ، تجربے سے اسے اَور بڑھانا چاہیے ، اپنے تئیں اَوروں کو فائدہ پہنچانا چاہیے -

بہت سے دانش مندوں کی یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ بہت دنوں تک پڑھنا نہیں چاہیے - فرانسیسیوں کے ہاں یہ کیا خوب ضرب المثل ہے کہ تعلیم بہت جلد شروع ہونی چاہیے ، مگر دیر تک جاری رہنی نہیں چاہیے - مگر افسوس ہے کہ یہاں ہندوستان میں اس پر عمل نہیں ہو سکتا - کالج کی تعلیم میں بہت زمانہ گزر جاتا ہے - بعض طلبہ کا دماغ تو کالج ہی کی تعلیم میں ایسا ضعیف ہو جاتا ہے کہ وہ بعد تعلیم کے کسی بڑے کام کے لائق نہیں رہتا -

۳۹- معلّموں کی تعلیم و طلبہ کی استعداد اور امتحان

بعض صاحبِ استعداد معلّموں کی عادت ایسی ہوتی ہے کہ وہ طلبہ کے سامنے بہت سی باتیں ایسی فرماتے ہیں کہ جن کا سمجھنا

۱- احتظاظ : لطف اٹھانا - ۲- التذاذ : لذت حاصل کرنا -

طلبہ کی استعداد سے باہر ہوتا ہے ۔ شاگرد اور استاد کی قابلیتوں میں ایک اندازۂ مناسب کے ساتھ مناسبت ہونی ضرور ہے ۔ گو کسی چیز کا ایک اندازۂ مناسب مقرر کرنا بڑا دشوار کام ہے مگر جو صاحبِ فہم و ذکا ہیں ، وہ اپنی قابلیت اور استعداد کو جتنا چاہیں کم کر کے شاگردوں کے مناسبِ حال بنا سکتے ہیں ۔ جیسے گھوڑا خواہ کیسا ہی تیز رفتار ہو اس کی چال ایسی کم ہو سکتی ہے کہ بچے کو اس پر سوار ہونا مشکل نہ رہے ۔ پہلوان خواہ کیسا ہی شہ زور ہو وہ اپنے زور کو ایسا کم کر سکتا ہے کہ ایک لڑکے سے لڑنت کرے اور لڑکے کو معلوم نہ ہو کہ میں پہلوان سے کشتی لڑ رہا ہوں ۔ ہاں یہ سچ ہے کہ پہاڑ پر چڑھنے سے اترنے میں زیادہ خطر ہے ۔ غرض تعلیم کا فائدہ جب ہی پورا ہوگا کہ استاد اور شاگردوں کی استعداد میں مناسبت ہو اور کوئی بات طلبہ کی لیاقت سے زیادہ نہ کہی جائے ۔

میں نے کالجوں میں دیکھا ہے کہ بعض نیک نہاد ، عالی استعداد انگریز پروفیسر گھنٹوں لیکچر دیتے ہیں ، مگر فقط اس سبب سے کہ ان کی اور طلبہ کی لیاقتوں میں کوئی مناسبت نہیں ہوتی ، بہت محنت ان کی اکارت جاتی ہے ۔

ہمارے کالجوں اور اسکولوں میں یہ دستور مجبوری سے ہو گیا ہے کہ طلبہ ، جن کی طبیعت اور ذہانت مختلف درجے کی ہوتی ہیں ، وہ ہم سبق ہو کر ایک جماعت میں پڑھتے ہیں اور پہلے سے ان کے واسطے ان کی خواندگی اور ان کے پڑھنے کی مدّت معیّن ہوتی ہے ۔ استاد سب کو ایک سبق دیتا ہے ، سب کے سامنے وہ ایک ہی تقریر اور تحریر پیش کرتا ہے ، سب کو ایک ہی ہدایت کرتا ہے ۔ پس جن دو چار کی ذہانت و قابلیت اس خواندگی اور مدّتِ تحصیل کے موافق ہوئی ، وہ لائق و فائق ہو گئے اور باقی اپنی استعداد اور قابلیت کے

موافق کچھ اور ہو گئے - یہی سبب ہے کہ کسی کالج میں کوئی گروہ کا گروہ لائق طلبہ کا نہیں پیدا ہوا - اگر ہر کالج کے لائق طلبہ کو شمار کیجیے تو ان کو انگلیوں پر گن لیجیے -

ہمارے مدرسوں میں طلبہ کے سبق سننے کا یا ان کے تحریری امتحان کا طریقہ ایسا ہے کہ جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ الفاظ اور ان کی ترکیب طلبہ کے ذہن میں محفوظ ہیں، مگر اس پر مطلق خیال نہیں ہوتا کہ اصل معانی اور مغزِ سخن طلبہ کے ذہن میں حاضر ہو، اور اس کے موافق اپنی زندگی کے بسر کرنے کے اندر عمل کرتے ہوں اور سینکڑوں طرح سے ان کو بدل بدل کر مختلف مقاصد و مطالب میں برتتے ہوں - مثلاً استاد لڑکوں کو سچ کی بابت سبق پڑھاتا ہے، تو فقط اس سبق کے الفاظ اور ترجمہ و ترکیب کو پوچھے گا - اس پر خیال نہیں کرے گا کہ اس سبق پر عمل کر کے طلبہ راست کردار اور گفتار بھی ہوئے یا نہیں، جس سے اصل مطلب تعلیم کا حاصل ہوتا ہے - اس غذا سے کیا فائدہ ہے کہ ادھر کھائیں ادھر اوک کر کے قے کر دیں جس سے معلوم ہو کہ معدے نے اس غذائے ناملائم کو نہیں قبول کیا، اس لیے اس نے اپنا کام کر کے ہضم نہیں کیا - اگر وہ ہضم کرتا تو غذا کو بالکل بدل کر کچھ سے کچھ بنا دیتا -

پس اسی طرح اگر شاگرد کوئی چیز سیکھتا ہے اور اس کی اپنے ذہن سے نئی نئی صورتیں بنا کر اپنے کام میں نہیں لاتا تو جان لینا چاہیے کہ غذائے ناملائم کی طرح اس کے ذہن اور طبیعت نے سبق کو نہیں قبول کیا - ایسی تعلیم سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا - الفاظ کی تحقیق، فقروں کی ترکیب کی تدقیق فقط حافظے میں ایک چیز کا امانت رکھنا ہے - یہ علم بر زبان اور کتابی علم خالی زیور ہے -

کوئی ایسی مستحکم بنیاد نہیں کہ جس پر کوئی علم کی عالی شان عمارت قائم ہو۔

اے طالب علمو! تم کو چاہیے کہ جو چیز پڑھو، اس کو سمجھو، چھان بین کرو۔ ذہن کو اوروں کے بھروسے پر نہ چلاؤ۔ غیروں کے خیالات کے آرزومند ہو کر مقلّد نہ بنو ورنہ تمھارے سر پر تقلید کا وہ پہرہ جم جائے گا جو تمھارے ذہن و فہم کو زنجیروں میں پابند رکھے گا۔ یہ غلامی تمھارے فطری جوہرِ جودت کو زائل کر دے گی، آزادیِ فہم و رائے کی صورت کبھی خواب میں بھی نہیں دکھائے گی۔

غیروں کے بھروسے اور اعتماد پر بات کو نہ مان لو۔ جب حکما، عقلا اور علما کے مسائل اور اور اقوال کے اندر اختلافِ رائے دیکھو، ان میں سے کسی کو پسند نہ کرو۔ اگر پسند کرنے کی قابلیت نہ رکھتے ہو تو اس کو حالتِ مشتبہ میں رہنے دو، کیونکہ آدمی کو جیسی محبت علم سے ہے، ایسی ہی ظن اور شک و شبہ سے چاہیے۔ کیونکہ دنیا کی ساری باتیں تو تحقیق ہو کر یقین کے مرتبے پر نہیں پہنچ گئیں۔ زیادہ تر تو ابھی معرضِ اشتباہ میں پڑی ہیں۔ جب آدمی کسی بادشاہ کے ماتحت نہیں ہوتا تو اپنی حفاظت کی آپ فکر کرتا ہے۔ پس جو شخص تقلید کو اپنا حاکم نہیں بناتا، تحقیق کو فرماں روا بناتا ہے، وہی کسی چیز کا محقّق بن سکتا ہے اور کوئی نئی چیز پا سکتا ہے۔

تم شہد کی مکھی کو دیکھو کہ وہ کبھی اس باغ میں گل و لالہ پر اور کبھی اس چمن میں یاسمین و نسترن پر بیٹھتی ہے اور پھولوں کا رس چوستی ہے۔ پھر اپنی محنت و استعداد اور استقلال سے سب رسوں کو ملا جلا کر ایسا بدل دیتی ہے کہ خالص شہد

بن جاتا ہے اور خاص اُسی کا کہاتا[1] ہے - کوئی نہیں کہتا کہ یہ اِس پتّی کا رس اور اُس گل کا عرق ہے - پس تم بھی بوستانِ علم میں شہد کی مکھی بن کر مختلف اربابِ علم کے مسائل کے پھولوں سے استخراج اور استنباط کرو اور سب کو ملا کر اپنے ذہن کے سانچے میں ڈال کر ڈھال لو کہ وہ علم خاص تمہارا ہو جائے ، خواہ تم کو یاد رہے یا نہ رہے کہ ہم نے کہاں سے یہ مصالحۂ[2] علمی بہم پہنچایا تھا - تم کو اس کے اظہار کی ضرورت بھی نہیں - لوگ عمارت کی نمائش اور اسباب کی آرائش دکھاتے ہیں مگر یہ نہیں بتلاتے کہ کہاں سے روپیہ کما کر ان میں لگایا ہے ؛ چوری سے ، لوٹ سے ، قرض سے یا کسی نیک ذریعے سے ؟

تمہارے مطالعہ و تحصیلِ علم کا[3] یہ نتیجۂ اعظم ہونا چاہیے کہ تم بے شک دانش مند ہو جاؤ ، تمہاری حالت پہلے سے بہتر ہو جائے ، تمہاری عقل روشن ہو جائے ، وہ تم کو نیک و بد دکھائے ، وہی تمہاری فرماں‌روا ہو کہ تم کو کوئی کام اپنی مرضی کے خلاف نہ کرنے دے ، وہی تم سے تمہارے کاموں کا انتظام کرائے ، تم سے تحمّل کرائے - اپنے آگے سب تمہارے[4] جذباتِ نفسانی کو اندھا ، بہرہ ، اپاہج ، ناکارہ کر دے - وہ خود آزاد ہو - اگر خِرد کو آزاد نہ رکھو گے ، خود مختار نہ ہونے دو گے تو بزدل ، کمینے ، ذلیل ، رذیل ہو جاؤ گے -

جو شخص حقیقت میں ماہیتِ علم سے واقف ہے ، وہ اپنے علم

۱- کہاتا : یعنی کہلاتا ہے - ۲- اصل میں ''مصالح علمی'' تھا -
۳- اصل میں (صفحہ ۵۹) ''تحصیل کا علم'' چھپا تھا -
۴- اصل : تمہاری -

کو سچا آزاد بناتا ہے۔ وہ کچھ پابند اَوروں کے مقولوں کا نہیں رہتا۔ اپنے مقولوں کے استناد اور استشہاد کے لیے اَور کی کتابوں کو نہیں ٹٹولتا۔ ارسطو اور افلاطون کی تصنیف کو نہیں تلاش کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ سچی بات اور سچا استدلال سب کے واسطے یکساں ہے۔ یہ اَور بات ہے کہ کوئی اس کو پہلے کہے یا پیچھے۔ یہ کچھ ضروری نہیں کہ جو پہلے اسے کہے، وہ اُسی کا کہلاوے، دوسرے کا نہیں۔ ایک سچی بات خواہ افلاطون کہے یا ایک بُڑھیا کہے، دونوں یکساں ہیں۔ میرے قول کے موافق ایسی ہی ایک بات سچی ہو سکتی ہے، جیسے افلاطون کے قول کے موافق۔ میں اور افلاطون اس میں برابر ہیں۔

۴۔ گھر سے باہر جا کر پڑھنا—ورزشِ جسمانی

اکثر تجربہ کار عقلا کی یہ رائے ہے کہ تعلیم کے واسطے اولاد کا گھر سے دور رہنا اُن کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ان کو، خواہ وہ امیر زادے ہوں یا غریبوں کے بچے ہوں، بہت قسم کے مکروہات ایسے پیش آتے ہیں جو تحصیلِ علم کے مانع ہیں۔ امیر زادوں کا حال یہ ہے کہ ماؤں کا دل نرم ہوتا ہے، اولاد کے ساتھ فطرتی محبت ہوتی ہے، محبت اندھی ہوتی ہے۔ وہ اولاد کی خطاؤں کو دیکھنے نہیں دیتی۔ جو دیکھتی ہے تو ان کی اصلاح اور تادیب کے لیے جس سختی کی ضرورت ہے وہ اس کو گوارا نہیں ہوتی۔ وہ اپنی اولاد کو بڑے ناز و نعمت کے ساتھ پالتی ہے۔ ان کا بناؤ سنگار اپنے مذاق کے موافق کرتی ہے۔ اسی لیے وہ بچوں کو زیور اور گوٹے کناری کے کپڑے اپنی پسند کے پہناتی ہے۔ وہ اپنی اولاد کے لیے جفا کشی، محنت کسی قسم کی گوارا نہیں کرتی۔ ورزش میں ڈنڈ

مُگدر کو ہلا کر پسینے میں غرق ہونا، اکھاڑے میں لڑنت سے گرد آلود ہونا، ناشائستہ گھوڑے پر سوار ہونا، پھری گدکے کا ہاتھ میں لینا، ننگی تلوار کا سونتنا، بندوق تپنچے کا چھوڑنا، ماؤں کے دل میں دھڑکن[1] پیدا کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے امیر زادوں میں نزاکتِ جسمانی ایسی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کسی رنج و محنت کی برداشت نہیں کر سکتے۔ کم ہمت، بزدل، زنانہ طبیعت ایسے ہو جاتے ہیں کہ عالی ہمتی و جواں مردی کا کوئی کام ہونا ان سے مشکل ہوتا ہے۔

روحانی تعلیم کے واسطے جسمانی تعلیم لازمی ہے۔ یہ دونوں ایک جوڑی میں ساتھ جُتی ہوئی ہیں۔ اگر ان میں سے ایک گری تو دوسری ساتھ گرتی ہے۔ روح میں قوت جب تک نہیں آتی کہ جسمانی طاقت اس کی معاونت نہیں کرتی۔ اگر جسم میں ضعف آ جائے تو روح میں اس کے ساتھ ضعف آتا ہے۔ جن کے جسم ضعیف و ناتواں ہیں، وہ یہ کیفیت خود جانتے ہیں کہ ان کی روحوں کو کیا کیا تکلیفات رہتی ہیں۔ غرض امیرزادوں کی نزاکتِ جسمانی ہی ان کی روحانی تکالیف کا بھی سبب ہوتی ہے۔

سوائے اس کے جو استاد و اتالیق، امیرزادوں کی تعلیم کے واسطے مقرر ہوتے ہیں، وہ ان کے ماں باپوں کے لحاظ سے ان پر زیادہ تنبیہ و تاکید و تادیب نہیں کر سکتے۔ ان کو ہمیشہ یہ لحاظ رہتا ہے کہ یہ لڑکا ہمارے ولیِ نعمت کا صاحب زادہ ہے۔ ایک دن وراثت پا کے خود صاحبِ ریاست ہوگا۔ اِس وقت کی تادیب کا کہیں ہم سے بدلا نہ لے، اس لیے وہ زیادہ تادیب سے ڈرتے ہیں،

۱۔ اصل (صفحہ ۶۱) : دھڑکنی۔

بہ لطائف الحیل[1] اپنا کام کرتے ہیں۔

یہ امیرزادوں کا حال ہے۔ اب غریبوں کا سنو کہ ان کے گھروں میں اتنے کام دھندے لگے رہتے ہیں کہ تحصیلِ علم کے لیے فرصت فراغت کے ساتھ نہیں ملتی۔ بہت وقت آٹا دال مول لینے اور نمک مرچ کے لانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ غرض دونوں کو اپنے اپنے گھروں میں مکروہات اور موانع پیش آتے ہیں کہ وہ تحصیلِ علم میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے تعلیم کے واسطے بہتر یہی ہے کہ گھر سے دور رہ کر تحصیلِ علم و ہنر کریں۔ اس ملک میں ایسا انتظام ہے۔ دور دراز سے امیروں اور غریبوں کی اولاد آ کر تحصیلِ علم کر سکتی ہے۔

بعض اربابِ دانش کی یہ رائے ہے کہ کم عمر لڑکے تعلیم کے واسطے وہاں بھیجے جائیں جہاں کی زبان ان کی مادری زبان سے مختلف ہو تاکہ ان کو وہاں کے لوگوں کی صحبت سے ایک غیر زبان آسانی سے آ جائے۔ بڑی عمر میں زبان ایسی سخت ہو جاتی ہے کہ غیر زبان کے الفاظ کے تلفّظ کی قابلیت نہیں رہتی۔ سوائے زبان کے غیر ملک کے رسم و رواج، آئین و قوانین سے وہ واقف ہو جائیں گے۔ ان میں طلاقت اور ظرافت غیر زبان کی خاصی ہو جائے گی جس سے ان کی فہم تیز ہو جائے گی۔ ہندوستان کے اُمرا اپنی اولاد کی تعلیم کا سامان انگلستان میں مہیّا کریں تو پھر دیکھیے ان کی اولاد میں کیا عقل و تمیز پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ لطائف الحیل: لطیف اور حکمت آمیز حیلے بہانے۔

۱۴- طلبہ کا اور آدمیوں سے باتیں کرنا

طلبہ میں باہم مباحثہ ہونا بھی تعلیم کا ایک جزوِ عظیم ہے - معلّم جب دیکھے کہ طالب العلم کے پاس کچھ سرمایۂ علمی جمع ہو گیا ہے تو اس کو فہمائش کرے کہ وہ اپنے مبلغِ علم کو جزرسی اور کفایت شعاری سے خرچ کرے ، فضول نہ برباد کرے - گفتگو کرے تو اعتدال سے ، نہیں تو چپ رہے - اوروں کے مشاہدات اور رایوں اور مباحثوں کو سن کر ذخیرۂ علم اپنا اور بڑھائے - جب وہ کِھلی اور ٹھٹھول کی باتیں اور ہزل اور مزاح کی حکایتیں لوگوں سے سنے ، جو ناگوارِ خاطر ہوں ، تو سکوت اختیار کرے -

یہ بات نہایت ناسزا و ناشائستہ و نامعقول ہے کہ جس کام کو ہم خود نہ کرتے ہوں ، اس کو اور جو کریں تو ہم ان پر طعن و طنز کریں اور اس پر ایک مباحثہ و مناقشہ قائم کریں - ہم کو اپنی نصیحت چاہیے ، اوروں کی فضیحت سے کیا غرض - تجھے پرائی کیا پڑی تو اپنی نبیڑ - تم کو دانش مند بغیر خود ستائی و خویشتن نمائی کے بننا چاہیے ، حسد سے دور رہنا چاہیے -

اکثر نوعلم طالب علموں کو یہ شوق ہوتا ہے کہ وہ گفتگو اس طمطراق سے کرتے ہیں کہ جس سے ان کی لیاقت اور استعداد اصلی قابلت سے زیادہ ظاہر ہو - دوسرے کی باتوں کو اِس طرز سے کاٹتے ہیں کہ ان کی شہرت بہت زیادہ ہو - بعض نوجوان اپنے علم کے گھمنڈ میں آن کر ایسے اپھرتے ہیں کہ چھوٹا منہ بڑی بات کہنے لگتے ہیں - وہ ایک شانِ حکومت اپنی رائے کے اظہار میں دکھاتے ہیں - جیسے کہ یہ کوئی بڑے علم کی معراج پر پہنچ گئے ہیں - وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہماری باتیں بھی ایسی ہی مستند و معتبر سمجھی

جائیں گی کہ جیسی پہلے بزرگانِ صاحب کمال کی ۔

وہ خوب یاد رکھیں کہ جب تک کوئی شاعر معراجِ کمال پر نہیں پہنچتا ، اس کے تصرفاتِ شعری کو کوئی مستند نہیں جانتا ۔ ایسے ہی جب تک کوئی عقل و دانش میں برتر اور بزرگ نہیں ہوتا اُس کے قول و فعل معتبر و مستند نہیں ہوتے ، کوئی ان کا پیرو نہیں ہوتا ، اپنے رسم و رواج کو نہیں چھوڑتا ۔ جب کوئی ایسی بزرگی و و خوبی کسی میں ہوتی ہے تو اُس کی پیروی میں اپنی رسم و عادات کو ترک کرتے ہیں ۔ پس یہ دلیل تمھارے لیے نہیں ہو سکتی کہ سقراط[1] اور ارسطخافس نے اگر اپنے رسم و رواج کو توڑا تو ہم کیوں نہ توڑیں ۔ ان کو تو یہ منصب جب حاصل ہوا کہ وہ دانش مندی و نکوکاری کے قلمرو کے شہنشاہ بنے ۔ تم قُلی ہو کر یہ شاہانہ جاہ و جلال کیونکر حاصل کر سکتے ہو :

دلا ! تا بزرگی نیاری بہ دست
بجائے بزرگاں نباید نشست

پس اپنے مرتبے اور شان کو دیکھ کر گفتگو اور آرزو کرو ۔ تم اپنے ہم مرتبہ و ہم لیاقت ، ہم استعداد لوگوں کے ساتھ مباحثہ کرو کہ جن سے برابر کی کُشتی لڑ سکو ۔ مباحثے میں کبھی مغالطہ اور دھوکہ دینے کی باتیں نہ کرو ۔ راست و دروغ ، جائز و ناروا کو بغیر ردّ و قبول و توقّف و تردّد کے قبول نہ کرو ۔ عاقل کی زبان پہلے دل سے سخن کو عرض کرتی ہے ، جب وہ اجازت تکلّم کی دیتا ہے تو وہ حرکت کرتی ہے ۔ پہلے تم براہینِ متین دل میں خوب سوچو ،

۱- سقراط کے لیے دیکھیے حاشیۂ سابق ۔

پھر ان کو اس طرح بیان کرو کہ ایجاز مُخل[1] اور اطناب مُمل[2] نہ ہو۔ کوئی طعن و طنز کسی رمز کے ساتھ ان میں نہ ہو۔ وہ ایسے آئینے ہوں کہ صداقت کا معائنہ کرائیں۔ لفظوں کے طمطراق اور فقروں کی دھوم دھام اور منطقی حجتّوں کی اِشکال[3] سے تمھاری تقریر کرسی نشیں نہیں ہو سکتی۔ اس کو تو عزت جب ہی حاصل ہوگی کہ اس میں حق و راستی اپنی روشنی دکھاتی ہوں گی۔

مباحثے کی علّتِ غائی یہ ہونی چاہیے کہ ایک امرِ حق منکشف ہو، خواہ تمھاری طرف سے یا جانبِ مقابل سے۔ مگر یہ بات جب حاصل ہوگی کہ کوشش اور نیکی تمھاری گفتگو کی رہنما ہو۔

جب تم کو اپنی دلیل میں خود غلطی معلوم ہو تو اس کا اعتراف کرو۔ اگرچہ یہ نہایت مشکل ہے کہ جس وقت مباحثے کی حرارت طرفین میں بھری ہو، کوئی اپنی غلطی کا اقرار کرے اور غلط دلیل کو چھوڑ دے۔ مگر حق جوئی اور انصاف پرستی اسی کا نام ہے، گو وہ شاذ و نادر آدمیوں میں ہوتی ہے۔ سخن پروری[4] اور ہٹ دھرمی پاجی کمینوں کی عادت ہوتی ہے۔ ایک غلط بات کی پچ کیے جاتے ہیں۔ اس کے ترک کرنے کو ذلّت سمجھتے ہیں جس سے وہ اور زیادہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔

جب تم کسی مجلس میں تقریر کرو تو چاروں طرف آنکھ لگا کر دیکھ لو کہ کون کون بیٹھے ہیں، اور کان لگا کر سن لو کہ

۱۔ ایجاز مُخل: یعنی اختصار خلل انداز نہ ہو۔
۲۔ اطناب مُمل نہ ہو: یعنی غیر ضروری تفصیل طبیعت میں ملال پیدا نہ کرے۔
۳۔ اِشکال: مشکل۔
۴۔ سخن پروی: یعنی اپنی بات پر اڑے رہنا۔

کیا کہہ رہے ہیں ۔ یہ نہ سمجھو کہ جو صفِ اول میں اونچی جگہ پر بیٹھے ہیں، وہی بڑے ہیں اور قابلِ خطاب ہیں ۔ یہ صدر نشیں فقط حکومت اور ثروت کے اعتبار سے ہیں، کچھ علم و دانش کے سبب سے نہیں ۔ اکثر :

دولت و علم در یک مکاں نمی یابم

تم کو سب کی طرف مخاطب ہونا چاہیے ۔ ہر قسم کے آدمیوں سے باتیں کرو کہ جس سے تجربہ و علم بڑھے ۔ ہر پیشہ ور، ہر فرقے کے آدمیوں سے باتیں کرنے میں کچھ نہ کچھ تمھاری معلومات بڑھیں گی ۔ کسان، کمھار، لوہار، بنیے، بزاز سے باتیں کرکے اپنے فائدوں کی باتوں کا انتخاب کر سکتے ہو ۔ عوام الناس سے گفتگو کرنے سے یہ بڑا نفع ہوتا ہے کہ ان کے اندر ایسی نیکیاں معلوم ہوتی ہیں کہ جن پر رشک ہوتا ہے اور ان کی طرف رغبت ہوتی ہے، اور ان کی برائیوں کے معلوم ہونے سے بدی سے نفرت ۔ بے وقوفوں سے باتیں کرنے میں عقل بڑھتی ہے ۔

۲۴۔ مشاہدہ و تجربۂ طلبہ و تعلیمِ علوم

یہ امر بھی تعلیمِ طلبہ میں داخل ہے کہ وہ اشیا کے تجسّس و تفتیش میں راست بازی کے ساتھ درپے رہیں ۔ اگر ان کے شہر کے ہمسائے میں کوئی عجیب و غریب شے ہو، جیسے کہ کوئی نادر عمارت، کوئی چشمۂ آب، کوئی اور قدرتی شے، کوئی بزرگ منش آدمی، یا کوئی مشہور مقام جہاں کوئی واقعۂ عظیم ہؤا ہو، تو اس کو خود جا کر دیکھیں ۔ مختلف اقوام کی اوضاع و اطوار، مختلف ملکوں کی آمد و خرچ کی تفصیل، بادشاہوں کے آپس کے عہد و اقرار لوگوں کی زبانی سنیں ۔ ان کے جاننے سے دل خوش ہوتا ہے اور

فائدہ پہنچتا ہے۔

اگرچہ میں سب علموں کو نہیں بیان کر سکتا کہ کس طرح سیکھنے چاہیں مگر چند علموں کا حال، جو ضروری ہیں، بیان کرتا ہوں۔

اول علمِ تاریخ کا بیان اس لیے کرتا ہوں کہ ہم اس کی کچھ وقعت نہیں کرتے اور نہ اس کو اس طرح پڑھتے ہیں کہ کچھ فائدہ حاصل ہو، بلکہ اپنی تعلیم میں اس کو ارذل جانتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے میں جو لوگ مصروف رہتے ہیں، وہ حقیقت میں اچھے زمانے کے بزرگوں، جواں مردوں، صاحب کمالوں سے باتیں کرتے ہیں۔ یہ باتیں ہماری روزمرہ کی گفتگو میں داخل ہو سکتی ہیں۔

تاریخ کے پڑھنے کے دو طریقے ہوتے ہیں؛ ایک وہ جس سے کچھ فائدہ نہ حاصل ہو بلکہ تضییعِ اوقات ہو۔ دوسرا وہ جس سے سراسر فائدے حاصل ہوں۔ پہلے طریقے کے موافق ہم پڑھتے ہیں کہ معلّم نے بتلا دیا یا خود طوطے کی طرح یاد کر لیا؛ کہ تیمور[1] ان راہوں میں ہندوستان آیا تھا، فلاں فلاں حصے ہندوستان کے فتح کیے، اتنی دولت غنیمت میں لے گیا۔ بس آگے کچھ اور نہیں۔

اب دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم تاریخ کو پڑھ کر اوروں کے

۱۔ تیمور: تیمورلنگ (۱۳۳۶ء—۱۴۰۵ء) سمرقند کے قریب کش کے مقام پر پیدا ہوا۔ چغتائی خاندان کا عظیم فرمانروا جس کی ہیبت سے پورا ایشیا کانپ اٹھا۔ اس نے خوارزم، کاشغر، خراسان، ایران، شام اور مصر کو فتح کیا۔ بغداد کو تباہ کر کے بایزید اول کو مغلوب کیا۔ اس نے سمرقند کو اپنا پایۂ تخت بنایا جس کی وجہ سے یہاں علما اور اہلِ حرفہ کثیر تعداد میں جمع ہو گئے۔ امیر تیمور کے مظالم سے ایک دنیا کانپتی تھی۔

تجربے کو ایک مناسب اندازے سے بدل کر اپنے حسبِ حیثیت اپنے کام میں لائیں ، اس کا مشاہدہ کریں ۔ انسان کا کوئی فائدہ مند کام ایسا نہیں ہے کہ تاریخ سے نہ حاصل ہوتا ہو ۔ تاریخ وہ ہادی اور رہنما ہے کہ سارے انسان کے مشکل کاموں میں اپنی انگلی سے ایسا رستہ بتلا دیتی ہے کہ جس سے مشکل آسان ہو جاتی ہے ۔ وہ پکار پکار کر کہتی ہے کہ جو اور آدمیوں پر گزرا ہے وہ تم پر بھی گزرے گا ۔ اس کے ذریعے سے جو ہماری گفتگو صاحب کمالوں سے ہوتی ہے ، اس سے ایک تعجّب خیز روشنی عقل و فہم میں پیدا ہوتی ہے ۔ اگر اس گفتگو کا موقع انسان کے ہاتھ سے جاتا رہے تو وہ خود تنہا بِھچ بِھچا[1] کر ، اپنے اوپر آپ تہہ ہو کر رہ جائے ۔ ان کی نگاہ کے روبرو سوائے ناک کے کچھ نہ نظر آئے ۔

ایک دفعہ سقراط[2] سے کسی شخص نے پوچھا تھا کہ تم کس ملک کے رہنے والے ہو ؟ تو اس نے جواب میں بجائے ایتھنز[3] کہنے کے یہ کہا کہ میں دنیا کا رہنے والا ہوں ۔ اس کے خیالات ایسے معمور اور وسیع تھے کہ وہ ساری دنیا کو اپنا وطن اور تمام دنیا کے

۱۔ "بِھچنا" سے مشتق ۔ موجودہ املا "بِھنچنا" ہے ۔

۲۔ سقراط کے لیے دیکھیے حاشیۂ گزشتہ ۔

۳۔ ایتھنز : یونان کا پایۂ تخت ۔ ۱۹۵۶ع میں آبادی ۶۰۰۰۰۰ تھی ۔ ۵ ق م میں اسے ایک عظیم بحری مرکز کی حیثیت حاصل تھی ۔ ۳۳۸ قبل مسیح میں سکندر اعظم کا باپ فلپ مکدونی اس کا حاکم ہوا ۔ ۱۴۶ قبل مسیح میں یہ شہر سلطنتِ یونان کا حصہ بنا لیکن اس نے اپنی تہذیبی اور ثقافتی انفرادیت کو برقرار رکھا ۔ ۱۴۵۶ع میں خلفائے عثمانی اس پر قابض ہوئے جن سے ۱۸۳۴ع کے آخر میں اس نے آزادی حاصل کی ۔ یہ شہر اپنے علما ، فلاسفہ ، ادبا ، اہلِ حرفہ اور سیاسی قائدین کی بدولت ہمیشہ ممتاز رہا ۔ اس کے آثار قدیمہ آج بھی اس کی عظمت کے شاہد ہیں ۔

آدمیوں کو اپنا دوست ، ہم وطن جانتا تھا اور ان سے گفتگو کرتا تھا - ہمارا سا حال نہ تھا کہ سوائے اپنے پاؤں کے آگے کی زمین کے کچھ نہیں دیکھتے - ہمارا حال یہ ہے کہ جو کچھ ہم پر گزرتی ہے ، ہم جانتے ہیں کہ وہ ساری دنیا پر گزر رہی ہے - ہم اپنے ہی ملک کو ساری دنیا اور اپنے تئیں ساری دنیا کے آدمی سمجھتے ہیں - اگر ہمارے ملک میں قحط پڑتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ دنیا میں قیامت آ گئی ، حشر برپا ہوگیا - اگر بارش کی کثرت ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ دنیا ڈوب گئی ہے - اگر ہم پر افلاس آ گیا تو ساری دنیا بھوکی مرنے لگی - اگر خود جاہل و بد اخلاق ہو گئے تو کہنے لگے کہ زمانے میں علم و اخلاق نہیں رہا ، وہ سب اٹھ گیا - غرض اپنے اوپر ساری دنیا کا قیاس ہے - اس غلطی میں تھوڑے بہت سب ہی گرفتار ہیں - یہ بڑی غلطی ہے اور اس سے بہت نقصان ہوتے ہیں -

جس شخص کے خیال میں نیچر کی تصویر کامل شان و جلال کے ساتھ موجود ہے ، وہ اس کے سب رنگوں میں ہمیشہ نیرنگی اور بوقلمونی دیکھ کر ایک عجائب خانۂ رنگیں اس کو سمجھتا ہے - وہ اپنے تئیں تو کیا بلکہ ساری اپنے ملک کی سلطنت و عظمت اس تصویرِ عالم میں خال کے برابر نہیں پاتا - ایسا شخص اپنی عظمت و شان کا ٹھیک تخمینہ کر کے قدر شناس ہو سکتا ہے -

تاریخ دنیا کو ایک آئینہ بنا کر ہماری آنکھوں کے سامنے رکھ دیتی[1] ہے ، جس میں ہم اپنے تئیں پہچان سکتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور اپنی سچی رغبتِ دلی سے کیا کرنا چاہیے - تاریخ دنیا کی ایک کتاب بنا کے مطالعے کے لیے پیش کرتی ہے کہ جس کے اوراق میں

۱- اصل (صفحہ ۶٦) : دیتا -

ہم بے شمار اوضاع و اطوار ، قوانین و آئین ، رسم و رواج ، عادات ، قومیں ، فرقے غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کر کے اپنی اصلاح اور درستی کر سکتے ہیں اور اپنے عیوبِ فطرتی کے ضعفوں سے آگاہ ہو سکتے ہیں ۔ ان باتوں کا جاننا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے کہ کیا کیا شان و شکوہ کی سلطنتیں خاک میں مل گئیں جن کا پتا ڈھونڈے[1] نہیں ملتا ۔ کیا کیا دُول کے انقلاب اور تبدّل ہوئے ہیں کہ وہ پہچانی نہیں جاتیں ، کیسے کیسے نامور بزرگ ، صاحبِ کمال ، فتح مند ، با اقبال گمنامی اور فراموشی کے دریا میں غرق ہوئے ہیں ۔ پس ان خیالات سے نہ سلطنت پر بھروسا ، نہ دولت پر اعتماد ، نہ علم و ہنر پر غرور ، نہ شہرت کا غَرّہ پیدا ہوگا ۔ یہ ساری دنیا کی عظمت و شان کی چیزیں کچھ اور ہی نظر میں دکھائی دینے لگیں گی ، اور یہ امر دل نشیں ہو جائے گا کہ چشم زدن میں دنیا میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے ۔ یہ کروڑوں آدمی زمین کے اندر میٹھی نیندیں لے رہے ہیں اور بےزبانی کی زبان سے کہہ رہے ہیں کہ تم کو موت کے بعد زندوں سے زیادہ عمدہ صحبت ہماری میسر ہوگی ۔

فیثاغورث[2] نے دنیا کو ایک اُلمپیا[3] کے بڑے میلے سے تشبیہ

۱- اصل (صفحہ ٦٦) : ڈھونڈا ۔

۲- فیثاغورث کے لیے دیکھیے حاشیۂ سابق ۔

۳- اولمپیا یا اولمپک : یہ جسمانی کھیلوں کا ایک میلہ ہے جس کی ابتدا اہلِ یونان نے اولمپیا کے مقام پر کی تھی ۔ یہ کھیلیں ہر چار سال بعد ہوتی تھیں اور اب بھی ہوتی ہیں ۔ شروع میں صرف اہلِ یونان ان کھیلوں میں حصہ لیتے تھے لیکن اب ساری دنیا کے منتخب کھلاڑی کسی مقررہ مقام پر جمع ہو کر ان میں شامل ہوتے ہیں اور اپنے دست و بازو کی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

دی ہے کہ جس میں بے شمار آدمی جمع ہوتے ہیں ۔ بعض تو اس میں اس لیے آتے ہیں کہ اپنی ورزشِ جسمانی کے ہنر دکھلائیں اور انعام اکرام پائیں جس سے شہرت و عزت حاصل ہو ۔ بعض سوداگر اس نظر سے آتے تھے کہ میلے میں ایک ایک کے چار چار کر کے خوب دولت کمائیں ۔ تھوڑے سے آدمی اس لیے بھی آتے تھے کہ جن کو کچھ خاص اپنی[۱] منفعت پر نظر نہیں ہوتی تھی ، بلکہ فقط ان کو یہ دیکھنا منظور ہوتا تھا کہ وہاں کیا ہوتا ہے ، ہر کام کا وہاں کیا رنگ ڈھنگ ہے ، لوگوں کا طریقہ زندگی بسر کرنے کا کیا ہے ، کس طرح سے لوگوں نے اپنے طریقۂ معاشرت کی اصلاح کی ہے کہ ان کی زندگی لطف سے بسر ہونے لگی ۔ غرض یہ سارے تماشے علمِ تاریخ سے دل بہلاتے ہیں ، اگر اس کو پڑھنے کی طرح پڑھیں ۔

۳۴۔ اخلاقی تعلیم

اب میں اخلاقی تعلیم کا ذکر کرتا ہوں ، گو اکثر عقلا کے نزدیک اخلاقی تعلیم کا مذہبی تعلیم سے جدا کرنا ایسا ہے جیسے کہ آفتاب کا روشنی سے اور آگ کا حرارت سے ، گل کا بُو سے ۔ مذہب ہی کو لوگ اخلاق کے سمندر میں قطب نما جانتے ہیں جس سے بیڑا پار ہوتا ہے ۔ میں مذہبی اخلاق کو چھوڑ کر اس اخلاق

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

طاقت کی آزمائش کرتے ہیں ۔ اول ، دوم اور سوم آنے والے کھلاڑیوں کو بالترتیب سونے ، چاندی اور کانسی کے تمغے دیے جاتے ہیں ۔ اولمپک مشعل یونان سے چل کر مختلف ممالک سے گزرتی ہوئی ہاتھوں ہاتھ اولمپک میدان تک پہنچتی ہے ۔

۱۔ اصل (صفحہ ٦٧) : اپنے ۔

کی تعلیم کا ذکر کرتا ہوں جو حکمت و فلسفہ سے متعلق ہے ، جس کو علم تہذیبِ اخلاق یا حکمتِ عملی کہتے ہیں ۔ تمام علموں میں یہ شرف اِسی علم کو حاصل ہے کہ اس کی[1] تحصیل کی قابلیت بچوں میں نوشت و خواند کی قابلیت سے پہلے پیدا ہوتی ہے ۔ ہر حالت و ہر مقام میں اس کی تعلیم ہو سکتی ہے ۔ گھر میں ، باغ میں ، میز پر ، بچھونے میں ، خلوت میں ، جلوت میں ، صبح و شام ، یہ سب اس کی تعلیم کے لیے یکساں ہیں ۔ کیونکہ وہ اوضاع و اطوار کی خوبیوں کو سکھاتا ہے ، دسترخوان پر آدابِ طعام بتلاتا ہے ، مجلس میں آدابِ سخن ، کھیل کود میں حسنِ اخلاق ، غرض تمام حرکات و سکنات کا وہ رہنموں ہے ۔ اس کی تعلیم آسان بھی ہے ۔ اس کا حال ایسا ہے جیسا کہ گھر میں[2] اور اپنے شہر میں[3] پھرنا ، جس میں آدمی تھکتا نہیں ۔ اگر اتنا سفر میں چلے تو تھک جائے ۔ عقلا کے نزدیک تعلیم میں تقدیم اسی کو سزاوار ہے[4] ۔ یہ وہ علم ہے کہ جس میں انسان کے کل افعال و اعمال کے قاعدے بیان ہوتے ہیں ۔ وہ سکھاتا ہے کہ کن کن باتوں کا چاہنا انسان کا حق ہے ۔ خدا کے حقوق اس پر کیا ہیں اور آدمیوں کے کیا اور اس کے اپنے کیا ؟ دولت کو کیونکر خرچ کرنا چاہیے ؟ کون سا حصہ اس کا ملک کی بھلائی میں خیرات دینا چاہیے ؟ کتنا حصہ عزیز و اقربا میں تقسیم کرنا لازم ہے ؟ خدا کے کیا کیا احکام ہیں ؟ ان کی بجا آوری کے طریقے کون سے مستحسن ہیں ؟ انسان خود کیا ہے ؟ کس مطلب کے لیے دنیا میں پیدا ہوا ہے ؟ کون سی باتیں اس

۱- اصل (صفحہ ٦٧) : کے - ۲- اصل (صفحہ ٦٧) : کا -
۳- اصل (صفحہ ٦٧) : کا - ۴- یعنی اِسی تعلیم کو اولیت دی جائے -

کو جاننی چاہئیں ؟ تحصیلِ علم کی علّتِ غائی کیا ہونی چاہیے ؟ شجاعت ، اعتدال ، عدالت کیا چیز ہے ؟ علوِ ہمّت اور حرص میں ، غلامی و اطاعت میں ، اجازت اور آزادی میں کیا فرق ہے ؟ سچی قناعت کے پہچاننے کی علامات کیا ہیں ؟ موت ، تکلیفِ جسمانی و روحانی ، بے آبروئی سے کہاں تک خوف کرنا مباح ہے ؟ بلاؤں کی سختی سے کیونکر بچنا چاہیے یا کس طرح ان کو سہنا چاہیے ؟ وہ کون سی چھپی ہوئی کمائیاں ہیں جو انسان کو اپنے افعال پر متحرّک کرتی ہیں ؟ کون سی وجوہ ہوتی ہیں کہ انسان بے قرار ، مضطر و پریشان ہوتا ہے ؟

خلاصہ یہ ہے کہ سب سے اول دل میں یہ مسئلہ بٹھانا چاہیے کہ جس سے حسنِ اخلاق اور تہذیبِ نفس اور اصلاحِ فہم ہو اور ہم اپنے تئیں پہچانیں اور سمجھیں کہ کیونکر اچھی طرح جیتے ہیں ، کیونکر اچھی طرح مرتے ہیں ؟ انسان کو وہی علم سیکھنے چاہئیں جو اس کی آئندہ زندگی میں بکارآمد اور نفع رساں ہوں - باقی سب کو سلام کرنا چاہیے - ناحق ان میں تضییعِ اوقات نہیں کرنی چاہیے - جیسے علمِ نجوم ہے - ہمارا اس سے کیا مطلب نکلتا ہے کہ ستاروں کے مقامات آسمان پر کہاں ہیں - برجِ حمل میں زہرہ ہو یا مشتری ہو ، ہم کو کیا ، ہماری بغل تو خالی ہے - اس کا اثر دنیا پر کچھ نہیں - لڑائیاں ، موت ، غلامی اور حادثات و واقعات یکساں چلے جاتے ہیں - آسمان پر سیّاروں اور ستاروں کی راز کی باتوں کی تلاش سے انسان کو کیا فائدہ ہے - ہماری طبِ روحانی تو علمِ تہذیب اخلاق ہے کہ جس سے نفس اعتدال پر رہتا ہے - اعتدالِ روح سے صحتِ جسمانی کی بھی حفاظت ہوتی ہے -

تہذیبِ اخلاق کی بڑی نشانی یہ ہے کہ انسان خوش مزاج

ہو - اس کی طبیعت کدورت سے ایسی صاف ہو جیسے کہ چاند کے پاس کی چیزیں گرد و غبار سے پاک و صاف ہوتی ہیں - مہذّب آدمیوں کے چہرے پر ہر وقت بشاشت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں - جب کوئی طوفان اور طغیانی نفسِ امّارہ کی ظاہر ہوتی ہے تو وہ اس کو تھا دیتے ہیں - قحط ، بخار ، وبا کے خوفوں کو ہنسی ہنسی میں ٹال دیتے ہیں -

بعض آدمیوں کی یہ رائے ہے کہ علمِ تہذیبِ اخلاق ایک عمود کے سرے پر بیٹھا ہے جس کے گرد خار اور جھاڑ جھنکاڑ لگے ہوئے ہیں ، وہاں تک رسائی آسان نہیں - مگر یہ خیال بالکل غلط ہے - وہ تو ایک صاف میدان میں بیٹھا ہے جس کے چاروں طرف گلزار اور پھول ، پھل دار درخت ، سرسبز و شاداب لگ رہے ہیں - اس کی راہ میں دو رویہ گھنے سایہ دار درختوں کی قطاریں لگی ہیں - جو اس راہ پر چلتا ہے وہ آنکھوں سُکھ اور کلیجے ٹھنڈک منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے - وہ نیکی کا طریقہ بتلاتا ہے جو نہایت سہل گزار ، خوش آیند و فائدہ مند ہے - جس میں لڑکے ، بوڑھے ، معصوم[1] اپنی اپنی راہ سے پہنچ سکتے ہیں - سختی و درشتی اس راہ سے کوسوں دور ہے - آرام و چین اس میں اس سرے سے اُس سرے تک ہے - یہ علم تو ایک مادرِ مہربان ہے کہ اپنے بچوں کو تمام غلاظتوں اور نجاستوں سے پاک صاف کرتی ہے ، ان میں توانائی بڑھاتی ہے - درشتی ان پر نہیں کرتی ہے ، نرمی اس کی فطرتی ہے - وہ اپنی اولاد

۱- اصل میں (صفحہ ۶۹) لفظ ''معصوم'' کے بعد ''مسکار'' بھی تھا جسے حذف کر دیا گیا - معلوم نہیں مصنف کی اس لفظ سے کیا مراد تھی - ممکن ہے کتابت کی غلطی سے مکار کو مسکار بنا دیا گیا ہو -

میں عزّت و شان ، حسانتِ صحت کے پیدا کرنے کی[1] فکر میں رہتی ہے اور ان کو بتلاتی ہے کہ تم ان عمدہ خوبیوں کو کیونکر باقاعدہ اور منظّم بنا سکتے ہو ، جس کے بغیر تمھاری زندگی تکلیفات کے سبب سے وبالِ جان ہے -

افلاطون کا قول ہے کہ انسان میں یہ علم صداقت ، حلم ، ثبات ، دیانت پیدا کرتا ہے - باقی اَور علوم جن سے کاربرآری ہوتی ہے ، وہ ملمّع یا جھوٹا رنگ و روغن ہے - بعض لڑکوں کی طبیعت ایسی ہوتی ہے کہ وہ حکمتِ علمی کی باتوں سے دور بھاگتی ہے - ایک حکمت کے مسئلے کے سننے سے ان کا دل ایک بیہودہ بازاری گپ میں زیادہ لگتا ہے - اگر گلی میں ڈھول تاشے کی آواز آئے تو وہ کتاب کو بند کر کے ، مکتب چھوڑ اس کے سننے کو بھاگتے ہیں - ایسی طبیعت کے لڑکوں کے واسطے بہتر ہے کہ کوئی پیشہ تارکشی ، زر دوزی ، موچی وغیرہ کا سکھایا جاوے ، خواہ وہ کیسے ہی امیرزادے ہوں -

افلاطون کا قول ہے کہ لڑکوں کی تعلیم ان کی طبائع کی استعداد اور قابلیت کے موافق ہونی چاہیے - ماں باپوں کے تموّل ، حالت ، لیاقت کو اس میں دخل دینا نہیں چاہیے - اب ہم وقتِ تعلیم کا ذکر کرتے ہیں -

حکمتِ عملی انسان کو زیست کا طریقہ سکھاتی ہے ، اس لیے اس کی تعلیم کا آغاز بچپنے ہی سے ہونا ضروری ہے - کیونکہ بچوں کو جس وضع و طرح و عادت کا بنانا چاہو ، وہ بن سکتے ہیں - وہ اس نوعمری میں نہایت نرم ہوتے ہیں - جس سانچے میں چاہو ، ڈھال لو -

---

۱- اصل (صفحہ ۶۹) : کے -

مٹی نرم و گیلی ہی چاک پر چڑھا کر جلدی برتن بنا لو - بچوں کا زمانۂ فرصت دراز نہیں ہوتا - پندرہ سولہ برس کی عمر تک ان کی تعلیم کا زمانہ ہے - باقی زندگی دنیا کے کام دھندوں کے لیے ہوتی ہے - اس عرصے میں جتنی باتیں ان کے لیے ضروری ہیں ، وہ سب سکھا دو - وہ تہذیبِ اخلاق کے اصول بتلاؤ کہ جن کو وہ سمجھ کر عمل کرنے لگیں - یہ علم بغیر عمل کے بے کار ہے -

جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نیک کام کرنے کی عادت فقط جاننے سے ، بغیر مشق کے ہو سکتی ہے ، وہ گویا یہ کہتے ہیں کہ ناچنا صرف دیکھنے سے ، بغیر ہاتھ پاؤں ہلانے کے آ سکتا ہے - یا گھوڑے پر چڑھنا ، پھری گدکا پھرانا بغیر مشق کی تکلیف کے - یہ وہ علمِ باعمل ہے کہ بچوں کو بھی اپنا فائدہ مند سبق پڑھا دیتا ہے اور پیرِ خمیدہ پشت کو بھی درس دے دیتا ہے -

دیکھو ارسطو نے سکندر کو لڑکپن میں کس خوبی سے تعلیم کیا ہے کہ نہ اس کو منطقی اِشکال کے پیچوں کے جنجال میں پھنسایا ، نہ علمِ ہندسہ کے مسائل کے مخمصوں میں ڈالا ، بلکہ اس نے شجاعت و دلیری کے طریقے ، ثبات و استقلال کی روشیں ، اعتدال اور عدالت کے برتاؤ ، بزرگی ، شان و شوکت کی نگہداشت ، خوف کی حقارت ، ان سب کا میگزین اس کے ساتھ ایسا کر دیا کہ جس سے اس نے اپنے ایامِ طفلی و جوانی میں بیالیس ہزار پیادوں اور چار ہزار سوار اور ایک کروڑ کے قریب روپے سے ساری دنیا میں اپنا ڈنکا بجا دیا - یہ مثال تو ایک بڑے بادشاہ اور بڑے استاد کی تھی ، مگر ایسی قسم کی تعلیم ہر طرح کے بچوں کو اپنے مناسبِ حال ہو سکتی ہے کہ جس کا مآل یہ ہو کہ نیکی سے محبت پیدا ہو -

۴۴- علم و ادب کی تعلیم

اب میں چند کلمے ادب کی تعلیم کی نسبت کہتا ہوں - زباں دانی کی تعلیم ہمارے لیے بڑی ٹیڑھی کھیر ہے - دنیا کا یہ مسلّم مقولہ ہے کہ تعلیم مادری زبان میں ہے - یہ سچ ہے مگر جس ملک میں بادشاہی زبان مادری زبان سے غیر ہوتی ہے ، وہاں علمِ ادب کی تعلیم میں ایسی گلجھڑیاں[1] آن کے پڑتی ہیں کہ کسی طرح سلجھائے سے نہیں سلجھتیں - بادشاہی زبان مادری زبان پر اپنے تسلّط کا سکّہ ایسا بٹھاتی ہے کہ اس کو ابھرنے نہیں دیتی - وہاں جو نتائجِ عظیم تعلیم کے ہوتے ہیں ، وہ نہیں حاصل ہو سکتے - ہماری بادشاہی زبان انگریزی ہے جس کی تحصیل میں ہم تیرہ چودہ برس تک اپنا خون پانی ایک کرتے ہیں ، تو وہ ٹوٹی پھوٹی بری بھلی آ جاتی ہے ، مگر توسیعِ خیالات و استدلال کی قدرت ، جو مادری زبان کے ساتھ علومِ معقول میں مخصوص ہے ، وہ نہیں پیدا ہوتی - اب ہماری کلاسیکل زبانیں عربی ، سنسکرت ہیں جو ہمارے لیے بیش بہا زیور ہیں ، مگر ان کی تحصیل کے طریقے ایسے دشوار ہیں کہ ہزاروں میں دو چار ہی کامیاب ہوتے ہیں - عربی زبان کی صرف و نحو میں برسوں صرف ہوتے ہیں ، سنسکرت میں کومدی اور امر کوش کے کنٹھ کرنے میں ایک عمر کٹتی ہے - اس صرف و نحو کی تحصیل کا نتیجہ یہ ہے کہ الفاظ کی ترکیب سے جملے ، جملوں کی ترکیب سے فقرے اور فقروں کی ترکیب سے عبارت بنانی آ جاتی ہے - جن کو پیشۂ معلّمی پسند ہوتا ہے ، وہ ان زبانوں کی تحقیق میں وقت صرف کرتے ہیں ، توسیعِ خیالات اور اختراعات ان کو بھی حاصل نہیں ہوتی -

---

۱- گلجھڑیاں : اُلجھنیں -

بعض دانش مندوں کی رائے ہے کہ گو ہمارے دل و دماغ میں ہزاروں خیالات بھرے ہوں مگر جب تک ہم کو قدرت زبان پر حاصل نہیں ہوگی ، وہ اس طرح ادا نہ ہوں گے کہ ان کا اثر دل پر ہو - بعض اربابِ علم کی اس کے خلاف رائے ہے کہ جو چیز ایک دفعہ ذہن میں آتی ہے تو اپنے ساتھ ہی اپنے بیان کے لیے الفاظ بھی لاتی ہے - یہ نہیں ہو سکتا کہ جو خیالات ذہن میں ہوں ، ان کے ادا کرنے کے واسطے الفاظ جلدی نہ بہم پہنچ جائیں - خیالات میں خود ایسا زور ہے کہ وہ الفاظ اپنے لیے پیدا کر لیتے ہیں - الفاظ پر جو زیادہ نظر رکھتے ہیں ، اُن میں آوازیں بہت مگر معانی کم ہوتے ہیں - اصل یہ ہے کہ خیالات اور الفاظ دونوں چاہئیں ، مگر ہر ایک کے واسطے ایک اندازۂ مناسب چاہیے - نہ فقط خیالات سے کام چلتا ہے ، نہ فقط الفاظ سے - افسوس ہے کہ ہمارے لیے دونوں کی توسیع کے واسطے میدان تنگ ہے -

۳۵- زبانی و کتابی تعلیم

تعلیم کیا[1] زبانی ہوتی ہے یا کتابی - زمانۂ قدیم میں عقلا بہت سے ملکوں اور قوموں میں زبانی تقریروں اور گفتگوؤں سے تعلیم کرتے تھے - مگر اب ہماری تعلیم میں یہ طریقہ اکثر متروک ہو گیا ہے - اگر کچھ ہے تو اعلیٰ درجے کی تعلیم میں - زبانی تعلیم میں تمام مطالب و مراتب اختصار کے ساتھ کان میں پڑ جاتے ہیں اور ان کے باہمی علاقے معلوم ہو جاتے ہیں - زبانی تقریر سے مضامین مؤثر اور دل نشین ہوتے ہیں - اس قدر کتاب سے نہیں ہوتے -

---

۱- یہاں لفظ ''کیا'' بمعنی ''یا'' استعمال ہوا ہے -

وہ یاد بھی زیادہ بہ نسبت کتاب کے رہتے ہیں کیونکہ سننے والا یہ قصد کرتا ہے کہ میں ان کو نہ بھولوں ۔ یہ کوئی کتاب تو نہیں ہے کہ جب چاہوں گا دیکھ لوں گا ۔ اگر سنا ہوا مضمون یاد نہ رکھوں گا تو میرے ذہن میں کسی طرح نہ آئے گا ۔

دوسری کتابی تعلیم ہے جس میں کتابیں سب سے زیادہ آسان ذریعۂ تعلیم ہے ۔ ان سے تعلیم جب اچھی ہو سکتی ہے کہ وہ خود اچھی ہوں ، ورنہ ایک بُری[1] کتاب ، بڑا شیطان انسان کے واسطے ہے ۔ اب چار قسم کی کتابیں ہم کو پڑھائی جاتی ہیں : سنسکرت ، عربی فارسی ، اردو ہندی اور انگریزی ۔ اصل کتابیں سنسکرت کی ہماری طبیعت میں فروتنی ، مسکینی ، راسخ الاعتقادی پیدا کرتی ہیں ، مگر یہ ایسی حدِ اعتدال سے پرے لے جاتی ہیں کہ دنیاوی معاش کی تلاش سے بالکل کَنارہ کش کرکے گوشہ گزینی یا دریوزہ گری کی طرف رغبت دلاتی ہیں ۔ جو کتابوں میں لکھا ہے اس میں شک و شبہ کو دخل نہیں ، سوائے ان کے مان لینے کے کوئی چارہ نہیں ۔ حقیقت کی تحقیق و تصدیق اس میں کفر ہے ۔ وہ ہماری ہمّت و عزم کو اصلاحِ احوال و رسم و عادات میں نہایت پست و سست کرتی ہیں ۔ جو پرم پرا[2] سے چلا آتا ہے پس اسی پر انسانیت کا خاتمہ ہے ، آگے نہ عقل کو آزادی ہے ، نہ سمجھ کو وسعت ہے ۔ ایک تنگ نائے تقلید کی قید ہے جو خیالات میں وسعت پیدا نہیں ہونے دیتی ۔ جس کی آندھی میں چراغِ عقل روشن نہیں ہوتا ۔

دوسری قسم کی کتابیں عربی فارسی کی ہیں ۔ گو خیالی باتوں

۱۔ اصل : (صفحہ ۷۲) بڑی ۔

۲۔ پرم پرا : ابتدا سے ، ہمیشہ سے ۔

سے وہ زیادہ معمور ہیں مگر ان کی تحصیل میں کچھ عقل و ذہن کو تحریک ہوتی ہے، اور ان کتابوں اور استادوں کی تاثیر سے نفاست مزاج میں پیدا ہوتی ہے۔ نشست برخاست (اور) گفتگو میں سلیقہ آتا ہے۔ لیکن یہی نفاست پسندی، سلیقہ شعاری کبھی وہ رعونت و نخوت، مرزا منشی، خود نمائی، خویشتن آرائی پیدا کرتی ہے کہ کاہلی و بے پروائی کا باعث ہوتی ہے۔ کتابوں میں زیادہ تر مضمون عاشقانہ ہوتے ہیں جن کی اشتعالک پانے سے عاشق مزاجی و معشوق مزاجی پیدا ہوتی ہے، جس سے حوصلہ پست و ارادے سست ہو جاتے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ باتیں خوب دلکش، خوش کن، چکنی چپڑی بنانی آ جاتی ہیں۔ مراسمِ تعظیم و آداب کی بجا آوری ایسی شائستگی کے ساتھ بظاہر ہوتی ہے کہ وہ پسندیدہ معلوم ہوتی ہے۔

تیسرے اردو ہندی کتابیں ہیں جو عربی فارسی، سنسکرت کی بے تمیز اولاد ہے۔ اس کا ابھی کچھ اثر نہیں ہوتا۔

چوتھی قسم کی کتابیں انگریزی کی ہیں جن کے اندر ساری دنیا گھری ہوئی بیٹھی ہے۔ جن میں ایک قوم نے تعلیم پانے سے ساری دنیا میں اپنی سلطنت و علم و ہنر کا سکہ جمایا ہے۔ جب ہم انہیں پڑھتے ہیں تو ہمارا حال چراغ کا سا ہو جاتا ہے کہ اپنے تلے اندھیرا اور دور دور روشنی۔ جو سوجھتی ہے وہ دور ہی کی۔ اپنے تئیں بھول جاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ہم کیا ہیں۔ جب انگریزی کتابیں انگریز معلموں سے پڑھتے ہیں تو اس کی خبر نہیں رکھتے کہ ہم کون ہیں؟ یہ انگریز کون ہیں؟ ''ایاز قدرِ خود بشناس'' فراموشِ خاطر ہوتا ہے۔ ان کی برابری کا دعویٰ ہوتا ہے۔ شکستہ بالی میں بلند پروازی کی ہوس ہوتی ہے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ایک

لنگڑا لڑکا اسپ۔ تیز رفتار کے شکار بند کو پکڑ کر کے[1] قدم چل سکتا ہے۔

شعر

دامن صبا نہ چھو سکے جس شہسوار کا
پہنچے کب اس کو ہاتھ ہمارے غبار کا

غرض جو بلند خیالی و عالی ہمتّی اُن کی ہوتی ہے ، وہ حدِ اعتدال سے متجاوز۔ اخلاق کا حال اَور بھی بدتر ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں میں بیٹھے تو اہلِ یورپ بن کر اور اہلِ یورپ میں بیٹھے تو ہمسر ہو کر۔ غرض دونوں جگہ جو بنے وہ اچھے نہ بنے۔ گو سب کا وتیرہ یکساں نہیں ہے۔ ان میں بعض ایسے اہلِ تمیز بھی ہوتے ہیں کہ وہ دور سے دیکھتے ہیں اور اپنے قدموں کے نیچے نزدیک سے۔ جو قدم اٹھاتے ہیں سوچ سمجھ کر۔ وہ ان کتابوں کی تعلیم سے سب سے زیادہ فائدہ یہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ وہ یہ سمجھیں کہ ہم کیا ہیں اور جن کی یہ کتابیں ہیں ، وہ کیا ہیں۔ ان کی نسبت سے ہم میں کیا کیا عیب و نقص زیادہ ہیں ؟ ان کی اصلاح کی کیا کیا تدبیریں ہماری موجودہ حالت سے مناسب ہیں ؟ ہم ترقی کیونکر کر سکتے ہیں ؟ پس یہی خیالات ہم کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

۴۶۔ سب سے زیادہ دلچسپ نتیجۂ تعلیم

ایک دلچسپ بات سنو کہ ہر طالب علم کی تعلیم اس کے مناسبِ حال ہونی چاہیے۔ اگر کوئی طالب علم ایسا ذکی و ہوشیار

۱۔ ''کے'' بمعنی کتنے۔

ہو کہ وہ اپنی طبیعت پر یہ اقتدار رکھتا ہو کہ کبھی اُس کو اپنی حد سے متجاوز نہ ہونے دے، تو تعلیم سے اس میں ایسی لیاقت پیدا کردو کہ وہ اپنا رنگ سب رنگوں میں ملا دے - ہر مجلس اور عقل کے گوں ہو - بادشاہوں کے درباروں اور امرا کی مجلسوں، فقرا کے حلقوں میں، غرض ہر صحبت و ہر جلسے میں وہ ممتاز اور سرفراز معلوم ہو - اس کے اختیار میں ہو کہ جس جون میں چاہے، اپنے تئیں بدل کر لے آئے - ہمیشہ دنیا میں ایسی ہی طبیعت کے آدمیوں سے بڑے بڑے کام ہوئے ہیں - وہ ہر موقع و مکان و مقام کے مناسب اپنا مزاج بنا لیتے ہیں - مجسٹریٹ ہوئے تو فوجداری کے مقدّمات میں سیاست کی شان دکھانے لگے - جج ہوئے تو دیوانی مقدّمات میں بنیوں کا سا مزاج میں حلم بنا لیا - کلیسا میں ممبر پر بیٹھے تو انصاف و رحم کا وعظ فرمانے لگے - میدانِ جنگ میں گئے تو دشمنوں کے سر قلم کرنے لگے - کہیں پولیٹیکل ایجنٹ بنے تو کچھ اَور ہی روپ بنا لیا - سب کی سنتے ہیں، اپنی نہیں کہتے - کہیں روپے کی فیّاضی سے کام نکلتا دیکھا تو حاتم بن گئے، کہیں روپیہ جوڑنے کی ضرورت پڑی تو قارون ہوگئے - غرض اسی طرح وسعت آبادِ علم سے دولت آبادِ عمل میں جو آتے ہیں، وہی دنیا میں سب پر سبقت لے جاتے ہیں اور اپنے کارہائے نمایاں کے کارنامے لکھا جاتے ہیں - گو بعض پرہیزگار اس قبیل کے دنیا کے کامیابوں کو ابن الوقت کہتے ہیں مگر جن کو تعلیم سے ابن الوقت بننا آتا ہے، وہی دنیا میں سرفراز اور بلند شان ہوتے ہیں - عظیم المحل و عدیم المثل بنتے ہیں - سب فنون و علوم میں یہی فن اور علم دشوار اور مشکل ہے کہ انسان کیونکر نیک چال اور خوش گزران بنے - یہ علم و فن کتابوں کے پڑھنے سے نہیں آتا بلکہ زندگانی کے تجربوں سے

آتا ہے - عقل مند اُن علموں کو علم ہی نہیں جانتے کہ جن میں فقط الفاظ دل بہلاتے ہوں اور کوئی کام عملاً بکار آمد نہ ہو -

تعلیم سے یہ غرض نہیں کہ تم زیورِ علم سے آراستہ ہو کر اپنی خود نمائی کرو - بلکہ علّتِ غائی اس کی یہ ہے کہ تم اپنی زندگی کا دستور العمل موافق عقل کے مقرر کرو ، اور اس کے قوانین اور آئین کے پابند ایسے ہو کہ تمھارے چال چلن میں ہوش مندی ، راست بازی راست گفتاری ، عدالت گستری ، جور ترسی ، حق پژوہی ، میلِ حق پر مائل ، جانبِ باطل سے اجتناب ، پیرویِ حق میں گرما گرمی ، بیماری کی حالت میں مزاج میں صبر و استقلال ، عیش و عشرت میں اعتدال ، کاروبارِ خانگی میں انتظام ، کھانے پینے میں بے تکلّفی ، گوشت پلاؤ ، ساگ پات ، دال دلیا سب برابر ، پینے میں پانی کے آگے شراب حرام ، غرض یہ ساری باتیں تمھارے دستور العملِ زندگی میں ، جو تمھاری تعلیم سے تصنیف کیا ہوا ہو ، نظر آئیں تو تم نے تعلیم پائی ، ورنہ وہی مثل ہے کہ گدھے پر کتابیں لاد دیں -

خاتمہ

اوپر کے مضمون کا ماحصل و لبِّ لباب یہ ہے کہ تعلیم پانے کا مقصد عظیم یہ ہے کہ آدمی خلعتِ مردانگی پہن کر میدانِ فرزانگی میں آئے - خرد مند ، کارشناس بنے - خواہشِ فضول و غضبِ نامقبول سے گریز کرے ، عاداتِ نامعقول سے پرہیز کرے ، راستی و نکوکاری کو اپنا پیشہ بنائے ، خودبینی[1] و خود ستائی سے فراموشی اختیار کرے ، حق کی جستجو میں رہے ، خود شناسی و خدا شناسی کے

۱- اصل (صفحہ ۷۶) : خودبین -

درپے رہے ۔ غرض اچھی طرح جیے ، اچھی طرح مرے :

امروز چناں بزی کہ فردا چو روی
خنداں تو بروں روی و گریاں ہمہ کس

آں چناں زی کہ بعدِ مُردنِ تو
ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

۷۴- اپنی ہی استعداد اور قابلیت سے صحیح اور غلط کا اندازہ کرنا حماقت ہے

دنیا میں بہت سے ایسے بیچارے جاہل آدمی رہتے ہیں کہ لوحِ دل ان کا سادہ ہوتا ہے اور ہر نقش کے قبول کرنے کے لیے آمادہ ۔ وہ اور لوگوں کے کہنے پر جلد یقین اور اعتقاد لے آتے ہیں ۔ راست و دروغ ، جائز و ناروا کو بدون رد و قبول و تردّد و توقّف مان لیتے ہیں ۔ جیسے نرم موم پر مُہر کو لگائیے تو بے مزاحمت اس کے تمام حروف اُٹھ آتے ہیں ، ایسے ہی ان کے نرم دل پر جن اعتقادوں کا نقش جمائیے وہ بیٹھ جاتا ہے ۔ ترازو کے خالی پڑلوں[1] میں سے جس پڑلے میں ذرا سا وزن رکھیے تو وہ اُسی طرف جھک جاتا ہے ۔ اسی طرح ان کے خالی دل میں جس اعتقاد کا وزن رکھیے ، اُسی طرف وہ جھک جاتا ہے ۔ دوسرا کوئی اور وزن ہی نہیں ہوتا ہے کہ اس کو جھکنے نہ دے ۔

بچوں ، عورتوں ، عوام الناس ، بیمار آدمیوں کو دیکھتے ہو کہ وہ کیسے سریع الاعتقاد ہوتے ہیں ۔ جو وہ سنتے ہیں ، اُسی کو یقین

۱- موجودہ املا ''پلڑوں'' ہے ۔

کر لیتے ہیں - گویا ان کے کان ہی عقل و فہم کا کام دیتے ہیں - ایک لوگ تو یہ ہیں کہ جن پر جہالت کی تیرگی چھائی ہوتی ہے - دوسرے وہ لوگ ہیں کہ جن پر یہ حماقت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے کہ وہ عقل اور فہم کو ایسا وسیع سمجھتے ہیں کہ گویا ساری دنیا کی باتیں ان میں سمائی ہوئی ہیں - جو بات ان کی عقل و فہم میں نہ آئے ، اسے معدوم سمجھتے ہیں ، یا اس کو دروغ بتلاتے ہیں - مثلاً کوئی شخص ان سے معجزات اور کرامات اور خرقِ عادات کا ذکر کرے ، خواہ ان کے واسطے کیسی بزرگوں کی شہادت معتبر و معتمد موجود ہو ، لیکن وہ کہہ دیں گے کہ یہ سب جھوٹ ہے - ان کو یہ یقین کرنا چاہیے کہ نیچر کی قدرت بے انتہا ہے - وہ تمام نہ انسان کی سمجھ میں آئی ، نہ آئے گی - اپنے قصورِ فہم کا اعتراف نہایت عجز و انکسار سے اس کے سامنے کرنا چاہیے - معلوم نہیں کہ کیا کیا اسرار اس میں مخفی ہیں - کل ہی کا ذکر ہے کہ تم اس کی بہت سی باتیں نہیں سمجھتے تھے مگر معلّم کی تعلیم نے ان کو سمجھا دیا -

تم کو ناممکن اور نادر الوقوع باتوں میں تمیز کرنی چاہیے - تم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ کون سی چیز اس نیچر (عادت ، فطرت) کے خلاف ہے اور کون سی چیز عوام کی رائے کے خلاف ہے - یہ جان لینا کہ جس چیز کو ہم جانتے ہیں ، اس سے بڑی چیز دنیا میں نہیں ہے ، نہایت حماقت اور جہالت کی نشانی ہے - ایک شخص جو پہلے ہی پہل چھوٹا دریا دیکھتا ہے تو اسی کو وہ بہت بڑا دریا سمجھتا ہے - اب یہ سمجھنا کہ ایسا بڑا دریا کوئی دنیا میں نہیں ہے ، نادانی ہے - ہم نے شہر دہلی دیکھا ہے ، پس یہ جان لینا کہ اس سے بڑا شہر کوئی دنیا میں نہیں ہے ، جیسے کہ اس کے جاہل باشندے یقین کرتے ہیں ، بڑی بے وقوفی ہے -

یہاں لوگوں نے دو مذہب ہندو ، مسلمان دیکھے ہیں - وہ یہ جانتے ہیں کہ سوائے ان دو مذہبوں کے کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں ہے - ہم اپنی مجلسوں اور صحبتوں میں اِس قسم کی جہالت کے بڑے تماشے دیکھتے ہیں کہ ہر مسئلۂ علمی اور معاملاتِ ملکی و مالی و جنگی ، غرض ہر قسم کے مقدماتِ عظیم کا فیصلہ لوگ اپنی ٹکیل سمجھ سے اٹکل پچّو کر دیں گے اور اس کے واسطے کوئی ذلیل سی دلیل لائیں گے اور اس کے آگے قوی دلائل کو لغو و ضعیف جانیں گے - غرض ایسے پندار و غرور میں بھرے ہوئے ہوتے ہیں کہ اپنی سمجھ اور تجربے کے آگے ساری دنیا کے عقل اور تجربے کو غلط و ہیچ و پوچ جانتے ہیں -

۳۸- بھولے بھالے آدمی جھوٹ بہت کم بولتے ہیں

جو آدمی بھولا بھالا ہوگا ، وہ جھوٹ بہت کم بولے گا - جو بات کہے گا وہ غالب سچ ہی ہوگی - اس میں جھوٹ بات بنانے کا مادہ ہی نہیں ہوتا - جھوٹ بات کا بنانا ایک اختراع اور ایجاد ہوتا ہے جس کے واسطے ذکاوت کی حاجت ہے ، جس سے وہ سادہ لوح معترا ہوتے ہیں - اب شریف ، بھلے مانس ، تعلیم یافتہ آدمیوں کو دیکھو کہ اول جس بات کو دریافت کرتے ہیں اس میں بہت تجسّس اور تفتیش کر کے بال کی کھال نکالتے ہیں - پھر اس میں موشگافی کے بعد اپنی معلومات کے اظہار میں حسنِ بیان چاہتے ہیں - اس حسنِ بیان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بات کو اس طرح ادا کرتے ہیں جس طرح اپنے تئیں پسند ہو ، یا سننے والوں کو پسند آئے اور وہ ان کی داد دیں - غرض ایسے گل پھول بات میں لگاتے ہیں کہ جس سے اصل بات بدل جاتی ہے - اس سے یہ غرض ہوتی ہے کہ ان کی

شہرت اور نام‌وری ہو۔

بہت سے جھوٹ بولتے ہیں مگر اس جھوٹ کو جھوٹ نہیں جانتے۔ اس کا نام حسنِ بیان رکھتے ہیں۔ ان کا ذہن جو باتیں اختراع کر کے واقعاتِ نفس الامری پر حاشیے چڑھاتا ہے، اس سے ان کا دل بہت خوش ہوتا ہے۔ پس اس لیے یا تو بات اس شخص کی قابلِ اعتبار ہے جو پرلے درجے کا راست گفتار ہو، جھوٹ کی برابر کسی کام کو برا نہ جانتا ہو، یا بھولا بھالا ہو کہ بات میں نمک مرچ لگانی نہ جانتا ہو۔ سیدھی سادی طرز پر واقعاتِ اصلی کو بیان کرتا ہو۔

۴۹۔ وحشی و نیم وحشی

بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ ہم ان کو وحشی اس سبب سے کہتے ہیں کہ وہ ہمارے استعمال میں نہیں آتیں۔ مثلاً الفاظ وحشی وہ کہلاتے ہیں جو ہمارے استعمال میں نہیں آتے۔ جانور وحشی وہ کہلاتے ہیں جو ہمارے ہاتھ نہیں آتے، ہمارے گھروں میں نہیں رہتے۔ ہر قوم اپنے مذہب کو، اپنی سلطنت کو، اپنے علم و ہنر کو، اپنے رسم و رواج کو، اپنی شائستگی و تہذیب کو کامل جانتی ہے اور انھی چیزوں کو معیار اور لیول غیر قوموں کی شائستگی و تہذیب کے جانچنے کا اور ہمواری دیکھنے کا بناتی ہے (لیول ایک آلہ زمین کی ہمواری دیکھنے کا ہوتا ہے)۔ پس جو اس کسوٹی پر پورا نہیں اترتا اور اس لیول میں نہیں آتا، اس کو وحشی، نیم وحشی، جنگلی یا کوئی اور برا نام رکھ دیتے ہیں۔

کسی قوم کو جنگلی کہنا ایسا ہے جیسا کہ ہم ان میووں کو جنگلی کہتے ہیں جن کو نیچر (قدرت) نے اپنے ہاتھ سے لگایا

ہے اور نشوونما دیا ہے ۔ ان میں سارے خواص و صفات اصلی پائے جاتے ہیں ۔ ہم کو اپنے پروردہ میووں کو جنگلی کہنا چاہیے جن کی اصلی صفات کو ہم نے فقط اپنی زبان کے مزے کے لیے بگاڑ دیا ہے ۔ نیچر (قدرت) نے جو خوبیاں ان میں پیدا کی تھیں ، ان کو بدلا ہے ۔ مگر اس پر بھی بہت سے میوے جنگلی ایسے ہیں کہ وہ ہمارے پروردہ میووں کو مات کر دیتے ہیں ۔

یہ عقل قبول نہیں کرتی کہ انسان کی صناعت ، قدرت کی صناعت پر سبقت لے جائے ۔ گو ہم نے اپنی مادرِ نیچر پر مہربانی کر کے اس کو اپنے اختراعات اور ایجادات کے زیور سے ایسا لادا ہے کہ اس کا جی گھبرانے اور دم گھٹنے لگا ہے ، مگر جہاں اس کو آزادی حاصل ہے وہاں ہماری ساری محنت اور صناعت کے ایجاد و اختراع اس کے آگے پانی بھرتے ہیں اور غلام ہیں ۔

جنگلوں میں دیکھو کہ کیسے کیسے خود رو پھولوں کے گلستانِ کھلے ہوئے ہیں کہ ان کے آگے ہمارے سدا بہار چمن و گلزار خاک ہیں ۔ سینکڑوں پرند وہاں وہ خوش الحانی سے راگ گا رہے ہیں کہ ہمارے طوطیٔ ہزار داستان اور سکھائے پرند بدآواز معلوم ہوتے ہیں ۔ ہمارے پلے ہوئے چوپایوں سے سینکڑوں جنگلی چوپائے زیادہ موٹے تازے ، توانا ہیں ۔ نیچر کی صناعت کو کہیں ہماری صناعت پہنچ سکتی ہے ؟ اس نے جو مکڑی کو جالا بُننا سکھایا ہے ، کیا کوئی انسان صانع ویسا جالا بُننا سکھا سکتا ہے ؟ یا پرندوں کو اس نے جو گھونسلے بنانے سکھائے ہیں ، وہ کوئی کاریگر آدمی بنا سکتا ہے ؟ ہرگز نہیں ۔

افلاطون کا یہ قول آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ دنیا میں ساری چیزیں قدرت سے پیدا ہوئی ہیں یا انسان کی صناعت سے ۔

کل حسانت ، نفاست ، عظمت و شانِ کمال قدرتی چیزوں میں نمایاں ہیں اور سارے نقص و عیب انسان کی مصنوعی چیزوں میں ۔ پس وحشی قوم کے کچھ معنی نہیں ، سوائے اس کے کہ وہ اپنے نیچر کے زیرِ فرمان ہے ۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین کے ساتھ اختلاط پیدا کر کے اپنے تئیں خراب خستہ نہیں کیا ، اپنی سادگی کو نہیں چھوڑا ، اپنی اصلی صورت و شکل کو بناؤ سنگار کر کے نہیں بدلا ۔

بعض وحشی قوموں میں وہ خوبیاں پائی جاتی ہیں کہ ان سے اگر مہذّب قوم ناواقف رہے تو افسوس کا مقام ہے ۔ گو ان میں نہ تجارت ہے ، نہ علم پڑھنے لکھنے کا ہے ، نہ حساب جانتے ہیں ، نہ ان میں حاکم کا نام ہے ، نہ کوئی ملکی اور مالی بزرگی کسی کو ہے ۔ نہ کوئی خادم ہے ، نہ مخدوم ، نہ دولت ہے ، نہ افلاس ہے ، نہ کوئی معاہدہ ہے ، نہ تقسیمِ وراثت ہے ، نہ کوئی مال ہے ، نہ کوئی خدمت ہے ، مگر ہاں فرصت ہے ۔ نہ عزیز و اقربا کا ادب ہے ۔ اگر ہے تو سب کا برابر ہے ۔ نہ لباس ہے ، نہ زراعت ہے ، نہ اناج ہے ، نہ شراب ہے ۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان کی زبان میں نہ ایسے الفاظ ہیں کہ جن کے معانی جھوٹ ، بدکاری ، زنا کاری ، طمع ، حسد ، مذمّت ، غیبت ہوں ۔ غرض جیسا فطرت نے ان کو معصوم پیدا کیا ہے ، ویسے ہی ہیں ۔ پتھروں اور لکڑیوں کے ہتھیار بنا لیے ، ان سے مچھلی اور جنگلی جانوروں کا شکار کر لیا ۔ ان کو سینک کر بُھون کر کھا لیا ۔ وہ اوزار پتھروں کے ایسے بنا لیتے ہیں کہ اپنے سارے کام چلا لیتے ہیں ۔ ان سے بال ایسے مونڈتے ہیں جیسے کہ استرے سے ۔ غرض ان میں یہ اگر دیکھو کہ کتنے وہ برے کام کرتے ہیں تو بہت تھوڑے ہوں گے ۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ان کے برے کاموں میں تشدّد ہوتا ہے مگر تعدد اتنا نہیں ہوتا ،

جیسا کہ تہذیب و شائستگی میں۔

اگر اس خیال کو وسعت دیجیے تو یہ نتیجہ پیدا ہوگا کہ کل انسانوں کا حال یکساں ہے۔ خدا تعالیٰ کے انعام سب پر عام ہیں۔ اس کی ہزاروں نعمتیں ہیں، وہ سب میں برابر بٹی ہوئی[1] ہیں۔ کسی کو کچھ دیا، کسی کو کچھ۔ یہ انسان کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی قوم کے سوا اَور قوموں کو ناشائستہ، غیر مہذّب و نیم وحشی و وحشی نہ کہے تو اس کو اپنے تئیں مہذّب کہنے کا لطف نہیں آتا۔ اَوروں کو جب تک جہنّمی نہ بنائے تو اپنے جنّتی ہونے کا مزہ نہیں آتا۔

۵۰۔ انتظاماتِ الٰہی میں رائے زنی ہُشیار دلی سے چاہیے

نامعلوم یعنی مجہول چیزوں میں مکر و فریب کا گھر ہوتا ہے۔ آدمی سونا بنانا نہیں جانتے، اس لیے کیمیا گروں کے 'جل میں آجاتے ہیں۔ بعض نادان ان کے کہنے میں آجاتے ہیں[2] اور ان کے کہنے میں آن کر اپنے سونے چاندی کے گھر خاک میں ملا دیتے ہیں۔

آدمی کو یہ نہیں معلوم کہ آیندہ کیا ہوگا اس لیے جوتشیوں یعنی نجومیوں اور رمالوں، فال گوؤں، خوابوں کی تعبیر دینے والوں، فقیروں اور جوگیوں اور بہت سے اِسی قسم کے آدمیوں کے دم جھانسے میں آجاتے ہیں اور ان کے کہنے پر یقین کرتے ہیں۔ گو ہزاروں دفعہ ایسے لوگوں کے مکر و فریب و افترا کھل جاتے ہیں جس کے سبب سے وہ جابجا آوارہ گرد ہوتے ہیں۔ پورب سے

۱۔ اصل (صفحہ ۸۰) : بٹے ہوئے۔

۲۔ یہاں اصل میں ''بعض نادان'' کے الفاظ دوبارہ آ گئے تھے جنھیں تکرار سے بچنے کے لیے حذف کر دیا گیا ہے۔

پچھم اور پچھم سے پورب ، اور دکھن سے اتر اور اتر سے دکھن مارے مارے پھرتے ہیں ، مگر اپنی حرکات سے باز نہیں آتے اور اپنی باتوں پر اصرار چلا جاتا ہے کہ ہم اسرارِ الٰہی سے واقف ہیں ، مشیّتِ ایزدی کو جانتے ہیں ، خدا کی باتیں جو کسی کو نہیں معلوم وہ ہم کو معلوم ہیں - غرض ایک ہی قلم سے سیاہ و سفید نقش بناتے ہیں -

افلاطون نے لکھا ہے کہ اگر ایک جماعت کی مخاطبت میں دیوتاؤں کے اوصاف بیان کیجیے تو سب آدمی مطمئن ہو کر اس کو یقین کر لیں گے ، لیکن آدمیوں کے اوصاف بیان کیجیے تو اس میں سو چون و چرا نکالیں گے - کیونکہ سننے والوں کی جہالت ایک فراخ میدان آگے لاتی ہے کہ جس آزادی سے اس میں چاہو ، نامعلوم و مخفی چیزوں کے اسرار کے بیان کے گھوڑے دوڑاؤ - مجہول چیزیں عجیب و غریب ہوتی ہیں ، اسی سبب سے ان کا یقین ہوتا ہے - استدلالِ عقلی کا جرح قدح اُن میں نہیں چل سکتا ، جیسا کہ ہماری اَور باتوں میں چل سکتا ہے - ان کو بہ مجبوری ماننا پڑتا ہے -

انسان کی طبیعت میں داخل ہے کہ وہ ہر معلول کی علّت اور ہر مسبّب کا سبب دریافت کرتا ہے - مگر جب حادثات اور واقعات عجیب پیش آتے ہیں تو بعض آدمی مدعی ان واقعات کے اسباب جاننے کے ہوتے ہیں اور کسی سبب سے ان کو منسوب کر دیتے ہیں ، اور ایسی ابلہ فریبی کرتے ہیں کہ ان سببوں کو لوگ یقین کر لیتے ہیں - یوں ہزاروں عجیب و غریب افسانے بے سروپا انسان یقین کرنے لگتا ہے - ان کا عجیب ہی ہونا باعثِ یقین ہے مگر آدمی کو چاہیے کہ وہ دل سے یقین کرے کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانتا ہے - کسی انسان کا مقدور ہی نہیں کہ اسرارِ الٰہی اور خدا کی مرضی

کو جاننے لگے۔

امریکا میں قومِ انڈین[1] کی یہ رسم ہے کہ جب لڑائی میں ہزیمت ہوتی ہے یا کسی مقابلے میں ناکامی ہو تو وہ آفتاب سے، جو ان کا معبود ہے، اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ اور یہ جانتے ہیں کہ یہ آفت جو ہم پر آئی وہ ہماری شامتِ اعمال کے سبب سے آئی۔ وہ ہمارے معبود کی عین عدالت ہے۔

پس اِسی طرح ہم کو یقین کرنا چاہیے کہ دادارِ جہاں آفریں جو کچھ کرتا ہے، اس میں چون و چرا کی جگہ نہیں ہوتی۔ وہ حکیم ہے، کوئی کام اس کا حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ جو کام ہمارے لیے وہ کرتا ہے وہ ہمارے حق میں اچھا ہی ہوتا ہے۔ وہ حکیم جو تلخ دارو ہم کو پلائے، اسے کشادہ پیشانی سے پئیں؛ اس کا احسان مانیں، شکر بھیجیں، تسلیم و رضا کو اختیار کریں۔ مگر انسان عجب نادان ہے کہ دنیا کی اقبال مندی اور بداقبالی کو مذہب سے منسوب کرتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ غیر مذہب والے دنیا میں جاہ و جلال رکھتے ہیں اور اپنے مذہب والے ادبار کے غار میں پڑے ہیں، تو اس کے اپنے معتقداتِ مذہبی سست ہو جاتے ہیں اور غیر مذہب والوں کے معتقدات کی طرف رجحان ہوتا ہے۔ اس کو سمجھنا چاہیے کہ دنیاوی عروج و تنزل کو مذہب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ مذہب تو یہ بتاتا ہے کہ دنیا دارالامر ہے، یعنی مذہبی احکام کی بجا آوری کی جگہ ہے۔ عقبیٰ دارالجزا ہے جہاں برے بھلے کاموں کی جزا سزا ملے گی۔ مذہب یہ نہیں کہتا ہے کہ جو

۱۔ ریڈ انڈین: امریکا کے مقامی باشندے جنھیں یورپی آبادکاروں نے آہستہ آہستہ ختم کر دیا ہے اور اب بہت معمولی تعداد میں بچ گئے ہیں۔

دنیا میں نیک ہوگا ، وہ دنیاوی جاہ و مال بھی رکھے گا اور جو شریر ہوگا ، وہ دنیاوی مال و جاہ سے محروم ہوگا ۔

پس یہ انتظاماتِ الٰہی جو ہوتے رہتے ہیں کہ آج کسی قوم کا عروج ہے ، کل کسی قوم کا ، کسی قوم کا آج ادبار ہے ، کسی کا کل تھا ، اس کے اسباب کو مسبّب الاسباب ہی جانتا ہے ، انسان کا کام نہیں ہے ۔ اس کا سبب مذہب کو قرار دینا غلط ہے ۔ مذہب تو وہی رہتا ہے مگر اہلِ مذہب کے اقبال و ادبار میں انقلاب ہوتا رہتا ہے ۔ اس لیے دنیا کے عروج و تنزّل کو اس میں دخل نہیں ہے ۔ اس سے اپنے معتقدات میں ڈھِل مِل ہونا نہیں چاہیے ۔

خدا تعالیٰ نے بتلا دیا ہے کہ نیک اعمالوں کو اپنی جزا کے واسطے اور بد اعمالوں کو اپنی سزا کے واسطے ایک آنے والے روز کا انتظار رکھنا چاہیے ۔ آدمی آفتاب کی روشنی سے فائدہ اٹھائے ، اُس کی طرف آنکھ سے ٹکٹکی باندھ کے اپنے تئیں اندھا نہ بنائے ۔ پس اسی طرح خدا نے جتنی عقل اپنے کاموں کی سمجھ کے لیے دی ہے ، اسی سے فائدہ اٹھائے ۔ اس سے زیادہ سمجھنے کے لیے کوشش کرنے سے عقل کو نہ بڑھاوے ۔

۵۱- عیش و موت

قدیم زمانے کے بہت سے حکیم بالاتفاق یہ رائے رکھتے ہیں کہ جس وقت زندگی میں آفات زیادہ اور آسودگیاں کم ہو جائیں تو مر جانے کے واسطے یہ وقت نہایت اچھا ہے ۔ یہ امر نیچر کے قاعدے کے خلاف ہے کہ ہم اپنی حیات کو اس حالت میں برقرار رکھیں کہ اس میں سوائے رنج اور تکلیف کے کچھ نہ ہو ۔ چنانچہ ان کے مقولے

یہ ہیں :

(۱) یا چین کی زندگی ہو یا اچھی موت ہو (ان دو باتوں میں سے کوئی ایک ہو)۔

(۲) جب زندگی ملالت انگیز ہو تو مر جانا اچھا ہے۔

(۳) ذلّت کے ساتھ جینے سے مرنا بہتر ہے۔

مگر ان مقولوں اور رایوں پر افسوس ہے۔ آدمی اپنی زندگی کو کیوں ایسا کم بخت بنائے جس سے مرنا جینے سے اچھا ہو جائے۔ پہلے ہی سے دنیا کے جاہ و منصب پر کیوں ایسا دل لگائے کہ جس کے مفقود ہونے پر حیات سے موت اچھی ہو جائے۔

بہت سے حکما نے امرا کو نصیحت کی ہے کہ وہ دنیا کی عیش و عشرت و جاہ و دولت پر خاک ڈال کر خلوت نشین ہو جائیں اور حکیمانہ زیست بسر کریں۔ لیکن اہلِ دنیا عیش و عشرت، مال و دولت کے پھندوں میں ایسے پھنسے ہوئے ہوتے ہیں کہ نہ انہیں کھول کر باہر آ سکیں، نہ توڑ کر اپنے تئیں چھٹا سکیں۔

۵۲- کپڑے پہننے کی ضرورت

لباس پہننا انسان کی ضرورت میں داخل ہے یا عادت میں؟ اس کا فیصلہ کرنا ہے

لباس پہننے کی عادت نے بھی کیا[1] چاروں طرف سے کپڑوں کو لپٹا کر اپنے تئیں چھپایا ہے کہ جب تک اس کی نسبت کچھ کہا نہیں جاتا کہ اس کے کپڑے نہ اتارے جائیں[2]۔ ہم کو معلوم

۱- اصل میں جملہ یوں تھا: ''لباس پہننے کی عادات نے بھی کیا اپنے تئیں چاروں طرف سے کپڑوں کو لپٹا کر اپنے تئیں چھپایا ہے ...''

۲- یہ نامکمل جملہ اصل کے مطابق ہے۔

ہے کہ بہت سی قومیں برہنہ رہتی ہیں - اب یہ سوچنا چاہیے کہ یہ عریانی اصل وضعِ انسانی ہے یا ان کے ملک کی ہوا ایسی گرم ہے کہ اس نے یہ عریانی کا لباس پہنا رکھا ہے ؟

خدا کا کلام اور کام شہادت دے رہا ہے کہ سورج کے تلے جتنی چیزیں ہیں ، ایک ہی قوانین ان پر فرمانروائی کرتے ہیں - پس اب یہ دانش مندوں کا کام ہے کہ وہ دنیا کے دستورات پر غور کر کے قوانینِ قدرت اور انسان کے قوانینِ اختراعی میں تمیز کریں جس میں ذرا جھوٹ نہ ہو- تمام اور مخلوقات اپنے حوائجِ ضروریہ کا اسباب اپنی پیدائش کے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں - لباس کے لیے سوئی تاگا ان کے ساتھ ہوتا ہے - اب انسان کیا قصوروار تھا کہ وہ محتاج و بے نوا و ناقص پیدا ہوتا کہ جب تک اس کو خارج سے امداد نہ ملے تو جی نہ سکے - درخت ، پودے جانور ، غرض سارے ذی حیات قدرتی لباس اپنا کھالوں ، بالوں ، خولوں ، چھالوں اور اسی قسم کی چیزوں کا رکھتے ہیں - ہمارا حال بھی ایسا ہی تھا ، مگر ہم نے جیسے آفتاب کی روشنی کے سوائے اپنے لیے اور روشنیوں کو اختراع کر لیا ہے ، ایسے ہی ہم نے اپنی قدرتی وضع کو چھوڑ کر اوروں کی وضع طرح کو اختیار کر لیا ہے - یہ لباس پہننا فقط عادت ہی کی بات ہے ورنہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ملکوں میں ، جن میں جاڑا ہمارے اس ملک کا سا پڑتا ہے یا جن میں ہمیشہ زیادہ سردی رہتی ہے ، وہاں آدمی ننگے دھڑنگے بے تکلّف پڑے پھرتے ہیں - ان کے بدن کو سردی کی خبر بھی نہیں ہوتی - اپنے ملک میں دیکھتے ہیں کہ گنوار مزدور کڑاکے کے جاڑے میں کام کرتے ہیں - نہ ان کی چھاتی پر ، نہ پیٹ پر ، نہ پیٹھ پر کپڑا ہوتا ہے - اپنے ہی بدن میں دیکھ لو کہ جو سب سے زیادہ نازک اعضا ہیں ، وہ ہوا میں کھلے

رہتے ہیں: جیسے آنکھ، ناک، کان، منہ۔ اگر ہم کو انگرکھا اور پائجامہ پہننا ضرور ہوتا تو ہمارے اعضا، جو ہوا میں برہنہ رہتے ہیں؛ ضرور تھا کہ قدرت سے ان کی سخت کھال بنائی جاتی، جیسے ہاتھ پاؤں کی انگلیوں پر ناخن ہیں، تاکہ وہ موسموں کی سختیوں سے بچے رہتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہم ہیں جو کنجروں[1] سے زیادہ کپڑے پہنتے ہیں، دوسرے کنجر ہیں جو ان لوگوں سے زیادہ کپڑے پہنتے ہیں جو سوائے اپنی کھال کے کچھ اور نہیں پہنتے۔ کڑاکے کے جاڑے میں ایک جوگی سر سے پاؤں تک ننگا ایسا اینڈتا ہوا چلا جاتا تھا گویا کہ ایک بڑا پوستین پہنے ہوئے تھا۔ ایک شخص نے پوچھا کہ جوگی جی! آپ کو جاڑا نہیں لگتا؟ "بابا مجھے جاڑا کیوں لگے۔ کیا تمہارے چہرے کو جاڑا لگتا ہے؟ میرے سارے بدن کا حال تمہارے چہرے کا سا ہے۔" جاڑے میں تم دیکھتے ہو کہ سویرے لوگ ٹھنڈی ہوا میں ٹھنڈے پانی سے نہاتے ہیں۔ ننگے بیٹھ کر پوجا پاٹ کرتے ہیں۔

ایک بادشاہ نے ایک مسخرے سے، جو بہت باریک کپڑے پہنے ہوئے تھا، پوچھا کہ تجھے جاڑا ان باریک کپڑوں میں نہیں لگتا؟ میں تو اتنے کپڑے پہنے ہوئے ہوں، پھر بھی سردی لگتی ہے۔ کیا تدبیر کروں کہ تیری طرح مجھے جاڑا نہ ستائے؟ اس مسخرے نے کہا کہ حضور! اگر میرا کہا مانیے تو تمام کپڑوں کو اتار کر پھینک دیں۔ پھر میری طرح آپ کو جاڑا نہیں لگے گا۔

۱۔ کنجر: (۲) مذکر۔ ایک خانہ بدوش قوم جس کا پیشہ سرکیاں، چھینکے وغیرہ بنا کر بیچنے اور جنگلی جانوروں کو شکار کرنے کا ہے۔ (نور اللغات)۔ یہ لوگ غربت اور افلاس کی وجہ سے ناکافی لباس پہنتے ہیں۔ اسی لیے مصنف نے ان کو بطورِ مثال پیش کیا ہے۔ (مرتب)

پوشاک پہننے کی عادتیں مختلف قوموں میں مختلف ہیں۔ ہر ایک قوم میں آدمیوں کی عادتیں جدا جدا ہیں۔ بعض آدمی جاڑے گرمی میں ایک ہی کپڑے پہنتے ہیں۔ چلّے[1] کے جاڑے میں بھی ململ کے انگرکھے میں ایسے ہی گرم وہ رہتے ہیں جیسے روئی کے لبادے میں۔ عورتیں باریک ڈوپٹے اور دُلائی میں جاڑا بسر کرتی ہیں۔ ایک عورتیں وہ ہیں جو کاتک و پوس میں ننگے پاؤں دریا پر نہانے جاتی ہیں۔ دوسرے وہ عورتیں ہیں کہ اس موسم میں پاؤں میں موزہ اور موزے پر جوتا پہنتی ہیں۔ بعض قومیں سر پر بال اور بالوں پر ٹوپی اور دستار، بعض قومیں سر گھُٹا ہؤا چھلا ہوا کسیرو[2]، پھر اس پر ننگا۔

افلاطون کا قول ہے کہ سر اور پاؤں پر کوئی لباس پہننا نہ چاہیے۔ جو قدرت نے دیا ہے، وہی رکھنا چاہیے۔ بعض آدمی ایک جوڑا کپڑوں کا پہنتے ہیں اور جب تک وہ چیتھڑے ہو کر بدن سے اتر نہیں جاتا، وہ دوسرا جوڑا نہیں بدلتے۔ بعض دن میں چار چار دفعہ کپڑے اتارتے ہیں۔ بعض گھر میں ننگے سر اور باہر ٹوپی پہنتے ہیں، بعض اس کے برعکس عمل کرتے ہیں۔ اگر ان سب باتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اصل انسان کا لباس وہ ہے کہ جس کا اُلٹا سیدھا نہیں ہے، یعنی عریانی، اور باقی جامے مستعار و مخترعِ انسانی ہیں۔ مگر یہ بات ماننی ہماری عادت کے خلاف ہے، اس لیے شاید ہی اس کو کوئی مانے۔

۱۔ چلّے کا جاڑا : (عو) پوس ماگھ کی سردی۔ سخت سردی۔ (نوراللغات)
۲۔ کسیرو : نوراللغات میں ''کسیرو'' کے سامنے لکھا ہے : ''ایک قسم کی خوردنی جڑ''۔ معلوم ہوتا ہے یہاں کاتب سے سہو ہوا ہے۔

۵۳- ہماری حالتوں کا یکساں نہ ہونا

بہ اعتبار اوصافِ باطنی اور کمالاتِ روحانی کے ، جیسا کہ دو انسانوں میں فرقِ عظیم ہوتا ہے ، ایسا دو حیوانوں میں نہیں ، بلکہ ایک انسان اور حیوان میں نہیں (ہوتا) - ایک کو دوسرے آدمی پر وہ عجب سبقت ہوتی ہے کہ دوسرے آدمی کو حیوان پر نہیں ہوتی - ارسطو و افلاطون کو عقل کے لحاظ سے جو فوقیت ایک گنوار پر ہے ، وہ گنوار کو بیل گدھے پر نہیں - زمین اور آسمان کے درمیان فاصلے میں اتنے گز نہیں جتنے کہ انسانوں کے طبائع و ذہنوں کے مختلف درجے ہیں - انسان کے عیب و صواب جانچنے کا طریقہ اور جان داروں کا سا نہیں ہے کہ چند صفات جو ان کی جنس کے ساتھ مخصوص ہیں ، ان کا امتحان کرکے ان کے برے بھلے ہونے کا تخمینہ کر دیں - مثلاً گھوڑا ہے ، اس کی طاقت اور سُم مستحکم دیکھ کر ہم اس کے اچھے برے ہونے کا تخمینہ کر دیتے ہیں - سرکس میں جو گھوڑا تیز دوڑا ، اس کی واہ وا کا نعرہ بلند ہو گیا - گھوڑے کی خوبیوں کے دیکھنے میں اس کی رفتار کو دیکھتے ہیں ، ساز و لگام کے زرق برق ہونے کو نہیں دیکھتے - باز کے بازوؤں کو دیکھتے ہیں ، اس کی خلخال کو نہیں دیکھتے - پس اسی طرح انسان کے[1] اوصافِ باطنی کیوں نہیں دیکھتے - وہی اس کے اپنی نفس و ذات کے ہیں -

ایک شخص کا اصطبل گھوڑوں سے بھرا ہوا ہے ، محل عالی شان بنا ہوا ہے ، آمدنی لاکھوں روپے سالانہ کی ہے - یہ ساری چیزیں

۱- اصل (صفحہ ۸۶) : کی -

خارج میں اس کے گرد ہیں ، مگر اس کی ذات کے اندر داخل نہیں ۔ اگر ہم کسی گھوڑے کو خریدتے ہیں تو پہلے اس کی گردنی[1] آتارتے ہیں اور ننگا کرکے خوب اپنی آنکھیں کھول کر اس کا رنگ ، خوبصورتی ، دُم ، قدم ، ہاتھ ، پاؤں ، آنکھیں ، سینہ ، غرض تمام اعضا اس کے جو کام کے ہوتے ہیں ، ہم دیکھتے ہیں ۔ زین و چارجامہ کے تکلّف سے کچھ مطلب نہیں رکھتے ۔ پس اسی طرح انسان کے اوصاف کا تخمینہ کرنا چاہیے ۔ اگر ایک آدمی کو دیکھو کہ وہ بھاری پوشاک زرق برق ، سونے چاندی میں غرق ، پہنے ہوئے ہے تو سمجھ لو کہ وہ ایک ایسی چیز دکھا رہا ہے جو اس کی ذاتی نہیں ، بلکہ اس پوشاک نے ان چیزوں پر ، جس سے اس کا اصل حال کھلتا ہو ، پردہ ڈال دیا ہے ۔ تلوار کی قیمت و قدر اس کی کاٹ اور دھار سے ہوتی ہے ، نہ نیام سے ۔ اگر دھار کُرری[2] ہوئی ہو تو کمخواب کے نیام سے کیا کام نکلے گا ۔ غرض انسان کے لباسِ ظاہری پر اپنی بصارت کو نہ خرچ کرو ، بلکہ اوصافِ باطنی کو بصیرت سے دیکھو ۔

اگر کوئی آدمی پائے چوبیں[3] لگا کر بلند ہو جائے اور تم کو قد کی بلندی ناپنی ہو تو پہلے اسے اتار کر اور پھر کھڑا کر کے قد ناپو ۔ انسان کے القاب و خطاب اور آمدنی سے قطع نظر کر کے

۱- گردنی : (سونّث) گھوڑے پر ڈالنے کا کپڑا جو گردن سے لے کر پٹّھوں تک ہوتا ہے (نوراللغات) ۔

۲- کُرّری دھار : نوراللغات میں "کری" کا مطلب "کرکری ، خستہ" لکھا ہے ۔ یہاں غالباً دھار کا ناقص ہونا مراد ہے ۔ پنجابی میں اس کا مترادف "کُھنڈی" ہے ۔

۳- یعنی لکڑی کے پاؤں ۔

اس کی تنہا ذات کو دیکھو کہ جسم اس کا تندرست و چالاک و چست ہے ، حسین ہے اور اپنے سب کاموں کے[1] کرنے کے لائق ہے ؟ جو جو استعدادیں اور لیاقتیں ہونی چاہئیں وہ رکھتا ہے ؟ اس کے پاس جو دولت ہے ، وہ اپنی گرہ کی ہے یا قرض کی ہے ؟ بخت و اتفاق سے تو دولت مند نہیں ہو گیا ہے ؟ شجاع ایسا ہے کہ ننگی تلوار کے سامنے اس کی آنکھ نہیں جھپکتی ؟ اس کو جان کی پروا نہیں ، خواہ وہ منہ کے رستے سے نکلے یا دم گھُٹ کر ؟ اس کو وہ ثبات و استقلال ہے کہ اضطرار و اضطراب اس کے پاس ہو کر نہیں گزرتا ؟ غرض یہی باتیں ہیں جو انسان میں دیکھنی چاہئیں اور انھی سے انسانوں میں باہم تمیز ہوتی ہے ۔

دانش مند آدمی وہ ہے جس نے اپنے نفس کو مغلوب و محکوم کر رکھا ہے ۔ تمام شہواتِ نفسانی کے روکنے پر قادر ہے ۔ نہ افلاس سے ڈرتا ہے ، نہ موت کا خوف رہتا ہے ۔ نہ قید کی زنجیروں سے بھاگتا ہے ، نہ جاہ کی چاہ رکھتا ہے ۔ اس کا سنجیدہ دل ایک مجلّا مصفّا گولا ہے کہ جس پر خارجی چیزیں نہیں ٹھہرتیں ۔ ایسا شخص ریاست و سلطنت سے بہت بلند مرتبہ رکھتا ہے ۔ وہ خود شہنشاہ ہے ، وہ اپنی دولت کا مالک خود ہے ۔ کوئی چیز نہیں جس کی حرص و ہوس اس کو ستائے یا دولت اس پر حملہ آور ہو ۔ انسان کی بڑی آرزو یہی ہوتی ہے کہ بدن کو کوئی تکلیف نہ ہو ، دل کو سب طرف سے راحت و اطمینان ہو ، خوف اور افکار سے خالی ہو ۔ اب اس کے مقابل میں عوام الناس میں سے کسی ایک جاہل کو دیکھو کہ احمق ، کمینہ ، پاجی ، غیر مستقل ، غصّہ و غضب کے ہاتھ میں

۱۔ ''کے'' اضافہ' مرتب ۔

ایسا گرفتار کہ جس طرح وہ چاہیں اس کو ہلائیں جلائیں ، آپے سے باہر کر دیں - اس کے سارے کام اوروں پر موقوف - ان دونوں آدمیوں میں زمین و آسمان کا فرق پاؤ گے - مگر عادت و رسم یوں پڑ گئی ہے کہ ہم ظاہری اوصاف کو باطنی اوصاف پر فوقیت دیتے ہیں - گدا و بادشاہ ، امیر و غریب ، حاکم و محکوم ، دولت مند و مفلس خیال کر کے آدمیوں کے اعزاز میں تفاوت برتتے ہیں - مگر درحقیقت سوائے کپڑوں کے ان میں کچھ اور فرق نہیں ہے - جیسے تھیئٹر (تماشا گاہ) میں ابھی ایک شخص بادشاہ اور وزیر بن کر آتا ہے ، تھوڑی دیر کے بعد پھر وہ اصلی حالت میں خدمت گار کی صورت میں ہو جاتا ہے - پس ایسا ہی حال دنیا کا ہے کہ اس میں شہنشاہ جو نیلگوں ریشمی لباس ایسا پہنے ہوئے ہیں کہ آسمان کے ستاروں کا سماں دکھاتا ہے ، زیور وہ زیبِ بدن ہیں کہ جن کے زمرد سونے میں جڑے ہوئے آنکھوں کو چکاچوند لگاتے ہیں ، وہ بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور ناجائز عشق سے غم میں پھنسے ہوئے ہیں - اب ذرا حجاب اٹھا دو تو سوائے اس کے تم نہ دیکھو گے کہ وہ ایک معمولی آدمی ہے - اس کی رعایا میں سے کمینے سے کمینہ جو آدمی ہے ، شاید اس سے بھی وہ بدتر ہے -

انسان کی اصلی خوشیاں باطنی ہیں - یہ جھوٹی خوشیاں ظاہری — کم ہمتی ، تلوّن ، حرص ، کینہ ، حسد — اس کو ایسا ہی پریشان کرتی ہیں کہ جیسے کہ اور ما و شما کو - اس واسطے نہ خزانہ اور نہ لشکرِ عظیم دل کے کم بخت جھگڑوں کو چکا سکتے ہیں ، نہ زریں چھتیں دل کے افکار اور ترددوں کو بھگا سکتی ہیں - ہزاروں سپاہ میں وہ کھڑا ہو تو بھی اس پر تردد اور خوف حملے کرتے ہیں -

انسان کے پیچھے جو تردداتِ اور خوف لگے ہوئے ہیں، نہ وہ ہتھیاروں کی چمک دمک سے، نہ تیروں کی نوک سے ڈرتے ہیں، نہ بادشاہوں کے شاہانہ زریں، ارغوانی لباس کا ادب کچھ کرتے ہیں۔ وہ اس سے ہم آغوش ہوئے بغیر رہتے نہیں۔ کیا وہ اپنی بادشاہی کے سبب سے بخار، نقرس[1]، صرع[2] کی بیماریوں سے بہ نسبت اَوروں کے زیادہ بچ سکتا ہے؟ کیا اس کے بڑھاپے کی سرگرانی کا بوجھ اس کے سپاہی اپنے سر پر لے کر ہلکا کر سکتے ہیں؟ کیا موت کے خوف کو، جب اس پر طاری ہو، اس کے مشیر و وزیر تسلی و تشفی دے کر دور کر سکتے ہیں؟ جب اس کے دماغ میں حسد یا کوئی اور حرص تیرتی ہے تو کیا بہت سے آدمیوں کے مجرے اور کورنش اور بڑی بڑی تعظیمیں خوش مزاج بنا سکتی ہیں؟ کیا تاجِ زریں اور تختِ سیمیں اس کے قولنج کا علاج کر سکتے ہیں؟ کیا کوئی عمدہ پلنگ پر عمدہ چادر اوڑھنا بخار کو کم کر سکتا ہے؟ بخار کے نزدیک دوشالہ اور کمبل دونوں برابر ہیں۔

سکندرِ اعظم کے خوشامدی درباریوں نے اس سے کہا کہ آپ مُشتری[3] دیوتا کی اولاد میں سے ہیں۔ جب وہ ایک روز زخمی ہوا تو اس نے کہا کہ میرے بدن میں سے تو وہی سرخ خون نکل رہا ہے جو اَور آدمیوں کے بدن سے نکلا کرتا ہے۔ یہ خون وہ نہیں ہے جو دیوتاؤں کا ہوتا ہے۔

۱۔ نقرس: (ع) مذکر۔ انگوٹھے کے درد کا نام۔ ایک طرح کا گٹھیا۔ وہ درد جو پاؤں کے انگوٹھے میں ہوتا ہے۔

۲۔ صرع: مرگی۔

۳۔ مشتری: ایک ستارہ جس کا انگریزی نام جوپیٹر ہے۔ نیز قدیم رومنوں کا ایک دیوتا جسے وہ بعلبک میں پوجا کرتے تھے۔

ایک اور بادشاہ کی تعریف میں ایک شاعر نے کہا کہ آپ سورج کے 'پتّر'[1] ہیں - اس نے کہا کہ جو شخص میری بغل کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے ، اس سے پوچھ کہ یہ بات غلط ہے (اگر وہ ایسا ہوتا تو پاس کا بیٹھنے والا جل جاتا) - غرض بادشاہ بھی آدمی ہوتا ہے - اگر فطرت نے اس کو بد صورت پیدا کیا ہے تو سارے عالم کی سلطنت اس کو خوب صورت نہیں بنا سکتی - پریاں اس کے تخت کو اٹھائیں ، قدم قدم پر گل و گلزار لگائیں ، تو بھی اس کی صورت نہیں بدل سکتی - اگر وہ احمق ہو تو ایسے ہی یہ چیزیں دانش مند نہیں بنا سکتیں - عیش و عشرت ، اقبال مندی کا بھی لطف بغیر طاقت اور فہم کے نہیں اٹھ سکتا - مثل مشہور ہے کہ جیسی روح ویسے ہی فرشتے - چیزوں کا حال ایسا ہی ہو جاتا ہے ، جیسا کہ ان پر قبضہ رکھنے والوں کا دل ہوتا ہے - اگر ان کو درست طور سے کام میں لاؤ تو اچھی ہیں ، اگر برے طور سے کام میں لاؤ تو بری ہے -

کسی چیز کا مزہ جب ہی آئے گا کہ زبان کی قوّتِ ذائقہ درست ہوگی - دولت کا مزہ جب ہی آئے گا کہ اچھی طرح اس کو کام میں لانے کی عقل ہوگی - کسی چیز کا قبضہ ہم کو خوش نہیں کرتا ، بلکہ اس سے متمتّع ہونا ہم کو لذت دیتا ہے - زمین کی ملکیت اور چاندی سونے کے ڈھیر کا ایک تپ زدہ مالک کیا احتظاظ اٹھا سکتا ہے ؟ کیا وہ اس کے بخار کو کم کر سکتے ہیں ؟ ان کی لذّت تو جب ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ ان کا مالک صحیح المزاج اور تندرست ہو - جو شخص طامع اور خائف ہو ، اس کو اپنی زمین

---

۱ - 'پتّر' : بیٹا - اولاد -

اور اپنا گھر ایسا ہی ہے جیسا کہ اندھے کے لیے تصویر - جب زبان ہی سے قوّتِ ذائقہ زائل ہوگئی ہو تو ہریل[1] اور لوے[2] کے گوشت میں کیا مزہ آئے گا؟ نیم کے پتّے اور قند دونوں برابر ہیں - ایسے ہی جس کی عقل سلب ہو گئی ہو اس کو دولت مندی کا کیا مزہ حاصل ہوتا ہے - اس کے پاس دولت کا ہونا ایسا ہے جیسے گھوڑے کے پاس سازِ سیمین و زریں کا ہونا، جو اس کو کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا -

افلاطون کا یہ اچھا قول ہے کہ صحّت، حسن، قوّت، دولت اور وہ سب چیزیں، جو اچھی بتلاتے ہیں، وہ منصف آدمی کے لیے اچھی اور غیر منصف کے واسطے بری ہیں - اور اس کے بالعکس بری چیزوں کا حال ہے کہ غیر منصفوں کے واسطے اچھی اور منصفوں کے واسطے بری - اسی واسطے جہاں جسم اور روح دونوں مرض میں گرفتار ہوں وہاں یہ خارجی ساز و سامان اور اسبابِ آرام کام نہیں آتے - ایک سوئی کی نوک کا چبھنا اور دل میں ذرا سا بھی غصے کا آنا بادشاہِ عالم کی عیش کو منغّص[3] کرنے کے لیے کافی ہے - اگر غصّہ آئے تو کیا بادشاہ ہونا اس کے چہرے کے لال پیلے ہونے کو روک سکتا ہے؟ کیا وہ دیوانوں کی طرح دانتوں کے کچکچانے سے باز رہ سکتا ہے؟ جو شخص طبعِ سلیم اور ذہنِ مستقیم، جسمِ تندرست رکھتا ہو، اس کو بادشاہی کا حاصل ہونا زیادہ خوش نہیں کرتا - اگر کسی شخص کا معدہ صحیح ہو، پاؤں اور پھیپھڑے

۱- ہریل : ایک قسم کا پرندہ جو جنگلی کبوتر کے برابر ہوتا ہے اور جس کا رنگ سبز ہوتا ہے - (نور اللغات)

۲- لوا : بٹیر کی قسم سے ایک چھوٹے پرند کا نام جو اکثر جھاڑیوں میں رہتا ہے - (نور اللغات)

۳- اصل : منغّض - صحیح منغّص بمعنی مکدّر -

درست اور منتظم ہوں تو پھر اس کو خوش ہونے کے واسطے شاہانہ دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ شاید اس کی رائے شاہ سلیوکس[1] کی سی ہوگی جو یہ تھی کہ عصائے شاہی کے وزن کو جو شخص جانتا ہے، اگر اس کے سامنے بھی وہ پڑا ہوگا تو اس کے اٹھانے کے لیے نہیں جھکے گا۔ اچھے بادشاہ کو فرائضِ سلطنت ایسے ہی تکلیف دیتے ہیں۔ سچ ہے کہ جب ہم کو اپنی ذات پر حکومت کرنی دشوار ہو تو اوروں پر حکومت کرنی کیوں نہ زیادہ مشکل ہوگی۔

فرماں روائی انسانوں کو سبز باغ دکھا کر اپنی طرف کھینچتی ہے، مگر انسان کی رائے ایسی ضعیف و نازک ہے کہ نئی اور مشتبہ چیزوں میں انتخاب کرنا اس کو مشکل ہے۔ یہ بات نہایت آسان ہے کہ ہم خود پیشوا نہ بنیں بلکہ پیرو ہوں۔ اس سے دل بڑا چین اور آرام سے رہتا ہے کہ ہم کو ایک ہی راستہ ایسا چلنے کے لیے مل جائے کہ جس میں کسی کی باز پرس کا خوف سوائے اپنے نفس کے نہ ہو۔ چپ چاپ اطاعت اختیار کرنا حکمرانی چاہنے سے بہتر ہے۔

کیخسرو[2] کا یہ مقولہ ہے کہ تمام رعایا میں سے جو سب سے

۱۔ شاہ سلیوکس: ۳۱۲ قبل مسیح سے ۶۴ قبل مسیح تک شام پر حکومت کرنے والے ایک شاہی خاندان کا مؤسس اعلیٰ۔ سلوکس نیکاتور (۳۵۶—۲۸۰ ق‌م) سکندر اعظم کا ایک جرنیل جو فرات اور ہندوستان کے درمیان کے علاقے کا گورنر مقرر ہوا لیکن ۳۰۱ ق‌م میں یہ خود مختار ہو گیا اور شام و ایشیائے کوچک کو اپنی مملکت میں شامل کرکے انطاکیہ کو پایۂ تخت مقرر کیا۔

۲۔ کیخسرو: ایشیائے کوچک کے تین سلجوقی بادشاہوں کا نام کیخسرو تھا۔ کیخسرو اول ۱۲۱۰ میں محاربۂ بیزنطین میں قتل ہوا۔ کیخسرو دوم ۱۲۳۷ میں تخت نشین ہوا اور کیخسرو سوم ۱۲۸۲ میں قتل ہوا۔

زیادہ عاقل ، ہوشیار ، قابل ہو وہ بادشاہ بننے کے لائق ہوتا ہے - نیرو[1] بادشاہ کہا کرتا تھا کہ عیش و عشرت سے جیسی رعایا لذّت یاب ہوتی ہے ، ایسے بادشاہ نہیں ہوتے - اس لیے کہ اپنی[2] مرضی کے موافق بادشاہوں کو سامانِ عیش کے مہیا کرنے کے موقعے اور آسانیاں ایسی نہیں ہیں - وہ اُن خوشیوں سے محروم ہو جاتے ہیں جو رعیّت کو حاصل ہوتی[3] ہیں - وہی عشق بازی ان کی ، جو ایک قرار پر نہیں رہتی ، ایسی ایذا رساں ان کے لیے ہو جاتی ہے جیسے معدے کے واسطے بے نمک گوشت بد ہضمی کے سبب سے - گویّوں کے طائفے میں گویے کو گانا سننے میں اس سے زیادہ مزہ نہیں آتا جو سننے والے کو آتا ہے - دعوتوں کی[4] مجلسوں کی ، رقص و سرود کی[5] محفلوں کی ، سانگ کے ہنگاموں کی ، کُشتی کے دنگلوں کی اور پٹّے بازی کے اکھاڑوں کی جب کثرت ہو جاتی ہے تو ان کا دیکھنا اجیرن ہو جاتا ہے اور بار بار دیکھنے سے ایسا دل پھر جاتا ہے کہ ان کی طرف دیکھنے کو جی نہیں چاہتا ، مزہ اور لطف آنا تو درکنار - ان کے دیکھنے کا دل جب ہی مشتاق ہوتا ہے کہ وہ گاہے ماہے ہوں - جب تک آدمی پیاسا کچھ دیر نہ رہے ، پانی پینے میں مزہ نہیں آتا - نٹوں کے تماشے میں دیکھنے والوں کو لطف آتا ہے ، وہ خود تو تھک کر چکنا چور[6] ہو جاتے ہیں -

اُمرا اور بادشاہوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی امیری کی حالت سے ایسے سیر ہو جاتے ہیں کہ بھیس بدل کر غریبوں کی طرح

۱- نیرو : دیکھیے حاشیۂ سابق -
۲- اصل (صفحہ ۹۰) : اپنے -
۳- اصل (صفحہ ۹۰) : ہوتے -
۴- اصل (صفحہ ۹۰) : کے -
۵- اصل (صفحہ ۹۰) : کے -
۶- کذا -

بود و باش کرنے سے خوش ہوتے ہیں - امیر اور دولت مند اپنے خوانِ ُپر الوان سے ایسے سیر ہو جاتے ہیں کہ وہ غریب آدمیوں کے کھانوں کو ، جس میں نہ دسترخوان کا نہ مکان کا تکلف ہوتا ہے ، بہت کشادہ پیشانی سے کھاتے ہیں -

ہر چیز کی افراط اس کو بے لطف اور گراں خاطر کر دیتی ہے - اگر کسی امیر کے محل میں تین سو عورتیں بھری پڑی ہوں تو وہاں کیا خواہشِ نفسانی کو پریشانی ہوگی - اُس کو شکار کا مزہ کیا آئے گا جو سات ہزار باز لے کر شکار کو جائے -

اُمرا کے پیچھے ایک اور کم بختی لگی ہوتی ہے کہ وہ ایسے کھلے میدان میں بیٹھے ہوتے ہیں کہ ہر شخص کی نظر ان پر پڑتی ہے - ان کی ذرا ذرا سی بات کا گھر گھر چرچا ہوتا ہے - وہ ایسی بلندی پر جاگزیں ہوتے ہیں کہ کسی سے اپنی حرکات کو چھپا نہیں سکتے - وہ اگر ذرا سا بھی نا مناسب کام کرتے ہیں تو لوگ اس کے بیان کرنے میں مبالغہ کرتے ہیں - رعایا ان پر عیب گیری کو[1] اپنا حق سمجھتی ہے ، ان کی ذرا سی بات کا افسانہ بنا دیتی ہے -

افلاطون نے قہرمان فرماں روا کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ اپنے شہر میں جو کام چاہے اپنی مرضی کے موافق کرے ، اس کو کوئی روک نہ سکے - اس سبب سے اس کے ُبرے کاموں کی شہرت جو شرارت انگیزی کرتی ہے ، وہ اس کے خود ُبرے کام نہیں کرتے - ایک بادشاہ بادشاہی کی مصیبتیں یہ بیان کرتا ہے کہ دنیا کی آزادانہ سیر بادشاہ نہیں کر سکتے - اپنی ریاست و مملکت میں قیدیوں کی طرح مقیّد ہوتے ہیں - ان کو ہمیشہ آدمی گھیرے رہتے ہیں -

---

۱- اصل (صفحہ ۹۱) : کا -

بادشاہ الفنسو[1] کہا کرتا تھا کہ بادشاہوں کا حال بعض لحاظ میں تو گدھوں سے بدتر ہے - گدھوں کو ان کے مالک رات کو فرصت دے دیتے ہیں کہ جہاں چاہیں پھریں ، مگر بادشاہوں کو تو کسی وقت بھی فرصت و فراغت آدمیوں کے بھرے رہنے سے نہیں ہوتی -

نیرو یہ کہا کرتا تھا کہ بادشاہوں کا کوئی دوست نہیں ہوتا - دوستی کا امتحان وہ کیوں کر کر سکتا ہے ، جب کہ یہ نہ معلوم ہو سکے کہ یہ کام کسی نے محبت کے سبب سے کیا یا اطاعت کے خیال سے ؟ اطاعت تو سب پر بادشاہ کی لازم ہے ، خواہ اچھا ہو یا برا ہو - جو تعظیم و تکریم بادشاہوں کی کی جاتی ہے ، وہ مراسم کے موافق ہوتی ہے ، کچھ بادشاہ کی خاص ذات سے اس کو تعلق نہیں ہوتا - بادشاہ کا معاہدہ دوستی کا کسی سے ہو نہیں سکتا - وہاں تو حاکمی اور محکومی اور غالب و مغلوبی اور آقائی و ملازمت کا تعلق ہوتا ہے - غرض بادشاہ کے گرد جتنی چیزیں ہوتی ہیں ، وہ اور ہی لباس اور بھروپ میں ہوتی ہیں ، اصل حقیقت ان کی کھلتی نہیں - اہلِ دربار نے جب شہنشاہ جولیس[2] کی تعریف کی کہ حضور بڑے عادل ہیں ، اس نے کہا کہ میں تمھاری اس تعریف کا جب اعتبار کروں کہ اگر میں کوئی ظلم کا کام کروں تو کہو کہ تو بڑا ظالم

۱- الفنسو : مشہور الفانسو دوم - پرتگال کا بادشاہ (۱۲۱۱—۱۲۲۳) - اس نے عربوں سے جنگ کی اور کئی مواقع پر انھیں مغلوب کیا -

۲- جولیس : غالباً یہ جولیس الفقیر ہے جس نے اپنی ماں اور باپ کو قتل کر دیا تھا - پھر اس نے توبہ کی اور اتنی عبادت کی کہ ساری زندگی عبادت و ریاضت میں گزار دی - اس نے اپنے نام پر ایک کنیسا بھی تعمیر کروایا تھا -

ہے - بادشاہوں کو یہ بڑا فائدہ ہے کہ جو کچھ وہ کہیں یا کریں، رعایا پر ان کی فقط اطاعت ہی لازم نہیں ہوتی بلکہ اس کی تعریف کرنی بھی ضرور ہوتی ہے :

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت ''اینک ماہ و پرویں''

غرض نظرِ غور سے دیکھیے تو بادشاہوں اور امیروں کو وہی فائدے حاصل ہیں جو غریبوں اور ذلیل سے ذلیل آدمیوں کو - جیسے غریب سوتے ہیں، ویسے وہ سوتے ہیں، کوئی نئی نیند تو ان کی ہوتی نہیں - کھانے میں ایک پِسنہاری[1] کو اپنی سوکھی روکھی روٹی میں جو مزہ آتا ہے، وہی بادشاہ کو اپنے دسترخوانِ پُر الوان میں، جس پر ہزاروں نعمتیں چنی جاتی ہیں - علیٰ ہذالقیاس اَور خواہش ہائے طبعی کی کیفیت ہے - اُسی لوہے کے ہتھیار اَور سپاہیوں کے پاس ہوتے ہیں جس کے بادشاہوں کے پاس ہوتے ہیں - ان کا تاج ان کو نہ دھوپ سے بچا سکتا ہے، نہ مینہ سے -

شاہ پرہس نے جب ملک اٹلی[2] کے فتح کا ارادہ کیا تو اس کے ایک مشیر نے پوچھا کہ آپ یہ شاہانہ تیاریاں کن ارادوں کے لیے کر رہے ہیں؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ ملک اٹلی کے فتح کے ارادے سے - اس نے کہا کہ پھر اس کے بعد کیا ارادہ ہے؟ بادشاہ نے

۱- پِسنہاری = اُجرت پر آٹا پیسنے والی عورت -

۲- اٹلی : یورپ کا ایک جمہوری ملک جس کی آبادی تقریباً ۴۷ ملین ہے - اس کا دارالحکومت روما ہے جس کی آبادی ۱۵ لاکھ کے لگ بھگ ہے -

جواب دیا کہ پرتگال[1] اور ہسپین[2] کی فتح کا ارادہ ہے ۔ اس نے کہا پھر اس کے بعد؟ بادشاہ نے کہا کہ افریقہ کے تسخیر کرنے کا ۔ اس نے کہا پھر اس کے پیچھے؟ بادشاہ نے کہا کہ امن و عافیت کے ساتھ بیٹھ رہنے کا اور اللہ اللہ کرنے کا ارادہ ہے ۔ اس مشیرِ عاقل نے کہا کہ یہ کام جو جفا کشی اور زحمت اٹھانے کے بعد آپ کریں گے ، پہلے ہی سے کیوں نہیں کرتے ۔

سچ ہے لوگ نہیں جانتے کہ دنیا میں چیزوں کے حاصل کرنے کی مناسب حدیں کیا ہیں اور کس حد تک اصل خوشی اور مسرت حاصل ہو سکتی ہے ۔ اصل یہ ہے کہ ہر شخص اپنی قسمت آپ بناتا ہے ۔ کامیابی کو اپنے سے منسوب کرتا ہے اور ناکامی کو تقدیر سے ۔

۵۴- بُو و خُلق

خوش اخلاق کو خوشبو سے تشبیہ دیتے ہیں ، یعنی جیسے کہ راحت روح کو خوشبو پہنچاتی ہے ، ایسے ہی خوش خلقی سے آدمی

۱- پرتگال : مغربی یورپ کا ایک ملک جس کی آبادی ستاسی لاکھ کے قریب ہے اور رقبہ ۱۸۷۳۰ کلومیٹر ۔ دارالحکومت لزبن ہے ۔

۲- ہسپین : مغربی یورپ کا ایک جمہوری ملک ۔ آبادی تقریباً ۲۹ ملین ۔ اس کی سرحدیں پرتگال اور فرانس سے ملتی ہیں ۔ یہ ایک زرعی ملک ہے جس میں مختلف قسم کے پھل بھی پیدا ہوتے ہیں ۔ مچھلی بھی خاصی تعداد میں پکڑی جاتی ہے ۔ معدنیات سے بھی مالا مال ہے ۔ کئی قیمتی پتھروں کے علاوہ چاندی ، لوہا اور زنک وغیرہ بھی نکالے جاتے ہیں ۔ اس کا دارالحکومت میڈرڈ ہے جو کسی زمانے میں مجریط کہلاتا تھا ۔ دوسرے اہم شہر : برسلونا ، ملقہ ، سرقسطہ ، وادی الولید ، طلیطلہ ، غرناطہ ، اشبیلیہ ، قرطبہ اور اندلس ۔

کو راحت پہنچتی ہے - بعض آدمیوں کا اخلاق ہی خوش نہیں ہوتا بلکہ ان کا جسم بھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کے پسینے میں عطر کی خوشبو آتی ہے - انسان کے جسم کی بڑی تعریف یہ ہے کہ اس میں کوئی بُو نہ ہو - وہ شخص بڑا پاکیزہ نفس ہوتا ہے کہ جس کے بدن میں کوئی بو نہیں ہوتی -

جو لوگ عطر اپنے بدن پر زیادہ تر لگاتے ہیں ، ان پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان کے جسم میں سے بدبو آتی ہے - اس عیب کے چھپانے کے واسطے وہ عطروں میں جسم کو بساتے ہیں - ایسے لوگ جب ایک شخص پر ہنسنے لگے کہ تُو عطر نہیں لگاتا تو اس نے کہا کہ میرے[1] بدن میں سے کوئی بو نہ آئے ، میں اسی کو اپنے بدن کا معطّر ہونا جانتا ہوں - بعض آدمی خوشبو پر جان دیتے ہیں - ان میں بدبو سونگھنے کی ذرا برداشت نہیں ہوتی - بعض کی قوّتِ شامہ ایسی تیز ہوتی ہے کہ کسی کی بغل کی اور پکی ہوئی پھنسی کی بُو ایسی دور سے سونگھ لیتے ہیں کہ جیسے کہ کتّا چھپی ہوئی کُتیا کی - جو بُوئیں قدرتی ہیں اور تیز نہیں ہیں ، ان کا کیا کہنا ہے ، سبحان اللہ ! عورتوں کو انھی کا استعمال چاہیے - خوشبو کا مَلنا زیادہ تر عورتوں ہی کا کام ہے - وحشی قوموں میں بھی عورتیں ان خوشبوؤں کا استعمال کرتی ہیں - تاتاری عورتیں خوشبودار مصالحہ[2] ، جو ان کے ملک میں پیدا ہوتا تھا ، اپنے سارے بدن پر مَلتی تھیں - جب بیاہی جاتی تھیں تو اسی کا بٹنا[3] لگاتی تھیں -

بعض آدمیوں کو خوشبو اتنی پسند ہے کہ وہ افسوس اور

۱- اصل میں یہاں ''میری'' چھپا تھا - ۲- اصل : مصالح -
۳- بٹنا : اُبٹن -

شکایت کرتے ہیں کہ نیچر نے کوئی ایسی چیز نہ بنائی کہ وہ ہماری ناک میں ہمیشہ خوشبو پہنچاتی رہتی - مگر یہ ان کی شکایت بے بجا ہے - 'مونچھیں'[1] ایسی ہیں کہ ان کو عطردان جو چاہے بنا لے - خوشبو ان کو لگا دے ، ناک کو ایسا ہی معطّر رکھیں گی جیسے کہ عطردان -

خوشبوؤں سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ ہوا کی تعفّن اور سمّیت سے آدمیوں کو محفوظ رکھتی ہیں اور امراضِ وبائی میں مبتلا نہیں ہونے دیتیں - ان کے سبب سے غلیظ مریضوں کے عیادت کے لیے جانے میں جو ہوا کی عفونت کا اثر دماغ پر ہوتا ہے ، وہ نہیں ہوتا - بہت دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو مکان خوشبو سے مہکتے رہتے ہیں اور جو آدمی عطروں میں بسے رہتے ہیں ، ان کو وبائی امراض نہیں ستاتے -[2] ہیضے کے دنوں میں گھروں کو کافور کی بو سے اور لوبان کی دھونیوں سے مہکاتے ہیں - طبیب بھی خوشبو سے اپنے کام نکالتے ہیں - مریضوں کی روح میں تازگی پیدا کر دیتے ہیں - اکثر معابد میں بخور کا استعمال ہوتا ہے جن کی خوشبو سے عابدوں کا دماغ معطّر ہوتا ہے ، حواس میں تازگی آتی ہے ، خدا کا خیال زیادہ پاکیزگی کے ساتھ ہوتا ہے - باورچی کھانوں کو خوشبوؤں سے معطّر کرتے ہیں - بعض دفعہ مشک عنبر کھانوں میں پڑتے ہیں جن کی قیمت کھانوں کی قیمت سے بھی زیادہ ہوتی ہے - جس وقت ایسے کھانے دسترخوان پر چنے جاتے ہیں تو سارا مکان کیا گلی تک مہک جاتی ہے - کھانے والوں کو قوّتِ ذائقہ ہی اکیلی لذّت یاب نہیں کرتی بلکہ قوّتِ شامہ بھی روح کو راحت پہنچاتی ہے -

---

۱- اصل : موچھیں -   ۲- اصل : اسی ہیضے -

۵۵- الفاظ کی طمطراق اور فصاحت

پہلے زمانے میں فصحا نے فصیح کی یہ تعریف کی ہے کہ جس کو یہ ملکہ ہو کہ ادنیٰ مضمون کو اعلیٰ مضمون بنا دے، چھوٹی بات کو بڑا کر دے۔[۱] یہ فصیح کیا ہوا، ایسا موچی ہوا کہ چھوٹے پاؤں کی بڑی جوتی بنا دے۔

بعض نے فصاحت کی یہ تعریف کی کہ وہ کسی کام کے واسطے بہت سے آدمیوں کو ترغیب دے کر آمادہ کر دے۔ سقراط اور افلاطون نے یہ تعریف کی کہ فصاحت ایک فن خوشامد کرنے اور فریب دینے کا ہے۔ فصحا اس تعریف سے گو انکار کریں مگر تمام احکام، جو ان کی فصاحت سے چلتے ہیں، وہ اسے ثابت کرتے ہیں۔ گو فصاحت اور فصیح کی کچھ تعریف کی جائے مگر فصحا کا زمرہ ہمیشہ دنیا میں معزّز رہا ہے۔ حکومتِ جمہوری میں تو انھوں نے وہ کارہائے نمایاں کیے ہیں کہ جو یادگارِ زمانہ ہیں۔ بہت سے جھگڑے فساد، خانہ جنگیاں، معاملات کی پیچیدگیاں، یہ سب انھوں نے تیغِ زبان چلا کر ایسے فیصلہ کر دیے کہ تلوار چلانے سے نہ ہوتے۔

روم کی حالت جس وقت نہایت تباہ تھی اور سینکڑوں ہنگامہ آرائیاں ہو رہی تھیں، اِن فصحاے سحربیاں ہی کا کام تھا کہ ان کو بالکل مٹا دیا۔ سلطنتِ شخصی میں اس کی ضرورت نہیں پڑتی، اس لیے ایران میں کوئی شخص ایسا فصیح بیان نہیں پیدا ہوا کہ اس نے اپنی فصیح بیانی سے عوام کو کسی کام کے لیے آمادہ کیا ہو۔ جیسے امراض کے واسطے طبیبوں کی ضرورت ہے، ایسے ہی سلطنتِ

۱- اصل میں لفظ "کر دے" ندارد۔

جمہوری میں فصحا کی حاجت ہے - عوام الناس میں یہ قدرتی بات ہے کہ کانوں میں وہ باتیں، جو راگ کی طرح جاتی ہیں، ان کے دل پر اثر کرتی ہیں، گو ان میں صدق و حق کچھ بھی نہ ہو - پس فصاحتِ تقریر کا اثر ایسے لوگوں پر جب تک ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم اچھی طرح نہ[1] کی جائے - ان کی عادت میں داخل ہوتا ہے کہ جہاں کسی نے چکنی چپڑی باتیں بنائیں، وہ اس کے دم میں آئے -

ہر پیشے والے کو اپنے کام میں باتیں بنانی بہت آتی ہیں - ایک ذہین باورچی[2] سے باتیں کیجیے تو وہ سینکڑوں کہانیاں دعوتوں کی بنا کے کہہ دے گا؛ کہ آدمی کی اشتہا کی اتنی قسمیں ہیں، یہ کھانا اُس کھانے کے بعد اچھا معلوم ہوتا ہے، کھانے اِس ترتیب سے کھائے جائیں تو ان میں مزہ خوب آتا ہے - پھر پکانے کی ترکیبیں سنیے تو اس سنجیدگی اور متانت و فصاحت سے بیان کرے گا کہ یہ معلوم ہوگا کہ کوئی مسئلۂ حکمت یا وعظ یا کوئی معاملۂ ملک داری بیان کر رہا ہے - جو شخص دو باتیں کسی اور قسم کی ٹھیک نہیں بیان کر سکتا، وہ اپنے کام میں باتوں کا تار لگا دیتا ہے - غرض یہ الفاظ کی طمطراق گو حق اور راستی سے دور ہوتی ہے[3] مگر دنیا کے کام اسی[4] سے خوب چلتے ہیں -

۵۶- عظمت، جاہ و جلال نیک کام و نیک نام کی

دنیا میں اشیا و اسما ہیں - اسم سے مسمّٰی مفہوم ہوتا ہے، یعنی وہ شے جس کا نام وہ ہے - اسم شے کا جوہر[5] نہیں ہوتا بلکہ

۱- اصل: نہیں -
۲- اصل: بورچی -
۳- اصل: ہیں -
۴- اصل: انھیں -
۵- 'جوہر' اور 'عرض' منطق کی اصطلاحیں ہیں -

عرض ہوتا ہے ، یعنی شے کی ذات کا وہ حصہ نہیں ہوتا بلکہ ایک خارجی امر اس کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے ۔

خدا تعالیٰ کی ذات کو وہ اعلیٰ کمال حاصل ہے جس پر افزائش کا خیال نہیں ہو سکتا ہے ، یعنی اس کے کمال پر کسی اور کمال کا اضافہ نہیں ہو سکتا ۔ مگر ہاں اس کے نام پر اضافہ ہو سکتا ہے ، یعنی اللہ تعالیٰ کے جو ظاہری کام ہیں ، جن سے ہم نعمتیں اور برکتیں پاتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہیں ، ان کو اس کے نام پر بڑھا سکتے ہیں ۔ اسمِ صفات رازق ، رحیم ، رحمان وغیرہ اس کے اسمِ ذات پر جتنے چاہیں بڑھا سکتے ہیں ۔ جب ہم اس کی ذاتِ کامل الصفات میں ، جس میں کسی خوبی کی افزائش کو دخل نہیں ہے ، کسی خوبی کی افزائش نہیں کر سکتے تو اس کے نام کے ساتھ صفات لگاتے ہیں جو اس کی ذات سے خارج ایک حصہ ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عظمت و جلال خدا ہی کی ذات سے مخصوص ہے ۔ اگر آدمی خواست گار اس کا ہو تو اس سے زیادہ کوئی احمق نہیں ۔ بے چارے انسان کا مقدور کیا ہے ؛ عاجز ، مسکین ، محتاج ، ناقص ، ہر وقت اس کو یہ ضرورت رہتی ہے کہ وہ اپنا حال بہتر بنائے اور اپنی بہبودی کے لیے ہمیشہ سعی کرے ۔ وہ اندر سے کھوکھلا ، خالی ہے ۔ اس کو ہوا اور آواز سے اپنے تئیں پُر کرنے کی ضرورت نہیں ، بلکہ کسی منجمد مادے سے بھرنے کی حاجت ہے جس سے کہ اس کی اصلاح ہو ۔ انسان پر اول جستجو اس چیز کی ملازم ہے جس کی حاجت زیادہ ہو ۔ اگر کوئی شخص بھوکا مرتا ہو تو وہ بڑا احمق ہے جو خوراک سے زیادہ قیمتی پوشاک کی تلاش میں سعی کرے ۔ حوائجِ ضروریہ کا بہم پہنچانا سب کاموں پر مقدم ہے ۔ اس لیے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ زیادہ ضرورت بے شک اوصافِ باطنی کے بہم

پہنچانے کی ہے یا آرائش و زیبائش ظاہری کی، جس سے ہماری ایک عظمت و شان ظاہر میں ہوتی ہے۔ کون اس سے انکار کرے گا کہ سب سے مقدّم ضرورتیں یہ ہیں: صحت، نیکی، حکمت، حسانت بہم پہنچائیں۔ پس اول ان ضرورتوں کو رفع کرنا چاہیے، بعد اس کے زیب و زینت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

۵۷- عظمت و شان پر جو انسان مرتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ بہت سے اسباب آرام جان ایسے ہاتھ لگتے ہیں کہ لوگ ہم کو پسند کرتے ہیں۔ وہ ہماری تعریف کراتے ہیں، اوروں کے طعن و طنز سے زیادہ بچاتے ہیں۔ بعض حکما اس عزّت و شان کو اسی سبب سے برا کہتے ہیں کہ ان کا یہ مذہب ہے کہ انسان کی تمام خوشیوں میں وہ خوشیاں سب سے بدتر اور نفرت کے قابل ہیں جو اوروں کی پسند پر موقوف ہوں۔ یہ اوروں کی پسند اور تعریف کی خواہشیں ہماری ذات کے لیے بہت بداندیشیاں کھڑی کر دیتی ہیں۔ ہم کو خوشامد پسند بناتی ہیں جس کے سبب سے ہم پر خوشامدی مسلّط ہو جاتے ہیں اور سلاطین اور امرا کے ہاں بڑے بڑے صاحب اختیار اور اعتبار ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کے حق میں زہریلے کانٹے ہوتے ہیں۔ وہ بہت سی صاحب عصمت عورتوں کو خوشامد اور تعریف کر کے پُھسلا لیتے ہیں اور ان کو خراب خستہ کرتے ہیں۔ بعض حکما اور اکثر فقرا کا مقولہ ہے کہ دنیا کی عظمت و شان اس قابل نہیں ہے کہ کوئی عاقل اس کے حاصل کرنے کے واسطے اپنی انگلی بھی ہلائے۔

اپی کیورس[1] کے مقولات اعظم میں سے یہ ایک مقولہ ہے کہ

۱- اپی کیورس: (۳۴۱—۲۷۰ ق م) یونانی فلسفی۔ یہ نظری کی بجائے عملی فلسفے کا داعی تھا۔ اس دور کے اکثر یونانی حکما اس کے نظریات سے متاثر ہوئے۔

"تو اپنے تئیں چھپا -" پس اِس حکم میں یہ امر داخل ہے کہ ہم سوائے اپنی ذات کے اَوروں سے تعلق نہ رکھیں اور اَوروں کو اپنے تئیں نہ پہچنوائیں - درحقیقت وہ اِس حکم سے ہم کو منع کرتا ہے کہ ہم جمہور کی ذمہ داری کے کاموں اور عہدوں کو اپنے ذمے لیں ، جس کی پسند کے موافق کام کرنے سے عزّت اور عظمت ہم کو حاصل ہوتی ہے - اس نے عزّت و شان کی ذلّت مان لی ہے جس کے سبب سے وہ ہم کو منع کرتا ہے کہ معزّز و مکرّم نہ بنو -

اور اِسی طرح کی ایک اور حکیم نصیحت کرتا ہے کہ تم کسی عنوان اپنے کاموں کو باقاعدہ اور منضبط اس لیے نہ کرو کہ شہرت عام ہو - مگر ہاں اِس صورت میں کہ ایسے اتفاق پیش آئیں کہ تمھاری اَور آدمی ایسی تحقیر کریں کہ جس سے تم کو تکلیف ہو -

گو یہ اوپر کی تقریریں حکما کی سچّی اور عقل کے موافق معلوم ہوتی ہیں مگر خود ان میں دو رنگی موجود ہے - اس لیے کہ وہ جس بات کو کہتے ہیں کہ ہم یقین کرتے ہیں ، وہ درحقیقت یقین نہیں کرتے ، اور جس چیز سے کہتے ہیں کہ ہم نفرت رکھتے ہیں ، اسی سے رغبت رکھتے ہیں - یعنی گو زبان سے کہتے ہیں کہ دنیاوی عزّت و عظمت نفرت کے قابل ہے مگر وہ خود ایسے کام کرتے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس کی طرف رغبت ہے - وہی اپی کیورس ، جس کا مقولہ اوپر نقل کیا گیا ہے ، جب مرنے لگا تو بوقتِ مرگ یہ خط لکھا : جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "اِس وقت گو مجھ کو پتھری اور مثانے[1] کے سبب سے بہت تکلیف ہے مگر میری روح کو اِس سے مسرّت ہے کہ میں نے بہت سے مسئلے و مقولے ایجاد

۱- اصل : مسانہ -

کہے - میرے پیدا ہونے کی سالگرہ ہمیشہ کی جائے اور اس میں میرے سارے دوستوں اور مشہور آدمیوں کی دعوت کی جائے ۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنے مرنے کے بعد اپنی نیک نامی اور شہرت کا خیال نزع کی حالت میں خوشی دیتا تھا ، اور بقاے نام کا یہ خیال تھا کہ سالگرہ کے لیے وصیّت کی - غرض جو حکیم یا فقیر دنیا کی جھوٹی عزّت و جاہ کو پادر ہوا بتاتے ہیں ، وہ خالی منافقانہ باتیں بناتے ہیں - جو زبان پر ہوتا ہے ، وہ دل میں نہیں ہوتا -

۵۸- بعض اربابِ حکمت اوپر کی رائے کے بالکل برخلاف رائے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عزّ و شان کو خود اسی کی خاطر سے چاہنا چاہیے - وہ بعدِ مرگ ہماری حیاتِ ثانی اور یادگار مثل اولاد کے[1] ہے - یہ رائے عام پسند ہے اس لیے کہ انسان کی طبیعت کا میلان اسی طرف ہے - ارسطو نے اس کی طمع اور نفرت دونوں کو افراط تفریط میں داخل کر کے رذائل میں داخل کیا ہے اور اوسط کو افضل بتایا ہے ، اور کہا ہے کہ انسان کے اسبابِ ظاہری میں عزّت کا مرتبہ سب سے اول ہے -

ایک حکیم کی رائے یہ ہے کہ "جو نیکی مخفی رہی ، وہ مُردہ کیڑے سے کچھ ہی کم ہوتی ہے -" یہ رائے ایسی غلط ہے کہ اس کو حکیم کہنا سزاوار نہیں - اگر اوپر کی رائے صحیح مانی جائے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آدمیوں کو نیک کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے جب تک اُن سے شہرتِ عام جمہورِ انام میں نہ ہو - اور نیکی کا گھر جو دل ہے ، اس کے کاموں کے منتظم اور منضبط کرنے کی حاجت نہیں ہے[2] جب تک کہ وہ دوسروں کے علم میں نہ آئیں - اس رائے

۱- "کے" اضافۂ مرتّب - ۲- اصل : نہ ہو -

کے موافق ایسی بدکاری کی اجازت ملتی ہے جو سلیقہ و ہوشیاری و مکاری کے سبب سے لوگوں پر کھلتی نہیں - مثلاً ایک شخص ہمارے پاس اپنا روپیہ بغیر کسی گواہ کے امانت رکھ جائے تو اس کو واپس دینا نیکی میں داخل نہ ہوگا، اس لیے کہ اس کا اظہار اَوروں پر نہیں ہوتا - یوں بہت سی قسم کی شرارتیں ہم کرنے لگیں گے جن میں ہم کو اطمینان ہوگا کہ عدالت سزا نہیں دے گی -

ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ لیاقت سے آگے شہرت و عزت جاتی ہیں، کبھی بے حد آگے بڑھ جاتی ہیں - ان کا حال سائے کا سا ہوتا ہے کہ وہ کبھی شخص کے آگے چلتا ہے اور اس سے زیادہ طویل ہو جاتا ہے - غرض اتفاقی شہرت کبھی نیکی سے زیادہ بڑھ جاتی ہے - پس نکو کاری نیک نامی کے حاصل ہونے پر منحصر کرنا اس کو بخت و اتفاق کے ہاتھ میں دینا ہے جس سے نیکی کا خود درجہ اور رتبہ قائم نہیں رہتا - وہ بخت و اتفاق پر قائم رہتا ہے - اس لیے نکوکاری اپنے اعلیٰ درجے سے گر کر ادنیٰ درجے پر آ جاتی ہے - نکوکاری میں صرف خدا پر یا اپنی کونشنس[1] پر نظر رکھنی چاہیے کہ وہ دیکھتا ہے - خواہ کوئی اس کو اَور دیکھے یا نہ دیکھے، اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے - اس کو اَوروں کا دیکھنا اور جاننا بخت و اتفاق پر موقوف ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی نیک کام نہیں ہے جب تک نیک نامی نہ ہو - شجاعت وہیں کام میں آنی چاہیے جہاں شہرت حاصل ہو - غرض جو نیکی پر نیک نامی کو مقدّم رکھتے ہیں، ان کو یہ جاننا چاہیے کہ بخت و اتفاق سب چیزوں پر حکمران ہے - وہ اپنی مرضی کے موافق جسے چاہتا ہے آگے چلاتا ہے، جب

١- یعنی وجدان، مافی الضمیر -

چاہتا ہے پیچھے ہٹاتا ہے - یہ کام اس کا عدل و انصاف کے ساتھ نہیں ہوتا - پس شجاعت کو وہاں کام میں لانا جہاں اس کے دیکھنے والے ہوں ، اس کے یہ معنی ہیں کہ کبھی اپنے تئیں جان جوکھوں میں جھونکنا نہیں چاہیے - لڑائیوں میں جہاں ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے ، کس کو اپنے کام سے ایسی فرصت ملتی ہے کہ وہ تمھاری بہادری کو دیکھ کر اس کی شہادت دے گا کہ میں اپنے کام سے غافل ہو کر تمھارے کام دیکھتا تھا - ہزاروں موقعے ایسے پیش آتے ہیں کہ جہاں بڑے بڑے بہادروں کے مردانہ کام دفن ہو جاتے ہیں - سچی اور عاقلانہ عظمت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جو شجاعت بالطبع ہوتی ہے ، وہ اپنے کاموں میں جلوے دکھاتی ہے ، نہ عزّت کے حاصل کرنے میں -

یہ بخت و اتفاق کی بات ہے کہ قیصر[1] و سکندر کی بے حد و نہایت شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی ورنہ ہزاروں بہادر ، دلاور ، شجاع ایسے گزرے ہیں کہ جنھوں نے اپنا کام سکندر و قیصر کی[2] عالی ہمتی اور والا نہمتی سے شروع کیا تھا مگر اپنے کام کے آغاز میں ہی ان کا خاتمہ بالخیر ہوگیا - یہ سارے ارمان دل کے دل میں لے گئے ، ناشاد و نامراد خاک میں مل گئے - کسی نے نہ پوچھا کہ

۱- قیصر : (۱۰۱-۴۴ ق م) اس کا اصل نام یولیوس تھا - روما کے عظیم فرماں رواؤں میں اس کا شمار ہوتا ہے - اس نے گولیا کو فتح کیا اور فرسال کے مقام پر پومپیوس کو شکست دی - جب اس نے فتح حاصل کر لی تو اہلِ روم کو ان الفاظ میں فتح کی خوش خبری بھیجی: "میں آیا ، میں نے دیکھا اور پھر فتح کر لیا" اس کے یہ الفاظ ضرب المثل بن گئے - بالآخر خود بھی قتل ہوا -

۲- اصل : کا -

تم کون تھے ، کیا تھے ، کیا کرتے تھے ۔ قیصر کیسے کیسے پُرخطر و ہولناک مقاموں میں جا کر سلامت نکل آیا ۔ زخمی ہونا تو کیا ، بال بھی بیکا نہ ہوا ۔ مگر ہزاروں دلاور ان سے کم ہولناک مقاموں میں گئے اور ہلاک ہوگئے ۔ بے شمار بہادرانہ کام دنیا میں ہوتے ہیں جن کو کسی نے دیکھا نہیں ، وہ یوں ہی مٹ گئے ، کوئی اپنی نشانی نہیں چھوڑ گئے ۔ لڑائی کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بڑے بڑے جواں مردوں کا کام تمام ہو جاتا ہے ۔ ان کو میدانِ جنگ میں اپنے جوہرِ شجاعت کا دکھانا ہی نصیب نہیں ہوتا ۔ ایک چھوٹے سے قلعے کی فتح میں بڑے بڑے جرنیل دفن ہو جاتے ہیں ۔ اگر وہ ایک میدانِ جنگ میں جاتے تو ان کی معرکہ آرائیاں دیکھنے میں آتیں ۔ اب یہ بخت و اتفاق نہیں ہے تو کیا ہے ۔

جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ میرا مرنا وہاں سزاوار ہے کہ جہاں ناموری ہو اور میرا ذکرِ جمیل باقی رہے ، وہ اپنی موت کی شہرت کے سبب سے زندگی کی نیک نامی کو خاک میں ملاتا ہے ۔ اس لیے کہ جب تک کہ کوئی اس کو موقع عظیم ناموری اور شہرت کا ہاتھ آئے ، سینکڑوں ایسے موقعے پیش آتے ہیں کہ ان میں ضرور جان جوکھوں کرکے ہاتھ پاؤں ہلانے چاہئیں ۔ ان میں وہ ساکت رہتا ہے اس لیے نیک نامی کو کھوتا ہے ۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ مشہور نامور وہی آدمی ہے جس کی نیک نامی کی نفیری کونشنس (وجدانِ قلبی) بجائے ۔ کونشنس ہی کی شہادت انسان کی مسرّت افزا ہوتی ہے ۔ جو شخص اس لیے نیک بنتا ہے کہ لوگ اس کو نیک جانیں اور جب نیک جانیں تو اس کی قدر و منزلت کریں ، جو نیکی اس لیے کرتا ہے کہ اس کی شہرت و ناموری اور ذکر جابجا ہو ، ایسے شخص سے یہ امید نہیں کی جاتی کہ وہ کوئی کارِ عظیم سرانجام

دے گا ۔

ایک بہادر کہتا ہے کہ میں نے جاڑے کے موسم میں بہت سے کام ایسے کیے ہیں کہ وہ ذکر کے قابل ہیں مگر وہ سب ایسے پوشیدہ کیے گئے ہیں کہ کسی کو خبر نہیں ہے ۔ اس لیے اگر میں ان کو نہ بیان کروں تو کوئی الزام میرے ذمے نہیں ہے ۔ یہ جوان مرد بہادر بڑے بڑے کام کرنا چاہتا تھا ، نمود و شیخی نہیں بگھارتا تھا ، اس لیے اس کے کاموں کو سوائے دیکھنے والوں کے کسی اور نے نہیں جانا ۔ آدمی کو چاہیے کہ لڑائی میں اپنا فرض ادا کرنے جائے ۔ خوب جان لے کہ بہادرانہ کاموں کا معاوضہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا ہے ۔ لیاقت کے کام خواہ کیسے ہی پردے میں گھر کے اندر کیے جائیں ، یہاں تک کہ جو دل میں نیک خیالات کیے جائیں گے ، وہ بھی اپنا صلہ پاتے ہیں ۔ نیک دل اپنے نیک کام کرنے ہی کو سو صِلوں کا ایک صِلہ سمجھتے ہیں ۔ نیکی خود آپ اپنا صلہ ہے ۔

ایک آدمی کو نفس الامر میں بہادر ہونا چاہیے ۔ بخت و اتفاق جب اس کے انتفاع پر حملہ کریں تو ان کے مقابلے میں کمرِ ہمّت چست رکھ کر سلامت رہنا چاہیے ۔ نیکی تمام کمینہ خصلتوں[1] سے کنارہ کشی کرتی ہے اور بے داغ صاحبِ عزتوں میں چمکتی ہے ۔ وہ گنواروں اور احمقوں کی مرضی پر اپنی علوّ مرتبگی کو نہیں چھوڑتی ہے ، نہ اس سے سروکار رکھتی ہے ۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ نیک کام کرے ، مگر خود نمائی اور ظاہر آرائی کے لیے نہیں ، بلکہ اپنی باطن آرائی کے لیے جہاں کسی کی آنکھ ، سوائے اپنی آنکھ کے ، تاک نہیں لگا سکتی ۔ اسی سبب سے ہم موت کے خوف سے ،

۱- اصل : ہزیمتوں ۔

دکھ درد سے ، اہل و عیال کی جدائی کے رنج سے ، دوست آشناؤں کے درد مفارقت سے ، مال و دولت کے تلف ہونے کے الم سے محفوظ رہیں گے ، اور ان چیزوں میں سے کسی کا خیال نہیں ہوتا - جہاں موقع جنگ ہوتا ہے ، وہاں جان جوکھوں میں اپنے تئیں ڈال دیتا ہے - کسی ذاتی فائدے اور منفعت کے لیے نہیں ، بلکہ محض حسن خیر کے لیے - یہ فائدہ سب نفعوں پر سبقت رکھتا ہے اور حرص و تمنّا کرنے کے قابل ہے - عزّت و عظمت ظاہری تو فقط اِس کا نام ہے کہ لوگ ہماری نسبت اچھی رائے محبّانہ رکھیں -

اگر ایک ایکڑ زمین کا عدالت کے ساتھ فیصلہ کرانا ہو تو اس کے واسطے ایک قوم میں سے دس آدمی بھی منتخب ہونے مشکل ہوتے ہیں ، اس لیے یہ بڑی نادانی ہے کہ انسان کے میلان ہائے خاطر اور افعال کے فیصلے کے لیے ، جس سے زیادہ مشکل اور بزرگ کام کوئی دنیا میں نہیں ، ایک گنوار دل کو اکھٹا کریں جو جہالت ، بے انصافی ، بے استقلالی کے باوا ہوتے ہیں - اس سے کیا بڑی نادانی ، حماقت اور گدھاپن ہوگا کہ ہم ایک فرد کو تو ذلیل و خوار سمجھیں اور ان افراد کے مجموعے کو معزّز سمجھ کر اپنے کام پر ان کی رائے سے حکم صادر کرائیں - جس شخص کا مقصد اعظم یہ ہو کہ میں ان گنواروں کو خوش کروں ، وہ منزل مقصود پر کبھی نہیں پہنچے گا - اس ازدحام کے خیالات سمجھنے سے زیادہ کوئی بات مشکل نہیں ہے ، وہی سب باتوں سے زیادہ کم سمجھنے میں آتی ہے - ان کی آواز خواہ کسی طرف سے آئے ، اُس پر کان لگانا نہیں چاہیے - سسرو کہتا ہے کہ میری رائے یہ ہے کہ اگرچہ کوئی چیز خود ناپاک نہ ہو مگر وہ عوام الناس کے کسی گروہ کی تعریف کرنے سے ناپاک ہو جاتی ہے -

گنواروں کی ہوائی خبروں اور رایوں کا ہجوم ایک ایسا آوارہ گرد اور بے سروپا رہتا ہے کہ ہم اس کے پیچھے خواہ کیسی ہی ہنرمندی و تیزی و جودت کے ساتھ قدم رکھیں، تو بھی ہم کو کسی راہِ مستقیم پر وہ نہیں لے جائے گا بلکہ آوارہ اور گمراہ کرے گا: ع

او خود گمرہ است کرا رہبری کند

ہم کو اپنے تئیں پا در ہوا نہیں بننا چاہیے بلکہ عقل کا مستقل پیرو بننا چاہیے اور اسی سے سمجھ لینا چاہیے کہ سوائے بخت و اتفاق کے کوئی اور طریقہ عقل کے موافق ایسا نہیں ہے کہ ہماری تعریف عوام الناس کی زبان پر ہو۔ اگر میں راہِ مستقیم پر اس سبب سے نہ چلوں کہ وہ مستقیم ہے تو بھی اس پر اِس سبب سے چلنا چاہیے کہ تجربے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انجام میں اس رستے کے راہ رَو کے واسطے بہت سی خوشی اور فائدے ہیں۔ یہ ایک نعمتِ خداداد انسان کے لیے ہے کہ کارِ خیر کرنے میں ہمیشہ زیادہ فائدے ہی حاصل ہوتے ہیں۔

قدیم زمانے میں جب طوفان آتے تو ملاح یہ کہتا کہ اے خدا! تجھے اختیار ہے کہ مجھے بچاوے یا ڈباوے مگر میں اپنے سُکان[1] کو صحیح و درست چلاؤں گا۔ پس آدمی کو اپنا کام نیکی کے ساتھ کرنا چاہیے، انجام اس کا اچھا ہی ہوگا۔ ہزاروں منافقوں و مشتبہ آدمیوں کی تعریف سنتے ہیں کہ وہ دنیا کی عقل خوب رکھتے ہیں۔ مگر جن پھندوں سے ایک دیانت دار سچا آدمی نکل جائے گا ان میں

١۔ سُکان: کشتی کو متوازن رکھنے اور حسبِ منشا چلانے کے لیے کشتی کے پیچھے عموداً ایک تکون تختہ لگا دیا جاتا ہے جس کا نیچے کا حصہ پانی میں رہتا ہے۔ یہ ایک طرح کا سٹیرنگ ہوتا ہے اور اسی کو سُکان کہتے ہیں (پنجابی: سخان)۔

وہ پھنس کر ایسے رہ جائیں گے کہ مر کر نکلیں گے ۔

۵۹۔ تعریف سننے میں کوئی قدرتی شیرینی تو ہے نہیں مگر معلوم نہیں پھر کیوں سب آدمی اس کے شوقین ہیں ۔ ایک حکیم کہتا ہے کہ مجھے اپنی تعریف سننی ناگوار نہیں ہے مگر مجھے اس سے انکار ہے ، اس لیے کہ خود نیکی کے مقاصدِ اعظم و شرائطِ اہم یہ ہیں کہ کام عمدگی اور خوش اسلوبی سے کیا جائے ۔ اس کی پروا نہیں ہونی چاہیے کہ لوگ ہماری نسبت کیا رائے رکھتے ہیں ۔ آدمی کی خود اپنی رائے نیک ہونی چاہیے ۔ اپنی دولت سے دولت مند ہونا چاہیے ، نہ یہ کہ قرض لے کر ۔ غیر لوگ فقط واقعات اور ظاہری صورتوں کو دیکھتے ہیں ، چہرے کو جانچتے ہیں ، دل کو نہیں پرکھتے ۔ اچھی صورت بنانا ہر شخص کے اختیار میں ہے[۱] مگر دل کا خدا حافظ ہے ۔ میدانِ جنگ میں ایسی ریاکاریاں بہت سی ہوتی ہیں کہ دل تو ڈرپوک مرغی کے بچے کا سا ہے مگر میدانِ جنگ میں اوبچی بہادر سپاہی بنے کھڑے ہیں ۔ جب جان جوکھوں کے موقعے آ جاتے ہیں تو حیلہ حوالہ بنا کر اس سے بچ جاتے ہیں ۔ جو کوئی بڑی مجبوری آن کر پڑتی ہے تو وہ اس حال سے جاتے ہیں کہ خوف کے مارے دل دھڑ دھڑ کرتا ہے مگر چہرہ اپنا بہادروں کا سا بنائے ہوئے ہیں ۔ ایسے دھوکے ہزاروں دنیا کو ہوتے ہیں ۔ جھوٹی عزت خوش کرتی ہے مگر بدنامی جھوٹوں اور خطاکاروں کو ڈراتی ہے ۔

پس اس اوپر کے بیان سے معلوم ہوا کہ جو ظاہری حال پر رائیں مرتّب کی جاتی ہیں ، وہ نامحقّق اور مشتبہ ہوتی ہیں ۔ اپنے حق

۱۔ کذا ۔

میں اپنی شہادت سب سے زیادہ محقّق[1] ہوتی ہے۔ اپنے تئیں اپنے اندر دیکھو ، باہر نہ دیکھو ۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر اور لوگ ہمارا ذکر کریں گے تو ہمارا نام بڑا ہوگا ۔ اس کی پروا ان کو نہیں ہوتی کہ وہ ذکر کس طرح کریں ۔ وہ اس اپنے ذکر کے چھوڑ جانے کو حیاتِ ثانی سمجھتے ہیں ۔ افسوس ہے کہ وہ اس حیات کے لیے ، جو اور لوگ ان کو دیتے ہیں ، نیک کام کریں ۔

٦۰۔ نیک کاموں کے ذکرِ خیر کے باقی رہنے سے دنیا کو فائدہ ہوتا ہے ۔ بے شک کاموں کا ذکرِ جمیل انسان میں نیک کام کرنے کی طرف رغبت دلاتا ہے اور بد کاموں کی یاد بدی سے نفرت دلاتی ہے ۔ نوشیرواں کی عدالت کی اور حاتم طائی[2] کی سخاوت کی شہرت ، عدالت و سخاوت کی طرف رغبت ، اور چنگیز و ہلاکو[3] کے

۱۔ اصل میں "تحقیق" کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ۔

۲۔ حاتم طائی : (؟–٦۰۵ع) زمانۂ جاہلیت کا ایک شاعر جو اپنی شجاعت اور سخاوت کی وجہ سے مشہور ہوا ۔ اس کی سخاوت ضرب المثل ہے ۔ اس کا دیوان پہلی مرتبہ رزق اللہ حسون نے ۱۸۷۲ع میں لندن میں شائع کیا اور دوسری مرتبہ المانوی ترجمے کے ساتھ ۱۸۹۷ع میں چھپا ۔ ایک مرتبہ جاہلی شاعر بشر بن ابی حازم اپنے ساتھیوں نابغہ الزبیانی اور عبید بن الابرص کے ساتھ نعمان سے ملنے کے لیے حیرہ کی طرف روانہ ہوئے ۔ راستے میں ایک بدّو اونٹ چرا رہا تھا جس سے انھوں نے کھانے کے لیے کچھ مانگا ۔ یہ بدّو حاتم طائی تھا جس نے ان مہمانوں میں سے ہر ایک کے لیے ایک اونٹ ذبح کر دیا ۔ چونکہ وہ تینوں آدمی مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اس لیے حاتم کا خیال تھا کہ ہر آدمی اپنے قبیلے میں جا کر اس کی سخاوت کا ذکر کرے گا ، چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔

۳۔ چنگیز و ہلاکو : چنگیز خاں (۱۱۵۵ع – ۱۲۲۷ع) : مشہور منگول فاتح جس نے اپنی فتوحات اور ظلم و ستم کی بدولت بحر اسود سے لے کر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ظلم و ستم کی یادگار ظلم سے نفرت دلاتی ہے ۔ مگر اپنی شہرت چاہنے کا مرض وبا کی طرح ایسا پھیلا ہوا ہے کہ آدمی نیک نام ہونے کو زیادہ ، بہ نسبت نیک کام کرنے کے ، چاہتے ہیں ۔ اپنی مرضی کے موافق وہ نیک نامی چاہتے ہیں جس کے مستحق نہیں ہوتے ۔ جو عاقل دانش مند ہیں ، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بعدِ مرگ اگر ذکر ہمارا اچھی طرح ہوا تو کیا ، بری طرح ہوا تو کیا ۔ لعنۃ اللہ کسی نے نام کے ساتھ کہا تو کیا ، رحمۃ اللہ کہا تو کیا ہاتھ لگ گیا ۔ اس ذکرِ خیر سے قبر کا بوجھ ان کے بدنوں پر ہلکا نہ ہو جائے گا اور ان کی مٹی اور قبر سے کوئی لالہ و گل پیدا نہیں ہو جائیں گے ۔

میدانِ جنگ میں ہزاروں آدمی مارے جاتے ہیں ۔ ان میں سے سو کا نام بھی یادگار باقی نہیں رہتا ۔ سپہ سالاروں اور افسروں کی یادگار تو کیا ، خود ان لڑائیوں اور فتوحات کا نشان مٹ جاتا ہے ۔ یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ ہوئی تھیں یا نہیں ۔ زمانے کی نصف سے زیادہ دنیا کی تاریخ ایسی مٹ گئی ہے کہ کہیں اس کا پتا نہیں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

چین تک کی تمام سلطنتوں کو لرزہ براندام کر دیا تھا ۔ کہتے ہیں جب یہ پیدا ہوا تھا تو اس کے ہاتھ پر خون کا ایک لوتھڑا تھا ، جو اس کے سفّاک ہونے کی علامت سمجھی گئی ۔

ہلاکو : (۱۲۱۷ع–۱۲٦۵ع) یہ بھی منگول فاتح ہے جس نے فارس میں منگول سلطنت کی بنیاد رکھی ۔ جب اس نے آمو دریا کو عبور کیا تو پہلے فارس اور اسماعیلیہ کے حکمران اس سے مغلوب ہوئے اور پھر خلیفۃ المسلمین کی فوج نے شکست کھائی ۔ چنانچہ اس نے بغداد کو خوب لوٹا اور تباہ و برباد کیا ۔ پھر اس نے شام کو فتح کرنے کے لیے لشکر بھیجا اور خود بھائی کی موت کی خبر سن کر فارس میں لوٹ آیا ۔ جب اہلِ مصر کو اس کے لشکر کی آمد کی اطلاع ملی تو انھوں نے چڑھائی کر کے اس کو شکست دی ۔

لگتا ۔ اگر وہ موجود ہوتی تو کیا اس میں ایسی ہی سب طرح کی مثالیں موجود نہ ہوتیں جو اب تاریخِ موجودہ میں موجود ہیں ۔ ناموری اور شہرت کی بھی عمر ہوتی ہے ۔ بعض آدمیوں کی شہرت و ناموری کی اتنی ہی عمر ہوتی ہے کہ وہ جوانی میں اپنے کاموں میں مشہور ہوتے ہیں ، بڑھاپے میں کوئی ان کو ، نہ ان کے کاموں کو جانتا ہے ۔

قیصر[1] نے جو باون فتوحات حاصل کیں ، ان میں سینکڑوں بہادروں نے کارہائے نمایاں کیے ہوئے ہوں گے جب سلطنتیں کی سلطنتیں درہم برہم ہوئی ہوں گی ۔ مگر ان بہادروں کا نام جب ہی تک یاد رہا کہ ان کے جورو بچے جیتے رہے ۔ سپاہی جو بندوق لگاتا ہے اور جس پر بندوق لگتی ہے ، اگر ان کا رجسٹر بنایا جائے تو وہ تیسرے روز ردی ہو جائے گا ۔ سینکڑوں کام ایسے معمولی ہوتے ہیں کہ وہ کسی گنتی میں نہیں آتے ۔ مثلاً ایک سپاہی دو چار سپاہیوں کو مار ڈالے تو کوئی کارِ نمایاں نہیں سمجھا جائے گا ۔ غرض تاریخ میں بہت چھوٹے چھوٹے واقعات نہیں لکھے جاتے ۔ صفحۂ دہر پر بخت و اتفاق سے انھی ناموروں کے نام باقی رہتے ہیں جو بڑے اعلیٰ درجے کے کام کر جاتے ہیں ۔

غرض شہرت اور ناموری سے عزت و عظمت کا خواست گار ہونا عقل کا کام نہیں ہے ۔ اگر مصوّر ، کاریگر ، شاعر ، مصنّف ، نحوی ، منطقی اپنے کاموں کی یادگار چاہیں تو کچھ سزاوار بھی ہے ۔ مگر نکوکار اپنی نیکی کی یادگار چاہیں تو بالکل سزاوار نہیں ہے ۔ نیک کام خود اپنی ذات سے ایسے اچھے ہوتے ہیں کہ کوئی انعام اور یادگار

۱۔ قیصر : (۱۰۱ ق م–۴۴ ق م) روما کا ایک عظیم فرماں روا اور فاتح ۔

ان کا معاوضہ نہیں ہو سکتا - نیک خدمت کا انعام وہ خود خدمت ہی ہے - مگر یہ یاد رکھو کہ جو نکوکار نیک نام مشہور ہیں ، ان کی شہرتِ نیک نامی کا پاس ، لحاظ ، ادب ہمیشہ ہم کو رکھنا چاہیے - یہ خدا کی مرحمت ان کے حال پر ہے کہ شریر بھی زبان سے اور دل سے ان کی تعظیم کرتے ہیں اور نیکوں کی بُروں سے تمیز کرتے ہیں -

خلاصہ یہ ہے کہ ساری عزت و عظمت انسان کی اِس میں ہے کہ وہ زندگی اپنی پاک اور آزاد بسر کرے اور اطمینانِ قلب حاصل کرے - اس اطمینانِ قلب حاصل کرنے کا کوئی قاعدہ یا عام کلیہ نہیں بیان ہو سکتا ہے ، یہ قاعدہ ہر ایک کے ساتھ جدا جدا مخصوص ہے -

۶۱- معزز کاموں کا صلہ

دنیا کے اندر قدیم زمانے میں سب سے زیادہ معزز فضیلت مرد میں شجاعت اور عورت میں عصمت قرار پائی ہے - یہ دونوں صفتیں تمام اَور عیبوں کی پردہ پوش ہیں - انسان میں شجاعت ہی کی فقط صفت ایسی ہے کہ جس کے سبب سے زبردست کو زیردست مغلوب کر کے محکوم بنا سکتا ہے - اس لیے جن جنگ جُو اور رزم خُو قوموں نے دلاوری اور شجاعت دکھائی وہ دنیا میں فرماں روا ہو گئیں اور اپنا نام پیدا کر گئیں جو جریدۂ عالم پر ثبت ہے - اول اول ان میں سے کسی ایک قوم نے یہ ایجاد کیا کہ جو جواں مرد شجاعت میں ممتاز ہو ، اس کے اعزاز کے واسطے کوئی خصوصیت ایسی پیدا کی جائے کہ جس سے وہ اَور سب آدمیوں سے افضل معلوم ہو - پھر اس ایجاد کی تقلید ساری دنیا کی سلطنتوں نے کی اور اپنے اپنے

مذاق کے واسطے جدا جدا نشان و اعزاز مقرر کیے - مگر یہ سب عزّت کے نشان خالی خولی تھے - ان میں کچھ دولت کا خرچ نہ تھا - جو کوئی فتح مند فتحِ عظیم حاصل کرتا تو اس کے سر پر بعض درختوں کے پتّوں یا پھولوں کا تاج بنا کے رکھ دیتے - بعض کے واسطے لباس کی خاص قطع و وضع مقرر کر دیتے - بعض کو شہر میں کوچ پر سوار ہو کر - کسی کو رات کو مشعل ساتھ لے کر نکلنے کی اجازت دے دیتے - کسی کے واسطے مجالسِ عامہ میں خاص نشست مقرر کر دیتے - بعض کے نام کے ساتھ خطاب و القاب کی تخصیص کر دیتے - بعض کو تمغے، جن پر خاص علامات ہوتی تھیں، دے دیتے - یہ خاص اعزاز تھے جو شاہزادوں اور امیروں کو حاصل نہیں ہوتے تھے - جو لائق اولعزم ہوتے تھے وہ ان اعزاز کے نشانوں کے واسطے جان لڑاتے تھے - اِن میں جو باہم رشک و حسد ان کے واسطے ہوتا تھا، وہ کبھی دولت کی منفعت کے واسطے نہیں ہوتا تھا -

معزّز کاموں کا معاوضہ انعامِ زر سے نہیں ہوتا - انعام میں اگر جائداد یا روپیہ مل گیا تو وہ اَور جائداد اور روپے کے ساتھ مل جائے گا جس کو معزّز کام کرنے والے اپنی عزّت کی افزائش کا سبب نہیں جانتے، بلکہ اپنی خاص دولت میں اس انعام کی دولت کی افزائش کو برا جانتے ہیں - وہ تو اپنے معزّز کام کا معاوضہ ایسا چاہتے ہیں جس سے ان کی ذات کے ساتھ وہ خصوصیت پیدا ہو جو اور کسی کو نہ حاصل ہو - انعام میں روپیہ ملنا تو عام ہے - اگر ایک خدمت گار اچھی طرح کام کرے، قاصد محنت سے پیغام رسانی کرے، گویّا اچھی طرح گائے، کوئی اور تماشا گر اچھا تماشا دکھائے، تو اس کو انعام مل جاتا ہے - یہ کچھ اچھے ہی کاموں

کے ساتھ خصوصیت انعام ملنے کی نہیں ہے بلکہ برے کاموں کا بھی انعام خوشامدیوں، رنڈی بھڑووں مکاروں، کو مل جاتا ہے۔ اس لیے اہلِ فضیلت اپنی فضیلت کے صلے میں دولت نہیں چاہتے، بلکہ وہ اعزاز چاہتے ہیں جو عام نہ ہو بلکہ وہ مخصوص خواص کے ساتھ ہو۔

۶۲- جہاں کوئی بُرا نہ معلوم ہوتا ہو، وہاں اچھا کون معلوم ہوگا؟-

جب کوئی نیکی عام ہو جاتی ہے تو پھر اُس کی قدر نہیں رہتی۔ اگر کوئی شخص اپنی اولاد کی تعلیم ہوشیاری اور فرزانگی سے کرے تو کچھ تعریف کی بات نہیں۔ سپارٹا[1] کے رہنے والے سب بہادر تھے۔ وہاں کسی باشندے کی بہادری کی تعریف نہیں کی جاتی تھی۔ جس جنگل میں سب درخت اونچے ہوں، وہاں درخت کی بلندی کی تعریف کیا ہے؟ پس اِسی طرح اگر کوئی معزّز کام کا معاوضہ عام ہو جائے تو کوئی اس کو نہیں چاہے گا۔

۶۳- ہتھیاروں کا باندھنا

ہمارے ملک کے شرفا اور اُمرا اور رؤسا سب نے ہتھیاروں کا باندھنا اس سبب سے چھوڑ دیا ہے کہ کچھ اُن کو اپنی جان کا خوف و خطر نہیں رہا۔ اُن کے ملازم ان کے ہتھیار ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ جب شکار کرنے کی یا دربار جانے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اپنے نوکروں سے ہتھیار لے کر لگا لیتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ

۱- سپارٹا: بلادِ مغرب کے شمالی سرے پر واقع ایک مقام۔ طنجہ سے دس کیلومیٹر مغرب کی طرف۔ مورخ البکری نے اس کو اشبرتال کہا ہے۔

سب اوپچی بنے رہتے تھے - خود[1] ، زِرہ ، بکتر ، جلتہ ، خفتان پہنتے تھے - گُرز ، تلوار ، نیزہ وغیرہ لگاتے تھے کہ سارا بدن لوہے میں غرق ہو جاتا تھا - صرف نتھنے سانس لینے کے لیے اور آنکھیں دیکھنے کے لیے کھلی رہتی تھیں - سواری کے گھوڑوں پر برگستواں (پاکھریں) اور آئینے لگائے جاتے تھے کہ کوئی جگہ خالی نہیں رہتی تھی کہ جہاں زخم لگ سکے - اس قدر ان ہتھیاروں کا بوجھ ہوتا تھا کہ اب کسی سپاہی سے وہ نہیں اُٹھ سکتا - مگر اُن کو جیسے اپنے ہاتھ پاؤں کا بوجھ نہیں معلوم ہوتا تھا ، ایسے ہی ہتھیاروں کا وزن نہیں معلوم ہوتا تھا -

۶۴- باپ کی محبت

یہ سچّا قانونِ فطرت ہے کہ ہر انسان اور حیوان میں محبّتِ طبعی ، اول درجے کی ، اپنی ذات کے ساتھ ہے جس کی حفاظت اور دفعِ مضرّت کو وہ مقدّم جانتا ہے اور درجۂ دوم کی اولاد کے ساتھ ہے - نیچر نے اس محبّت کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ اُس کی کُل صنعت کو وسعت اور ترقی ہو - قاعدہ ہے کہ ماں باپوں کو اولاد سے جو محبت ہوتی ہے ، اس سے کمتر اُلفت اولاد کو ما باپوں کے ساتھ ہوتی ہے -

---

۱- خود : لوہے کی ٹوپی جو لڑائی کے وقت پہنتے ہیں - (نور اللغات)
زِرہ : فولاد کا حلقہ دار کُرتا جو لڑائی میں پہنتے ہیں - (نور اللغات)
بکتر : ایک قسم کا لوہے کی کڑیوں کا بنا ہوا جامہ جو لڑائی کے وقت پہنتے ہیں - ایک قسم کی زِرہ - (نور اللغات)
چلتہ : زرہ - بکتر - (نور اللغات)
خفتان : ایک قسم کا جُبّہ - زِرہ - (نوراللغات)

ارسطو کا قول ہے کہ جو شخص کسی کو فائدہ پہنچاتا ہے، اُس سے وہ اُلفت زیادہ رکھتا ہے اور جس کو فائدہ پہنچتا ہے وہ اپنے فائدہ پہنچانے والے سے کمتر محبّت رکھتا ہے۔ یعنی مُنعِم[1] کو مُنعَم علیہ[2] سے زیادہ محبّت ہوتی ہے بہ نسبت اس کے کہ منعم علیہ کو منعم کے ساتھ الفت ہوتی ہے۔ ہر صنّاع اپنی صناعت کا مشتاق ہوتا ہے۔ باپ اپنی اولاد کو بمنزلہ اپنے نفس کے جانتا ہے اور اس کی صورت کو جانتا ہے کہ قدرت نے اُسی کی صورت کے نسخے سے نقل کی ہے، اس لیے بیٹے کی لوحِ فطرت پر باپ کی ہیئت کی تمثال ثبت کی ہے۔ یہ خیال اس کا درست ہے۔ پدر ہی ظاہری وجودِ فرزند کا سبب ہوتا ہے۔ غرض اس کا خُلق اور خَلق اُسی کے مشابہ ہوتا ہے۔ اِسی سبب سے باپ اولاد کو اپنے سے زیادہ افضل ہونا چاہتا ہے، اس کی تکمیل سے اپنا اکمل ہونا سمجھتا ہے۔ باپ کی محبّت فرزند کے ساتھ نیکی اور صداقت پر مبنی ہوتی ہے اور اولاد کی محبّت باپ کے ساتھ منفعت پر۔ چونکہ نیکی و صداقت کو زیادہ استقلال اور پائداری بہ نسبت منفعت کے ہے، اس لیے باپ کی محبت کو اُستواری بہ نسبت اولاد کی محبت کے زیادہ ہوتی ہے۔ انتفاع[3] ہمیشہ یاد نہیں رہتا۔ بچے کو باپ سے جو انتفاع بچپنے میں ہوتا ہے وہ معلوم نہیں ہوتا۔ بَڑپنے[4] میں وہ یاد نہیں رہتا۔ غرض اولاد کو ما باپوں کے ساتھ محبت کرنے میں وہ مسرّت نہیں حاصل ہوتی جو ما باپوں کو خوشی اولاد کے ساتھ محبت کرنے میں ہوتی ہے۔

۱- منعم : انعام یا فائدہ دینے والا۔

۲- منعم علیہ : جس کو انعام یا فائدہ پہنچے۔

۳- انتفاع : حصولِ نفع۔ ۴- بڑپنا : بچپنا کی ضد۔

ہم کو وہ چیزیں زیادہ عزیز ہوتی ہیں جن کی قیمت ہم زیادہ دیتے ہیں ۔ اب اولاد کو سمجھ لو کہ کیا کیا ہم کو ان کی قیمت میں دینا پڑتا ہے ۔ پھر وہ ہم کو کیوں نہ عزیز ہوں ۔ جو کچھ ان کو دیا ہے اس کی بازیافت کی اُمید نہیں ۔

۶۵۔ خدا نے ہم کو عقل دے کر اَور جانوروں سے زیادہ دانش ور بنایا ہے

ہمارا حال اَور حیوانوں کا سا نہیں ہے کہ اولاد کی محبت میں اُنھی قوانینِ فطرت کے، کمینگی میں، پابند ہوں جن میں اَور حیوان بھی شریک ہیں؛ یعنی اولاد سے محبت اَور جانوروں کی طرح کریں ۔ بلکہ ہم اپنی عقل اور دانش کو بھی اپنے اختیار سے اولاد کی محبت میں کام میں لاتے ہیں اور محبتِ طبعی کے ہاتھ میں اپنے اختیار کی لگام نہیں دے دیتے کہ وہ ہم کو جہاں چاہے لے جائے ۔ عقل مند اُن محبتوں اور رغبتوں سے نفرت کرتے ہیں جو فرزانگی پر مبنی نہ ہوں ۔ اُن کو یہ پسند نہیں کہ بچوں کی بَپّیاں لیتے ہیں اور طرح طرح سے پیار کرتے ہیں ۔ وہ اس بات کو بھی خوشی سے پسند نہیں کرتے کہ بچے ان کی بغل میں دودھ پیئیں ۔ بلکہ جب تک بچے اپنی جسمانی صورت اور روحانی سیرت سے خوش مزاجی اور نیک نہادی اپنی نہ دکھلائیں، وہ اُن کی طرف ملتفت زیادہ تر نہیں ہوتے ۔

سچی اور باقاعدہ محبت کی ترقی جب ہی ہوگی کہ وہ اپنے خوش لیاقت ہونے کا یقین دلا دیں، تو اُس وقت محبتِ طبعی کے ساتھ محبتِ عقلی زانو بہ زانو بیٹھے گی اور ساتھ چلے گی اور ان کی پرورش میں مربّیانہ محبت کام میں آئے گی ۔ اگر اس کے برخلاف اولاد کا نالائق ہونا ثابت ہوگا تو اس صورت میں محبتِ طبعی کو عقل کا محکوم

بنانا چاہیے ۔ مگر ہم زمانے کا چال چلن اس کے بالعکس دیکھتے ہیں ، کہ باپ اپنے بچوں کے کھیل کود ، دوڑ پھدک ، بھولی بھولی باتوں پر فریفتہ ہوتے ہیں ، مگر جب وہ بڑے ہو کر اپنے کاموں کو خوب پختگی سے کرتے ہیں تو وہ التفات نہیں کرتے ہیں ۔ وہ اولاد کا یہ تماشا بندروں کا سا اپنے دل بہلانے کے لیے دیکھتے تھے ۔ بچوں کے کھلونے خریدنے میں اور گیند بلاّ مول لے دینے میں وہ بڑے فیّاض تھے ، مگر جب وہ بڑے ہوئے اور اُن کو حقیقت میں خرچوں کی ضرورت پڑی تو انھوں نے اپنی مُٹھّی بند کر لی اور کوڑی کوڑی کو ترسانے لگے ، بلکہ باپ بیٹے ایک دوسرے سے جلنے لگے ۔ بیٹا یہ چاہتا ہے کہ باپ جلد مرے تو زندگی کا لطف آئے ، اور بیٹے کو باپ اپنا رقیب جانتا ہے اور جلتا ہے کہ میرا زمانہ دنیا سے سدھارنے کا اور اس کے مزے اڑانے کا آیا ، جہاں تک ہو سکے ، بخل کر کے اسے تنگ کیجیے ۔ اگر باپ یہ جانتا کہ بیٹا میرے مرنے کو چاہے گا تو وہ بیٹے کو منہ نہ لگاتا ۔

عقل مندوں کے نزدیک تو یہ ظلم و ستم ہے کہ جب اولاد لائق اور قابل ہو جائے تو باپ کی ساری دولت میں اور تمام امورِ خانگی کے انتظام میں شریک نہ ہو ، اور جنھوں نے انھیں پالا ہے وہ انھیں تنگ دست اور مفلس رکھیں ۔ یہ انصاف سے بعید ہے کہ ایک بڈھا باپ ، ادھ مُوا ، فقط اکیلا ایک کونے میں پڑا ہو اور اس دولت سے مستفید ہو جو اولاد کی پرورش اور ترقی میں صرف ہونی چاہیے ۔ اور بے چاری اولاد کا وہ حصۂ عمر جو اُمنگوں اور ترقی کا ، عزت آبرو پیدا کرنے کا ، جمہور کی خدمت کرنے کا ، مخلوق کی مزاج دانی کا ہے ، یوں ہی اکارت اور برباد جائے ۔ جو باپ اولاد کو یوں مایوس کرتے ہیں اور ہر طرح سے تنگ کرتے ہیں تو ان

کی اولاد مجبور ہو کر کوئی توسّل اپنی بسرِ اوقات کا نکالتی ہے، اور یہ وسائل کبھی نہایت ذلیل اور رذیل ہوتے ہیں - اس سبب سے عالی خاندان اور اشراف زادے، بدمعاش اور اوباش ہو جاتے ہیں - قید ہوتے ہیں اور طرح طرح کی ذلتیں اٹھاتے ہیں - یہ بری عادتیں ان میں ایسی پڑ جاتی ہیں کہ باپ کی دولت ہاتھ لگنے پر بھی نہیں جاتی ہیں -

۶۶- بعض آدمیوں کا یہ مقولہ ہے کہ ہم جو سو طرح سے، کفایت شعاری سے دولت کو جمع کرتے ہیں اور خرچ سے بچاتے ہیں، اس کا مآلِ کار اور بڑا فائدہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دولت مندی ہمارے سارے خاندان سے ہماری تعظیم کرائے گی - درازیٔ عمر جب ہمارے سب زوروں کو مٹائے گی تو یہ دولت کا زور ہم کو وہ شہ‌زور بنائے گا کہ سب پر ہم زبردست رہیں گے - ہمارے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے، کسی کا مقدور ہماری طرف ترچھی نگاہ سے دیکھنے کا نہ ہوگا، کوئی گستاخی اور بیباکی ہماری جناب میں نہ کرے گا - سب خدمت کرتے رہیں گے، ہماری کوئی خفّت نہ کرے گا - یہ ہوس ان کی ضعفِ عقل کے سبب سے ہے - ارسطو کا قول ہے کہ بڑی عمر سے اور ہر قسم کے ضعف سے آدمی کو طولِ امل ہوتا ہے اور ہوا و حرص کا دامن دراز ہوتا ہے - ہر بیماری کا بڑا علاج یہ ہے کہ اس کو پیدا نہ ہونے دے -

وہ باپ بڑا بدبخت ہے کہ جس سے اولاد کو محبّت صرف اپنی غرض اور احتیاج اور منفعت کے سبب سے ہو - اگر باپ یہ چاہے کہ اولاد کے دل میں سچی محبت پیدا ہو اور وہ میری تعظیم و تکریم، ادب لحاظ دل سے کریں، تو اس کو ان کے ساتھ نیکی اور دانش مندی اور خوش اخلاقی اور شیریں زبانی و رحم دلی کے ساتھ

پیش آنا چاہیے۔

بچوں کو عزّت اور آزادی کے لیے جو تعلیم ہوتی ہے، اُس میں سختی و جبر و مارپیٹ کرنا نہایت مضرّت پہنچاتا ہے۔ عقلا کے نزدیک عقل، ہوشیاری اور[1] ہدایت سے جو تعلیم کا کام نہیں ہو سکتا، وہ زور سے بھی کبھی نہیں ہو سکتا۔ لکڑی سے دماغوں کی تعلیم وہ نہیں ہو سکتی جو فقط زبان کے الفاظ کی تازیانہ زنی سے ہو سکتی ہے۔ لڑکے اطاعت کے واسطے کمتر اور آزادی کے واسطے زیادہ تر تعلیم پاتے ہیں، اس لیے ان کے دل میں فراخ حوصلگی، فرزانگی، زیرکی، آزادی پیدا کرنی چاہیے، نہ یہ کہ مارپیٹ سے ان کی ذکاوت بجھا دی جائے۔ اس مارپیٹ کا نتیجہ یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ لڑکے ڈرپوک، ضدی، خود سر ہو جاتے ہیں۔

اگر ہماری یہ تمنّا ہو کہ اولاد ہم سے محبّت کرے اور کبھی کسی موقع پر وہ ہمارے مرنے کی دعا نہ مانگے — گو اولاد کے واسطے کوئی ایسا موقع نہیں ہوتا کہ باپ کے مرنے کی آرزو کرنا معقول و قابلِ عذر ہو، کیونکہ عقل پر کوئی شرارت مبنی نہیں ہوتی — غرض کہ سختی و درشتی ان کے ساتھ نہیں برتنی چاہیے۔ عقل کے موافق ان کی تربیت کرکے اٹھانا چاہیے، نہ اس غرض اور احتیاج کے موافق جو اپنی ذات کی اولاد کے ساتھ متعلق ہے[2]۔ تم اولاد پر فقط محبّت سے تسلّط کرو، نہ زور سے۔

وہ شخص بڑی غلطی پر ہے جو اُس سلطنت کو کہ زور سے حاصل ہوئی ہے، مستقل اور پائدار زیادہ اُس سلطنت سے جانتا ہے جو محبت و شفقت و تالیفِ قلوب سے ہاتھ لگے۔ پس جب تم اولاد

۱- ''اور'' اضافۂ مرتّب۔ ۲- اصل: ہیں۔

کے ساتھ ایسے نیک نہاد ہو گے تو وہ تمھاری ہڈیوں اور جوتیوں تک کو تبرّک کے طور پر رکھیں گے اور ان کی تعظیم و تکریم کریں گے ، کیونکہ قیمتی چیزوں کی خاکستر بھی قیمتی ہوتی ہے - باپ پر واجب ہے کہ اولاد کی آسائش اور آرام و راحت کے اسباب مہیّا کرے -

۶۷- اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ چھوٹی عمر میں شادی نہ کریں جس سے اُن کے ہاں جلد اولاد پیدا ہو اور ان کی چھوٹی عمر وہ بڑی ہو جائے کہ باپ بیٹے ، بھائی بھائی معلوم ہونے لگیں - اس سے بڑی دقّتیں اور دشواریاں پیش آجاتی ہیں - خصوصاً اُن اُمرا کو جو تعلقہ داری یا زمینداری کی وجہ سے امارت رکھتے ہیں - کیونکہ وہ کوئی اَور پیشہ نہیں کرتے ، ان کی آمدنی کی صورت نہیں بدلتی - برخلاف اور غریب غربا مزدوروں کے کہ اُن کے ہاں جو کثرت اولاد ہوتی ہے تو ان کی دولت پیدا کرنے کے آلات اور اوزار بڑھتے ہیں - جب خرچ بڑھتا ہے ، اس سے زیادہ سرمایہ بڑھتا ہے -

ارسطو کا قول ہے کہ ۳۷ برس کی عمر میں شادی کرنی چاہیے - افلاطون کہتا ہے کہ تیس برس سے پہلے بیاہ نہیں کرنا چاہیے - ۵۵ برس کی عمر کے بعد تو وہ شادی کرنے پر بڑی لعنت ملامت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اولاد نکمّی پیدا ہوتی ہے - ان حکیموں نے تو ایک معقول حد مقرر کی مگر تھلیز نے تماشا کیا ہے کہ جب جوانی میں ماں نے شادی کا تقاضا کیا تو کہا کہ ابھی نو عمر ہوں ، میری شادی کا وقت نہیں آیا - جب بڑی عمر کا ہو گیا اور ماں نے پھر بیاہ کا تقاضا کیا تو کہا کہ اب میری شادی کا وقت جاتا رہا -

ناوقت کام کرنے سے ہمیشہ کراہیت رکھنی چاہیے - بعض قوموں کا یہ قول ہے کہ جو شخص سپاہی پیشہ ہیں ، اُن کے حق میں بیس

برس کی عمر سے پہلے عورت کے ساتھ مقاربت[1] زہر ہے۔ لڑائی کے واسطے سپاہی کا مجرّد[2] ہی ہونا اچھا ہوتا ہے۔ عورتوں کی صحبت سے سپاہیوں کی مردانگی میں کمی ہو جاتی ہے۔ جو سپاہی جوان عورت سے شادی کر لے اور اس سے بچے بھی پیدا ہو جائیں اور وہ خوشحال بھی ہو تو اس خاوند اور باپ بننے سے اس کی پہلی شجاعت میں فرق آجاتا ہے۔

۶۸۔ اب یہ سوال ہے کہ باپ بیٹوں کی کیا کیا عمریں ہوں کہ باپ بیٹے کو اپنا سب کام سپرد کرکے سبکدوش ہو۔ اس کے واسطے کوئی قاعدۂ کلّیہ تو نہیں مقرر ہو سکتا مگر مقتضائے عقلِ دور اندیش یہ ہے کہ جب تک باپ اپنے کام کو بخوبی انجام دے سکتا ہو، میدانِ جنگ میں لڑ سکتا ہو، دربار کچہری میں اپنا کام کر سکتا ہو، تو اس کو اپنے ہاتھ پاؤں ایسے ڈھیلے نہیں کرنے چاہییں کہ سارا اپنا گھر بار، کام کاج بیٹے کے سپرد کر کے اس کا دست نگر ہو جائے۔ جب تک کپڑے نہیں اتارنے چاہییں کہ بچھونے میں پڑنے کا وقت نہ آئے۔ جب عمر اور قویٰ کا ضعف اعضا کو فرسودہ کر دے، صحت جواب دے، ناتوانی کسی مجلس و محفل میں شرکت کی اجازت نہ دے تو ایسے وقت میں دولت کے جمع کرنے کی ہوس بڑی غلطی ہے۔ یہ وقت اُس کے لیے اِس امر کے سوچنے کا ہے کہ میں مدّتِ دراز تک اپنے سارے ساز و سامان سے متمتّع ہوا اور اب مجھ میں قابلیت اس سے احتظاظ[3] کی باقی نہیں رہی۔ سوائے گھر میں بیٹھے رہنے اور چارپائی پر پڑے رہنے کے کسی اَور کام کا نہیں رہا۔ بہتر ہے کہ جو کچھ میرے پاس اسباب اور دولت و مال ہے، اپنے مستحق وارثوں

۱۔ مقاربت = قربت۔

۲۔ مجرّد = کنوارا۔

۳۔ احتظاظ = لطف حاصل کرنا۔

کو دے دوں اور کہہ دوں کہ اے عزیزو! آج تک میں نے اس دولت سے لطفِ زندگی اٹھایا، اب تمھاری باری ہے، تم اس سے محظوظ ہو۔ اگر وہ یہ نہیں کرے گا تو اپنے حق میں کانٹے بوئے گا اور خاندان میں بغض و عداوت کی جڑ جمائے گا۔ جب بدن پر اتنے کپڑے ہوں کہ تن سنبھال نہ سکے تو اُتار ڈالنے چاہییں۔ جب پیرانہ سالی کام کو اچھی طرح نہ کرنے دے تو وہ کام اپنی جوان اولاد کے سپرد کرنا چاہیے۔ خود اس کو کر کے ذلیل نہ ہونا چاہیے۔ بوڑھے گھوڑے کو پہلے ہی دور کر دینا چاہیے تاکہ اس کے ٹھوکر کھا کے گرنے پر دیکھنے والے نہ ہنسیں۔

بڑی غلطی یہ ہوتی ہے کہ آدمی پہلے سے یہ نہیں سمجھتے کہ عمر کا بڑھنا جتنا ہمارے جسم کو ناتواں کرتا ہے، اُتنا ہی ہماری عقل کو ضعیف کرتا ہے۔ اور یہ قاعدہ طبعی ہے کہ ہمارے دونوں جسم و عقل میں یکساں تغیّر غایت درجے کا ہوا کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جن دانش مندوں نے یہ پیش بینی نہیں کی، ان کی نیک نامی اور شہرت کو پیرانہ سالی کے کاموں نے بٹّا لگا دیا ہے۔ جو عاقل و فرزانہ ہوتے ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اب عمر نے جیسا ہمارے جسم کو ناتواں کیا ہے، ویسا ہی ہماری عقل کو ضعیف کیا ہے۔ اس لیے تلوار یا قلم کے کاموں کا بوجھ، جو ہمارے سر پر ہے، ہم سے نہیں اُٹھ سکے گا۔ اس لیے وہ سبکدوش ہو کر خلوت نشینی اختیار کرتے ہیں۔ وہ دولت، مکان، اسباب سب کچھ اپنی اولاد کے سپرد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم اب سارا انتظام کرو۔ گو وہ سارا اختیار اولاد کے سپرد کرتے ہیں مگر خود ایسے بے اختیار نہیں ہوتے کہ اولاد کے ہاتھ میں کاٹھ[1] کی پُتلی بن جائیں۔ بلکہ وہ اپنا اختیار اور

١۔ اصل میں ”کاٹ“ تھا۔

اقتدار ، رعب داب ایسا رکھتے ہیں کہ اگر چاہیں تو یہ سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیں ۔ وہ اولاد کو اپنے تجربے کی باتیں بتا کر ان کے کاموں میں اعانت کرتے ہیں ۔ اکثر ان سے علیحدہ مکان میں بیٹھتے ہیں تا کہ ان کی جوانانہ صحبت میں وہ بارِ خاطر نہ ہوں ۔ مگر ان کے اوضاع و اطوار اور کاموں کے نگران رہتے ہیں ۔ غلطی میں ان کو نہیں پڑنے دیتے ، گمراہ نہیں ہونے دیتے ۔

۶۹۔ جو باپ اپنی اولاد سے تعظیم ، تکریم ، پاس ، لحاظ ، ادب زیادہ چاہتے ہیں ، احمق ہیں

بعضے باپ ذرا ذرا سی باتوں پر خفا ہو جاتے ہیں ۔ ادھر لڑکا ان کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھا ، آدھر ان کی تیوری پر بل چڑھا ۔ رستہ چلنے میں اگر لڑکے نے دو قدم پیش قدمی کی ، آن کا چہرہ برافروختہ ہوا ۔ کوئی اس نے جواب آزادانہ دے دیا تو انھوں نے گھُرکنا ، جھڑکنا شروع کیا ۔ ہمیشہ چہرہ بنائے ، منہ تمتائے اس لیے رہتے ہیں کہ سارا گھر ان سے ڈرتا رہے ، کوئی شوخی اور بے باکی نہ کر سکے ۔ اولاد خواہ بڑی ہو کر جوان کیوں نہ ہو جائے ، مگر یہ کبھی ان سے دوستانہ برتاؤ نہیں کریں گے ۔ وہ بچوں کے ڈرانے کے لیے اپنا منہ کالا کر کے بِیچا[1] بنتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کا مطلب حاصل نہیں ہوتا ۔ اولاد ان سے بے لطف رہنے لگتی ہے ، ادب کی جگہ ان کی ہنسی آڑانے لگتی ہے ۔ ان کی چڑھتی ہوئی جوانی کا ، شباب کے زمانے کا اقتضا یہ ہے کہ وہ محبت اور شفقت کی نظر سب سے چاہتے

۱۔ بِیچا : کاغذ یا کپڑے کی مصنوعی ڈراؤنی صورت ۔ بچوں کے ڈرانے کے لیے ایک ہیبت ناک صورت بنا دیتے ہیں ۔ اس کو ''اللہ کا فضل'' یا ''ھَوّا'' بھی کہتے ہیں ۔ (نوراللغات)

ہیں - وہ باپ کے دہشت ناک چہرے کو کب خاطر میں لاتے ہیں - اس کو وہ ایسا سمجھتے ہیں کہ جیسے کہ کھیت میں چڑیوں کے ڈرانے کے لیے پُتلا کھڑا کرتے ہیں جس کے نہ دل میں، نہ رگوں میں خون ہوتا ہے مگر چہرہ ڈراؤنا ہوتا ہے - بے شک باپ کو اولاد کے دل میں خوف اپنا رکھنا ضرور ہے مگر اس سے زیادہ تر اُن کے دل میں اپنی محبت پیدا کرنی لازم ہے -

مثل مشہور ہے کہ پیری و صد عیب - جب ہم بڑے ہوں گے تو ہم میں بہت سی باتیں قابلِ نفرت پیدا ہوں گی - اُس وقت سوائے اپنے کنبے کی سچی محبت کے کوئی چیز دل کی خوش کرنے والی نہیں ہوگی - اگر اُس وقت میں بھی گالیاں دینے سے، کوسنے دینے سے اور ناحق کی حکمرانی و خوف دلانے سے باز نہیں آئیں گے تو اس عمر میں اپنے تئیں ستائیں گے، سارے سامانِ عیش و آرام کو اپنے اوپر تلخ کریں گے - یہاں وہ کوڑی کوڑی کے انتظام پر جان دیتے ہیں، وہاں چپکے چپکے روپے خاک میں مل رہے ہیں؛ قند لُٹے کوئلوں پر مُہر - ان کے سامنے دسترخوان پر آبالی دال، روکھی سوکھی روٹی، مگر پیچھے ان کے خوب مرغّن کھانے - بڑے میاں تو اس اپنی شیخی میں مرتے ہیں کہ میں اپنے سارے گھر پر خوب رعب داب رکھتا ہوں، وہاں بچہ بچہ ان کو مُوا ہؤا جانتا ہے - سارے گھر میں صرف یہی اکیلے ایسے ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے - خلاصہ یہ ہے کہ اولاد پر ایسی شفقت و مہربانی نہ کرنا جس سے ان کے دل میں محبت پیدا ہو اور ایسی اپنی حالت بنائی رکھنا کہ جس سے اُن کے دل میں خوف پیدا ہو، انتظامِ خانہ داری کے لیے اچھا نہیں ہوتا، گھر میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے - بعض باپ ایسے ہوتے ہیں کہ بیٹے سے ظاہر میں درشت مزاج ہوتے ہیں مگر دل بہت محبت رکھتے

ہیں - جب وہ مر جاتا ہے تو اس بات پر زیادہ روتے ہیں کہ میں نے کبھی اس پر اپنی محبتِ دلی کو ظاہر نہیں ہونے دیا - اس کی لیاقت اور قابلیت کی تعریف اس لیے نہیں کی کہ اس کو غرور نہ پیدا ہو -

بعض باپ اپنی اولاد کی طرف سے ایسے سنگدل ہوتے ہیں کہ عمر بھر اپنی زندگی میں اولاد کو اپنی دولت کی شرکت سے ، جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں ، محروم کرتے ہیں - بلکہ مرنے کے بعد بھی وہ اپنی ساری جائداد اور اسباب و مال کا مالک مثل اپنی بیوی کو بنا جاتے ہیں - مردوں کا حق عورتوں کو دے جانا ، بیٹوں کو محروم کر کے ان کی ماں کو اپنا قائم مقام بنانا بڑی حماقت ہے - اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ گھر میں بہت سے فساد جھگڑے کھڑے ہوتے ہیں - ماں بیٹوں میں بھی آن بن ہو جاتی ہے - دونوں کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے - باپ کی نا انصافی کے سبب سے عدالت میں مقدمات لڑتے ہیں ، طرح طرح کی زیر باریاں ہوتی ہیں - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر پر تباہی آتی ہے ، عزت آبرو بگڑ جاتی ہے ، بد نامی ہوتی ہے - بہتر طریقہ یہی ہے کہ جب آدمی کے مرنے کا زمانہ آئے تو اپنے مذہب یا رسم و رواجِ ملک کے موافق حق داروں کو اپنا اپنا حق دے دے ، جس کے سبب سے نہ کوئی جھگڑا کھڑا ہو ، نہ کوئی فساد برپا ہو -

۷- اب تک ہم نے اس اولاد کا ذکر کیا جن کو ہم عورتوں سے جنواتے ہیں - وہ ہماری جسمانی اولاد ہوتی ہے - اِس کو ہم اپنا وجودِ ثانی کہتے ہیں - اولاد کے جسم میں ماں کا زیادہ تر حصہ ہوتا ہے ، باپ کا تھوڑا - اب ہم اس اولاد کا ذکر کرتے ہیں جس کے ماں باپ ہم اکیلے ہی ہوتے ہیں - اس کے وجود میں کسی اور کی شرکت نہیں ہوتی - وہ ہمارے جسم سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ ہمارے اس جزو سے جو جسم سے درجۂ اعلیٰ رکھتا ہے - پس وہ ہماری روحانی اولاد

ہوتی ہے جو عقل و فہم و علم سے پیدا ہوتی ہے۔ ان میں خوب صورتی، حسن و ادا و انداز سارا ہمارا پیدا کیا ہؤا ہوتا ہے۔ اس کے اندر ہم خود موجود ہوتے ہیں۔ ان کی خوبی و نکوئی ہمارے نام کو بلند کرتی ہے۔ وہ ہماری بڑی جانکاہی سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ اولاد کیا رشید ہوتی ہے کہ جس سے دوسری اولاد کی نسبت دل زیادہ خوش ہوتا ہے۔

افلاطون کہتا ہے کہ یہ وہ بچے ہیں جو حیاتِ دوام رکھتے ہیں اور اپنے باپ کو بھی حیاتِ جاوید دیتے ہیں۔ اب تم پوچھو گے، ایسی اولاد کون سی ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ وہ تصنیفات[1] ہے جس کے اچھے ہونے سے ہم اولاد سے بھی زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے ایک ایک شعر و مصرع کو فرزندِ رشید کے برابر عزیز رکھتا ہے۔ وہ اچھی تصنیفات کو اپنی یادگار، اولاد سے زیادہ جانتا ہے۔ ارسطو کا قول ہے کہ تمام صنّاع اپنی صنعت کو عزیز رکھتے ہیں مگر شاعر سب سے زیادہ اپنے شعر کو عزیز رکھتا ہے۔ بعض شاعر مرنے کے وقت اپنے شعروں کو پڑھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان سے ایسے ہی رخصت ہوتے ہیں جیسے کوئی اپنی اولاد سے۔

تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّفوں کو وہ اپنی تصنیفات عزیز ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی جان ان پر قربان کر دی ہے۔ بعض مصنّفوں سے بادشاہوں نے کہا کہ اگر تم اپنی تصنیفات کو شائع نہ کرو تو ہم تم کو زندہ رہنے دیں گے مگر انھوں نے نہیں مانا اور کہا کہ یہ تصنیفات ہی ہماری زندگی کو ہمیشہ قائم رکھے گی۔ بعض مصنّفوں کی تصنیفات جلائی گئی تو وہ اس کے شعلوں میں

۱- فاضل مصنّف نے 'تصنیفات' کو اکثر جگہ واحد کے طور پر استعمال کیا ہے حالانکہ یہ لفظ واضح طور پر 'تصنیف' کی جمع ہے۔

خود جا پڑے اور اپنی تصنیفات کو اپنے ساتھ لے گئے ۔ بعض مصنّفوں کی تصنیفات جب جلائی گئی تو اس کے بعد ان کو اپنا جینا اچھا نہیں معلوم ہوا ۔ کسی نہ کسی طرح سے اُنھوں نے اپنے تئیں ہلاک کر دیا ۔ یہ تصنیفات بھی ایسی اولاد ہے کہ باپوں کو معبود کا درجہ دیتی ہے ۔ سولن[۱] ، لدی[۲] کرگس وغیرہ کو دیکھ لو ۔

۱۷۔ موت کا تجربہ

بڑے بڑے رُتبے کے حکیمِ حاذق گزرے ہیں کہ جنھوں نے فقط استدلالی اور خیالی ہی باتوں پر اعتماد نہیں کیا بلکہ تجربے اور عمل کی مشق میں ہزاروں تکالیف اور مصائب کو جھیلا ہے ۔ افلاس کے حالات دریافت کرنے میں نہ انھوں نے استدلال پر اکتفا کی ، نہ انھوں نے یہ انتظار کیا کہ زمانے کا انقلاب ان کو مفلس بنائے تو وہ اس کے حالات دریافت کریں ۔ بلکہ اپنی ساری دولت پر خاک ڈالی ، خود بخود افلاس کا جامہ پہنا ۔ بعض نے اپنی ساری عیش و عشرت کو رخصت کیا ، جفاکشی اور محنت کی عادت ڈالی تاکہ مشقّت و مزدوری کی زندگی کا تجربہ حاصل ہو کہ کیا کیا اس میں ہوتا ہے ۔ بعض نے اپنے عزیز اعضا کو قطع کیا ، آنکھوں کو نکال ڈالا ، عضوِ تناسل کاٹ ڈالا تاکہ ایسی حالتوں میں دیکھیں کہ ان کی جان پر کیا آن کے بنتی ہے ۔ مگر جو سب سے بڑا کام تھا ، یعنی مرنا ،

۱۔ سولن : (٦٤٠ ق‌م — ۵۵۸ ق‌م) ایتھنز قدیم کا ایک فلسفی ۔ یونان کے سات حکیموں میں سے ایک ۔ اس نے ایتھنز والوں میں روح وطنیت کو ابھارا اور مظلوموں پر ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کی ۔ اس نے اپنے ملک کے لیے کئی قانون ایسے بنائے جن کی بدولت عوام الناس بہت سے مظالم سے محفوظ ہو گئے ۔

اُس میں تجربے نے ناکام رکھا اور کچھ مدد نہیں کی -

ایک آدمی کو عادت کے سبب سے درد ، تکلیف ، شرم و حیا ، مایحتاج[1] اور علیٰ ہذا القیاس بہت سی چیزوں کا تجربہ حاصل ہو سکتا ہے مگر موت کا تجربہ ہم کو ساری عمر میں ایک دفعہ ہوتا ہے - جب وہ ہمارے پاس آتی ہے تو ہم نوآموز ہی اس کے تجربے میں ہوتے ہیں ، پہلے سے کوئی مشق اس کی نہیں ہوتی - زمانۂ قدیم میں بعض حکمائے مقدّس ایسے گزرے ہیں کہ انھوں نے ذائقہ موت کا چکھا اور اپنے تمام قُوائے عقلیہ کو اِس طرف مصروف کیا کہ موت کیا ہے اور جسم سے روح کے نکلنے کا رستہ کون سا ہے؟ مگر کوئی ان میں سے واپس نہ آیا کہ موت کی حقیقتِ حال کی خبر سناتا - جو شخص موت کے خوابِ شیریں میں سویا ، پھر اس کے جاگنے کی کہیں سے خبر نہیں آئی -

کنیس جولیس[2] بڑا بہادر ، جواں مرد ، نیک نہاد رومی تھا جس کے ثباتِ قدم کی عجیب و غریب داستانیں مشہور ہیں - جب وہ قتل کے لیے قتل گاہ کو جاتا تھا تو اس کے دوست نے ، جو ایک حکیم تھا ، اس سے پوچھا کہ اے میرے دوست ! تم یہ بتاؤ کہ تمھاری روح کہاں ہے ؟ وہ کیا کام کر رہی ہے ؟ کس سوچ بچار میں وہ ہے ؟ تو اُس نے جواب دیا کہ یہ خیال کر رہا ہوں کہ موت کے واسطے آمادہ ہوں اور تمام اپنے قُویٰ اور استعدادِ عقلیہ کو صرف کر رہا ہوں کہ موت کا وقت ، جو ایک طرفة العین ہوتا ہے ، اس میں

۱- مایُحتاج = وہ چیز جس کی احتیاج ہو -

۲- کنیس جولیس : یہ غالباً جولیانوس الفقیر ہے جس نے اپنے والدین کو قتل کرکے فقیری اختیار کر لی تھی اور ساری عمر عبادت و ریاضت میں گزار دی تھی ، مگر بالآخر خود بھی قتل ہؤا -

جسم سے علیحدہ ہو کر روح کی حرکت کس طرف ہوتی ہے؟ اور آیا اس کو یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ میں یہاں پھر آؤں اور اپنے دوستوں کو اس کی حقیقتِ حال سناؤں؟ کیا دل گُردے کا آدمی تھا کہ موت کے وقت یہ ہوش و حواس رکھتا تھا کہ خود موت پر فلسفی حکم صادر کرنا چاہتا تھا۔

بعض حکیموں نے لکھا ہے کہ موت کے آزمانے کا یہی ایک خاص طریقہ ہے کہ قریب الموت ہونے کا تجربہ کریں؛ گو اس سے تجربہ کامل اور کلیّہ نہ ہو مگر تقریباً۔ گو ہم قلعے کو تسخیر نہیں کر سکتے مگر اس کے قریب ایسے جا سکتے ہیں کہ اس کے اندر کے جانے کے سارے رستے ہم کو معلوم ہو جائیں۔ یہ امر کچھ عقل کے خلاف نہیں ہے اور بغیر دلیل کے نہیں ہے کہ "النّوم أخت[1] الموت۔" یعنی سونا مرنے کی بہن ہے۔ اب سونے کا تجربہ موت کے تجربے کو کچھ بتائے گا۔ جاگتے جاگتے بہت آسانی سے سو جاتے ہیں اور دنیا کی روشنی سے بالکل بے خبر ہو جانے کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی۔ اگر اس نوم[2] سے نیچر ہم کو یہ تعلیم نہ کرتا کہ جیسے تم جینے کے لیے بنائے گئے ہو، ایسے مرنے کے لیے، اور زندگی میں وہ حالت نہ پیش کرتا جو بعد موت کے ہمیشہ کے لیے اس نے ہمارے لیے مقرر کی ہے اور ہم کو یہ عادت نہ ڈلواتا اور اس کا خوف نہ دور کرتا، تو سونے کی استعداد بالکل بیکار اور برخلافِ نیچر ہوتی۔

دوسرے سوائے سونے کے ایک اور بات ہے کہ سخت حادثات ہم کو ایسے پیش آتے ہیں جن سے کہ ہم غشی کی حالت میں بالکل

۱۔ اصل میں "اخوت" ہے۔ یعنی نیند موت کی بہن ہے۔

۲۔ نوم = نیند۔

بے ہوش ہو جاتے ہیں - حقیقت میں موت کا ایک نیچرل سچّا رخ وہ ہم کو دکھاتی ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے پنجے سے یہ خوف کرنا نہیں چاہیے کہ وہ کوئی اپنے ساتھ درد ، تکلیف اور رنج لاتی ہے - کیونکہ رنج کے ادراک کے واسطے وقت اور تکلیف اٹھانے کے واسطے ایک مہلت چاہیے - موت کا وقت نہایت شتابی اور نہایت ہی کم ہوتا ہے ، اس لیے موت کا رنج ہم کو کچھ محسوس نہیں ہوتا - پس یہی دو حالتیں ایسی ہیں کہ جو موت تو نہیں مگر قریب الموت ہونے کا تجربہ ہم کو سکھاتی ہیں اور ہم اسے موت پر قیاس کر سکتے ہیں -

۲۷- بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ وہ خیال میں بری معلوم دیتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ ایسی نہیں ہوتیں

ایک شخص جو تندرست رہتا ہو اور کبھی اس کی انگلی بھی نہ دکھی ہو تو اس کے خیال میں بیماری بڑی خطرناک معلوم ہوتی ہوگی اور بیماروں کے حال پر اس کو بڑا رحم آتا ہوگا - مگر وہ شخص جب خود بیمار ہوگا تو جان لے گا کہ بیماری جیسے میرے خیال میں خوفناک تھی ، ایسی حقیقت میں نہیں ہے - اگر کوئی شخص مینہ ، آندھی کی رات میں کسی محفوظ مکان میں بیٹھا ہو تو وہ ان لوگوں پر ترس کھائے گا جو اِس رات کو باہر میدان میں ہوں گے ، مگر وہی شخص اگر میدان میں ہوتا تو اس کا دل وہاں سے جانے کو کہیں اور نہ چاہتا - یوں ہر شخص خیال کرتا ہے کہ اگر میں ایک ہفتہ یا مہینہ بھر تک کسی مکان میں قید رہوں تو اس کی مصیبت کا میں متحمّل نہیں ہو سکتا - مگر بیماری کی حالت میں وہی شخص ایک مکان میں ہفتہ یا مہینہ بھر تک رہے گا تو جان جائے گا کہ میری حالت ایسی

قابلِ رحم نہیں ہے جیسی میں اور بیماروں کی حالت قابلِ رحم جانتا تھا - میرے خیال نے اِن مصیبتوں کو اصل حقیقت سے دو چند کر دیا - یہی حال موت کی تکلیف و رنج کا ہے جن کو خیالات نے بہت بڑھایا ہے - لوگ کہتے ہیں کہ انگلی میں پھانس لگنے کی جب اتنی تکلیف ہوتی ہے تو موت کی کیوں نہ تکلیف ہوتی ہوگی - صرف قیاس ہی ہے - موت میں بعض دفعہ اِتنی بھی تکلیف نہیں ہوتی جیسی پھانس لگنے میں -

۳۷- موت کی تکالیف کے باب میں حکما کی مختلف رائیں[1] ہیں

ایک حکیم تو یہ کہتا ہے کہ جب آدمی کی موت آتی ہے تو اس کے مرض کو طوالت ہوتی ہے، یا دفعۃً کسی مرضِ مہلک میں یا امراضِ مُزمنہ میں وہ گرفتار ہوتا ہے، جیسے فالج، صرع - بیماری کے زور سے وہ گم سُم ہو جاتا ہے - اٹھتا ہے تو گر پڑتا ہے، آہ و فغاں کرتا ہے، کانپتا ہے، ہاتھ پاؤں دے دے کے مارتا ہے، سہج سہج سانس لیتا ہے یا دھونکنی کی طرح سانس چلنے لگتا ہے، منہ سے جھاگ نکلتے ہیں - غرض ان تکالیف کے سبب سے قوّت زائل ہو جاتی ہے، سر میں درد ہوتا ہے، ہولے ہولے بولتا ہے، غش پر غش آتے ہیں جس سے دیکھنے والوں کے دل پر صدمہ ہوتا ہے کہ کیسی تکالیف میں وہ مبتلا ہے کہ جن سے یہ اس کی جان پر بنی ہوئی ہے - مگر ان علامات سے وہ ضرور جانتے ہیں کہ ابھی جان باقی ہے جو یہ ہاتھ پاؤں کچھ ہل رہے ہیں -

مگر دوسرا حکیم یہ کہتا ہے کہ ایسی حالت میں دونوں جسم و

۱- اصل میں "رائے" چھپا تھا -

روح سوتے ہیں - وہ زندہ ہیں مگر اپنے تئیں نہیں جانتے - کب یہ یقین ہوسکتا ہے کہ جب اعضا کی یہ حالت غیر ہو، بدحواسی کی یہ نوبت ہو، تو روح میں ایسی قوّت باقی[1] ہو کہ وہ کچھ ادراک کر سکے - اس لیے ان آدمیوں کو اپنی سخت تکالیف محسوس نہیں ہوتیں - ان پر آوروں کا بہت افسوس کرنا عبث ہے - ہاں وہ حالت نہایت رنج و تکلیف آمیز ہے کہ روح میں قوت ہو اور زبان میں ان کے اظہار کی قدرت نہ ہو - جیسے بعض آدمیوں کی دشمن پہلے زبان کاٹ ڈالتے ہیں، پیچھے ان کو قتل کرتے ہیں - اگر ایسے قتل ہونے میں چہرے پر استقلال نمایاں ہو تو ان کی بے زبانی ہزار زبان سے ان کی شجاعت اور ثبات و استقلال کی تعریف کرتی ہے -

بعض دفعہ دشمنوں کے ہاتھ میں جب آدمی پڑ جاتا ہے، وہ جان لینے سے پہلے[2]، صدہا طرح کی تکلیف پہنچاتے ہیں - کبھی بھاری جرمانے اور تاوان کی طلب میں طرح طرح سے سزا دیتے ہیں اور ایسی حالت ان کی بنا دیتے ہیں کہ وہ کچھ درد، رنج، تکلیف کو بھی بیان نہیں کر سکتے - کوئی زیادہ سوال پوچھ کر ان کو ستائے تو کچھ ٹوٹا پھوٹا جواب ان کے منہ سے بمشکل نکلتا ہے - بہت چیخ چیخ کر ان سے بات کیجیے تو وہ کچھ سنتے ہیں اور آخر الفاظ کا جواب بھکا ہوا دیتے ہیں، کچھ سمجھ کر نہیں - اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روح کے کناروں پر ہماری آواز مَس کرتی ہے -

غشی کی حالت میں ہمارے اعضا کی حرکات اختیاری نہیں ہوتیں، بالکل اضطراری ہوتی ہیں - نیچر کے موافق وہ حرکتیں اپنے کاموں کے لیے کرتے ہیں، کچھ ہمارے ارادے سے نہیں - لڑائیوں میں ہتھیاروں

۱- اصل : پاتی -

۲- اصل : پہلے جان لینے سے -

سے سپاہیوں کے سینکڑوں اعضا کٹ کر جدا ہو جاتے ہیں اور وہ تڑپا کرتے ہیں مگر ان سپاہیوں کے دلوں کو ، جن کے وہ اعضا دفعۃً آناً فاناً ضرب سے کٹ کر جدا ہو گئے ہیں ، ان کے تڑپنے سے کچھ تکلیف نہیں ہوتی - تم نے قصائیوں کی دکانوں میں بکروں کے گوشت میں دیکھا ہوگا کہ ان کے پٹھے اور نسیں پھڑکا کرتی ہیں - غرض انسان اور حیوان دونوں کے مرنے کے بعد پٹھے اور نسیں پھڑکتی ہوئی دیکھنے میں آتی ہیں - ہر شخص کو یہ تجربہ ہوتا ہے کہ اس کے اعضا کبھی اکڑ جاتے ہیں اور کبھی سُن ہو جاتے ہیں جن میں اس کی مرضی کو دخل نہیں ہوتا - غرض یہ حرکات ، جو بظاہر ہماری کھال کے اوپر نظر آتی ہیں ، ان کو ہم اپنی حرکات نہیں کہہ سکتے -

اس کو بالاتفاق سب مانتے ہیں کہ سونے میں جو ہمارے ہاتھ پاؤں میں درد ہوتا ہے ، اس سے ہم کچھ متاذّی[1] نہیں ہوتے - اور یہ جانتے ہی نہیں کہ غشی کی حالت میں کبھی ہماری آنکھیں کھلتی ہیں ، کبھی بند ہوتی ہیں - ہم اپنے گھر کو دیکھتے ہیں مگر پہچانتے نہیں - زبان سے بڑاتے ہیں مگر جانتے نہیں کہ کیا کہتے ہیں - لوگ ہم سے "چلا" چلا" کر باتیں کرتے ہیں اور کچھ ہم سے پوچھتے ہیں - ہم اُن کا جواب کچھ دے دیتے ہیں لیکن ہم کو خبر نہیں ہوتی کہ کیا کہا - پھر ہوش میں بھی نہیں یاد آتا ہے کہ کسی نے ہم سے کیا باتیں کہی تھیں اور ہم نے انھیں کیا جواب دیا تھا - ہاں جس وقت غشی کی حالت سے ہوش میں آتے ہیں تو سب دکھ ، درد ، رنج ، تکلیف معلوم ہوتا ہے کہ کس کس بلا میں مبتلا ہیں -

اِس تمام بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ موت کا تجربہ جو ہم کو ہؤا

۱- متاذی = ایذا رسیدہ -

ہے ، وہ فقط اس قریب الموت ہونے کے تجربے سے ہوا ہے ، اسی پر قیاس موت کا کر سکتے ہیں -

۴۷ - کونشنس (وجدانِ قلبی)

کونشنس بھی کیا عجیب و غریب قوت ہمارے دل کے اندر بیٹھی ہوئی کام کرتی ہے - کوئی ارادہ خواہ کیسا ہی مخفی ہم کریں ، وہ اس کا اعلان کر دیتی ہے - ہمارے گناہ کا کوئی گواہ نہ ہو ، وہ ہمارے خلاف گواہی دینے کو موجود ہے اور ہم سے لڑنے کو تیار ہے - ہر وقت ایک تازیانہ اس کے ہاتھ میں رہتا ہے جو ہماری ہر خطا پر وہ ہلاتی رہتی ہے اور دل پر سٹاک سٹاک لگاتی ہے - ہمارے جن گناہوں پر کوئی چوں بھی نہ کرتا ہو ، یہ لعنت کا طوق ہماری گردن میں ڈال دیتی ہے - ہماری جو خطا سب کی نظر سے مخفی ہو ، وہ اس کے اشتہار لگا دیتی ہے - جس ہمارے جرم کے انتقام کا خیال کسی کو نہ ہو ، وہ اس کے انتقام کے لیے آمادہ رہتی ہے -

ایک شخص کی یہ کہانی ہے کہ اُس نے ابابیل کے بچوں کا گھونسلا نکالا اور بچوں کو بڑی بے رحمی سے کچل ڈالا - جب لوگوں نے اس ظلم پر اس کو لعنت ملامت کی تو اس نے کہا کہ جو کچھ میں نے ان بچوں کے ساتھ سلوک کیا ، وہ اُسی کے مستحق تھے - یہ چھوٹے سے بچے ایسے بدذات شریر تھے کہ مجھ پر ہمیشہ جھوٹا بہتان باپ کے مار ڈالنے کا لگاتے تھے - اب تک کسی شخص کو یہ خبر نہ تھی کہ اس نے اپنے باپ کو مار ڈالا ہے - اب کونشنس کے انتقام کے جوش نے باپ کے مار ڈالنے کی خطا کو اُس سے خود ظاہر کرا دیا - اس سے افلاطون کے اِس مقولے کی تصدیق ہوتی ہے کہ گناہ کی سزا اس کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے اور ہمیشہ اس کے پیچھے لگی رہتی ہے ،

دیر سویر گناہ گار کو وہ مل جاتی ہے -

شرارت خود شریروں کے حق میں کانٹے بوتی ہے - جو بدذات اَوروں کے گرانے کے لیے کنویں کھودتے ہیں ، وہ خود اس میں گرتے ہیں - ''چاہ کَن را چاہ در پیش - کلوخ انداز را پاداش سنگ است[۱] -'' جو بد نفس اَوروں کے لیے برے منصوبے باندھتے ہیں ، وہ خود انھی کے لیے عذابِ جان ہو جاتے ہیں - بِھڑ جو نیش زنی کرتی ہے ، تو اَوروں کو تکلیف پہنچاتی ہے مگر اپنے ڈنک کا بھی نقصان کرتی ہے اور ہمیشہ کے لیے اُس کو کھو بیٹھتی ہے - اس کی زندگی اَوروں کی زخم رسانی پر ختم ہو جاتی ہے - بعض زہریلی مکھیاں ہوتی ہیں جن کے گرد قدرت نے ایسی چیزیں پیدا کر دی ہیں کہ وہ ان کے زہر کی تریاق ہوتی ہیں - بعض زہریلے بچھو جس گھاس میں پیدا ہوتے ہیں ، وہی گھاس ان کے زہر کے لیے تریاق ہوتی ہے - اِسی طرح جو شخص بدی سے خوش ہوتا ہے ، اُس وقت کونشنس ناخوشی پیدا کرتا ہے اور وہ ہم کو سوتے جاگتے تکلیف دیتا ہے ، اور وہ بُرے بُرے خیالات ہمارے دل میں پیدا کرتا ہے کہ ہم اُن کو خواب میں یا بخار کے ہذیان میں ظاہر کر دیتے ہیں -

ایک شخص نے خواب دیکھا کہ اس کی کھال اُتاری گئی ہے اور پھر جسم اس کا پتیلے میں اُبالا گیا ہے ، تو دل اُس سے چپ چاپ یہ کہتا ہے کہ ان سارے عذابوں کا سبب تُو ہی ہوا ہے - شریر کے لیے کوئی جگہ مأمن[۲] نہیں بن سکتی جس میں وہ چھپ سکے ، کیونکہ وہ اپنے سے آپ کیسے چھپ سکتا ہے - شرارت کو خود

۱- یعنی جو دوسروں کے لیے کنواں کھودتا ہے ، وہ خود اس میں گرتا ہے اور جو دوسروں پر پتھر پھینکتا ہے بالآخر خود بھی پتھر کھاتا ہے -

۲- مأمن = امن کی جگہ -

کونشنس ظاہر کر کے اس کو شریر بنا رہا ہے، پھر اس کو اطمینانِ قلب کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ گناہ کی پہلی سزا یہ ہے کہ وہ خود اس کو معاف نہیں کر سکتا۔ جن کا کونشنس بد ہے وہ ان کے دلوں کو خوف سے بھرتا ہے، جن کا کونشنس نیک ہے ان کا قلب اطمینان سے رہتا ہے۔ جن کی نیّت بہ خیر ہے اور معصیت سے بری ہے، ان کا کونشنس ایسی ان کی تقویت کرتا ہے کہ وہ خطرناک مہلک مقاموں میں بے خوف و خطر جاتے ہیں۔ جن کا کونشنس مقدس ہے، اگر وہ ناحق کسی الزام میں پھنس جاتے ہیں تو وہ الزام سے بری ہونے کے لیے اپنی بےگناہی ثابت کرنے کا بار نہیں اٹھاتے اور اس کو اپنی خفّت سمجھتے ہیں۔

ایک دیانت دار سپہ سالار پر جب خیانت کا الزام لگا تو اس نے ججوں کے سامنے ایک کتاب نکال کر آمد و خرچ کا حساب سنایا۔ جب ججوں نے اس کو کہا کہ کتاب کو حوالے کرو تو اس نے ان کے سامنے کتاب کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیے اور کہا کہ میں اپنی بےگناہی کے ثبوت میں اسے دینا اپنی ذلّت سمجھتا ہوں۔ کونشنس کی اعانت کے واسطے شاید انسان نے آلاتِ تعزیر ایجاد کیے ہیں اور ان سے طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیّتیں خطرناک، انسان کو پہنچائی جاتی ہیں۔ اُن سے انسان کے استقلال کا امتحان ہو سکتا ہے مگر راست بازی کا نہیں۔ جو شخص ان کی تکالیف کا متحمّل ہوتا ہے یا نہیں ہوتا، دونوں راستی کا اخفا کرتے ہیں۔ ایک وہ مجرم ہوتے ہیں کہ جن کو شکنجے میں کھینچیے تو وہ اپنے جرم کا اقرار نہ کریں، ایک وہ بےگناہ ہوتے ہیں کہ اس کے خوف کے مارے جھوٹ موٹ کا اقرار کر کے مجرم بن جاتے ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ مار کے آگے بھوت ناچتا ہے۔ بیچارے معصوم

کا تو کیا مقدور ہے کہ وہ اس کے آگے ٹھہر سکے۔ اس کے خوف سے وہ جھوٹ بولنے لگتا ہے۔ کونشنس مجرم کے اقرارِ گناہ میں اِن آلاتِ تعزیر کا معاون ہوتا ہے اور مجرم کے استقلال میں خلل ڈالتا ہے، اور بے گناہ میں استقلال اور ثبات ان عذابوں کے اٹھانے میں پیدا کرتا ہے۔ اگر نظرِ غور سے دیکھیں تو یہ آلاتِ تعزیر شکنجہ وغیرہ بےکار ہیں۔ اس لیے کہ ہم اُن لوگوں کو، جن کے جرم مشتبہ ہیں، وہ سزا و تعزیر دیتے ہیں جو موت سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ یہ سزا دینی انسانیت سے بعید ہے۔ بہت سے بے گناہ ان کے عذابوں کے ڈر سے سارے جرم کا اقرار کر کے موت کو قبول کر لیتے ہیں۔ پس آلات کی ایجاد کا خیال، جو کونشنس کی تائید کے لیے پیدا ہوا ہے، وہ غلط ہے۔

۷۵۔ خود کُشی

مثل مشہور ہے کہ "ہر حیلے رزق، ہر بہانے موت۔" مرنے کے ہزاروں طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک خودکشی بھی ہے جس میں اپنی مرضی کے موافق مرنا ہوتا ہے۔ بہت حوادثات اور سانحات ایسے پیش آتے ہیں کہ اُن کی تکلیفات کا اُٹھانا بعض آدمیوں کو موت کی تکلیف سے مشکل معلوم ہوتا ہے اور مرنا جینے سے اچھا نظر آتا ہے، اس لیے وہ اپنے تئیں مار ڈالتے ہیں۔ ہم اس مضمون میں خودکشی کی تائید و تردید کی جو دلائل حکما نے لکھی ہیں، بیان کر کے یہ نتیجہ نکالیں گے کہ کسی حال میں خودکشی مستحسن نہیں ہے بلکہ وہ نامردی اور دیوانگی ہے۔

ایک حکیم سے کسی نے پوچھا کہ آزادانہ زیست کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ موت کو ناچیز جاننے سے۔ جو شخص موت سے نہیں ڈرتا، وہ کسی مصیبت و خوف سے نہیں ڈرتا۔ ایک

بے چارہ لڑکا پکڑا گیا، نخاس[1] میں بیچا گیا، ظالم آقا کے پالے پڑا۔ اُس نے ایک نہایت ذلیل کام اس کے حوالے کیا۔ لڑکے نے آقا سے کہا کہ آپ کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ جس لڑکے کو میں نے مول لیا ہے وہ یہ ذلّت کا کام ایسی حالت میں کرے گا کہ اس کو اپنے آزاد کرانے کا سہل طریق آتا ہو؟ یہ کہہ کر اس نے اپنے تئیں ایک بلندی سے گرایا اور اپنا کام تمام کیا۔

بعض حکیموں کا قول ہے کہ دانشمند کو درازیٔ عمر سے احتراز کرنا چاہیے۔ جتنا اُس کو جینا چاہیے اُتنا جیے۔ یہ نہیں کہ وہ جتنا جی سکے، جیے۔ یہ نیچر کا بڑا احسان ہے کہ اُس نے حیات کی کنجیاں ہمارے ہاتھ میں دے دی ہیں جس سے ہم اپنے عالمِ رنج و بلا کو دفع کر سکتے ہیں۔ حیات کے اندر جانے کا ایک رستہ اور باہر نکلنے کی بے شمار راہیں بنائی ہیں۔ زمین کی وسعت زندوں کے لیے تنگ ہو سکتی ہے مگر مُردوں کے لیے ہمیشہ فراخ رہتی ہے۔ ایک حکیم کہتا ہے کہ جو لوگ دنیا کی مصیبتوں اور آفتوں کی شکایت کرتے ہیں، بیہودہ ہیں۔ کس نے اُن کو باندھ رکھا ہے کہ وہ اپنے تئیں ان سے نہ چُھٹائیں۔ یہ ان کی نامردی ہے کہ وہ اپنے تئیں رنج و تکلیف میں اسیر ہو کر قیدِ حیات میں رہتے ہیں۔ موت سب جگہ موجود ہے، ہر جا ہر وقت اس کا سامان مہیا رہتا ہے۔ ہر شخص ہم کو حیات سے محروم کر سکتا ہے مگر موت کے پنجے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

موت کے ہزاروں رستے ہیں۔ اگر موت انسان کے اختیار میں نہ ہوتی تو زندگی غلامی کی قید ہوتی۔ موت کسی خاص مرض کا حکمی

۱۔ نخاس: انسانوں کی خرید و فروخت کی منڈی۔ بازارِ بردہ فروشی۔ (نور اللغات)

علاج نہیں ہے بلکہ تمام امراض کا ایسا علاج ہے کہ وہ سب ہی کو کھو دیتا ہے۔ موت ایسے گھاٹ پر آتار دیتی ہے کہ جس میں کچھ خوف و خطر نہیں، اس لیے بہت سے اس کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ ایک ہی بات ہے کہ کوئی شخص اپنے قرض کو وقتِ موعود سے پہلے ادا کردے یا روزِ موعود پر دے دے۔ اسی طرح حیات بھی ایک قرض ہے جس کو وہ روز موعود سے پہلے دے دے یا روزِ موعود پر دے۔ اس دنیا کی بھول بھلیّاں میں جو رشتۂ حیات ہم کو پھرا رہا ہے، وہ کہیں سے منقطع ہو جائے، وہیں اس کا خاتمہ ہے۔ کوئی موت خودکشی سے بہتر نہیں کہ وہ حسبِ دل خواہ ہوتی ہے۔ زندگی اَوروں کی مرضی پر موقوف ہے، موت ہماری اپنی مرضی پر۔ ہمارے معمولی معالجے بھی جان ہلاک کرتے ہیں؛ کاسٹک اور چیرہ لگانے، اعضا کٹانے، فاقے کرنے، خون نکلوانے کی تکلیفیں آٹھانی پڑتی ہیں۔ پس اس سے بہتر ہے کہ ہم آگے قدم بڑھا کر وہی علاج کیوں نہ کریں کہ جس سے صحتِ کُلی یقینی ہو جائے۔ سخت مرض کے واسطے سخت علاج چاہیے۔ سخت امراض کے واسطے موت سے بہتر کوئی علاج نہیں۔

ایک شخص کو گٹھیا ہو گئی تھی۔ ٹانگوں میں اس کے بہت درد رہتا تھا۔ اس نے ان کو ایسی[۱] زہریلی دوا لگائی کہ جس سے وہ سُنّ ہو کر بے حِس ہوگئیں۔ تو اُس نے کہا کہ ٹانگوں کو اپنی مرضی کے موافق مرض چاہیے کہ جس سے درد محسوس نہ ہو۔ پس جب خدا ہم کو اپنی مرضی سے ایسی حالت کو پہنچاتا ہے کہ جس میں جینا ہزار درجے بدتر مرنے سے ہوتا ہے تو وہ ہم کو اختیار دیتا ہے کہ جہاں چاہو، چلے جاؤ۔ ضعف و نقاہت سے دبنا ضعفِ عقل

۱- اصل: ایسے۔

ہے اور ان کو پرورش کرنا دیوانگی ہے۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ نیچر کے موافق کسی دانش مند کا جینا یہ ہے کہ جب اس کو اپنا مرنا برمحل معلوم ہو تو اپنے تئیں مار ڈالے، خواہ کیسا ہی آسودہ حال ہو۔ بے وقوفی کا جینا یہ ہے کہ وہ جیتا رہے، خواہ کیسا ہی شکستہ حال ہو، بشرطیکہ نیچر کے موافق مایحتاج کا محتاج نہ ہو۔

ایک حکیم کہتا ہے کہ اگر ہم اپنے مال میں خود غبن کریں تو خلافِ قوانین کوئی کام چوری کا نہیں کیا کہ چور کی سزا دی جائے۔ اِسی طرح اگر ہم نے اپنے گھر میں لکڑیاں جلائیں تو آتش زنی کے قوانین کے خلاف کام نہیں کیا کہ آگ لگانے والے کی سزا دی جائے۔ اسی طرح اگر ہم اپنے تئیں مار ڈالیں تو کوئی کام ہم نے خون کے قوانین کے خلاف نہیں کیا کہ خونی کی سزا پائیں۔ جیسے ہم زندگی کے کاموں کے مختار ہیں، ایسے ہی موت کے۔

اب تک ہم نے خودکشی کی تائید میں دلائل بیان کیں، اب اس کے برخلاف (بیان کرتے ہیں[1]) ۔ بڑے بڑے عاقلوں کی یہ رائے ہے کہ جب تک ہمارے پروردگار کا حکم ہمارے پاس نہ آئے، ہم کو اس دنیا کے حصار سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ جب خدا کی مرضی ہوگی وہ ہم کو حکم دے گا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ ہم پر فرض ہے کہ ہم اُس کے بغیر اجازت کے باہر نہ جائیں، کیوں کہ ہم اپنے ہی لیے فقط پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ اپنے ملک اور قوم کے واسطے، اپنے معبود کی عبادت کے واسطے۔ اگر ہم اپنے تئیں قتل کر ڈالیں گے تو وہی ملک کے قوانین باز پرس کریں گے جو آدمی کے قتل میں کرتے[2] ہیں۔

۱- قوسین کے الفاظ مرتّب نے اضافہ کیے ہیں۔

۲- اصل : ہوتے ہیں۔

اپنے تئیں مار ڈالنا گویا اپنے فرائض کو چھوڑ کر بھاگ جانا ہے۔ ہم کو خدا ضرور بھگوڑوں کی سزا دے گا۔ گو ہم نے کوئی خطا سوا اس کے نہ کی ہو کہ اپنے ہاتھوں اپنے تئیں قتل کیا ہو، حیات کی روشنی کو چھوڑ کر موت کی تاریکی کو خود اختیار کیا ہو۔ اپنے فرائض کو چھوڑ کر فرار ہو جانا کیا بڑا گناہ نہیں ہے جس کی سزا نہ ملے؟ ثبات و استقلال و صبر و ہمّت کی خوبی یہ ہے کہ جس زنجیر سے ہم پابستہ ہوں اس کی تکالیف کو صبر سے سہیں۔ نہ یہ کہ اسے توڑ کر بھاگ جانے کا قصد کریں۔ نیکی تو وہ شجاع ہے کہ کوئی حادثہ ایسا نہیں ہے کہ جس کا منہ نہ پھیر دے۔ وہ تو خود رنج و تکلیف کو ڈھونڈتی پھرتی ہے، انھی سے تو اس کا نشو و نما ہوتا ہے۔ اگر آفت و بلا و مصیبت نہ ہو تو صبر و استقلال و ثبات کی خوبیاں کیونکر ظاہر ہوں۔ وہ نہ تو کسی ظالم کے جبر و تعدّی سے خوف کرتے ہیں، نہ شکنجے کے عذابوں سے ڈرتے ہیں۔ وہ ہر مصیبت کے مقابلے میں سینہ سپر کرنے کو موجود ہیں۔ جیسے بعض درخت کلھاڑیوں کے لگنے سے اور گُدے[۱] ٹہنیوں کے کٹنے سے اور زیادہ پھیلتے ہیں، اسی طرح وہ مصائب کے تیر کھانے سے زیادہ پھولتے پھلتے ہیں۔

ایک اور حکیم کا قول ہے کہ جینے میں کچھ خوف نہیں۔ نیکی کے معنی یہ ہیں کہ ہر مصیبت کا مقابلہ جواں مردانہ کرے۔ تکالیف سے بچ کر نکل جانے میں کوئی خوبی نہیں۔ مصیبت زدہ، جو موت کو ناچیز سمجھ کر اس کو اختیار کرتا ہے، وہ نامرد ہے، جواں مرد وہی ہے جو مصیبت زدگی کی حالت کو ناچیز جان کر تحمّل کے ساتھ اپنے تئیں سنبھالتا ہے۔ یہ نیکی نہیں ہے بلکہ مخنّث پن ہے کہ دنیا

۱۔ گُدّا: درخت کی موٹی اور مضبوط شاخ۔ (نور اللغات)

کے آلام اور مصائب سے منہ چھپا کے قبر کے گڑھے میں جا کر سو رہے۔ نیکی کبھی اپنا منہ نہیں پھیرتی اور اپنی رائے سے انحراف نہیں کرتی، خواہ اُس کے مقابلے میں مصیبتوں کے طوفان کھڑے ہوں۔

کبھی ہم رنج و تکلیف سے بچنے کے لیے موت کو اختیار کرتے ہیں، کبھی موت سے بچنے کے لیے ہم موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ سچ کہو کہ یہ دیوانگی نہیں ہے تو کیا ہے کہ مرنے کے خوف سے کوئی شخص اپنے تئیں مار ڈالے؟ یا پہاڑ پر سے کوئی اپنے تئیں سر کے بل گرا دے۔ آئندہ مصیبتوں کا خوف انسان کا بڑا پتلا حال کرتا ہے۔ مگر جو سچے بہادر، دلیر ہیں، وہ کب ان کو خاطر میں لاتے ہیں۔ جب کوئی تکلیف ان پر حملہ آور ہوتی ہے، وہ سینہ سپر ہو کر اس سے لڑتے ہیں۔

افلاطون اپنے قوانین میں لکھتا ہے کہ سب سے زیادہ پاجی موت اُس شخص کی ہے جو اپنے عزیز اور قریب تر دوست کو، یعنی اپنے تئیں، ہلاک کرتا ہے اور باقی زندگی کے واسطے جو باتیں اس کے لیے مقرر تھیں، اُن سے محروم کرتا ہے، اور یہ کام فقط اپنے بودے دل کے اور ضعفِ عقل کے سبب سے کرتا ہے، ورنہ اس کو کوئی مجبوری اس کے کرنے کی نہیں ہے۔ نہ کوئی اس پر ایسا حادثۂ عظیم واقع ہوا ہے کہ جس کو برداشت نہ کر سکتا ہو، یا کوئی ذلّت ایسی ہوئی ہو کہ جینا بھلا نہ لگتا ہو۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ زندگی ہیچ ہے، ان پر ہنسی آتی ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ یہی اس کی ہستی ہے۔ جو اعلیٰ درجے کی عمدہ ہستی رکھتے ہیں، اگر وہ انسان کی ہستی پر ہنسیں تو بجا ہے، مگر انسان خود اپنی ہستی کو ہیچ جانے تو نہایت حماقت ہے۔ یہ بات کسی اور جانور میں نہیں ہے کہ وہ اپنی ہستی پر خود لعنت ملامت کرے اور

اسے ہیچ سمجھے۔

بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہم ہیں ، اس سے بدل کر کچھ اور ہو جائیں۔ اگر آدمی ہیں تو فرشتہ بن جائیں ۔ اگر فرشتہ بن گئے تو پھر انسان نہ رہے؛ تو رنج و راحت جو آدمی کو ہوتے ہیں ، اس سے محروم رہے۔ ہم کو اس سے حاصل کیا ہوا ؟ خود اپنے نقیض بن گئے ، خود اپنے تئیں آپ روکنے لگے ——— دکھ درد سے چھٹکارا ، اس زندگی کی آفات سے خلاص ہونا ، جو انسان اپنے تئیں ہلاک کرنے سے چاہتے ہیں ، وہ کسی طرح فائدہ نہیں اٹھاتے ۔ اگر آدمی جنگ سے بچے اور صلح سے متمتع نہ ہو اور مصیبت سے پیچھا چھٹائے اور راحت کا مزہ نہ اٹھائے ، اس کو کچھ فائدہ نہیں حاصل ہوتا ۔

ان دو رایوں میں جو اوپر بیان ہوئیں ، بڑے بڑے مباحثے ہوتے ہیں ۔ بعض نے 'حکَم'[1] بن کر یہ قرار دیا ہے کہ ضرور بعض حالات میں اپنے تئیں آپ مار ڈالنا اچھا ہے ۔ مگر جو لوگ اکثر خود کشی کرتے ہیں ، ان کے اسباب معقول نہیں ہوتے ۔ اور وہ ان اسباب کی ، جو مانع اس کے ہوتے ہیں ، کچھ وقعت نہیں کرتے ۔ اس لیے اُن اسباب کی تجدید ہونی چاہیے کہ وہ بتلائیں کہ کہاں تک خود کشی مباح سمجھی جائے ۔

بعض طبائع ایسی وہمی اور بے حس ہوتی ہیں کہ وہ افرادِ انسانی کو نہیں بلکہ اقوام کو خود کشی پر آمادہ کر دیتی ہیں ۔ دنیا میں کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے کہ جس کے سبب سے مرگ جوئی نیک خوئی

۱۔ حَکَم : دو شخصوں کے جھگڑے میں نیک و بد کی تمیز کر کے حکم دینے والا ۔ ثالث ۔ (نور اللغات)

سمجھی جائے۔ اس واسطے زمانہ ایسا انقلاب پیدا کرنے والا ہے کہ بُری حالت میں سے اچھی حالت ہو جانی کچھ مشکل نہیں ہوتی۔ جواں مرد، خواہ اُن پر ایسی ہی سخت مصیبت و آفت آئے، مایوس نہیں ہوتے۔ میدانِ جنگ میں شکست پر شکست پاتے ہیں مگر فتح کی امید کبھی نہیں منقطع کرتے اور کبھی خود کشی کی پاجیانہ موت کو اختیار نہیں کرتے۔ مرنا بھی چاہتے ہیں تو اس طرح کہ اپنے ملک اور قوم کی عزت ہو۔ مثل مشہور ہے کہ "جب تک سانس ہے، آس ہے"۔ جب تک جسم میں جان ہے، ہزاروں امیدیں ہو سکتی ہیں۔ ہزاروں ہرن کتّوں کے دانتوں سے چُھوٹ کر نکل جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض زخمی آدمیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے زخم لگانے والوں سے زیادہ دنوں جیتے ہیں۔ بہت سے آدمی اَدبار کے گڑھے میں پڑے تھے، وہ اقبال مندوں سے بڑھ گئے۔ اس لیے کسی مصیبت سے گھبرا کر اپنے تئیں مار ڈالنا نادانی و حماقت ہے۔

بعض حکیموں کی رائے ہے کہ بعض امراض کی شدّت میں اپنے تئیں مار ڈالنا اچھا ہے، جیسے پتھری کی بیماری میں جب پیشاب بند ہو جائے، جزام، کوڑھ کی بیماریوں میں۔ لڑائیوں میں خود کشی ہزاروں طرح سے ہوتی ہے۔ عورتیں اپنی عصمت کی پردہ دری کے خوف سے اپنے تئیں ہلاک کرتی ہیں۔ ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر ان کی پردہ دری ہوئی بھی تو اس میں ان کا کیا گناہ ہے۔ خدا سے وہ پناہ مانگیں اور توکل پر اپنے تئیں چھوڑ دیں۔ بعض آدمی اس غیرت میں اپنے تئیں ہلاک کرتے ہیں کہ ان کو دشمنوں کا رحم کرنا موت سے زیادہ برا معلوم ہوتا ہے۔

بعض قوموں نے ان لڑائیوں میں خود کشی کے دستور اور قوانین بھی مقرر کر رکھے ہیں۔ جیسے کہ راجپوتوں کے ہاں دستور ہے کہ

جب دشمنوں کے ہاتھ سے تنگ ہوتے ہیں تو اول بال بچوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرتے ہیں۔ مال و دولت، نقد و جنس کو جلا کر خاک کرتے ہیں۔ ہاتھی گھوڑوں کو اور مویشی کو اندھا کر دیتے ہیں۔ بعد اس کے آپس میں گلے مل، تلواریں ہاتھوں میں لے دشمن پر جا گرتے ہیں، پھر جو ہونی ہو سو ہو۔ بعض آدمی خود کشی مذہب کے سبب سے کرتے ہیں، جیسے ہندوؤں کے ہاں۔ وہ بُتوں پر سر کاٹ کر چڑھا دینے کو، ستی[1] ہونے کو، جگن ناتھ جی کے رتھ کے نیچے دب کر مر جانے کو بیکنٹھ باشی[2] ہونا جانتے ہیں۔ بہت سے بڈھے، بیمار، ضعیف زندہ گنگا میں لہری بُلوا[3] کے ڈوبتے ہیں۔ غرض بعض خدا پرست خللِ دماغ سے سمجھتے ہیں کہ ہم بہتر حالت میں بہشت کے اندر مزے سے ہو جائیں گے۔ اس دنیا کے انتقال سے خدا سے وصال ہوگا۔ چتا میں بیٹھ کر جل جاتے ہیں، زندہ دفن ہو جاتے ہیں۔ اکثر گورنمنٹ اِس خودکشی کے باب میں مداخلت کرتی ہے۔

بعض گورنمنٹ کا یہ قانون تھا کہ جو شخص خود کشی چاہے، وہ ایک اپنی درخواست مع دلائل خود کشی کے گورنمنٹ کے روبرو پیش کرے۔ اگر گورنمنٹ اس درخواست کو منظور کرتی تو زہر بھی اپنے پاس سے دیتی جو خاص اِسی کام کے لیے بنایا جاتا تھا، جسے پی کر اپنے پیمانۂ عمر کو وہ لبریز کرتا تھا۔ مگر اب تمام گورنمنٹیں

۱۔ ستی: ہندوؤں کی ایک قدیم رسم جس کے مطابق شوہر کے مرنے کے بعد اس کی بیوی کو زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ شوہر کے مرنے پر عورت کو بھی آگ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ ہندوؤں میں یہ رسم مقدس سمجھی جاتی تھی۔

۲۔ بیکنٹھ باشی: جنتی، بہشت میں جانے والا۔

۳۔ ہری بُلوا کے: یعنی ہری کرشن کا نام لے کر جو ہندوؤں کا دیوتا ہے۔

خود کشی کو جرم سمجھتی ہیں -

برٹش گورنمنٹ جب سے ہندوستان میں آئی تو مذہب اور رسم کے موافق جو خود کشیاں کثرت سے ہوا کرتی تھیں ، ان کا انسداد خوب ہو گیا - اب فقط یہ اسباب رہ گئے : ذلّت ، غیرت ، غصّہ ، تکلیف - ان کے سبب سے ہندوستان میں بہت خود کشیاں ہوتی ہیں - خصوصاً عورتیں کنووں میں ڈوب کر بہت مرتی ہیں - ساس سے لڑ کر یا سوکن کے رشک سے وہ خود کشی کرتی ہیں - مگر یہ زیادہ تر رواج ہندوؤں کے ہاں ہے - دنیا میں مسلمانوں ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ خود کشی نہیں کرتے - ہزاروں انگریز مجسٹریٹ اور جج ہندوستان سے انگلستان چلے گئے مگر ان کے سامنے کسی مسلمان کی خودکشی کا مقدمہ نہیں پیش ہوا -

اس تمام بیان سے غرض یہ ہے کہ جو ابلہ فریب دلائل خود کشی کے لیے بیان کی جاتی ہیں کہ بری طرح جینے سے مرنا اچھا ہے ، یا دشمنوں کے ہاتھ سے مرنے سے یا ذلیل ہونے سے خود کشی بہتر ہے ، امراض کے مصائبِ جسمانی اور آلامِ روحانی کے اٹھانے سے رشتۂ حیات منقطع کرنا بہتر ہے ، یہ سب نادانی اور جہالت کے دلائل ہیں - وہی انسان جواں مرد ہیں کہ جو ہر مصیبت سے مقابلہ کرتے ہیں اور اپنے ثبات و استقلال و ہمّت میں کبھی لغزش نہیں کرتے - جس وقت ان کی اجل خدا کی طرف سے آتی ہے ، اس وقت مرتے ہیں -

۷۶ - اپنے تئیں پہچاننا اور اپنی قدر جاننا

انسان کو بڑی احتیاط اور ہوشیاری اپنی معرفتِ نفس اور قدر شناسی میں درکار ہے - اس کو اپنے سچے ایمان سے بغیر کسی تعصّب و طرفداری کے خبردار ہونا چاہیے کہ اس کا سچا اصلی حال برا بھلا کیا

ہے ۔ اگر وہ اپنے تئیں کامل ، دانا اور پارسا جانتا ہے تو وہ اپنی کسی مطلب برآری کے لیے خودستائی کرے گا ۔ انسان کا نفس جیسا حقیقت میں ہو ، اس سے کمتر بیان کرنا حماقت ہے ۔

ارسطو کا قول ہے کہ اپنی قدر سے کم قیمت نقد لے لینا نامردی اور بزدلی میں داخل ہے ۔ نیکی کبھی اپنی امداد جھوٹ سے نہیں چاہتی ۔ سچ میں کوئی بات غلط نہیں ہوتی ۔ جب نفس کا حال بیان کرو تو اصلی ۔ یہ لن ترانیاں مارنی ، تعلّی کی لینی فقط غرور و عُجب سے ہی نہیں پیدا ہوتیں بلکہ وہ زیادہ تر حماقت و سفاہت سے پیدا ہوتی ہیں ۔ اس برائی سے ایسے افعال سرزد ہوتے ہیں کہ آدمی اپنی اصلی باتوں سے زیادہ اندازے سے خوش ہوتا ہے اور اپنے نفس سے زیادہ محبت رکھتا ہے ۔ جو لوگ منع کرتے ہیں کہ انسان کو اپنا ذکر نہیں کرنا چاہیے ، وہ حقیقت میں یہ منع کرتے ہیں کہ اپنے نفس کے حال پر خیال کرنا نہیں چاہیے ۔ ہم کو ہمیشہ ان کے خلاف کام کرنا لازم ہے ۔ اپنے نفس پر توجہ و غور کرنا تعلّی و تشخّص کے مرض کا معالجہ ہے جس سے بہتر کوئی اور علاج نہیں ۔ غرور انسان کے خیال میں رہتا ہے ، اس میں زبان کو بہت کم دخل ہے ۔ جن لوگوں کی یہ رائے ہے کہ اپنے نفس پر زیادہ خیال کرنا اپنے سے زیادہ خوش ہونا ہے ، اور اپنے نفس سے زیادہ باتیں کرنی اپنے سے زیادہ محبت کرنی ہے ، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ افراط اُن لوگوں میں پیدا ہوتی ہے جو اپنے ظاہری معاملات اور مقدمات پر توجہ و خیال کرتے ہیں ، نہ باطن پر ۔ وہ لوگ اپنے نفس پر متوجہ ہونے کو شیخ چلّی کی طرح ہوا میں قلعے بنانا جانتے ہیں ۔ وہ اپنے نفس کو اپنے سے غیر و بیگانہ سمجھتے ہیں ۔ اگر کسی شخص کو اپنے نفس پر خیال کرنے سے علم کے غرور کا جوش اس سبب سے آٹھے کہ اس سے نیچے بہت کم علم

موجود ہیں تو اس کو پہلے زمانے پر خیال کرنا چاہیے کہ کیسے کیسے عالم ، صاحبِ کمال اس سے اوپر گزرے ہیں کہ جن کی جوتیوں کے پاس بیٹھنے کی بھی لیاقت اس میں نہیں ہے - اگر کسی کو اپنی شجاعت کا گھمنڈ پیدا ہو تو وہ بڑے بڑے جواں مردوں کے کارنامے دیکھے اور سمجھ لے کہ ان کے آگے میں کیسا پست ہوں - کسی خاص صفت اور ہنر کے سبب سے انسان کو پھولنا اور مغرور ہونا نہیں چاہیے ، اس لیے کہ اس کے دوسرے پلڑے میں عیب اور نقصان اتنے چڑھے ہوئے ہیں کہ اس کے اوصاف ان کا پاسنگ بھی نہیں -

سقراط اپنے خدا کا حکم یہ بتاتا تھا کہ تو اپنے تئیں پہچان - اس حکم کی بجا آوری میں اس نے اپنی ساری عمر بسر کی - زیادہ تر اپنا حال بیان کرتا اور اپنے شاگردوں کو بھی نصیحت کرتا کہ تم کتابوں کی باتیں نہ بیان کیا کرو بلکہ اپنے نفس کی اصلی باتوں اور حرکات کو بیان کیا کرو - غرض آخر کو سقراط نے اپنے تئیں یہ پہچانا کہ میں کچھ نہیں ہوں - پس یہی ایک بات اس کی ایسی تھی کہ لوگوں نے اس کو ولی اللہ مانا - پس جو شخص اپنے نفس کو سقراط کی طرح پہچانے ، وہ مردانہ وار اس کو بیان کرے - جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان کے نفس کی نیکیاں خالص نہیں ہوتیں ، ان میں بھی شرارت ایسی ہوتی ہے کہ قابلِ توبہ ہوتی ہے ، اس لیے کہ جب انسان ان کو بیان کرے گا تو اپنے اوپر الزام ہمیشہ لگایا کرے گا یا تعلّی و تشخّص کیا کرے گا جو انسان کے نفس کے بیان سے جدا نہیں ہو سکتے - وہ ایک چھوٹی خطا سے بچنے کے لیے بڑی خطائیں کرے گا - اس لیے بہتر ہے کہ انسان اپنے نفس کا ذکر نہ کرے - یہ کہنا اس کا ایسا ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ بچے کی ناک صاف کرنے کی جگہ ناک کو اڑا دینا چاہیے کہ پھر پاک صاف

کرنے کا جھگڑا نہ رہے۔

۷۷۔ افعالِ انسانی کا متلوّن ہونا

جو دانش مند افعالِ انسانی کا مشاہدہ اور اعمالِ بشری کا تجربہ کرتے ہیں، ان کو یہ امر تحقیق ہو گیا ہے کہ اکثر انسان اپنے کاموں میں متلوّن ہونے میں مستقل نہیں ہوتے۔ گرگٹ کے سے رنگ بدلتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ، کیونکہ گرگٹ اپنا رنگ سفید نہیں بنا سکتا۔ آدمی سے ایسی حرکاتِ متناقض سرزد ہوتی ہیں کہ اس سے آدمی کے تمام کاموں میں مناسبت و مطابقت کا دکھا دینا اور اس کی خصلت و عادت پر کسی حکمِ قطعی کا اپنی رائے سے لگا دینا نہایت دشوار ہو گیا ہے۔ ایک ہی آدمی کے کاموں میں ایسا تناقض پایا جاتا ہے کہ یہ نا ممکن سا معلوم ہوتا ہے کہ اسی سے وہ سب کام سرزد ہوئے ہوں۔

وہی ایک شخص جو عہدِ شباب میں لومڑی کی طرح فریب دے کر کام کرتا ہے، جوانی میں شیر کی طرح دلیر ہو کر مہمات کو سرانجام دیتا ہے، بڑھاپے میں کتّا بن جاتا ہے۔ وہی تیمور[1] جس نے ہزاروں بندگانِ خدا کا خون بہایا، اسی نے یہ کہا کہ جب میرے پاؤں تلے چیونٹی آتی ہے تو دل دُکھنے لگتا ہے۔ وہی نیرو جو ستمِ مجسّم تھا، جب ایک شخص کے قتل کا فتویٰ دستخط کے لیے اس کے سامنے پیش ہوا تو آہِ سرد بھر کر کہنے لگا کہ مجھے لکھنا نہیں آتا۔ دل میں کیا انقلاب ہوا ہے کہ جس نے لاکھوں آدمیوں کا خون اپنی گردن پر لیا ہو، وہ ایک شخص کے قتل کے فتوے پر دستخط

۱۔ تیمور: (۱۳۳۶–۱۴۰۵) مشہور منگول فاتح۔

کے لیے قلم ہاتھ میں نہ لے اور کہے کہ مجھے لکھنا نہیں آتا - ہر شخص اپنی ذات سے اور اپنے تجربے اور مشاہدے سے اِتنی مثالیں بہم پہنچا سکتا ہے جس سے اُس کو یہ یقین ہو جائے گا کہ متلوّن اور بے استقلال ہونا انسان کی طبیعت کا ایسا ظاہری عیب ہے کہ جس میں سب مشترک ہیں اور سارے انسان تھوڑے بہت مبتلا ہیں - چنانچہ ایک عقل مند کا مقولہ ہے کہ وہ صلاح و مشورہ ہی برا ہے جس میں تغیّر و تلوّن کو دخل نہ ہو -

یہ امر کسی قدر معقول ہے کہ آدمی کے افعال اور اعمال کا طریقہ ، جو اکثر یہ ہو ، اُس پر اچھے برے ہونے کا حکم لگایا جائے ، مگر اس کے ساتھ یہ امر بھی خیال میں رہے کہ متلوّن اور غیر مستقل ہونا انسان کا مقتضائے طبیعت ہے - مگر بعض اہل الرائے اور دانش مند حقیقت شناس اس راہ سے کچھ پھر جاتے ہیں - وہ آدمی کی تمام وضع ، طریقہ و طرح کو دیکھ کر ایک مستقل اور مستحکم حکم اس کے اخلاق اور عادات کی نسبت اپنی رائے سے صادر کرتے ہیں اور اُس کے تمام کاموں کو اِس اپنے حکم کے ساتھ مطابق کرتے ہیں اور جو کام ان کے حکم کے ساتھ مطابق کسی طرح نہیں ہو سکتے تو وہ ان پر ریاکاری اور مکاری کا حکم لگا دیتے ہیں - مثلاً عالم گیر[1] پر ان کی رائے نے یہ حکم لگایا کہ وہ متعصّب تھا - اب جو کام اس کے ایسے ہیں کہ جس سے اس کی بے تعصّبی پائی جاتی ہے تو وہ اس کو ریاکاری اور مکاری سے منسوب کریں گے - یہ نہیں خیال کریں گے کہ متلوّن

۱- عالم گیر : (۱۶۱۸—۱۷۰۷) شاہجہان بادشاہ کا بیٹا - اس کی بڑی فتوحات میں فتح دکن سرِ فہرست ہے - گولکنڈا اور بیجاپور پر بھی اس نے قبضہ کیا - اس کے عہد میں اہلِ علم کی بہت قدردانی ہوئی -

اور بے استقلال ہونا انسان کی طبیعت میں داخل ہے۔ ظالم سے بعض عدل کے اور عادل سے بعض ظلم کے کام ہوتے ہیں۔

انسان کی کسی نیکی کا یقین کرنا ایسا دشوار نہیں ہے جیسا کہ مستقل اور ثابت قدم ہونے کا۔ اس کے برخلاف متلوّن اور غیر مستقل ہونے کا یقین کرنا ایسا آسان ہے جیسا کہ کسی بدی کا۔ جو شخص کہ کسی آدمی کے ذرا ذرا سے کاموں کو بالتفصیل دیکھتا ہے، وہ اس کی نسبت صحیح و سچی رائے قائم کر سکتا ہے۔ عقل و دانش کا اصولِ اعظم یہ ہے کہ آدمی کا ثابت قدم اور مستقل ہونا ایسا مشکل ہے کہ دنیا کی تاریخ میں بہت ہی تھوڑے جواں مرد ایسے نکلیں گے کہ اُنھوں نے جو راہ اور روش اور رسم و طریق اپنے لیے اختیار کیے، اس سے کبھی منہ نہیں موڑا، خواہ کیسے ہی وسوسے اور خطرے اور اوہام ہوئے۔ ایک عاقل حکیم نے کیا زندگی کے کُل طریقوں کو اِن مختصر الفاظ میں ایک قاعدے کے اندر بیان کیا ہے کہ: انسان ایک چیز کا اور اُسی ایک چیز کا ہمیشہ ارادہ کرے گا یا نہ کرے گا۔ اب اگر یہ ارادہ نیک ہے تو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ایسا ارادہ ہمیشہ مستقل ہو سکتا ہے، لیکن اگر ارادہ نیک نہیں ہے تو اس میں استقلال کبھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ برائی ہمیشہ بے قاعدہ اور بغیر اندازۂ معیّنہ کے ہوتی ہے۔ اس میں استقلال نہیں ہو سکتا۔

ایک حکیم کا قول ہے کہ صلاح مشورہ اور سوچ بچار ہی ہر نیک کام کا آغاز ہے، کمالِ استقلال اس کا انجام ہے۔ اگر ہم اپنی عقل سے کوئی خاص ترتیب اور انتظام اپنے طریقۂ زندگی کے لیے متعیّن کریں تو ہم کو عمدہ طریقے پر قائم ہونا چاہیے۔ مگر اس کا خیال کوئی نہیں کرتا ہے کہ جس چیز کی طرف انسان آج رغبت کرتا ہے، کل اس سے نفرت رکھتا ہے۔ جس چیز کو آج کھوتا ہے، کل اس کی جستجو

کرتا ہے - اس کی ساری زندگی متناقض کاموں سے بھری ہوئی ہے - کبھی وہ ڈانواں ڈول اِدھر کا آدھر پڑا پھرتا ہے، کبھی اوپر اڑتا ہے، کبھی نیچے گرتا ہے، اس کے حال کو ثبات و استقلال نہیں ہے -

ہماری زندگی کا طریقۂ معمولی یہ ہے کہ موقعِ وقت کی ہوا، خواہش ہائے نفسانی کے میلان کی پیروی میں جس طرف دائیں بائیں اوپر نیچے چاہتی ہے، آڑاتی ہے - جب تک ہمارے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ کیا چیز ہم کو حاصل کرنی چاہیے، ہم اُس چیز پر غور و خوض نہیں کرتے - جب یہ خیال آتا ہے تو ہم ایسے بدلتے ہیں جیسے کہ کوئی چھوٹا جانور اپنے رنگ بدلتا ہے کہ جس چیز پر اسے رکھو، اُسی کا رنگ اپنے میں دکھلاتا ہے - ابھی ہم نے جو بات دل کے سامنے پیش کی تھی، اُس سے رخ پھیر لیتے ہیں اور پھر اُسی طرف رجوع کرتے ہیں - غرض ہم لٹّو کی طرح ادھر اُدھر پھرتے ہیں - لٹّو کو ڈور اُس کی جس طرف پھراتی ہے، پھرتا ہے - ہم کو میلانِ طبع جدھر پھراتا ہے، اُدھر پھرتے ہیں - غرض ہم خود نہیں چلتے ہیں بلکہ چلائے جاتے ہیں - جیسے کہ دریا میں پانی اپنے زور کے موافق چیزوں کو اپنے اوپر تیز و سست چلاتا ہے، اِسی طرح ہمیشہ ہم کو ہماری خواہش ہائے نفسانی کا میلان اپنے زور کے موافق متحرّک کرتا ہے - ہم ہمیشہ کچھ نئی چیزیں مانگتے ہیں، سر سے بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں، مگر یہ نہیں جانتے ہیں کہ جو چیزیں ہم مانگتے ہیں، وہ کیسے بے ٹھور ٹھکانے نامعلوم ہیں -

انسان کے دلوں کا حال بھی دنوں کا سا ہے کہ ہمیشہ ان میں تلوّن ہوتا ہے - انسان کا مزاج بھی زمانے کے ساتھ چلتا ہے - وہ میلانِ خاطر اس کو ہمیشہ اِدھر آدھر جھلاتا پھرتا ہے، کہیں ثابت قدم نہیں ہونے دیتا - نہ وہ کسی چیز کو آزادانہ چاہتا ہے، نہ

کلیۃً و مطلقاً و استقلالاً - ہاں جن آدمیوں نے اپنے ذہن میں اپنے اوضاع و اطوار کے طریقے اور اخلاق کے قاعدے و قانون خوب استحکام کے ساتھ منضبط کیے ہیں ، ساری عمر میں ان کے کام ہموار اور یکساں نظر آتے ہیں ، اور ان کے کل کاموں میں ایک کام کو دوسرے کام کے ساتھ ہمیشہ ایک مناسبت اور نسبت دیکھنے میں آتی ہے - مگر یہ بھی مشکل ہے کہ سارے کام وہ لَیئوں[1] کے ساتھ مقرر کریں کہ جو سُروں میں ہوتے ہیں کہ کبھی ان میں بےسُری آواز نہیں نکلتی -

بعض آدمی ایسے دنیا میں گزرے ہیں کہ جنھوں نے اپنی بزمِ عیش و طرب کے لیے وہ قاعدے مقرر کیے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو ایک دن سے زیادہ نہیں جانتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ آج ہی جو کچھ گلچھرّے اُڑانے ہوں ، اُڑا لیں ، کل کی خبر خدا جانے - مگر وہی جب مکان بناتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کبھی مرنے کے نہیں - یہاں بھی تلوّن موجود ہے - انسان میں تلوّن مزاجی کے اسباب طرح طرح سے جمع ہو جاتے ہیں -

ایک بادشاہ اپنے ایک نوکر کو بہت عزیز رکھتا تھا - جواں مرد ، نیک نہاد جانتا تھا - وہ ایک مرضِ مُزمنہ میں مبتلا تھا - بادشاہ نے حکیم پر تاکید کرا کے اس کا علاج کرایا - جب وہ اچھا ہوگیا تو پھر خطرناک جنگ اور ہولناک کام سے دل چُرانے لگا - بادشاہ نے کہا کہ اب تمھاری وہ دلیری اور عالی ہمتی کہاں گئی ؟ تو اس نے عرض کیا کہ جہاں پناہ ! پہلے میں ایک ایسے مرض میں مبتلا تھا کہ مرنے کو جینے سے اچھا جانتا تھا - جان جوکھوں کے کام کرنے سے خوش ہوتا تھا - اب اچھا ہوگیا ہوں تو خطرناک کاموں

۱- لَیئوں : لَے کی جمع -

کے کرنے سے ڈر لگتا ہے۔ اسی طرح جنگ میں میدان کے اندر ایک سپاہی کے دشمن نے گولی ماری، وہ غصّے اور انتقام کے جوش میں ایسا بھرا کہ دشمن پر پل کر گیا اور بڑی جواں مردی سے اپنا بدلا نکالا۔ افسرِ سپاہ نے اُس کی اِس ہمّت و جرأت پر تحسین و آفرین کی۔ مگر جب افسرِ سپاہ اس کو کسی مہم پر بھیجنے لگا اور ایسی باتیں سمجھائیں کہ انھیں سن کر بڑا نامرد بھی جواں مرد بن جاتا، مگر اُس پر کچھ اثر نہ ہوا اور صاف انکار کیا اور کہا کہ کسی ایسے غریب آدمی کو مہم پر بھیجو کہ جس کی تھیلی چوری ہوگئی ہو۔

ہم بعض شخصوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ کل شجاعت کے کام کر رہے تھے، آج نامردی کے کام ان سے سرزد ہو رہے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جوہرِ شجاعت ان کی ذات میں نہیں ہوتا۔ بعض صورتیں ایسی پیش آتی ہیں کہ ان کو شجاع بنا دیتی ہیں۔ جب وہ حالتیں بدل جاتی ہیں تو ان کی شجاعت بھی 'جبن'[1] سے بدل جاتی ہے؛ مثلاً انتقام کے جوش میں غصّے میں بھر آئے یا شراب کے نشے میں مست ہوگئے یا جنگی باجوں کی آواز نے دل پر اثر کیا۔ ان سببوں سے تھوڑی دیر کے لیے ان میں شجاعت پیدا ہوگئی۔ پھر جب یہ اسباب جاتے رہے تو انھوں نے بھی اپنی اصلی حالت پر معاودت[2] کی۔

بعض حکیموں نے جب یہ دیکھا کہ انسان سے ایسے افعالِ متضاد اور اعمالِ متناقض سرزد ہوتے ہیں کہ ان کا ایک مخزن سے سرزد ہونا خیال میں نہیں آتا تو انھوں نے انسان کے واسطے دو روحیں مقرر کیں جو جدا جدا اپنی قدرت اور قوّت رکھتی ہیں۔ ایک خیر کی طرف لے جاتی ہے، دوسری شر کی طرف۔ اگر انسان اپنے دل کی کیفیت و حالت

۱۔ 'جبن = بزدلی۔ ۲۔ معاودت = لوٹ آنا، واپسی۔

کو خوب غور اور خوض کی نگاہ سے دیکھے تو اس کو یقیناً یہ امر معلوم ہوگا کہ وہ ایک حالت میں دو دفعہ نہیں ہوتا۔ اس کے دل کے کونے متناقض اور متضاد اشیا سے آباد ہیں۔ جھوٹ، سچ۔ علم، جہالت۔ سخاوت، بُخل۔ کفایت، اِسراف۔ رنج، خوشی۔ ذہانت، غباوت۔ عصمت، شہوت۔ خموشی، ہرزہ گوئی۔ محبت، عداوت۔ غیرت، بے حیائی یہ سب چیزیں کم و بیش اس کے ارادے اور مرضی کے موافق ہوتی رہتی ہیں، اور ناموافق چیزوں کا دور دل میں لگاتار لگا رہتا ہے۔

انسان میں کوئی فضیلت و رذیلت نہیں سمجھنی چاہیے جب تک اس میں مذاولت[1] نہ ہو۔ ایک دفعہ شجاعت کے کام کرنے سے کوئی شخص شجاع نہیں ہوتا۔ شجاع وہ ہے جس کی ذات کے اندر ہر حالت میں شجاعت پائی جائے۔ کُل حادثات میں، جو اس کو پیش آئیں، اپنے اِس ملکے کو دکھائے۔ جیسا وہ خلوت میں دلیر ہو ویسا جلوت میں، جیسا فرصت[2] میں اول ہے ویسا ہی لڑائی میں۔ یہ نہیں کہ گھر میں کچھ اَور ہو اور میدانِ جنگ میں کچھ اَور۔ شجاع بستر پر بیماری کا ایسا ہی بہادری سے مقابلہ کرتا ہے اور موت سے نڈر رہتا ہے جیسا کہ حملۂ جنگ میں۔ اگر ایک شخص دشمن کی دیوارِ شکستہ کے شگاف میں دلیرانہ گھس جاتا ہے مگر عدالت میں ایک مقدمے کے ہارنے پر یا بچے کے مرنے پر عورتوں کی طرح چیخیں مار مار کر روتا ہے اور رنج و غم کرتا ہے، یا نامرد ہے مگر افلاس کی مصیبتوں کو استقلال سے سہتا ہے، یا نائی کے آسترے سے ڈرتا ہے مگر دشمن کی تلواروں پر بے خوف و خطر جا پڑتا ہے، تو ہم ایسی

۱- مُزاولت = کسی کام کو بار بار کرنا۔ ۲- اصل: فہرست۔

صورتوں میں کام کی تعریف کریں گے لیکن اُس آدمی کو شجاع نہیں کہیں گے - جو انسان حقیقت میں نیک ہوتا ہے وہ نیکی کو نیکی کی خاطر سے کرتا ہے - جو شخص اپنی اغراض پر نیکی کی نقابِ مستعار لے کر ڈالتا ہے ، خود نیکی اپنی نقاب اُتار لیتی ہے اور اس کی اغراض کو دکھا دیتی ہے - نیکی کا رنگ تو وہ گہرا اور پکا ہے کہ جس دل پر جم گیا وہ پھر جاتا نہیں ، دل ہی کے ساتھ جاتا ہے -

پس جب کسی انسان کی نسبت اپنی صحیح اور سچی رائے قائم کرنی چاہیں تو بہت تحقیق و تدقیق کی نظر سے ہم اس کی زندگی کے افعال کا سراغ لگائیں ، اور اگر ہم اس میں ثبات و استقلال کو مضبوط بِنا پر قائم نہ دیکھیں بلکہ اس میں تلوّن پائیں کہ وہ مختلف واقعات کے پیش آنے سے اپنے طریقے کو بدلتا ہے اور اس میں سست یا تیز قدم اٹھاتا ہے تو اُس کو یہ جاننا چاہیے کہ وہ ہوا کے آگے چلتا ہے ، اُسی کے ساتھ رخ بدلتا ہے ، زمانہ ساز ہے ، اصلی صفات سے محروم ہے - یہ انسان کی خوبی بڑی قدر و منزلت کے لائق ہے کہ وہ سارے کاموں میں یہ معلوم ہو کہ وہ ایک ہی شخص ہے -

حکمائے قدیم میں سے ایک حکیم کا قول ہے کہ یہ بات تعجب کی نہیں ہے کہ بخت و اتفاق ہم پر زیادہ تر حکمرانی کرتے ہیں - یہ بھی اتفاق ہے کہ ہم جیتے ہیں - جب تک انسان اپنی زندگی کا مآلِ کار نہ متعیّن کرے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا ، وہ اپنے لیے کوئی خاص کام نہیں تجویز کر سکتا - جب تک آدمی کے ذہن میں کل کی صورت خیال میں نہ ہو ، اس کے اجزا کی ترتیب کیسے دے سکتا ہے - اگر تصویر کھینچنی نہ آتی ہو تو رنگ کس کام کے ہیں - تیر انداز کو یہ نہ معلوم ہو کہ میں کہاں نشانہ لگاؤں گا تو ترکش سے تیر

نکالنا اور کمان کو زہ[1] پر چڑھانا بیکار ہے - جب تک کسی معاملے میں مآلِ کار نہ متعیّن ہو، صلاح و مشورہ بیکار ہے - جب تک کسی بندرگاہ میں اترنے کا ارادہ مقرّر نہ ہو، ہوا کا رخ دیکھنا کس کام کا ہے - پس جب تک کسی شخص کی زندگی کا مآلِ کار نہ معلوم ہو، اس کے خصائل کی نسبت کوئی رائے نہیں قائم ہو سکتی ہے -

اکثر یوں عادت پڑ گئی ہے کہ انسان کے ظاہری اور خارجی کاموں کو ہم دیکھ کر اپنی رائے قائم کرتے ہیں مگر اس کے باطن کے تجسّس میں سعی نہیں کرتے اور یہ نہیں سوچتے کہ وہ اندر کون سی کمانیاں ہیں کہ جو حرکاتِ ظاہری پیدا کر رہی ہیں - مگر کسی کے باطن میں پیٹھنا[2] اور اس کے ظاہری کاموں کا اصلی سبب جاننا نہایت دشوار اور خطرناک کام ہے - بہت ہی تھوڑے آدمی دنیا میں گزرے ہیں جنھوں نے یہ کام کیا ہو، ورنہ انسان کے ظاہری کاموں پر سب رائے قائم کرتے ہیں -

۷۸ - شراب خواری

شعر

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
ہے ذوق اس جہان کو زیب اختلاف سے[3]

دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ایک ہی چیز کے ہزاروں درخت ہیں اور

۱- اصل : زے -
۲- پیٹھنا = داخل ہونا، گھس جانا -
۳- شیخ محمد ابراہیم ذوق کا یہ شعر، دیوانِ ذوق مطبوعہ مجلس ترقی ادب میں یوں چھپا ہے :

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوق اس جہان کو ہے زیب اختلاف سے

ہر درخت میں لاکھوں پتّے ہیں، مگر نہ دو درخت ایک سے ہیں، نہ دو پتّے۔ اِسی رنگا رنگ اختلاف کا نام دنیا ہے۔ اِسی طرح دنیا میں ہزاروں بُرائیاں ہیں مگر دو اِن میں سے یکساں برابر نہیں ہیں۔ بعض حکیم ان سب کو یکساں جانتے ہیں۔ جو شخص نیکی کی راہِ مستقیم سے سو قدم بے راہ ہو یا دس قدم، دونوں کو گمراہ جانتے ہیں اور اس راہِ گمراہی میں ان کے واسطے خیر نہیں جانتے۔ ان کے نزدیک خواہ کوئی شخص مذہب سے بےادبی کرے یا کوئی چیز چرائے، دونوں یکساں ہیں۔ مگر یہ ان کی ہٹ دھرمی ہے۔ بھلا اوپر کی صورت میں برائیوں کے سبب سے کب آدمی یکساں برابر بد ہو سکتے ہیں۔ غرض حکما کی رائے میں مثل اَور مسائل کے اس میں بھی اختلاف چلا آتا ہے کہ برائیاں سب برابر ہیں یا نہیں۔ گناہوں کے درجوں اور اندازوں کو خلط ملط کرنا اندیشے سے خالی نہیں۔ اگر سب گناہ برابر ہو جائیں تو قاتل، خونخوار، دغا باز، مکار، ظالم، جابر اپنے تئیں بڑے فائدے میں سمجھنے لگیں اور اپنی کانشنس کی خوب خوشامد کریں، اور یہ جانیں کہ ہم بھی ایسے ہی ہیں جیسے کہ کاہل، سست، نفس پرست، ریاضت و عبادت میں سست لوگ ہیں۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ ہر شخص غیروں کے گناہوں کو کبیرہ اور اپنے گناہوں کو صغیرہ جانتا ہے۔

ابتدا سے ان گناہوں کے باب میں معلّم ہمیں درست تعلیم ہی نہیں دیتے۔ سقراط نے لکھا ہے کہ حکمت کا کام ہے کہ وہ نیک و بد میں تمیز کرنے کا ملکہ پیدا کر دے۔ ہم میں سے جو زیادہ اچھا ہے، وہ بھی بد ہے، اس لیے ایسے علم کی بھی ضرورت ہے کہ جو ایک برائی کی دوسری برائی سے تمیز کرنے کی استعداد پیدا کر دے۔ جب تک یہ علم نہ سیکھا جائے، اور سیکھا جائے تو صحیح طور سے،

تب تک نیک و بد ایسے خلط ملط معلوم ہوں گے کہ وہ پہچانے نہیں جائیں گے۔

غرض اِس تمہید سے یہ ہے کہ شراب پینا بُرا ہی نہیں ہے بلکہ سب بُرائیوں میں بد تر ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی بُرائی نہیں ہے۔ اس لیے اس کو اُمّ الخبائث[۱] کہتے ہیں۔ اَور برائیوں کے کرنے میں بڑا حصہ روحانی ہوتا ہے مگر اس میں صرف جسمانی حصہ ہے، یعنی اَور بُرائیوں میں علم، محنت، دلیری، جرأت، ہمّت، ہوشیاری، تیزی، چستی، چالاکی کی ضرورت ہوتی ہے، شراب پینے میں کسی کی ضرورت نہیں۔ اس کے واسطے کسی عقل کی ضرورت نہیں۔ اَور برائیاں عقل و فہم کو تحلیل کرتی ہیں مگر شراب پینا دل کو بالکل زائل اور فنا کر دیتا ہے اور جسم کو نکمّا بناتا ہے۔ جب شراب کا اثر اپنی پوری طاقت ہم میں دکھاتا ہے تو تمام اعضا میں گرانی آجاتی ہے، وہ ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ ٹانگیں لڑکھڑاتی ہیں، زبان بہکتی ہے، دل میں ہَول اٹھتے ہیں، آنکھیں اُبل آتی ہیں، ہچکیاں آتی ہیں، جھگڑے کھڑے ہوتے ہیں۔ سب سے بدتر حالت انسان کی یہ ہے کہ اس کو اپنے آپے کی خبر نہ رہے اور وہ اپنے تئیں سنبھال نہ سکے۔ جیسے پتیلی کی تہہ میں جس چیز کو ڈال کر جوش دو، اُس کا اُبال اس کے اوپر اُٹھتا ہے، اسی طرح شراب کے نشے میں جو راز کہ دل کے اندر مخفی ہوتے ہیں، وہ زبان پر آتے ہیں۔ جس کے دل کا حال دریافت کرنا چاہو، اس کو شراب پلا کے معلوم کر لو۔

سلاطین اور اُمرا و وزرا کی بہت سی مثالیں ایسی تاریخ میں لکھی ہیں کہ انھوں نے خود شراب پی کر اپنے اسرار کو برملا کہہ دیا کہ جس سے ان کے سر پر آفتیں آ گئیں۔ یا اَوروں کو شراب پلا کر

۱۔ اُم الخبائث = بُرائیوں کی ماں۔

راز کی باتیں معلوم کر لیں۔ متقدّمین حکما مے نوشی کی زیادہ تر مذمّت نہیں کرتے بلکہ بعض تو شراب پینے کو اچھا بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ آدمی کو تازہ و توانا کرتی ہے، مُردہ دل کو بھی زندہ بنا دیتی ہے، اس کے پینے سے بعض آدمی نیک خیال ہو جاتے ہیں، ان کے ذہن اور عقل روشن ہو جاتے ہیں۔

کیخسرو نے اپنے بھائی پر یہ فخر کیا تھا کہ میں تجھ سے زیادہ شراب پیتا ہوں۔ بعض اطبّا اور اقوامِ شائستہ کا قول ہے کہ معدے کے قُویٰ جو ضعیف و مضمحل ہو جاتے ہیں، ان کے از سرِ نو قوی کرنے کے لیے ایک مہینے میں ایک دفعہ شراب کا کثرت سے پینا اچھا ہے۔ یہ ایک تازیانہ اُن کی سستی اور کاہلی کے لیے ہو جاتا ہے۔

ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ مجالسِ مشورہ میں ایرانی شراب پی کر بیٹھتے تھے جس سے ان کی عقل اور ذہن میں تیزی پیدا ہو جاتی تھی۔ یوں تو کوئی برائی دنیا میں نہیں ہے کہ جس کے طرف دار بعض آدمی نہ ہوں، مگر سچ یہ ہے کہ شراب خواری سے زیادہ کوئی بُرائی انسان کے حق میں مُضر نہیں ہے اور اس سے زیادہ کوئی احمقانہ اور ناشائستہ حرکت نہیں ہے؛ گو وہ اَور بُرائیوں کی طرح غیروں کے لیے ایذا اور ضرر رساں نہیں ہے، اور پبلک سوسائٹی میں ہل چل نہیں ڈالتی، خاص اپنی ذات کے لیے بُری ہوتی ہے۔

افلاطون اٹھارہ برس کی عمر تک شراب پینے کو منع کرتا ہے اور چالیس برس کی عمر تک اجازت دیتا ہے اور آگے عمر میں گاہے ماہے۔ کسی شادی اور تہوار کی تقریب میں شراب پینے کو منع نہیں کرتا ہے۔

ایک حکیم شراب کی یہ تعریف کرتا ہے کہ وہ جوان کو حسین اور پیر کو جوان بناتی ہے۔ انسان کی تمام شہواتِ نفسانی کو ایسا نرم کر دیتی ہے جیسے کہ آگ لوہے کو۔ جن مجالس و محافل کا

انتظام ایسا ہو کہ کوئی شخص بیہودہ حرکت نہ کرنے پائے تو ان میں شراب کا دور چلنا بہت ہی نافع اور مفید ہے۔ شراب سے ہر شخص کی طبیعت اور مزاج کا حال معلوم ہوتا ہے۔ وہ گویا معیارِ مرد ہے، کھوٹے کھرے کو فوراً بتلا دیتی ہے۔ اس سے روح میں اعتدال پیدا ہوتا ہے، جسم بیماریوں سے بچتا ہے، وہ لڑائی کی تو جان ہے۔ مگر مجسٹریٹ و جج اور اُن لوگوں کو، جو حقوقِ رعایا کا انفصال کرتے ہیں، یا اَور پیشے کرتے ہیں، دن کو شراب پینی نہیں چاہیے، اور اُس رات کو بھی جس میں وہ حمل رکھوانے کا قصد کرتے ہوں۔

یہ ایک سوال بھی بڑے لطف کا ہے: قدیم زمانے سے چلا آتا ہے کہ شراب میں یہ طاقت بھی ہے یا نہیں کہ اس کا نشہ عقل مند حکیم کی روح کو مغلوب کر دے؟ انسان بھی کیا کیا اپنی شیخی کے لیے اپنی نسبت نیک رائیں لگاتا ہے۔ دانش و حکمت کیا انسان کی فطرت کو بدل دے گی جو اس پر شراب کا اثر نہ ہوگا؟ جاہل ہو یا عاقل ہو، فالج کے اثر سے دونوں ایک طرح بچ سکتے ہیں۔ اسی طرح شراب کے اثر سے دونوں ایک ہی طرح بچ سکتے ہیں اور ایک ہی طرح مبتلا ہو سکتے ہیں۔

بعض آدمی بیماری کی شدّت میں اپنا نام بھول جاتے ہیں۔ بعض کی رائے اور عقل بالکل درہم برہم ہو جاتی ہے۔ غرض حکمت و دانش سے انسان آلام اور عوارضِ[1] جسمانی سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ شراب کے نشے کا جو اثر ہے، وہ سب پر ہوگا، خواہ عاقل حکیم ہو یا جاہل گنوار۔ جیسے کہ زمین کے مختلف خواص کے سبب سے ایک ہی طرح کے بیج طرح طرح سے پھولتے پھلتے ہیں اور مختلف مزے رکھتے ہیں، اسی طرح شراب کا حال ہے کہ انسانوں کے طبائعِ مختلف پر اپنا

۱۔ اصل: آرام اور افزائش۔

اثر طرح طرح سے ظاہر کرتی ہے - کوئی شراب پی کر دیوانہ ، وحشی ، جانور ، درندہ ہو جاتا ہے ، کوئی نہایت نیک بن جاتا ہے ، کسی کو انتقام کا جوش اس سے اُٹھتا ہے ، کسی میں محبت و عشق کی آگ سلگتی ہے - غرض وہ بہت سے رنگ اپنے دکھاتی ہے جس کو تم روزمرہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو یا کانوں سے سنتے ہو -

ہندوستانی جو دائم الخمر[1] رہتے ہیں ، اُن میں بہت کم ایسے ہیں جو پینتالیس برس سے زیادہ جیتے ہیں - اس ملک کے نوجوان رئیس زیادہ تر اس شراب کی بدولت اپنے جامِ عمر کو لبریز کرکے جرعۂ موت پیتے ہیں - خدا اس سے بچائے ، وہ بری بلا ہے - جب منہ کو لگ جاتی ہے تو وہ 'چھوٹتی نہیں - عرب کے ایک شاعر کا قول ہے :

شعر

اترک الخمر و لوکنت فتیاً کیف یسعی فی جنون من عقل

یعنی شراب پینا چھوڑ دے اگر تو جواں مرد ہے - کوئی عقل مند آدمی اس بات کی کوشش نہیں کرتا کہ مَیں مجنون ہو جاؤں -

اہلِ فارس کا قول ہے کہ :

در ہوش چہ خطا دیدی کہ بے ہوش شدی[2]

۷۹- انسان کا اپنی حالت پر غور کرنا

اگر کبھی کچھ اپنے حال پر خیال کریں ، اور وہ وقت کہ ہم غیروں کے افعال کے تجسّس میں اور خارجی چیزوں کے تفحّص میں صرف کرتے ہیں ، اُس کو اپنے حال کے غور و پرداخت میں لگائیں تو معلوم ہوگا کہ ہم کیسے ضعیف و ناتواں ہیں اور پست حالت میں

۱- دائم الخمر : ہمیشہ شراب کے نشے میں بدمست رہنے والا -
۲- یعنی ہوش مندی میں تم نے کیا برائی دیکھی ہے جو بے ہوش ہو گیا ہے -

پڑے ہیں - ایک بڑا بھاری عیب ہم کو اپنا یہ معلوم ہوگا کہ ہمارے خود خیالات اور خواہش ہائے نفسانی ہم کو اس قوت سے محروم کرتے ہیں کہ جو سب سے زیادہ فائدہ مند ہے ، اور مناسب چیز کا ہمارے لیے انتخاب کرتی ہے - حکما میں ہمیشہ سے اس بات پر مناقشہ چلا آتا ہے اور چلا جائے گا کہ انسان کے واسطے نیکیوں میں کون سی نیکی سب سے زیادہ معزز و مکرّم ہے جس کو افسر[1] ، فہرست و سرتاج ان کا بنائیں - نہ کبھی اس کا فیصلہ ہوا ہوگا ، نہ اس پر اب اتفاق ہوگا - جو چیزیں ہم چاہتے ہیں ، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں بہت ہی ضروری چاہنے کے قابل ہیں ، مگر جب یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں تو کچھ اور چیزیں چاہتے ہیں - غرض وہی ایک طلب کی تشنگی چلی جاتی ہے جو کبھی بجھتی نہیں -

جو چیزیں کہ ہمارے علم و قبضہ میں آ جاتی ہیں ، ان پر ہم قناعت نہیں کرتے ، اپنے اطمینانِ قلب کے لیے کافی نہیں سمجھتے - ان کو غیر کافی جان کر ایسی چیزوں کی طلب میں تڑپتے ہیں کہ خود نامعلوم ہیں - جو چیزیں زندگی کی آسودگی کے واسطے ضروری اور لازمی ہیں ، وہ سب حاصل ہیں - بہت سی دولت ، عزت ، شہرت ، اپنی اور اپنی اولاد کی نیک نامی ، یہ سب ہاتھ تلے ہیں مگر دل میں وہی تردد اور فکر چلے جاتے ہیں - گویا دل نے شکایتوں کا جامہ پہن رکھا ہے - تو معلوم ہوا کہ وہ ظرف ہی خراب ہے جس کی خرابی سے یہ سب خارجی چیزیں جمع ہو کر خراب ہو گئیں - ہماری شہواتِ نفسانی غیر مستقل و متلوّن ہوتی ہیں - وہ کسی چیز سے احتظاظ اور التذاذ بخوبی نہیں اٹھاتیں - اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو چیزیں آدمی کے قبضہ و اختیار میں

۱- افسر = تاج یا سرتاج مراد ہے -

ہیں ، وہ خود اچھی نہیں ہیں ، اس لیے وہ اپنا خیال اُن چیزوں کی طلب میں دوڑاتا ہے جن کو نہ جانتا ہے ، نہ سمجھتا ہے - ان کے پانے کی اُمیدوں اور خواہشوں میں ان کی پرستش کرتا ہے اور نہایت تعظیم و تکریم کرتا ہے - کیا یہ قیصر کا مقولہ اچھا ہے کہ اس عیب میں تھوڑے بہت سب مشترک ہیں کہ جو چیزیں مجہول اور نادیدہ ہیں ، ہم ان پر بہت بھروسا رکھتے ہیں اور ان میں بہت ذہن کی رسائی پاتے ہیں -

۸۰- اولاد کا نام رکھنا

سُقراط کا قول ہے کہ باپ کو بڑی احتیاط سے اپنی اولاد کا نام رکھنا چاہیے - یہ اُس حکیم کا کہنا سچ ہے - باپ پر اولاد کا یہ حق ہے کہ وہ اچھے نام رکھے - اگر نامناسب نام رکھ دیا تو عمر بھر اس نام سے شرمندگی اٹھانی پڑے گی -

بعض دفعہ بھلے مانس اپنی اولاد کے نام رذالوں کے سے رکھ دیتے ہیں جس سے اولاد کو عمر بھر ندامت اٹھانی پڑتی ہے - بعض اوقات غریب آدمی اپنی اولاد کے نام امیروں کے سے رکھ لیتے ہیں تو ان کی جگت ہنسائی ہوتی ہے - بعض دفعہ چماریاں عیسائی ہوتی ہیں تو پادری صاحب نام وکٹوریہ اور الزبتھ رکھ دیتے ہیں ، تو اور انگریز سن کر بہت ہنستے ہیں - نام ایسا رکھنا چاہیے کہ وہ آسانی سے یاد رہے ، مشکل سے بھولے ، تلفّظ اس کا آسان ہو ، خاندان اور ذات پر دلالت کرتا ہو -

۸۱- عمر

عمر کا کچھ بھروسا نہیں - کوئی انسان نہیں کہہ سکتا کہ میں اتنے دنوں جیوں گا - نیچر نے انسان کی افزائشِ عمر کے لیے ایک حد

مقرر کر دی ہے اور حکم دے دیا ہے کہ وہ اس سے آگے نہیں بڑھنے پائے گی مگر کمی کی کوئی حد مقرر نہیں - سینکڑوں قانون نیچر کے ایسے ہیں کہ وہ موت کا فتویٰ دے کر مار ڈالتے ہیں - نیچر اگر کسی کو درازیٔ عمر کا پٹّا مہربانی سے لکھ بھی دیتا ہے تو اس کو زندگی کا نبھانا دشوار ہوتا ہے - بیس برس کی عمر میں جو انسان میں جوہر پیدا ہونے والے ہوتے ہیں ، وہ اپنا رنگ دکھانے لگتے ہیں - اگر اس عمر تک کوئی آدمی کا ہنر نہ ظاہر ہو تو پھر آگے اُمید نہیں - جو کانٹا نکلتے (اُگتے) ہی نہ چبھنے لگے تو وہ پھر چبھتا نہیں - ہونہار بِروا کے چکنے چکنے پات - تیس برس کی عمر تک انسان کے عقل و ہوش و حواس ترقی کرتے جاتے ہیں اور چست و درست و چالاک و مستعد رہتے ہیں - یہ آدمی کی نمو کا زمانہ ہے - پھر وقوف کا کچھ زمانہ رہتا ہے ، پھر انحطاط کا وقت آتا ہے ، پھر ترقی موقوف ہوتی ہے -

تاریخ کو دیکھیے تو تیس برس کی عمر کے اندر جتنے آدمیوں نے کارہائے نمایاں کیے ہیں ، اتنے تیس برس سے زیادہ کی عمر والوں نے نہیں کیے - جو لوگ اپنے وقت کو اچھی طرح بسر کرتے ہیں ، ان کا تجربہ اور علم بڑھتا جاتا ہے - مگر قوائے جسمانی اور روحانی کا تنزّل بھی ہوتا جاتا ہے - ان میں مستعدی اور چستی نہیں رہتی - نیچر انسان کے اِنجر پِنجر ڈھیلے کرتا جاتا ہے ، قوّت اور خون کے مد کا جزر ہوتا ہے ، عقل لنگڑانے لگتی ہے ، زبان بہکتی ہے ، دل میں پژمردگی پیدا ہوتی ہے - ابیات[1]

چو تاریخ پنجہ در آمد بہ سال
دگرگونہ شد بر شتابندہ حال

۱- تمام شعر اصل کے مطابق ہیں -

سر از بار سنگی در آید بہ سنگ
جنازہ بہ تنگ آید از راہ تنگ
فروماند دستم ز مے خواستن
گراں گشت پایم ز برخاستن
تنم گونۂ لاجوردی گرفت
گلم سرخی انداخت، زردی گرفت
ھیونِ روندہ ز رہ ماندہ باز
ببالیں گہ آمد سرم را نیاز
ھماں بور چوگانیِ باد پا
بصد زخم چوگاں نہ جنبد ز جا

ہزاروں میں دو چار ایسے ہوتے ہوں گے جو عمرِ طبعی تک پہنچے ہوں گے - پس عمرِطبعی پر پہنچ کر مرنا شاذ اور نادر اور ایک امرِ اتفاق ہے - اس کو اتفاق موت کہنا چاہیے - مگر ہم اس کو کبھی اتفاق مرگ نہیں کہتے ، یہ ہماری غلطی ہے - گورنمنٹ کے سارے کاموں میں عمر کی قید لگی ہوتی ہے؛ مدرسے میں اِس عمر سے کم داخل نہیں ہوں گے ، اِس عمر سے زیادہ کے پڑھائے نہیں جائیں گے ، اِس عمر میں یونیورسٹی کے داخلے کا امتحان نہ ہوگا ، اِس عمر میں سول سروس کا امتحان ہوگا ، اِس عمر سے نوکری کا آغاز ہوگا ، اِس عمر کے بعد نوکری کا خاتمہ ہوگا - عورت مرد کے واسطے عمرِ بلوغ مقرر ہوتی ہے - مگر اس باب میں ہمیشہ قوانین اور قاعدے بدلتے رہتے ہیں اور ایک ہی کام کے واسطے مختلف عمریں ، مختلف زمانے مقرر ہوتے رہتے ہیں - ان کا لکھنا عبث ہے - ابھی سول سروس ہند کے واسطے ۱۹ برس کی عمر مقرر تھی ، اب ۲۳ برس کی - پہلے زن و شو کی عمرِ رضامندی گورنمنٹ کی طرف سے ۹ برس مقرر تھی ، اب بارہ

برس مقرر ہو گئے - پہلے پچپن سالہ ملازم نوکری چھوڑنے پر مجبور کیے جاتے تھے ، اب ساٹھ برس تک ان کو اجازت دی جاتی ہے - حقیقت میں بعض کام ایسے ہیں کہ وہ ایک خاص عمر کے بعد اچھی طرح نہیں کیے جاتے - معلّمی پچاس برس کی عمر کے بعد اچھی طرح نہیں کی جاتی ، مگر یہاں حالتِ نزع تک سمجھتے ہیں کہ معلّم معلّمی کر سکتا ہے - غرض شائستہ گورنمنٹ کی ملازمت میں لیاقت کے سوا عمر کو بھی دخل ہے -

۸۲- قول و[1] فعل

کہنا کچھ اَور ہوتا ہے اور کرنا کچھ اَور - کہنے اور کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے - کہنا تو زبان ہلانے کا کام ہے ؛ بہ قولِ شخصے کہ زبان کے آگے خندق نہیں - وعظ کچھ اَور ہے ، واعظ کچھ اَور - واعظین کے ہاتھ میں ایک عمدہ کام پند و وعظ کا ہے - ان کی سیاست عوام کے دلوں پر مسلّط ہوتی ہے مگر ان کے دل ایسے ناپاک اور خبیث ہو رہے ہیں کہ مذہب میں طرح طرح کے خلل پیدا ہوتے ہیں - ان کے باہمی نفاق اور انتقام جوئی کے سبب سے دلائلِ مذہب پر ایک آفت برپا ہوتی ہے اور ایک فسادِ عظیم کھڑا ہوتا ہے -

بعض واعظوں کا ظاہری اخلاق بہت اچھا ہوتا ہے مگر ان کی رائے اوندھی اور عقل اندھی ہوتی ہے - بعض واعظ شریر ہوتے ہیں ؛ راست بازی اور نکوکاری کا وعظ فرماتے ہیں مگر خود اس کا یقین نہیں رکھتے - جس انسان کے قول و فعل موافق نہ ہوں ، وہ منافق ہے - منافق کے کلام کا اثر کچھ دل پر نہیں ہوتا اور نہ کوئی سنتا ہے -

---

۱- اصل میں واؤ نہیں ہے -

ایک شخص جس نے میدانِ جنگ میں تلوار کی شکل نہ دیکھی ہو ، وہ تیغ زنی کا ذکر کرے تو کون اسے سنے گا ۔ چنانچہ ایک فلسفی شجاعت کی تعریف کر رہا تھا ، ایک سپاہی اُسے سن کر ہنس پڑا ۔ دوسرا آدمی جب اس پر خفا ہؤا تو اُس نے کہا کہ یہ بیان میں نے ابابیل کی زبانی سنا تھا اس لیے بے اختیار ہنسی آئی ، اگر باز سے سنتا تو ہر گز نہ ہنستا ، گوشِ جان سے سنتا ۔ غرض جب کسی انسان کے قول و فعل کو موافق نہیں دیکھتے تو اس کی بات نہیں سنتے اور نہ اس کے کہنے سے ان کے دل پر اثر ہوتا ہے ۔ جو سچّے اپنے کاموں میں گزر گئے ہیں ، گو ان کے کلام پر ہزاروں برس گزر چکے ہیں مگر اب تک ان کا لفظ لفظ دل پر اثر سحر کا سا کرتا ہے ۔ جو اپنے کاموں میں سچّے نہ تھے ، ان کے قول گو فصاحت ، بلاغت ، استدلال سے بھرے ہوئے ہیں ، ذرا بھی اثر نہیں کرتے ۔

بہت سے فقرا اور صوفیوں کی کتابیں ہیں کہ جن میں دولت کی بے ثباتی اور زیست کی حقارت ، موت کی خوبی بیان کی گئی ہے مگر ان کے عمل اس کے برخلاف تھے ، اس لیے ان کا اثر کچھ بھی دل پر نہیں ہوا ۔ ان کا لکھنا نہ لکھنا برابر ہے ۔ ظاہر ہے جو شخص خود عالی ہمّت ، عاقل ، نیک مزاج نہیں ہوتا ، وہ ہزار باتیں عقل و نیکی کی بنائے ، اُس سے کسی کا دل نہیں پسیجتا ۔ سچے منصف وہی ہوتے ہیں کہ جو کچھ اُنھوں نے کہا ، وہ کر کے بھی دکھا دیا ۔ اگر یہ کہا کہ جھوٹ بولنا بُرا ہے تو عمر بھر جھوٹ نہیں بولے ۔ اگر کہا کہ غصّہ کرنا بُرا ہے تو کبھی وہ غصّے نہیں ہوتے ۔ ایسے ہی مقدّس بزرگ اپنی درست کرداری سے راست گفتاری کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر جما گئے ہیں اور ان کو راستی کا رستہ بتا گئے ہیں ۔

۸۳- ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرّر ہے

ہر چیز کے لیے ایک وقت معیّن ہوتا ہے - ہزاروں چیزوں کے وقت کو سب آدمی جانتے ہیں ؛ تعلیم پانے کا زمانہ بچپنا ہے - اب کوئی بوڑھا ایک نئی زبان ، جو اُس نے پہلے نہ سیکھی ہو ، ہر روز مدرسے میں جا کر سیکھنی شروع کرے تو لوگ اُسے پیرِ نابالغ کہیں گے کہ بڈھا ہو کر بچوں کے کام کرتا ہے - اس کہن سالی میں جو پڑھتا ہے تو عالم کیا مر کر ہوگا ؟ مطالعہ اور غور کرنا ہر عمر میں سزاوار ہے لیکن مکتب میں ہمیشہ حاضرباش ہونا لڑکوں کا کام ہے - بڑھاپے میں کسی زبان کی الف ، بے ، تے پڑھنی سزاوار نہیں - اُسے تو یہ مطالعہ کرکے پڑھنا چاہیے کہ دنیا سے سفر بہ آرامِ تمام کیونکر ہو ؟ اللہ بس باقی ہوس - اگر کوئی سپہ سالار ہنگامۂ کارزار سے جدا کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگے تو اِس نا وقت نماز پر سپاہی تبرّا کریں گے - نماز کے وقت معیّن ہیں - اس وقت کی عبادت یہی ہے کہ سپاہیوں کی صف بندی اچھی طرح کرائے - غرض ہر عمر کا اقتضا ہے - جب اس کا انقضا ہو جائے تو اُس عمر کے کام چھوڑ دینے چاہییں - مگر ہم اپنے میں یہ عیب دیکھتے ہیں کہ جتنی عمر ہماری ڈھلتی جاتی ہے ، اُتنی ہوا و ہوس بڑھتی جاتی ہے - اِدھر عمر دراز ہوتی ہے ، اُدھر حرص و آز دامن دراز کرتی ہے - ہم بوڑھے ہوتے ہیں ، حرص جوان ہوتی ہے - ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں (لیکن) قبر تو نہیں بنواتے مگر مکان عالیشان بنوا رہے ہیں اور اس کے لیے سنگِ مرمر ترشوا رہے ہیں - گویا دوبارہ زیست شروع ہوگئی -

جب بڑھاپا آ جائے تو سمجھنا چاہیے کہ زندگی جیسی بری بھلی کٹنی تھی ، کٹ چکی - اب نہ کچھ کھونا ہے ، نہ ہاتھ لگنا ہے - پہلے سفر کے زادِ راہ کا قرض ادا کرنا ہے ، آگے چلنا نہیں - اس بڑی

عمر میں ان باتوں کا شوق چھوڑنا چاہیے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ دولت، ثروت، عزت، حکومت، طاقت، قدرت، علم کیونکر لوگ حاصل کر رہے ہیں۔ ایسی چیزوں کا فکر کرنا ایسا ہے جیسے کوئی آدمی اُس وقت بولنا سیکھے کہ جب ہمیشہ چپکا رہنا پڑے۔ عہدِ شباب کی آب و تاب نہ رہے اور نونہالِ جوانی پت جھڑ ہو جائے تو اُس وقت عیش و طرب کے ثمر سے ہاتھ اُٹھانا چاہیے۔

ایک حکیم نے خوب کہا ہے کہ:

چوں پیر شدی کارِ جواں نتواں کرد
پیریست نہ کافری، نہاں نتواں کرد
در ظلمتِ شب ھر آنچہ کردی کردی
در روشنیِ روز ھاں نتواں کرد

۸۴- سفّاکی یعنی بہت خون بہانا

کہتے ہیں کہ سفاکی کرنا نامردی ہے، یعنی نامردی کے پیٹ سے سفاکی پیدا ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ زنانی طبیعت کی خاصیّت ہوتی ہے کہ وہ کینہ رکھتی ہے، سخت انتقام لیتی ہے، غیظ و غضب میں دیوانی ہو جاتی ہے۔ سفّاکی یعنی آدمیوں اور دشمنوں کے قتل کا سبب یہ کینہ و انتقام ہی ہوتا ہے۔ اکثر سفّاک ایسے دیکھنے میں آئے ہیں کہ ان کا دل ایسا نامرد اور بودا ہوتا ہے کہ ذرا سی مصیبت میں رونے لگتا ہے، مگر دشمن جو ان کے قابو میں آجائے تو اس کے قتل کرنے سے خوش ہوتا ہے۔

بعض بادشاہ ایسے گزرے ہیں کہ روز بے گناہوں کا خون اپنی گردن پر اِس خوف و اندیشے سے لیتے تھے کہ کہیں وہ ہمارے دشمن ہو کر ہم کو نہ ستائیں۔ شجاعت وہ صفت ہے کہ شجاع وہاں ہاتھ

نہیں اٹھاتا جہاں اس کو مقابلے کی امید نہیں ہوتی - وہ اس بیل کو نہیں مارتا جو اسے سینگ مارنے پر نہ تلے - جہاں دشمن نے اس کے آگے سر جھکایا ، اس کے آگے گلے پر تلوار نہیں چلاتا بلکہ اسے گلے لگاتا ہے - مگر شجاعت کے برخلاف 'جبن'[1] کا قاعدہ یہ ہے کہ نامرد خوفناک مقاموں میں شکار کے لیے نہ جائے مگر بس چلے تو دشمنوں کی خونریزی سے خون کے ندی نالے بہائے ، قتلِ عام کا حکم دے دے - جو لشکر فتوح حاصل کرتے ہیں ، ان میں نامرد پاجی سپاہیوں کا ، یا جو ان کے پچھ لگو ہوتے ہیں ، انھی کا کام یہ ہے کہ مطیع دشمن کے خون سے اپنا منہ کالا کرتے ہیں -

جو شجاعت سے ناآشنا ہیں ، وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ جواں مردی کس کا نام ہے - وہ خانہ جنگیوں میں سر پھٹول ہی کو مردانگی کہتے ہیں ، اور جو دشمن ان کے پاؤں میں سر رکھتا ہے ، اس کے سر اڑانے کو رستم و اسفندیار[2] کا کام جانتے ہیں - شجاعت یہ ہے کہ دشمن کو مغلوب کرے ، نہ یہ کہ قتل - اس سے اطاعت کرائے ، نہ یہ کہ تلوار سے سر اڑائے - جو طبائع انتقام جو ہوتی ہیں ، ان کے انتقام کی بھی آرزوئیں جب پوری ہوتی ہیں کہ دشمن زندہ رہے - اس کے مار ڈالنے میں تو کوئی ارمان دل کا نہیں نکلتا - انتقام کا اثر کوئی مردہ پر تو ہوتا نہیں - دشمن کو مارنا گویا اپنے انتقام کی تمام تکالیف سے اس کو چھڑا دینا ہے - انتقام کا یہی لطف ہے کہ دشمن کو معلوم ہو کہ دشمنی کا خمیازہ ہے ، پشیمان و پریشان ہو کر آئندہ وہ توبہ کرے ، اپنے کان

۱- جبن = بزدلی -

۲- رستم و اسفندیار : شاہنامہ' فردوسی کے مشہور کردار - کہا جاتا ہے کہ رستم ۳۰۰ قبل مسیح میں زندہ تھا لیکن اس بات کی محکم شہادت کوئی نہیں - حقیقت یہی ہے کہ یہ کردار فردوسی کا اختراع کردہ ہے -

مروڑے کہ پھر ایسی حرکت مجھ سے سرزد نہ ہوگی - جس سے انتقام لیا جاتا ہے ، اگر اس کو انتقام کا اثر نہ معلوم ہو تو پھر اس سے انتقام لینا ایسا ہے جیسے کہ کسی پتھر اور حیوان سے ، جن میں انتقام کا اثر محسوس ہونے کی قابلیت نہیں ہے - دشمن کا مار ڈالنا کچھ انتقام کا کام نہیں ہے بلکہ حزم و احتیاط کا ، نہ عالی ہمتی کا بلکہ اپنی حفاظت کا کام ہے - اس قبیل سے ہم ، انتقام کا جو نیک انجام ہے ، اسے ہاتھ سے دیتے ہیں ، نیک نامی کو کھوتے ہیں - ہم یہ اپنا جُبن اور زنانہ پن دکھاتے ہیں کہ ہماری جان دشمن کے جان رکھنے سے نکلتی ہے ، اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ زندہ رہا تو ہم کو اسی طرح ستائے گا جس طرح اب ستاتا ہے - دشمن کو قتل کر ڈالنا اپنی حفاظتِ ماتقدّم ہے اور فارغ البال ہونا ہے - اگر سچی شجاعت اور نیکوکاری کی راہ سے ہم دشمن پر فتح یاب ہونا چاہیں اور اس کو اپنا زیردست دیکھ کر دل خوش کرنا چاہیں تو ہم کو اس کے قتل کرنے سے ناخوش ہونا چاہیے ، کہ وہ ہماری خوشی کو ، جو اس کو مطیع دیکھنے سے فتح مندی کی آبرو اور عزت ہوتی تھی ، وہ اپنے ساتھ لے گیا - بعض شخص جو اس کا انتظار دیکھتے ہیں کہ جب مصنّف مر جائے تو ہم اس کی تصنیفات پر اپنا زہر آگلیں تو وہ بڑے ہی نامرد کمینے ہیں -

ارسطو کے حال میں لکھا ہے کہ جب اس سے یہ کہا کہ بعض شخص تم کو بُرا کہتے تھے تو اس نے کہا کہ اور زیادہ برا کہنے دو - مجھ پر تازیانہ زنی وہاں وہ کریں جہاں میں نہیں ہوں - ان ظالم سفّاک نامردوں نے بہت سے طریقے اپنے دشمنوں کے قتل کرنے کے اور ان کی تکلیفوں سے اپنے دل کو راحت پہنچانے کے نکالے ہیں ، مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جو تکالیف سخت ہوتی ہیں ، وہ دیرپا نہیں ہوتیں ، تھوڑی دیر میں آدمی کا کام تمام کر دیتی ہیں - اور جو تکالیف دیرپا

ہوتی ہیں وہ دشمن کی جان کو عذاب پہنچانے میں سخت نہیں ہوتیں - سوائے اس کے ان تکلیفوں سے مارنے کا اثر دشمن پر کچھ نہیں ہوتا - جو سر کٹانے سے نہیں ڈرتا ، ان کی ایسی تکالیف کے مارنے سے کیوں ڈرنے لگا کہ آگ میں جلائیں گے یا بدن پر گرم سلاخیں لگائیں گے یا شکنجے میں کھینچیں گے -

ایک بادشاہ نے قتل کا یہ طریقہ ایجاد کیا کہ دشمنوں پر ایک تلوار کی ضرب ایسی لگاتا کہ اس کی ناف کے پاس سے دو ٹکڑے الگ الگ ہو جاتے - جب یہ دونوں ٹکڑے تڑپتے تھے تو وہ یہ سمجھتا تھا کہ میں دشمن کو دو موتوں کا مزہ چکھاتا ہوں - وہ نہیں جانتا تھا کہ ایسے صدموں میں موت کی تکلیف بہت دیر تک نہیں ہوتی ہے - بلکہ اس سے زیادہ تو یہ طریقہ مارنے کا ہولناک ہے کہ آدمی کی زندہ کھال ، ہر روز جدا جدا اعضا کی ، اُتاری جائے - اس طرح تو آدمی کئی روز تک زندہ رہتا ہے - صلیب پر مشکل سے آدمی چوبیس گھنٹے تک زندہ رہتا ہے - گو تاریخ میں بعض واقعات ایسے لکھے ہیں کہ صلیب پر سے لوگ اُتر کر زندہ رہے ہیں - جوسی فس مؤرخ لکھتا ہے کہ رومیوں نے جوڈہا کے یہودیوں کو صلیب پر چڑھایا تھا - تین روز بعد میرا گزر وہاں ہوا تو میں نے تین آدمیوں کو ، جو میرے دوست تھے ، صلیب پر سے اُتارا - دو تو اُسی وقت مر گئے مگر ایک مدت تک زندہ رہا -

فریسس نے اپنی ذہانت دشمنوں کے قتل میں یہ خرچ کی کہ اس نے چارچ سچل اپنے دشمن کو تین دن تک ننگا شکنجے میں ڈالے رکھا اور لوگوں کو حکم دے دیا کہ جو تکلیف وہ چاہیں ، اسے پہنچائیں - اس کے ساتھ جو اور قیدی تھے اُن کو بھوکا رکھا - تین دن بعد اس نے اس کے بھائی کو ، جس کے سبب سے اُس نے یہ ساری

مصیبت اپنے سر پر لی تھی ، حکم دیا کہ اس کا خون پیے اور اس کے افسروں کو حکم دیا کہ وہ اس کے گوشت کو کاٹ کر کھائیں ۔ جب وہ مر گیا تو اس کی ہڈیوں اور گوشت کو ، جو باقی رہا تھا ، اُبال کر سب اس کے رفقا اور عزیزوں کو کھلایا ۔ یہ سارے کام نامردی ، بزدلی ، کمینہ پن اور پاجی پن کے تھے ۔

۸۵- دلچسپ حکایت

ایک عورت ایسی اُلّو تھی کہ جب وہ اندھی ہوگئی تو وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ میں اندھی ہو گئی ہوں جو مجھے کچھ نظر نہیں آتا ، بلکہ یہ سمجھتی تھی کہ سارے گھر میں اندھیرا ہو گیا ہے ۔ غل مچا مچا کر گھر والوں سے کہتی تھی کہ مجھے باہر لے چلو کہ میں کچھ دیکھوں ۔ اس گھر میں تو اندھیرے کے سبب سے کچھ دکھائی نہیں دیتا ۔ لوگ اس کی بے وقوفی پر ہنستے تھے ۔ مگر جیسا کہ اس عورت کا حال تھا ، ایسا ہی انسان کا حال ہے کہ وہ اپنے طمع اور حرص کے دیکھنے میں اندھا ہے ۔ اَور اندھے تو اَوروں کو رہنمائی کے لیے بلاتے ہیں مگر یہ ایسا اندھا ہے کہ کسی کو نہیں بلاتا اور اپنے آپ گمراہ ہوتا ہے ۔ اَوروں کی بے وقوفی پر ہنستا ہے ۔ یہ نہیں سمجھتا کہ بقول سنیکا[1] :

> ”جب مجھے کسی احمق پر ہنسنا ہوتا ہے تو میں خود اپنے ہی اوپر ہنس لیتا ہوں ۔ مجھے احمق کی تلاش دور نہیں کرنی پڑتی ، وہ اپنے ہی پاس ہوتا ہے ۔“

۱- سینیکا : (۲ع—۶۶ع) مشہور رومانی فلسفی جو قرطبہ میں پیدا ہوا ۔ نیرو کا استاد تھا اور نیرو ہی کے حکم سے مارا گیا ۔

جو شخص اپنے تئیں بیمار نہیں جانتا ، اس کی بیماری کا علاج اور زیادہ مشکل ہوتا ہے - ساری بیماریاں ہمارے اندر ہی ہوتی ہیں ، کچھ باہر سے نہیں آتیں - اگر ہم ان بیماریوں کو پہلے سے دیکھ کر حفظِ ماتقدم نہ کریں گے تو اپنے امراض کا علاج کیسے کر سکیں گے -

۸۶- بیماری کی نقل سے بیمار پڑنا

اکثر مائیں اپنے بچوں کو منع کرتی ہیں کہ وہ توتلوں اور لنگڑے ، کانڑے ، اندھوں ، بھینگے ، ٹِڑھ مُوؤں[1] کی اور ناقص الاعضا آدمیوں کی نقلیں نہ اتارا کریں - کچھ تو اِس سبب سے کہ وہ اسے بد فالی سمجھتی ہیں جس سے بد فالی کا وہم پیدا ہوتا ہے : مصرع

مزن فالِ بد کاورد حالِ بد

کچھ اِس سبب سے کہ وہ یہ جانتی ہیں کہ بچپنے میں سارے اعضا ایسے کم زور اور نازک ہوتے ہیں کہ اندیشہ ہے کہ ایسی نقلوں کے کرنے کا اثر کہیں اصل نہ بنا دے - چنانچہ بعض لڑکے جو توتلے ، بھینگے ، ٹِڑھ مُوئے آدمیوں کی گھر میں اکثر نقل اتارا کرتے تھے ، وہ توتلے اور بھینگے اور ٹیڑھ مُوئے ہو گئے - بعض شخصوں کو دیکھا ہے کہ انھوں نے کسی ضرورت کے سبب سے اپنے تئیں بیمار بنایا تھا کہ وہ اصل میں بیمار ہو گئے -

ایک شخص روم کے اُمرا کے دربار میں آتا جاتا اور جب اُمرا اس کے گھر آتے تو تعظیم کے لیے کھڑا ہونا اس کو سخت ناگوار تھا - اس لیے اس نے گٹھیا کی بیماری کا بہانہ بنا رکھا تھا - ٹانگوں پر کپڑے لپیٹے ، کچھ لیپ اس پر لگائے رہتا تھا - آخر کو تھوڑے دنوں کے بعد اثر یہ ہوا کہ سچ مچ گٹھیا ہو گئی -

---

۱- ٹِڑھ مُوؤں = ٹیڑھے منہ والوں -

ایک شخص نے کچھ جرم کیا تھا جس کے سبب سے اس کو اپنے کو چھپانا پڑا، تو اُس نے اپنے تئیں ایک آنکھ پر پلاسٹر لگا کر کانڑا بنا لیا - جب اِس روپوشی کی ضرورت نہیں رہی تو آنکھ پر سے جب پلاسٹر اُتارا تو آنکھ میں روشنی بالکل باقی نہیں رہی تھی - معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسری آنکھ میں چلی گئی -

بعض دفعہ جن چیزوں کو شوقین نوجوان خوش نمائی کے لیے رکھتے تھے، آخر کو بیماری کے سبب سے ان کو ضرورت ہو گئی - ہاتھ میں لکڑی اس لیے رکھتے تھے کہ خوبصورت معلوم ہوں مگر گٹھیا کی بیماری ہوگئی جس میں لاٹھی رکھنے کی ضرورت ایسی ہو گئی کہ اس کے بغیر ایک قدم نہیں اُٹھایا جاتا تھا -

بعض دفعہ قوّتِ متخیّلہ کا ایسا زور ہوتا ہے کہ جو بیماری خواب میں دیکھتے ہیں کہ ہم کو ہوئی، وہی بیداری میں اصل ہو جاتی ہے -

۸۷- انگوٹھا

انگوٹھے کو فارسی میں نرانگشت کہتے ہیں، یعنی وہ سب اُنگلیوں میں نر، یعنی زیادہ طاقت ور ہے - اس کو دوسرا ہاتھ بھی کہتے ہیں کیونکہ اگر اس کو کاٹ ڈالیے تو ہاتھ بیکار ہوتا ہے - پہلے زمانے میں روم کے بادشاہوں نے دشمن کی فوج کو یہ سزا دی ہے کہ سپاہیوں کے انگوٹھے کاٹ ڈالے جس سے پھر وہ ہتھیار پکڑنے کے قابل نہیں رہے - بڑے شہروں کے بازاروں میں دیکھا ہوگا کہ کیسے نوجوان، رند اوباش کوٹھوں کی طرف انگوٹھے چڑھاتے ہیں اور اس سے کیا مطلب رکھتے ہیں - پٹھانوں کے ہاں انگوٹھے کے سرے کو کلمے کی انگلی کے ساتھ ملا کر دائرے کی شکل بنا کے دکھانا بڑی گالی اور حماقت کی بات ہے - چنانچہ پشاور میں ایک کپتان صاحب انگریزی سپاہ کی چاند ماری

میں سپاہیوں کی نشانہ بازی کے نمبر لگا رہے تھے - ایک پٹھان سوار کی گولی کوئی نشانے پر ٹھیک نہ لگی تو انھوں نے انگوٹھے اور انگلی کو انگریزی صفر کی شکل بنا کے کہا کہ تمھارے نمبر صفر ہیں ، جس کو وہ سوار اپنی بڑی حقارت سمجھا اور غصّے میں بندوق بھر کر کپتان صاحب کو اجل کی گولی کا نشانہ بنایا -

بعض وحشی قوموں میں جب دو بادشاہ آپس میں عہد و پیمان نہایت واثق کرتے تھے تو دونوں اپنے داہنے ہاتھ ملاتے تھے اور پھر انگوٹھوں کو خوب کستے تھے جس سے خون جھلکنے لگتا تھا - ان پر کچوکا لگاتے تھے جس سے خون باہر نکل آتا تھا ، وہ پی لیتے تھے -

رومیوں میں انگوٹھا نیچا کر کے پھرانا تعریف کی اور اٹھا کر پھرانا حقارت کی نشانی ہے -

۸۸- کسی خالص چیز کا مزہ ہم نہیں چکھتے

انسان بھی کیا ضعیف البنیان[۱] ہے کہ کوئی بسیط[۲] چیز ، جو آلائش سے خالص ہو ، اپنے کام کے لیے اس کے ہاتھ نہیں آتی - جتنے عناصر و بسائط ہم استعمال کرتے ہیں ، وہ بدلے ہوئے ہوتے ہیں - جن فلزّات کو ہم کام میں لاتے ہیں ، وہ آلائش سے خالی نہیں ہوتے - خالص سونا ہمارے کام ہی میں نہیں آ سکتا جب تک اس میں اور ملاؤ[۳] نہ ہو - نیکی جو ہماری زندگی کی علّتِ غائی ہے ، خالص ہم کو نہیں ملتی ہے - نہ وہ راحت اور اسبابِ راحت ہم کو میسّر ہوتے ہیں[۴] جن میں رنج

۱- ضعیف البنیان = جس کی بنیاد ضعیف ہو - بے بنیاد -
۲- بسیط = مرکب کی ضد ، یعنی خالص حالت میں -
۳- 'ملاؤ' بمعنی ملاوٹ -
۴- اصل : ہوتا ہے -

اور بے آرامی کا ملاؤ اور لگاؤ نہ ہو۔ ہماری راحت و خوشی کے جتنے چشمے ہیں، ان میں تلخی ضرور ہے۔ جو ہماری اعلیٰ درجے کی مسرّت و سرور ہیں، ان میں غم و رنج کی آمیزش ضرور ہے۔ ہم تو اپنے تصوّر میں بھی کوئی تصویر خوشی کی ایسی نہیں بنا سکتے جس میں رنج و تکلیف کے رنگ نہ جھلکتے ہوں۔ خوشی و رنج گو آپس میں غیر متشابہ اور متضاد معلوم ہوتے ہیں مگر معلوم نہیں کہ قدرت نے ان میں کیا یگانگت و ہم زادگی رکھی ہے کہ وہ بغیر ملے رہتے نہیں۔

سقراط کہتا ہے کہ بعض دیوتاؤں نے یہ چاہا تھا کہ خوشی و رنج کو آپس میں ایسا ملا جلا دیں کہ وہ ایک ہو جائیں۔ مگر وہ جب یہ نہ کر سکے تو انھوں نے ان کو دُموں کی طرف سے جوڑ دیا، اس لیے خوشی و رنج ایک دوسرے کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔

ایک یونانی شعر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دیوتا ہمارے ہاتھ خوشی بیچتے ہیں جس کی قیمت میں رنج ضرور لیتے ہیں، یعنی جب تک رنج ہماری گرہ میں نہ ہو، خوشی مول ہی نہیں لی جا سکتی۔ خوشی بھی ہم کو چباتی ہے اور پیستی ہے۔ اگر فرحت و مسرّت میں اعتدال نہ ہو تو وہی وبالِ جاں ہو جاتی ہے۔ اگر انسان کو سارا سامان خوشی کا حسبِ دل‌خواہ مل جائے اور کوئی چیز اس میں باقی نہ رہے تو خوشی کا بوجھ اس سے سہارا نہ جائے گا، وہ اس کے تلے پچکنے لگے گا اور اسے چھوڑ کر بھاگے گا۔ اور یہ چھوڑنا بالطبع ہے، اس لیے کہ جہاں کوئی شخص ایسا کھڑا نہیں ہو سکتا کہ گرنے سے بچے، تو وہاں سے ضرور وہ فرار ہوگا۔

ایک حکیم کا قول ہے کہ ہر غم میں ضرور کوئی خوشی ہوتی ہے۔ انسان کا دل ہی خدا نے ایسا بنایا ہے کہ جب تک وہ محنت کا رنج نہ اٹھائے، راحت کا لطف نہیں آتا۔ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ

انسان اپنے تئیں رنج و محنت کے حوالے کر دینے سے مسرور ہوتا ہے - رونا بھی ایک خاص قسم کی خوشی ہے - دوستانِ مرحوم کی یاد بہ طرزِ خوش ہم کو ممنون کرتی ہے اور ہم کو ایسا مزہ وہ دیتی ہے جیسے مے نوش کو شرابِ کہنہ کی تلخی - وہ ساقی سے یہ تمنا کرتے ہیں کہ شرابِ کہنہ ، جو سب سے زیادہ تلخ ہو ، اُس سے ہمارا پیالہ بھر دے - رنج و خوشی کا رشتہ بے ترتیب سا قدرت نے ہی بنایا ہے - مصوّر کہتے ہیں کہ ہم کو روتے ہوئے چہرے کے بنانے میں بہت سی اُس کی دھجیں اور رخ وہی بنا۔ پڑتے ہیں جو ہنستے ہوئے چہرے کے - اگر تصویر پوری نہ بنی ہو تو دیکھنے والا یہ نہیں تمیز کرے گا کہ ان دونوں روتے ہوئے اور ہنستے ہوئے چہروں میں سے کس کی تصویر ہے - زیادہ ہنسنے میں بھی آنسو نکل آتے ہیں - اگر مذہبی نیکیوں کو بھی دیکھیے تو اس میں برائی کی آمیزش موجود ہے - کوئی شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ میں نے یہ خالص نیکی کی تو جب وہ اس کے پاس کان لگا کر بیٹھے گا تو نہایت نرم آواز اس کے کان تک آئے گی جس کو کوئی اور نہیں سنے گا کہ میں خالص نہیں ہوں ، مجھ میں کچھ آلائش بدی کی ہے - غرض خیرِ محض اور شرِ محض کالعدم ہے -

قوانینِ عدالت میں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم انسان کے دکھ ، درد ، رنج ، تکلیف کو دور کرتے ہیں ، وہ بھی ناانصافی کی آلائش سے پاک صاف نہیں ہوتے - ان کا حال افلاطون نے اُس سانپ کا سا بتایا ہے کہ جس کا سر کاٹتے ہیں اور وہ کٹنے سے اور زیادہ بڑھ جاتا ہے - کوئی قانون نہیں جس میں خواص کا نقصان نہ ہو ، مگر اس کا معاوضہ فائدۂ عوام سے ہو جاتا ہے - غرض ہر مثال میں کچھ ناانصافی کا بھی اختلاط موجود ہے - انسان ایک فقیر کی گُدڑی ہے کہ جس کے اندر ہزاروں پیوند پارے رنگا رنگ کے جڑے ہوئے ہیں -

۸۹- باتیں گھڑنی

باتیں بڑے آدمیوں کے دل بہلانے کے لیے ایسے ہی اوزار ہیں جیسے بچوں کے دل بہلانے کے لیے کھلونے - مگر آج کل ہم میں بُری باتوں سے دل بہلانے کی عادت ہو گئی ہے - ہمارے پیچھے یہ مرض ایسا لگ گیا ہے کہ خواہ ہم اپنا حال بیان کریں یا کسی دوسرے شخص کا ، جس میں کوئی ہماری غرض بھی نہ ہو ، تو کوئی اس کا اعتبار نہیں کرتا - شاید تھوڑے ہی آدمی ہوں گے کہ جن کی باتوں پر لوگوں کو یقین ہوتا ہوگا اور وہ یقین کے قابل بھی ہوں - ساری بد اخلاقیوں کی جڑ یہ ہے کہ ہمارے کلام میں سے سچائی رخصت ہو گئی - ہر نیکی کی ابتدا سچ ہی سے ہوتی ہے - اب سچ بولنا اِس کا نام رہ گیا ہے کہ ہم باتیں بنا بنو کر اپنی بات کا یقین دوسرے آدمی کو سچ ہونے کا کرا دیں - کھوٹے سکّے چالاکی سے چلا کر کھرے سکّوں میں گِنوا دیں - جھوٹ بولنا ، قسم کھانا کوئی بُرا نہیں جانتا ، حسنِ کلام میں وہ داخل ہیں - ایک بات کے بیان کرنے میں نفس الامری واقعات پر خیال نہیں کرتے ، بلکہ جس طرح اپنے تئیں اس کا بیان اچھا معلوم ہو یا اوروں کو سمجھیں کہ اس طرح بیان کرنا اچھا معلوم ہوگا ، اُس طرح بیان کرتے ہیں اور اس کا نام حسنِ بیان رکھتے ہیں -

غرض ریاکاری اور مکاری کے ساتھ باتیں بنانا ہماری عادت میں داخل ہے اور وہ عیب کی جگہ ہنر سمجھا جاتا ہے - کوئی گالی اور دشنام اور بُرا لفظ اس سے بڑھ کر نہیں ہے کہ کوئی تم کو جھوٹا کہے - ہر مذہب کسی برائی پر ایسی لعنت ملامت نہیں کرتا جیسی کہ جھوٹ بولنے پر - مگر رواج نے ان دونوں باتوں کا اثر دل پر اِتنا بھی باقی نہیں رکھا جیسا کہ اُڑد پر سفیدی - یہ نیچر کا قاعدہ ہے کہ آدمی

جس عیب میں زیادہ تر سنا[1] ہوا ہوتا ہے ، اُسی کی زیادہ وہ حمایت کرتا ہے - اگر ایک آدمی دوسرے آدمی کو جھوٹا کہتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ تُو مجھ پر کیوں افترا اور بہتان باندھتا ہے - اس پر بہت غصہ و خفا ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ اس ٹرپھش سے ظاہری عیب چھپ جائے گا ، گو وہ حقیقت میں اپنے اصلی حال پر رہتا ہے - ہم نہیں سمجھتے کہ جو ہم کو جھوٹا کہتا ہے ، وہ یہ کہتا ہے کہ تم بڑے ڈرپوک ، نامرد ہو - اس سے زیادہ کوئی اور بُرائی ہوگی کہ آدمی اپنے لفظوں کو نگل جائے ؟ یعنی اپنے علم کے برعکس جھوٹ بولے - جھوٹ بولنے کے برابر کوئی کمینہ پن نہیں ہے -

ایک حکیم کیا خوب کہتا ہے کہ جھوٹ بولنا آدمیوں سے ڈرنا اور خدا کی تحقیر کرنی ہے - خدا کا حکم ہے کہ جھوٹ مت بول - جب یہ حکم نہ مانا تو اُس کے حکم کی تذلیل ہوئی - پس اس سے زیادہ کون سی ، انسان کے ذلیل اور خوار کرنے والی ، بُرائی ہوگی کہ جس کے سبب سے وہ آدمیوں سے ڈرے اور خدائے تعالیٰ سے بہادری کرے - ہماری باتیں ہی ہمارے دل کی ترجمان ہیں - صرف انھی کے ذریعے سے ہم خیالات کو دوسرے تک پہنچا سکتے ہیں ، اپنے ارادوں اور نیّت کو ظاہر کر سکتے ہیں - پس جب وہی جھوٹے ہوئے تو گویا ہم اپنے بنی نوع کو فریب دیتے ہیں اور ان سے اپنے تعلقات کے رشتوں کو توڑتے ہیں - اپنے تمام خط و کتابت کا ، گورنمنٹ کے ذمہ داری کے کاموں کا اعتبار کھوتے ہیں - ہم سے تو وہ وحشی بُت پرست قومیں اچھی ہیں کہ جب وہ جھوٹ بولتے ہیں یا جھوٹی بات سنتے ہیں تو زبان اور کان کا خون کفارے میں بُتوں پر چڑھاتے ہیں اور جھوٹ

۱- سنا ہوا = آلودہ -

سے توبہ کرتے ہیں - مگر یہاں تو جیسے آہن گر لوہے کو، زرگر سونے کو گھڑ گھڑا کر کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے، اِسی طرح ہم باتونی بات کا بتنگڑ بنا کے کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں -

۹۰- غصّہ بچوں پر

جہاں دنیا کے اور تماشے دیکھتے ہیں، وہاں غصّے کے بھی عجیب و غریب تماشے نظر آتے ہیں - گھروں میں ماں باپ کا چہرہ غصّے میں سرخ انگارا بنا ہوا ہے، معصوم بچوں پر لاتیں چل رہی ہیں، تھپڑ گھونسے لگ رہے ہیں، پھول سے گالوں پر نیل پڑ رہے ہیں - ایسے ہی مکتبوں اور مدرسوں میں دیکھتے ہیں کہ استاد کی آنکھوں میں خون اتر رہا ہے - ان کی ڈراؤنی چیخوں اور بھبکیوں سے ان کے ننھے ننھے شاگردوں کا دل دہل رہا ہے - جو ابھی دایہ کے دامن سے جدا ہوئے ہیں، قمچیوں، بیدوں، تسموں کے ہاتھ خوب صاف ہو رہے ہیں - معصوموں کے نازک بدن پر بدھیوں پر بدھیاں پڑ رہی ہیں -

بعض دفعہ تو وہ مارپیٹ کی نوبت پہنچتی ہے کہ بچوں کے بدن پر ہلدی تھوپی اور آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی ہے - سر کے گومڑے دبائے جاتے ہیں - غرض جیسی سخت بیماری سے بیمار کی صورت بگڑ جاتی ہے، ویسی ہی لڑکوں کی شکل اس مار دھاڑ اور دہشت و خوف سے کچھ اور ہو جاتی ہے - تمام بیماریوں میں سخت بیماری وہی شمار ہوتی ہے جس میں آدمی کا چہرہ بگڑ جاتا ہے، اس لیے اِس زد و کوب کو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بچوں کے لیے ایک سخت مرض ہے - استاد اور شاگردوں میں وہی علاقہ ہے جو مریض اور طبیب میں - جیسے کہ طبیب کا بیمار پر غصّے ہونا بے جا ہے، ایسا ہی استاد کا شاگرد پر ناحق خفا ہونا ناسزا ہے - پھر اور یہ غضب ہے کہ نہ اِس ظلم کے لیے

کوئی پولیس ہے جہاں فریاد کی جائے، نہ کوئی عدالت ہے جس میں استغاثہ پیش کیا جائے - اب وہ حیران ہیں کہ کیا کریں - اس سے ان کے دل کو تسکین نہیں ہوتی کہ اُن کو یہ سمجھایا جاتا ہے کہ جس جس جگہ بدن پر استاد کی مار کی چوٹ لگے گی ، وہ بہشت میں جائے گا -

استادوں کے غضب کی مار پیٹ ، تاکید و تادیب و گوشمالی نہیں معلوم ہوتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتقام لیتے ہیں - لڑکے جانتے ہیں کہ ہم بےگناہ ہیں ، یہ مار ناحق ہم پر پڑی ہے - آستاد جی کسی اور بات پر جلے بیٹھے تھے ، وہ جلن ہم پر نکالی ہے ، استانی جی سے لڑائی ہوئی ہوگی - عراقی پر بس نہ چلا ، گدھیا کے کان اینٹھے -

غصّے کے برابر کوئی جذبۂ انسانی خلافِ عقل کام کرنے والا نہیں ہے - وہ آدمی کو دیوانہ بنا دیتا ہے ، دیوانگی کے کام کراتا ہے - اگر کوئی جج مغلوب الغضب ہونے کے سبب سے کسی مجرم کو ناحق پھانسی کا حکم دے دے تو اس جج کے خود پھانسی دینے پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا - پھر معلوم نہیں کہ ایسی خطاؤں پر ما باپوں اور آستادوں کو کیوں نہیں سزا ملتی ہے کہ وہ معصوم بچوں کو غصے میں آن کر سخت زد و کوب کرتے ہیں - ان کی اصلاح نہیں کرتے بلکہ اپنا انتقام لیتے ہیں - ان کا کام تھا کہ وہ ان بچوں کو ایسا آدمی بناتے کہ وہ ملک کی خدمت کے لائق ہوتے ، امن اور لڑائی کے زمانے میں مفید کام کرتے -

بعض آدمی ایسے مغلوب الغضب پیدا ہوتے ہیں کہ طیش و غضب میں بھرے ہوئے اپنی اوندھی عقل پر اس طرح چلتے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ پر سے بڑے پتھر جدا ہو کر ، آڑ آڑ کر گرتے ہیں

اور ڈھلانوں کو[1] ویران و عریاں کرتے ہیں۔

انسان پر لازم ہے کہ جب تک اس کا غصّہ فرو نہ ہو تو کسی ملازم پر دست درازی نہ کرے۔ جب بیماری میں نبض پُر اضطرار و بے قرار تیز چل رہی ہو، شعلۂ غضب سارے بدن میں آگ لگا رہا ہو تو ایسی حالت میں ہم کو کوئی کام کرنا نہیں چاہیے۔ بلکہ ہمارا غصّہ ہی حکم دے گا، وہی بولے گا۔ غرض جو کام کرے گا وہی کرے گا۔ جب یہ سلگتی ہوئی آگ بجھ جائے گی اور ہم ٹھنڈے اور خاموش ہو جائیں گے تو ہم کو کچھ اور عالم نظر آئے گا اور چیزیں ہم کو کچھ اَور سے اَور نظر آئیں گی۔ غصّے کی حالت میں جو ہم خطائیں اَوروں کی دیکھتے ہیں، وہ اپنی اصلی حالت پر دکھائی دیں گی۔ جیسے کہ کُہر میں چیزیں اپنی اصلی صورت پر نظر نہیں آتیں، ایسے ہی آتشِ غضب کا دُخان دماغ کو ایسے گھیرے ہوئے ہوتا ہے کہ عقل کسی خطا و قصور کو اپنی اصلی حالت پر نہیں دیکھ سکتی۔

پس بچوں کو جو گوشمالی عقل و شعور کے ساتھ دی جاتی ہے، وہ مؤثر اور فائدہ مند ہوتی ہے۔ اور اگر وہ کسی اَور سبب سے ہوتی ہے، جیسے کہ ماں باپ یا استاد کو غیظ و غضب میں لڑکے دیکھتے ہیں کہ چہرہ بر افروختہ ہے، منہ پُھول رہا ہے، نیلی نیلی رگیں کھڑی ہوئی ہیں، آنکھوں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خون اتر رہا ہے، تو وہ اس سزا کو نہیں مانتے اور بُرا جانتے ہیں۔

۱۹- ایک غصّے کی حکایت پلوٹارک[2] نے یہ لکھی ہے کہ

۱- اصل: ڈھلانوں کو طرفوں کو۔

۲- پلوٹارک: (۴۵ یا ۵۰ع—۱۲۵ع ؟) یونان کا مشہور حکیم اور مورخ۔ اس نے ایتھنز میں تعلیم حاصل کی اور مصر و شام اور ایشیا کا سفر کیا۔ اس کی ایک کتاب کا نام ''سیرالرجال العظام'' ہے۔

اس کا ایک غلام بڑا شریر ، بد ذات تھا - اپنے آقا کے مسائلِ حکمت کی بھنک بھی اس کے کان میں پڑتی رہتی تھی - کسی خطا پر پلوٹارک نے ایک شخص کو حکم دیا کہ اس پر بید لگائے - جب بید لگنے شروع ہوئے تو غلام پہلے کچھ بڑبڑایا کہ مجھے ناحق یہ سزا دیتے ہو، میں نے کوئی خطا نہیں کی ہے - پھر اور زیادہ زبان درازی کر کے کہنے لگا کہ یہ پلوٹارک حکیم نہیں ہے ، یوں ہی اپنی حکمت کی شیخیاں مارا کرتا ہے - میں نے اکثر اس کو کہتے سنا کہ غصے ہونا وحشیانہ حرکت ہے ، بلکہ اس نے اس غضب کے باب میں ایک کتاب لکھی ہے - مگر خود غصے کے مارے مجھے پٹواتا ہے جس کے سبب سے اس کی تمام تحریریں غلط اور جھوٹی ہو گئیں -

پلوٹارک نے بہت نرمی اور آہستگی سے جواب دیا کہ او بد ذات ! بتا کہ تو نے مجھ میں کون سی غصے کی نشانی دیکھی ؟ کیا میری آنکھوں میں غیظ و غضب کی کوئی نشانی ہے؟ کیا میرا چہرہ غصے سے بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے ؟ کیا اس کی رنگت بدل گئی ہے ؟ کیا میری آواز خوف ناک و دہشت ناک ہے ؟ کیا میرا بدن کانپتا ہے ؟ کیا میرے منہ سے جھاگ نکل رہے ہیں ؟ کیا کوئی لفظ میرے منہ سے ایسا ناشائستہ نکلا ہے کہ جس سے میں توبہ کروں ؟ یہی ساری غصے کی سچی نشانیاں ہیں جن میں سے کوئی بھی مجھ میں نہیں پائی جاتی - یہ کہہ کر اس نے بید مارنے والے سے کہا کہ جب تک اس بھلے مانس اور مجھ میں مباحثہ رہے ، تم اپنا کام کیے جاؤ - بہت سی حکایتیں عالی صفات ، نیک نہادوں کی لکھی ہیں کہ شریروں نے ان کے بڑے بڑے نقصان کیے مگر انھوں نے ، جب ان کو غصہ آگیا ، سزا سے ہاتھ کھینچ لیا -

یہ غصہ وہ پاجی جذبہ ہے کہ خود اپنی تعریف اور خوشامد

کرتا ہے۔ اگر ایک کام ناحق کر بیٹھے، کوئی سچا ثبوت اس کے ناحق ہونے کا پیش کرے، جس کا جواب کچھ نہ آئے، تو اور چڑ جائے گا اور اور جھلا کر اپنے پہلے ناحق کام کی تائید میں اور بے جا کام کرنے لگے گا۔ کوئی شخص غصے میں آن کر کسی بے گناہ بے خطا کو مارنے لگے اور وہ اپنی بے گناہی کا ثبوت قطعی پیش کرے تو اس کا غصہ اس عذر سے دوچند ہو جاتا ہے اور اس کی سزا کو بڑھاتا ہے۔ چنانچہ اس کی ایک حکایت یہ ہے کہ پای سو ایک سپہ سالار تھا جس میں بہت ہی نیک عادتیں تھیں، مگر بُرائی یہ تھی کہ مغلوب الغضب بہت تھا۔ اس کے دو سپاہی فوج کے لیے دانہ چارہ لینے گئے۔ ان میں سے ایک واپس آیا، دوسرا رستہ بھول کر کہیں سے کہیں چلا گیا۔ جب اس نے اس سپاہی سے اس کا پتا پوچھا تو وہ بتا نہ سکا۔ اس پر قتل کا شبہ ہوا اس لیے غصہ آیا۔ سپاہی کے قتل کا حکم دیا۔ جب جلّاد اس سپاہی کا سر اڑانے کو تھا کہ وہ دوسرا سپاہی آ گیا۔ یہ دیکھ کر ساری سپاہ خوش ہو گئیں اور ان دونوں ہمراہیوں کے گلے لگیں۔ پھر اپنے سپہ سالار کے پاس گئیں جس کا ابھی پہلا ہی غصہ باقی تھا۔ اب یہ اور معاملہ پیش آیا جس سے اس کی مغلوب الغضبی پر نادانی اور ناانصافی سوار ہوئی۔ دونوں سپاہیوں کی صورت دیکھتے ہی اس کی آتشِ غضب اور مشتعل ہوئی جس نے ایک بے گناہ کی جگہ تین کو قتل کرایا؛ اس نے حکم دیا کہ پہلے سپاہی کی نسبت تو پہلے ہی قتل کا حکم صادر ہو چکا ہے، دوسرے سپاہی کی گردن اس لیے اڑائی جائے کہ اس کی گمراہی نے ایک بے گناہ کو مجرم بنایا۔ تیسرے جلّاد کا سر اڑایا جائے کہ اس نے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ سپاہی کے سوا جس کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ بعض مقامات پر بغیرِ غصے کے کام نہیں چل سکتا، باقی اور سب آدمیوں میں غصے کا ہونا

سخت عیب سمجھا جاتا ہے۔

بعض آدمی ایسے مغلوب الغضب پیدا ہوتے ہیں کہ ان کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی دیگچی پانی کی بھری ہوئی چولھے پر رکھی ہو اور اس کے نیچے لکڑیاں بھڑ بھڑ جاتی ہوئی رکھی جائیں، جس سے وہ پانی پہلے جوش میں آکر پتیلی میں پھرے گا، پھر ابال میں آکر باہر نکلے گا۔ پھر اس کے گرد بھاپ اٹھ کر چاروں طرف پھیل جائے گی۔ پس جیسی یہ حالت پانی کی آگ کے اوپر ہوتی ہے، اِسی طرح غضب ناک طبائع کا حال آتشِ خشم کے مشتعل ہونے سے ہوتا ہے کہ اس کے دھوئیں سے دماغ بھر جاتا ہے۔

بعض آدمی ایسے متحمّل ہوتے ہیں کہ ان کو غصّہ بہت کم آتا ہے۔ بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو غصّہ آتا ہے تو وہ اس کو مارتے ہیں اور ان کے سینے میں اس کا اثر کچھ باقی نہیں رہتا۔ ایسے متبرّک متحمّل تعظیم و تکریم کے مستحق ہوتے ہیں۔ مگر بعض ریاکار، تیرہ دروں مکر سے ایسے بھرے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کو غصّہ کیسا ہی آئے، اپنی نرم خوئی اور نیک مزاجی جتلانے کے لیے بظاہر اس کو پی جاتے ہیں اور سینے میں کینہ رکھتے ہیں، جس کا زہریلا اثر اور صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ بدکاروں[1] کی بدیاں جو ظاہر ہوتی ہیں، وہ ایسی خطرناک نہیں ہوتیں جیسی کہ ریاکاروں کی برائیاں چھپی ہوئی۔ برائی کا قاعدہ ہے کہ جتنا اسے کوئی چھپائے اتنی وہ ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے کوئی شراب خانے میں مے خوار جائے اور اپنے تئیں چھپائے تو وہ اور ظاہر ہو کر زیادہ رسوا ہوتا ہے۔ گو ان ریاکاروں کو دنیا میں بظاہر لوگ تعظیم کی نظروں سے دیکھتے

۱۔ اصل: گو بدکاروں کی بدیاں۔

ہیں مگر انسان کو اپنی باطن آرائی کی طرف زیادہ خیال اور توجہ چاہیے - ظاہر آرائی کے لیے خوش خوئی و مستقل مزاجی کو دکھانا اچھا نہیں ہوتا - بہتر ہے کہ اگر کسی شخص کو غصہ نوکر پر آئے تو وہ اس کے منہ پر ایک تھپڑ مار دے ، مگر یہ نہ کرے کہ ظاہر میں اس سے کچھ نہ کہے اور دل میں کینہ رکھے - جو اپنے غصے کی بھڑاس نکال ڈالتے ہیں ، اُن کا سینہ بے کینہ اور دل صاف ہو جاتا ہے - ظاہر کی برائی سے باطن کی برائی زیادہ خوفناک ہوتی ہے -

۹۲- خاندان میں جو لوگ سرپرست ہیں ، ان کو اپنے غصے کو حدِ اعتدال سے باہر نکالنا نہیں چاہیے - کبھی ایسی صورتیں پیش آتی ہیں کہ غصہ ہونا ضرور پڑتا ہے - گو غصہ نہ بھی آئے تو غصے کی صورت بنانے سے وہاں کام نکل جاتا ہے - جب کوئی شخص بار بار غصے میں آن کر اَوروں کو لعنت ملامت کرتا ہے تو اس کا اثر بہت ضعیف ہو جاتا ہے اور اس کی باتوں کا سننا عادت میں داخل ہو جاتا ہے - اگر وہ اپنے نوکروں کے ذرا ذرا سے قصور پر خفا ہوتا ہے ، جیسے نوکر نے برتن کو ٹیڑھا رکھا یا اس کو صاف اچھی طرح نہیں کیا تو وہ گالیاں دینی شروع کرتا ہے ، چور اور بدمعاش کہنے لگتا ہے ، تو پھر نوکروں پر غصے کا اثر نہیں رہتا - عقل کا اقتضا یہ ہے کہ جب تک غصے سے کوئی کام نہ نکلے ، غصے نہ ہونا چاہیے - اس لیے جو شخص غیبت میں کسی شخص پر خفا ہوتا ہے ، وہ حقیقت میں سائے پر حملہ کرتا ہے اور پیش از وقت کام کرتا ہے - غصے کا ہونا تو جب ہی مناسب ہے کہ جن شخصوں نے خفا کیا ہے ، وہ روبرو ہوں اور ان پر ہماری خشم ناکی کا اثر ہو - یوں پیٹھ پیچھے بڑبڑانا ایسا ہے جیسے کہ بیلوں کا حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے سینگوں کو درختوں کے تنے پر مارتے ہیں اور ڈکارتے ہیں اور پیروں سے

خاک اڑاتے ہیں ، اور یہ جانتے ہیں کہ ہم خوب لڑ رہے ہیں - بعض آدمیوں کو گو غصّہ بہت جلد جلد آتا ہے مگر وہ تھوڑی دیر میں اُتر جاتا ہے - وہ صرف زبان کو اپنے غصّے کا ہتھیار بناتے ہیں - وہ بُرے الفاظ وہیں تک نکالتے ہیں جہاں تک اُن کا اثر لوگوں پر معقول ہو - وہ ایسا کلام نہیں کرتے جو لوگوں کے دلوں کو چھیدے اور تلوار اور سنان کا کام کرے - یہ کہنا کہ انسان کبھی غصّے کو نہ آنے دے اور دل کو اطمینان اور آرام سے رکھے ، بہت عمدہ نصیحت معلوم ہوتی ہے مگر اس پر عمل نہیں ہو سکتا -

ارسطو کا قول ہے کہ بعض اوقات نیکی کا ہتھیار غصّہ بن جاتا ہے - اگر اس کا یہ مقولہ سچ ہے تو یہ ہتھیار نئی طرح کا ہوگا ، اس لیے کہ اَور ہتھیاروں کو ہم پکڑتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں چلاتے ہیں ، مگر یہ ہتھیار ہم کو پکڑتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے ، چلاتا ہے -

۹۳- غصّے اور دیوانگی میں فرق

جو شخص غصّے کو دیوانگی کہتا ہے ، وہ اس کی وقعت کو بڑھاتا ہے ، اس لیے کہ دیوانگی تو اُس مرض کا نام ہے کہ دماغ میں ایسا خلل واقع ہو کہ ساری عقل جاتی رہے - ایسی حالت میں جو افعال سرزد ہوتے ہیں اور اس سے بُرائیاں جو پیدا ہوتی ہیں ، وہ گناہ میں نہیں گنی جاتیں - برخلاف غصّے کے کہ اس میں نخوت اور حماقت کے سبب سے دیوانگی پیدا ہوتی ہے - اُن شرارتوں کے کرنے کا قصد ہوتا ہے جن کو وہ کر نہیں سکتا -

۴۹- تکلیف و رنج کا وہم و خیال

ایک بڑے نامور حکیم کا مقولہ ہے کہ کوئی چیز خود[۱] ہم کو آزار اور رنج نہیں پہنچاتی ہے بلکہ اس کا خیال اور وہم ہم کو سخت تکلیف پہنچاتا ہے - اگر یہ مقولہ بالکل صحیح ثابت ہو جائے تو اس سے انسان کو اپنی کم بخت حالت کی تشفی اور تسلی کے لیے اکسیرِ اعظم ہاتھ لگ جائے - اس واسطے کہ اگر دنیا میں کوئی موذی شے ہم میں خود نہیں داخل ہوتی بلکہ ہماری رائے اور خیال اس کو موذی بنا لیتے ہیں ، تو یہ اس ہمارے اختیار میں ہو جاتا ہے کہ یا[۲] تو اس کو ہم پرلے درجے کا ذلیل سمجھیں یا بجائے موذی کے نافع بنا لیں - جب یہ موذی چیزیں خود ہم کو اپنے اوپر مختار بناویں تو پھر ان کو ہم منفعت اور مصلحت کے لیے بکار آمد کیوں نہ بنائیں؟ جس چیز کو ہم موذی اور ایذا رساں کہتے ہیں ، اگر در حقیقت وہ ایسی نہیں ، بلکہ ہمارے خیال اور رائے نے یہ صفات اس میں پیدا کر دی ہیں ، تو اس حالت میں کہ کوئی مانع ہمارا نہ ہو ، ہم کو اختیار ہے کہ ہم اپنے اس خیال کو بدل دیں - ہم بڑے بے وقوف ہوں اگر ایذا رساں جانب کے طرف دار بنیں اور بیماری ، افلاس ، ذلّت کے کڑوے اور ناگوار مزوں سے تلخ کام ہوں اور ان کو خوش ذائقہ نہ بنائیں - اگر قسمت سے یہ مادہ ہم کو حاصل ہو جائے تو ضرور ہے کہ اس کی کوئی صورت ہم بنائیں - مولوی روم[۳] کے

۱- اصل : کوئی خود چیز -   ۲- اصل : کہ کیا -

۳- مولوی روم : جلال الدین رومی (۱۲۰۷ع—۱۲۷۳ع) مشہور صوفی شاعر- بلخ میں پیدا ہوئے اور قونیہ میں فوت ہوئے - انھوں نے بغداد ، مکہ معظمہ ،

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اشعار بھی قابل یاد رکھنے کے ہیں :

آدمی را فربہی است از خیال — گر خیالاتش بود صاحب جمال[1]
ور خیالاتش نماند ناخوشی — می گدازد ہمچو موم از آتشی
درمیانِ مار و کژدم گر ترا — با خیالاتِ خوشاں دارد خدا
مار و کژدم مر ترا مونس شود — کاں خیالت کیمیای مس شود
صبر شیریں از خیالِ خوش‌شد است — کاں فرح و تازگی پیش آمد است

جن چیزوں سے ہم خوف کرتے ہیں ، اگر ان کا اصلی وجود ایسی قدرت رکھتا ہے کہ اپنی حکومت سے ہمارے اندر اپنا گھر بناتا ہے ، تو اِس سبب سے کہ سب انسان ایک جنس ہیں اور سب کے پاس خیالات اور فیصلہ کرنے کے اوزار اور آلات ایک ہی ہیں ، گو ان میں چھوٹے بڑے ہونے کی نسبت ہو ، تو وہ یکساں اور ایک ہی طرح ان کے اندر بسے گا ۔ مگر اختلافِ رائے جو ان کے باب میں ہمارے اندر ہے ، وہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ وہ ہمارے اندر اس اسلوب سے داخل ہوتے ہیں کہ ایک شخص ، شاید جیسا ان کا اصلی وجود ہے ، اس کو اپنے اندر داخل سمجھتا ہے اور ہزاروں آدمی ان کے اُس وجود کو ، جو اصلی وجود سے متغایر ہوتا ہے یا متضاد ، اُس کو اپنے اندر سمجھتے ہیں ۔ ہماری جان کے یہ تین بڑے دشمن ہیں : موت ، افلاس ، آزار ۔ اب ہر چیز کی نسبت ہم لکھتے ہیں کہ کیا لوگ سمجھتے ہیں ۔ ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

دمشق اور دوسرے کئی شہروں کا سفر بھی کیا ۔ بالآخر قونیہ میں وعظ و تلقین شروع کی ۔ انھوں نے شمس تبریز کو تلقین کی اور سلسلۂ مولوی کی بنیاد رکھی ۔ ''مثنوی معنوی'' ان کی مشہور و معروف تصنیف ہے ۔ مولانا روم وحدت الوجود کے قائل تھے ۔

۱۔ تمام شعر اصل کے مطابق ہیں ۔

وہ لوگ ہیں کہ موت کی برابر کسی اور چیز کو خوف ناک نہیں سمجھتے - وہ دہشت ناک چیزوں میں بھی سب سے زیادہ ہولناک اسی کو جانتے ہیں - مگر دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ زندگی کے طوفان اور طغیانی کے لیے بندرگاہِ امن یہی ہے - تمام آلامِ حیات کا خاتمہ اسی پر ہو جاتا ہے - اس مرگ کو حیاتِ طبعی کہتے ہیں -

افلاطون کا قول ہے کہ ''مُت بالارادة تحی بالطبعة''[1] - بارِ جسمانی کے تحمّل سے روح مجرّد ہو جاتی ہے ، قفسِ قالب سے طائرِ روح آزاد ہو جاتا ہے - موت سب مرضوں کی دوا ہے - موت میں جو لذّت ہے ، وہ حیات میں نہیں -

قدیم حکما کا قول ہے کہ ''انسان حیٌ ناطقٌ مائیتٌ'' (زندہ ، ناطق ، مرنے والا) - پس موت سے انسان کی تکمیل ہوتی ہے :

نشنید کہ ہر کہ بمیرد تمام شد (کذا)

جواں مرد موت کو پکار پکار کر کہتے ہیں کہ ہم تیرے قدر شناس ہیں ، تو ہمارے پاس آ ، نامردوں پاس نہ جا - اب ہم ان شیخی کے بہادرانہ کلاموں کو چھوڑتے ہیں ، واقعات بیان کرتے ہیں -

حکما اکثر ارادۂ موت کو پہلے سے سوچتے ہیں ، مرنے کے لیے جلدی کرتے ہیں ، موت کے بلانے میں مدد کرتے ہیں - بہت سے ہم ایسے دیسی آدمیوں کو بھی دیکھتے ہیں کہ مرنے کے لیے جاتے ہیں - یہ مرنا بھی ان کا خالی مرنا نہیں ہوتا بلکہ بڑی ذلّت اور تکلیفوں کے ساتھ ، مگر ان کے چہرے پر ذرا بھی اضطراب نہیں معلوم ہوتا - خواہ یہ حال ان کا فطرتی بھولے پن سے ہو یا جواں مردی اور دلیری سے ہو - اس حالت میں سب اپنے کام کرتے ہیں - معاملاتِ خانگی

۱- عزم کے ساتھ موت قبول کر تا کہ تمھیں حیاتِ طبعی حاصل ہو -

کا فیصلہ کرتے ہیں، دوستوں کو وصیّت کرتے ہیں، گاتے ہیں، وعظ کہتے ہیں، انھوں سے مخاطب ہو کر باتیں کرتے ہیں۔ بعض اوقات لطیفہ سنجی دوستوں سے کرتے ہیں، مے نوشی ان کے ساتھ کرتے۔ غرض سب کام سقراط کے سے کرتے ہیں۔

۵۹۔ عجب عجب حکایات اُن لوگوں کی مشہور ہیں جو پھانسی پائے گئے: نظامی[۱]

شنیدم رسن بستہ سوئے دار | برو تازگی رفت چوں نوبہار
بپرسیدش از مہربانان یکے | کہ خرّم چرائی و غم اندکے؟
چنیں داد پاسخ کہ عمر ایں قدر | بغم بُردنش چوں توانم بسر

ایک شخص پھانسی کے لیے چلے جاتے تھے۔ انھوں نے پہرے کے سپاہیوں سے کہا کہ بھئی تم مجھ کو اُس بازار سے نہ لے جانا، وہاں میرا پرانا قرض خواہ رہتا ہے، وہ گرفتار کر لے گا۔ ایک اور ایسے ہی شخص نے پھانسی دینے والے سے کہا "بھئی مجھے گُدگُدیاں بہت لگتی ہیں، کہیں تم میری گردن کو ہاتھ نہ لگانا، مجھے ہنسی آ جائے گی۔"

ایک شخص نزع میں پادری صاحب کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کر رہے تھے کہ پادری صاحب نے فرمایا کہ تم خداوندِ مسیح کے ساتھ کھانا کھاؤ گے۔ اس پر اس نے کہا کہ میری جگہ آپ کھانا کھانے چلے جائیے، میں آج روزہ رکھ لوں گا۔

ایک پھانسی لگنے والے نے پانی مانگا۔ جب پانی آیا تو پھانسی دینے والے نے پہلے پی لیا۔ جب اپنا جھوٹا پانی اسے پینے کو دیا تو

۱۔ نظامی: (۱۱۴۰ع—۱۲۰۲ع) مشہور ایرانی شاعر۔ فارسی ادب پر ان کے گہرے اثرات مترتب ہوئے۔ ان کی کتاب "خمسۂ نظامی" مشہور ہے جس میں پانچ مثنویاں ہیں، یعنی مخزن الاسرار، خسرو شیریں، لیلیٰ مجنوں، اسکندر اور ہفت پایکار۔

اس نے کہا کہ میں یہ جھوٹا پانی نہیں پیتا - مجھے خوف ہے کہ کہیں بیمار نہ ہو جاؤں -

ایک شخص کو پھانسی پانے کے وقت ایک قحبہ نہایت بد شکل دکھائی گئی اور کہا گیا کہ تم اس سے نکاح کر لو تو جاں بخشی ہو جائے گی - تھوڑی دیر اسے بھانپ[1] کر کہا کہ یہ لنگڑاتی ہے، مجھے جلدی پھانسی دو - ایسے ہی ایک شخص کے روبرو ایک لڑکی لائی گئی اور کہا گیا کہ اس سے شادی کر لو تو جان بچ جائے - اس نے کہا کہ یہ کلّہ خشک ہے اور ناک اس کی بہت بڑھی ہوئی ہے - مجھے اس سے شادی کرنی پسند نہیں، مرنا پسند ہے - تاریخ میں بہت سی مثالیں ایسی ہیں کہ ہزاروں آدمیوں نے ذرا سی بات دشمنوں کی نہیں مانی اور جان دے دی - ایک بادشاہِ ایران نے شہر فتح کر کے اہلِ یونان سے کہا کہ تم میرے لیے دعا مانگو کہ بادشاہ کو خدا سلامت رکھے - مگر یہ یونانیوں نے نہ مانا - وہ پہلے ایرانیوں کے ساتھ لڑائی میں عہد کر چکے تھے کہ مرنا قبول ہے مگر یونانی قوانین کی بجائے ایرانی قوانین کا ماننا منظور نہیں - تُرکوں اور یونانیوں میں لڑائی ہوئی تو تُرکوں نے ختنہ نہ کرانے اور اصطباغ[2] پانے پر موت کو ترجیح دی -

بہت سی مثالیں ایسی ہیں کہ دوستوں نے دوستوں کی بجائے اور ملازموں نے اپنے آقاؤں کے بدلے اور شاگردوں نے اپنے اُستادوں کے

۱- اصل میں ''پھاب'' ہے -

۲- اصطباغ : رنگنا - غوطہ دینا - نصاریٰ اپنی اولاد کو، اور نہ صرف اولاد کو بلکہ ہر ایک مذہب عیسوی میں داخل ہونے والے کو زرد پانی میں غوطہ دے کر کہتے ہیں کہ اب نصرانی ہوا - بپتسما دے کر عیسائی بنانا - (نوراللغات)

عوض میں جان دینی قبول کر لی - ہندوؤں کی عورتیں کیسے ہنسی خوشی ستی[1] ہونے کو قبول کرتی تھیں - نرسنگا[2] میں جب بادشاہ مرتا ہے تو اس کی تمام بیویاں اور حرمیں، اس کے عزیز، نوکر، افسر، گھر کے اندر کے ملازم بادشاہ کے ساتھ جلنے کو بڑی عزت سمجھتے ہیں - بعض اوقات شہر کے شہر دشمنوں کے ہاتھ سے ایسی ایذا پاتے ہیں کہ اپنے مرنے کی سینکڑوں ترکیبیں نکالتے ہیں -

ایک لمبی چوڑی فہرست، عورت مردوں کی، ہر قوم اور ملّت کی اور ہر زمانے کی، ایسی بن سکتی ہے کہ جنھوں نے موت کو خود اختیار کیا اور زندگی سے سیر ہو کر یہ چاہا کہ اب مرنے میں زیادہ مزہ ہے - مگر جو لوگ موت کے خوف سے لرزاں اور ہراساں رہتے ہیں، ان کی تعداد کے سامنے اوپر کی فہرست کسی شمار میں نہیں گنی جا سکتی -

ایک کشتی دریا میں چلی جاتی تھی کہ آندھی بڑے زور و شور سے آئی - اِس کشتی میں حکیم پرہو بھی بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ ایک سؤر تھا - جب اُس نے دیکھا کہ آدمیوں کے گھبراہٹ کے مارے اوسان خطا ہوئے جاتے ہیں تو اُس نے اپنے سؤر کی طرف اشارہ کر کے (اُن سے) کہا کہ دیکھو تم انسان ہو کر اتنا گھبراتے ہو - یہ حیوان ہے، اس کو ذرا بھی خبر نہیں - تم کو خدا نے عقل دے کر اشرف المخلوقات بنایا اور سارے جانوروں کا مالک اور بادشاہ کیا - تم کو خدا نے

۱- ستی ہونا: عورت کا اپنے شوہر کے فراق میں جل کر مر جانا - (نوراللغات)
۲- نرسنگا: لغات میں ''نرسنگا'' کے معنی بجانے کا سینگ، بگل، صُور وغیرہ لکھے ہیں جو یہاں موزوں نہیں - البتہ ''نرسنگھ'' کے آگے فرہنگِ آصفیہ میں دوسرے معانی کے علاوہ ''شہ زور آدمی، بہادر آدمی'' بھی لکھا ہے - یہ غالباً کسی ملک یا ریاست کا نام ہے -

عقل اس لیے دی ہے کہ تم اپنے تئیں تکلیف پہنچاؤ؟ کیا عقل ہمارے اطمینان اور خوشیوں کو خاک میں ملانے والی ہے جس سے ہماری حالت سؤر سے بھی بدتر ہو جاتی ہے؟ کیا ہم اپنی عقل کو، جو ہماری حالت اعلیٰ درجے کی نیک بنانے کے لیے دی ہے، اس کو اپنی بربادی و تباہی کے کام میں لائیں؟ اس سبب سے ہم قدرت کا قانون، جو عام ہے، اسے توڑتے ہیں؟ جو استعداد اور قابلیت و اعضا اور وسائل اس نے عطا کیے، ان کو اپنی نفع رسانی[1] اور مصلحت میں کام میں لائیں۔

امراض اور بیماریوں کی وہ سخت ایذائیں اور تکلیفیں ہیں کہ بڑے بڑے ولی اللہ بھی حذر[2] مانگتے ہیں۔ ان کو یہ سمجھنا کہ وہ فقط خیال سے پیدا ہوتی ہیں، صریح غلط معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ حواس ان کی شہادت دیتے ہیں۔ اگر یہ حواس جھوٹے ہیں تو عقل بھی سچی نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کوڑے جو ہماری پیٹھ پر لگ رہے ہیں، وہ کیا اچھی گُدگدیاں ہیں۔ ایلوا[3] گھول کر جو پلایا جائے، اسے کہہ دے کہ کیا میٹھا شربت ہے۔ یہاں تو پرہو کے سؤر کی کچھ نہیں چلتی۔ اگر اس کی پیٹھ پر لکڑیاں لگاؤ تو وہ بھونکتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاں اسے بھی تکلیف ہوئی ہے۔ جو لوگ زبان سے بک دیتے ہیں کہ امراض میں تکلیفات خیالی ہیں، وہ واقعات سے الفاظ کو بھڑاتے ہیں۔ گو لفظاً وہ انکار کرتے ہیں مگر اس کا اقرار کیے بغیر چارہ نہیں۔

غرض یہ قاعدۂ کلیہ نیچر کا ہے کہ جو آسمان کے نیچے جاندار

۱۔ اصل: نفع رساں۔

۲۔ حذر مانگتے ہیں، یعنی پناہ مانگتے ہیں۔

۳۔ ایلوا = مصبّر۔ ایک قسم کی کڑوی دوا۔

ہے، وہ امراض سے متاذّی[1] ہوتا ہے۔ موت کا اِدراک عقل سے ہوتا ہے۔ وہ ایک آنی حرکت ہوتی ہے۔ موت کے واسطے نہ زمانۂ استقبال ہے، نہ ماضی ہے۔ حال میں وہ آ چکی یا آئے گی۔ جس عرصے میں کہ موت آنکھیں اپنی دکھاتی ہے، اس سے بہت تھوڑی دیر میں ہزاروں حیوان اور انسان مر جاتے ہیں۔ غرض مرنے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ بعض کہتے ہیں کہ موت کا تو سب کو یقین ہے کہ وہ ضرور آئی گی اور دفعۃً آئے گی۔ اس کا خوف فقط بیماریوں کی ایذاؤں سے ہوتا ہے۔ موت کی لین ڈوری[2] بیماری ہی ہوتی ہے۔ بعض اس کے بالعکس کہتے ہیں کہ بیماریوں کا خوف جب ہی زیادہ ہوتا ہے کہ ان میں مرنے کا گمان ہوتا ہے۔ امراضِ مہلک ہی میں دوہرا خوف ہوتا ہے: ایک مرض کی تکلیف کا، دوسرا مرنے کا۔ جو امراض مہلک نہیں ہوتے، اُن میں فقط اکیلی ایذا کا خوف ہوتا ہے۔ بزرگوں کا یہ مقولہ ہے کہ خود موت میں خوف نہیں، خوف تو موت کے بعد ہے۔ مگر ایک حکیم کا یہ قول ہے کہ موت سے پہلے اور پیچھے جو خوف ہیں، وہ موت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے۔

غرض موت میں تکالیفِ امراض کا خیال ہوتا ہے اور افلاس میں تکالیف کا خیال مصائب کے سبب سے ہوتا ہے: بھوکا پیاسا مرنا، جاڑے میں اکڑنا، گرمی میں جلنا اور بہت سی بے آرامیاں اور بے چینیاں۔ صبر سے یہ ساری مصیبتیں معدوم تو نہیں ہو سکتیں مگر ان کے تشدّد میں تخفیف ہو سکتی ہے۔ گو جسم اور عقل دونوں روح سے سرکشی کریں مگر صبر اس کو اچھی حالت میں رکھ سکتا

۱۔ متاذّی = ایذا رسیدہ۔

۲۔ لین ڈوری: (مونث) وہ خیمہ جو آگے جاتا ہے۔ (۲) (کنایۃً) کسی بات کی آمد کا نشان۔ کسی کام کے آغاز کی نشانی۔ ابتدا۔ (نوراللغات)

ہے - اگر یہ مصائب نہ ہوتے تو انسان کی بہت سی خوشیاں اور نیکیاں کبھی ظاہر نہیں ہوتیں - شجاعت، علوِ ہمّت، قوّت و عزمِ جزم کی شہرتیں اِن مصائب ہی کے سبب سے ہوتی ہیں - اگر وہ نہ ہوں تو پھر یہ خوبیاں نہ رہیں - شجاعت تو خوفوں کی مشتاق رہتی ہے - میدانِ جنگ میں سخت زمینوں پر سونا پڑتا ہے - ہتھیاروں کے پھلوں کے زخم اپنے پہلوؤں پر اٹھانے پڑتے ہیں - گرمی میں، دھوپ میں جلنا پڑتا ہے - بھوکا پیاسا رہنا ہوتا ہے - گھوڑے گدھوں کا گوشت کھانا پڑتا ہے - آدمیوں کے چھیچھڑے اڑتے ہوئے، زخموں سے چُور چُور بدنوں سے لہو نکلتے ہوئے اور زخموں میں ٹانکے لگتے ہوئے، سلائیاں پڑتی ہوئیں، یہ سب باتیں دیکھنی پڑتی ہیں - پس یہی مصائب ہیں جن کے اندر صبر کرنے نے جواں مردوں کو گنواروں اور نامردوں پر فوقیت دی ہے - بزرگوں کا قول ہے کہ دنیا میں وہی بڑے کام گنے جاتے ہیں جن میں محنت اور مشقّت اٹھانی اور رنج کھینچنے پڑتے ہیں - انسان صرف ہنسی کی باتوں، مسخرگی، دل لگی، شوخی، مزاح، چھیڑ چھاڑ، سبک سروں کی صحبت سے خوش نہیں ہوتا، بلکہ زیادہ تر اس کو مسرّت و انبساط اپنے استقلال و ثبات کے کاموں سے حاصل ہوتی ہیں - میدانِ جنگ میں تلوار کے زور سے فتح حاصل کرنے میں جو ناموری اور شہرت حاصل ہوتی ہے، وہ خدع[1] و فریب و حکمتِ عملی سے فتوحات حاصل کرنے میں نہیں ہوتی - کام کی قدر اس کی قیمت پر موقوف ہے - جن کاموں کی قیمت میں ہم اپنی جان اور خون دیں، اس سے زیادہ اور کیا کام بیش بہا ہو سکتے ہیں -

---

۱- خدع = دھوکا (اصل میں "خداع" چھپا ہے) -

نیچر کا قاعدہ ہے کہ جس دکھ درد میں تشدّد زیادہ ہوتا ہے وہ دیرپا نہیں ہوتا۔ یا[۱] وہ خود جلد ختم ہو جاتا ہے یا خاتمہ کر دیتا ہے۔ جب تم اس کی برداشت نہیں کر سکتے تو وہ تم کو دنیا سے برداشتہ کر دیتا ہے۔ جو دکھ درد تشدّد سے خالی ہوتے ہیں وہ دیرپا ہوتے ہیں۔ ہمیشہ بیچ میں آرام کرنے کے لیے وقفہ دیتے ہیں۔ جب ہم کو شہر خوش نہیں آتا تو باہر چلے جاتے ہیں؛ ایسے ہی[۲] جب دنیا کے رنج و الم کی برداشت نہیں ہو سکتی تو یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ انسانوں میں رنج و تکلیف کی برداشت کرنے کی مختلف قابلیتیں ہوتی ہیں، بلکہ ایک ہی انسان میں مختلف اوقات و حالات میں یہ قابلیت بدلتی رہتی ہے۔ وہی شخص جو فصّاد[۳] کے نشتر سے گھبراتا ہے، میدانِ جنگ میں ایسی حرارت اس میں آ جاتی ہے کہ تلوار کے بہت سے زخم کھاتا ہے اور کچھ پروا نہیں کرتا۔ بچہ جننے کا درد وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے سخت بتلایا ہے مگر عورتوں کی قوّتیں ایسی ہیں کہ ان کے پیٹ میں جو کچھ آج ہے، وہ کل پیٹھ پر سوار ہے۔ وہ پیٹ سے نکلا نہیں کہ پیٹھ پر ڈالا نہیں۔ بہت سی گنواریاں بچے جنتی ہیں اور ٹوکری میں ڈال کر سر پر رکھ کر گھر میں لے جاتی ہیں۔ بیچ میں کوئی ندی نالہ آیا تو اس میں خود نہا لیں اور بچے کو نہلا لیا۔ فاحشہ عورتیں اسقاطِ حمل بے تکلّف کرتی ہیں۔ منچرے[۴] استروں سے سینکڑوں زخم بدن پر لگاتے ہیں اور خبر نہیں ہوتی۔ جوگی نقیر کیسے

۱۔ اصل : کیا۔

۲۔ اصل : ہے۔

۳۔ فصّاد : نشتر لگا کر خون نکالنے والا۔

۴۔ منچرے : لغات میں یہ لفظ نہیں ملا۔ اصل میں اسی طرح چھپا ہے۔

کیسے کشٹ اٹھاتے ہیں ؛ ہاتھوں کو سکھا دیتے ہیں ، الٹے درختوں میں لٹکتے ہیں ، مٹی راکھ کھاتے ہیں کہ رنگ زرد ہو جاتے ہیں - اِن تکالیف کے برداشت کرنے کی مردوں ہی میں صفت نہیں ہے بلکہ عورتوں میں بھی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں - بعض بعض مقامات میں اپنے چہرے کی[1] کھال نئی کھال نکلنے کے لیے اتروا ڈالتی ہیں ، سفید بالوں کو جڑ سے اکھیڑ ڈالتی ہیں ، اچھے پچھے دانتوں کو اکھڑوا ڈالتی ہیں کہ خوبصورت بتّیسی کے دانت لگائیں - غرض روزمرہ اس کی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ ایک آدمی جس مصیبت سے رو رہا ہے ، دوسرا اپنے صبر کے سبب سے مضطرب نہیں ہوتا - غرض افلاس کے مصائب گو زیادہ مضرّت رساں ہیں مگر ان میں صبر و استقلال و برداشت کرنے سے خوبیاں ایسی پیدا ہوتی ہیں کہ ان سے انسان کا دل خوش ہونے لگتا ہے اور ان کی تکالیف کم ہو جاتی ہیں - بعض حکیم کہتے ہیں کہ دولت مندی سے انسان کے معاملات بدل جاتے ہیں ، کوئی خوشی نہیں بڑھتی - احتیاج کے سبب سے حرص نہیں ہوتی بلکہ دولت کی افراط سے - مفلس کو افلاس سے جو تکالیف ہوتی ہیں ، وہ دولت مند کو حرص سے -

تمام مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ موت ، مرض ، مفلسی ، یہ تین مصیبتیں سب سے بڑھ کر انسان کے لیے ہیں - ان میں موت کی تکلیف میں تو خیال کو دخل ہو سکتا ہے ، سوائے اس کے اور بہت سی چیزیں جو زمانۂ آیندہ سے تعلق رکھتی ہیں ، ان میں خیالات کو بڑا دخل ہے ؛ مگر افلاس اور امراض کی تکالیف مشاہدے میں اتی ہیں ، وہ اصلی ہیں ، خیال کو اس میں دخل نہیں ہے -

---

۱- اصل : کے -

۱۹٦[1]- سچّائی یا راستی

۱- سچّائی یا راستی میں اموراتِ نفس الامری ہوتے ہیں - اگر وہ فلسفیانہ و حکیمانہ و عارفانہ ہوں تو ان کا نام خاص حق یا صدق ہم رکھتے ہیں ، اور اگر وہ دنیا کے اموراتِ سلطنت و مملکت و روزمرّہ کے کام کاج اور معاملات و مقدّمات سے متعلق ہوں تو ان کا خاص نام راست بازی یا راست گوئی یا درست کرداری رکھتے ہیں ، اور علی العموم ان سب پر راستی یا سچّائی کا اطلاق کرتے ہیں -

۲- راستی جس چیز کو زیب و زینت دیتی ہے ، اس کی خوبی کو ایسا بڑھا دیتی ہے جیسی گل کی خوبی کو اس کی خوشبو - یوں موسمِ بہار میں ہزاروں پھول کانٹوں پر شگفتہ ہیں ، جو مثلِ گل[2] اپنی رنگتوں کی چمک اور شوخیاں دکھاتے ہیں ، مگر جب مرجھا کر مر جاتے ہیں تو زمین پر پڑے سڑا کرتے ہیں ، کوئی ان کا گاہک نہیں ہوتا - مگر گل اپنے مرجھانے کے بعد بھی وہ خوشبوئیں بناتا ہے کہ جن سے دل و دماغ کو فرحت و راحت ملتی ہے - پس اے نوجوان! تُو اپنی زندگی گل کی سی بنا کہ مرنے کے بعد تجھ سے وہ سچّائی کا سَت اور عطر نکلے کہ لوگوں کا دماغ اس سے معطّر ہو - اگر غور سے دیکھو تو سچّائی سر تا پا حسن و جمال ہے - کوئی قدرتی خوبی اس کی مثل نہیں - اخلاق کی جان سچّائی ہے - چہرے کا جمال خط و خال کا سچّا ہونا ، راگ کا جوہر سُروں کا سچّا ہونا ، عمارت کی خوش اسلوبی سچّا تناسب - شاعری میں گو سراسر جھوٹ

۱- یہاں سے تمام عنوانات کے ساتھ نمبروں کا اضافہ مرتّب نے کیا ہے -

۲- مصنّف نے گل اور پھول میں یوں تمیز کی ہے کہ جس میں خوشبو ہے وہ گل ہے اور جو خوشبو سے خالی ہے وہ پھول ہے -

بھرا ہوتا ہے مگر جہاں اس میں سچّائی جلوہ نمائی کرتی ہے، ایک کمال پیدا کر دیتی ہے۔ غرض جہان میں جہاں سچ کا بول بالا ہے، وہیں اُجالا ہے جس میں جھوٹ کا منہ کالا دکھائی دیتا ہے۔ سچ وہ ابرِ رحمت ہے کہ جس کی برکت سے عالم سرسبز ہے۔

۳۔ راستی کا رستہ کیسا سیدھا اور صاف، بے خطر، با امن و امان ہے کہ جس کے طے کرنے میں بہت کم تکلیف ہوتی ہے۔ وہ ہمارے مقصد تک پہنچانے کا رستہ بہت نزدیک و مختصر ایک خطِ مستقیم میں ہے۔ راستی سیدھے راہ چلتی ہے، جھوٹ کی چال پیچ در پیچ سانپ کی سی ہے کہ ذلّت سے پیٹ کے بل چلتا ہے اور پاؤں کے بل نہیں چلتا۔ اگر تم سچ کی راہ سے بھٹک گئے تو پھر بھول بھلیّوں میں پڑ گئے۔ جتنا چلو گے، اُتنے ہی پھیر میں پڑو گے۔ آخر کو اس سے نہ نکل سکو گے، تھک کے بیٹھ جاؤ گے، دوام کو ناکام رہو گے۔

۴۔ سچ میں وہ افسون ہے کہ منکر بھی اس پر مفتون ہیں۔ جھوٹے بھی اپنے جھوٹ کو سچ بتاتے ہیں۔ ان کا جھوٹ اور قصّوں اور کہانیوں کا جھوٹ وہی زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے جو سچ کے مشابہ ہوتا ہے۔ سچ میں وہ ادا ہے کہ سب کے دل میں کھبتی ہے۔ اس کی تلخی میں بھی ایک مزہ ہے۔ سچ کے پوچھنے والے بہت ہیں مگر اس کے سننے والے تھوڑے ہیں۔ لوگ سچ کو جو نہیں مانتے، اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اس کے لیے شہادت موجود نہیں ہوتی بلکہ اس سبب سے کہ سچ کے ڈھونڈنے کا میلان خاطر نہیں ہوتا اور اس کے تجسّس کی محنت و مشقّت گوارا نہیں ہوتی۔ اس طرف سے ایک بے اعتنائی ہوتی ہے۔ ہزاروں تلوّن مزاج سچ پر قائم نہیں رہتے۔ اپنے خیالات اور اقوال اور افعال کو سچ کا پابند نہیں رکھتے۔ دل کو پتّھر بنا کے صاف سچ سے مقابلہ کرنا اور اس کو نہ ماننا ایسا ہی

آسان ہے جیسا کہ آنکھیں بند کر کے دوپہر کی دھوپ کو نہ دیکھنا۔ انسان کی جبلّت میں یہ امر داخل ہے کہ جھوٹ بولنے سے مزہ آتا ہے، سچ سننے سے کتراتا ہے۔ جس شخص کو نیکی سے محبت ہے، اُس کو سچ سے محبت ہے، اس لیے کوئی نیکی نہیں جس کی اصل سچائی نہ ہو۔ برخلاف اِس کے کوئی برائی نہیں جس کی ابتدا جھوٹ سے نہ ہو۔ اگر آدمی یہ عہد کرے کہ میں سب گناہ کروں گا مگر جھوٹ نہ بولوں گا تو اس سے خود بہ خود سب گناہ چھوٹ جائیں گے، اس لیے کہ چوری اور جؤا کھیلنے کے وقت اس کو یہ خیال آئے گا کہ اگر کسی نے پوچھا تو سچ کہنا پڑے گا اور شرمندگی یا ذلّت یا سزا اٹھانی پڑے گی۔ پس سچ ہی اس کو ہر قسم کی برائی کرنے سے روکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جھوٹ تمام گناہوں کی ماں اور سچ سب برائیوں کا سلاح ہے۔ سچ کے پیٹ میں سب نیکیاں ہیں اور جھوٹ کی گرہ میں ساری برائیاں۔

۵۔ بعض حکیموں نے اس کی تحقیقات کی اور حیرانی میں رہے کہ جھوٹ سے آدمیوں کو نہ شاعرانہ خوشی ہوتی ہے نہ تاجرانہ نفع ملتا ہے، پھر وہ کیوں جھوٹ بولتے ہیں؟ اس کے زہر میں عسل کی حلاوت جانتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سچ کی نسبت جھوٹ زیادہ پُر رونق معلوم ہوتا ہے۔ وہ شمع کی سی روشنی ہے جس میں رنگ برنگ کے تماشے اور بازیاں بڑی خوشنما دکھائی دیتی ہیں۔ اور سچ دن کی سی روشنی ہے کہ جس میں وہ بوقلمونی و رنگ آمیزی پھیکی پڑ جاتی ہے۔ سچ ایک آبدار موتی ہے جو دن میں آب و تاب دکھاتا ہے۔ شب چراغ نہیں جو رات ہی کی روشنی میں جگمگاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جھوٹ میں لطف زیادہ آتا ہے، بے فائدہ دل خوش ہوتا ہے۔ اگر آدمیوں کے دلوں سے جھوٹ موٹ کے خیالات

و تشخّص و شیخی و تعلّی نکل جائیں تو ان کی ساری امنگیں و ترنگیں و ولولے دل سے نکل کر ایسا افسردہ ان کو کر دیں جیسے کہ بدن سے کل خون نکل کر صرف پوست و استخوان باقی رہ جائے ۔

بعض آدمی کہتے ہیں کہ ہم سچے ہیں مگر ان کے دل میں راستی اس طرح ثابت نہیں جیسے کہ آسمان پر ثوابت[1] ثابت ہیں ، بلکہ ان کا حال شہابِ ثاقب کا سا ہے کہ ہوا میں ناچتا ہے ۔ اِدھر چمکا اُدھر غائب ہوا ۔ راستی ان کے دل پر پتّھر کی لکیر نہیں بلکہ ریت پر نقش ہے ۔ ہوا کے جھوکے سے اس کی شکل مٹتی ہے اور دم پھونکنے سے اس کی صورت بگڑتی ہے ۔ ان کے دل میں راستی کی روشنی یوں دکھائی دیتی ہے جیسا کہ طوفانِ باد و باراں میں ستارہ جھلملاتا ہوا ۔ گو وہ بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے مگر تھوڑی دیر میں ایسا نظر سے غائب ہو جاتا ہے کہ یہ شبہ پڑ جاتا ہے کہ وہ پہلے دکھائی بھی دیا تھا یا صرف نظر کا دھوکا ہی تھا ؟ بہت سے آدمی اپنی سچی رایوں کو اِس طرح بدلتے رہتے ہیں جیسے عورتیں اپنے[2] اَن چاہنے والوں کو کہ جن سے شادی کرنی منظور نہیں ہوتی ۔ جب نئے خواستگار مل گئے ، پرانے چاہنے والوں کر چٹخا دیا ۔ آدمی کو جھوٹ سے ایسی محبت ہے کہ جو جھوٹی باتیں اس کی آنکھ کو خوشنما معلوم ہوتی ہیں ، ان کو سچ یقین کر لیتا ہے ۔ مگر سچ بھی وہ قدرت رکھتا ہے کہ گو کوئی اس پر ناک بھوں چڑھائے مگر وہ اپنے سنجیدہ ثبوت سے اِس تیوری کے بل کو نکال ہی دیتا ہے ۔ سچ کی روشنی خود اس کی ذات سے ایسی عیاں ہوتی ہے جو دروغ کو بے فروغ کر دیتی

۱۔ ثوابت : وہ سیارے جو گردش نہیں کرتے ۔ (نوراللغات)

۲۔ اصل : اپنی ۔

ہے ۔ حق کے آخر سب طالب ہیں اور اس کے دعوے سب غالب ۔

٦۔ امرِ حق کی تحقیق ایک بڑا ادّق کام ہے ۔ وہ ایک بڑا مستحکم قلعہ ہوتا ہے جس کے گرد سب طرف دیوار نہایت استوار نیچر نے کھینچ دی ہے ۔ فراست اس کی قلعہ کشائی یوں کرتی ہے کہ اس کو نہایت محنت و توجہ سے سب طرف سے گھیرتی ہے ، اپنے تئیں بچانے کا خیال رکھتی ہے ۔ اس کے اندر جانے کے تمام رستوں اور راہوں کو قریب جا کر بڑی ہوشیاری سے دیکھتی بھالتی ہے ۔ کبھی اس کو یہ خیال ہوتا ہے کہ میں نے اس قلعے کے ایک حصے کو فتح کر لیا مگر تھوڑی دیر بعد وہ آپ اس پر متحیّر ہوتی ہے کہ فتح کیسی ، مجھے تو خود شکست ہو گئی ہے ۔ پھر وہ تیار ہو کر از سرِ نو حملہ آور ہوتی ہے اور اپنی مشکل آسان کرتی ہے ۔ مدتوں تک پڑی رہتی ہے مگر عقلی توپ خانے لگاتی ہے اور شکستوں پر شکستیں پاتی ہے ۔ براہین و حُجج[1] و استدلال کے گولے مارتی ہے اور نازک فرقوں اور نتائج کو دیکھتی ہے ۔ آخرِ کار وہ حق کے قلعے میں ، جو چاروں طرف سے بند تھا ، داخل ہوتی ہے ۔ جب دل بے قرار ہو کر اپنے رخ کو ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف پھیرتا ہے اور قوائے عقلیہ کو کہتا ہے کہ ایک بات کو سمجھ ، دوسری بات کو فیصلہ کر ، تیسری بات کی تنویع[2] کر ، چوتھی بات کو یاد کر ، اِس طرح سے بعض چیزوں کے نہایت نازک تفاوت و مطابقت معلوم ہوتے ہیں اور آخر کو بڑی مشکل اور دشواریوں سے وہ ایک بات کو

۱۔ حُجج : حجّت کی جمع ، یعنی دلائل ۔

۲۔ تنویع : کسی چیز کی الگ الگ قسمیں بنانا ۔ کسی بات کو تذبذب کی حالت میں چھوڑ دینا ۔

فرض کر کے اس کے آخری نتائج ایسے معلوم کرتے ہیں کہ پہلے جو باتیں آپس میں متضاد و متناقض معلوم ہوتی تھیں اور ایک دوسرے کی قاطع تھیں ، جس کے سبب سے مطلب سمجھ میں نہیں آتا تھا ، اُن کے اجزا باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کے موقوف علیہ معلوم ہوتے ہیں -

علوم کی تحقیقات میں امرِ حق کے دریافت کرنے کا یہی طریقہ ہے جو نہایت دشوار ہے - سچائی کا حال ایسا ہے جیسے کہ کسی پری بیگم کا جس کا شاہانہ مزاج ہو - اول تو اس کی صورت ہی نظر نہیں آتی ، اگر صورت نظر آجائے تو پہلی دفعہ میں ملاقات نہیں ہوتی - اب خواہ کیسے ہی اخلاق و تواضع سے اس کی طرف مخاطب ہو ، وہ سنتی ہی نہیں ، نظرِ التفات تو کجا - غرض جب تک مدّتوں پاپڑ نہ بیلو اور مشقّتِ شاقّہ نہ اٹھاؤ ، کوئی تمتّع اس سے نہیں اٹھا سکتے - دنیا میں جو بڑے بڑے ذہین عالی دماغ گزرے ہیں ، اُنھوں نے بھی کسی امرِ حق کو جب ہی دریافت کیا ہے کہ سخت محنت کو اپنے اوپر گوارا کیا ہے - بے محنت وہ بھی خالی ہاتھ رہے - غرض تحقیقِ حق میں جو کچھ نتیجہ ہاتھ آتا ہے ، وہ ریاضت اور محنت کا ثمرہ ہوتا ہے - تحقیقِ حق کی حد کو انتہا نہیں - تمام امورِ حق میں مذہبی حق کے لیے سب سے زیادہ محنت و مشقّت گوارا کرنی چاہیے - ہر شخص حق کا مردِ میدان نہیں ہو سکتا کہ اس میں دشمنوں کے سامنے مقابلے کے لیے بے دھڑک کھڑا ہو - تھوڑے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ حق کی پیروی میں غلطیوں کے لشکر پر بے تحاشا حملہ آور ہوں اور حق کے دشمنوں پر فتح یاب - راستی کی عقل جن لوگوں کی حامی ہوتی ہے ان میں اختلاف نہیں ہوتا - وہ حق کے قبول کرنے میں موافقت رکھتے ہیں - وہ ان کی ہوائے نفسانی کو روک دیتی ہے ، نفس

میں اطمینان پیدا کر دیتی ہے ۔ یہ راستی رائے کو اس طرح بتدریج بدلتی ہے کہ بدلنا معلوم نہیں ہوتا اور سہج سہج اس کو عقل کی طرف لے جاتی ہے ۔ جو راستی کی طرف سے انقلاب واقع ہوتے ہیں ، وہ انسان کو فائدہ پہنچاتے ہیں مگر اُن آدمیوں پر بارِ خاطر ہوتے ہیں جو ظلم کرتے ہیں اور فریب دیتے ہیں ۔ تھوڑے ہی آدمیوں پر حق کے گُن ایسے کھلتے ہیں جو اس کی دھن میں آخر ہوتے ہیں ۔

۷- چھوٹی چھوٹی باتوں میں جھوٹ بولنے کے اندر سہل انگاری نہیں چاہیے اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بڑی باتوں ہی میں سچ بولنا ضرور ہے ۔ اگر یوں جھوٹ بولنے لگو گے تو تھوڑے دنوں میں اس کے عادی ہو جاؤ گے ۔ عادت میں وہ زور ہے کہ پھر اس پر کوئی زور تمھارا چلنے کا نہیں ۔ اس عادت کے سبب سے لوگ بری طرح تمھارے اخلاق کا اندازہ کریں گے ۔ اس لیے بچوں کو چھوٹی چھوٹی باتوں سے ابتدا ہی سے روکنا چاہیے ۔ اگر کوئی بات ایک دروازے میں ہو اور وہ دوسرے دروازے میں بیان کریں تو اس سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے ، ان کو ڈانٹنا چاہیے ۔ تم نہیں جانتے کہ اس طرح سچ سے انحراف کہاں تک نوبت پہنچائے گا ۔ ساری گمراہیاں جھوٹ ہی سے پیدا ہوتی ہیں ۔

۸- رسم و رواج اور پرانے احکامات امرِ حق کے[1] تسلیم کرنے میں بڑے حارج ہوتے ہیں ۔ جب ایک سچی بات معلوم ہو جائے تو رسم و رواج کو بالائے طاق رکھ کر اس کو تسلیم کرنا چاہیے ۔ پہلے زمانے کے توہماتِ باطلہ اور وساوس کا دل میں بس جانا بڑا دشمنِ جانی سچی اور عقلی باتوں کے ماننے کا ہے ۔ پہلے جو لوگ

۱- اصل : کی ۔

لکھ گئے ہیں اس پر کوئی حسد نہیں کرتا - جیسے پہلے زمانے سے ان کو مانتے آئے ہیں ، اب بھی مانتے ہیں - زمانۂ دراز کی باتیں ایسی خوش نظر آتی ہیں جیسے کہ دور کی چیزیں فاصلے کے سبب سے خوش نما معلوم ہوتی ہیں - یہی ایک بات ایسی ہے جو ہمیشہ ہم سے انحراف کراتی ہے - امرِ حق جب ہی منکشف ہوتا ہے کہ مفصّل و متواتر غور اور خوض اس پر چلے جائیں اور خیالات کی تصحیح و ترمیم ہوتی رہے - انکشافِ حق میں انسان کے تمام قوائے عقلیہ کا ظہور ہوتا ہے - ہر نسل کے واسطے اس کا ایک حصّہ مقرّر ہے - پس ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے حصّے کا حق ادا کریں - یہ نوعِ انسان کا کام ہمیشہ کے لیے ہے - زمانۂ دراز میں بڑی تحقیقاتوں سے ایک امرِ حق قائم ہوتا ہے - جھوٹ تو یوں ہی رونق پا جاتا ہے - جس بات کی بنیاد کہ راستی پر نہیں ہوتی ، اس کو نیچر پلٹ کر کسی نہ کسی وقت میں دکھا دیتا ہے کہ وہ بے اصل ہے - اس لیے کہ دیر تک مکر و فریب نہیں چلتا - کاٹھ کی ہانڈی دیر تک نہیں جلتی ، کاغذ کی ناؤ دیر تک نہیں بہتی -

۹- انسان کی خوشی کی بنیاد سچ پر ہے - اس کے گروہوں کے باہمی اتفاق کی بندش سچ پر ہی ہے - بغیر سچائی کے نہ کسی زبان پر اعتبار ہو سکتا ہے ، نہ قسم ، عہد و پیمان و ضمانت پر اعتماد ، نہ کسی فریق میں دوستی و اتفاق - کہتے ہیں کہ شیاطین بھی آپس میں سچ بولتے ہیں تو ان میں اتفاق رہتا ہے -

۱۰- تمام علوم کا مرکز سچ ہے - انسان کے دل میں بڑا واعظِ ناصح سچ ہے - جب دل میں راستی کی موجیں اٹھتی ہیں تو حق کی فوجیں نازل ہوتی ہیں - کوئی چیز اس سے خالی نہیں ؛ کواکب میں ، آفتاب میں ، گل و نسیم میں موجود ہے - انسان فانی ہے ، اس کی

سچائی بھی فانی ہے - مگر خدا کی سچائی ازلی و ابدی ہے ، اس کی بنیاد کو کوئی خوف و خطر نہیں ، اس کا سر سب آفتوں سے محفوظ ہے - وہ اُس ہاتھ کی بنی ہوئی ہے جس نے آسمان بنایا ہے - بھلا اس پر طوفان کا اثر کیا ہوگا اور سمندروں کا تلاطم اس کو کب اپنی جگہ سے ہلا سکے گا - وہ زمانے کی ہزاروں سالوں کی طغیانی میں قائم رہتا ہے ، اس کو ہمیشگی ہے -

۱۱- افعال کا اقوال کے ساتھ موافق کرنا راست بازی ہے - سچ بولنا فراخ حوصلگی ہے - انسان کے دل میں نیکی ، ہوش مندی ، انصاف سچ ہی پیدا کرتا ہے - راستی ہی اس کی رائے کو زندہ بناتی ہے ، ان میں استقلال و استحکام پیدا کرتی ہے ، فہم و فراست کو روشن اور نیت کو درست ، حافظے کو خیالات سے معمور کرتی ہے - در حقیقت راست بازی ہی کا نام دانش مندی ہے - اس کے بغیر آدمی اندھا ہے - وہی اس کی عقل کی آنکھ کی پُتلی ہے - کوئی بیش بہا نعمت ، سچ کی برابر ، انسان کے پاس نہیں - مکاری اور ریاکاری سے بہت زیادہ فائدے راست کرداری سے حاصل ہوتے ہیں -

۱۲- سچ کی بڑی اور یقینی نشانی یہ ہے کہ تمام عالم اس کا تجربہ اور امتحان کرے تو اس کو ایک ہی طرح پائے گا اور کبھی اس میں تغیّر اور فرق نہ دیکھے گا -

۱۳- سچائی میں سوائے اچھائی کے کچھ اَور نہیں ہوتا - سچ سے محبت کرنی اور خدا سے محبت کرنی ایک ہی معنی رکھتی ہے ، اس لیے کوئی فرض انسان کا سچائی کی محبت کے برابر نہیں - اصل نسب کی شرافت سچائی ہے ، تمام خلقت کی لیاقت کا تاج سچائی ہے - سچائی انسان کا زیور ہی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک آلہ ہے - امیر آدمیوں کے لیے سچائی شان و شکوہ ہے ، غریب آدمیوں کا وہ راس المال

ہے ، رزق ہے ، اس کی سفارش ہے ، اس کے اعتبار کا محضر ہے - سچائی آفتاب کی روشنی ہے کہ کسی غلاظت سے ناپاک نہیں ہو سکتی - سچائی ہی ہماری عقل و فہم کی موضوع ہے ، جیسی کہ ہماری نیّت کی موضوع نیکی ہے - عقل جھوٹ سے خوش نہیں ہو سکتی ، جیسے نیّت کسی ظاہری بدی سے - سچائی پر ہمارے بہت سے معاملات موقوف ہیں - یہ بڑی شرم اور کم بختی کی بات ہے کہ ہم اس کو نہ دیکھیں - جس راہ میں ہم چلتے ہیں ، اس میں وہ ایسی چمکتی ہوئی ، روشن حرفوں میں لکھی ہوئی ہوتی ہے کہ دوڑنے والے بھی پڑھ لیں - پس تم اس سے کیمیا بناؤ کہ خیال سچا ہو - علم دانش مندانہ ہو ، شاہی عارفانہ ہو -

۱۴- یہ امر مشتبہ ہے کہ جو لوگ چاندی سونے کی کانیں بتلا گئے ہیں ، اُن کا آدمی احسان مند ہو یا اُن کا جو اُن کو صاف کر کے ان پر سکہ جما کے اور قیمت مقرر کر کے اس کو رائج کرتے ہیں ؟ پس اسی طرح یہ امر بھی تحقیق نہیں کہ انسان اُن بزرگوں کا ممنون ہو جو سچی باتیں کتابوں میں لکھ کر صندوق میں بند کر گئے ہیں یا اُن کا جو لوگوں کو وہ باتیں سکھاتے پڑھاتے ہیں - گو انھوں نے خود سچائی کو منکشف نہیں کیا ، مگر صندوق کے اندر جو کتابوں کی قید میں وہ تھی ، اسے آزاد کیا - انھوں نے سچائی کی روشنی کو بند کر کے نہیں رکھا بلکہ اس سے ہزاروں مشعلیں روشن کر کے اپنے ہاتھوں میں لے کر جہاں جہاں جہالت کی گھری تاریکی تھی ، وہاں لے گئے ہیں -

۱۵- سچ کے تین حصے ہوتے ؛ اول سچ کی تحقیقات کرنا جس سے اس کا عشق ظاہر ہوتا ہے - دوئم سچ کا جاننا جس سے اُس کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے - سوم سچ کا یقین کر لینا ہے جس سے آدمی مسرور ہوتا ہے - یہ تینوں باتیں انسان کی نیکیوں کی بادشاہ

ہیں - سچ کا زبان سے کہنا آسان ہے - وہ کانوں کو گیت اور باجوں کی آوازوں کی طرح بھلا معلوم ہوتا ہے ، اس کے احکام سننے سے دل خوش ہوتا ہے - بہت سے آدمی اس نیکی کی تعریف کرتے ہیں لیکن اس کے حکم کی پیروی نہیں کرتے - اس کی پیچ دار راہوں پر چلنا بھی سخت دشوار ہے - بے ڈھب نام اس کے ہنرمندی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں اور بہت سے رمز و کنایہ میں اس کے معنی بیان کیے جاتے ہیں - جب سچائی کی سچی تصویر بناؤ تو اس میں نور الٰہی نظر آئے گا لیکن اگر جھوٹی تصویر بناؤ تو وہ آنکھوں کو بڑا دھوکا اور فریب دے گی - جھوٹ سچ دونوں آپس میں بڑے تپاک اور اخلاق سے مل کر ٹھگوں کی طرح گھات میں ہمارے بیٹھے رہتے ہیں اور موقع پا کر ہم کو زخمی کرتے ہیں -

۱۶- ایک سچائی اور سچائیوں کا بیج ہوتا ہے - وہ آدمی کے دل میں اس لیے بویا جاتا ہے کہ وہ پھولے پھلے ، سڑ کر پڑا نہ رہے - اِس بیج میں جو قوتِ دل ثمر لاتی ہے ، وہ آزادی ہے - جب توانائیِ دل اور آزادی دونوں جمع ہو کر ایک کام پر توجہ کریں گے تو اس میں سچائی زیادہ دریافت کر لیں گے -

۱۷- جو شخص انکشافِ حق کے واسطے مستعد ہوتا ہے اس کو غلطی اور ناحق یقین سے لڑنا پڑتا ہے - پبلک کی کچہری ایسی صاف دل اور روشن ضمیر نہیں ہوتی کہ وہ تنقیح لکھ کر فیصلہ کر دے ، اس لیے اس کو اپیل آئندہ نسلوں میں کرنا پڑتا ہے جو سچی ڈگری اس کے حوالے کریں گے -

۱۸- جیسے ہمیشہ خشک زمین میں پیداوار کے واسطے پانی کی ضرورت رہتی ہے ، ایسے انسان کی خوشی کے واسطے سچائی کی حاجت رہتی ہے - جیسے کہ ایک درخت دریا کے کنارے پر پیدا ہو تو وہ

آفتاب کی تپش اور موسم کی سختی کی آفتوں سے محفوظ رہتا ہے، پس ایسے ہی جس شخص کے دل میں مذہبی دانائی ہمیشہ آتی رہتی ہے وہ تمام دکھوں سے بچتا رہتا ہے - گو اتفاق سے وہ جھوٹ کی تاریکی میں چلا بھی جائے تو بھی اپنی اصل روشنی کو نہیں کھوئے گا -

حق کا آفتاب، جس کو فنا نہیں، کبھی کبھی بادلوں میں چھپ جاتا ہے - اس سبب سے یہ نہیں ہوتا کہ اس کی روشنی میں کوئی عیب لگ جائے، مگر ہاں تعصّب و ایمان کا نقص اس کو تاریک دکھاتا ہے -

۱۹- بعض نیک نہاد شاعری کو بھی بُرا کہتے ہیں کہ شاعر جھوٹ کے پُتلے ہوتے ہیں اور ہمارے دل میں جھوٹے خیالات پیدا کرتے ہیں - مگر ایسے جھوٹ سے جو صرف خیال میں آ کر گزر جائے، کچھ نقصان نہیں ہوتا - ہاں جو دل میں بیٹھ جائے یا دوسروں کے دلوں میں بٹھایا جائے تو البتہ اس سے مضرّت پہنچتی ہے -

۲۰- حکیم دیمقریطس[1] کا قول ہے کہ سچائی ایک عمیق چاہ کی تہہ پر پڑی ہوتی ہے جس پر پانی آئینے کی طرح چمکتا ہے اور اس کا عکس دکھاتا ہے - مگر تہہ پر سے اس کے باہر نکلنے کی امید بہت کم ہے - سنا گیا ہے کہ بعض دفعہ حکما تحقیقِ حق میں اپنے عکس کی تصویر کو سچائی سمجھ کر اس کی تعظیم و ادب کرنے لگتے ہیں -

---

۱- حکیم دیمقریطس: (۵ قبل مسیح) یونانی فلسفی جس کا کہنا تھا کہ اس کائنات کے حدوث کا مصدر ایسے ذرات ہیں جنکی کوئی نہایت نہیں اور جو فضا میں ہمیشہ حرکت کرتے رہتے ہیں - اس کی اخلاق تعلیمات بہت قابلِ قدر تھیں - اس کا عقیدہ تھا کہ سعادت خواہشاتِ نفسانی پر قابو پانے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے - اس کی تصانیف یہ ہیں جو سب کی سب نابود ہو گئیں: "فی سلامة النفس"، "فی طبیعة الانسان" اور "فی الجحیم" - (المنجد فی الادب و العلوم)

۲۱- سچ ایک چشمۂ ملائم ہے کہ زمین سے گرم نکلتا ہے مگر اس کے منبع کے گرد برف کے انبار لگے ہوئے ہیں جن میں وہ گزرتا ہے - جو چیزیں اس کی سدِّ راہ ہوتی ہیں ان کو آگے سے اپنے طور پر ہٹاتا ہے - اور جتنا وہ چلتا ہے ، اُتنی ہی اس کی دھار تیز ہوتی جاتی ہے - جب موسم نہایت سرد ہوتا ہے تو وہ رک جاتا ہے ، اس کی روانی میں توقّف ہوتا ہے مگر وہ فنا نہیں ہوتا - وہ ہوا کے بدلنے کا منتظر رہتا ہے جس سے وہ دوبارہ زندہ ہو کر پھر آگے چلتا ہے -

۲۲- ایک گھر جل جائے اور اُس کا اسباب خاکستر ہو جائے، جس میں ایک چاندی کا ٹکڑا پگھل کر چُھپ جائے ، تو بہت سے خاکستر کے ڈھیر اُٹھانے پڑیں گے اور سلیقے سے بڑی محنت کرنی پڑے گی ، تو یہ چاندی کا ٹکڑا ہاتھ آئے گا، اس سے محنت کی اجرت مل جائے گی - ایسے ہی جب کسی شے میں اختلافِ آرا ہوتا ہے اور وہ سب رائیں سوائے ایک کے غلط ہوتی ہیں ، تو ہم[1] متضاد رایوں کی مختلف شاخوں کا تجزیہ و تحلیل کر کے امرِ حق کو دریافت کرتے ہیں -

۲۳- ضرور نہیں ہے کہ سچ کو ذہانت کا لباسِ پُر تکلّف پہنایا جائے - یہ لباس تو جھوٹ کے لیے درکار ہوتا ہے جو اُس کو چھپائے -

۲۴- دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی تماشا خوش نما نہیں کہ ایک شخص سچائی کی حمایت میں دشمنوں کے روبرو اپنی جوانمردی دکھا رہا ہو اور شہید ہو کر اپنے یقین اور ایمان پر اپنے خون کا ٹھپّا

۱- اصل میں یہ جملہ یوں تھا : ”تو ہم متضاد رایوں کے مختلف شاخوں کے تجربی و تحلیل کر کے امرِ حق کو دریافت کرتے ہیں -“

جاتا ہو - اگر تم کو آسمان کچل کر پامال کر ڈالے تو بھی سچ بولو - اور اگر تمام دنیا کی نعمتیں تم کو ملیں تو بھی جھوٹ نہ بولو - سچ ہمیشہ مبارک ہوتا ہے ، گو وہ بعض دفعہ آزار رساں روشنی میں پوشیدہ ہو جاتا ہے - وہ ہمیشہ اُس روشنی کی طرح عزیز ہوتا ہے جو تاریکی میں پہاڑوں کی گھپائیں دکھاتی ہے[1] - وہ ایک ستارہ ہے جو زندگی کے طوفان میں رہ نمائی کر کے سلامت رکھتا ہے -

۲۵- سچائی اپنی ذات میں ایسی ایک موافقت اور مطابقت رکھتی ہے کہ اُس کو اپنے لیے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی - وہ ہمارے پاس رہتی ہے ، ہمارے ہونٹوں پر بھی بیٹھی رہتی ہے - ہم کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ بے تکلف باہر نکل جاتی ہے - برخلاف اِس کے جھوٹ بڑا دہشت ناک ہوتا ہے - اس میں آدمی کو ایجاد کی کشمکش میں پھنسنا پڑتا ہے اور فریب پر فریب ایجاد کرنے پڑتے ہیں -

۲۶- سچائی کے قبول کرنے کے لیے دل کی ایک خاص حالت ہوتی ہے - جب تک دل میں اس کے قبول کرنے کی اہلیت نہیں ہوتی ، اس کا قبول کرنا ایسا ہوتا ہے جیسے کہ آدھی رات کو آفتاب کا طلوع ہونا - جو کنواں کیچڑ سے اَٹا ہو ، اس میں پانی ڈالنے سے کیچڑ اور اُلٹ پلٹ ہوگی - ایسے ہی جو دل نجاست سے بھرا ہے ، اُس میں راستی کے ڈالنے سے اور نجاست اُچھلے گی - بعض آدمی عمر بھر کلامِ الٰہی سنا کرتے ہیں تو بھی ان کو حق کا علم نہیں ہوتا ، بلکہ سننے سے اور دل سخت ہو جاتا ہے - اس واسطے جو وعظ کہ ان کے دل پر گزرتے ہیں اور وہ دل کے اندر نہیں بیٹھتے ، ان کا حال بیج کا سا نہیں ہوتا بلکہ مسافر کے نقشِ پا کا سا ہوتا ہے کہ وہ رستے

۱- اصل : ہیں -

کو اپنی گزرگاہ بنانے سے اور زیادہ سخت کرتے ہیں۔

۲۷۔ دنیا کے کاموں میں سچ سب سے زیادہ عمدہ بات ہے۔ جو لوگ سچ کو نہیں برتتے، وہ یہی کہتے ہیں کہ صاف معاملہ اور کھرا لین دین آدمی کی عزت ہے۔ دنیا کے کاروبار میں جھوٹ کا ملاؤ ایسا ہے جیسے کہ سونے چاندی کے سکّوں میں، کہ اِن دھاتوں کو زیادہ وہ کام کا بنا دیتا ہے، مگر اس کے ساتھ ان کو کھوٹا بھی کر دیتا ہے۔ کوئی چیز آدمی کو ایسا گُوہ میں نہیں نہلاتی جیسے کہ جھوٹ اور فریب۔ جھوٹ کیوں سب برائیوں میں بُرا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ جھوٹ بولنے والا خدا سے نڈر اور آدمیوں سے خوف ناک ہوتا ہے۔ جھوٹ خدا کا سامنا کرتا ہے اور آدمی سے جھجکتا ہے۔ جھوٹ بولنا دل کی نامردی اور ضعف کی علامت ہے۔ تم کو متنبّہ ہونا چاہیے کہ عجیب چیزوں اور کہانیوں کو جلد یقین نہ کر لو اور اس سے زیادہ اس امر کی احتیاط کرو کہ تم خود ان کو اوروں کے سامنے نقل نہ کرنے لگو۔ اس واسطے کہ اگر وہ جھوٹ ثابت ہوں گی، جیسی کہ اکثر وہ ہوتی ہیں، تو تم کو بھی اس جھوٹ کے نقل کرنے کی ندامت اٹھانی پڑے گی اور اس سے اوروں کا بھی نقصان ہوگا۔

۲۸۔ بعض اصلی سچائیاں تہہ پر ہوتی ہیں جن پر اور بہت سی سچائیاں چنی جاتی ہیں اور ان سب میں ایک مناسبت و موافقت ہوتی ہے۔ ان کا حال آسمان کی روشنی کا سا ہوتا ہے کہ خود ہی خوبصورت نہیں ہوتی بلکہ وہ اور چیزوں کو بھی اپنی روشنی سے چمکاتی ہے جو بغیر اس روشنی کے معلوم نہ ہوتیں اور دکھائی نہ دیتیں۔ حضرت مسیح[۴] کا یہ قول کہ ”تُو اپنے ہمسائے کو ایسا پیار کر جیسا کہ تُو اپنے تئیں“ ایک ایسی اصلی سچائی ہے کہ جس پر بنی نوع انسان

کے سارے اخلاق کی بنا قائم ہے اور اس نے تمدنی اخلاق کی ہر مشکل کو آسان کر دیا ہے - پس ایسی اصلی سچائیوں کی جستجو چاہیے اور دل میں انھی کا خزانہ جمع کرنا چاہیے -

۲۹- جو شخص سچ جانتا ہے مگر اُس کو عزیز نہیں رکھتا، اُس کا حال چمگادڑ کا سا ہے کہ آنکھیں رکھتی ہے مگر ایسی بری کہ آفتاب کو نہیں دیکھ سکتی -

تمام دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ گو کوئی چیز معدوم اور گم نہیں ہوتی مگر سب چیزیں بدلتی رہتی ہیں، لیکن سچائی کبھی نہیں بدلتی - سچائی میں حیات، قوت، جان یہ سب ہوتی ہیں مگر ہم نہ خود اس کو سمجھ سکتے ہیں، نہ سمجھا سکتے ہیں -

سچائی یہ چاہتی ہے کہ مجھ کو تم پیار کرو مگر وہ خود کسی کو پیار نہیں کرتی - وہ ہمارے پاس آتی ہے اور ایسی چلی جاتی ہے کہ پھر مڑ کر نہیں دیکھتی - ہم جھوٹ کی طرف رغبت کرتے ہیں تو وہ ہم سے بار بار بغل گیر ہوتا ہے - اس کے ساتھ خوب عیش اڑاتے ہیں - اس کے عشق میں دیوانے ہوتے ہیں اور اس کی باتوں سے دل خوش کرتے ہیں - اس کی بغل میں سو کر موت اور سچائی کے خواب دیکھتے ہیں مگر ان سے نفرت کرتے ہیں -

۳۰- ایک شاعر نے کہا ہے کہ سمندر کے کنارے پر کھڑے ہو کر جہازوں کا آنا جانا دیکھنا یا کسی قلعے کے جھروکے میں سے میدانِ کارزار کی ہنگامہ آرائی کا دیکھنا بڑی خوشی کے تماشے ہیں - مگر یہ خوشی اُس خوشی کے آگے ہیچ ہے کہ ہم سچائی کے پہاڑ پر، جو سب سے زیادہ سربلند ہے اور جہاں صاف اور خوش آیند ہوا چل رہی ہے، وہاں کھڑے ہو کر نیچے جھوٹ کی خرابیاں اور طوفان اور کُہر اور آوارگی دیکھیں - مگر یہ دیکھنا بہ نظرِ عبرت

ہو ، نہ غرور کی نظر سے -

۳۱- علم و عقل کا اندازہ راستی سے ہوتا ہے - سوائے اس کے خواہ کسی بات کو لوگوں نے مان بھی لیا ہو اور اس کو پسند بھی کر لیا ہو اور اس کا شاذ و نادر ہونا اس کی سفارش بھی کرتا ہو، مگر وہ جہالت یا بدتر از جہالت ہے -

۳۲- نیا سونا جو پایا جاتا ہے ، وہ جب تک مروج نہیں ہوتا جیبوں کا بوجھ ہی ہوتا ہے - یہی حال نئے سچ کا ہوتا ہے کہ جب تک وہ مروج نہیں ہوتا ، فائدہ نہیں ہوتا -

۳۳- سچائی ایک بیج ہے جو بڑی گہرائی کے اندر رکھا گیا ہے مگر دنیا کے اندر وہ ظاہری رسم و رواج کی جھوٹی ترازو میں تولی جاتی ہے -

۳۴- خلاصہ تمام اوپر کے مضامین کا یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مذہباً ہر جھوٹ خدا کو ناخوش کرتا ہے اور معاملاتِ دنیا میں بے اعتبار و ذلیل کرتا ہے - ''جھوٹا'' بڑی حقارت کا لفظ ہے - سچ یاد رکھنا ہے ، جھوٹ ایجاد کرنا ہے -

۳۵- بعض حکما کا مذہب یہ ہے کہ نیک کام وہ ہے جو سوسائٹی کی خوشی بڑھاوے اور ُبرا کام وہ ہے جو اس کی خوشی گھٹاوے - اُن کے نزدیک وہ جھوٹ گناہ میں داخل ہی نہیں جو انسانوں کو خوش کرتا ہے - جو خباثتِ دلی اور سیاہ باطنی سے مکار جھوٹ بولے ، جس سے اس کی یا اَوروں کی خوشی کم ہو ، تو وہ قابلِ نفرت ہے ، ورنہ وہ جھوٹ جس سے خوشی اُتنی حاصل ہو جتنی چاہیے ، برائی میں داخل نہیں - سینکڑوں باتوں کو ، جن سے آدمیوں کے دل خوش ہوتے ہیں ، جاہلوں نے ان کا نام جھوٹ رکھ چھوڑا ہے - اُن کے نزدیک اگر دنیا میں سچ کے طرف دار سچ کی سلطنت جما دیتے تو وہ بالکل

سنسان اور اداس اور غم زدہ ہو جاتی ، تفریحِ طبع کے سارے سامان غارت ہو جاتے - نہ دل لگیاں ، نہ چٹکلے بازیاں ، نہ ٹھٹھول ، نہ ہنسی ، نہ آؤ بھگت ، نہ تواضع ، تکریم ، خوش اخلاق کی باتیں قائم رہتیں ، نہ ہمارے دل بہلانے کے لیے قصے و افسانے ایسے بنتے کہ جن سے نیچر پر وارنش اور ہمارے اخلاق کی پالش ہوتی - نہ ہم کسی کی حماقت پر مسکرا سکتے ، نہ کسی کی جہالت پر ہنس سکتے - نہ عاشق و معشوق میں ادا و انداز کی باتیں ہوتیں - پھر جب یہ عشق کی باتیں نہ ہوتیں تو شاعری کہاں ہوتی - شاعروں کی زبان پر مُہرِ خاموشی لگ جاتی - اگر کوئی شخص انسان کی شائستگی اور تہذیب کی تاریخ کی تحقیقات کرے تو تحقیق ہو گا کہ آدمی جتنا جھوٹ بولنے کے فن میں ترقی کرتا گیا ، اتنی اس کی شائستگی بڑھتی گئی - جو شخص اوروں کو خوش کرنا اور اپنی خوش اخلاق کی تعریف سننی چاہتا ہے ، اور اوروں کو بھی چاہتا ہے کہ وہ اس سے یہ خوش اخلاق پیش آئیں ، اس کی زندگانی ایک طولانی جھوٹ ہوتا ہے - روزمرّہ دیکھتے ہیں کہ حکیموں کی خوش مزاجی کی جب تعریف ہوتی ہے کہ فیس جو مریض پیش کرے ، اس کے لینے سے وہ زبان سے انکار کریں ، گو سَو دل سے خواستگار ہوں - جب مجلس میں کسی کو صدرِ انجمن بنائیں یا ممبر پر بٹھائیں یا امام بنائیں یا کسی کو اعلیٰ عہدہ دیں تو وہ زبان سے اس کے قبول کرنے میں کوئی عذر پیش کرے ، گو اس نے درپردہ ہزار سعی اس کے حاصل کرنے کے لیے کی ہو ، ایسی باتیں بنانی حسنِ اخلاق میں داخل ہیں ، ان میں جھوٹ بولنا ہی لطف دیتا ہے - سچ میں یہ مزے کہاں - غرض جہاں نقصان نسبت فائدے کے زیادہ ہو ، وہاں جھوٹ ایسے حکما کے نزدیک داخلِ گناہ نہیں -

۹۷- موت

۱- بچّے اندھیرے میں جاتے ہوئے ڈرتے ہیں - اور اگر ان سے یہ کہہ دو کہ اِس اندھیرے میں ہَوّا بیٹھا ہے ، یا اَور ڈراؤنی کہانیاں اس کی سنا دو تو اَور زیادہ اس میں جانے سے خوف کرنے لگیں گے - اِسی طرح آدمی موت سے ڈرتے ہیں - جب آدمی موت کو یوں خیال کرتا ہے کہ وہ گناہ کی سزا ہے اور ایک عالم سے دوسرے عالم میں جانے کی راہ ہے ، تو یہ خیال مذہبی ہو جاتا ہے اور پھر اس سفرِ آخرت کے زادِ راہ کے لیے وہ تیاری کرنے اور موت سے کم ڈرنے لگتا ہے - مگر مذہبی خیالات میں بعض اوقات توہّماتِ باطلہ اور بیہودہ خیالات بھی شامل ہو جاتے ہیں -

بعض کتابوں میں لکھا دیکھا ہے کہ اگر ایک آدمی کی انگلی کی نوک دبائی جائے تو اس کو کس قدر دکھ درد ہوتا ہے - پس اِسی پر قیاس کرنا چاہیے کہ جب موت آئے گی اور ہر عضو پر صدمۂ عظیم پہنچائے گی تو کیا غضب کی تکلیف ہوگی - اس خیال سے موت کا خوف زیادہ ہو جاتا ہے - باوجودیکہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جان آسانی سے نکل جاتی ہے کہ اُس میں اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی کہ ایک عضو کے درد سے - (موت کا خوف فقط تکلیف کے خیال سے ہونا بچپنے کی بات ہے) - حکیموں کا قول ہے کہ موت میں اتنی تکالیف نہیں ہیں جتنی کہ اس کے جلو کی چیزوں میں ؛ جو یہ ہیں کہ مریض کا بستر پر تڑپنا ، کروٹیں بدلنا ، ہاتھ پاؤں کو دے دے مارنا ، کبھی سکیڑنا ، کبھی پھیلانا ، کراہنا ، آہ و فغاں کرنا ، دوستوں کا آنا اور غم زدہ ہونا ، عورتوں اور بچوں کا رونا ، نوکروں کا بدحواس زرد چہرہ ہوکر خدمت کا کرنا ، گھر کا ڈراؤنا ہونا ، اس میں بیمار

کے پلنگ کا بچھنا ، اس کے گرد شمعِ افسردہ کا روشن ہونا ، طبیبوں کا بیٹھنا اور مایوس اٹھنا ، آخر کو موت کا آ جانا ، تجہیز و تکفین کی تیاری کا ہونا - یہ سب باتیں موت سے زیادہ دل پر خوف طاری کرتی ہیں - خدا نے انسان کے دل میں ایسے جذبے بھی رکھے ہیں کہ وہ موت کے خوف کو کم کر دیتے ہیں - انتقام کا جوش موت کے خوف پر غالب ہوتا ہے - عشق تو موت کی کچھ حقیقت ہی نہیں گنتا - عزت و ناموس کے لیے جان دے دینا ایک بات ہے ، غم و الم تو آس پاس آڑ کر جاتے ہیں - دولت کی طمع و حرص بھی موت کی پروا نہیں کرتی - تم سنتے ہو گے کہ کتنے آدمی ان اپنے جذباتِ نفسانی میں اپنی جان کھوتے ہیں - دوستوں کے چہرے اگر نقاب کے اندر چھپے ہوئے ہوں تو ان سے بچے ڈرتے ہیں اور جب نقاب اُٹھا کر دیکھ لیں تو پھر ہنستے ہیں - پس اِسی طرح موت جب تک نقاب کے اندر چھپی ہوئی ہوتی ہے تو ڈرتے ہیں ، مگر جب نقاب کو اُٹھا کر اُسے دیکھ لیتے ہیں تو پھر خوف نہیں رہتا - کچھ آدمی اپنی دلیری یا آفت زدگی کے سبب سے موت کے خواہاں نہیں ہوتے بلکہ وہ اس سبب سے بھی اس کو چاہتے ہیں کہ ایک ہی کاموں کے بار بار کرنے سے تھک جاتے ہیں[1] - جیسے پیدا ہونا ایک امرِ طبعی ہے ، ایسا ہی مرنا ہے - چھوٹے بچوں کو تو شاید مرنے اور پیدا ہونے میں ایک ہی سی تکلیف ہوتی ہے - زخم کی تکلیف جب تک محسوس نہیں ہوتی کہ اس سے گرم لہو نکلتا ہے اور وہ گرم رہتا ہے - اِسی طرح جو لوگ کسی نیک کام میں شوق سے اپنے دل کو سرگرم کرتے ہیں ،

۱- اصل میں جملہ یوں تھا : "کچھ آدمی اپنی دلیری یا آفت زدگی کے سبب سے موت کے خواہاں نہیں ہوتا . . . تھک جاتا ہے -"

موت کے رنج ان کو محسوس نہیں ہوتے - اُن کو اپنی توقعوں کے پورا ہونے کا اور اپنے کاموں کی نیک انجامی کا یقین ہوتا ہے - موت شہرت اور نیک نامی کا دروازہ آدمی پر کھولتی ہے اور حسد و حقد کا در بند کرتی ہے - ساری بُرائیاں اس کے ساتھ قبر میں دفن ہو جاتی ہیں، مرنے کے بعد وہ عزیز ہو جاتا ہے -

۲- موت ایک شبِ تاریک ایسی ہے کہ اس میں ہم کو گزرنا ناگزیر ہے - اس کی صبح کا انتظار کرنا بے فائدہ ہے - وہ ایک قعرِ عمیق ہے جس کی تہہ پر ہماری رسائی کسی راہ سے ممکن نہیں - موت ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جس کو ہم نہیں جانتے مگر اس سے ایسے ڈرتے ہیں کہ جان نکلتی ہے -

۳- موت ہمارے مکان کے آستانے پر کھڑی رہ کر اِتنی مہلت ہم کو دیتی ہے کہ ہم اپنے سارے کاموں کو، سوائے اُن کے جو اَوروں کی بھلائی اور اپنے تزکیۂ نفس کے لیے کیے ہیں، بیہودہ اور باطل و لاطائل سوچ سمجھ لیں -

۴- تعجّب ہے کہ لوگوں کو موت پر تعجّب ہوتا ہے مگر سونے [۱] پر نہیں جو موت کی بہن ہے - ہم برسوں تک متواتر دیکھتے ہیں کہ راتوں کو بوڑھے، بچے، عورتیں سوتے ہیں مگر کبھی ان کو دیکھ کر متحیّر نہیں ہوتے -

۵- موت بھی ایک زندگی ہے - جنگل میں قبرستان کے مُردوں سے زندہ آہیں بھر کر کہتے ہیں کہ درختوں کے پتّے گر کر تمھاری قبروں کے گرد ہوا سے صدقے ہوتے ہیں مگر تم ان کی کھڑ کھڑ کی آواز نہیں سنتے - جانور درختوں پر بولتے ہیں، ان کے نغمے تمھارے

۱- کذا - یہاں "نیند" زیادہ مناسب لفظ تھا -

کان میں نہیں جاتے - تم ایسے تنگ و تاریک مکانوں میں خاموش پڑے ہو کہ ان سے نکل کر شہر میں ہمارے جلسوں اور محفلوں میں شریک نہیں ہو سکتے - افسوس ہے کہ ہم بھی تم کو جلد بھول گئے - مُردے اِس کا جواب دیتے ہیں کہ ہم بڑے آرام سے اپنے گھر میں رہتے ہیں - یہاں رہنے سے ہماری دنیا کی تمام مصیبتوں اور آفتوں کا خاتمہ ہو گیا - ساری مضرّت رساں باتیں ، سارے زہریلے کام ہمارے ہم سے جدا ہو گئے - تمام مایوسیوں اور افکار و تردّد سے ، سخت بلاؤں سے چھٹکارا ہو گیا - دل کی حرکت کے موقوف ہونے سے تسکین ہو گئی - کوئی بات ایسی نہیں کہ جس کی فریاد و شکایت کریں - برخلاف اس کے تمھاری زندگی بنجر زمین ہے جو آنسوؤں سے بوئی جاتی ہے - تم عزت و شان حاصل کرنے کے لیے خوفوں میں گھرے ہوئے ہو - تمھاری حسانت پر پژمردگی چھائی جاتی ہے - تم کیا زندہ ہو ، ہم زندہ ہیں -

۶- آدمی خواہ کیسا ہی احمق اور بیوقوف ہو مگر اس کو یہ یقین نہیں ہو سکتا کہ میری موت نہیں آئے گی - موت کا سیاہ بادل جو اس پر آنے والا ہے ، اس کے فاصلے کے حساب میں خواہ وہ غلطی کرے مگر اس کو یقین ہے کہ وہ میرے سر پر ضرور آئے گا - آدمیوں کی سب حالتوں میں یوں تو اختلاف ہے مگر مرنے میں سب کا اتفاق ہے ، اس لیے موت کی نسبت جو کچھ کہا جائے ، اس کو ہر ایک آدمی اپنی نسبت منسوب کر سکتا ہے - آدمی کی زندگی کی ہزاروں دھاریں ہیں - کوئی ان میں تیز چلتی ہے ، کوئی سست ، کوئی اُجلی ، کوئی میلی ، مگر موت اِن سب کو ٹھہرا دیتی ہے - موت کہیں نہیں دکھائی دیتی مگر وہ سب جگہ زمین پر موجود رہتی ہے - خزاں میں جیسے پتّے جھڑتے ہیں ، ایسے آدمی موت سے مرتے ہیں - جینے کی شرط مرنا ہے -

شعر

نہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

ہستی کے لیے ضرور اک دن ہے فنا
آنا نری دلیل جانے کی ہے[1]

کبھی آدمی کو یہ امید نہیں ہو سکتی کہ میں اپنی موت سے بچ جاؤں گا۔ اس کو یقینِ کامل ہے کہ زمانہ یوں ہی چلا جائے گا۔ میں نہ ہوں گا، نہ میری دولت اور اولاد ماتم داری کے لیے رہے گی۔ میں خواہ کہیں دنیا کے پردے پر ہوں اور میری حالت خواہ کیسی ہو، کیسا ہی زبردست قوی ہوں مگر ضرور موت کے پنجے میں گرفتار ہوں گا۔ قضا و قدر نے موت کا فتوی مجھ پر دے دیا ہے، وہ کسی طرح نہیں ٹل سکتی[2]۔ کوئی چیز دنیا میں ایسی نہیں کہ جس کو میں کہوں کہ میری ہے، مگر موت اور وہ زمین جو میری ہڈیوں کو چھپائے گی۔

۷۔ ملکِ عدم کا حال تو کسی کو نہیں معلوم کہ کیا ہے۔ مسافر وہاں جا کر پھرا نہیں کہ اُس سے حال معلوم ہوتا۔ مگر جانے والے بہت تھوڑے ہی ایسے ہوتے ہیں کہ وہاں جانے سے ناراض نہ ہوں۔ مگر ہاں امراض کی سختی ایسی ہے کہ اُس کے سبب سے مریض چاہتے ہیں کہ اُس ملک کی سیر کو جلد چلے جائیں تو مصیبت سے چھوٹ جائیں۔ بعض آدمی اپنے مذہبی خیالات ایسے رکھتے ہیں کہ

۱۔ کذا۔

۲۔ اصل : سکتا۔

وہ موت کے وقت چپ چاپ اپنے تئیں سنبھالے ہوئے رہتے ہیں اور مرنے سے خوش معلوم ہوتے ہیں - تاریخ کا وہ حصہ سب سے زیادہ دلچسپ ہے جس میں بڑے بڑے بیدار مغزوں، ہُشیار دلوں، بزرگ منشوں کے وہ کلمات لکھے ہیں جو اُنھوں نے اپنے آخری وقت میں زبانِ گوہر افشاں سے فرمائے، جس سے اُن کی ہمّت و استقلال معلوم ہوتا ہے؛ کہ اِس موت کے نازک وقت نے بھی اُن کو بدلا نہیں، جیسے تھے ویسے ہی رہے -

۸- موت ایک غول ہے جو آدمی کی اُمیدوں کی ساری راہوں میں کھڑا رہتا ہے - ایک بُھوت ہے جو بِن بلائے گستاخانہ آدمی کی[۱] عیش و عشرت کی محفلوں میں گھس آتا ہے - اس کی ہنسی، خوش طبعی، ظرافت، لطیفہ سنجی میں اپنا تاریک ہاتھ دکھاتا ہے اور اپنا نام موت اُس سے لکھاتا ہے - اس کی دنیاوی خوشیوں کی جڑ میں گُھن کی طرح لگا رہتا ہے - کیڑے کی طرح اس کو اندر ہی اندر کترتا ہے - اُس کی ساری شیرینیوں میں زہر ملاتا ہے، اُس کی کل شگفتگیوں[۲] کے گل کے لیے کانٹا بنتا ہے، اُس کی خوشبویوں میں چیکٹ[۳] ملاتا ہے، اُس کی بہار پر خزاں لاتا ہے، اُس کے خندہ کو گریہ بناتا ہے، اُس کی حسانت میں داغ لگاتا ہے، اُس کی موزونیوں کو ناموزوں کرتا ہے، اُس کے کل کے اقراروں میں اور فردا کے کاموں میں "شرطِ زندگی" کی قید لگاتا ہے - آدمی اس سے نفرت رکھتا اور خوف کھاتا ہے -

---

۱- اصل: کے -   ۲- اصل: شگفتیوں -

۳- چیکٹ: چراغ کی گاد، تیل کی گاد - وہ مٹی جو تیل کے سبب سیاہ اور چکنی ہو جائے - (نوراللغات)

۹- کوئی اس موت کے آنے سے زیادہ تحقیق[1] اور موت کے آنے کے وقت سے زیادہ نا تحقیق[2] نہیں - اس واسطے آدمی کو چاہیے کہ وہ موت کے لیے ہمیشہ آمادہ رہے - جو برگزیدہ ، نیک صفات موت کے لیے تیار رہتے ہیں ، وہ کچھ جلد مرنا نہیں چاہتے ، بلکہ اچھی طرح مرنا چاہتے ہیں - اس لیے وہ موت کی تلخیوں کو ہمیشہ شیرینی میں پرورده کرتے رہتے ہیں -

۱۰- موت وہ ظالم ہے کہ کبھی نچلی نہیں بیٹھتی کہ کوئی اس کی صحیح تصویر آتارے - جو تصویر اس کی اتاری گئی وہ آٹکل پچّو ، نہ اس کی مثل ، نہ مشابہ - بھلا اس کافر کی تصویر کیونکر آترے - ہاتھ میں پنسل اُس کے خوف سے لرزتی ہے - خیال کو اُس کا بڑھانا ناپسند ہے - اس کے سایہ بنانے میں جہالت اپنی تاریکی خرچ کرنے میں اسراف کرتی ہے - پس اس طرح اس کی تصویر بہت ڈراؤنی بنتی ہے -

۱۱- ہنسنے اور رونے سے ، جاگنے اور سونے سے ، شگفتہ اور پژمردہ ہونے سے ، روشنی اور تاریکی سے ، خوف و اُمید سے ، نشست و برخاست سے ، قرار اور بے قراری سے ، یاد و فراموشی[3] سے ، فراہمی و پراگندگی سے ، جوار بھاٹے سے ، ہجر و وصل سے ، ابھی کبھی سے ، بخار و فالج سے ، اِن سب چیزوں سے موت جلد نکال کر لے جاتی ہے - اور اُس گھر میں لے جا کر بسا دیتی ہے جہاں ہمیشہ رہنا ہے ، اور وہاں آرام چین ، محبّت اُلفت ، نیک امیدیں ہوتی ہیں -

۱۲- حکیم سینیکا کا قول ہے کہ اُس شخص کو موت سخت بھاری

۱- تحقیق بمعنی محقّق استعمال ہوا ہے -
۲- ناتحقیق : یعنی غیر محقّق -
۳- اصل : فراموش -

معلوم ہوتی ہے جس کو لوگ بہت جانتے ہیں مگر وہ اپنے تئیں نہیں جانتا ۔ لون ٹی نس ایک بڑا ادیب گزرا ہے جس نے علومِ ادبیہ کو دوبارہ زندہ کیا تھا ۔ اپنے نفس کے علم کو یعنی خود شناسی کو ایسا ضروری جانا کہ اپنی قبر کے لیے یہ کتبہ تصنیف کر گیا کہ لوگوں کو اس سے عبرت اور نصیحت ہوا کرے :

"میں لون ٹی نس[1] ہوں ۔ علمِ ادب کی تمام قوّتیں اور استعدادیں مجھے پیار کرتی تھیں ، ہردل عزیز تھا ، بادشاہانِ زمین میری تعظیم و تکریم کرتے تھے ۔ تُو اب جانتا ہے کہ میں کون ہوں ؟ یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ تُو جانتا ہے کہ میں کون تھا ؟ اب میں تاریکی میں پڑا ہوں ۔ تجھ مسافر کو نہیں جان سکتا ، لیکن میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تُو اپنے تئیں جان اور پہچان ۔"

۱۳۔ تم دیکھتے ہو کہ بڑے بڑے دولت مند مرتے ہیں اور اپنے عالی شان مکان چھوڑتے ہیں ۔ ان کے باغوں کے درختوں میں سے کوئی ان کے ساتھ نہیں جاتا ۔ اگر جاتا ہے تو اوک[2] (ایک درخت کا نام ہے) تابوت بن کر اور سرو تجہیز بن کر ۔

۱۴۔ موت سب جگہ موجود ہے ۔ وہ سب جگہ ہم کو ملتی ہے ۔ ہر بہانے موت موجود ہے ؛ سختی سے ، خفیہ اثر سے ، ستارے سے ،

۱۔ اصل میں یہاں "لون ٹے فس" چھپا ہے لیکن اس سے پہلے پیراگراف میں "لون ٹی نس" ہی ہے ۔

۲۔ اوک : شاہ بلوط ؛ ایک قسم کا جنگلی درخت جس کی لکڑی سخت اور مضبوط ، پھل گول اور پتیوں کے کنارے کٹاؤ دار ہوتے ہیں ۔
(انگریزی اُردو لغت ، از مولوی عبدالحق)

گھر کی بدبو سے ، بادل کے اٹھنے سے ، بخارات کے ملنے[1] سے ، پتھر پر گرنے سے ، پیٹ بھر کر کھانے سے ، معدے کے خالی رکھنے سے ، شراب پینے سے ، نمازوں کے پڑھنے سے ، آفتاب سے ، چاند سے ، گرمی سے ، سردی سے ، راتوں کے نیند نہ آنے سے ، دنوں کے سونے سے ، پانی کے جم کر سخت ہو جانے سے ، خنجر کے تیز ہونے سے ، دریا میں پانی کی طغیانی سے ، بال سے[2] ، کشمکش سے ، حرکت کی شدّت سے ، چپ چاپ بیٹھنے سے، خدا کے فضل سے ، خدا کے قہر سے ، غرض ہر ایک چیز سے ، جو انتظامِ گیتی میں داخل ہے اور ہر ایک امرِ اتفاقیہ سے موت آتی ہے - یہ وہ قانونِ قدرت ہے جو ازلی و ابدی ہے - اس میں نہ کبھی تغیّر ہوا نہ ہوگا - وہ حکمِ الٰہی ہے - اس کی زنجیروں نے ہم کو ایسا ہی مضبوط جکڑ رکھا ہے جیسا قضا و قدر نے -

۱۵- جب ہم موت کا خیال کرتے ہیں تو وہ ہزاروں گناہ ، جن کو ہم نے کیڑوں کی طرح روندا ہے ، پھنکارتے ہوئے سانپ بن جاتے ہیں اور ہم کو کاٹتے ہیں -

۱۶- موت کا وقت کوئی معیّن نہیں ، اس لیے تُو اپنے پہرے پر سنتری بنا کھڑا رہ - دشمن ضرور آنے والا ہے ، تُو ہر وقت چوکنّا رہ ، آنکھوں کو سب طرف لگائے رکھ -

۱۷- لوگ موت کی یہ شکایت ناحق کرتے ہیں کہ وہ اچانک دفعتہً ہمارے پاس آجاتی ہے - وہ تو ہمیشہ اپنے آنے کی خبر دیتی رہتی ہے - ہر شخص جانتا ہے کہ میں مروں گا اور مرنے کا وقت معیّن نہیں - اگر یہ دونوں باتیں نہ معلوم ہوتیں تو شکایت بجا ہوتی -

۱۸- موت بھی کیا منصف ہے کہ سب فقیر و غنی اور ضعیف و

۱- کذا - ۲- کذا -

قوی کو برابر کرتی ہے - سب مرتے ہیں اور مرنے کے بعد سب خاک میں مل کر برابر ہو جاتے ہیں - جیسے انگیٹھی میں بڑ کی خاکستر یہ نہیں بتلاتی کہ وہ ایسا بڑا درخت تھا کہ جس کے سایے میں ریوڑ کے ریوڑ آرام پاتے تھے، کسی نے کاٹ کر اس کی یہ نوبت پہنچائی، اِسی طرح جو بڑے فتح مند گزرے ہیں کہ جن کے فتوحات کے اشتہار وہاں تک پہنچے تھے جہاں تک کہ دن رات پہنچتے ہیں، اُن کی خاک نہیں بتلاتی کہ وہ ایسے ذی جاہ تھے یا غریب آدمی تھے - جس بادشاہ کو جاہ و جلال کے سبب سے اور جس فقیر کو حقارت کے سبب سے ہم نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتے تھے، ان دونوں کی خاکیں اُڑ رہی ہیں - ان کی چھان بین کر کے کوئی بتا سکتا ہے کہ یہ خاک شاہ کی ہے اور وہ گدا کی؟ بادشاہوں کی خاک گرجاؤں کے صحنوں سے اُڑ کر ان کے اندر جاتی ہے جس کو جاروب کش[1] پھر نکال کر صحن میں ڈال دیتا ہے - غرض موت سب کو ہم مرتبہ بنا کر خاک میں چین اور آرام سے سلاتی ہے اور فرقِ مراتب کے جو عناد و فساد اُٹھتے تھے[2]، ان کو بٹھا دیتی ہے - بادشاہوں کی قبروں کے نشان خاک چھاننے سے بھی نہیں ملتے -

۱۹- جب موت ایسی عالم گیر ہو، لازمی اور طبعی ہو، تو یہ ناممکن ہے کہ حکمتِ الٰہی نے انسان کے واسطے اسے مضر بنایا ہو، ضرور وہ مفید ہوتی ہے -

۲۰- اکثر آدمی اِس طرح جیتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہی نہیں کہ مرنا ہے - ایسے ہی جو آدمی مرتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ ہم کو

۱- جاروب کش : جھاڑو دینے والا، خاکروب -
۲- اصل : اٹھتی تھی -

مرنے کے بعد جینا ہے۔

۲۱- دوست پر دوست مرتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس کا کوئی دوست نہ مرا ہو۔ کوئی یہاں ایسا وصل ہی دلوں میں نظر نہیں آتا جس کے ساتھ ہجر نہ دکھائی دے، مگر ہاں کہتے ہیں کہ دوسرے عالم میں وصل کے لیے ہجر نہیں۔ وہاں کی زندگانی کا حال یہاں کی زندگانی کا سا نہیں ہے کہ برق کی چمک، شرر کی لپک ہو، کہ آنکھ جھپکنے میں غائب ہو۔

۲۲- جو دنیا کو علی‌الدوام جانتا ہے، وہ موت کے نام سے ڈرتا ہے۔ مگر جو اس کو ایسا نہیں جانتا، وہ اس سے خوش ہوتا ہے۔ جس شخص کو آزادی آزاد نہیں کر سکتی، اُس کو موت آزاد کر سکتی ہے۔ جس کو وہ اچھا نہیں کر سکتی، اُس کے واسطے وہ شفا دینے کو حکیم بنتی ہے۔ جس کام میں کوئی تسلی نہیں دے سکتا، اُس میں وہ تسلی دیتی ہے۔

۲۳- بعض دفعہ جو آدمی کو یہ خیال رہنے لگتا ہے کہ اب میں مروں گا، تو اُس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ قوائے روحانیہ اس کے ضعیف ہو جاتے ہیں۔ وہ دماغ کو رگوں کے ذریعے سے اس کی خبر پہنچا دیتے ہیں۔

۲۴- انسان موت کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے بجلی کو، کہ بہت دُور ہے یا آسمان پر ہے، مگر وہ نہیں جانتا کہ یہ بجلی اس کے اندر موجود ہے، اس کے بال بال کی اور ہر جزوِ بدن کی روح ہے۔ وہ ہر دماغ سے نکلتی ہے، زمین سے اوپر اور آسمان سے نیچے آتی ہے اور ہر ایک کے لیے مناسب طور پر موت بنتی ہے اور پھر اپنے کل سے جا کر ملتی ہے۔

۲۵- موت ایسی کریہہ منظر ہے کہ اگر وہ ہمارے پیشِ نظر بعینہٖ

رہتی تو ساری زندگی تلخ ہو جاتی اور کسی کام میں لطف نہ آتا۔ کوئی شیرینی ایسی نہ ہوتی جو اس کے سبب سے کڑوی نہ معلوم ہوتی۔ مگر خداوند تعالیٰ تو بڑا رحیم ہے۔ اس نے ہماری خلقت ایسی بنائی ہے کہ ہمارے حواس اور ہمارا دل اشیا کو محسوس و ادراک کر کے بڑا خوش رہتا ہے۔ ہم اپنے سب کاموں میں موت کو اتنی دور سے دیکھتے ہیں کہ اس کی صورت ہم کو نظر نہیں آتی۔ لیکن آخر موت کا آنا یقینی ہے، وہ کبھی نہ کبھی آئے گی اور معلوم نہیں کہ کس وقت آئے گی۔ اس لیے اس کے خیال کے واسطے بھی کوئی حصّہ حیات کا مقرر کرنا چاہیے۔ انسان کو خود اپنی ذات سے بڑی محبت ہے اس لیے اس کو یہ ضرور فکر ہوتا ہے کہ بعد مرنے کے میرا حال کیا ہوگا۔ اہلِ مذہب کا خیال یہ ہے کہ نہ دولت و مال، نہ عزیز و اطفال ہمارے ساتھ جائیں گے، فقط ہمارے اعمال ہمارے ساتھ جائیں گے، وہی سزا و جزا دلائیں گے، اس لیے موت کا خیال ان کو بد اعمالی سے بچاتا ہے اور نیک اعمالی پر لے جاتا ہے۔

۲۶- بعض لطیفہ سنجوں نے اخلاق کی کتابوں میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آنے کا ایک رستہ بنایا اور جانے کی راہیں بے شمار۔ بخار اور دردوں اور اَور[۱] سببوں سے جو موت آتی ہے، اس کی تشبیہ یوں دیتے ہیں کہ موت سب سے اوّل آگ کے جسم میں حلول کرتی ہے، اور پھر تھوڑی دیر کے بعد برف کا آدمی بن جاتی ہے، اور پھر توپ کے گولے کی طرح کرّہ کے گرد غلطاں ہوتی ہے، پھر تڑتڑ ملمع کی گولی کی طرح پڑتی ہے۔ ہر دفعہ وہ تلوار کی صورت

۱- یہاں صرف ایک ''اور'' تھا لیکن سیاق و سباق کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں ایک دوسرا ''اَور'' بھی ہونا چاہیے جسے مصنف دوسرا کے معنوں میں اکثر استعمال کرتے ہیں۔ غالباً کاتب کے سہو کی وجہ سے رہ گیا ہے۔

بن جاتی ہے - پھر چھوٹی ہو کر خنجر ، پھر سؤا ، پھر خمیدہ پن ، پھر بال کی برابر سوئی ، غرض موت ہزاروں روپ بھرتی ہے[1] -

۲۷- مشرقی بادشاہوں کا ایک افسر ہوا کرتا تھا جو صبح کو کسی خاص وقت موت کو یاد دلایا کرتا تھا - موت کے اکثر یاد رکھنے کا یہ ضرور نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان دنیا کے کاموں کی بے جا ہوس نہیں کرتا - جن بادشاہوں نے ساری دنیا کے فتح کرنے کی آرزو کی یا جن عالموں نے دنیا کے کل علموں میں کمال چاہا ، وہ اگر موت کو جانتے تو یہ آرزوئیں بے جا نہیں کرتے - موت کا یقین سکھاتا ہے کہ کسی سے دشمنی و حسد کرنی بے جا ہے ، کسی دنیا کی[2] عزیز چیز کے تلف ہونے کا رنج نامناسب ہے - وہ بتلاتی ہے کہ دو دوستوں میں ضرور پہلے ایک مر جائے گا اور دوسرا زندہ رہے گا - اس کو مرنے پر زیادہ رنج نہیں چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اچھا ہؤا کہ دوسرے دوست نے میرے مرنے کا رنج نہیں دیکھا -

۹۸- مذہب

۱- مذہب کے لیے دلائلِ عقلیہ کافی نہیں ہوتیں بلکہ اس کے لیے کچھ اور بھی چاہیے - جو اہلِ مذہب اپنے احکامِ مذہبی کے پابند ہیں وہ اپنے ایمان اور عقیدے کے ایسے دوست نہیں ہوتے جیسے کہ عقل کے دشمن ہوتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ عقل فی نفسہٖ رفیع القدر اور بلند پایہ ہے - اسی کے سبب انسان حیوانوں میں ممتاز ہو کر اشرف المخلوقات بنا ہے - اسی کی افزائش پر انسان کی ترقی ، خوشی ،

۱- یہ عبارت اصل نسخے میں اسی طرح ہے -

۲- اصل : کے -

نیکی منحصر ہے - وہی انسان کے نفس کی وہ قوت ہے کہ جس سے آمورِ حق کا انکشافِ علمی ہوتا ہے - جب مقدمات ترتیب پاتے ہیں اور شہادت پیش ہوتی ہے تو ان کو مرتب کر کے عقل ہی نتیجہ نکالتی ہے - غرض اِسی قوتِ مُدرکہ کے طفیل سے سارے اِدراکات ہوتے ہیں -

امورِ حق کے دو حصے ہیں جن میں ایک بڑا حصہ ہے جس کے انکشاف میں عقل کو بالکل دخل ہے اور وہ خود کافی ہے ، کسی اَور امداد کی اس کو ضرورت نہیں ؛ مثلاً مادیات اور مادوں کی طبائع ، خواص کی تحقیقات فقط اپنی قوت سے وہ کر لیتی ہے - مگر دوسرا حصہ آمورِ حقہ کا ایسا ہے کہ جس کے ادراک میں عقل عاجز ہے - کچھ تو اِس سبب سے کہ اِلحاد نے اس کی شہادت کو تاریک یا محو کر دیا ہے - کچھ اِس وجہ سے کہ اُن کی ذات و صفات کی شان ہی ایسی ہے کہ خدائے جلّ شانہ کی خاص تعلیم اور اِلقا و الہام و مکاشفہ پر ان کا انکشاف موقوف ہے - گو اس حصے میں بھی عقل کو دخل ہے ، مگر ایک خاص حد تک - اِس حد سے پرے اُن امور میں جن سے کہ تمام عالم کی اغراض متعلق ہیں ، عقل نے اپنے غرور اور تکبّر کے سبب سے اپنے عجز و خطا و خرابی کو ظاہر کر دیا - ایسے امور میں ہم اس کے دخل پر تبرّا بھیجتے ہیں اور اس کے اعتبارِ خدا داد پر اعتماد نہیں کرتے -

علومِ ریاضیہ ، جبر و مقابلہ ، علمِ ہندسہ ، کُل علومِ طبیعیات میں عقل رہنمائی کے لیے کافی و وافی سمجھی جاتی ہے - کبھی یہ خوف نہیں ہوتا کہ وہ ہم کو ان علوم میں گمراہ کرے گی - تمام اشیا جو ثبوتِ عقلیہ رکھتی ہیں[1] ، اُن میں وہ اپنی حد کے دائرے سے باہر

۱- اصل میں یہ جملہ یوں تھا : ”تمام اشیا میں جو ثبوت عقاید رکھتی ہیں -“

قدم نہیں رکھتی ، غالباً کبھی غلطی نہیں کرتی - اور جو کبھی کسی اتفاق سے بہک جاتی ہے تو ایک تحقیقِ[1] جدید سے کامل استقرا ہو کر اس کی غلطی کی تصحیح ہو جاتی ہے - مگر جب وہ تن تنہا اخلاق اور مذہب کے دائرے میں قدم رکھتی ہے اور کوئی اس کی استعانت نہیں کرتا تو وہ نیکی اور راستی سے بڑی خوفناک برخلافی[2] کرتی ہے ، اور خدا کے باب میں بھی اپنے نقص فساد انگیز ظاہر کرتی ہے - جہاں اس نے الہامِ ربّانی سے انحراف کیا تو وہ اپنی دانائی سے باغی ہو جاتی ہے اور انسان کے دل کی فطرت کو ناپاک کرتی ہے ، اسے بے اعتقاد بناتی ہے - سب سے بڑی عقل پوچھو تو دین ، ایمان ، عقیدہ ہے جس کے سبب سے انسان عاقل اور باز پرس کے قابل ہؤا ہے -

غرض یہ الہام و مکاشفہ کے اُمورِ حق انسان کے دل پر بڑے مؤثر ہیں - ہر فردِ بشر اور ہر گروہ کے لیے جو باتیں کہ مسرّتِ جاوید رکھتی ہیں ، اُن میں وہ موجود ہیں - حیوانِ ناطق اور خدائے تعالیٰ کے درمیان ، جو خدا کا رکھا ہوا تعلق ہے ، اس کو وہ بتاتے ہیں - اس میں غلطی کرنا ہلاک ہونا ہے - عقل اس میں گڑبڑ کر کے بڑے مغالطے دیتی ہے ، حیران و دِق کرتی ہے - کتبِ مقدّسہ کے اِلہامِ الٰہی کی مخالفت کر کے انسانیت کے اصول میں خلل ڈالتی ہے - جب عقل نہ اپنی حد کو جانتی ہے ، نہ اپنے عہدے کے کام ، تو[3] وہ اُن کاموں میں اپنی مداخلت کرتی ہے جو اس کے ماتحت ہونے سے باہر ہیں - وہ[4] دماغ اس کا چلتا ہے کہ الہامِ الٰہی کو چاہتی ہے کہ میرے آگے سر جھکائے - وہ اُن مسائل کا کچھ پاس و لحاظ نہیں کرتی جو

۱- اصل : تحقیقت - ۲- اصل : برخلافے -

۳- اصل : کو وہ -

۴- یعنی اس کا دماغ ایسا چل جاتا ہے -

بمنزلۂ اسرارِ الٰہی ہیں۔ وہ ان کو یقین نہیں کرتی۔ ایسی حالت میں عقل دہشت ناک و خوف ناک ہو جاتی ہے، اس سے بجائے نفع کے نقصان پہنچتا ہے؛ ورنہ عقل اگر اپنی حد کو پہچان کر تحقیقاتِ مذہبی میں آزادانہ قدم رکھے تو انسان کو بہت فائدہ پہنچائے۔

۲- برک صاحب فرماتے ہیں کہ ہم اِس بات کو خوب جانتے ہیں، اور اِس جاننے پر فخر کرتے ہیں، کہ انسان بالطبع مذہبی حیوان ہے۔ مُلحد ہونا انسان کی عقل ہی کے خلاف نہیں ہے بلکہ اُس کی جبلّت اور فطرت کے بھی[1] برخلاف ہے، اس لیے الحاد دیر تک نہیں قائم رہ سکتا۔ اِس امر کی تصدیق تمام زمانوں میں ساری قوموں نے کی۔ انسان خواہ کیسا ہی ضلالت، توہّماتِ باطلہ، بُت پرستی، غلطیوں میں مبتلا ہو مگر وہ وجودِ الٰہی اور اس کے کمالات کا ضرور معتقد ہوگا۔ سارے ملک کے باشندے، خواہ وہ عالم ہوں، جاہل ہوں، مہذّب ہوں، غیر مہذّب ہوں، وحشی ہوں، وہ سب کے سب خدا کو کسی نہ کسی طرح سے مانتے ہیں۔ انتظامات و تدابیرِ الٰہی کے قائل ہوتے ہیں۔ اُس کی عبادت کرتے ہیں، گناہوں کی معافی کے واسطے قربانیاں کرتے ہیں، آخرت کو مانتے ہیں، خدا کے ہونے پر اُن کی تمام وحشیانہ نیکیوں کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ غرض خدا کا انکار کسی سے کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

۳- **اتّحادِ مذہبی**: دنیا میں کوئی چیز، آدم زاد کے اجتماع میں اتّحاد پیدا کرنے والی، مذہب سے زیادہ نہیں ہے۔ اتّحاد کی صحیح حدود میں جب مذہب محدود ہوگا تو وہ انسان کے لیے سعادت و برکت کا سبب ہوگا۔ جیسے خدا پرست مذہبوں میں اختلافات و فساد و

۱- "بھی" اضافۂ مرتّب۔

عناد کھڑے ہوتے ہیں، ایسے بت پرستی کے مذہبوں میں نہیں ہوتے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ خدا پرستوں کا خدا بڑا غیور ہے۔ وہ اپنی عبادت اور مذہب میں غیر کی شرکت کو نہیں دیکھ سکتا۔ بت پرستی کے مذہبوں میں مذہب کا مدار فقط رسومِ ظاہری کے برتاؤ پر ہوتا ہے۔ اُن کے مذہب کے مصنّف بھی اکثر شاعر ہوتے ہیں۔ جس مذہب میں اختلافات اور بدعاتِ سیّئہ زیادہ تر نمایاں ہوتی ہیں تو اِس سے خود مذہب کو کلنک کا ٹِیکا لگ جاتا ہے اور اہلِ مذہب کا اخلاق بگڑ جاتا ہے۔ انسان کے جسم میں کسی خِلط[1] کے فساد سے وہ خرابی نہیں پیدا ہوتی جو ایک زخم یا عضو کی شکستگی سے صدمہ پہنچتا ہے۔ روحانی امراض میں اتّحادِ مذہبی کا جاتا رہنا سخت مرض ہے۔ اس سے غیر مذہب والوں کو مذہب کی تحقیر و تذلیل کی دلیل خوب ہاتھ لگ جاتی ہے۔ وہ کہنے لگتے ہیں کہ اِس مذہب کی ایک زبان نہیں، دس زبانیں ہیں۔ ایک کچھ کہتا ہے، دوسرا کچھ بولتا ہے، کوئی بات ٹھکانے کی نہیں معلوم ہوتی۔ متناقض رائیں، مختلف عقیدے ان میں ایسے ہیں کہ جن سے وہ دیوانے یا کچھ دیوانوں سے بہتر معلوم ہوتے ہیں۔

پس اتّحادِ مذہبی کے نہ ہونے کا ایک نتیجہ تو یہ غیر مذہب والوں میں نمودار ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مذہب بے اعتبار ہوتا ہے۔ اب دوسرا نتیجہ اپنے مذہب والوں میں یہ ہوتا ہے کہ آپس کی مصالحت جاتی رہتی ہے جس سے ہزاروں عافیتیں اور نعمتیں چھن جاتی ہیں۔ مصالحت سے ایمان قائم رہتا ہے، ایک دوسرے کے ساتھ فیاّضانہ سلوک ہوا کرتا ہے۔ اس کی بجائے ایک دوسرے کے ساتھ مخالفت

۱۔ خِلط: اخلاطِ اربعہ، یعنی صفرا، سودا، خون، بلغم میں سے ہر ایک کو خلط کہتے ہیں۔ اخلاط جمع۔ (نوراللغات)

شروع ہوتی ہے - ایک دوسرے کی تحریروں کو پڑھتے ہیں اور تبرّا بھیجتے ہیں - دو فریق لڑنے والے اور تیسرے اُن کے درمیان ثالث بالخیر بننے والے کھڑے ہو جاتے ہیں - کوئی کہتا ہے کہ جو ہماری مخالفت کرتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں ہے اور جو ہماری مخالفت نہیں کرتا وہ ہمارے ساتھ ہے - جزئیات پر تکراروں کی تحریروں کے طومار کے طومار ہو جاتے ہیں - کُلیّات پر تھوڑی بحث ہوتی ہے - جزئیات میں اختلافات کے سبب سے بحث و تکرار کو طول ہو تو مضائقہ نہیں، مگر کلیّات میں اتحاد رہنا چاہیے - کپڑے مختلف پہنے جائیں مگر کہیں ان میں چاک نہ ہونا چاہیے - جو سمجھ دار ہیں وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ایسے اختلافات کا کرنا اور اس پر آپس میں لڑنا جاہلوں کا کام ہے - وہ جانتے ہیں کہ دونوں ایک ہی بات کہتے ہیں مگر جہالت سے اِس بات کے ماننے میں متفق نہیں ہوتے - خدا ایسے جزئیات کے اختلافات پر خیال نہیں کرے گا - وہ تو دلوں کو دیکھتا ہے، یہ نہیں دیکھتا کہ انسان ضعیف العقل ایسا ہے کہ وہ اپنی متناقض باتوں کو نہیں سمجھتا کہ وہ ایک ہی ہیں -

اب اتحادِ مذہبی کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک تو یہ کہ اس کی بنا جہالت پر رکھی گئی ہو - جیسے اندھیرے میں سب رنگ ایک ہی نظر آتے ہیں، ایسے ہی جہالت میں مذہب کے سب رنگ متحد معلوم ہوتے ہیں، کوئی اختلاف نظر نہیں آتا - دوم، اصول گو آپس میں متضاد ہوں مگر ان کو اتحاد تسلیم کرا دے - اس صورت میں جھوٹ سچ کا حال ایسا ہوگا جیسے لوہے اور مٹی کا کہ گو وہ دونوں آپس میں چسپاں ہوں مگر مل نہیں سکتے -

۴- مذہب وہی ہے جو انسان کی خوشی پر خوشی زیادہ کرتا چلا جائے - مذہب اِس کا نام نہیں ہے کہ آدمی دنیا کی تمام بے گناہ

خوشیوں اور چین و آرام و صحبت کو چھوڑ کر غار و کوہ میں جا بیٹھے اور غم زدہ ہو کر آفت اور مصیبت میں پھنسا رہے، ترکِ لذّات کرے، طرح طرح کی سختیاں اُٹھائے، ریاضتیں کرے، کم کھانے اور ننگے زمین پر سونے سے اپنے تئیں لاغر و ناتواں بنائے۔ مذہب تو اِس کا نام ہے کہ دل کو گناہ کی آلودگی سے پاک صاف کرے۔ جن خوشیوں میں کوئی گناہ نہیں، ان کو مذہب منع نہیں کرتا، مگر اُن میں اعتدال رکھنے کو کہتا ہے، کیونکہ افراط سے وہ گناہ بن جاتی ہیں، جس کا انجام تلخ کام کرتا ہے۔ ایسی خوشی اُن تمام خوشیوں سے زیادہ ہوتی ہے جو گناہ سے ہوتی ہیں۔

۵۔ مذہب کا اثر: مذہب بھی عجیب و غریب کام کرتا ہے۔ میخ کی طرح کسی تنگی میں نہیں گُھسا ہوتا۔ وہ تو خدا کا روشن چراغ ہوتا ہے جس کی صاف روشنی دل کو روشن کرتی ہے۔ وہ فیضِ الٰہی کا سرچشمہ ہوتا ہے جس میں سراسر انصاف و سچائی بھری ہوتی ہے۔ وہ قلب سے خطاؤں کو دھوتا ہے، دل سے دنیا کو لُڑھکا دیتا ہے، نفس کو تاریکی سے بالکل خالی کر دیتا ہے۔ وہ تاریک تماشا گاہوں کو روشن کرتا ہے، ناہموار راہوں کو ہموار، ناخوش دلوں کو خوش، نہایت کڑوے تلخ[1] کو میٹھا شہد، نہایت بیمار روح کو صحیح و تندرست۔ دل میں اُمیدیں پیدا کرتا ہے، بُشرے کو رونق دیتا ہے، سر میں تیل ڈالتا ہے، آنکھوں کو روشن کرتا ہے، ہاتھوں کو قوّت دیتا ہے، پاؤں کو تیز روی، زندگی کو خوش و خرّم، محنت کو راحت، موت کو فیروزمند، خوفناک[2] کو ایمن، نامرد کو

۱۔ کذا۔
۲۔ 'خوفناک' بمعنی خوف زدہ استعمال ہوا ہے۔

مردانگی، کمزور کو زور۔ قبر کے خوفوں کو اپنے زور سے دور کرتا ہے، موت کی تکلیفوں سے بچاتا ہے، ایمان کو تقویت دیتا ہے۔ محبّت کو شوق، امید کو خوش آیندہ، حرارتِ مذہبی کو تابندہ۔ غلاموں کو بیٹا بناتا ہے، چیتھڑے اتروا کر لباس پہناتا ہے، لعنت ملامت سے دل کو خوش کرتا ہے، قید خانے کو محلِ شاہی بناتا ہے، شہید ہونے کی آگ کو نسیمِ بہار و گلزار۔ مذہب نہ روپے سے خریدا جاتا ہے، نہ کسی اور استحقاق سے ہاتھ آتا ہے۔ فقط فضلِ ربِ کریم پر موقوف ہے۔ جو خدا کی عبادت کرے گا، خدا اس کو خود اپنی راہ بتائے گا۔ کچھ ستارے و فرشتے کی رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ عاجزانہ محبت سے خدا ملتا ہے، مغرورانہ عقل سے نہیں۔ بارگاہِ الٰہی میں محبت لے جاتی ہے، مغرور سائنس (علوم) کو وہاں دھکے ملتے ہیں۔ مذہب خواہ الہامی ہو یا نیچریہ، دونوں صورتوں میں یکساں فائدہ پہنچاتا ہے۔ عینِ شباب، صحت، ثروت میں وہ احسان مندی اور پرلے درجے کی محبت کو دلوں میں چمکاتا ہے۔ مصیبت، بیماری، بڑھاپے میں ایمان و عقیدہ میں پکا، خدا کی مرضی کا بالکل تابع، اپنے فرائض کے ادا کرنے میں خوش باش کرتا ہے۔ ایسی حالت میں مذہب سے وہ قوتیں موجود ہو جاتی ہیں جو معلوم ہوتی تھیں کہ معدوم ہو گئی ہیں۔ افقِ زندگی پر جو ستارۂ شام تھا، وہ دوسرے موسم میں صبح کا ستارہ بن جاتا ہے، اور موت کی تاریکی میں اپنی روشنی دکھاتا ہے۔

۶۔ **مذہب کی تعظیم**: مذہب کو خواہ کسی پیرایے میں دیکھو، وہ تعظیم و ادب کے قابل ہے۔ اس کی عبادت گاہ بڑی شان و شکوہ رکھتی ہے۔ اس کے پُجاری اندر جا کر تسکینِ قلب پاتے ہیں، خدا کے فضل و کرم کی امید رکھتے ہیں، مگر اِس کے ساتھ خوف و عبرت بھی رکھتے ہیں۔ اگر ہم روحانی اشیا کو جسمانی چیزوں کے ساتھ تشبیہ دینے

کے مجاز ہوں تو ہم مذہب کو ایسی[1] قدرتی فضاؤں سے تشبیہ نہیں دے سکتے جس میں سب چیزیں شگفتہ و خنداں ہوں ؛ بلکہ اِس کی تشبیہ اونچے پہاڑوں ، گہرے سمندروں یا ستاروں بھری رات سے دیں گے جن کے دیکھنے سے انسان کے دل کو مسرّت و عبرت دونوں ہوتی ہیں ۔ ان کی حسانت کو شان و شکوہ کے ساتھ دیکھ کر دل خوش بھی ہوتا ہے اور عبادت بھی کرتا ہے ۔

۷۔ **مذہب خود غرض نہیں ہوتا** : جو شخص خدا کے مذہب کو مانتا ہے ، اس کے واسطے پہلا حکم یہ ہے کہ 'تو بارور ہو۔ جو نیک آدمی ہوتا ہے ، اس کی نیکی دل کے اندر چھپی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ وہ اس سے اپنے کمزور بھائی کو زور آور کرنا جانتا ہے ۔

جب انسان کی روح راستی پر ہوتی ہے تو وہ ضرور چاہتی ہے کہ میں بہشت میں اَور لوگوں کو لے جاؤں ۔ جو نیک آدمی ہوتے ہیں ان کا مقصدِ اعظم یہ ہوتا ہے کہ اَوروں کو بھی اپنا سا بنائیں ۔ جو شخص اِس طرح مر جاتا ہے کہ جس سے شانِ الٰہی کی شکوہ نہ ظاہر ہو وہ بڑا ناسپاس ہے ۔ وہ درخت کس کام کا ہے کہ زمین کا بوجھ ہو اور پھلے بھی مگر کوئی بیج ایسا نہ چھوڑے کہ جس سے اُس جیسا اَور درخت پیدا ہو ۔ یہ سچ ہے کہ سب آدمی اپنی مثل نہیں چھوڑ سکتے مگر اپنے مشابہ چھوڑ سکتے ہیں ۔ ایسے آدمی جو اپنا مثل نہیں چھوڑتے وہ اُن پژمردہ اور مردہ دانوں کی مانند ہیں کہ جن سے ایک سال بھی فصل نہیں پیدا ہوتی ۔ اگر ایک طبیب کو کوئی عمدہ نسخہ معلوم ہو اور وہ اس کو شائع کیے بغیر مر جائے تو اس کو چور کہنا چاہیے کہ جس نے حقیقت میں بہت سی وہ

۱۔ اصل : ایسے ۔

نعمتیں چرائیں جو اس کے مرنے کے بعد بہت بڑھ جاتیں - پس اس کے جینے کا نتیجہ فقط یہ ہوا کہ اس نے اوروں کے ساتھ بھلائی اس لیے کی کہ اپنے ساتھ زیادہ بھلائی ہو - جو شخص یہ چاہتا ہے کہ فقط میں ہی اکیلا بہشت میں جاؤں ، معلوم نہیں جائے گا یا نہیں - جو ارکانِ شاہی حسد کے سبب سے یہ چاہتے ہیں کہ سوائے ہمارے کوئی اور بادشاہ کا خیرخواہ نہ ہو ، وہ بادشاہ کے بھی خیرخواہ نہیں ہیں - جن کے دل خدا شناس ہوتے ہیں ، وہ فیّاض ہوتے ہیں - ان کا دل منوّر ہوتا ہے اور وہ اپنی روشنی پھیلائے بغیر نہیں رہ سکتے - نیک نہاد جو چاہتے ہیں ، خاطر خواہ وہ نہیں کر سکتے ، مگر جو کچھ وہ کر سکتے ہیں اُس میں محنت کرتے ہیں - اُن کی دلی تمنّا یہ ہوتی ہے کہ اوروں کو بہشت میں ساتھ لے جائیں -

۸- مذہب کا دنیا کے کاموں کے لیے دستورالعمل ہونا : دنیا میں اکثر مذہب ایسے ہیں کہ اُن میں دنیا کے تمام چھوٹے بڑے کاموں کے لیے قاعدے اور سلطنت و حکومت کے لیے قوانین و آئین مقرر ہیں - ہر شخص پر ان کے موافق زندگی بسر کرنی فرض ہوتی ہے - انسان کو بالطبع یہ جکڑبندی پسند نہیں ہوتی - وہ ان قیدوں سے گھبرا جاتا ہے اور زنجیریں تڑانی چاہتا ہے - اور فراخ دلی کی حالت میں وہ اُن متعلقات کو بھی ، جو خدا کے ساتھ ہوتے ہیں ، چھوڑ دیتا ہے - مذہبوں میں عیسائی مذہب اِس باب میں مستثنیٰ ہے - اس نے سوسائٹی کے برتاؤ کے قاعدے نہیں مقرر کیے - سلطنت کے لیے کوئی صورت نہیں متعیّن کی - اس کے تمام احکام روحانی ہیں جو ہوائے نفسانی اور شہواتِ جسمانی کے روکنے کے واسطے زنجیریں ہیں - لوگ کہتے ہیں کہ یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ اس کی ترقی بالاستقلال چلی جاتی ہے ، اور مذہبوں کا تنزّل ہوتا جاتا ہے - مسلمانوں کی جو

عالی شان سلطنتیں تھیں ، اُن کو اسی پابندیِ شرع نے پست کر دیا ہے ، ترقی کو روک دیا ہے اور یہی بڑا سبب ان کے تنزّل کا ہوا ہے ۔

اِس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہی مذہب تھا کہ جس کے سبب سے ترقی ہوئی تھی ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر مذہب میں کچھ نیکیاں ہوتی ہیں ، کچھ برائیاں ۔ ایک زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کی ہوا اس کی نیکیوں کے نشو و نما کے لیے موافق ہوتی ہے اور ان کو سرسبز و شاداب کرتی ہے ، مگر اس کے ساتھ برائیاں بھی دبے دبے پرورش پاتی ہیں ۔ زمانے کی ہوا بدلتی رہتی ہے ۔ پس جہاں وہ بدلی تو معاملہ بالعکس ہو جاتا ہے کہ برائیوں کا نشو و نما وہ ہوتا ہے کہ نیکیاں اس کے تلے دب جاتی ہیں اور مذہب کی بہار پر خزاں لاتی ہیں ۔ اب کوئی زبردست مُصلح و مجدّدِ دین پیدا ہو گیا کہ اس نے ان برائیوں کے بڑھنے کو روک دیا اور نیکیوں کی پژمردگی میں جان ڈال کر شگفتہ کر دیا تو خیر رہی ، نہیں بربادی تو ہے ۔ عیسائی مذہب آزادی سے چلتا ہے ۔ دنیا کے معاملات میں کوئی زنجیر اس کے پاؤں میں نہیں پڑی ہوئی ۔ وہ اپنی بےلباسی کے پشمینہ لباس میں پھر رہا ہے ۔ وہ ہر زمانے کے مناسب چال چلتا ہے ۔ کوئی زمانہ اس کی شائستگی کا مانع نہیں ہو سکتا ۔ اور مذہبوں نے سوسائٹی کے ڈھانچ بنانے کے قواعد کے ساتھ دل کی ہدایت کے واسطے قوانین بنائے ہیں مگر عیسائی مذہب نے فقط افراد کے لیے روحانی قاعدے تجویز کیے ہیں جس سے اب بھی ، اور آیندہ بھی ، تبدیلیاں سوسائٹی کے حق میں عمدہ عمدہ ہوں گی ۔

۹۔ جیسے تھرمومیٹر (مِقیاس الحرارت) کو اصلی آفتاب کی حرارت میں رکھو تو اس میں پارہ اوپر کو اٹھے گا مگر برف کے ڈلے کے پاس رکھو تو نیچے اُترے گا ، ایسا ہی اہلِ مذہب کا حال ہے کہ جب

وہ کلامِ الٰہی کے آفتاب کے قریب ہوتا ہے تو اس کا عروج محبتِ الٰہی میں ہوتا ہے جس سے اس کو خوشیاں ہوتی ہیں ، مگر جب وہ دنیا کی ٹھنڈی برف کے ساتھ ہوتا ہے تو وہ نیچے آترتا ہے اور اس کی وہ خوشیاں جاتی رہتی ہیں -

۱۰- جس وقت بگل بج رہا ہو اور وہ لڑائی کی خبر دے رہا ہو تو ہتھیاروں کا لگا لینا مشکل نہیں ہوتا ، مگر جب لڑائی کی کچھ اطلاع نہ ہو تو ہر وقت ہتھیار باندھے رہنا مشکل ہے - ہماری روحانی لڑائی جنگ ہائے عظیم کی طرح نہیں ہے کہ جن میں مہلت اور فرصت ملتی ہے ، بلکہ وہ روزانہ ، ہر ساعت ، ہر لمحے میں موجود ہے ، جس میں دشمنوں کو ہٹانا پڑتا ہے -

۱۱- مذہب افلاس کو روکتا ہے - سچّا مذہب انسان کو عقبیٰ میں بہشت ہی میں نہیں لے جاتا بلکہ وہ دنیا میں بھی انسان کی حالت بہتر بناتا ہے - وہ امیروں ہی کو فائدہ نہیں پہنچاتا ، جو مرفہ حالی سے عالی شان مکانوں میں رہتے ہیں ، بلکہ وہ زیادہ تر اپنا نیک اثر غریب بے چارے مسکین آدمیوں کے جھونپڑوں میں دکھاتا ہے - یہ سچّے مذہب کا کام ہے کہ وہ انسان کی ہوائے نفسانی کو کم کرتا ہے اور وہ اُن کو محکوم بنا لیتا ہے - ہوائے نفسانی کا غلبہ انسان کو عیّاش ، اوباش ، شراب خوار اور طرح طرح سے بدکار بنا دیتا ہے ، جس کے سبب سے افلاس کی مصیبت میں گرفتار ، قرض دار ، ذلیل و خوار ، بے عزّت ہوتا ہے - وہ اپنی شہواتِ نفسانی کی اگام کو ہاتھ میں نہیں رکھتا - اس کی طبیعت کا میلان برائی کی طرف ہوتا ہے - اس میں اپنا وقت ، اپنا مال ، اپنی قوّت خرچ کرتا ہے ، اس لیے نا وقت اس کو موت آ جاتی ہے - جن آدمیوں کی رائے یہ ہے کہ عوام الناس کی تعلیم ان کے حق میں مُضر ہوتی ہے ، وہ حق پر نہیں ہیں - تمام جاہلوں کے

واسطے علم سے بہتر کوئی چیز نہیں - جہالت سے تعصّب پیدا ہوتا ہے ، تعصّب سے ہوائے نفسانی میں جوش اُٹھتا ہے - تعلیم اس آفت سے بچاتی ہے - محنت ، انتظام ، کفایت شعاری کی عادتیں پیدا کراتی ہے - مذہب کا اثر جو عوام پر ہوتا ہے ، وہ روز تم دیکھتے ہو -

۱۲- دنیا میں جو بالفعل مذہب کی صورت ہے ، ہر ملک میں کم و بیش وہ بات نہیں ہے جو پہلے تھی کہ لوگوں کے دلوں سے ہزاروں آوازیں خدا کی ستائش و نیائش کی نکلتی تھیں - ہزاروں گیت اس کی حمد و ثنا کے بڑے ذوق و شوق سے گائے جاتے تھے - اب مذہب ایک دنیاوی ہوشیاری کا نام ہو گیا ہے - اس کا حساب بھی منفعت اور مصلحت پر کیا جاتا ہے - ناچیز دنیا کی خوشیوں کا معاوضہ عقبیٰ کی بڑی خوشیوں سے کیا جاتا ہے - مذہب کو بھی لوگوں نے ایک تاجرانہ منفعت سمجھ لیا ہے - مذہب کے کاموں کا کرنا اجرت کے لیے ٹھہرا رکھا ہے - اب مذہب اللہ جلّ شانہ کی عظمت و ادب نہیں ہے بلکہ وہ ایک وحشیانہ خوف و رجا ہے - اگرچہ بہت سے اہلِ مذہب ایسے ہوں کہ جن کا یہ حال نہ ہو - خدا نخواستہ اگر ایسا ہو تو دنیا کی بڑی کم بختی آئے - لیکن جو شخص دانا و ہوشیار ہے ، ہم کو یقین ہے کہ وہ زمانے کا رنگ اور مقتضا دیکھ کر ہمارے قول کی تصدیق کرے گا -

۱۳- تسلیٔ مذہبی : نیک آدمیوں کی بڑی تسکین و تسلی مذہب سے ہوتی ہے - بہشت ملنے کی بڑی خوشی لگی رہتی ہے - برے آدمیوں کو نہ اطمینان ہوتا ہے ، نہ کوئی توقع ہوتی ہے - انسان کی روح اپنا تعلق آیندہ زمانے سے کبھی منقطع نہیں کرتی - وہ ایسے زمانے کو دیکھتی رہتی ہے جب آدمی کو سب طرح عیش و آرام حاصل ہوتا ہے ؛ جوانی میں مست و تندرست ، نبض خوب درست ، بدن میں طاقت ،

صورت میں حسانت ، ہر ایک کام میں کامیابی : تو بھی کبھی کبھی خیال آیندہ کا آتا ہے کہ کیا ہوگا ۔ جب زمانہ بدل جاتا ہے ، دوست آشنا چھوڑ دیتے ہیں ، بیماری اور بڑھاپا ستاتا ہے ، تو پھر عقبیٰ کا فکر زیادہ ہوتا ہے ، اور یہ تردد پیدا ہوتا ہے کہ اب مر کر کہاں جانا ہوگا ۔ ایسے نازک وقت میں سوائے مذہب کے کوئی تسلّی اور تشفّی دینے والا نہیں ہوتا ۔ مذہب کا بڑا تعلق آیندہ حالت سے ہے ، اس لیے ہر ایک آدمی کو اس کی خبر رکھنی چاہیے ۔ بہت سے علم ہیں ، ان کی شاخیں بھی بہت سی ہیں جن کا حاصل کرنا عوام کو بڑا فائدہ نہیں دیتا ، کیونکہ وہ کچھ تعلق ان کے فرائض سے نہیں رکھتے ۔ ان کی جبلّت میں ، نہ ان کی طبیعت میں وہ ذہانت ہے ، نہ عقل ہے کہ جس سے وہ ان علموں کی تحقیقات کے درپے ہوں ۔ مگر ان علموں کی تحقیقات سے مبادیٔ مذہب کا حال مختلف ہے ۔ ان سے ہر روز انسان کو کام پڑتا ہے اور ان کی ضرورت رہتی ہے ۔ کچھ وہ دل لگی کی باتیں نہیں کہ ضیافتِ طبع ہو ۔

۱۴ ۔ سچّے مذہب میں نہ تو کوئی مکر و فریب ہوتا ہے ، نہ اس میں قوّتِ متخیّلہ کی تبخیر کا جوش و خروش ، نہ اس میں ہوائے نفسانی کا زور شور ہوتا ہے ۔ مگر ہاں جب مذہب ڈھٹ بندی کرتا ہے تو آنکھوں کے سامنے ایسی کُہر آ جاتی ہے کہ یہ سب بالائی باتیں مذہبی معلوم ہونے لگتی ہیں اور بہت سے مغالطے کھانے پڑتے ہیں ۔ سچّا مذہب انسان میں تواضع ، عاجزی ، کسرِ نفسی ، نفس کشی بغیر کسی طرف داری اور تعصّب کے پیدا کرتا ہے جس کے سبب سے وہ خدا کو جانتا ہے اور ہر کسی سے محبت کرتا ہے ۔ غرض وہ انسان میں نیا نیچر پیدا کرتا ہے جو اس کی روح کو خبر کر دیتا ہے کہ اس کا حال خدا کا سا ہے ۔

۱۵- **مذہب میں سرد مہری:** بعض آدمیوں میں مذہبی حرارت ذرا نہیں ہوتی - بالکل مذہب میں ٹھنڈے اور سرد ہوتے ہیں - بعض آدمیوں میں حرارتِ مذہبی کی شدّت ہوتی ہے - ان میں اصلی نیکی ہوتی ہے - گو کبھی کبھی اس حرارت کے اضطراب و اضطرار میں ان کی نوبت دیوانگی پر پہنچ جاتی ہے مگر ان کے دوبارہ صحّت پانے اور بحال ہونے کی توقع ہوتی ہے - مگر جو مذہب میں بالکل ٹھنڈے آوے کی طرح ہیں وہ تو ایسے کودن ، محض بےحس ہیں کہ جن کے سنبھلنے کی امید ہی نہیں - ایک وہ لوگ ہیں کہ جن کی حالت ان دونوں افراط و تفریط کے درمیان اعتدال کے ساتھ ہے - ان کا حال ایسا ہے کہ جیسے کوئی شخص دو شخصوں کے درمیان عین وسط میں کھڑا ہو تو ہر کنارے کے دیکھنے والے کو وہ دوسرے کنارے کے قریب معلوم ہوگا - پس اسی طرح جو شخص ان دونوں حالتوں کے درمیان بیچو بیچ ہوگا تو وہ شخص اس کو حرارتِ مذہبی سے خالی کہے گا جو خود حرارتِ مذہبی سے بھرا ہوا ہے - جو شخص حرارتِ مذہبی سے بالکل خالی ہے ، وہ اس کو کہے گا کہ حرارتِ مذہبی سے بھرا ہوا ہے - غرض دونوں طرف سے اس پر لعنت ملامت ہوگی -

۱۶- **مشکلاتِ مذہبی:** اگر مذہب فقط اتنی بات ہوتی کہ جسم کو کچھ حرکتیں دے لیں ، کچھ زبان ہلا لی تو بہشت میں جانا ایسا آسان ہوتا جیسے کہ کسی دوست کی ملاقات کو جانا - مگر بڑی مشکل تو یہ ہے کہ مذہب تو اس کا نام ہے کہ دنیا کی محبّت کے خیالات کو چھوڑ کر خدا سے بالکل دل لگائے اور دنیا اور ما فیہا کو بھول جائے - ما سوا سے جو تعلّق رکھے وہ للہ[1] -

---

۱- یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ اگر کسی چیز سے تعلق رکھے تو وہ بھی اللہ ہی کی خوشنودی کے لیے ہو -

۱۷- نیک آدمیوں کو اگرچہ بڑھاپا آتا ہے، اُن کے تمام قُوا ضعیف روز بروز ہوتے جاتے ہیں جس سے تکلیف ہوتی ہے، مگر اُن کی روح میں غور کرنے کی قوّت و تنومندی ایسی آتی جاتی ہے کہ کوئی صدمہ ان کو مغلوب نہیں کر سکتا۔ غرض یوں نفع نقصان برابر رہتا ہے۔ جو ایک طرف سے کھویا جاتا ہے؛ وہ دوسری طرف سے ملتا جاتا ہے۔ اس طرح یہ کہنا درست ہے کہ وہ بوڑھے ہی نہیں ہوتے۔

۱۸- آزادی کے شجر کی بلندی پر مذہب نشو و نما پاتا ہے، وہیں شگفتہ و پختہ ہوتا ہے۔ جب ملک میں یہ افراط و تفریط نہیں ہوتی کہ نہ طوائف الملوکی ہوتی ہے، نہ ایک شخص کی قہرمانی سلطنت ہوتی ہے، بلکہ ایسی آزادی ہوتی ہے جس میں صلح و اعتدال ہو، تو وہاں مذہب کی ترقی بہت ہوتی ہے۔

۱۹- مذہب کی محبّت: جو شاہزادہ کہ مذہب سے محبّت کرتا ہے اور اس سے ڈرتا ہے، وہ ایسا شیر ہے کہ جو اس کو پچکارتے اور پکارتے ہیں تو وہ ان کی طرف جھکتا ہے۔ اور جو شاہزادہ مذہب سے نفرت رکھتا ہے اور خوف نہیں کرتا، وہ ایک وحشی درندہ ہے جو بھوک بھوک کر اُس زنجیر کو کاٹتا ہے جو اُسے مسافروں پر لپکنے نہیں دیتی۔ جو شخص مذہب بالکل نہیں رکھتا، وہ وحشت ناک حیوان ہے جو اپنے تئیں آزاد بھنبھوڑنے اور کھانے کے لیے سمجھتا ہے۔

۲۰- سب انسان فطرت میں مساوی ہیں، مگر اُن میں سے ایک کو بہ نسبت دوسرے کے نیکی بڑا کرتی ہے۔ غریبی مسکینی کی حالت میں مذہب نیک طبیعت، عالی طبع اور فراخ حوصلہ بناتا ہے اور دل میں وہ استغنا پیدا کر دیتا ہے کہ دولت کے فائدوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ مذہب خواہ جھوٹا ہو یا سچا ہو، یہ سب کو ماننا پڑتا ہے کہ اسی کے عمدہ اصول، بے خوف و خطر انسان کی حیات و موت کے

لیے رہنما ہوتے ہیں -

۲۱- بہت سے آدمی معیشت کے مارے مذہب کا دعویٰ کرتے ہیں ، مگر وہ دنیاداری کے ہزاروں دھندوں میں پھنسے ہوئے ہیں کہ رات دن مشقّت اُٹھاتے ہیں ، تردد و تفکّر کرتے ہیں - اُن کی روح کا خدا کے ساتھ گفتگو کرنا ایسا ہے جیسا کہ پیٹ کے بل پہاڑ پر چڑھنا یا آفتاب سے اوپر اُچھلنے کا قصد کرنا - دنیا کو وہ اپنی بہشت بناتے ہیں اور اپنے اَمثال و اَقران کی دلیلیں لاتے ہیں - مگر وہ سب سڑی بُسی دلیلیں ہوتی ہیں -

۲۲- اہلِ مذہب کی سنگ دلی اور دنیا طلبی سے مذہب کی جو ذلّت و خواری ہوتی ہے وہ دشمنوں کی لعنت ملامت سے کبھی نہیں ہوتی - اکثر آدمیوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ پہلے مذہب کے چہرے پر خاک دُھول مَل دیتے ہیں اور پھر اس خاک آلودہ رنگ کو مذہب کا اصلی رنگ قدرتی سمجھنے لگتے ہیں - پھر اس صورت سے خوش نہیں ہوتے اور کہنے لگتے ہیں کہ اس ڈراؤنی شکل کی کیوں اچھی طرح مدارات کریں -

۲۳- مذہب کی روکیں : اکثر دولت مند مذہب کے پابند نہیں ہوتے کیونکہ مذہب مقیّد کرتا ہے ، دولت شترِ بے مُہار بنا کے آزاد کرتی ہے -

۲۴- اگر دنیا میں خدا اور مذہب نہ مانا جائے تو پھر انسان کی زندگی کا مقصدِ اعظم باقی نہ رہے - شخصی خوشی اور قومی بہبودی اور خاص و عام کی نیکی کی جڑ مذہب ہی ہے - جو شخص خدا کی مرضی پر رہتا ہے ، راستی کے قُطب کے گرد پھرتا ہے ، فیّاضی اختیار کرتا ہے ، اُس کے لیے دنیا ہی بہشت ہو جاتی ہے - یہ مذہب کے ساتھ بڑی گستاخی ہے کہ کوئی کہے کہ کم عقلوں ، بچوں ،

عورتوں کے واسطے فقط مذہب بنایا گیا ہے۔ مذہب کا بڑا مطلب یہ ہے کہ انسان کی یہی خوشی ہو کہ وہ اپنے تئیں خدا کے مشابہ بنائے۔ جو مذہبی علم اس بات کی تعلیم نہیں سکھاتا وہ مذہبی علم نہیں ہے بلکہ کوئی اَور جھوٹا علم ہے۔ اکثر آدمی اور بعض وقت کُل آدمی طولِ دعا و نماز سے گھبراتے ہیں اور اِس کے جلد تمام ہونے سے خوش ہوتے ہیں۔ مگر یہ کچھ محنت و مشقّت کی بات نہ تھی جس سے وہ گھبرائے۔ وہ اپنے خدائے تعالیٰ کی عظمت ظاہر کرنے اور اپنی عزّت حاصل کرنے کی بات تھی۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو ضعفِ روحانی ہے اور وہ مذہب کے خیالات میں جھوٹا ہے۔ نقل مشہور ہے کہ ''یا چُھوؤ نہیں یا گھیرے ہو[۱]''، وہ مذہب پر صادق آتی ہے کہ مذہب سے تھوڑا ہی واقف ہونا انسان کو غم زدہ بناتا ہے، جیسے کہ علم کا تھوڑا ہونا مغرور بناتا ہے۔ بعض آدمی اپنے مذہب کو بھی اسی طرح بدلتے رہتے ہیں جیسے کہ لباس کی وضع طرح بدلتی رہتی ہے۔ بہت آدمی یہ سمجھتے ہیں کہ مذہبِ مروجہ بھی ایک ٹکٹ ہوتا ہے کہ ایک دفعہ اس کو خرید لیا اور بہشت کے دروازے پر دکھا دیا اور اندر چلے گئے۔ جو مذہب انسان پر پوری فرماں روائی نہیں کر سکتا، وہ اس کی پوری شفاعت نہیں کرا سکتا۔ مذہب جو دنیا کی شرارت سے آدمی کو نہیں بچا سکتا، وہ عاقبت کی ہلاکت سے کیسے بچا سکتا ہے۔ مذہب میں اس سے زیادہ

۱۔ کذا۔ اصل میں جملہ یوں تھا: ''نقل مشہور ہے کہ کیا چھوؤ نہیں یا گھیرے ہو'' مراد غالباً یہ ہے کہ یا تو کسی کام میں ہاتھ ہی نہ ڈالو اور اگر شروع کرو تو پھر اسے مکمل کر کے چھوڑو۔ اصل میں ''کہ کیا'' کی بجائے ''کہ یا'' ہونا چاہیے۔ متن میں اسی کو ترجیح دی گئی ہے۔

کوئی عمدہ خیال نہیں ہے کہ تکمیلِ روح میں وہ برابر ترقی کرتا چلا جائے اور قوت پر قوت حاصل ہوتی جائے ، نیکی پر نیکی بڑھتی جائے ، علم پر علم زیادہ ہوتا جائے ؛ جس سے دل کو گرم ، ہاتھوں کو پاک ، قول و فعل میں مطابقت کرتا جائے، جس سے خدا راضی ہو کہ میرے بندے اپنے تئیں خوبیوں میں میرے مشابہ بناتے جاتے ہیں -

۲۵- بعض ملک اور قومیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن میں مذہبی فرقے سیکڑوں طرح کے ہمیشہ قائم ہوتے رہتے ہیں - ان کے مذہب ایسی تشبیہ سے تعبیر ہو سکتے ہیں کہ ایک اژدہا ہو جس کے بہت سے سر ہوں اور اُن کے پھن نکلے ہوئے ایک دوسرے پر پُھنکار رہے ہوں - بعض سر بہت بڑے ہوں - اگر ان میں ایک سر کاٹ ڈالو تو اُن کی جگہ دس ، بیس ، سو تک چھوٹے چھوٹے سر نکل آئیں اور اُس زخم میں کلبلاتے ہوئے دکھائی دیں -

۹۹- انتقام

۱- انتقام لینے کی طرف انسان کو بالطبع میلان ہے اور میلان بھی ایسا ہے کہ کوئی دوسرا میلان اس کے برابر نہیں ، اس لیے اس کی روک تھام میں سب سے زیادہ اہتمام چاہیے - انتقام ایک وحشیانہ عدل ہے (یعنی قانونی نہیں) - قانون کا کام یہ ہے کہ انتقام کی راہ کو بند کرے - جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرتا ہے وہ قانون سے تجاوز کرتا ہے - مگر جو شخص اس کا عوض لیتا ہے وہ قانون کو معطّل کرتا ہے - دشمن سے انتقام لینے میں آدمی اُس کی برابر ہو جاتا ہے مگر معاف کرنے میں اُس سے برتر ، کیونکہ بزرگوں اور بادشاہوں ہی کا کام معاف کرنا ہے - حضرتِ سلیمان[ؑ] کا قول ہے کہ

آدمی کی دانائی غصّے کو ٹالتی ہے اور یہ اس کی عظمت ہے کہ خطا سے آنا کانی کرے ۔ دانش مند آدمی حال اور مستقبل کی باتوں پر توجہ کرتے ہیں ۔ ماضی کی باتوں کو سمجھتے ہیں کہ وہ ہو چکیں ، گذشت آنچہ گذشت ، بر گذشتہ صلوٰۃ ۔ کسی نے برائی کی کی ، قصّہ تمام ہوا ۔ کوئی شخص برائی کو برائی کی خاطر سے نہیں کرتا بلکہ اس میں اپنی منفعت یا خوشی یا عزّت یا کوئی اَور بات اِس طرح کی دیکھ لیتا ہے ۔ برائی کرنے میں ہر شخص اپنے تئیں دوسرے سے زیادہ عزیز رکھتا ہے ۔ پس اس لیے مجھے غصّے نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی شخص اپنے تئیں مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے ، اپنے نفع کے واسطے مجھے ضرر دیتا ہے ۔ اگر کوئی شخص برائی اپنی بدسرشتی کے مقتضا سے کرے تو اس کا حال کانٹے کا سا ہے جو چبھتا ہے اور چھیلتا ہے ، کیونکہ اس کے سوا وہ کچھ اَور نہیں کر سکتا ۔ جن برائیوں کی سزا قانوناً نہیں مل سکتی ، اگر اُن کا عوض خفیف سا لیا جائے تو خیر ، کچھ مضائقہ نہیں ۔ مگر کہیں وہ اس حد تک نہ پہنچ جائے جو قانوناً مجرم بنائے اور سزا کا مستحق کرائے ، جس سے ایک اَور دشمن قانون پیدا ہو جائے ، ایک کے دو دشمن ہو جائیں ، یک نہ شد دو شد ۔ دشمن کے واسطے ایسی بھٹّی نہیں گرم کرنی چاہیے کہ جس کی گرمی سے خود اپنا منہ جُھلس جائے ۔ بعض آدمی دشمن کو جتلا کے انتقام لینے میں خوش ہوتے ہیں ۔ وہ پاجی ، نامرد ، کمینوں کی طرح اس کو چھپاتے نہیں اور اندھیرے میں تیر نہیں لگاتے ۔ یہ ان کی فراخ حوصلگی ہے ۔ جب دشمن سے نفرت ہوتی ہے تو کوئی اَور[1] اس (دشمن) کو معدوم کر دے ، اس کی پروا نہیں ہوتی ، مگر جب اس سے

۱۔ ”اور“ اضافہ مرتّب ۔

انتقام لینا منظور ہوتا ہے تو اِس میں لذّت آتی ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے اس کو عدم کی راہ دکھائیں یا خوب ستائیں ۔ اگر دشمن دوسرے کی تلوار سے مارا جائے تو دل ایسا خوش نہیں ہوتا جیسا اپنے ہاتھ سے سر اُڑانے میں اور پاؤں سے سر کچلنے میں ۔

ایک شخص نے اپنے بے وفا دوستوں کی نسبت کہا کہ وہ جو برائی کریں ، وہ معاف نہیں ہو سکتی ، اس لیے حکم یہ ہے کہ دشمنوں کی خطائیں معاف کرو ، نہ یہ کہ دوستوں کی ۔ مگر اس باب میں حضرت ایوب[ع] نے خوب فرمایا ہے کہ کیا ہم خدا سے اچھی چیزیں لیویں ، بری چیزیں نہ لیویں ؟ پس اِسی ارشاد کو دوستوں کے ساتھ ایک مناسب اندازے کے ساتھ برتو ۔ جن دوستوں سے فائدہ اٹھاتے ہو ، اُن سے نقصان بھی اُٹھاؤ ۔

یہ امر تحقیق ہے کہ جو شخص انتقام کے درپے رہتا ہے وہ اپنے زخم کو ہرا رکھتا ہے ۔ اگر وہ یہ نہ کرتا تو زخم بھر کر اچھا ہو جاتا ۔ سخت انتقام یہ ہے کہ تُو اپنے دشمنوں کے ساتھ نرمی اور شیریں کلامی کر کے اُن کی ہڈیاں توڑ اور اُن کے سر پر کوئلے جلا ۔ ان کی خطائیں معاف کر کے خوب خوش ہو ۔ انتقام استسقاے[1] روح ہے کہ جو ہم کرنا چاہتے ہیں ، اُس سے زیادہ ہم کو تکلیف پہنچتی ہے ۔ جو شخص انتقام زیادہ لیتا ہے وہ برائی کرنے والوں سے زیادہ برا ہوتا ہے ۔ اس سے زیادہ برا آدمی کون ہوگا جو ہمسائے کی برائی کو اپنی بھلائی جانے ۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے دل و دماغ سے تمام انتقام و کینے کے خیالات کو نکال کر پھینک دے ۔ انتقام لینا

۱- استسقا : ع ۔ اسم مذکر (۱) لغوی معنی پانی مانگنا ، تشنگی ، پیاس ، عطش ۔ (۲) ایک بیماری کا نام ہے جس سے پیٹ بڑھ جاتا ہے اور پیاس بہت لگتی ہے ۔ (فرہنگِ آصفیہ)

ایک شیطانی حرکت ہے - انسان سے شیطان کا کام کرانے والا انتقام سے زیادہ کوئی اور نہیں ہے - اس میں اپنے ہی مزاج کا زہریلا پن اپنے اوپر اثر کرتا ہے - اگر تم پورا انتقام نہیں لے سکتے تو فی الحال تکلیف و رنج میں رہو گے اور اگر پورا عوض لے سکتے ہو تو آیندہ رنج اٹھاؤ گے - انسان کو کوئی چیز انتقام سے زیادہ گزند رساں نہیں - وہ سوہانِ روح ہے - انتقام کا غصّہ بہت ہوتا ہے - اگر غصّے میں آن کر ہم کسی کو برا کہیں تو ہم کو چاہیے کہ سورج کے ڈوبنے سے پہلے ہم صلح کر کے مصافحہ کریں اور دوست آپس میں ہو جائیں -

۲- یہ انتقام لینا نہایت عمدہ ہے کہ اگر کوئی ملک کے سینے کا ایک قطرۂ خون نکالے تو اُس کے گاڑھے لہو کی دھار بہانی چاہیے - تلوار کی دھاریں اُن کی طرف موڑنی چاہییں جو ہمارے ملک کو تکلیف دیتے ہیں - اگر کوئی داغ ملک پر لگ گیا ہو تو اُس کو آنسوؤں کے دریا سے دھونا چاہیے - جب جواں مرد دشمن کے ملک کو فتح کرتے ہیں تو وہ اپنے سپاہیوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ ہماری بڑی فتح یہ ہے کہ دشمنوں سے انتقام لینے میں ہم اپنے دلوں کو محکوم بنائیں :

بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

۳- جو شخص جور و جفا کی عوض میں جور و جفا کرتا ہے، وہ قانون سے تجاوز کرتا ہے، مگر طرفِ ثانی سے نہیں - جو لوگ خود اپنے طور پر انتقام دشمنوں سے لے لیتے ہیں اس کا اثر نافع ہوتا ہے کیونکہ قانون اکثر اس کے لیے سوتا ہے - جو شخص کسی کو ضرر پہنچاتا ہے وہ برائی کو شروع کرتا ہے، مگر جو اس کا انتقام لیتا ہے وہ اس کو بے انتہا بڑھاتا ہے اور اپنے پیچھے ایک

بے عزتی کی دُم لگاتا ہے جس کو نیک دلی اور خوش چلنی بھی الگ نہیں کر سکتی - اپنے گھر کے پیچھے ایسی آفت لگاتا ہے جس سے عزّت جاتی رہے گی - اس لیے سب سے اچھا بدل یہی ہے کہ جو شخص ہم کو مضرّت پہنچائے ، ہم اس کی مثل نہ بنیں -

۱۰۰- مصیبت

اس مضمون میں ہر جگہ مصیبت کے معنی یہ ہیں
کہ جو ہم چاہیں ، اُس کے خلاف ہو

۱- دنیا میں اقبال و اِدبار کے بھی عجب تماشے نظر آتے ہیں کہ بعض آدمیوں کو دیکھتے ہیں کہ ایک اِدبار کی گھٹا اُن پر ایسی چھائی ہوتی ہے کہ وہ جس کام میں سعی کرتے ہیں اُس میں کامیاب نہیں ہوتے ہیں ، جو منصوبہ باندھتے ہیں وہ ادھورا رہتا ہے ، پورا کسی طرح ہوتا ہی نہیں - اُن کی ساری[۱] سعیاں بے فائدہ ہوتی ہیں - ان کے گرد آفات کی تاریکی ایسی چھائی ہوتی ہے کہ کبھی اس میں خوش نصیبی کی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی - اس کے برخلاف بعض شخصوں کو ایسا اقبال مند دیکھتے ہیں کہ مٹّی کو ہاتھ لگائیں تو سونا ہو جائے - جس کام کو وہ اختیار کرتے ہیں اُس میں کامگار ہوتے ہیں - دولت کا مینہ اُن پر برستا ہے - خواہ وہ کیسا ہی انوکھا اور بےجوڑ کام کریں ، کامیابی اُن کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑی ہے - جن باتوں کی انھیں امید اور توقع بھی نہیں ہوتی وہ بھی حاصل ہو جاتی ہیں - اِدبار اور مصیبت کا سر پر آنا انسان کے اختیار سے باہر ہے - وہ اُس حکیم کا مقرّر کیا ہوا ہے جس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا - اس لیے انسان کو

۱- اصل : ان کے سارے -

یہ خیال کرنا چاہیے کہ اِس بیماری اور مصیبت و اَدبار میں بھی اُس دانا نے کوئی حکمت رکھی ہوگی ۔ وہ حکمت یہ ہے کہ مصیبت انسان کی بڑی معلّم و ادیب[1] ہے ۔ وہ آدمی کو بتلاتی ہے کہ اس کی ولادت اور وفات کے مابین عمرِ رواں کے چند سالوں کا جملہٴ معترضہ کوئی ہستی نہیں رکھتا ۔ اگر خداے تعالیٰ نے ایک شربت کا پیالہ پلایا تو اُس کی[2] مٹھاس کا مزہ کچھ دیر کے بعد جاتا رہتا ہے ، اور اگر تلخی کا جُرعہ[3] منہ میں ڈالا تو تھوڑی دیر بعد کڑوے پن کا پتا نہیں رہتا ہے ۔ مگر مدبّرِ عالم نے ان کے بعدِ اثر ایسے رکھے ہیں کہ وہ دیرپا ہمیشہ ہوتے ہیں ۔

خداے تعالیٰ نے جو اپنے اخلاق کی گورنمنٹ بنائی ہے ، اُس کی پیچ دار کل کو وہ طرح طرح سے چلاتا ہے اور اس سے دلوں کو اُکساتا ہے ۔ وہی اپنی اس گورنمنٹ کے[4] قانون کو کما حقّہ جانتا ہے ۔ ان ہی قوانین کو اُس نے اپنی محبّت کا رشتہ بنایا ہے ۔ کسی پر خدا خفا ہوتا ہے ، کسی پر مہربان ۔ بعض پر اپنی نعمتوں کا انبار لگا دیتا ہے کہ وہ شکرگزار ہوں ، بعض کے سر پر مصیبتوں کا بار رکھ دیتا ہے کہ وہ دنیا کو بےاعتبار جانیں[5] ۔ اس کی عیش و عشرت ، مال و دولت پر اعتماد نہ کریں[6] ۔ جو یہ سمجھتے ہیں ، وہ خدا کی طرف سے ایسی تسلّی و تشفّی پاتے ہیں کہ جس سے کوئی ان کو محروم نہیں کر سکتا ۔ وہ ہمیشہ اس تسکین و تسلّی کی تلاش کے درپے ایسے رہتے ہیں جیسے کوئی جہاز تباہی میں آ جاتا ہے تو وہ ایسی بندرگاہ کی تلاش کرتا ہے کہ جس میں جا کر سلامت رہے ، اور سمندر کے اندر جس بلا میں مبتلا

۱۔ ادیب بمعنی مؤدب ۔

۲۔ اصل : کے ۔ ۳۔ جُرعہ = گھونٹ ۔

۴۔ اصل : کی ۔ ۵۔ اصل : جانے ۔ ۶۔ اصل : کرے ۔

ہو رہا ہے ، اُس سے بچ جائے ۔

۲- جیسے کہ بے موسم بارش آدمیوں اور حیوانوں کے حق میں مُضّر ہوتی ہے ، مگر زمین کو سرسبز و شاداب اور بعض پھولوں کو شگفتہ اور بعض پھلوں کو پختہ کر دیتی ہے ، ایسے ہی مصیبت و آفت جو آتی ہے ، گو وہ اکثر آدمیوں کے حق میں مُضّر ہوتی ہے مگر بعض کو مفید بھی ہوتی ہے ۔

۳- دنیا میں مصیبتوں کا پڑنا بھی ایک بڑی نعمت ہے ، اس لیے کہ اس حالت میں خدا سب سے زیادہ یاد آتا ہے ، اور دل خدا کی طرف خوب رجوع ہوتا ہے ، اور آدمی دنیا سے آداس ہوکر برداشتہ خاطر ہوتا ہے ، اور جانتا ہے کہ میں یہاں اپنا وطن چھوڑ کر غریب الوطن ہوں ۔ مسکینی و غریبی میں رہنا مجھے بدکاریوں سے بچائے گا ۔ گو لوگ مجھے آفت زدہ اور غریب جان کر ذلیل جانیں گے مگر میں اپنے باطن کو ، جسے خدا دیکھ رہا ہے ، راست کردار کروں اور اسی کو اپنی شیخی ، غرور ، نخوت ، نمودِ شان کے زہر کا تریاق بناؤں ۔ ایسی حالت میں آدمی سمجھتا ہے کہ میں اپنے اصلی وطن سے جلاوطن ہو کر یہاں آیا ہوں ۔

۴- **مصیبت زدگی کے فائدے :** انسان کی حالتِ موجودہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے ، اُس کو قیام نہیں ہوتا ۔ کوئی حماقت اِس سے زیادہ نہیں ہے کہ ہم یہ توقع کریں کہ ہماری زندگی ہمیشہ آرام سے بسر ہوگی اور ہم پر راحت کا چشمہ ہمیشہ یکساں رواں رہے گا ۔ خواہ جھونپڑوں کے رہنے والے ہوں یا محلوں کے ، اُن کے واسطے بچپنے سے لے کر بڑھاپے تک ، ہمیشہ چھوٹے چھوٹے واقعات ایسے پیش آتے ہیں جو ان کو تکلیف پہنچاتے ہیں ۔ ان سے کسی طرح نجات نہیں ہو سکتی ۔ ان واقعات کا نام سخت مصائب نہیں رکھنا چاہیے ، نہ ان کو سخت سمجھنا چاہیے ۔

ہوگز صاحب کہتے ہیں کہ مصیبت زدہ اُس شخص کو نہ کہنا چاہیے کہ جس کی کامیابی دنیا میں تھوڑی دیر کے لیے رک گئی ہو، بلکہ اُس شخص کو جس پر آسمان ٹوٹ پڑا ہو اور سخت صدمات واقع ہوئے ہوں - ایسے مصیبت زدہ بھی دنیا میں تھوڑے نہیں ہوتے بلکہ ہر وقت دیکھ لو کہ کتنے امیر صاحبِ دولت مفلس ہو جاتے ہیں - تندرست سے بیمار، راحت و آرام سے رنج و عذاب میں گرفتار، کام سے معزول - کیا خاصے بھلے چنگے اپنے عزیز و اقارب، دوست آشناؤں میں رہتے تھے یا اب موت کے پنجے میں پھنسے ہوئے ہیں - جب اس قسم کی بلائیں ہمارے گرد جمع ہوتی ہیں تو ہمارا دل متفکّر ہو کر ان کا علاج کرتا ہے - مصیبت حقیقت میں ایک مکتب ہے جو تمام قوائے روحانیہ کی وہ تعلیم اور تادیب کرتا ہے جس سے روحانی چین اور آرام ہوتا ہے - اور یہ مفید سبق وہ سکھاتا ہے کہ انسان عاجز و ناتواں ہے، اس کو مذہب کی ضرورت ہے - دنیا ہمیشہ اس کو پُھسلاتی ہے اور مغالطہ دیتی ہے - آدمی اسی مدرسے میں دانائی اور گناہ کی برائی اور دنیا کی بے ثباتی سیکھتا ہے - عیش و عشرت میں بعض نیکیاں دیکھنے میں آتی ہیں جو بڑی دل آویز اور نمود و شان کی ہوتی ہیں - مگر اندوہ و ملال میں جو نیکیاں نظر آتی ہیں وہ بڑی مستحکم و مستقل ہوتی ہیں - مسکینی، صبر، وقار، ہوش مندی، عابدانہ توکّل، یہ نیکیاں سب ایسی ہیں کہ ان کی ترقی سخت مصیبت زدگی کی حالت ہی میں ہوتی ہے - اس سے ہم اپنی شرم گیں غفلت کی نیند سے جاگتے ہیں جس سے ہمارے خواب ہائے شیریں، جو ہمارے دل کو بہلا اور پُھسلا رہے تھے، پراگندہ اور منتشر ہو جاتے ہیں اور دل خدا کے ساتھ لَو لگاتا ہے اور اس کو اپنا مأمن[1] بنا کے پناہ مانگتا ہے - اس پر توکل کر کے

۱- مأمن = جائے امن -

اپنی کارروائی چاہتا ہے جس سے دل کو بڑی تقویت اور طمانیت ہوتی ہے - مصائب اور آفات کے سمندر میں اس کو سہارا ایسا ملتا ہے کہ اس کا بیڑا پار ہوتا ہے - ثباتِ قدم کا علم بلند ہوتا ہے ، دل نورِ سعادت سے منوّر ہوتا ہے - اُس تاریکی میں جہاں اندھیرا گُھپ ہوتا ہے ، خدا کے توکّل کا نور اُس کو منزلِ مقصود پر پہنچاتا ہے -

غرض فائدہ مصیبت زدگی کا یہ ہے کہ قُوائے روحانیہ کو ایسے بلند مرتبے پر پہنچاتی ہے کہ وہ اِس دنیا کو پست پایہ سمجھ کر بازیچۂ اطفال کی طرح بے ثبات جانتی ہیں اور عالمِ فانی سے برداشتہ خاطر ہو کر عالمِ باقی کی تمنّا کرنے لگتی ہیں ، جہاں جاودانی نعمتیں اور[1] برکتیں ملتی ہیں - وہ دنیا کی[2] قابل القدر اشیا کی قدر کرتی ہیں مگر اُن کا قبضہ اپنے اوپر ایسا نہیں ہونے دیتیں کہ جس سے ضرر اور تکلیف پہنچے[3] - وہ اپنے ایمان اور خدا پر توکّل کرتی ہیں -

دویم مصیبت زدگی کا فائدہ یہ ہے کہ ہم اس کے سبب سے اپنی سوسائٹی کی خدمات کا حق خوب بجا لاتے ہیں - جہاز راں جب ہی کامل ہوتا ہے کہ سمندروں کے طوفانوں کی مصیبتوں کو اُس نے سہا ہو - سپاہی جب ہی اپنے فن سے ماہر ہوتا ہے کہ محاصروں اور لڑائیوں کے داؤ گھاتوں سے آفتیں اُٹھا کر واقف ہوا ہو - ان کاموں کے جاننے کے واسطے اَوروں کے کارناموں کا فقط پڑھ لینا کافی نہیں ، بلکہ اپنے ذاتی تجربہ کی ضرورت ہے -

۵- ہمیشہ مصیبت کم و بیش کسی برائی کے روکنے کے واسطے ہوتی ہے - وہ اُن باتوں کو ، جو کانوں سے سنا کرتے تھے ، آنکھوں

۱- لفظ ''اور'' اضافۂ مرتّب -

۲- اصل : کے -   ۳- اصل : پہنچیں -

کو دکھا دیتی ہے۔ وہ ساری بیماریوں اور افلاس کی آفتوں اور موت کی تکلیفوں کو بیمار، مفلس، قریب الموت بنا کے دکھا دیتی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ مصیبت کے نیشوں سے بے قرار و بے صبر ہو کر زیادہ چبھنے نہ دے۔

۶۔ جو شخص مصیبت زدہ ہو، اُس سے پوچھو کہ اَور لوگ اس کے[1] ساتھ اِس حالت میں کس طرح پیش آتے ہیں اور وہ خود اس حالت میں اَوروں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ ان دونوں کے واسطے مصیبت زدگی معیار ہے؛ مصیبت زدہ کے واسطے یہ کہ وہ کمینگی اور بے دیانتی اس حالت میں نہ اختیار کرے اور اَور لوگوں کے واسطے یہ کہ اُس کے ساتھ گستاخی نہ کریں اور غرور سے نہ پیش آئیں اور ذلیل و حقیر نہ جانیں۔

۷۔ مصیبت کا حال زہردار مینڈک کا سا ہے کہ نہایت بد شکل اور زہریلا مگر سر میں ایک بیش قیمت جوہر رکھنے والا۔

۸۔ اگر ہمارے گرد طوفان برپا ہو، ہمارا جہاز بھنور میں پھنسا ہو تو ہم کو بچوں کی طرح رو رو کر اس طوفان کو نہ دیکھنا چاہیے اور مایوس ہو کر یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ ہوا کا ایک[2] اَور جھونکا ہم کو برباد کر دے گا اور لہروں کا تلاطم ہم کو ڈبو دے گا۔ بلکہ اُس وقت ہماری ساری توجہ دل سے خدا کی طرف ہونی چاہیے؛ کہ جس نے یہ طوفان اور تلاطم اٹھایا ہے، وہی ناخدا بن کر ہمارا بیڑا پار کرے گا۔ ہم کو دلیری اور جرأت و ہمّت ایسی دے گا کہ ہم طوفان کی مصیبتوں کو خوشی سے اُٹھائیں گے۔

۱۔ اصل: کی۔

۲۔ لفظ "ایک" اضافۂ مرتّب۔

۹- عاقل ، نیک نہاد آدمی کا حال مصیبت میں دھندلی لالٹین کا سا ہوتا ہے کہ جو آدمی اس کے گرد ہوتے ہیں ان کو وہ تاریک معلوم ہوتی ہے ، مگر اس کے اندر خوب روشنی ہوتی ہے - جب اُس کا دروازہ کھلتا ہے تو وہ خوب دکھا سکتی ہے -

۱۰- جس شخص پر مصیبت نہیں پڑتی ، وہ کبھی خود شناس نہیں ہو سکتا اور نہ اپنی نیکی کو پہچان سکتا ہے -

۱۱- اقبال مندی کی خوبیوں کی آرزو سب کو ہوتی ہے - مگر ادبار کی[۱] خوبیوں کی تعریف خوب ہوتی ہے - اگر معجزے کے معنی نیچر پر حکمرانی کے قرار پائیں تو وہ مصیبت کی حالت میں انسان سے صادر ہوتے ہیں - اقبال‌مندی میں بڑی نیکی اعتدال ہے اور ادبار میں بڑی نیکی استقلال ہے - اقبال ، خوف و آفت سے خالی نہیں ہوتا اور ادبار تسکین اور توقّع سے - اول میں آنکھ کی خوشی ہے ، دوسرے میں دل کی خوشی - نیکی کا حال خوشبو کا سا ہے کہ وہ آگ میں جلنے سے یا پیسنے سے بہت مہکتی ہے - اقبال ، بدی کو خوب کھول کر دکھا دیتا ہے ، ادبار نیکی کا اظہار خوب طرح سے کر دیتا ہے -

۱۲- جیسے برف اور پالے کا موسم گزر جاتا ہے مگر اُس کا اثر زمین کے نرم کرنے میں اور فصل کے بڑھانے میں اور پکانے میں موسمِ گرما میں معلوم ہوتا ہے ، ایسا ہی مصیبت کا وقت اور موقع گزر جاتا ہے مگر اس کا اثر انسان کے پختہ کار کرنے کے لیے باقی رہتا ہے -

۱۳- مصیبتیں دو طرح کی ہوتی ہیں ؛ ایک تنبیہ و تادیب کے لیے ، دوسرے امتحان کے لیے - تنبیہ و تادیب سے یہ مراد ہے کہ مصیبت سے وہ خوبی آدمی میں پیدا ہو جائے جو پہلے اُس میں

۱- اصل : کے -

نہ تھی ، اور اگر تھی تو اُس کی ترقی ہو جائے ۔ امتحان سے مراد یہ ہے کہ ترقی کی مقدار معلوم ہو جائے کہ کتنی ہوئی ۔ معلّم کا کام یہ ہے کہ طلبہ کو اچھی طرح پڑھاوے ، مُمتحن کا کام یہ ہے کہ یہ بتلاوے کہ کہاں تک طلبہ نے ترقی کی ہے ۔ مصیبتوں کی یہ دونوں قسمیں اکثر خلط ملط ہو جاتی ہیں ، کیونکہ ہم تعلیم اور امتحان سے ایک ہی نتیجہ نکالتے ہیں ۔ ایسی خلط ملط کرنے سے خرابی پیدا ہوتی ہے ۔ جب مصیبت ادنٰی درجے کی ہوتی ہے تو وہ تنبیہ و تادیب کے لیے ہوتی ہے ، اور جب وہ بڑھ جاتی ہے تو امتحان کے لیے ہوتی ہے ۔ بیماری ایسی مصیبت ہے کہ جو دونوں—تادیب اور امتحان—کے لیے ہے ۔ جب وہ تھوڑی ہوتی ہے تو تادیب و تنبیہ کے واسطے اور جب زیادہ طول کھینچے تو امتحان کے لیے ۔ جب آدمی کو نئی نئی بیماری ہوتی ہے تو دوستوں کی تیمارداری کا ممنون وہ دل سے ہوتا ہے ، مگر جب مرض کو طوالت ہوتی ہے تو وہ کسی کی تیمارداری کا احسان مند نہیں ہوتا ، ایک مساوات ہو جاتی ہے ۔ وہ خود اپنے ہی رنج و تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے ۔ آدمی یہ خوب سمجھ لے کہ کوئی چیز اس کو دانش مند اور نیک نہیں بنائے گی جب تک وہ اس کے سیکھنے میں سخت رنج و تکلیف نہیں اُٹھائے گا ۔

۴۱ - یہ روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ کوئی انسان ایسا نہیں ہو سکتا کہ زندگی میں جس پر کوئی چھوٹی بڑی مصیبت نہ واقع ہوئی ہو ۔ اس سے کسی طرح ہمارا چھٹکارا نہیں ہو سکتا ۔ نہ اُس کو اپنی شان و شکوہ دکھا کے ڈرا سکتے ہیں ، نہ اپنے ثبات و استقلال سے اُس پر فتح یاب ہو سکتے ہیں ۔ نہ بھاگ کر اُس کے آگے آنے سے ، نہ تاریکی میں چھپ کر اُس کے پیچھا کرنے سے بچ سکتے ہیں ۔ حکماے حاذق اِن مصیبتوں کے حُزن و ملال کا یہ علاج بتا کے ہمارے

کچھ آنسو پونچھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ہماری حالت کے ہر انقلاب کے ساتھ رنج میں راحت کو غالب رکھا ہے ، اور ہماری جہالت وغیرہ کے سبب سے ہماری برائیاں ہم کو مصیبت زدہ بناتی ہیں - یہ علاج اُن کا ایسا ہے جیسا کہ طبیبوں کا ہوتا ہے کہ جب وہ کسی درد کو رفع نہیں کر سکتے تو جس جگہ وہ ہوتا ہے ، اُسے سُن کر دیتے ہیں - جو مصیبت زدگی کی مداحی کرتے ہیں ، اُن کی ذکاوت کی تعریف ہو جاتی ہے ، مگر اُن کی دلائل تسلیم نہیں کی جاتیں - اب تک نہ کسی کی تقریر ایسی فصیح اور ایسی بلیغ ہوئی کہ ظلم سے جو تکلیفیں پہنچتی ہیں ، یا محتاجی سے جو آفتیں آتی ہیں ، یا ضعف و ناتوانی سے جو رنج پہنچتے ہیں ، اُن میں تخفیف ہو جاتی -

آدمی جو اپنی بلند سوادی[1] سے بڑی بڑی اُمیدیں کرتا ہے ، وہ گو سب طرح پوری نہیں ہوتیں ، مگر جس کام میں وہ بہت کوشش کرتا ہے ، اُس میں کچھ نہ کچھ کام بن جاتا ہے - پہلے حکما نے جو مصیبتوں کے زہر کے تریاق کی تلاش میں بڑی جانفشانی کی تو وہ ایسا تو نہ ہاتھ لگا کہ جو جامِ حیات کو شیریں و لطیف بنا دیتا ، مگر اس سے تلخی اُس کی کم ہو گئی - دل کے ناسوروں پر جو مرہم اُنھوں نے لگایا ، گو وہ اس سے بالکل اچھے نہ ہوئے ، مگر ان کی اذیّت کم ہو گئی - غرض مصیبت پر فضول اور حدِ اعتدال سے باہر جو اضطرار و اضطراب ہوتا تھا ، اس سے نجات حاصل ہو گئی - جو قوّت مصائب کی بے قراری میں زائل ہوتی تھی ، وہ رنج کے گھٹانے میں اور اس سوچ بچار میں صرف ہونے لگی کہ ہر مصیبت میں[2] ایک منفعت ہے -

---

۱- اصل : سودائی -
۲- ”میں“ اضافۂ مرتّب -

۱۵- سینیکا نے فقط مصیبت زدگی پر صبر و ثبات ہی کی ہدایت نہیں کی بلکہ اُس نے دل کے خوش کرنے کی راہ بھی بتائی ہے - وہ کہتا ہے کہ جو شخص مصیبت میں گرفتار نہیں ، اس نے دنیا کا ایک ہی رخ دیکھا ، دوسرے رخ کے تماشے سے محروم رہا - دل کے خوش کرنے کے واسطے مصیبت کا پڑنا ضروری شرط ہے - وہ اپنے شاگردوں سے ارشاد کرتا ہے کہ تم مصیبت اٹھاؤ جس سے تم کو راحت و عافیت کا لطف آئے - جو محقّق حقیقت آگاہ ہونا اور مشہور و نامور ہو کے عوام الناس کے درجے سے بلند ہو کر خواص بننا چاہتے ہیں ، وہ ہمیشہ تحقیق و تفتیش کے درپے رہتے ہیں - جہاں ایک تحقیق ختم ہوئی ، دوسری شروع ہو گئی - اسی طرح سے جتنے وہ عقل و دانش میں سرفراز ہوتے جائیں گے ، اُتنا ہی نیرنگیِ عالم کا تماشا زیادہ دیکھیں گے - میدانِ عقل میں جتنے وہ جفا کشی و رنج اٹھاتے ہیں ، اُتنی ہی اُن کو وہ خوش دلی حاصل ہوتی ہے کہ وہ کسی بادشاہ اور امیر کی حالت پر رشک و حسد نہیں کرتے - مشقّت کی مصیبت اُٹھانے ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ خوشیاں علم سے حاصل کرتے ہیں - سینیکا نے نہایت خوش بیانی سے مصیبت زدگی کا حال لکھا ہے اور خوب لکھا ہے ؛ کہ مصیبت زدگی ہی آدمی کو دنیا کے تجربے کرنے کا موقع دیتی ہے - ہمیشہ کی راحت سے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا - مصیبت سے بھاگنا لاعلمی ہے اور راحت سے رہنا ایک جہالت ہے - جب تک آدمی مصیبت نہ اُٹھائے ، راحت کے سچے معنی ہی سمجھ میں نہیں آتے - ''قدرِ عافیت کسے داند کہ مصیبتے گرفتار آید (کذا) -'' ہماری خوش حالی ایک امرِ اضافی ہے - ہر شخص اپنی مصیبت کے رنج کو یوں خیال کر کے گھٹا سکتا ہے کہ بہت سی مصیبتوں سے بچا ہؤا ہوں - ہیرے کی چمک دمک سیاہ

چیزوں کے پاس لانے سے اور تصویر میں سائے کے ہونے سے روشنی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ پس اِسی طرح اپنی مصیبت بھی اَوروں کے[1] مصائب کے ساتھ ملانے سے راحت دیتی ہے۔ دنیا میں انسان کے لیے کوئی مسرّت اس سے زیادہ نہیں کہ محنت کے بعد راحت ملے۔ جس محنت سے خوشی ہو وہ خود راحت ہے۔ تونگری و ثروت تو آدمی کو خود شناس بننے ہی نہیں دیتی۔ وہ ایسا[2] سست خیال آدمی کو بنا دیتی ہے کہ وہ اپنی قوّتوں کا تخمینہ درست کر ہی نہیں سکتا۔ جس شخص کے استقلال نے خوف کا مقابلہ نہ کیا ہو، جس کی فراست مشکلات پر غالب نہ ہوئی ہو، جس کی دیانت بُری ترغیبوں میں امتحان کے اندر نہ آئی ہو، اُس کا حال اُس سونے کا سا ہے جو کسوٹی پر نہ چڑھا ہو اور اِس سبب سے اُس کی قیمت نہ مقرر ہوئی ہو۔

۱۰۱۔ بناوٹ

۱۔ اِس مضمون میں جہاں بناوٹ کا لفظ لکھا ہے، وہاں مراد یہ رکھی ہے کہ آدمی اپنے تئیں بہانے بنا کے وہ دکھاوے جو حقیقت میں نہیں ہے۔ یا جو حقیقت میں ہے، اُس کو چھپاوے۔ بناوٹ بھی حکمتِ عملی اور دانائی سمجھی جاتی ہے، مگر ادنیٰ درجے کی اور ضعیف۔ یہ بڑے ذہین اور ذکی اور قوی دل آدمی کا کام ہے کہ وہ اُن موقعوں کو پہچان جائے جہاں سچ بولنا اور سچ کام کرنا چاہیے۔ جو مدبّرانِ ملکی اس راستے کو چھوڑ کر بناوٹ کی باتیں کرتے ہیں، وہ دانائی میں ضعیف سمجھے جاتے ہیں۔ جو مدبّرانِ ملکی معاملاتِ ملکی میں، یا اَور لوگ جو اَور قسم کے معاملاتِ دنیاوی

۱۔ اصل: کی۔
۲۔ اصل: ایسے۔

میں ماہر اور باہنر ہوتے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ معاملات کے اندر کون سی باتیں چھپانی چاہییں[1] اور کون سی ظاہر کرنی؛ اور کون سی آدھی کس پیرایے میں بتلانی چاہییں[2]، اور یہ کام کس موقع پر اور کس کے سامنے کرنا چاہیے - ان آدمیوں کے واسطے تو بناوٹ کی عادت ہارج و مانع کام روائی میں ہوتی ہے، مگر جن کو بناوٹ کی عادت نہیں ہوتی، علی العموم اُن کو بناوٹ سے کام پڑتا ہے اور اِخفا اپنے کاموں کا کرنا ہوتا ہے، اور ایسی احتیاط کرنی پڑتی ہے جیسے کہ رستہ چلنے میں کم دکھائی دینے والے کو کہ وہ سہج سہج رہ رہ کر قدم رکھتا ہے - جو عاقل، ہوشیار، بیدار مغز ہوتے ہیں، وہ معاملات میں کھرے اور صاف ہوتے ہیں اور ان کا نام راست بازی اور راست گوئی میں مشہور ہوتا ہے - ان کا حال سدھائے[3] ہوئے گھوڑوں کا سا ہوتا ہے کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ کہاں ٹھہرنا اور کہاں مڑنا چاہیے - اُن کو جہاں ضرورت بناوٹ کی پڑتی ہے، وہاں اس کو اختیار کرتے ہیں، مگر اُن کی راست معاملگی کی شہرت اور ناموری اُن کی بناوٹ کو کسی پر کُھلنے نہیں دیتی - آدمی اپنے اوپر تین طرح سے نقاب ڈال کر چھپاتے ہیں؛ اول، خلوت، اختفا، کم گوئی اختیار کرتے ہیں - وہ آدمیوں کے مشاہدے ہی میں نہیں آتے اور کوئی موقع نہیں دیتے کہ کوئی ان کو پہچانے کہ وہ در اصل کیا ہیں - دوم، وہ حرکات ایسی کرتے ہیں اور دلائل ایسی بیان کرتے ہیں کہ جن سے ان کی اصل حقیقت برخلاف لوگوں پر ظاہر ہو - سوم، اپنے تئیں ایسا دکھاتے ہیں جو وہ درحقیقت نہیں ہیں -

---

۱- اصل: چاہیے -
۲- اصل: چاہیے -
۳- اصل: سدائے -

اول صورت میں جب آدمی اپنے تئیں خلوت میں بیٹھ کر چھپاتا ہے تو بہت سے لوگوں کا حال اُس پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اُس کے پاس لوگ جا کر اپنے دل کا حال کہہ دیتے ہیں، اور کم گوئی کی عادت سے بھی وہ اور لوگوں کے حال پر مطلع ہوتا ہے۔ کیونکہ جو شخص بکواسی ہوتا ہے، وہ جو کچھ جانتا ہے، اور علاوہ اِس کے جو وہ نہیں جانتا، اُسے بھی کہتا ہے اور پیٹ کا ہلکا ہوتا ہے، اس لیے لوگ اس کے روبرو اپنے راز کی باتیں نہیں کہتے ہیں۔ مگر چپ چاپ آدمی کے آگے اپنے دل کی باتوں کے کہنے میں دریغ نہیں کرتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ وہ ان کا اعلان نہیں کرے گا۔

دوسری صورت کے آدمی سے لوگ گستاخانہ سوالات ایسے کرتے ہیں کہ خواہ وہ خاموشی جواب میں اختیار کرے یا سچا جواب دے تو دونوں سے ایک نتیجہ نکالتے ہیں: مثلاً اس سے پوچھیں گے کہ یہ مضمون آپ کے فلاں دوست کا لکھا ہوا ہے، یا آپ کے فلاں دوست کا دوالا (دیوالیہ) نکلنے کو ہے اور وہ فلاں جگہ چھپا ہوا ہے۔ اب اگر ان سے وہ یہ کہے کہ میں ایسے سوالوں کا جواب دینا پسند نہیں کرتا تو لوگ اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان باتوں کو تسلیم کرتا ہے، اور اگر سچا جواب دے تو اس میں اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

تیسری صورت جو ہے وہ نہایت ہی مکروہ ہے اور نازیبا اور جھوٹی ہے۔ وہ جھوٹ اور ڈرپوک پنے سے پیدا ہوتی ہے۔

بناوٹ کے تین فائدے ہیں:

اول فائدہ یہ ہے کہ جو شخص بناوٹ جانتا ہے اُس کا مقابلہ ہمیشہ سوتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ مقابلہ تو جب جاگتا ہے کہ کوئی شخص اپنے ارادے اور نیّت کا اعلان کرتا ہے، جس کے سبب سے

اُس کے مخالف جو ہوتے ہیں، وہ مقابلے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

دوم، بناوٹ میں آدمیوں کو پھر جانے کے واسطے خوب موقع ہاتھ میں رہتا ہے اور ان پر عدمِ ایفا کا الزام نہیں عاید ہو سکتا۔ اس واسطے اُن کا جو اظہار ہوتا ہے، وہ کوئی ایسا معاہدہ نہیں ہوتا کہ اس پر چلنا یا پھسلنا پڑے اور اُن پر عدمِ ایفا کا الزام عائد ہو۔

سوم، بناوٹ سے دوسرے آدمی کی باتیں خوب دریافت کر سکتا ہے، کیونکہ جو شخص اس کے سامنے دل کی باتیں کہتا ہے، وہ اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ تائید ایسی کرتا ہے کہ اور آگے وہ چلتا ہے اور آزادانہ گفتگو کرتے کرتے اپنے خیالات آزادانہ بیان کرنے لگتا ہے۔ اس لیے یہ بڑی سیانی ضرب المثل اہلِ سپین کی ہے کہ ایک جھوٹ بات کہو، ایک سچی بات دریافت کرو۔ غرض کوئی اَور طریقہ بات دریافت کرنے کا بناوٹ کے سوا نہیں ہے۔

بناوٹ کے تین ہی نقصان ہیں: اول، بناوٹ کرنے والا ڈرپوک اور نامرد سمجھا جاتا ہے۔ وہ کاموں میں سیدھی طرح اپنے مقصد تک اڑنے میں اپنے پروں کو نوچتا ہے۔ دوم، وہ اُن لوگوں کے خیالات کو حیران اور پریشان کرتا ہے جو اس کے معاون ہوتے ہیں۔ اسی سبب سے اس کو اکیلا اپنے مقصد تک جانا ہوتا ہے۔ سوم، سب سے بڑا بھاری نقصان یہ ہوتا ہے کہ اعتبار اور اعتماد جو کارروائی کا بڑا اوزار ہے، وہ اس سے چھن جاتا ہے۔

سب سے بہتر اور عمدہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی رائے کے اظہار میں صاف و کھرا ہو۔ اپنی عادات کا اخفا کرے۔ کبھی کبھی موقع پر بناوٹ کو بھی کام میں لائے۔ اس کو زمانہ سازی کا ملکہ ایسا ہو کہ جہاں کام چلانے کا علاج کوئی اور نہ ہو تو وہ اس کو کام میں لائے۔ مگر یہ یاد رکھو کہ آدمی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ

بناوٹ میں باوجود قدرت اور ملکہ رکھنے کے اس کو کام میں نہ لائے ۔ اگر بناوٹ میں لیاقت نہ ہو تو اس کو کام میں نہ لانا کوئی خوبی نہ ہوتی ۔ مگر بعض جگہ بناوٹ کا کام میں لانا ضروری معلوم ہوتا ہے ، جیسا کہ لڑائی میں ، کیونکہ وہاں ایک دوسرے پر اعتماد نہیں ہوتا ۔ جس میں خدع[1] سے کوئی خلل ہو ، وہاں تو پولیس اور چور کی سی لڑائی ہوتی ہے ۔

۲۔ بناوٹ بھی ایک مختصر دانائی ہے ۔ بالکل دل کا عریاں ہونا ایسا ناخوش معلوم ہوتا جیسے کہ جسم کا ننگا ہونا ۔ بناوٹ بھی انسان کی محافظ ہے ۔ جو آدمی بناوٹ نہیں کرتا ، وہ بھی لوگوں کو ایسا ہی مغالطے میں ڈالتا ہے جیسا وہ شخص کہ جو بناوٹ کرتا ہے ۔ اس لیے کہ دنیا اس پر اعتماد اور بھروسا نہیں کرتی ، اس کو کچھ مال نہیں سمجھتی ۔ جو شخص بناوٹ نہیں جانتا ، وہ اپنے اوپر اختیار نہیں رکھتا ۔ اگرچہ انسان اشیا کا خیال بالکل راست درست نہیں کر سکتا ، مگر کم از کم یہ تو اُس کو چاہیے کہ جو خیال کرے ، وہ سچ سچ بیان کرے ۔ جو شخص سچی پالیسی[2] کو اپنی سمجھ سے پرے دیکھتا ہے ، وہ بناوٹ کو دانائی سمجھتا ہے ۔ جو بناوٹ کرتا ہے ، وہ آزادی سے ہاتھ اُٹھاتا ہے ۔ بناوٹ کا جواب بناوٹ سے دیا جاتا ہے ۔ جوابِ تُرکی بہ تُرکی ۔

۳۔ بناوٹ دو طرح کی ہوتی ہے : ایک ظاہری صورت اور لباس میں : جیسے کوئی شخص بڑا دولت مند ہو مگر کپڑے ایسے موٹے جھوٹے پہنے کہ غریب معلوم ہو ۔ جیسے کہ بنیے اور مہاجنوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ لاکھوں روپے پلّے ہوتے ہیں مگر کپڑے

۱۔ خدع = دھوکا ۔ ۲۔ اصل : پولیسی ۔

گزی گاڑھے[1] کے چھوٹے پنّلوں کے ہوتے ہیں۔ دوم، دولت ایسی نہ ہو جیسی کہ پوشاک فوق البھڑک ہو۔ کم دولت مسلمانوں کا یہی حال ہے۔ سوم، وہ مفلس جو کرائے کا جوڑا پہن کر اپنے تئیں آسودہ حال دکھاتا ہے اور کپڑوں کا کرایہ بھی نہیں دے سکتا۔ یہ ان تینوں میں بدتر ہے۔ بعض جاہلوں کو دیکھتے ہیں کہ جُبّہ و دستار وہ پہنتے ہیں کہ عالم معلوم ہوں۔ یا مکار و دغاباز کہ عابدوں اور زاہدوں کے سے کپڑے پہنتے ہیں۔

دوسری طرح کی یہ کہ جو دل کی حالتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے آثار چہرے پر ضرور نمودار ہوتے ہیں، وہ اُن کو ظاہر نہ ہونے دیں یا اس کے برخلاف ظاہر کریں؛ مثلاً غم، غصّہ، عشق۔ یہ تینوں دل کی حالتیں ایسی ہیں کہ جیسی دل میں اضطرار وہ پیدا کرتی ہیں ایسی ہی چہرے پر اضطراب۔ مگر بعض آدمیوں میں بناوٹ کا وہ ملکہ ہوتا ہے کہ اس اثر کو چہرے پر ظاہر ہونے نہیں دیتے، بلکہ برخلاف اس کے اگر دل غم زدہ ہے تو چہرے پر بشاشت دکھاتے ہیں۔ اگر غصّے کے مارے سینے میں کینہ دشمن سے ایسا ہے کہ بس چلے تو تسمہ لگا نہ رکھیں، مگر ظاہر میں خندہ پیشانی کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں دشمن سے کرتے ہیں۔ معشوق کے عشق کا تیر دل میں لگا ہوا ہے مگر ظاہر میں ایک بے التفاتی دکھاتے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ کہیں وہی مثل نہ ہو کہ گدھی نے کھیت کھانا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے برخلاف کسی حسین سے ان کو نفرتِ قلبی ہے مگر زبان سے اس کے حسن و ادا و انداز کی وہ تعریف کرتے ہیں۔ نہایت مشکل ہے کہ آدمی کو بناوٹ، تکلّف، تصنّع میں وہ ملکہ حاصل ہو کہ

۱۔ گزی، گاڑھا: مذکّر (کنایۃً) موٹا کپڑا (نوراللغات)۔

ان کو بے تکلف کرنے لگے - برسوں کی مشق کی ضرورت ہے -

۱۰۲- ماں[1] باپ اور بچے

۱- بچوں سے ماں باپوں کے دلوں کو جو خوشیاں ہوتی ہیں، وہ اُن سے بیان نہیں ہو سکتیں اور جو رنج و خوف ہوتے ہیں، وہ ان کو بیان کرنا پسند نہیں کرتے - بچوں کے سبب سے محنت مشقت کرنے میں راحت معلوم ہوتی ہے - مگر مصیبت کی حالت ان کے ہونے کے سبب سے زیادہ تر تلخ ہو جاتی ہے - اولاد بہت سے تفکرات و تردد پیش لاتی ہے مگر موت کی یاد کم دلاتی ہے - بچوں کی وجہ سے حیوان اور انسان میں بقائے نسل کا ہمیشہ رہنا مشترک ہے، مگر عمدہ کاموں کے سبب سے یادگارِ روزگار رہنا انسان کے ساتھ مخصوص ہے - باپ کی محبت سے ماں کی شفقت کہیں زیادہ ہوتی ہے اور بعض اوقات تو وہ بڑھ کر حماقت بن جاتی ہے -

حضرت سلیمان[۴] کا قول ہے کہ دانش مند بیٹا باپ کو خوشنود کرتا ہے، پر بے دانش فرزند اپنی ماں کا بارِ خاطر ہوتا ہے - اس کا سبب یہ ہے کہ اولاد کی نیکی اور خوبی کو بہ نسبت ماں کی باپ زیادہ سمجھتا ہے - ماں کی محبت ایسی نرم و ملائم ہوتی ہے کہ جب وہ اولاد کی مصیبت و کم بختی دیکھتی ہے تو جانتی ہے کہ شاید میرے لاڈ پیار نے خراب کر دیا - بچوں سے جو گھر بھرپور ہو تو ان میں جو بڑے ہوتے ہیں اُن کا ادب لحاظ ہوتا ہے - جو چھوٹے ہوتے ہیں اُن سے کھلونوں کی طرح ماں باپ دل بہلاتے ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں جو ہوتے ہیں ان کو کوئی پوچھتا

۱- اصل میں ''ماں باپ'' کو ''ما باپ'' اور ''ماں'' کو ہر جگہ ''ما'' لکھا گیا ہے -

نہیں - مگر وہ دونوں سے اکثر اچھے ہوتے ہیں - وہ ماں باپ اولاد کے حق میں کانٹے بوتے ہیں جو ان کے ساتھ سختی و تنگی و بخل کرتے ہیں اور ان کے دینے کے واسطے تھیلی کا منہ بند کرتے ہیں - وہ ساری برائیوں کا دروازہ ان پر کھولتے ہیں ، ان کو کمینہ بناتے ہیں ، بہانہ جوُئی کی خو ڈلواتے ہیں ، کمینوں کی صحبت میں بٹھاتے ہیں - ان کو ندیدہ ایسا بناتے ہیں کہ جب اچھا کھانا ان کے سامنے آئے تو پیٹ سے زیادہ کھا جائیں - بچوں پر حکومت رکھنی اچھی ہے مگر روپے کا بخل ان کے سامنے اچھا نہیں - وہ ماں باپ اور اُستاد بڑے بیوقوف ہیں جو بھائیوں بھائیوں میں باہم اور شاگردوں میں آپس میں رشک کی عادت ڈلواتے ہیں - یہ گویا ان کے درمیان اس فساد کی بنیاد جماتے ہیں جس سے وہ بڑے ہونے پر خانہ برباد ہوں -

ملکِ اٹلی میں قریب کے اقربا کے ساتھ وہی محبت کرتے ہیں جو اولاد کے ساتھ - بھتیجے ، بھانجے ، بیٹے کو برابر ہی سا سمجھتے ہیں - یہ کچھ نیچر کا بھی قاعدہ ہے کہ ہر خاندان میں ایک مشابہت اور مماثلت ہوتی ہے - بعض دفعہ بیٹے کی شکل باپ سے ایسی نہیں ملتی جیسی چچا یا ماموں سے - ماں باپوں کو چاہیے کہ بچوں کے واسطے ابتدائے عمر میں کوئی پیشہ و ہنر و حِرفہ و علم ایسا تجویز کریں جس کا سیکھنا ان کی عمر میں آیندہ کام آئے - مگر یہ بات نہایت مشکل ہے کہ والدین اولاد کے واسطے ایسا کوئی کام سیکھنے کے لیے تجویز کریں کہ جو ان کی طبیعت کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو - دنیا کو یوں تشبیہ دیا کرتے ہیں کہ وہ ایک تختہ ہے کہ جس میں بہت سے سوراخ ہیں اور اُن پر میخیں پھینکی گئی ہیں - اب یہ ایک اتفاق کی بات ہے کہ کوئی میخ اُس سوراخ میں داخل ہو کہ اس میں ٹھیک آئے ورنہ کچھ ایسی ہوں گی جو ان میں جا ہی نہیں سکیں گی اور

کچھ ان کے اندر جا کر باہر نکل جائیں گی - پس اِسی طرح یہ امر اتفاقی ہے کہ بچپنے میں آدمی وہی کام سیکھے جو اُس کی طبیعت کے لیے مناسب و موزوں ہو -

جو والدین خود غرض نہیں ہوتے اور اپنی آسائش اور آرام کا خیال اپنی اولاد کے آرام اور فائدے کے آگے کچھ نہیں گنتے ، اُن کی اولاد خود غرض اور آرام طلب ہوتی ہے ، کیونکہ وہ ابتدائے عمر سے اِس کی عادی ہوتی ہے کہ اُن کو آرام اور آسائش اور اُن کا مقصد و مطلب اَوروں کی تکلیف سے حاصل ہو اور خود ان کو تکلیف اُٹھانی نہ پڑے - مگر جو ماں باپ خود غرض ہوتے ہیں اور اپنی آسائش اور چین کو اولاد کے آرام و فائدہ پر مقدّم رکھتے ہیں ، ان کی اولاد جفاکش ہوتی ہے اور خود غرض نہیں ہوتی ، کیونکہ خود ان کو آغازِ عمر سے حصولِ مطلب کے لیے اَوروں کی ناز برداری اُٹھانی پڑتی ہے -

۲- آدمی کے دل میں ملک کی محبّت کنبے کی الفت کے سبب سے پیدا ہوتی ہے - مجرّد آدمی اکثر بہت تند مزاج ہوتا ہے - جن آدمیوں کو سب طرح کا عیش و عشرت کا سامان مہیّا ہوتا ہے ، وہ اولاد کی طرف سے اکثر بدنصیب ہوتے ہیں -

۳- اولاد کے وجودِ ظاہری کے سبب ماں باپ ہوتے ہیں اور وہی ان کی تعلیم و تربیت کرتے ہیں - اس لیے اولاد پر واجب ہے کہ وہ ماں باپوں کا ادب ، لحاظ ، پاس اور تعظیم و تکریم و محبت دل و جان سے کریں - ماں باپوں کو چاہیے کہ وہ اپنے حسنِ خلق کا نمونہ شیریں کلامی اور فیّاضی کی مثالوں سے ایسا دکھائیں جس سے ان پر اثر ہو - نصائح ایسی شفقت و مہربانی سے کریں کہ ان کے دل پر یہ بات نقش ہو جائے کہ ماں باپوں سے زیادہ کوئی ہمارا شفیق

دوست نہیں - وہی ہمارے محافظ ہیں، وہی ہمارے خزانے ہیں، وہی ہمارے رہنما ہیں، وہی ہمارے قبلہ گاہ ہیں - جب ماں باپ شکی ہوتے ہیں تو ان کی اولاد بڑی مکّار ہوتی ہے -

۴- گھر میں باپ ایسا ہوتا ہے جیسے کہ کوئی بوڑھا درخت کہ وہ سب صدمات سے بچا رہتا ہے، اور بال بچے اس کے مثل سبز شاخوں اور پتّوں کے ہوتے ہیں جن کو وہ جانتا ہے کہ میں اپنے پیچھے چھوڑ جاؤں گا -

۱۰۳- تجرّد و تأہّل

تجرّد کے معنی بیاہ نہ کرنے کے، اور تأہّل
کے معنی بیاہ کرنے کے ہیں

۱- کارہائے نمایاں خواہ خیر کے لیے ہوں یا شر کے لیے، ان کے کرنے میں بیوی بچوں کا ہونا آدمی کا سدِّ راہ ہوتا ہے - سرکشی یا آزادی کے کام جو صورتِ عظیم میں نمودار ہوتے ہیں، ان کی سزا اولاد یا بیوی کو پہنچتی ہے - گویا کہ بیوی بچوں کا ہونا تقدیر کو آول[۱] دینا یعنی محکوم ہونا ہے - اکثر مجرّد اور بے اولاد آدمیوں نے بڑے بڑے کام رفاہِ عام اور فائدۂ عوام کے لیے کیے ہیں - اِن کاموں کے کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گو انھوں نے جسمانی ازدواج کسی عورت سے نہیں کیا مگر روحانی نکاح رفاہِ عام کے ساتھ کر کے اس میں وہ ایسے مصروف ہوئے جیسے کوئی اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہوتا ہے - صاحبِ اولاد اِس سبب سے آیندہ زمانے کا بڑا خیال رکھتے ہیں کہ ان کو اپنی اولاد اس میں چھوڑنی پڑتی ہے -

---

۱- آول : ضمانت - عزیز کو، روپیہ ادا ہونے یا اور کسی وعدے کے ایفا تک ضمانت کے طور پر کسی کے حوالے کر دیتے ہیں - (نوراللغات)

بعض مجرّد آدمی فقط اپنی ذات تک زمانے کا خیال رکھتے ہیں ، آیندہ زمانے کی کچھ پروا نہیں کرتے - بعض ان میں سے بیوی بچوں کو یہ سمجھتے ہیں کہ خرچ کے بِل (چٹھیاں) ہیں - بعض احمق ، طامع دولت مند فخریہ یہ کہتے ہیں کہ ہم دولت مند اِسی سبب سے ہیں کہ جورو بچے نہیں رکھتے - زیادہ اولاد دولت کو کم کرتی ہے - دو دولت مندوں میں اگر دولت برابر ہو تو جس کی اولاد زیادہ ہوگی ، وہ کم دولت مند بہ نسبت دوسرے کے سمجھا جائے گا ، اس لیے کہ اس کی اولاد کا خرچ زیادہ ہوگا - تجرّد کو آزاد طبع آزادی کے سبب سے پسند کرتے ہیں - ان میں بعض یہاں تک آزادی پسند ہوتے ہیں کہ کمر بند اور گارٹر کی بندش سے بھی ان کی طبیعت میں بستگی پیدا ہوتی ہے - مجرّد آدمی عمدہ دوست ، عمدہ آقا ، عمدہ ملازم ہوتے ہیں مگر عمدہ رعیّت و محکوم نہیں ہوتے - کیونکہ وہ اہل و عیال نہ[1] رکھنے کے سبب سے ایسے سُبک بار ہوتے ہیں کہ اُن کے فرار کے لیے کوئی روک ہی نہیں ہوتی - بھگوڑے اکثر مجرّد ہی ہوتے ہیں - کلیسا کے خادموں کا مجرّد ہی رہنا مصلحت ہے - ایسی حالت میں ان سے خیر کے کام زیادہ ہو سکتے ہیں - جب پانی کو تالاب بھرنا ہو تو وہ زمین کو کیا شاداب کرے گا - ایسے ہی جب وہ اپنے گھر کی خیر منانے میں لگیں گے تو اَور کارِ خیر مشکل سے کریں گے - مجسٹریٹ و جج خواہ مجرّد ہوں یا نہ ہوں ، یکساں ہیں - پانچ ملازم خراب ہوں تو چنداں خرابی نہیں ہوتی جیسی کہ ایک بیوی کے خراب ہونے سے - سپاہیوں کے واسطے جرنیلوں کی اکثر نصیحتیں تأہّل کے باب میں ہوتی ہیں - تأہّل درحقیقت انسانیت کی تعلیم و تادیب

۱- اصل میں ''نہ'' کا لفظ نہیں ہے -

کرتا ہے - مجرّد آدمی اِس سبب سے کہ عیال داری کا خرچ ان کے ذمے نہیں ہوتا، فیّاض ہوتے ہیں، مگر کٹّر اور سنگ دل بڑے ہوتے ہیں، کیونکہ ان سے کوئی چیز ایسی متعلق نہیں ہوتی کہ وہ ان کی الفت اور شفقت کی متقاضی ہو - بیویاں جوان آدمیوں کے لیے بمنزلہٗ بادشاہ کے ہوتی ہیں (حُکمِ زوجہ بہ از حکمِ خدا)، متوسط العمروں کے لیے دوست مصاحب، بُڈھوں کے لیے انائیں - تأہّل اور تجرّد دونوں ایسے ہیں کہ جن میں سے ہر ایک کی تردید اور تائید میں دلائل پیش ہو سکتی ہیں - بڑے بڑے دانش مندوں نے تجرّد اختیار کیا ہے - تھلیز سے جب اس کی ماں نے بیاہ کرنے کے لیے[1] پہلی دفعہ کہا تو جواب دیا کہ میں ابھی کم عمر ہوں - دوسری دفعہ اِس درخواست پر وہ بولا کہ میں بوڑھا ہوں -

ارسطو سے کسی شخص نے پوچھا تھا کہ بیاہ کرنا کیسا ہے؟ تو اس نے جواب دیا تھا کہ جو کرے گا وہ بھی پستائے گا[2] اور جو نہ کرے گا وہ بھی پستائے گا (بُور کے لڈو جو کھائے گا وہ بھی پستائے گا اور جو نہ کھائے گا وہ بھی پستائے گا) - بد مزاج خاوندوں کی بیویاں نیک مزاج ہوتی ہیں - اس کا شاید یہ سبب ہو کہ بد مزاج خاوندوں کے ساتھ بیاہ کرنے میں عورتوں کی نیک نامی بڑی ہوتی ہے اور ان کو اپنے صبر پر فخر ہوتا ہے - یا وہ اپنی پسند سے، برخلاف اپنے عزیزوں کی صلاح کے، بُرے خاوند کر لیتی ہیں، تو اپنی اس حماقت کے چھپانے کے لیے عقل مندی سے ان کے ساتھ نباہ کرتی ہیں اور اپنے کیے کو بھگتتی[3] ہیں - جہاں میاں بیوی دونوں

۱- اصل میں لفظ "لیے" نہیں ہے -

۲- کذا - یعنی پچھتائے گا - ۳- اصل : بھکتی -

بد مزاج ہوتے ہیں تو ان پر لوگ توجہ نہیں کرتے ، جیسے کو تیسا ، مگر جب ایک بد ہوتا ہے تو خیال کرتے ہیں ۔

۲- تأہّل کے باب میں یہ مقولے ، جو نیچے لکھے ہیں ، ان کو غور سے دونوں میاں بیوی مطالعہ کر کے فائدہ اٹھائیں :

اول ، دنیا میں گھر کی خوشی سے قربت جب حاصل ہوتی ہے کہ میاں بیوی میں سے کوئی خود غرض نہ ہو ۔

دوم ، دونوں ایک وقت میں ساتھ غصے نہ ہوں ۔

سوم ، نہ خلوت میں نہ جلوت میں ایک دوسرے کے ساتھ گستاخانہ باتیں کریں ۔

چہارم ، جب تک کہ گھر میں آگ نہ لگے ، کبھی ایک دوسرے سے غل شور مچا مچا کے باتیں نہ کریں ۔

پنجم ، ہر ایک کے دل میں یہ آرزو ہو کہ میں وہ کام کروں جس میں دوسرے کی خوشی ہو ۔

ششم ، ہر ایک کا یہ برتاؤ ہو کہ دوسرے کی خاطر کو اپنی خاطر پر مقدّم رکھے ۔

ہفتم ، میاں بیوی میں سے جب تک ایک سے خطا کا سرزد ہونا نہ تحقیق ہو لے ، دوسرا اس پر الزام نہ لگائے ۔ اور جب الزام لگایا جائے تو محبت و اخلاص سے ۔

ہشتم ، خطائے گزشتہ پر ایک دوسرے پر طعن و تشنیع نہ کرے ۔

نہم ، گو ساری دنیا کو دونوں بھول جائیں مگر ایک دوسرے کو نہ بھولیں ۔

دہم ، کبھی ایسا کام نہ کرے کہ ایک کو دوسرے سے دو دفعہ درخواست کرنی پڑے ۔

یازدہم ، ایک دوسرے کے خرچ میں چون و چرا نہ کریں ، نہ

پاجی پنے کی بات ہے -
دوازدہم ، ایک دن کے لیے بھی اگر جدا ہوں تو وقتِ رخصت پیار کی باتیں کریں -
سیزدہم ، جب پھر آن کر ملیں تو محبت و شوق سے ملاقات کی مبارک باد دیں -
چہاردہم ، آفتاب نہ غروب ہونے پائے کہ اپنے غصّہ و رنج کو ، جو باہم ہو ، دور کریں -
پانزدہم ، دونوں میں سے جو ایک خطا کرے ، اس سے اقرار کر کے دوسرے سے معاف کرا لے -
شانزدہم ، روزانہ پیار اخلاص کی باتیں کرنی کبھی نہ بھولیں -
ہفدہم ، گزشتہ را صلواۃ بھیج کر آیندہ کے لیے بہبود کی باتیں اختیار کریں -
ہشدہم ، ہمیشہ یاد رکھے کہ نکاح خدا کے حکم سے ہوا ہے - اُسی کے فضل و کرم سے وہ ہوگا جو ہونا چاہیے -
نوزدہم ، جب تک یہ یقین تم کو نہ ہو کہ ہم دونوں جنّت کی راہ پر چل رہے ہیں ، تب تک قانع نہ ہوں -
بستم ، بہشت میں داخل ہونے کی توقع کبھی کم نہ ہو -

۳- متأہّل اُس گل کی مانند ہے جو آگ پر کھچ کر گلاب دیتا ہے - اس کا بڑھنا ، جینا ، مرنا سب سہل ہیں - مجرّد مثل اُس گل کی ہے جو کانٹوں پر مرجھا کر رہ جاتا ہے - پس جیسا پہلا گل دوسرے گل سے بہتر ہوتا ہے ، ایسا ہی متأہّل مجرّد سے بہتر ہوتا ہے -

۴- تأہّل کے فائدے : تأہّل میں حسانت کم ہے مگر سلامتی زیادہ ہے - اس میں آرام بہت زیادہ ہیں مگر خوف نہایت کم ہے - رنج اور خوشی دونوں اس میں زیادہ ہیں - وہ خوشیوں سے بھی بھرا ہوا

ہے اور رنجوں سے بھی - اس کا بوجھ بڑا بھاری ہے مگر محبت و نیکی اس کو سنبھال کر ایسا کر دیتی ہے کہ جس سے دل خوش ہو جاتا ہے - تأہّل ساری دنیا کی ماں ہے - وہی سلطنتوں کو قائم کرتا ہے، شہروں کو آباد و معمور، کلیسا اور بہشت کو وہی بھرتا ہے - تجرّد کا حال اُس مکّھی کا سا ہے کہ سیب کے اندر بیچوبیچ میں بیٹھی ہے کہ ہمیشہ شیرینی میں رہتی ہے مگر اکیلی ہے اور مقیّد ہے - اِسی تنہائی میں مر جاتی ہے - مگر تأہّل کا حال شہد کی مکّھی کا سا ہے کہ گھر بناتی ہے، ہر پھول سے مٹھاس چوس کر جمع کرتی ہے، محنت کرتی ہے، اپنی سوسائٹی قائم کرتی ہے، سلطنتِ جمہوری جماتی ہے، اپنی آبادی میں سے نقلِ مکانی کرا کے نئی بستیاں آباد کرتی ہے، دنیا کو مزے دار چیزیں کھلاتی ہے، اپنے بادشاہ کی فرماں پذیر ہوتی ہے، انتظام رکھتی ہے اور بہت سے اَور بھلے کام کرتی ہے - تأہّل انسان کی اغراض کو بڑھاتا ہے اور اُس قانون کے موافق چلاتا ہے جس کے اوپر خدائے تعالیٰ نے دنیا کی بنیاد رکھی ہے -

۵- نیک ماں کی لڑکی سے شادی کرو - عقدِ نکاح کی گِرہ کو خوب نیکی سے باندھو - آپس میں باتیں کرنے میں نہایت احتیاط یہ رکھو کہ کوئی بات ایسی نہ ہو کہ جس سے کوئی ایک خفا ہوجائے - ہوا کے ذرا سے جھونکے سے کلی گر پڑتی ہے - ایسے ہی ذرا سی بے ڈھنگی بات بگاڑ کرا دیتی ہے -

۶- **تأہّل کی مختلف حالتیں:** تأہّل بے لطف و پھیکا ہوتا ہے کہ جن دو میں شادی بیاہ ہو جائے مگر نہ اُن میں کوئی ذہانت ہو، نہ کوئی مذاق ہو بلکہ فقط اِس وجہ سے شادی ہو کہ طرفین کے ماں باپ دُولھا دُلھن کو ملکیتِ زمین اور نقدی اور مقدرت میں ہم حالت دیکھ لیں - اس میں دُلھن کی ذاتی خوبیوں کا خیال اس سے

زیادہ نہیں ہوتا جیسا کہ جائدادِ زرعی کے خریدنے میں کسی مکان کے ہونے کا ۔ ان سے ایک گروہ دولت مندوں کا پیدا ہوتا ہے اور اس سے بنی نوع انسان میں ایسے آدمیوں کی بھیڑ لگتی ہے کہ جو نہ اپنے سے کمتر کو فائدہ پہنچائیں ، نہ برتر کا ادب لحاظ کریں ۔ ایسا تأہّل ایذا رساں ہوتا ہے کہ ایسے دو آدمیوں میں یہ رشتہ ہو کہ جن کا مذاق جلد باز اور مزاج کینہ توز ہو ۔ ان کے دوست یہ جانتے ہیں کہ یہ رشتہ مندی فقط اس لیے ہوئی ہے کہ افلاس سے بچیں ، جس کو سب سے زیادہ برا جانتے تھے ، اور اس سے اور برائیوں کے ساتھ دولت مند بنیں ۔ یہ دونوں مجلسوں اور صحبتوں میں کچھ رکے رکے گُھٹے گُھٹے معلوم ہوتے ہیں مگر خلوت میں ان کے اندر خوب جوتی پیزار ہوتی ہے اور ایک دوسرے کی صورت و سیرت پر لعنت ملامت کرتا ہے ۔ وہ جلوت میں برزخ کے اندر اور خلوت میں دوزخ کے اندر ہوتے ہیں ۔ ایسا تأہّل خوش حال ہوتا ہے کہ میاں بیوی نے خود اپنی پسند سے آپس میں یہ عقد باندھا ہو ۔ آپس میں حسانت اور دولت کا چنداں خیال نہ کیا ہو ۔ وہ ہرحال میں شریک رہتے ہیں ۔ راحت و مصیبت میں ، بیماری و صحّت میں ، افلاس و ثروت میں ایک دوسرے سے محبت و اخلاص کرتے ہیں ۔

۷۔ بعض بیاہ ایسے ہوتے ہیں کہ ابتدا میں تو بڑا سہاگ بھاگ ہوتا ہے مگر وہ صبح کی شفق کی طرح جلد جاتا رہتا ہے ۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جیسے وہ شادی کے وقت آپس میں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے ، بعد اس کے پسند نہیں کرتے ۔ تم کو خدا سے ڈرنا چاہیے اور ایک دوسرے کو خوش کرنا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ نکاح میں فقط آج ہی کا دن نہیں ہے کہ پیار میں فضولی کریں ، بلکہ آج کے بعد کل ہے اور کل کے بعد اور کل ہے ۔ اے لڑکیو !

تمھارا خطاب کدبانو ہے - تم کو اس کی شرم ہمیشہ رکھنی چاہیے کہ جس سے خاوند کے گھر کی تم مالک بنتی ہو - تم پر واجب ہے کہ ایسا اعتبار پیدا کرو کہ خاوند اپنے دل کی کُنجی اور گھر کا قفل تمھارے حوالے کرے - اس کے گھر کی عزت اور بھلائی تمھارے ہاتھ میں ہے - اے لڑکو! تم بھی اچھے باپ اپنے بچوں کے بنو - تم وہ کام کرو کہ تمھاری بیویاں دل و جان سے تمھاری عاشق ہو جائیں - انسان کے دل کا چین و آرام جیسا کہ ایک عورت کی محبت میں مخفی و مقفّل ہے، ایسا دولت کے عمیق خزانوں میں نہیں - جب وہ اپنے گھر کے پاس آتا ہے تو اُس کی ہوا میں برکتوں اور نعمتوں کی خوشبو سونگھتا ہے -

۸- تأہّل سے جوشِ شہوت کم ہو جاتا ہے مگر اس سے اوضاع و اطوار میں اصلاح نہیں ہوتی - بیاہ سے اگر خوش ہونا چاہتے ہو تو جلدی نہ کرو - جو جلدی شادی کرتا ہے، وہ پستاتا ہے - بیوی کو خوب سوچ بچار کر کرو - اس کا حال ایسا ہے جیسا کہ لڑائی میں خدع و حکمتِ عملی کا کہ اگر اس میں ایک دفعہ چُوک گئے تو پھر کچھ نہیں ہوتا - اِسی پر تمھاری آیندہ زندگی کی ساری خوشیوں کا مدار ہے - اس کی خُوبُو، عادت، مزاج کو خوب دریافت کر لو اور اس کے ماں باپوں کے جوانی کے مزاج کو تحقیق کر لو - اگر وہ فیّاض طبع ہوں تو مفلس نہ ہونے چاہییں کیونکہ بازار میں کوئی چیز بے قیمت دیے فقط فیّاض طبعی سے نہیں مل سکتی - کسی بدمزاج پاجی طبع سے، خواہ وہ کیسی ہی حسینہ ہو، نکاح نہ کرو اور نہ کسی بدشکل عورت سے شادی کرو، گو وہ دولت مند ہو - اس سے ذلیل ہو جاؤ گے - ایک مصیبت تم پر پڑے گی - نہ کبھی کسی بونی، نہ کسی احمق عورت سے شادی کرو - اس واسطے کہ اس سے بونوں اور احمقوں

کی نسل بڑھے گی ۔

بیاہ کرنا بھی لاٹری میں چِٹھی ڈالنا ہے کہ جب چالیس چٹھیاں خالی نکلتی ہیں تو ایک چٹھی مال کی نکلتی ہے ۔ اسی طرح صد ہا بیاہوں میں سے ایک میں یہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی کا سنجوگ ایسا ہو کہ سہاگ بھاگ خوب ہو ۔ جو آدمی اپنے مزاج کو بس میں کر سکتا ہے ، وہ بیوی کو بھی اختیار میں لا سکتا ہے ۔

بیاہ سے اگر خوش ہونا چاہتے ہو تو اُس عورت سے بیاہ کرو جو ہم عمر اور ہم حالت حسب نسب و دولت میں ہو ۔ تأہّل انسان کی زندگانی کا فردوس ہے ۔ دنیا کو اس کی خوشیاں جنّت بنا دیتی ہیں ۔ اس کے لڑائی جھگڑے ایسے رنج پہنچاتے ہیں کہ وہ دنیا کو جہنّم بنا دیتے ہیں ۔ جو لوگ برزخ کے قائل نہیں ، وہ یہ کہتے ہیں کہ تأہّل میں سوائے جنّت اور جہنّم کے کوئی تیسرا مقام نہیں ۔ تم فقط یہی خیال نہ کرو کہ بیوی خوب ملتی ہے ، نکاح کر لو ، بلکہ اس سے زیادہ یہ سوچو کہ ہمارے لیے شادی کرنے کا وقت بھی آیا یا نہیں ۔

۹ ۔ بیوی بچے انسان کو اُس محنت و مشقّت پر مجبور کرتے ہیں جس کے قابل وہ نہیں ہوتا ۔ جب وہ محنت کرتے کرتے مایوس ہو جاتا ہے تو وہی پھر اس کو ایسا اُکساتے ہیں کہ کیا وہ نامردوں کی طرح کونے میں پڑا ہوا تھا ، کیا پھر بہادرانہ لڑنے لگا ۔ غرض آدمی کو جتنا افلاس سہارا دیتا ہے ، اُتنا وہ کنبے کو سہارا نہیں دیتا ۔

۱۰ ۔ تأہّل کی جواب دہی : تأہّل بڑی جواب دہی اور ذمہ داری کا مقدّس کام ہے ۔ ایک چھوٹی سی کشتی میں دو جانیں بیٹھ کر عمرِ رواں کے بحرِ متّواج کے تلاطم میں رواں ہوتی ہیں ۔ ان کا مددگار سوائے ان کی اپنی ذات کے کوئی نہیں ہوتا ۔ ان کی نازک کشتی آیندہ خود انھی کے کنارے سے ہم کنار ہوتی ہے ۔ کوئی ان کی رنج و خوشی

کا شریک نہیں ہوتا - بیوی کی ساری خوشیاں خاوند سے پیدا ہوتی ہیں جن کا جاننا اس کو ضرور ہے - وہی ایک شخص ہے جس کے خوش کرنے کے لیے اس کو سو جتن کرنے پڑتے ہیں - باقی اور آدمی تو ایسے ہیں جیسے کہ دیوار پر سائے چمک رہے ہیں - خاوند پر بیوی کے یہ حقوق ہیں کہ جو عقد بندھا ہے اور اس میں جو عہد ہوا ہے اُسے پورا کرے - ہر حال میں اس کا شریک اور ہمدرد رہے - بیوی کی خطاؤں کو رحم و شفقت کی نظر سے دیکھے - اس کی اطاعت کے حق کا عوض دے - وہی مبارک شادی ہے جس میں یہ سب باتیں ہوں -

۱۱- ہم نیچے تأہّل کی دلائل ایسی لکھتے ہیں کہ چند الفاظ کے بدلنے سے وہ اس کے رد کی دلائل ہو جاتی ہیں :

اول ، اگر اوقات بسر کرنے کے اسباب تمھارے پاس ہیں تو تم کو تأہل سے ایک ایسا شخص مل جائے گا کہ وہ ان کی حفاظت کرے گا اور ان کو بڑھائے گا -

دوم ، اگر یہ سب اسباب موجود نہیں ہیں تو تأہل سے ایسا شخص ملے گا جو تمھاری تائید ان کے پیدا کرنے میں کرے گا -

سوم ، اگر تم خوش حال ہو تو تأہل سے تمھاری خوشی دو چند ہو جائے گی -

چہارم ، اگر تم مصیبت زدہ ہو تو تأہل سے تم کو ایسا شخص ملے گا کہ وہ تمھارے رنج کو بٹائے گا اور تسلّی اور تشفّی دے گا -

پنجم ، جب تم گھر کے اندر ہو گے تو بیوی رنج کو گھر سے نکال دے گی -

ششم ، جب تم گھر سے باہر ہو گے تو بیوی شوق کے ساتھ تمھاری منتظر رہے گی اور آنے پر تمھیں مبارک باد دے گی -

ہفتم ، انسان کو کوئی خوشی بغیر سوسائٹی کے نہیں حاصل ہو

سکتی ، اور کوئی سوسائٹی بہتر اہل وعیال سے نہیں ہو سکتی -

ہشتم ، ازدواج کی محبت نہایت سخت ہوتی ہے -

نہم ، یہ ازدواج ہی ہے جس سے کنبا بڑھتا ہے - بھائی ، بہن ، بھتیجے ، بھانجے زیادہ ہوتے ہیں - والدین کی تعداد دو چند ہوتی ہے -

دہم ، اس سے تم اچھی اولاد کے باپ بنتے ہو -

یازدہم ، حضرت سلیمان[ؑ] خاندان کے بانجھ ہونے پر لعنت کرتے ہیں اور تجرّد کی حالت پر اس سے زیادہ -

اب اِنھی دلائل کو برعکس یوں بناتے ہیں :

اول ، اگر اوقات بسر کرنے کے اوقات تمھارے پاس موجود ہیں تو تأہل سے ایک شخص ان کا خرچ کرنے والا پیدا ہوگا -

دوم ، اگر نہیں ہیں تو وہ شخص اور افلاس بڑھائے گا -

سوم ، اگر تم خوش حال ہو تو تأہّل سے یہ حالت جاتی رہے گی -

چہارم ، اگر تم مصیبت کی حالت میں ہو تو حضرت ایوب[ؑ] کی بیوی کی طرح تمھاری مصیبت کو بیوی بڑھا دے گی - بہت سی آفتیں اس کی تمھاری جان کو عذاب میں ڈالیں گی - تمھارے سر پر ایسا بوجھ بھاری رکھ دے گی کہ تم سے نہیں اٹھ سکے گا -

پنجم ، جب تم گھر میں ہوگے تو بیوی تم سے ایسا لڑے گی کہ گھر سے باہر نکال دے گی -

ششم ، اگر تم باہر ہو گے تو یہ عقل مندی ہے کہ تم باہر ہی رہو ورنہ جب اندر جاؤ گے تو بیوی تیوری میں بل ڈالے گی -

ہفتم ، خلوت سے قناعت ہوتی ہے اور تجرّد سے بہتر کوئی خلوت نہیں -

ہشتم ، ازدواج کی بندش ایسی سخت ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح

کھلتی نہیں ، آخر کو تباہ کر دیتی ہے ۔

نہم ، کنبے کی افزائش تجھے کھا جائے گی ۔

دہم ، بے عصمت بیوی ایسے بچے جنے گی جو تیرے نہیں ہوں گے ۔

یازدہم ، سینٹ پال تجرّد کو تأہل پر ترجیح دیتا ہے ۔

غرض خواہ حکما کے مقولوں کو دیکھو یا شعرا کے اشعار پر غور و تأمل کرو ، دونوں ۔ تجرّد و تأہّل ۔ میں سے ہر ایک کے موافق و مخالف دلائل پاؤ گے ۔

۱۲ ۔ بعض آدمی پہلی بیوی کے مرنے کے بعد شادی کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے ۔ جو نہیں کرتے اس کے دو سبب ہوتے ہیں ؛ اول یہ کہ پہلی بیوی سے ان کو آنس ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس کے مرنے کے رنج سے شادی نہیں کرتے ہیں ۔ یا وہ پہلی بیوی کے ہاتھ سے دق ایسے ہوتے ہیں کہ اس کے مرنے کے بعد تأہّل سے توبہ کرتے ہیں ۔ جو شادی کرتے ہیں ، اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ تأہّل میں چین اور آرام پہلی بیوی کے سبب سے ایسا پاتے ہیں کہ بغیر اس کے خوش نہیں رہ سکتے ۔

۱۳ ۔ اچھا خاوند وفادار ایسا ہوتا ہے جیسا کہ گڈریے کا کتّا ۔ پیارا ایسا ہوتا ہے جیسا کہ بچّہ ماں باپوں کو ۔ مُحسن ایسا جیسا کہ چشمہ تشنہ لب مسافروں کو ۔

اچھی بیوی خاوند کا دایاں ہاتھ ہوتی ہے ۔ اس کا مرنا خاوند کو ایسی تکلیف دیتا ہے جیسا کہ دائیں ہاتھ کا سوکھ جانا یا کمر کا ٹوٹ جانا کہ پھر اٹھا ہی نہ جائے ۔

۱۰۴ ۔ حسد

۱ ۔ محبت اور حسد دونوں دل پر جادو کا اثر کرتے ہیں ۔ جہاں

کوئی شے محبوب اور محسود نظر کے سامنے آئی ، اس کا اثر تصوّر میں ہوا اور ظاہر میں بھی وہ نمودار ہوا ۔ بعض تو زخمِ چشم اور نظرِ بد یا نظر لگنے کو کہتے ہیں کہ وہ چشمِ حسد ہی ہوتی ہے کہ محسود کی شان اور شکوہ کو دیکھ کر اس کو گزند پہنچاتی ہے ۔ غرض یہ تحقیق گو بے فائدہ نہ ہو مگر اس میں پڑنا خالی از دقّت نہیں ۔ اس لیے ہم اس کو چھوڑ کر یہ تین باتیں بیان کرتے ہیں کہ : اول ، کون لوگ حاسد ہوتے ہیں ؟ یعنی جو حسد کرتے ہیں ۔ دوم ، وہ کون سے آدمی ہوتے ہیں جو محسود ہوتے ہیں ؟ یعنی جن پر حسد ہوتا ہے ۔ سوم ، حسدِ شخصی اور حسدِ اجتماعی میں کیا فرق ہے ؟

اول بات کا بیان : جو شخص خود نیکی و خوبی سے خالی ہوتا ہے ، یعنی بد آدمی ہوتا ہے ، وہ حسد کرتا ہے ۔ انسان کی روح کی غذا یا[1] اپنی نیکی یا دوسرے کی برائی ہوتی ہے ۔ جب اس میں پہلی موجود نہیں ہوتی تو دوسری سے وہ اپنا پیٹ بھرتی ہے ۔ جس شخص کو یہ امید نہیں ہوتی کہ میں دوسرے کی خوبی اور نیکی اپنے میں پیدا کر لوں گا تو وہ ان کو گھٹا کے دوسرے کے[2] ساتھ اپنی مساوات پیدا کر لیتا ہے ۔

دوم ، وہ شخص حاسد ہوتا ہے جو اوروں کے حال کے[3] تجسّس اور تفحّص کے درپے رہتا ہے اور خود بڑا کارکن ہوتا ہے ۔ اور آدمیوں کے حال سے زیادہ واقفیت چاہنی اِس سبب سے نہیں ہوتی کہ وہ کچھ اس کی دولت و جائداد کے معاملات سے تعلق رکھتی ہے ، بلکہ اِس سے خوشی اس کو ایسی حاصل ہوتی ہے جیسے کہ سانگوں[4]

۱۔ اصل : کیا ۔ ۲۔ اصل : کی ساتھ ۔

۳۔ اصل : کی ۔

۴۔ سانگ = تمثیل ، ڈراما ، نقل ۔

کے دیکھنے میں - جو شخص کہ اپنے کاموں میں سر تا پا مصروف رہتا ہے اور دوسرے کے کام سے کچھ غرض نہیں رکھتا ، اس کے لیے حسد کا سامان کوئی نہیں ہوتا - ہاں جو شخص اَور کے حال کا تجسّس کرتا ہے اُس کے واسطے حسد کے اسباب موجود ہوتے ہیں - حسد تو کوچہ و برزن میں ہرزہ گردی کرتی پھرتی ہے - اس کا کوئی گھر مقرّر نہیں ہے ، اس لیے جو آوارہ گرد ہوتا ہے اس سے وہ ملتا ہے -

سوم ، اشراف اُن آدمیوں سے ہمیشہ حسد کرتے ہیں جو ادنٰی درجے سے اعلٰی درجے پر پہنچتے ہیں - وہ نظر کی طرح دھوکا کھاتے ہیں کہ اَوروں کے آگے بڑھنے کو اپنا پیچھے ہٹنا سمجھتے ہیں ، اور جانتے ہیں کہ اِن کے مراتب میں جو بُعد و فصل تھا وہ گھٹ گیا -

چہارم ، بد صورت ، خواجہ سرا ، بوڑھے ، حرام زادے حاسد ہوتے ہیں - اس لیے کہ جو شخص اپنا عیب کسی طرح دور نہیں کر سکتا وہ دوسروں کو عیب لگا کر اپنے[1] برابر کرنا چاہتا ہے - مگر یہ عیب اگر کسی بڑے بہادر ، شجاع ، جواں مرد میں ہوتے ہیں تو وہ اِن عیبوں کو اپنے کارہائے نمایاں سے اعجاز بنا دیتا ہے اور وہ اس کی عزّت و عظمت کے جزوِ اعظم ہو جاتے ہیں ؛ جیسے تیمور گورگاں کا لنگ[2] -

پنجم ، وہ لوگ کہ جن کو زمانے نے دھکا دے کے نیچے گرایا تھا ، مگر وہ پھر سنبھل کر اٹھے ، مصائب اور ذلّت اور آفات سے نکلے ، اس لیے وہ اَوروں کو بھی چاہتے ہیں کہ مذلّت و خواری میں پڑیں کہ جس سے ان کو پہلی اپنی بے عزتی سے نجات ہو -

ششم ، وہ لوگ بھی حاسد ہوتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ہم

۱- اصل : اپنی -　　۲- لنگ = لنگڑا پن -

بہت سے ہنروں میں صاحبِ کمال ہوں ۔ مشکل ہے کہ ایک شخص متعدّد ہنروں میں کمال دکھے ۔ ضرور ہے کہ کسی نہ کسی ہنر میں اور لوگ اس سے زیادہ تر کامل ہوں ۔ پس وہ ان سے حسد کرتا ہے ۔ شہنشاہ انڈرین میں یہ بیہودگی تھی کہ وہ شاعری ، مصوّری ، کاریگری میں یہ چاہتا تھا کہ میں ان سب کاموں میں اوروں سے سبقت لے جاؤں ، اس لیے اس کی عادت یہ تھی کہ وہ شاعروں ، مصوّروں ، کاریگروں سے حسد کرتا تھا ۔

ہفتم ، رشتہ داروں اور ہم پیشوں اور ہم سبقوں میں زیادہ محاسدت[1] ہوتی ہے ۔ جب اِن ہمسروں میں کوئی زیادہ بڑھ جاتا ہے تو اس پر باقی حسد کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں ۔ اسے دیکھ دیکھ کر ان کو اپنی بد نصیبی یاد آتی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ اس کی برتری سے ہماری کمتری لوگوں کے نزدیک عیاں ہوتی ہے ، اس لیے وہ اپنے نصیبے کو روتے ہیں اور اسے دیکھ کر جلتے ہیں اور اس کی شہرت اور ناموری سے ان کی حسد اور بھی دو چند ہو جاتی ہے ۔ قابیل[2] کی حسد اپنے بھائی ہابیل[3] کے ساتھ پرلے درجے کی کمینگی اور پاجی پنے کی تھی کیونکہ جب ہابیل کی قربانی اچھی طرح قبول ہوئی تھی تو وہاں کوئی اور دیکھنے والا نہ تھا ۔

اب ہم اُن آدمیوں کا ذکر کرتے ہیں جو محسود ہوتے ہیں ، یعنی جن پر حسد ہوتا ہے ۔

اول ، رذیل آدمی جو اول ہی اول معزّز و نودولت ہوتے ہیں ،

۱۔ محاسدت = ایک دوسرے سے حسد کرنا ۔

۲۔ قابیل : حضرت آدمؑ کا بیٹا جس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا تھا ۔

۳۔ ہابیل : حضرت آدمؑ کا دوسرا بیٹا جسے اس کے بھائی قابیل نے حسد سے ہلاک کر دیا تھا ۔

ابتدا میں آن پر حسد کا بڑا زور ہوتا ہے ، مگر یہ کم ہو جاتا ہے ۔

دوم ، لائق و قابل آدمی جن کی اقبال مندی اور برتری پر مدتِ دراز گزر جاتی ہے تو وہ زیادہ محسود ہو جاتے ہیں ۔ اس واسطے کہ گو ان کی خوبیاں بدستور رہتی ہیں مگر اس مدتِ دراز میں ان کے نئے حریف و رقیب ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جو ان کے اقبال و دولت کے سورج کو زوال کا گرہن لگانا چاہتے ہیں ۔

جو محسود کم ہوتے ہیں ، وہ یہ ہیں :

اول بادشاہ : حالتوں کے مقابلہ کرنے سے حسد پیدا ہوتا ہے ۔ جہاں مقابلے میں کوئی نہیں ہوتا ، وہاں حسد نہیں ہوتا ۔ پس بادشاہوں کے مقابل بادشاہ ہی ہوتے ہیں ، اس لیے بادشاہ پر حسد بادشاہوں کو ہوتا ہے ، کسی دوسرے کو نہیں ہوتا ۔

دوم ، وہ لوگ جو اپنی نیک افعالی کے سبب سے اعلیٰ درجے پر پہنچتے ہیں ، آن پر لوگوں کو حسد اِس سبب سے کم ہوتا ہے کہ وہ اس بزرگی و عزت کا مستحق ان کو جانتے ہیں ۔ کسی شخص کو ادائے قرض پر حسد نہیں ہوتا بلکہ انعام و عطیّات پر ۔

سوم ، خاندانی شریف ، عالی نصب آدمیوں کا عروج ہوتا ہے تو ان کی اقبال مندی پر لوگ کم حسد کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ ابھی کچھ بڑھے نہیں ۔ پہلے سے بڑے ہوئے ہیں ۔ حسد کا حال دھوپ کا سا ہے کہ وہ پُشتوں اور ناہموار زمینوں پر زیادہ گرم ہوتی ہے اور ہموار زمین پر کم ۔ ایسے ہی جن آدمیوں کی بتدریج ترقی ہوتی ہے ، ان پر بہ نسبت آن لوگوں کے ، جو دفعۃً بڑھ جاتے ہیں ، حسد کم ہوتی ہے ۔

چہارم ، جن لوگوں کو بڑی جانکاہی اور دور دراز کے سفروں کی مصیبت آٹھانے سے اور جان جوکھوں کے کام کرنے سے عزت و

بزرگی حاصل ہوتی ہے، اُن پر لوگ کم حسد کرتے ہیں، بلکہ ان کی جفاکشی اور سختیاں اُٹھانے پر رحم کرتے ہیں۔ یہ رحم حسد کی تیزی کو کند کر دیتا ہے۔ اس لیے مدبّرانِ ملکی جو بیدار مغز و ہوشیار اور سنجیدہ و متین ہوتے ہیں، وہ اپنی مصائب اور آفات کا حال اپنے جاہ و منصب حاصل کرنے میں بہت ظاہر کیا کرتے ہیں تاکہ لوگ ان سے حسد کم کریں اور ان کے حال پر رحم کریں۔

یاد رکھو کہ جو لوگ اپنی فراخ دلی اور آزادی سے بزرگی کو ظاہر کرتے ہیں، اُن پر حسد ایسا نہیں ہوتا جیسا اُن لوگوں پر جو اپنی برتری کو مکر، فریب، دغا کے لباس میں دکھاتے ہیں۔ اس طرح دکھانا یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ خود اپنی کم لیاقتی سے آگاہ ہیں جو دغا سے لیاقت کو دکھاتے ہیں۔ اُن آدمیوں کے بڑے حاسد پیدا ہو جاتے ہیں جو اپنی بزرگی اور برتری کو مغرورانہ دکھاتے ہیں، اور اُن کے دل کو چین نہیں آتا جب تک اپنی عظمت کی نمائش ظاہری سامان سے یا اپنے حریفوں پر فتح پانے سے وہ نہ دکھائیں۔ حقیقت میں لوگوں کو حسد کرنا وہ سکھاتے ہیں۔ برخلاف اس کے اُن لوگوں کے حاسد بہت کم ہوتے ہیں جو اپنے چھوٹوں کے ساتھ مدارات اور تواضع سے پیش آتے ہیں اور اپنے ماتحت افسروں کے استحقاق میں فرق نہیں آنے دیتے اور ان کی بزرگی کو مانتے ہیں۔ سیدھی سادی وضع رکھتے ہیں۔ کوئی ظاہری نمائش و نمود مکان میں، اسباب میں، پوشاک میں، خوراک میں نہیں رکھتے جو لوگوں کے دلوں میں حسد کا اشتعال کریں۔

اب تک ہم نے شخصی حسد کا بیان کیا، یعنی جو ایک شخص میں ہو۔ اب ہم اجتماعی کا بیان کرتے ہیں، یعنی جو پبلک میں ہو۔ شخصی حسد میں کوئی خوبی نہیں مگر اجتماعی میں بعض خوبیاں

ہوتی ہیں - جب کوئی آدمی اعلیٰ درجے پر سرفراز و ممتاز ہوتا ہے تو اس سے عوام کی ناراضی یعنی حسد اس کے حدِ اعتدال سے پاؤں باہر نکالنے کے لیے ایک زنجیر ہوتی ہے اور شہر بدر ہونے کا خوف دلاتی ہے اور ناجائز قوّت حاصل کرنے سے روکتی ہے - ریاستوں اور سلطنتوں میں حسد کا حال مرضِ متعدی و وبائی کا سا ہوتا ہے - جو اس سے ڈرتا ہے، اُسی کے پیچھے وہ زیادہ پڑتی ہے - بھلے چنگے آدمیوں میں وہ متعدی ہوتی ہے - پس یہی حال سلطنتوں اور ریاستوں میں حسد کے پھیلنے کا ہے کہ ان کے اچھے کاموں کو بھی بدنام کرتی ہے اور بھلے[1] کاموں کی بھی بری صورت بنا دیتی ہے - اور جو لوگ حسد سے ڈرتے ہیں اُنھی پر وہ زیادہ اثر کرتی ہے - عوام کی حسد زیادہ تر ارکانِ شاہی پر ہوتی ہے، کچھ بادشاہ و سلطنت سے نہیں - لیکن اگر کل ارکانِ شاہی سے حسد ہو تو گویا وہ سلطنت سے ہی حسد ہوتی ہے -

تمام برائیوں میں سب سے بد تو حسد ہے - اس کی برابر کوئی پاجی و کمینہ برائی نہیں - وہ ایک شرارتِ شیطانی ہے جو اندھیرے میں اپنا کام اندر ہی اندر[2] چھپ کے کرتی ہے اور رات کو گیہوں میں موٹرا بوتی ہے - جتنی بھلائیاں ہیں، اُن کے ساتھ برائیاں کرتی ہے - موت کے سوا حسد کا کوئی علاج نہیں -

۲- حسد در حقیقت خود پرستی ہے - خود پرستی یوں تو بہت سے گناہوں کی صورتیں بدلتی ہے، مگر جن کو وہ خود پیدا کرتی ہے ان میں سے حسد بھی ایک ہے جس کو رنج اور نفرت سے مرکب کر کے بناتی ہے - وہ دل کی کیفیت ایسی کر دیتی کہ

۱- اصل : بھلی -
۲- اصل : اندر ہی اندر ہی -

دوسرے کی خوش حالی اس پر صدمہ پہنچاتی ہے۔ اوروں کی خستہ حالی اور آفت زدگی اس کو چین اور آرام دیتی ہے۔ انسان کی ہوائے نفسانی میں سب سے زیادہ بری حسد ہے۔ غضب ظالم ہوتا ہے، غصّہ قہرناک مگر حسد وہ بد بلا ہے کہ اس کے سامنے کوئی نہیں کھڑا رہ سکتا۔ کوئی پناہ گاہ اس سے بچا نہیں سکتی، کوئی قوّت اس کے حملوں کو دفع نہیں کر سکتی۔ جیسا لوہے کو زنگ برباد کرتا ہے، ایسا ہی حسد دل کو۔

حضرت سلیمانؑ فرماتے ہیں کہ حسد ہڈیوں کو بوسیدہ کرتی ہے۔ جانسن صاحب کہتے ہیں کہ انسان اس سبب سے کہ مُدنی الطبع ہے، اس کے لیے کوئی چیز حسد سے زیادہ غیر مناسب نہیں ہو سکتی۔ وہ ذرا سی ترغیب پر صداقت اور محبت سے منہ پھیر لیتی ہے۔ اب تک نہ اولیا کو اور نہ ہجو کرنے والوں کو ایسا اوزار ملا ہے، نہ کوئی حکمت اور ہنر ایسا دریافت ہوا ہے کہ اس سے اس موذی دیو کا سر کچلا جاتا۔ انسان کی طبیعت کا مقتضا یہ ہے کہ وہ شرارت کی طرف رغبت کرتا ہے۔ جسمانی اور روحانی فائدے، عالی نسبی، علوّ مرتبگی ایسی چیزیں ہیں جن کی انسان بالطبع دل سے تمنّا رکھتا ہے۔ وہ جب غیروں کو ملتی ہیں تو دلوں کی قدرتی خباثت زور کرتی ہے اور اس سے حسد پیدا ہوتی[1] ہے۔

۳۔ جو انسان یہ چاہتا ہے کہ میں ممتاز اور سرفراز بھی ہمسروں میں ہوں اور چین اور آرام بھی کروں، تو یہ دونوں باتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ عیش و عشرت بے محنت مل نہیں سکتا۔ پس جو شہرت اور ناموری کی نردبان[2] پر عروج کرنا چاہتا ہے مگر چڑھنے کی تکلیف

۱۔ اصل: ہوتا ہے۔ ۲۔ نردبان = سیڑھی۔

کو گوارا نہیں کرتا ، وہ بری نظر سے اُن لوگوں کو دیکھتا ہے کہ جو اپنی فراست ، ذکاوت ، مستعدی و نیروے بازو ، محنت ، صبر و استقلال سے بزرگی اور برتری حاصل کرتے ہیں - پس یہ سستی اور کاہلی اس کے دل میں حسد پیدا کر کے دل اس کا جلاتی ہے -

مال و دولت کی طمع و حرص بھی بعض وقت حسد کا سبب ہوتی ہے - زرپرست جب دوسرے شخص کو دیکھتا ہے کہ وہ دولت کے جمع کرنے میں اپنے تمام منصوبوں اور تدابیر میں کامیاب ہوتا ہے ، مگر میری قسمت ایسی بری ہے کہ مجھے ذلّت و خواری کی حالت میں رکھتی ہے اور ہر طرح سے ناکام و نامراد کرتی ہے ، اس لیے وہ اُس شخص سے حسد کر کے جلنے لگتا ہے - یہ نہیں جانتا کہ تجارت ہزاروں پہلو رکھتی ہے - کسی کو کوئی پہلو دکھاتی ہے ، کسی کو کوئی -

حسد کا سبب خواہ کچھ ہی ہو ، اس سے سوائے رنج اور تکلیف کے کچھ اَور نہیں حاصل ہوتا - اس کے اجزا مقوّمِ نامرادی اور بد خواہی ایسے ہیں جن سے زیادہ انسان کی بدحالی کے واسطے کسی اور اجزا کی معجون نہیں بن سکتی - حاسد اپنے تئیں ضرر پہنچاتا ہے - حسد کرنا ایک زہریلے سانپ کا کھلانا اور پالنا ہے جو پالنے والے ہی کے دل پر ڈنک مارتا ہے - اَوروں کی خوش حالی دیکھ کر جلنا یہ ایک اور اضافہ حاسد کے ذاتی مصائب پر ہو جاتا ہے -

ایک ظریف نے جب ایک شخص کو افسردہ خاطر دیکھا تو اُس سے پوچھا کہ کیا آج تم پر خود کوئی آفت پڑ گئی ہے یا تم نے کسی اَور کی حالت اچھی دیکھی ہے جو تم پر یہ افسردگی چھائی ہے ؟ حسد شرارت کی کلیں بنا کر بڑے ظلم و جور و جفا کے کام برپا کرتی ہے - اب تک جو اس نے شرارت کے کام کیے ہیں ، وہ

اتنے ہیں کہ اگر ان کو لکھیں تو پڑھنے والے تھک جائیں ۔ اس کا آغاز جب سے ہے کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا ۔ حسد نے ہی اول انسان کے خون سے زمین کو تر کیا ۔ معلوم نہیں روز کتنے آدمی[1] قتل کراتی ہے ۔ اگر حسد اپنے کانٹے دل میں نہیں چھوڑتی تو وہ اپنے زہریلے اثر دوسری طرح سے پھیلاتی ہے ۔ نیچر میں اس کے زہر کا کوئی تریاق نہیں ۔ حکمت و فلسفہ اس کو پکڑتا ہے مگر مار نہیں سکتا ۔ سوائے اس کے کوئی علاج اس کا نہیں کہ آدمی خدا سے گڑ گڑا کر دعا مانگے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس بلا کو میرے پیچھے نہ لگائے ۔

۴۔ ہر گناہ میں کچھ لذّت اور خوشی ہوتی ہے ۔ اس کے کرنے کے لیے آدمی عذر بھی کر سکتا ہے ، مگر حسد میں یہ دونوں باتیں نہیں ۔ جس کسی کو یہ منظور ہو کہ ہم یہیں دنیا میں پہلے سے جہنّم کے مزے چکھیں تو وہ حسد کرنا اختیار کر لے ۔ خوبیوں کے دیکھنے میں وہ اندھی ہے مگر برائیوں کے دیکھنے میں اس کی سو آنکھیں ہیں ۔ اس کو سوائے عیبوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا ۔ حسد سے زیادہ کیا برائی ہو گی کہ وہ خدا سے لڑنا چاہتی ہے ، مگر اُس کا جاہ و جلال کب اس کو پاس آنے دیتا ہے ۔ اس لیے وہ اُن آدمیوں سے لڑنے لگتی ہے جن پر وہ فضل و کرم کرتا ہے اور جن کو دولت و جاہ مرحمت کرتا ہے ۔ دل میں حسد کا ہونا ایسا ہے جیسے کہ چھاتی پر ہزاروں زہریلے کالے سانپ بیٹھے پھنکارتے ہوں اور چھاتی ہی کو کھاتے ہوں ۔ حسد ، لیاقت و قابلیت کا سایہ ہے جو اس کے پیچھے پیچھے لگا پھرتا ہے ۔ قاعدہ ہے جیسی اصل ہوتی ہے ویسا سایہ ہوتا ہے ۔ پس محسود کی لیاقت و قابلیت کے موافق حاسد کی حسد چھوٹی بڑی ہوتی ہے ۔

۱۔ اصل : قتل کتنے آدمی ۔

حسد سے بعض دفعہ آدمی ایسے خائف ہوتے ہیں کہ وہ اپنے تئیں برتر اور اعلیٰ درجے کا بنانا گناہ کے برابر سمجھنے لگتے ہیں۔ اچھے کام کرنے میں حسد کی طرف سے خوف لگا رہتا ہے۔ حسد کمینگی اور پاجی پنے سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ چاہتی ہے کہ نیکی کا زور گھٹے، خوشی کا پیمانہ خالی ہو۔ وہ تو خوش حالی کو دیکھ کر بدحال اور تندرستی کو دیکھ کر بیمار ہوتی ہے۔ جب برائی سے خوش ہونے والی حسد کے پر جھوٹ کے لگ جاتے ہیں تو وہ اُڑ کر بری بری خبریں خوب اُڑاتی پھرتی ہے۔ تم حسد سے بھاگتے رہو۔ یہ ایسی برائی ہے کہ ہمیشہ تمھاری بدتری بتلاتی ہے۔ وہ آسی میں رہتی ہے۔ وہ ذلّت کے پیچھے بڑے شوق سے لپکتی ہے، خواری ہی اس کی خوراک ہے، غارت گری میں وہ بڑی شوخ و بے باک ہے۔

۵۔ جیسے گھاس پھوس[1] ہر سر زمین اور ملک میں، خواہ اس کی آب و ہوا کچھ ہی ہو، سبز و شاداب ہوتے ہیں، ایسے ہی حسد سب جگہ، خواہ گاؤں ہو یا بادشاہی دربار ہو، موجود ہے۔ وہ تموّل و افلاس کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر درجہ و مرتبہ کے آدمیوں کے دل میں وہ جوش و خروش کرتی ہے۔ رنگیلی اور بھڑکیلی پوشاک میں وہی اپنے رنگ دکھاتی ہے جو افلاس کے پھٹے پرانے گودڑ[2] کے لباس میں۔ طالب علموں اور معلّموں، گنواروں، بادشاہ کے معزّز درباریوں میں ایک ہی سی حقارت اپنے ہمسروں اور ہمسایے کی کراتی ہے اور خدا سے سرکش بناتی ہے۔ اس لیے سب کو چاہیے کہ بہت احتیاط و نگہداشت کریں کہ وہ کہیں اپنا گھر دل میں بنا کے آباد نہ ہو جائے۔ اس کے باہر رکھنے کی تدبیریں کرتے رہیں۔

۱۔ اصل: گھاس پوس۔ ۲۔ اصل: گڑ گوڈر۔

۶۔ حسد غرور کی ماں ہے ، قتل کی بانی ، روح کے لیے بڑی میلی کچیلی کیچڑ ، تازہ گوشت کے اور ہڈیوں کے گودے ـــ کھانے کے واسطے سنکھیا ، ہمسایے کے موٹے ہونے سے دبلی ہونے والی۔ حاسد سب سے حسد کرتا ہے مگر کوئی اس سے حسد نہیں کرتا ۔ اس کی کچھ طبیعت میں غرورِ حاسدانہ ہوتا ہے ۔ اس کو یہ بات برداشت ہی نہیں ہوتی کہ سوائے اپنے کسی دوسرے کی اچھی حالت دیکھ سکے ۔ جب وہ کسی کی سچی تعریف سنتا ہے تو اس میں ناحق چون و چرا کرتا ہے ۔ اور جب نیکیاں کسی کی ایسی نمایاں ہوتی ہیں کہ ان میں کچھ کلام نہیں ہو سکتا تو وہ اپنی اگر مگر لگا کے ان میں ایسی برائیاں بتلاتا ہے جو ان کی شان کو بٹّا لگاتی ہیں ۔ اور اگر زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتا تو خاموشی ایسے ادا و انداز سے اختیار کرتا ہے کہ جس سے ان میں شبہ پڑ جائے ۔

۷۔ جو آدمی تم کو اپنے سے برتر نظر آتے ہیں اور ان کے خطاب و القاب بڑے دھوم دھام سے ان کے نام کے ساتھ لگائے جاتے ہیں ، مکانات عالی شان اور باغ فردوس آئین رکھتے ہیں ، ان کی سونے چاندی کی سواریاں چھم چھم کرتی ہیں ، ان پر حسد نہ کرو ۔ ان کا یہ سارا سامان کیا ہے ؟ وہ سوائے مالکوں کی آنکھوں کے سب کی آنکھوں کو چکا چوند لگاتا ہے ۔ جس شخص کو ان کے دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے ، اس کی نظر میں ان کی کچھ قیمت نہیں ہوتی ۔ ارزاں ان کو جانتا ہے اور قابلِ التفات نہیں سمجھتا ۔ یہ سارا خانماں عمدہ و عالی شان اس کے نزدیک ایسا ہی سادہ ہے جیسے کہ کسی غریب آدمی کا سامانِ خانہ ہوتا ہے ۔ جیسے غریب اپنے جھونپڑے میں جاتا ہے ، امیر اپنے محل میں داخل ہوتا ہے ۔ اپنے سامان کی عظمت و شان اس کے دھیان میں بھی نہیں آتی ۔ جن تصاویرِ بیش بہا

اور اسبابِ خوش نما پر سے تم اپنی آنکھ اٹھانا نہیں چاہتے ، وہ انھیں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ۔ تم یہ خوب سمجھ لو کہ چیزوں میں خواہ کیسی ندرت اور حیرت ہو مگر روزمرّہ دیکھنے سے وہ نہ حیرت دلاتی ہیں نہ تعجّب ۔ اِس عالم کو دیکھو کہ اس میں آفتابِ عالم تاب کیا شانِ کبریائی اپنی دکھاتا ہے ۔ آسمان پر کیا کیا تعجب خیز چیزیں ہیں ۔ عادت نے ایسی مساوات کر دی ہے کہ ہم ان کو کبھی دیکھتے بھی نہیں ، تعجّب اور حیرت تو کیا کریں ۔ پس جب کُل عالم کا یہ حال ہو تو اس کے آگے کسی بڑے آدمی کے خانماں کی کیا بساط ہے ۔

غرض یہ بڑی غلطی ہے کہ ہم بڑے آدمیوں اور دولت مندوں کی خوشی پر حسد کریں ۔ ہم نہیں جانتے ہیں کہ ان کے دل کے اندر ایک گُھن لگا ہوا ہے جو ان کے دل کی خوشی کو کھائے جاتا ہے ۔ وہ حقیقت میں ہم سے زیادہ مصیبت زدہ ہیں ۔

۸ ۔ جو شخص پہاڑوں کی چوٹی پر چڑھتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ ان کی بلند چوٹیاں بادلوں اور برف سے گھری ہوئی ہیں ۔ ایسے ہی جو شخص کہ اور آدمیوں سے درجہ و رتبہ میں بلند ہو جاتا ہے یا ان کو محکوم بنا لیتا ہے ، وہ اپنے تئیں نیچے کے درجے کے آدمیوں کی حسد سے گھرا ہوا دیکھتا ہے ۔ اگرچہ اوپر آفتاب با شان و شکوہ بہت دور چمکتا ہے اور نیچے بہت دور زمین اور سمندر بچھا ہوا ہے مگر اس کے ننگے سر کے گرد برفی پہاڑیوں اور ہوا کے سخت طوفان برپا ہیں ۔

۹ ۔ دوسرے کی آسائش و آرام و خوش حالی سے نفرت کرنے کا نام حسد ہے ۔ حاسد اپنے بڑوں سے اس لیے جلتا ہے کہ وہ مجھ سے بڑے کیوں ہیں ، برابر کیوں نہ ہوئے ۔ اور اپنے چھوٹوں سے اس لیے حسد کرتا ہے کہ خوف ہے کہیں وہ اس کے برابر نہ ہو جائیں ۔ برابر

والوں سے اس لیے حسد کرتا ہے کہ وہ اس کی برابر کیوں ہیں۔ جب یہ حال ہو تو حسد سے دنیا کا تنزّل کیوں نہ ہو۔

۱۰- حاسد کی مت ایسی اُلٹ جاتی ہے کہ جن چیزوں سے اور لوگوں کو، جو حسد نہیں رکھتے، خوشی ہوتی ہے، اُس کو دلی رنج ہوتا ہے۔ جوانی، حسن، شجاعت، دانائی یہ سب خوبیاں اس کے دل میں کانٹے چبھوتی ہیں۔ وہ وہاں رنج کرتا ہے جہاں اس کو خوش ہونا چاہیے۔ وہ ایسے عالم میں رہتا ہے کہ اس میں جو شخص اپنی خوشی و خوبی حاصل کرنے میں سعی کرتے ہیں، وہ اسی میں آگ جلاتا ہے۔ کیا یہ کم بخت حالت ہے کہ وہ کسی شخص سے عداوت اِس سبب سے رکھے کہ اور لوگ اس سے محبت کرتے ہیں۔ حاسد کے دل کی اُس وقت تسلّی ہوتی ہے کہ کوئی بڑا نامور صاحبِ ہنر ایسی حرکت کرے کہ جو اُس کی شان کے لائق نہ ہو اور اس سے کچھ اس کے عیب و نقص ظاہر ہوں۔ یا کسی شخص نے کارِ عظیم کیا ہو مگر اس میں کوئی خلل ایسا پڑ جائے جس سے فقط وہی اکیلا اس کام کا کرنے والا نہ سمجھا جائے بلکہ اور لوگ بھی اس کے شریک جانے جائیں۔ مثلاً کوئی نظم ہو جس میں مصنّف نے اپنا نام نہ ظاہر کیا ہو تو حاسد، جو ایسی کتاب نہیں تصنیف کر سکتے، اس کے مصنّف بہت سے آدمیوں کو قرار دیں گے اور کہیں گے کہ کتاب کی طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُسی ایک شخص کی تصنیف سے نہیں جس پر لوگوں کا گمان ہے۔ اگر کسی حاسد سے کہو کہ فلاں آدمی بڑا امیر و دولت مند ہے تو اس کا منہ بگڑ جائے گا، مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہو کہ بچے بہت سارے اس کے ہیں تو البتہ کچھ صورت سنورے گی۔ حاسد کی خوشی کا حال ایسا ہے جیسا کہ نقل میں ایک جنّ کا حال لکھا ہے کہ اس کے مکان کی شان آنھی

آدمیوں کی ہڈیوں سے معلوم ہوتی تھی کہ جن کو مار کر اس نے ان کی ہڈیوں سے بنایا تھا ۔ پس دیکھ لو کہ حاسد کا رنج دلی، تسلی خاطر، دلی خوشی کیا ہے ؟ خدا کا شکر بھیجو کہ تمھارا دل حسد سے خالی مسکین بنایا ہے ۔ گو وہ چھوٹے چھوٹے کام کرتا ہے مگر بڑی لفظی طمطراق نہیں کرتا ۔

۱۱- **غرض و حسد میں فرق :** انسانوں میں جو باہم رقابت و عداوت قائم ہوتی ہے اس کے دو سبب ہوتے ہیں ؛ ایک غرض، دوسرے حسد ۔

جب ایک غرض میں بہت سے آدمی مشترک ہوتے ہیں تو وہ چند کو حاصل ہوتی ہے اور باقی اس سے محروم ہوتے ہیں، اس لیے کامیاب اور ناکام میں عداوت ہوتی ہے ۔ ہر شخص دولت، ناموری، حکومت چاہتا ہے مگر یہ سب چیزیں اضافی ہیں اس لیے وہ اوروں کی مفلسی، گم نامی، محکومی کا بھی آرزومند ہوتا ہے ۔ جب تک اور کم دولت مند نہ ہوں، اپنے دولت مند ہونے کا مزہ نہیں آتا ۔ غرض کی صورت میں اوروں سے منفعت حاصل کر کے اپنی برتری کی آرزو ہوتی ہے، مگر حسد کی حالت میں بغیر اپنی کسی منفعت کے اوروں کے گھٹ جانے کی تمنا ہوتی ہے ۔ ابتدائے نظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں تباہ اور غارت کرنے والی قوتوں میں غرض زیادہ قوی اور پُر تاثیر ہے، اس لیے کہ یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آتی ہے کہ آدمی کو اپنے خوش کرنے کا شوق بہ نسبت دوسرے کے خوش کرنے کے زیادہ ہوتا ہے ۔ انسان کا مقتضائے طبع ہے کہ چوری اپنی منفعت کے سبب سے زیادہ تر کرتا ہے، بہ نسبت اس کے کہ وہ غارت گری فقط شرارت کے لیے کرے ۔ لیکن در حقیقت غرض پر حسد غالب ہے ۔ فیاضی کے قدرتی قوانین کے خلاف جتنا حسد کام کرتی ہے، اتنا

غرض نہیں کرتی - بے عیب کاموں کی مذمّتیں اور دیانت مندی کے کاموں پر خیانت کی تہمتیں جو انسانوں پر مصیبتیں لاتی ہیں، اُن سے کوئی منفعت ان مصیبت لانے والوں کو نہیں ہوتی - وہ تو اُس ضیافت کے کھانے میں زہر ملاتے ہیں جس میں خود شریک نہیں ہوتے - غرض کا میدان تنگ ہے - معزول آدمیوں کے عہدوں کے چاہنے والے تھوڑے ہوتے ہیں، حسینوں کی جانشینی کی توقع کرنے والے تھوڑے ہوتے ہیں، اس لیے کہ ان کاموں کے لیے لیاقت ہونی ضروری ہے - مگر حسد کا میدان بے حد و پایاں ہے، اس کو اپنے اثر کرنے کے لیے کسی خارجی امداد کی ضرورت نہیں، کسی لیاقت کی حاجت نہیں - کاہلی و غرور سے وہ پیدا ہوتی ہے جو سب جگہ افراط سے موجود ہیں -

خود غرض جب کسی کو اپنی جگہ سے آ کھیڑے گا کہ اس کے قائم مقام ہونے کی لیاقت ہوگی اور اس کے کام کے سرانجام دینے کی لیاقت رکھے گا - مگر حسد تو ایک خیالی چیز ہے - اس میں لیاقت کی حاجت نہیں - آدمی خواہ کیسا ہی نالائق اور ناہنجار ہو، وہ نامردی اور حماقت سے حاسد بن سکتا ہے - جو غرض کے سبب سے گرتا ہے، اس کو بھوکے شیر بھنبھوڑتے ہیں - وہ اپنے دشمنوں کو دیکھ سکتا ہے اور ان سے مقابلہ کر سکتا ہے - مگر جو حسد کی کمین سے ہلاک ہوتا ہے، وہ اپنے حملہ آوروں کو نہیں دیکھ سکتا کہ ان سے مقابلہ کرے - اس کا دم گھٹ کر اس طرح نکل جاتا ہے جیسا کہ زہریلے بخارات میں -

غرض مندی کے ساتھ ہمیشہ محنت و مشقّت کی[1] جو کھوں لگی رہتی ہے - جو زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کو نقصان کا

۱- ”کی“ اضافہ مرتّب -

بھی خوف ہوتا ہے - اور جب وہ کسی بڑے سے کُشتی کر کے پچھڑتی ہے تو پھر کھڑی بھی نہیں ہو سکتی - مگر حسد کرنے میں نہ کچھ خرچ ہوتا ہے ، نہ کوئی خوف ہوتا ہے ، نہ کچھ محنت اُٹھانی پڑتی ہے - جس نیک نام کو چاہا اُس کو بد فرجام کہنے لگے - اس میں کچھ محنت کی ضرورت نہیں - جھوٹی بات کے کہنے میں خواہ وہ پکڑی جائے اور بدنامی ہو مگر اس کے پھیلانے میں کوئی مشقت نہیں اُٹھانی پڑتی - خلاصہ یہ کہ حسد سے جو نقصان ہوتے ہیں وہ غرض مندی سے نہیں ہوتے - غرض مندی میں تو منفعت بھی ہوتی ہے مگر حسد میں نقصان ہی نقصان ہوتا ہے -

۱۰۵- عشق و محبت

۱- زندگی بسر کرنے کے اندر عشق انسان کے کسی کام نہیں آتا مگر تھیٹر (تماشا گاہ) میں وہ بڑا تماشا دکھاتا ہے اور ناٹک کو خوب چمکا دیتا ہے ، مثنویوں کے لیے خوب خوب مضامین بنا دیتا ہے ، برائے شعر گفتن خوب است - انسان کے ساتھ تو وہ شرارتہ ٹھگینوں اور ڈائیوں[1] کی مانند کرتا ہے - جہاں تک حافظہ کام کر سکتا ہے وہاں تک زمانۂ گزشتہ و حال کسی ایسے[2] آدمی کو یاد نہیں دلاتا کہ وہ عاقل و فرزانہ بھی ہو اور عشق میں دیوانہ بھی[3] - اگر ڈھونڈ ڈھانڈ کر کوئی اس کی مثال نکال بھی لائے تو وہ مستثنیٰ صورت ہے جو ہر قاعدہ و قانون کے ساتھ لازمی ہے - آدمی اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ آسمان و زمین کی عمدہ عمدہ چیزوں کو دیکھ کر

۱- اصل : کذا - غالباً مراد یہ ہے کہ وہ (عشق) انسانوں کے ساتھ ٹھگوں اور دھوکا بازوں کی طرح شرارت کرتا ہے -

۲- اصل : ایسی -

۳- ''بھی'' اضافۂ مرتب -

ان پر غور کرے - بھلا یہ کب اس کو زیبا ہے کہ وہ بجائے اس کے فقط آنکھ کی پُتلی کو صنم بنا کر دل سے پرستش کیا کرے، جیسے جوپایہ اپنے منہ کی کرتا ہے؛ یعنی جیسے چوپایہ سارے دن منہ سے کھایا کرتا ہے، ایسے ہی آدمی اپنی آنکھوں سے معشوقوں کو نت دیکھ کر بُت بنایا کرے اور جن بڑے کاموں کے واسطے آنکھیں بنائی گئی ہیں ان کو چھوڑ دے - عشق اپنے زور کے آگے تمام مخلوق کو حقیر سمجھتا ہے - سب باتوں میں مبالغہ برا معلوم ہوتا ہے مگر عشق کی باتوں میں وہ بھلا لگتا ہے - انسان کا خوشامدی سب سے بڑا اس کا اپنا آپا ہے - وہ سب اور خوشامدیوں کو خوب جانتا ہے مگر عشق اس سے بھی زیادہ خوشامدی ہے، اس لیے کہ وہ معشوق کی ایسی خوشامد کرتا ہے کہ اپنا آپا بھی دل سے خوشامد آدمی کی نہیں کرتا -

جب عاشق معشوق سے محبت کرتا ہے تو معشوق یا[1] عاشق سے محبت کرنے لگتا ہے یا نفرت - اس دوسری حالت میں آدمی اپنے تئیں اور اپنی دولت و عقل سب کو برباد کرتا ہے - عاشقوں کے مصائب کو شاعر خوب بیان کرتے ہیں - جو عاشق معشوق پر مرتا ہے وہ اپنی حکومت و فراست کھوتا ہے - عشق و عقل ایک دل میں کسی طرح ساتھ نہیں رہ سکتے - عشق کمزوروں پر زبردستی کرتا ہے اور زبردستوں سے بھاگتا ہے - یہ امر شاذ و نادر ہے کہ کسی قوی دل کے دل میں کسی غفلت کے سبب سے عشق داخل ہو جائے، ورنہ وہ اکثر ضعیف القلب کو دباتا و ستاتا ہے - آدمی کو چاہیے کہ اپنے کاروبار میں ذرا بھی عشق کو دخل نہ دے - اگر وہ ایک دفعہ

۱- اصل میں ''یا'' کی بجائے ''کیا'' چھپا تھا -

کام کا سدِّ راہ ہو تو وہ دولت و مال کو برباد کر دے گا اور کسی کام کا انجام نیک نہیں ہونے دے گا۔ سپاہی زیادہ تر عاشق مزاج ہوتے ہیں، مگر یہ عشق ان کا ایسا ہوتا ہے جیسا کہ شراب کا پینا کہ جس سے یک گونہ انبساطِ خاطر ہو۔ اپنے نقصان کا معاوضہ خوشی سے ہو جائے۔ غرض یہ عشق فقط شہوت پرستی ہوتی ہے۔ انسان کو بالطبع رغبتِ دلی ہے کہ وہ اور آدمیوں سے موانست کرے۔ جب اپنی محبت کو ایک شخص یا چند شخصیتوں میں تقسیم نہیں کرتا تو بہت سے آدمیوں میں تقسیم کرتا ہے جس سے فقرا کی سی انسانیت اور سخاوت اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ زن و شوی کی محبت تو بنی نوع انسان کی بانی ہے اور دوستانہ موانست انسانیت کی تکمیل کرتی ہے مگر شہوت پرستی سے جو محبت پیدا ہوتی ہے وہ خانہ خراب ہوتی ہے۔

۲۔ جن آدمیوں کی یہ آرزو ہو کہ ہم ساری دنیا کے محب بنیں اور سارے عالم کو محبوب بنائیں تو ان کو لازم ہے کہ وہ اول نہایت گہری اور کامل محبت اُس شخص سے کریں جو اُن سے بہت اقرب[۱] ہے۔ اگر اُس اقرب سے وہ محبت نہیں کر سکتے جس کا نام محبت ہے تو وہ بعید سے کیا کریں گے۔ ستارہ جتنا بعید ہوتا ہے اس کی اتنی شعاعیں ضعیف آتی ہیں۔ پس جو آدمی کہ ساری دنیا کے آدمیوں کو اپنا محبوب بناتے ہیں، وہ درحقیقت کسی سے محبت سوائے اپنی ذات کے نہیں رکھتے۔

۳۔ محبتِ الٰہی: وہ دل کا نور ہے۔ ہمارے فہم کو روشن اور دل میں محبت و موانست کو گرم کرتی ہے۔ دماغ کو مُصفّا و مُجلّا

۱۔ اقرب = زیادہ قریب۔

بناتی ہے - روح کو وہ فراخی دیتی ہے جس میں دین اور دنیا کے امورِ حقّہ کو آدمی خوب دیکھ لیں - وہ حکمتِ نظری میں عمدہ معلّم و ادیب ہے اور عملی میں رہنما و ہادی ہے - کلامِ الٰہی کو ایسا سمجھاتی ہے کہ جس سے تمام شک و شبہے مٹ جاتے ہیں - وہی بتلاتی ہے کہ خدا کیونکر راضی رہتا ہے - قلب کے تمام معاملات کو فیصلہ کر کے طے کر دیتی ہے - مذہب میں جو مباحثے اور تکراریں ہوتی ہیں ، ان میں ثالث بالخیر پیدا کر دیتی ہے - خلاصہ یہ ہے کہ خدا کا خوف دانائی کا آغاز ہے ، اس کی محبت دانائی کا انجام و کمال ہے - وہی تمام علموں کی کُنجی ہے - خدا سے محبت جب تمھاری ثابت ہو گی کہ جو برا بھلا تمھارے آگے پیش آئے ، اس سے راضی رہو ، خدا کی طرف سے سمجھو ، اچھے کا شکر بھیجو اور برے پر صبر کرو - جو تازیانہ تمھاری پیٹھ پر پڑے ، اس کو ہونٹ بند کر کے بوسہ دو -

۴- محبت بھی کیا مسرّت ناک ہے - محبت سست کو چالاک ، بےخبر کو باخبر ، طامع کو قانع ، خاموش کو گویا ، غم زدہ کو خرّم و شاد بنا دیتی ہے - اگر کوئی یہ سوال کرے کہ جہاں محبت نہیں ہوتی وہاں خوشی بھی ہوتی ہے یا نہیں ؟ تو اس کا جواب یہ اکثر ضرور دیا جائے گا کہ جہاں محبت نہیں وہاں مسرت نہیں اور جہاں محبت ہے ، وہاں مسرت ہے - خوشی کے معنے یہ ہیں کہ کسی اچھی چیز سے محبت چاہیے - غم کے روکنے اور ہٹانے کے واسطے دوستوں کی محبت سے زیادہ کوئی چیز نہیں -

۵- دوستوں کی محبت ضرورت کے وقت زیادہ معلوم ہوتی ہے - روشن شمع سے دن کو کچھ فائدہ نہیں حاصل ہوتا مگر رات کو اس سے بہت کام نکلتے ہیں - اس کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ شمع کی روشنی

دن کو کم ہوتی ہے ، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ شام کو آفتاب کی روشنی نہیں ہوتی - یہی حال محبت کا ہے کہ سب وقت دوستوں میں وہ یکساں رہتی ہے مگر ضرورت و احتیاج کے وقت زیادہ وہ محسوس ہوتی ہے - محبت زیادہ نہیں ہوتی بلکہ اس کی احتیاج زیادہ ہو جاتی ہے - یہ احتیاج ہی دوست کی مدارات کی مبارک باد دیتی ہے اور اس کی قابلیت کے موافق قدر کراتی ہے - خوش حالی میں دوست کے[1] اخلاق و مدارا[2] کی ضرورت نہیں -

۶- عشقِ افلاطونی : ایک عشق تو ناعاقبت اندیش نوجوانوں کا ہوتا ہے کہ آنکھوں سے دیکھے ، نہ کانوں سے سنے - دوسرا عشق روحانی ہوتا ہے جس میں روح کا تعلق روح سے ہوتا ہے - اِس عشق کا محقّقِ اول افلاطون تھا - پیچھے اس کے مقلّد اور بہت سے اِس عشق کے باب میں ہوئے - وہ اُن آدمیوں میں ہوتا ہے جن کی سرشت میں شرافت و تقدّس پرلے درجے کی ہوتی ہے - اس کو نخوت اور تپاکِ ظاہری سے تعلق نہیں ہوتا -

۷- موت سے کچھ کم زورآور عشق نہیں ہوتا - نہ وہ کسی دریا کے پانی سے بجھ سکتا ہے ، نہ کسی سمندر کی طغیانی میں ڈوب سکتا ہے - وہ انسان کی خودی مٹاتا ہے ، خصائلِ انسانی کو مستحکم و شریف بناتا ہے ، زندگی کے کاموں کو عمدہ مقاصد کی طرف لے جاتا ہے - سچّی محبت پرستی ایسی عطیۂ الٰہی ہے کہ کوئی اور عطیّہ اس کی برابر انسان کو نہیں ملا - وہ ایسی متبرّک اور مقدّس آگ ہے کہ بتوں کے پاس نہیں جلانی چاہیے -

۸- ماں کی محبّت سب سے بڑھ کر ہے کہ نہ کبھی کم ہو ،

۱- "کے" اضافۂ مرتّب -
۲- مدارا = تواضع -

نہ کبھی بدلے، نہ کبھی تھکے - باپ بیٹے سے منہ پھیر لیتا ہے، بھائی بہن آپس میں سخت دشمن ہو جاتے ہیں، میاں بیوی ایک دوسرے کو چھوڑ دیتے ہیں، مگر ماں بیٹے کو نیک نامی اور بدنامی دونوں حالتوں میں یکساں چاہتی ہے - ماں[1] کو دنیا ملامت کرتی ہے مگر وہ اپنی محبت سے باز نہیں رہتی - اس کو ہمیشہ یہ امید لگی رہتی ہے کہ اب میرا بیٹا توبہ کرتا ہے اور نیک راہ پر چلتا ہے - اولاد کا پرانا رفیق ماں سے زیادہ کوئی نہیں ہوتا - وہ اُس روز سے کہ اُس کا نطفہ رحم میں پڑتا ہے، اس کی محافظ ہوتی ہے - وہ خوب یاد رکھتی ہے کہ جب میرا بچہ مسکراتا تھا تو میں شاد ہوتی تھی، جب وہ ہنستا تھا تو میرا دل باغ باغ ہوتا تھا، جب وہ کلکاریاں مارتا تھا تو میں خوش ہوتی تھی - اس کی جوانی کی اُمیدیں دل خوش کرتی تھیں -

غرض ماں اور اولاد کے درمیان وہ رشتۂ محبت مستحکم ہوتا ہے کہ وہ کبھی شکستہ نہیں ہوتا ہے - یہ وہ مبارک رشتہ ہے کہ جس کی قدر مہد[2] سے شروع ہوتی ہے اور اُس وقت ختم ہوتی ہے کہ ماں کو قبر میں دفن کرتے ہیں - یہ ماں ہی ہوتی ہے کہ کبھی ہم کو اپنی چھاتی سے جدا کرنا[3] پسند نہیں کرتی، کبھی ہم کو نہیں بھولتی - ہم گناہ کرتے ہیں تو وہ اس پر لعنت ملامت غصے سے نہیں کرتی بلکہ غم و رنج کھاتی ہے - غرض ماں صداقت و وفا کی تصویر ہوتی ہے - اس کی محبت سب محبتوں پر غالب ہوتی ہے - اس میں کبھی خود غرضی کے سبب سے فرق نہیں آتا - اولاد خواہ اس کا احسان نہ

۱- اصل میں یہاں لفظ ''بیٹے'' ہے مگر سیاق و سباق کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں لفظ ''ماں'' ہونا چاہیے -

۲- مہد = جُھولا -　　　۳- اصل : ہونا -

مانے اور نالائق ہو مگر اس سے اس کی محبت کچھ کم نہ ہوگی ۔ اس کی ساری خوشیوں کا مدار اولاد پر موقوف ہوتا ہے ۔ اس کی نیک نامی اور امارت اور ثروت سے وہ خوشی کے مارے پُھولی نہیں سماتی ۔ اگر اولاد مصیبت میں گرفتار ہو تو وہ زیادہ اس کی مددگار ہوگی ۔ اولاد کے لیے خوف سے نہیں ڈرے گی ۔ اگر لوگ اسے بد نام کرتے ہیں تو بھی وہ اسے پیار کرے گی ۔ اگر ساری دنیا چھوڑ دے تو بھی اس کے ساتھ رہے گی اور ساری دنیا اُسی کو سمجھے گی ۔

۹۔ آدمی کا دل ہمیشہ بدلتا رہتا ہے ۔ بعض دفعہ جس کو آج پیار کرتا ہے کل اُس سے نفرت کرتا ہے ۔ بہتر یہ ہے کہ محبت میں تیری رہ نما عقل و دانش ہو جو تجھ کو ہمیشہ سیدھا سادہ رستہ بتائے ۔ جیسے درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے ، ایسے ہی محبت اپنے ثمر سے جانی جاتی ہے ۔ اشرافانہ محبت ، خواہ اس میں خوشی ہو یا ناخوشی ، تمام زندگی کو عمدہ بنا دیتی ہے ۔ یہ محبت سب سے زیادہ خدا سے ، اپنے ملک سے ، اپنے بادشاہ سے ، اپنے خاندان سے ہونی چاہیے ۔

۱۰۔ ہر شخص اپنے تئیں دریافت کرنا چاہتا ہے ، مگر عاشق ہی اپنے تئیں پہچانتا ہے ۔ عشق ہی انسان کے دل کی تربیت ایسی کرتا ہے کہ وہ باقاعدہ ہو جاتا ہے ۔ عاقل کو چاہیے کہ وہ کسی نہ کسی چیز کو چاہے ۔ اگر وہ کسی چیز کو نہ چاہے گا تو ضرور دنیا اس کو ناخوش و ناگوار معلوم ہوگی ۔

۱۱۔ عشق کبھی تو ایسا احمق ہوتا ہے کہ وہ اپنے تئیں خود نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں ۔ کبھی وہ پاجی کمینہ ایسا ہوتا ہے کہ اپنا چہرہ روغن میں چھپا کے دکھاتا ہے ۔

۱۲۔ یونانیوں کے بُت خانوں میں عشق کے[1] بت کی صورت

۱۔ اصل : کی بُت ۔

ایک حسین اندھے بچے کی ہوتی ہے جس کے پہلو میں تیروں کا ترکش ہوتا ہے اور کمان ہاتھ میں ہوتی ہے - چاروں طرف تیر پھینکنا اس کا کھیل ہے مگر کسی کو اپنا نشانہ بنانے کا قصد نہیں کرتا ، جس سے یہ معلوم ہو کہ معشوق کا ارادہ عاشق کو تکلیف پہنچانے کا ہے - خود اس کا حسن ایسا دل لبھاتا ہے کہ بے اختیار اس پر پیار آتا ہے ، جیسا کہ پیارے بچے کی صورت پر آتا ہے - وہ خود آوروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے مگر بچپنے کے سبب سے اس کو خبر نہیں کہ میرا یہ حسن دل‌ربائی کر رہا ہے اور مجھ میں ایسی خوبی ہے کہ وہ آوروں کو فریفتہ کرتی ہے -

۱۳- زر نیست عشق ٹیں ٹیں[۱] : عشق بازی میں نہ شرافت کام آتی ہے ، نہ ذکاوت و ذہانت ، نہ لیاقت و فراست - فقط زر اس میں کام آتا ہے - وہی معشوقوں کی خرید و فروخت کرتا ہے - فقط اس لیے ، جس شخص نے اول زر نکالا ہے ، اس پر عاشق تبـّرا[۲] بھیجتے ہیں - زر کی برائی یہ کرتے[۳] ہیں کہ وہی ایک بھائی کو دوسرے بھائی کا جانی دشمن بناتا ہے ، بیٹے کو باپ سے لڑاتا ہے ، سب سے زیادہ یہ غضب ڈھاتا ہے کہ معشوقوں کو عاشقوں سے چھُڑاتا ہے -

۱۴- عشق کی پیدائش : جب حُسن پیدا ہوا تو اس کی َچھٹی[۴] بڑی دھوم دھام سے ہوئی - بہت سے مہمان بلائے گئے - ان میں دولت بھی گئی جو عاقبت اندیشی کی صاحب زادی تھی اور بہت سی خوبیاں

۱- یعنی دولت کے بغیر عشق کامیاب نہیں ہو سکتا -
۲- تبـّرا = لعنت ، پھٹکار ، اظہارِ بیزاری -
۳- یہ کرتے ہیں : یعنی اس طرح کرتے ہیں -
۴- َچھٹی : بچے کی ولادت کے َچھٹے روز خوشی کی ایک تقریب منائی جاتی ہے جسے َچھٹی کہتے ہیں -

رکھتی تھی - جب اِس چھٹی کی دعوت کا جلسہ ختم ہوا تو جیوپی طر[1] کے باغ میں سب مہمان سیر کو چلے گئے - مہمانوں میں افلاس بھی ایک مہمان تھا - اس نے دیکھا کہ دولت ایک سیج پر بڑے چین سے سوتی ہے - اس سے وہ ہم بستر ہوا - ان دونوں سے عشق پیدا ہوا - اس لیے عشق میں ماں (دولت) کی طرف کا اثر یہ ہے کہ وہ سازشیں اور تدبیریں اور حکمتیں کرتا ہے اور باپ (افلاس[2]) کا اثر یہ ہے کہ وہ گدائی کرتا ہے، زمین پر لوٹتا ہے، اپنے تئیں خاک میں ملاتا ہے، ہر طرح کی ذلّت و خواری اُٹھاتا ہے - اِن ماں باپوں (دولت و افلاس) کے اثر سے اس میں متضاد صفات موجود ہوتی ہیں -

۱۵- انسان خیال کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے - وہ ایک لحظہ بھی خیال سے خالی نہیں رہتا - مگر فقط خیالات سے اس کی زندگی بسر نہیں ہوتی - خالی خیالات خواہ کیسے ہی نیک اور خوش کرنے والے ہوں، وہ دل کو سست و پست کر دیتے ہیں - اب انسان کی ہوائے نفسانی جو افعال پر متحرّک کرتی ہیں[3]، دو ہیں : ایک محبت، دوم جاہ : یعنی اپنی برتری کی خواہش - اِنھی سے آدمی کی خصلت پہچانی جاتی ہے، اور وہ غیروں پر اور اپنے اوپر بہت اثر کرتی ہیں - ان کی بڑی عمیق چشمی دل کے اندر ہوتی ہے جو افعال پر متحرّک کرتی

۱- جیوپی طر یا جیوپیٹر : قدیم رومنوں کا ایک معبود دیوتا جو ان کے نزدیک تمام خداؤں کا باپ اور سردار تھا - آسمانوں کا رب اور آسمانی بجلی کا حاکم - یونانی اسے زیوس (Zeub) کہتے تھے - نیز ایک سیارہ جسے عربی میں مشتری کہتے ہیں (المنجد) -

۲- ''افلاس'' میں قوسین مرتّب کا اضافہ ہے -

۳- کذا - مطلب یہ ہے کہ انسان کی نفسانی خواہشات اُسے جن کاموں پر اُکساتی ہیں یا ترغیب دیتی ہیں، وہ دو ہیں -

ہے[1] اور ان میں بڑی زبردست قوّت ہوتی ہے - یہ دونوں ہوائے نفسانی گو ساتھ ساتھ ہمیشہ رہتی ہیں مگر متّحد نہیں ہوتیں - گو وہ ایک دوسرے کو فنا نہیں کرتیں مگر ضعیف ضرور کرتی ہیں - خواہ انسان کا قلب کیسا ہی وسیع ہو ، اس میں ایک ہوائے نفسانی ، محبت یا جاہ ، خوب وسعت کے ساتھ پھیل سکتی ہے - مگر جب دونوں اس میں آتے ہیں تو ہر ایک تنگ وسعت میں پھیلتا ہے - انسان کے دل میں اپنی محبت پوری سماتی نہیں اس لیے وہ اس سے باہر نکل کر خارج کی[2] اشیا پر جاتی ہے - یہ محبت اس لیے دو چیزوں پر زیادہ ہوتی ہے ؛ ایک حسانت پر اور دوسری کمال پر -

خدائے تعالٰی نے انسان کی برابر کسی کو حسین نہیں بنایا - اس کے چہرے کا سایہ بھی دوسری مخلوق میں نظر نہیں آتا - پھر انسان میں بھی عورت کے حسن کو برتری ہے - اس کو خدا تعالٰی نے عقل دی ہے - وہ مرد کا عجب زندہ پرتو ہے - جب عورت کا جی چاہے ، وہ مرد کا دل خوش کر سکتی ہے - اس کے ادا و انداز ، دل آویز اور دلکش ہوتے ہیں ، کوئی اس کی برابری دلربائی و دلبری میں نہیں کر سکتا - ہر دل میں اس کی رسائی ہوتی ہے - جس دل میں چاہے ، وہ بس جائے - عشق کی عمر کچھ نہیں ہوتی ، وہ نت نیا پیدا ہوتا ہے - شاعر اِسی لیے اس کو بچہ کہتے ہیں - عشق سے عقل و ذہانت بڑھتی ہے اور اس کی تقویت عقل ہی سے ہوتی ہے - ہر روز وہ ہماری حفاظت کو چھوڑتا ہے اور پھر ازسرِ نو اختیار کرتا ہے -

اگر انسان تنہا ہوتا تو بڑا ہی ناقص الوجود ہوتا - کوئی

۱- اصل میں جملہ یوں تھا : ''ان کی بڑے عمیق چشمی دل کے اندر ہوتی ہیں جو افعال پر متحرّک کرتے ہیں -"

۲- اصل : کے اشیا -

ذی حیات اس کی برابر کم بخت نہ ہوتا - اس کو اپنی خوشی کے لیے ہمراہیوں کی سخت ضرورت ہے - وہ اپنے حوائج اور تمناؤں اور آرزوؤں کو بغیر اوروں کی مدد کے پورا[1] نہیں کر سکتا ، اس لیے وہ اوروں کی تلاش کرتا ہے - کبھی وہ عشق اُن چیزوں سے رکھتا ہے جن تک رسائی اس کی قدرت سے باہر ہوتی ہے - جب اس میں مایوسی ہوتی ہے تو وہ اس کو چھپاتا ہے اور اس لیے اندر ہی اندر اس کے دل کو گھُن لگ جاتا ہے - آدمی جب اپنے سے کسی اعلیٰ درجے کے معشوق کے[2] ساتھ محبت کرتا ہے تو اس محبت کے ساتھ اپنی برتری کی آرزو بھی شامل ہوتی ہے ، مگر اس پر محبت غالب ہوتی ہے - وہ ظالم بادشاہ کی طرح اپنے حریف کو نہیں دیکھ سکتی - ساری[3] دل کی آرزوئیں اس کے تابع ہوتی ہیں اور اس کے حکم کی منتظر رہتی ہیں - سارا دل اپنے سے اعلیٰ درجے کے معشوق کی محبت سے پُر ہو جاتا ہے - مگر اپنے سے کمتر یا برابر درجے کی محبت ایسی ہوتی ہے کہ وہ دل کے ظرف کے ایک کونے میں پڑی رہتی ہے -

محبت کا اول کام یہی ہے کہ وہ بڑا ادب پیدا کرے - جن سے ہم محبت رکھتے ہیں ، ضرور اُن کا ادب کرتے ہیں - جب ہم کسی پر عاشق ہوتے ہیں تو اس کی بڑی قدر کرتے ہیں اور اپنے سارے کاموں کو اس کے خوش کرنے کے واسطے وقف کر دیتے ہیں - مگر جب معشوق متواتر بے وفائیاں کرتا ہے تو عشق میں پژمردگی آ جاتی ہے - اُس وقت جو مصیبت عاشق پر گزرتی ہے ، اُس کا حال

۱- اصل میں ''پورا'' کی بجائے لفظ ''دور'' تھا -

۲- اصل : ''اعلیٰ درجے کے ساتھ محبت کرتا ہے -'' الفاظ ''معشوق کے'' مرتّب کا اضافہ ہیں -

۳- اصل : سارے -

بیان نہیں ہو سکتا - یہ عشق دشمنِ جانی ہو جاتا ہے اور دل کے سو سو ٹکڑے کرتا ہے -

معشوق تمام دوستوں ، مربّیوں ، عزیزوں کو بھلا دیتا ہے - عاشق کو سوائے معشوق کے کسی اَور کی ضرورت ہی نہیں معلوم دیتی - دل ایسا عشق سے معمور ہوتا ہے کہ کسی بے آرامی اور رنج کے لیے جگہ ہی نہیں رہتی -

عشق و عقل ایک دوسرے کی ضد نہیں - عشق کبھی بے دلیل کے نہیں ہوتا - عشق سے کبھی عقل خارج ہی نہیں ہو سکتی ، وہ ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ ہی نہیں سکتے - اگر عشق میں عقل نہ رہے تو پھر انسان انسان نہ رہے ، وہ ایک بھدی کل بن جائے - یہ شاعروں کی بے عقلی ہے کہ وہ عشق کو عقل کی ضد بتلاتے ہیں اور اس کو اندھا کہتے ہیں - ذرا اس کے چہرے پر سے نقاب اُٹھا دو تو وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے - عاشقوں کی اُن تدابیر سے ، جو وہ معشوق کے بس میں لانے کے لیے کرتے ہیں ، معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسے عاقل ہوتے ہیں - عاشق جب اپنے محبوب سے جدا ہوتا ہے تو بہت سی باتیں بناتا ہے ، لیکن اس کے روبرو سٹّی بھول جاتا ہے - اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب وہ دور ہوتا ہے تو عقل میں خلل نہیں ہوتا - جب وہ نظر کے سامنے ہوتا ہے تو طبیعت سوچ بچار میں رہتی ہے[1] - عشق میں بڑا خوف یہ لگا رہتا ہے کہ کبھی معشوق ہمارے بس سے نہ نکل جائے - اس خیال سے ہوش خطا ہو جاتے ہیں - عشق کے خوف و رجا[2] بڑے ہی تکلیف پہنچاتے ہیں - معشوق کے عشق سے جو فائدے عاشق کو معلوم ہوتے ہیں ، ان کے قائم رہنے کا

۱- اصل : کذا -

۲- خوف و رجا = اُمید و بیم -

یقین نہیں ہوتا ، اِس میں ان کا کلیجا دھڑکتا رہتا ہے ۔

۱۰۶ ۔ اعلیٰ درجے کے عہدے

۱۔ اعلیٰ درجے کے عہدے جو لوگ پاتے ہیں ، وہ تین چیزوں کے نوکر بنتے ہیں : اول بادشاہ یا سلطنت کے ۔ دوم شہرت و ناموری کے ۔ سوم خود عہدے کے کاموں کے ۔ اِس سبب سے نہ خود ان کی ذات کو آزادی رہتی ہے ، کیونکہ وہ بادشاہ کے ہاتھ بِک جاتے ہیں اور اس کے بس میں ہوتے ہیں ۔ نہ ان کو اپنے کاموں میں آزادی ہوتی ہے ، اس لیے کہ[1] وہ سب ناموری اور شہرت کے لحاظ سے مرتّب کرنے پڑتے ہیں ۔ نہ اُن کی اوقات میں آزادی ہوتی ہے ، اس لیے کہ وہ عہدے کا کام ان کا پیچھا ایک لمحہ نہیں چھوڑتا ۔ یہ بھی انسان کی عجب آرزو ہے کہ اپنی آزادی بیچ کر اَوروں پر حکومت خریدنی اور خود اپنی ذات پر بے اختیار ہو کر اَوروں پر اختیار حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ اعلیٰ درجے کے عہدوں پر پہنچنے میں بڑی محنت اور مشقّت اُٹھانی پڑتی ہے اور پھر پہنچ کر اَور مشقّت پر مشقّت بڑھ جاتی ہے ۔ کبھی اِن اعلیٰ عہدوں کی عزت بڑے کمینہ پن اور ذلّت کے کاموں کے کرنے سے حاصل ہوتی ہے ۔ غرض ایسے عہدوں کا حاصل کرنا اور ان پر بحال رہنا اور معزول ہونا ، اِن سب حالتوں میں[2] تکلیف و محنت موجود ہے ۔ قیام اُن پر بے ثبات ہے ، تنزّل ہونا ، معزول ہونا اوندھے منہ گرنا ہے یا گرہن لگنا ہے ، جس سے وہ افسردگی اور ملال ہوتا ہے کہ اِس ضرب‌المثل پر عمل کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ”جب ہم وہ نہیں رہے جو پہلے تھے تو کوئی عقل کی بات نہیں ہے کہ ہم

۱۔ ”کہ“ اضافۂ مرتّب ۔

۲۔ اصل : ”ان سب حالتوں میں اس میں تکلیف . . .“

اَور زیادہ جینے کی آرزو کریں ۔" بہ مقتضاے عقل جب ملازمت کا چھوڑنا لازم ہوتا ہے تو بھی ان کا دل کبھی نوکری چھوڑنے کو نہیں چاہتا ۔ مگر ہاں ، جب وہ بیماری اور بڑھاپے سے مجبور ہوتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ اب ہم ملازمت کی دھوپ سے بچ کر اپنے گھر کی چھت کے سایے تلے بیٹھیں ۔

بڑے عہدے داروں کو ضرورت پڑتی ہے کہ وہ اپنے خوش کرنے کے لیے اَوروں کی رائے کو مستعار لیں ۔ جب وہ اپنے کاموں کی نسبت لوگوں کی رائے اچھی سنتے ہیں تو دل میں بہت خوش ہوتے ہیں ، لیکن اگر اس کے برعکس صورت ہوتی ہے تو[1] رنجیدہ دل ہونے میں اول اور اپنی خطا پانے میں آخر ہوتے ہیں[2] ۔ جب اعلیٰ درجے کی ، "آدمی کو ، امارت حاصل ہوتی ہے تو وہ اپنے حال سے ناواقف رہتا ہے ۔ کاموں کی سرگردانی میں ایسا پھنسا رہتا ہے کہ اپنی جسمانی اور روحانی صحت کی بھی خبر نہیں رہتی ۔ اُس شخص کی موت بڑی سخت ہوتی ہے جس کو اَور سب خوب جانتے ہیں مگر وہ اپنے تئیں نہیں جانتا ۔

آدمی کو اعلیٰ عہدے میں بُرائی اور بھلائی کرنے کا اختیار ہوتا ہے ۔ برائی کرنا تو خدا کی لعنت کا اپنے اوپر لینا ہے مگر بھلائی کرنے کی قدرت حاصل کرنی انسان کی سچّی آرزو ہے ۔

دو طرح کے آدمی اعلیٰ عہدوں پر پہنچتے ہیں ؛ ایک تو وہ

۱۔ "تو" اضافۂ مرتّب ۔

۲۔ یہ جملہ اصل میں یوں ہی چھپا ہے ۔ غالباً کاتب سے کوئی لفظ رہ گیا ہے یا عبارت آگے پیچھے ہو گئی ہے ۔ بظاہر مفہوم یہ ہے کہ اگر لوگوں کی رائے ان کے کاموں کی نسبت اچھی نہ ہو تو رنجیدہ خاطر ہوتے ہیں اور اپنی کوتاہی معلوم ہونے پر ختم ہو جاتے ہیں ۔ حالانکہ یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ کوئی شخص محض اپنی خطا معلوم ہونے پر آخر ہو جائے ۔

ہیں جنھوں نے اس سوچ بچار میں اپنا وقت صرف کیا ہے کہ کیونکر اعلیٰ عہدے وہ حاصل کریں - دوسرے وہ ہیں کہ اس خیال میں رہتے ہیں کہ جب عہدے حاصل ہو جائیں تو ان کے کام کیونکر سر انجام دیں - اول قسم کے لوگوں کو جب عہدے مل جاتے ہیں تو وہ پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں ، کیونکہ قاعدہ ہے کہ سچی اطاعت کا ہنر سچی حکومت کا رہنما اور ہادی ہے - مصرع

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

دوسری قسم کے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جس دولت کے حاصل کرنے میں اُنھوں نے اپنی عمر کا عمدہ حصہ کھویا ، جب وہ ہاتھ لگی تو یہ نہیں جانتے کہ اسے کیا کریں - جو آدمی نیک خیالات کرتے ہیں ، گو وہ خدا کے نزدیک مقبول ہوں ، مگر وہ نیک خیالات جب تک عمل میں نہ آئیں تو مثلِ خواب ہیں - اور عمل میں وہ جب آئیں گے کہ آدمی کو اختیار اور اقتدار کے عہدے حاصل ہوں - اور موقعے مفید اور حکومت کی جگہ ان کے کرنے کے لیے میسّر ہوں[۱] -

جب آدمی اعلیٰ عہدے پر پہنچے تو اُس کو پہلے زمانے کے بزرگ و عقل مند عہدہ داروں کی ، جن کے ہزاروں احکام موجود ہیں ، تقلید کرنی چاہیے - پھر خود کام کو اِس خوبی و خوش اسلوبی سے سر انجام دینا چاہیے کہ تھوڑے دنوں میں لوگ خود اس کو قابلِ تقلید سمجھنے لگیں - جن عہدے داروں نے کام کو بُری طرح کیا ہے ، ان پر لعنت ملامت نہ کر ، بلکہ اُن سے یہ سیکھ کہ کن چیزوں سے اپنے عہدے کی خدمات میں مجھے بچنا چاہیے - بہرحال[۲] اپنی

۱- اس جملے میں بھی کاتب سے کوئی سہو ہوا ہے -
۲- اصل : ہرحال -

اصلاح میں سعی کر۔ پہلے زمانے کو اور اُس کے عہدے داروں کو اپنی شیخی و تعلّی کے لیے بُرا نہ کہہ۔ اپنے میں ایسی خوبیاں پیدا کر کہ ہر مخلوق واہ واہ کہہ کر تیری[1] پیرو ہو جائے۔ ہر چیز کی اصل اور تہہ پر پہنچ اور سمجھ کہ اس کی ترقی کیونکر ہوئی اور تنزّل کس وجہ سے ہوا، اور زمانۂ گزشتہ اور حال دونوں سے صلاح و مشورہ لے؛ پہلے زمانے سے یہ کہ کیا اُس میں سب سے اچھا تھا اور زمانۂ حال سے یہ[2] کہ کیا اس کے لیے مناسب ہے۔ اپنے طریقے کو ایسا باقاعدہ بنا کہ لوگ جو تجھ سے کام کرنے کی تمنّا کریں وہی تُو کرے۔ مگر اِس اپنے طریقے کی پابندی میں ایسے ہٹیلے اور متعصّب بھی نہ ہو کہ کبھی اس سے ضرورت کی حالت میں بھی انحراف نہ کرو۔ غرض زمانۂ حال اور گزشتہ کو دیکھ کر عقل کے مطابق کام کرو۔ تم اپنے عہدے کے حقوق بھی قائم رکھو اور اپنے ماتحت کے استحقاق اور خدمات کی قدر و منزلت بھی[3] کرو۔ نئی باتیں ایجاد کرنے کے درپے نہ ہو۔ زیادہ تر خاموشی اختیار کرو۔ نوایجاد باتوں کا اظہار لوگوں کو چوکنّا[4] بناتا ہے۔ پہلی باتوں سے ان کو ایسی محبت و موانست ہوتی ہے کہ تم اس میں جو ایجاد کرتے ہو، وہ برا معلوم ہوتا ہے۔ مگر کبھی عوام کی غلط رائے کے موافق تم کو کام کرنا نہیں چاہیے۔ تم کو خود جاننا چاہیے کہ کسی زمین کا جوہر کیا ہے اور کون سا درخت اس میں خوب نشو و نما پا سکتا ہے۔ گو عوام اسے نہ جانتے ہوں، تم ایسے درخت کو بو کر اس کا بارور ہونا دکھا دو گے۔

۱۔ اصل: تیرے۔
۲۔ ''یہ'' اضافۂ مرتّب۔
۳۔ ''بھی'' اضافۂ مرتّب۔
۴۔ غالباً یہاں چونکنا مراد ہے۔

تم کو چاہیے کہ اپنے ماتحتوں کو اپنا کام اعلیٰ درجے کا سکھاؤ، نہ یہ کہ خود ادنیٰ درجے کے بن کر ان کا کام کرنا شروع کرو۔ ماتحت برابر اونچے ہونے سے جتنے خوش ہوں گے، اُتنے تمھارے نیچے ہو کر برابر بیٹھنے سے راضی نہیں ہوں گے۔ اپنے عہدے کی خدمات میں اُن کے صلاح و مشورہ سے مدد لو۔ وہ جن باتوں کے میاں جی بنیں، اُن میں سے جو اچھی باتیں ہوں، ان کو انتخاب کر لو۔ اعلیٰ درجے کے عہدہ داروں کو اپنے ماتحت نوکروں کے رکھنے میں بڑی دقّت پڑتی ہے۔ جو امیدوار عہدوں کے ہوں، ان میں اُن لوگوں کو نوکری دو جو اپنے حقِ خدمت کے ادا کو فرض جانتے ہوں اور کام کی لیاقت اور عہدے سے مناسبت رکھتے ہوں۔ گو عوام اس معیار پر ہمیشہ اعتراض کرتے رہیں گے کیونکہ وہ خود اس کو نہیں جانتے۔

۲۔ اعلیٰ درجے کے عہدوں میں چار بڑی برائیاں ہیں، ان سے بچنا چاہیے: اول تاخیر سے، دوم رشوت لینے سے (بلکہ اس کے شبہے سے)، سوم ناہمواری سے، چہارم ملائمت سے۔

اول، تاخیر سے لوگوں کو کاموں میں دخل یابی کا موقع ملتا ہے۔ ہر کام کے لیے جو اول وقت مقرر ہو سکے، مقرر کرنا چاہیے۔ اگر ضرورت کے سبب سے نہ ہو سکے تو کاموں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔

دوم، رشوت کے باب میں تم کو اپنے اور اپنے ماتحتوں ہی کے ہاتھ نہیں باندھنے چاہئیں بلکہ اہلِ معاملہ و مقدمہ کے بھی، کہ وہ رشوت دینے کے واسطے کھول ہی نہ سکیں، اور اُن کو یہ شبہ بھی نہ ہو کہ کوئی رشوت لیتا ہے کہ اس کے دینے کی جرأت کریں۔ جو حاکم ایسے متلوّن مزاج ہوتے ہیں کہ وہ اپنی رائے کو بغیر کسی سببِ ظاہری کے بدلتے ہیں تو ان پر رشوت ستانی کا شبہ ہوتا

ہے - اس لیے تم کو چاہیے کہ جب اپنی رائے بدلو تو اس کا اقرار اور اظہار وجوہ کے ساتھ کرو اور کوئی بات اس میں نہ چھپاؤ - کسی دوست اور عزیز کی قدر و منزلت اِتنی نہ کرو کہ جس سے لوگوں کو یہ شبہ ہو کہ اس کی معرفت رشوت لیتے ہو اور تم نے اس کو اپنی رشوت ستانی کا آڑتیا[1] بنا رکھا ہے -

سوم ناہمواری : اعلیٰ عہدہ دار جو ناہموار ہوتا ہے ، تو بے ضرورت اس سے لوگ ناراض ہو جاتے ہیں - اس کی سختی سے خوف پیدا ہوتا ہے مگر ناہمواری سے نفرت پیدا ہوتی ہے - عہدہ دار کو چاہیے کہ وہ اپنے منصبِ حکومت کے موافق لوگوں کو لعنت ملامت نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کیا کرے ، نہ طعن و تشنیع کے ساتھ -

چہارم ملائمت : حاکم میں ملائمت رشوت سے بھی زیادہ بُری ہوتی ہے - رشوت کی صورت تو کبھی کبھی ہوتی ہے مگر ملائمت کا حال یہ ہے کہ جہاں اس کی تحریک ہوئی تو اس سے ناحق مہربانیاں اور رعایتیں ہونے لگتی ہیں ، جیسے مُسرف کی فیاضیاں - اعلیٰ عہدہ دار ہو کر موم کی ناک بننا اپنے حق میں کانٹے بونے ہیں - اس سے بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں - حضرت سلیمان[2] کا قول ہے کہ آدمیوں کی ذات کا لحاظ پاس کرنا اچھا نہیں ، کیونکہ ایسا آدمی ایک روٹی کے ٹکڑے کے لیے خطا و گناہ کرے گا -

عہدہ پانے سے آدمی کے بعض خصائل اصلاح پاتے ہیں اور

۱- آڑتیا : موجودہ املا ''آڑھتیا'' ہے ، یعنی کمیشن ایجنٹ -

۲- حضرت سلیمان[ع] : حضرت داؤد[ع] کے بیٹے جو خود بھی نبی تھے - سلیمان الحکیم بھی مشہور تھے - یوروشلم کا ہیکلِ سلیمانی آپ ہی کا بنا کردہ تھا -

بعض بگڑ جاتے ہیں - آدمی کے عیب و صواب عہدہ پانے پر خوب کھل جاتے ہیں - بعض عہدہ دار اپنی خوبیوں کو دکھا کر اچھے معلوم ہوتے ہیں ، بعض برائیوں کو بتلا کر بُرے - بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو لوگ لائقِ حکومت سمجھتے ہیں لیکن جب وہ حکومت کے عہدے پر مقرر ہوتے ہیں تو ایسے کام کرتے ہیں کہ اگر وہ حاکم نہ ہوتے تو ان کی فیّاضی اور لیاقت کے قائل لوگ رہتے - عزت کا گھر نیکی میں ہے - قانونِ فطرت ہے کہ چیزیں اپنے مرکز کی طرف بڑی تیزی سے حرکت کرتی ہیں اور مرکز پر پہنچ کر ساکن ہو جاتی ہیں - ایسے ہی نیکی اولوالعزمی میں بہت تیز و تند حرکت کرتی ہے اور حکومت پر پہنچ کر ساکن ہو جاتی ہے - اعلٰی عہدے پر پہنچنے کی راہ ایک پیچ دار نردبان[1] ہے - اگر اس پر چڑھنے میں دیکھے کہ جھگڑے اور فساد پیش آتے ہیں تو آدمی کو چاہیے کہ وہیں تھم جائے جہاں جانے کہ میں یہاں تُلا رہوں گا - جہاں پارٹی یعنی فریق بن کر مخالفت اور فساد کھڑے ہوتے ہیں وہاں آدمی کو بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں - جو لوگ یہ مصلحت[2] بتاتے ہیں کہ آدمی دونوں کے بیچ میں کھڑا رہے تو وہ غلطی کرتے ہیں - اِس صورت میں آدمی ”زیں سُو رانده و زاں سُو مانده“ ہو جاتا ہے - قاعدہ ہے کہ جب فرقے مخالف کھڑے ہو جاتے ہیں تو ہر طرف کچھ باتیں سچ ہوتی ہیں ، کچھ جھوٹ - طرفَین میں سے جو باتیں سچ ہوں ، ان کو انتخاب کر کے ان کا طرف دار ہو جائے ، کسی فریق کی طرف نہ ہو - یہ سمجھ لے کہ فریقَین موجود ہی نہیں ہیں ، گو

۱- نردبان = سیڑھی ، زینہ -

۲- ”مصلحت“ بمعنی صلاح و مشورہ استعمال ہوا ہے -

عہدہ کسی فریق میں ہونے سے ملا ہو۔

۳- جو بلند مرتبہ تجھ سے پہلے گزرے ہوں اور جو تیرے شریک ہوں ، اُن سب کی عزت و تعظیم و ادب کر۔ جو تیرے شریک ہوں ، اُن کو ُبلا جس وقت اُن کو بلانے کی اُمید بھی نہ ہو ، اور جس وقت بلانے کی امید ہو تو اُن کو خارج نہ کر۔ اپنے عہدے کے آداب کو ملاقاتِ خانگی میں کام میں نہ لاؤ۔ ایک شخص گھر پر ملاقات کو آئے تو اس سے ملاقات کرنے میں وہ برتاؤ برتو جو اپنے عہدے کی حیثیت سے برتتے ہیں ۔ اُس سے کہہ دینا چاہیے کہ جب ہم اپنے عہدے کے کام پر بیٹھتے ہیں تو اَور آدمی ہوتے ہیں اور اپنے گھر پر اَور۔

۴- اعلیٰ عہدہ سلطنت کی بساط میں پیادہ نہیں ہوتا بلکہ وہ انتظامِ الٰہی کی بساط میں پیادہ ہوتا ہے۔ عہدہ آدمی کی برائیوں بھلائیوں کو کھول دیتا ہے۔ نیکیوں کو مہمیز مارتا ہے اور برائیوں پر لگام لگاتا ہے۔

جب تک عہدہ دار کے آگے برتر عہدے کا میدان نہ کھلا ہو ، وہ یہ نہیں جان سکتا کہ میں نے میدانِ نیکی کی دوڑ میں کہاں تک ترقی کی۔ عہدہ ہم کو اُن چیزوں کے درست کرنے کے قابل کرتا ہے جن کے لیے آرزو کرنی نہیں چاہیے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم کوئی حکومت ہی نہ رکھیں۔ عہدہ پانے سے اَوروں کی رائے پر عہدہ دار کی خوشی موقوف ہوتی ہے اور اس کی آزادی اَوروں کے ہاتھ بک جاتی ہے۔ مگر دنیا میں سب سے بڑی یہ نعمت ہے کہ ہم خوش ہوں ، اور اس سے زیادہ یہ کہ ہم اَوروں کو خوش کریں ، سو یہ بات حکومت کے عہدے میں نہیں ہوتی۔

۵- بادشاہ نائبِ خدا ہے۔ جو اس سے سرکشی کرتا ہے ، وہ

خدا سے بغاوت کرتا ہے - اس کا اثر سلطنت پر وہ ہوتا ہے جو ستاروں کا آسمان پر - اس کو مثلِ اجرامِ فلکی کسی وقت گردش سے آرام نہیں ملتا ، گو ان کی تعظیم و تکریم بڑی ہوتی ہے -

۱۰۷- بہادری

انسان کی سرشت میں دانائی سے زیادہ حماقت ہے ، اس لیے اس کے کاموں میں حُمق بہ نسبت دانش مندی کے زیادہ ظاہر ہوتا ہے - جو قوائے نفسانی حماقت کے کام کراتے ہیں ، وہ اس پر زیادہ تر اختیار رکھتے ہیں - پس یہ بہادری بھی اِسی قسم میں سے ہے جو جہالت کے کام زیادہ کراتی ہے - بہادری کی ماں جہالت اور حماقت ہے - وہ انسان کی اَور قوّتوں سے کم درجہ رکھتی ہے مگر باوجود اس کے وہ اُن سب لوگوں کے ہاتھ پاؤں باندھ لیتی ہے جو ضعیف الرائے اور بے ہمّت ہوتے ہیں - وہ اُمورِ سلطنت میں عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں اور تماشا دکھاتے ہیں - جیسے اناڑی حکیموں کے دو چار نسخے اور تجربے جسمِ انسانی کے کام آ جاتے ہیں ، ایسے ہی ان بہادروں کے کچھ کام سلطنت کے لیے بکار آمد ہوتے ہیں - گویا وہ بھی بدنِ سلطنت کے واسطے اناڑی نیم حکیموں کا حکم رکھتے ہیں - دونوں صورتوں میں یہ کامیابی اُصولِ علمیہ و حکمیہ پر مبنی نہیں ہوتی ، اس لیے وہ مستقل و پائدار نہیں ہوتی - بڑے بڑے کاموں کے کرنے کے دعوے بہادرانہ کرتے ہیں اور جب ان میں ناکام رہتے ہیں تو نہ شرم کرتے ہیں ، نہ پھر ان کے کرنے کی پروا رکھتے ہیں - وہ ایک بازیچہ اربابِ دانش کے ہوتے ہیں - بہادری اندھی ہوتی ہے ، وہ خوفوں اور تکلیفوں کو نہیں دیکھتی - اس وجہ سے وہ صلاح و مشورہ کار اچھی نہیں ہوتی ، مگر کارکن خوب ہوتی ہے - کیونکہ صلاح و مشورہ میں

مقدم امر یہ ہے کہ خوف و اندیشے تمام دیکھے جائیں ، مگر کارکنی میں ان پر کچھ خیال نہیں ہوتا ، خواہ وہ کیسے ہی بڑے ہوں ۔ اِسی وجہ سے بہادر آدمی سپہ سالاری کے واسطے ایسا موزوں نہیں ہوتا جیسا کہ ماتحت افسری کے لیے ۔

۲۔ انسان کو اپنے اور غیروں کے حقوق ادا کرنے میں ایسے مشکل جھگڑے اور دشوار قضیئے[۱] آن کر پڑتے ہیں کہ جن کے انفصال میں ہمیشہ اس کو کامیابی نہیں ہوتی اور ایسے جوکھوں اور خطروں میں اس کی جان پھنستی ہے کہ وہ ان سے بچ کر ہمیشہ نہیں نکل سکتا ۔ غرض انسان کی زندگی ایک جنگ ہے ۔ جنگ کے لیے بہادری اور شجاعت کی سخت ضرورت ہے ۔ شجاعت سے مراد ہماری یہ ہے کہ طبیعت میں ایسی قوت ہو کہ وہ خوف اور خطروں کا مقابلہ استقلال اور تحمل کے ساتھ کرائے ۔ جس میں صفت یہ ہوتی ہے اس کی عزت دل میں بغیر اس خیال کے پیدا ہوتی ہے کہ اس کی شجاعت آزادی کی حفاظت کر کے چین و آرام پیدا کرے گی یا ظلم کی حمایت کر کے سر پر بلائیں لائے گی ۔ ایک شجاعت تو بہ مجبوری کرنی پڑتی ہے کہ کوئی خدمت و منصب ایسا ہوتا ہے کہ اگر اس کے سبب سے خوف و خطر کا مقابلہ نہ کیا جائے تو ناک کٹ جائے اور ساری عمر بدنامی رہے ۔ ایسے محل پر شجاعت کرنا اپنا فرض ادا کرنا ہے ۔ اس سبب سے نیک نامی نہیں حاصل ہوتی بلکہ بدنامی سے بچاؤ ہوتا ہے ۔ دوسری شجاعت وہ ہے جو آدمی خود بخود کرتا ہے ۔ اس کو اختیار ہوتا ہے ، خواہ پلنگ پر سوئے یا آدھی رات کو دشمن کے شہر میں آگ لگانے کے لیے فصیل پر کمند لگا کے اتر جائے اور طوفان

۱۔ اصل میں ''قصے'' غالباً سہو کتابت ہے ۔

سے مقابلہ کرے - جو یہ کرتے ہیں ، وہ بڑے اولوالعزم عالی ہمّت ہوتے ہیں -

۳- شجاعت کو فضیلت میں یعنی نیکی میں شمار کرنے کے اندر بڑی احتیاط چاہیے - جب تک اس کا سبب اور وسائل اور مآل نہ معلوم ہو ، وہ فضیلت میں نہیں شمار ہو سکتی - اگر کوئی شخص اپنی حرص و آز اور جاہ کے واسطے جان کو جوکھوں میں ڈالے ، مثلاً پہاڑوں میں دور دراز سفر اس لیے کرے کہ ان کی معدنیات کا مالک ہو جائے یا اُن قوموں کو جو اس کے زبردست ہتھیاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں ، محکوم و مطیع بنا لے ، تو ایسی شجاعت نیکی میں نہیں گنی جائے گی - نہ اس کا کرنے والا شجاع سمجھا جائے گا - وہ تو ایک قزّاق چور ہے جو مال کی طمع میں پھانسی اور سزا کی پروا نہیں کرتا - یا وہ احمق ہے جو اپنے کل مال کو لاٹری کے ٹکٹ میں لگا دیتا ہے - جو شجاع بے غرض اَوروں کے فائدے کے لیے خوف و خطر کا مقابلہ کرتا ہے اور جان کو جوکھوں میں ڈالتا ہے ، وہ تحسین و آفرین کا مستحق ہے - ایسے ہی شجاعوں کے بُت صنم خانوں میں رکھے جاتے ہیں ، اور وہ دیوتا سمجھے گئے ہیں ، اور ان کے نام کے عبادت خانے بنائے گئے ہیں ، اور ان کی تصاویر کی پرستش ہوئی ہے - شجاعت کے ساتھ عزّت توام ہے اور عزّت کے ساتھ فضیلت -

۱۰۸- بھل منسائی اور بھلائی کرنا

۱- بھلائی کرنے سے مراد ہماری یہ ہے کہ خلائق کی خیرخواہی و بہبودی اور بہتری کو اپنی عادت بنائیں - بھل منسائی سے یہ مراد ہے کہ آدمی کا دلی میلان اور انسانوں کی بہی[1] و خیرخواہی کے

۱- بہی = بہتری -

واسطے ہو۔ سب اور نیکیوں پر اِس نیکی کو شرف حاصل ہے، کوئی اس سے زیادہ دل کی بزرگی نہیں ہے۔ اس میں جنابِ الٰہی کا خُلق پایا جاتا ہے۔ اگر آدمی میں یہ نیک خُو نہ ہو تو پھر وہ کیڑے مکوڑے سے بہتر نہیں ہے، بلکہ وہ شریر اور ذلیل ہے۔ یہ بھلائی کرنا خیرِ الٰہی ہے، اس کو فیّاضی کہتے ہیں۔ اس میں افزونی نہیں ہو سکتی مگر غلطی ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنا سارا مال و متاع خیرات کر دے جس سے تمام خاندان مفلس ہو جائے اور پھر اس میں بالکل فیّاضی کی قابلیت نہ رہے، یا یہ کہ دولت کو غیر مستحقّوں میں تقسیم کر دے، تو اِن دونوں باتوں میں یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ فیّاضی کی[1] مقدار میں افزونی ہوئی، بلکہ یہ جانا جائے گا کہ فیّاضی کرنے میں غلطی ہوئی۔ ہم کو چاہیے کہ ہم اپنے چال چلن کو، خواہ کیسا ہی وہ نیک ہو، عقل کا مطیع و منقاد رکھیں اور اپنے سب فرائض کے ادا کرنے میں عقل کو رہ نما بنائیں۔ اگر نیک مزاج بے پروائی سے نیک کام کرتا ہے تو اس سے برائی پیدا ہوتی ہے؛ مثلاً ایک شخص اپنی نرم دلی کے سبب سے مجرموں کو سزا نہ دے تو وہ ایک خاص گروہ کو مشتبہ فائدہ پہنچاتا ہے مگر ہزاروں آدمیوں کا نقصان کرتا ہے، تکلیف پہنچانے کے لیے مظلوموں پر ظالموں کو چھوڑتا ہے۔ یا ایک بڑا دولت مند فیّاضی سے کاہل بدمعاشوں کی پرورش کرتا ہے تو وہ محنت شعاری کو برباد کرتا ہے اور اس سے تمام قوم کی تونگری اور اخلاق کو خراب کرتا ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بے تمیزی کے ساتھ خیرات دینا بہ نسبت فائدے کے نقصان زیادہ کرتا ہے اور سستی و کاہلی کی طرف رغبت دلاتا ہے اور مکر و فریب بڑھاتا ہے۔ اگر تم کوچہ و

۱- اصل : کے۔

بازار کے میلے کچیلے چیتھڑے لگائے ہوئے فقیروں کو خیرات دو تو گویا اُن آدمیوں کو تم کرائے پر رکھتے ہو جو میلے کپڑے پہنیں اور اپنی مصیبت کی جھوٹی کہانیاں بنائیں - اگر تم خوب تحقیق کر کے سچّے محنتی آدمیوں کو اُس صورت میں خیرات دو کہ آفاتِ ناگہانی میں وہ مبتلا ہو گئے ہیں تو تم ان کے ساتھ فقط نیکی ہی نہیں کرتے ہو بلکہ محنت، جو دیانت کے ساتھ کی جاتی ہے، اس کی حمایت کرتے ہو - بعض نیک نہاد یہ کہتے ہیں کہ ہم خیرات میں اپنی نیّت کو دیکھتے ہیں کہ سوائے محتاجوں کی[1] احتیاج رفع کرنے کے اَور نہیں ہوتی - اگر کوئی محتاجوں کی صورت مکر و فریب سے بنا کر ہم سے کچھ لے جائے تو اس میں ہمارا کیا قصور و گناہ ہے - یہ اُس کی خطا ہے جس نے مکر و فریب کیا - یہ خیال اُن کا صحیح جب ہے کہ وہ تحقیق و تفتیش کے بعد محتاج کو دیں - لیکن اگر تحقیق نہیں کی تو ان کی اور مکار کی دونوں کی خطا ہے - وہ اپنے معاملات میں، جن کے اندر ان کی اغراض متعلق ہوتی ہیں، دیکھیں کہ اگر وہ کسی شخص کو اہل کار مقرّر کر کے کہیں کہ وہ ہمارے لیے گھوڑا یا مکان یا کوئی اَور چیز خرید دے اور وہ اسے بہت سی قیمت دے کر خرید لے اور یہ عذر کرے کہ میں نے بیچنے والے کی بات کو بے تحقیق صحیح سمجھ کر قیمت کا روپیہ دے دیا، یہ اگر خطا ہے تو بیچنے والے کی ہے کہ اس نے مجھ سے دغا کی، میرا کیا اس میں دوش ہے؛ تو کیا تم اُس سے یہ نہیں کہو گے کہ جیسی فروشندہ کی یہ خطا ہے کہ اس نے تم کو دغا دی اور ٹکے کے مال کے روپے لے لیے، ویسے ہی تمھارا یہ قصور ہے کہ چیز کی واجب قیمت چکانے کے لیے تحقیق میں

۱- اصل : کے -

تکلیف نہیں اٹھائی ؟ پس اِس اصول پر غور کر کے یہ سمجھو کہ خدا نے تم کو اپنی دولتوں کا خزانچی مقرّر کیا ہے۔ اس کو ناحق نہ اڑاؤ۔ بہتر طور سے اسے خرچ کرو اور اپنی[1] غفلت کی خطا کو دوسرے کی بد چلنی کی پناہ میں نہ لے جاؤ۔

اب اس بات کو اکثر عاقل تسلیم کرتے ہیں کہ محتاجگی دور کرنے سے اور محتاجی زیادہ بڑھتی ہے۔ ہاں بیمار اور اپاہج اِس قسم کے محتاج ہیں کہ وہ اپنی احتیاجوں کو نہیں بڑھا سکتے کہ زیادہ اپنے تئیں بیمار یا اپاہج کرلیں۔ اس لیے ایسوں کی احتیاجیں زیادہ تر دُور کرنی چاہییں[2]۔ اور ان کے ساتھ بھلائی کرنا انسان کے دل پر منقّش ہے۔ اگر وہ انسان کے ساتھ بھلائی نہیں کرتا تو جانوروں کے ساتھ کرتا ہے۔ تم نے بعض بے رحم آدمیوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ کتّے بلیوں کو کیسا پیار کرتے ہیں اور عمدہ کھانے کھلاتے ہیں۔

۲۔ اہلِ اٹلی کی ایک ضرب المثل مشہور ہے کہ "وہ ایسا نیک ہے کہ کسی کام کا نہیں۔" ان کے ایک فاضل نے کہا کہ متقدمین نے عیسائیوں کو نیکی کا بہانہ بتا کے ایسا ضعیف اور نامرد کر دیا ہے کہ ان کو یہاں اپنے انتقام کا خیال نہیں ہوتا۔ بہشت میں آسے خریدنا چاہتے ہیں مگر قوتِ بازو اور شجاعت سے نہیں۔ میں خود اِس طرح زیست بسر کرنے کو اپنے مذہب کے برخلاف جانتا ہوں۔ جنھوں نے اس پیرایے میں مذہب کی تشریح کی، وہ غریب پست ہمّت تھے کہ سوائے آرام طلبی کے کسی بڑے امرِ خیر کو نہیں چاہتے تھے۔ اگر عیسائی مذہب کا حکم یہ ہے کہ وہ اپنے ملک اور قوم کو سربلند کریں تو ان پر فرض ہے کہ وہ ملک اور قوم سے محبت کریں اور اس

۱۔ اصل : اپنے۔ ۲۔ اصل : چاہیے۔

کی عزت اس طرح رکھیں کہ سارا سامان حفاظت کا مہیا رکھیں۔ عیسائیوں کی بود و باش کا جو طریقہ ہے وہ ان کے مذہب کے بالکل برخلاف ہے۔ جو ان کو کام کرنا چاہیے، وہ کریں گے تو اپنی حفاظت کر سکیں گے۔ اور اگر وہ کام کریں گے جو کرتے آئے ہیں تو تباہ اور خستہ حال رہیں گے۔ جو نرم دل یہ چاہتا ہے کہ میں ہر کام میں دیانت دار رہوں، وہ بڑے نقصان میں رہتا ہے اور جوکھوں میں پڑتا ہے۔ بڑے مخالف اصولوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اس لیے بادشاہوں کو سخت دل رہنا چاہیے اور حسبِ ضرورت نرم دل ہونا۔

آج کل دنیا میں اِس بات کو خوب[1] جانتے ہیں کہ آدمی وہ کام کرے جو آدمی ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں، نہ وہ کام جو اس کو کرنا چاہیے۔ یہ ممکن نہیں کہ آدمی اپنے میں سانپ کی سی دانائی اور فاختہ کی سی بے گناہی جمع کر سکے۔ آدمی پر لازم ہے کہ وہ بدی کی فطرت و صفت سے خوب واقف ہو کیونکہ بغیر اس کے نیکی بے حفاظت رہتی ہے۔ طعن و خوف سے بچنے کے لیے یہ بہتر ہے کہ آدمی کو علم اپنی نیک عادت کی غلطی پر ہو جائے۔ اور آدمیوں کی بھلائی چاہو مگر یہ نہیں کہ اُن کے بُشرے[2] اور توہمات کے غلام بن جاؤ؛ یعنی کوئی شخص تمھارے پاس اپنا بُشرہ بناتا ہوا اور توہمات بتلاتا ہوا آئے تو تم اپنی نرم دلی سے اُس کو پیار کرنے لگو اور اُس کی بہبودی کے درپے ہو جاؤ اور اپنے دل کو اس کے ساتھ وابستہ کر دو۔ ہر شخص کے ساتھ وہ سلوک کرنا چاہیے جو اس کے لیے مناسب ہو۔ لقمان کی مرغ کی حکایت یاد رکھو کہ اُس کو ایک اناج کا دانہ گوہر کے دانے سے زیادہ خوش کرتا ہے۔

۱۔ ''خوب جانتے ہیں'' یعنی اچھا سمجھتے ہیں۔

۲۔ بُشرہ = شکل، صورت۔ یہاں بناوٹ یا سانگ مراد ہے۔

۳- خدائے تعالیٰ کو دیکھو کہ وہ سب بُرے بھلے، ظالم عادل پر اپنا مینہ برساتا ہے اور سورج کو چمکاتا ہے۔ مگر نہ سب پر دولت کا مینہ برساتا ہے، نہ عزت و دولت کی روشنی سب کو مساوی پہنچاتا ہے۔ اُس کے عام فیض سب کو برابر پہنچتے ہیں مگر اس کے خاص فیض خواص ہی کو ملتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے انسان کی خود اپنے[1] ساتھ محبت کو بجائے چربہ[2] کی بنایا ہے اور ہمسائے کی محبت کو تصویر۔ تم تصویر بنانے میں چربے کو نہ توڑو۔ اَوروں کی خیر خواہی میں عقل کو رہ نما بناؤ۔ وہ انسان کے وہم و خیال کے مطابق نہیں ہونی چاہیے بلکہ ضرورت و مصلحت کے موافق۔ حاجت مندوں پر بھی اور اپنے وسائل پر بھی نظر کرنی چاہیے۔ اگر کوئی شخص وسائل تھوڑے رکھتا ہے اور فیّاضی زیادہ کرتا ہے تو چشمہ خالی کرتا ہے اور دھار بہاتا ہے۔

۴- عقلِ مستقیم کی ہدایت سے خیر خواہیِ خلائق کی عادت نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ بعض آدمیوں کی جبلّت و فطرت میں داخل ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے بھی ہوتا ہے کہ بد خواہیِ خلائق بعض آدمیوں کی طینت میں ہوتی ہے۔ اس خُوے بد کا ادنیٰ اثر تو یہ ہے کہ مزاج میں چڑچڑاپن، ہٹ دھرمی، مقابلے کے لیے تیاری، کسی بھلائی کی طرف مشکل سے رغبت کرنا پیدا ہو، اور اعلیٰ اثر یہ ہے کہ حسد اور شرارت پیدا ہو۔ ایسے آدمیوں کی خوش وقتی اُس وقت ہوتی ہے کہ اَور لوگ مصیبت میں مبتلا ہوں۔ وہ لیزبرک کے کتّے سے بھی بد تر ہوتے ہیں جس نے اس کے زخم کو چاٹا تھا۔

۱- اصل: کو خود اپنی۔

۲- چربہ: خاکا، کاغذ۔ پوستِ آہو کو چرب (چکنا) کر کے کسی نقش یا تصویر پر رکھ کر ہو بہو اُس کی نقل اُتارنا۔

ان کا حال مکھیوں کا سا ہوتا ہے کہ زخم جب تک ہرا ہے ، اُس کے گرد بھنبھناتی ہیں - ان کو آدمیوں سے نفرت ہوتی ہے - ان کا حال طائی من کا سا ہوتا ہے کہ جس نے کہا تھا کہ میرے باغ میں ایک درخت نشو و نما پاتا ہے ، مَیں اُس کو اپنے مطلب کے لیے کاٹ لیتا ہوں ، کچھ دنوں کے بعد اُسے اُکھیڑ کر پھینک دوں گا - میرے دوستوں اور اہلِ ایتھنز کے سب چھوٹے بڑوں سے کہہ دیا جائے کہ جس کسی کو اپنی مصائب کا دور کرنا منظور ہو ، وہ اُس سے پہلے کہ میرے درخت پر کلہاڑی لگے ، اس کی شاخوں میں لٹک کر اپنے تئیں پھانسی دے لیں - پس ایسے ہی وہ لوگ درخت نہیں دیتے ہیں ، اس کی شاخیں پھانسی لگانے کے واسطے دیتے ہیں -

۵- خیرخواہیِ خلائق کی اجزا اور نشانیاں اَور بہت سی ہیں - جو شخص غیر آدمیوں پر لطف و کرم کرتا ہے ، اس کو کسی خاص شہر کا باشندہ نہ جاننا چاہیے بلکہ ساری دنیا کا - اس کے دل کا حال جزیرے کا سا نہیں ہوتا کہ ساری زمینوں سے علیحدہ اور بُریدہ ہو ، بلکہ اقلیم کا سا ہوتا ہے کہ اَور زمینوں سے ملا ہوا ہے - اگر وہ اَوروں کی تکالیف اور رنج و محن کو دیکھ کر شفقت اور اُلفت کرتا ہے تو اس کا دل درخت کا سا ہے کہ خود زخمی ہو کر اَوروں کے لیے مرہم تیار کرتا ہے - اگر وہ اَوروں کے قصوروں اور خطاؤں کو آسانی سے معاف کرتا ہے تو اس کا دل وہاں بویا گیا ہے جس پر کوئی گزند نہیں پہنچتا ہے اور نہ کوئی نشانہ اُس پر لگ سکتا ہے - سب سے بڑی بھلائی یہ ہے کہ آدمی خلائق کی خیر خواہی میں اپنے تئیں سر تا پا وقف اور قربان کر دے -

۶- بھلائی چھپ کر کرو اور اس کی شہرت پانے سے منفعل ہو - جن کو خدا روشن ضمیر بناتا ہے ، وہ اپنی شعاعوں سے اَوروں کو

روشن کرتے ہیں۔ اگر اوروں کے[1] ساتھ بھلائی جتنی کرنی آدمی چاہتا ہو، اتنی نہ کر سکے تو جتنی کر سکے، اس میں کوشش کرے۔ جیسے بلسان[2] کا درخت اپنا تیل اوروں کے فائدے کے لیے نکالتا ہے، اپنے لیے نہیں، ایسے ہی نیک آدمی اوروں کے فائدے کے لیے خود اپنے تئیں تکلیف دیتے ہیں اور بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ بھلائی کا درخت خدا ہی نے لگایا ہے، وہی اس کو پانی دیتا ہے، وہی اس میں کلیاں اور پھول لگاتا ہے اور پھل لاتا ہے۔

۷۔ تخلّق بہ اخلاقِ الٰہی[3] یہی ہے کہ جہاں تک ہمارا اختیار اور اقتدار ہو، وہاں تک عوام سے محبت کریں۔ خلائق کی بھلائی کے لیے منصوبہ باندھیں، تمام دنیا کے فائدوں کی ترقی پر کمر بستہ ہوں۔ نیک آدمیوں کی پہچان یہ ہے کہ ان کے تمام دوست آشنا نیک ہوں اور دشمن ان کے بد ہوں۔

۸۔ دنیا میں ہزاروں آدمی سانس لیتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، رہتے سہتے ہیں۔ طفلی، جوانی، پیری بسر کر کے چل بستے ہیں۔ پھر کوئی ان کا نام نہیں لیتا۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ انھوں نے دنیا میں کوئی بھلائی کا حصہ نہیں لیا، کسی کو کوئی نعمت اور برکت ایسی نہیں دی۔ نہ ایک سطر لکھی، نہ کوئی بات ایسی کہی کہ اس کو کوئی یاد کرتا۔ وہ فنا ہو گئے، ان کی روشنی تاریکی میں چلی گئی۔ جیسے حشرات الارض کو کوئی یاد نہیں کرتا، ایسا ہی ان کو بھی

۱۔ اصل: کی۔
۲۔ بلسان: (ع۔ بفتحتین و نیز بفتح اول و سکون و دوم) مذکر۔ مصر کے ایک مشہور درخت کا نام جس کے پتّوں سے روغن نکلتا ہے (نوراللغات)۔
۳۔ "تخلّق بہ اخلاقِ الٰہی" سے اِس حدیث شریف کی طرف اشارہ ہے: "تخلقوا باخلاق اللہ"۔ یعنی اللہ تعالیٰ جیسا اخلاق اپنے اندر پیدا کرو۔

کوئی یاد نہیں کرتا - تم کیا اس طرح کا جینا مرنا چاہتے ہو ؟ تم کو چاہیے کہ ایسی بھلائی کے کام کرو کہ مرنے کے بعد وہ زندہ رہیں اور انقلابِ زمانہ کا طوفان ان کو نہ مٹا سکے - مدارات کو بوؤ ، دوستی کا پھل پاؤ - رحم دلی اور اُلفت کا درخت لگاؤ ، محبت کا ثمر پاؤ - لوگوں کو احسان کر کے خوش کرو - یہ کام کبھی بے ثمر نہیں ہوتا - احسان کرنے کا اجر ضرور ملتا ہے - ان کاموں کی قلم سے اپنا نام لوحِ دل پر مایقرّہ[1] خط میں لکھو تو تمھارا نام ایسا چمکے گا جیسا کہ سرِ شام ستارے چمکتے ہیں اور تمھارے کام ایسے روشن ہوں گے جیسے کہ آسمان پر ماہ و مِہر -

۱۰۹- امارتِ اُمرا اور شرافتِ شرفا

۱- اول ہم اُن اُمرا کی اُمارت کا ذکر کرتے ہیں جو اراکینِ سلطنت ہوتے ہیں - اور پھر خاص شرفا کی شرافت کا ذکر کریں گے - جس سلطنت میں اُمرا اراکینِ سلطنت نہ ہوں ، وہ ایک قہری سلطنت ہے - سلطنت میں اُمرا کا ہونا بادشاہ کی خود مختاری کو روکتا ہے اور شترِ بے مُہار ہونے نہیں دیتا - وہ خاندانِ شاہی کی طرف سے رعایا کی نظر کو اپنی طرف پھیر لاتے ہیں - سلطنتِ جمہوری میں اُن کا ہونا کچھ ضرور نہیں - اس میں ان کے ہونے سے وہ امن و امان نہیں ہوتا جو نہ ہونے سے رہتا ہے - اس میں رعایا کاموں کو دیکھتی ہے ، کام کرنے والوں کو نہیں دیکھتی - اور اگر ان کی طرف دیکھتی ہے تو کچھ امارت کی نشانیوں اور خاندانی شجروں کے سبب سے نہیں ، بلکہ کاروبار کی خاطر سے کہ وہ ان کے لائق ہیں یا نہیں -

---

۱- اصل : کذا - غالباً اس لفظ کا مادہ ''قرار'' ہے - مطلب یہ ہوگا کہ ایسے پختہ خط سے لکھو جو مٹ نہ سکے -

بادشاہ کی شان و شکوہ کو با وقار و با اختیار امرا بڑھا دیتے ہیں مگر اُس کے زور کو گھٹا دیتے ہیں۔ رعایا میں اولوالعزمی اور جرأت و ہمّت پیدا کر دیتے ہیں مگر اس کی دولت کو دبا دیتے ہیں۔ یہ بہتر ہے کہ حکومت و عدالت میں تو بادشاہ کی برابر درجہ اُمرا کو ملے نہیں مگر وہ رعایا اور بادشاہ کے درمیان میانجی[1] ایسے رہیں کہ رعایا کی گستاخیوں کا سلسلہ انھی پر ٹوٹ جائے، بادشاہ تک اُس کی نوبت نہ آئے۔ جب اُمرا کی کثرت ہوتی ہے تو ان کے خرچ اُٹھانے سے رعایا زیرِ بار ہو کر مفلس ہو جاتی ہے اور تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ علاوہ اس کے یہ بھی ایک امر ضرور ہے کہ ایک زمانے میں اُمرا ایسے کم دولت ہو جائیں کہ ان کی آمد و خرچ میں کچھ مناسبت نہ رہے۔ خرچ آمد سے کہیں زیادہ ہو جائے۔ خاص شرفا کی شرافت کا حال یہ ہے کہ جب ایک قدیم قلعہ و عمارت کو، جس میں کوئی فرسودگی اور بوسیدگی نہ ہو اور ایک لکڑی کے پرانے درخت کو، جس میں کچھ نہ بگڑا ہو، نہ گُھن لگا ہو، عظمت کی نظر سے دیکھتے ہوں تو شرفا کے قدیمی خاندان[2] کو، جو زمانے کے حوادث کی طغیانی کا مقابلہ کر کے بچا رہا ہے، کیوں نہ عزّت کی نگاہ سے دیکھیں۔ جب بے جان اشیا کی قدامت کی عزت کرتے ہیں تو جانداروں کی عزت ان سے کہیں زیادہ کریں گے۔

امرائے جدید اپنی قوّتِ بازو سے پیدا ہوتے ہیں اور امرائے قدیم زمانے کی مساعدت سے۔ جو لوگ اول امارت کے درجے پر سرافراز ہوتے ہیں، وہ گو نیک کردار زیادہ ہوتے ہیں مگر اولاد

۱۔ اصل : کذا۔ مراد یہ ہے کہ وہ بادشاہ اور رعایا کے درمیان رابطے کا کام دیں۔

۲۔ اصل : خاندانوں۔

کی طرح بے گناہ نہیں ہوتے - کیونکہ کوئی امارت کی سربلندی نہیں حاصل ہوتی جب تک نیکی و بدی دونوں اس میں شامل نہیں ہوتیں - اولاد اُن کی نیکیوں اور خوبیوں کو یاد کرتی ہے اور بدیوں کو ان کے ساتھ دفن کر کے بھلا دیتی ہے - امرا حاسد تو ہوتے ہیں اس لیے کہ خاندانی امیر جفاکش کم ہوتے ہیں، اور جو جفاکش کم ہوتا ہے وہ جفاکش پر حسد کرتا ہے - سوائے اس کے امرا ایک درجے تک بلند ہو کر ٹھہر جاتے ہیں، اور زیادہ اونچے بلند نہیں ہوتے - اور نئے نئے آدمی بلند ہو کر اُن کے پاس آتے ہیں تو پھر مشکل ہے کہ وہ ان سے حسد نہ کریں - لیکن وہ محسود کم ہوتے ہیں، اس لیے کہ وہ معزز ہوتے ہیں - کسی بادشاہ کے پاس خاندانی امرا لائق موجود ہوں تو وہ اُن کو سلطنت کے کارہائے بزرگ آسانی سے سپرد کر سکتا ہے، کیونکہ رعایا بالطبع ان کی طرف ملتفت ہوتی ہے اور سمجھتی ہے کہ وہ حکومت ہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں -

۲- جو لوگ شرافتِ نسب رکھتے ہیں، اُن کا کچھ پاجی کمینہ ہو جانا ناممکن نہیں ہے - امارت کا سہرا سر پر زمانے کے ہاتھ سے بندھتا ہے - اگر کوئی شخص شرافتِ امرا کو بے قدر جانے تو پھر انسان اور حیوان کی اولاد میں کیا فرق و تمیز باقی رکھے گا - شریف امرا حاسدوں کی حسد سے یہ نیکی حاصل کرتے ہیں کہ ان پر مہربانی کرتے ہیں - یہ شاذ ہے کہ نیکی سے امارت پیدا ہو اور اس سے زیادہ یہ شاذ ہے کہ امارت سے نیکی پیدا ہو - انسان کو امارت حاصل کرنے کا وہ شوق دامن گیر ہے کہ زمانے کی دوڑ میں وہ ایسا دوڑتا ہے کہ نیا امیر بن جاتا ہے اور اس کی بغل میں پرانے امیر بے حس و حرکت بُت بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اس سے پیچھے رہ جاتے ہیں -

۳- شرافتِ نسب کی وہی شخص بے قدری کرتا ہے جو خود

شرافتِ نسب نہیں رکھتا - اور شرافتِ نسب کا فخر وہی شخص کرتا ہے جو کوئی ہنر اپنی ذات میں ایسا نہیں رکھتا کہ اس پر فخر کرے - جو شرفا نجابت ذات اور اصالتِ نژاد رکھتے ہیں اور پیشے اور حرفے ذلیل کرتے ہیں تو وہ یہ افسوس کرتے ہیں کہ ہم ایسے بزرگوں کی اولاد ہو کر یہ مکاسبِ خسیسہ[1] کرتے ہیں - اور رذیلوں کی اولاد، جو امارت کے کام کرتے ہیں، وہ افسوس کرتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا رذیل کام کرتے تھے - مگر یہ دونوں افسوس اُن لوگوں کو ہوتے ہیں جو حسنِ اخلاق سے معرّا ہوتے ہیں، ورنہ جو لوگ سچی شرافت رکھتے ہیں وہ شرمندہ ایسی باتوں سے نہیں ہوتے، بلکہ پاجی پنے کی بات کے سرزد ہونے سے - اب لوگ کہتے ہیں کہ شرافت وہ نہیں جو باپ دادا سے ورثے میں ملے بلکہ وہ جو انتخاب سے، یعنی لوگوں کی پسند سے ہاتھ آئے - سچ یہ ہے کہ سخاوت بڑی شرافت ہے -

۱۱۰- اِلحاد

(خدا کے ہونے سے منکر ہونا)

۱- انگریزی لفظ "ایتھزم" کے اصلی معنی خدا کے وجود سے انکار کرنے کے ہیں - ہم نے اس کا ترجمہ الحاد کیا ہے جس کے عربی زبان میں معنی دین سے پھر جانے کے ہیں - وہ دو طرح کا ہوتا ہے ؛ ایک یہ کہ انسان کو یقین ہو کہ خدا نہیں ہے - دوم یہ کہ یہ یقین ہو کہ کوئی نہیں جانتا کہ خدا کی صفات کیا ہیں - انسان کا اعتقاد کوئی اس سے بدتر نہیں ہے کہ خدا کے نہ ہونے کا یقین کرے - ساری دنیا کی جھوٹی کہانیوں اور دروغ افسانوں کو یقین کر لینا ایسا مشکل نہیں

۱- مکاسبِ خسیسہ = ذلیل کام، گھٹیا پیشے -

ہے جیسا اِس بات کا کہ سارا عالم بغیر کسی مدبّر و منتظم خالق کے ہست ہو گیا ہے - خدا نے اپنے منکرین کے وجوہ رد کرنے کے واسطے معجزے نہیں کیے - وہ خود اس کے تمام کاموں سے رد ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ جب آدمی فلسفہ شروع کرتا ہے اور تھوڑا سا ہی اس کو اوپر اوپر کا عام ہوتا ہے تو علّتِ ثانیہ پر، جو حواس سے محسوس ہوتے ہیں، انھی پر اکتفا کرتا ہے اور وہیں ٹھہر جاتا ہے اور وجودِ الٰہی کے انکار پر اُس کو مبادرت ہوتی ہے - مگر جب وہ فلسفے کو نظرِ تعمّق سے مطالعہ کرتا ہے اور اس کو استعداد حاصل ہوتی ہے اور اس کی تہہ پر پہنچتا ہے تو علّتِ ثانیہ سے علّتِ اَولیٰ یعنی علّت العلل پر (خدا) جس میں حواس کو دخل نہیں ہے، اس کا ذہن منتقل ہوتا ہے - اس سے زیادہ کیا کم عقلی اَور ہوگی کہ آدمی یہ یقین کرے کہ ہمارے چار عنصرِ ناپائدار اور پانچواں عنصرِ پائدار، جس سے اجرامِ فلکی پیدا ہوئے ہیں، خود بخود اِس خوش اسلوبی سے ترتیب اور اندازے کے ساتھ ترکیب پا گئے ہیں اور ان کو کسی منتظم اور مدبّر کی ضرورت نہیں ہوئی - یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک بے انتہا چھوٹے چھوٹے ذروں، بیجوں کی فوج خود بخود مجتمع اور منتظم اور حسین، بغیر خدا کی سپہ سالاری کے ہو جائے - مُلحد زبان سے خدائے تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتا ہے مگر دل میں اُس کے ضرور کچھ نہ کچھ اقرار ہوتا ہے - کہتے ہیں کہ مُلحد رات کو خدا پر آدھا یقین کرنے لگتا ہے - وہ ضرور کسی اُس چیز کو مانتا ہے جس میں صفاتِ الٰہی پائی جائیں - ان کا حال وحشی قوموں کا سا ہوتا ہے کہ اپنی جہالت و وحشت کے سبب سے الفاظ میں خدا کی تعریف نہیں کر سکتے مگر افعال میں وہ بُتوں کی پرستش اس طرح کرتے ہیں کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں خدا کا خیال ہے - دہریہ دہر میں

وہی صفات مانتا ہے جو خدا میں ہیں۔ مُلحد، خدا سے انکار کرنے والے دنیا میں بہت تھوڑے ہیں مگر ان کی تعداد ہمیشہ مبالغے سے بیان کی جاتی ہے۔ بعض حکما کے نزدیک دنیا میں ایسے ملحد کا وجود نہیں ہے کہ جس کو یہ یقین ہو کہ خدا نہیں ہے۔

اِلحاد کے اسباب یہ ہوتے ہیں: اول، مذہب کی تفریق۔ اگر اس میں دو فریق ہوں تو مذہب کی حمایت کا جوش اور شوق بڑھ جاتا ہے مگر جب اس میں فریقوں کی کثرت ہو جاتی ہے تو آدمی مذہب سے پھرنے لگتے ہیں اور مُلحد ہو جاتے ہیں۔ دوم علماے مذہبی کا بد اخلاق ہونا۔ پھر یہ کوئی نہیں کہتا کہ علما ایسے برے ہیں جیسے اور آدمی، بلکہ (یہ کہ) اور آدمی ایسے بُرے نہیں جیسے علما۔ سوم، مقدّس چیزوں کی اہانت، ہنسی اور مسخرگی۔ اس سے رفتہ رفتہ مذہب کا ادب آدمیوں کے دلوں سے اُڑ جاتا ہے۔ چہارم، زمانہ جس میں علم زیادہ ہو اور لوگ امن و امان سے خوش و خرّم رہتے ہوں۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ مصیبت میں آدمی کو خدا بہت یاد آتا ہے اور اس کو مانتا ہے۔

مُلحد شرافتِ انسانی کو مٹاتے ہیں۔ کیونکہ انسان میں ایک جزو حیوانی ہے جو حیوانوں سے ملتا ہے اور دوسرا جزو روحانی ہے جو رحمان سے ملتا ہے۔ پس جب دوسرا رشتہ و تعلق قطع کیا گیا تو انسان حیوان ہی رہ گیا۔ شرافت روحانی اس سے دور ہو گئی۔ علاوہ اس کے وہ انسان کی شان و شوکت اور انسانیت کی ترقی کو بھی روکتا ہے۔ اس بات کو کتّے کی مثال سے سمجھاتے ہیں: انسان کتّے کی پرورش کرتا ہے تو وہ (کتّا) انسان کو اپنا خدا مانتا ہے اور اس کے سبب سے وہ کیسے کیسے جرأت اور وفا کے کام کرتا ہے۔ یہ کام اس سے ہرگز نہ سرزد ہوتے اگر انسان، جو اس سے غیر ہے، اس کی اعانت

اور حمایت نہیں کرتا - اِسی طرح آدمی جب خدا کی حمایت پر بھروسا اور یقین کرتا ہے تو اس کو ایمان اور تقویتیں ایسی حاصل ہوتی ہیں کہ وہ صرف طاقتِ بشری سے کبھی ہاتھ نہیں آ سکتی[1] ہیں - خدا کو نہ ماننا اور اس کے ہونے کا انکار کرنا سب طرح سے قابلِ نفرت ہے - ایسا کرنا فطرتِ انسانی کو اُن وسائل سے محروم کرنا ہے جو اس کو عجزِ بشری سے نجات دیتے ہیں - خدا کا انکار ایک شخص کرے یا ایک قوم ، دونوں پر ایک سا اثر ہوتا ہے -

۲- خدا پرستی کا زور سب زوروں پر غالب ہے - جو قوم کہ خدا پرست ہوتی ہے ، خواہ وہ تعداد میں اور جسمانی قُوا میں ، مکر و فریب میں ، علم و ہنر میں ، وطن و قوم کی محبت میں اور قوموں کی برابر نہ ہو مگر وہ اپنی سچی خدا پرستی اور مذہب کی پابندی کے سبب سے اُن سب پر غالب آتی ہے -

۳- یہ امر امکان سے باہر ہے کہ انسان کا دل سچّے خدا سے منکر ہو - مُلحد بڑا مکار ہوتا ہے - جو سچّا مُلحد ہے وہ مقدّس چیزوں کو پکڑتا ہے مگر اُن کا ادب نہیں کرتا - الحاد کا اُلّو بے حیائی کے پر لگا کے دوپہر کو اُڑتا ہے اور جب آسمان پر آفتاب درخشاں ہوتا ہے تو اپنے پپوٹے خوب بند کر کے بولتا ہے کہ میں کہاں ہوں - وہ مُلحد تو ایئر پمپ کا رسیور ہوتا ہے جو ہوا سے خالی ہوتا ہے - بھلا اس میں اس کی عقل کے پر و بازو کیا اُڑ سکتے ہیں اور اس کی فصاحت و بلاغت کی آواز کب نکل سکتی ہے - اجرامِ فلکی کو مُلحد دیکھے تو وہ ایسا اندھا نہیں بن سکتا کہ اس کو اس عجیب و غریب عالم کا منتظم و مدبّر و خالق نظر نہ آئے - جہالت ، غرور ، قوی

۱- اصل : سکتے -

حواس ، ضعیف عقل ، خوش خوراکی اور بُری طرح زندگی بسر کرنے سے الحاد پیدا ہوتا ہے ۔ وہ سوسائٹی کے واسطے وبا ہے ۔ آخر اخلاق میں وہ فساد پیدا کرتا ہے ۔ مال کا وہ دشمن ہے ۔

آدمی مُلحدانہ زیست بسر کر سکتا ہے مگر وہ دل میں مُلحد نہیں ہو سکتا ۔ کوئی آدمی مُلحد کی برابر ذلیل و خوار نہیں ہوتا ۔ اس کا عقیدہ کہتا ہے کہ وہ سڈول مٹّی کا ڈھیر ہے ، ایک سست رفتار کل ہے ، روح کے بغیر ایک بولتا ہوا سر ہے ۔ اس کے تمام خیالات قوانینِ حرکت کے پابند ، اس کے تمام کام پہلے سے متعیّن ، اس میں اس سے زیادہ آزادی نہیں ؛ جیسے کہ دریا کی دھار کو یا طوفانِ باد میں ہوا کے جھونکے کو ۔ جہاں انتخاب نہیں ، وہاں لیاقت نہیں ۔ مُلحد سچّا دوست ، محبّت والا رشتہ مند، خیرخواہ رعایا نہیں ہو سکتا ۔

۴۔ مُلحد تو روح کو چُھری بھوک کے بالکل اس کا کام تمام کرتا ہے ۔ نجاتِ آخروی سے ہاتھ دھوتا ہے ۔ گناہ گار آدمی تو حیوانوں سے کمتر ہوتے ہیں مگر مُلحد شیاطین سے بدتر ہوتے ہیں کیونکہ شیاطین خدا کا یقین کرتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں ۔

۵۔ جنگل میں جب کسی وحشی آدمی کا نشانِ قدم مُلحد دیکھتا ہے تو آدمی کے ہونے کا اس کو یقین ہوتا ہے ، گو پہلے سے وہاں اس کی صورت نہ دیکھی ہو ۔ تو کیا وہ اُس خالقِ اکبر کا یقین نہیں کرے گا جس کے ہاتھوں کے نشان سارے عالم پر منقّش ہیں ؟

۶۔ مُلحد بڑا ہوش مند ہوتا ہے ۔ وہ اہلِ مذہب سے کہتا ہے کہ خدا نہیں ہے ، تُو کیوں مذہبی تکالیف اُٹھاتا ہے ۔ اہلِ مذہب جواب دیتا ہے کہ مذہب سے میرا نقصان کیا ہوتا ہے ۔ اس کے سبب سے مجھے کچھ شہواتِ نفسانی کو مارنا پڑتا ہے جو میرے حق میں نہایت مفید ہوتا ہے ۔ کچھ تھوڑی سی ظاہرا تکالیف اُٹھانی پڑتی

ہیں جس سے میرا دل اندر سے راضی اور خوش ہوتا ہے ۔ اس پابندیِ مذہب کے سبب سے شاید لوگ میرا بڑا ادب کرتے ہیں اور بے ریا، وفادار دوست ملتے ہیں ۔ میں تجھ سے زیادہ خوش و خرّم اور تندرست رہتا ہوں اور اس دنیا کی بہت سی برائیوں اور سزاؤں سے ایسا بچتا ہوں کہ تُو نہیں بچتا ۔ اگر خدا نہ ہوا تو مَیں اور تُو دونوں یکساں و برابر ہیں ۔ اگر خدا ہؤا تو پھر تیری کم بختی ہے ۔ اگر خدا کے ہونے اور نہ ہونے کے دلائل برابر کانٹے کی تول ہوں تو بھی خدا کے نہ ماننے میں جو بھاری جوکھوں اور خوف ہیں، وہ ماننے میں نہیں ہیں ؛ کہ اگر خدا نہ ہوا تو ماننا نہ ماننا اس کا برابر ہوا ، ماننے والے کا کچھ نقصان نہ ہؤا ، لیکن ہؤا تو پھر دیکھیے کہ ملحد کی جان کیا سخت عذاب میں آتی ہے ۔ جب اس کی جان اس جسم سے جدا ہو کر عالمِ ارواح میں پہنچی ، جس کا خیال بھی اس کو نہ تھا ، اور وہاں اس خدائے ذوالجلال کے روبرو ہونا پڑا ، جس کو وہ معدوم جانتا تھا ، تو کیا سخت حالت مصیبت کی پیش آئے گی ۔ کچھ ہمارے خیال سے اشیا معدوم و موجود نہیں ہو جاتیں ، جیسی وہ ہیں ویسی ہی ہیں ، خواہ ہم کچھ ہی خیال کریں ۔ ان پر یقین کریں یا نہ کریں ، اس سے ان کی ماہیت میں فرق نہیں آتا ۔ اگر خدا ہے اور ہم اس کے یقین کرنے سے سرکشی کریں تو کیا وہ معدوم ہو جائے گا ؟ ہمارے آنکھ جھپکانے سے کیا آفتاب تاریک ہو جائے گا ؟

۷۔ مُلحد کا حال ایسا ہے جیسے کہ کوئی شخص کسی بڑے شان دار محل میں جائے جس میں نہایت خوش اسلوبی سے اسباب سجا ہوا ہو ، نہایت خوبصورت چیزیں قرینے سے رکھی ہوں ، مگر وہاں نہ کوئی قوی حیوان ہو ، نہ انسان ہو ۔ ایک چوہیا اس میں پھر رہی ہو ؛ تو وہ یہ یقین کرے کہ اس عالی شان مکان کو اس چوہیا نے بنایا

اور سجایا ہے - اسی طرح دنیا میں بڑے بڑے کاموں میں خدا کو کام کرتا ہؤا وہ نہ دیکھے تو کہے کہ دنیا کو خدا نے نہیں بنایا بلکہ آدمی نے -

۱۱۱- باطل پرستی اور توہمّاتِ باطلہ

۱- انگریزی لفظ ''سوپرسٹی شن'' کا ترجمہ باطل پرستی اور توہمّاتِ باطلہ کیا ہے - باطل پرستی سے مراد ایسی چیزوں کی پرستش ہے جو پرستش کی مستحق نہیں ہیں[1] اور توہمّاتِ باطلہ سے مراد یہ ہے کہ بغیر کسی معقول وجوہ کے بیہودہ باتوں کا لحاظ اور ادب ایسا کرنا جیسا کہ مذہب کا ہوتا ہے - یہ بہتر ہے کہ آدمی خدا کے باب میں کوئی رائے نہ رکھے ، بہ نسبت اس کے کہ ایسی رائے رکھے کہ شانِ الٰہی کے سزاوار نہ ہو - پہلی صورت میں یقین نہ کرنا ہے ، دوسری صورت میں تحقیر اور گستاخی کرنا ہے - اس باطل پرستی میں بہ نسبت الحاد کے زیادہ نا خدا پرستی ہے - ایک میں خدا کی طرف سے غفلت ہے ، دوسری میں خدا کی حقارت ہے -

پلوٹارک[2] نے کہا تھا کہ اگر بہت سے لوگ یہ کہیں کہ ہم پلوٹارک کو نہیں جانتے کہ وہ کوئی آدمی ہے ، تو یہ بہتر ہے بہ نسبت اِس کے کہ لوگ کہیں کہ ہاں پلوٹارک کو ہم جانتے ہیں کہ وہ ایسا آدمی ہے کہ اپنے بچوں کو پیدا ہوتے ہی کھا جاتا ہے - ُبری طرح جاننے سے نہ جاننا اچھا ہوتا ہے - الحاد اس کا مانع نہیں

۱- اصل : ''جو پرستش کے مستحق نہیں ہے'' -

۲- پلوٹارک : (۴۵ یا ۵۰ع—۱۲۵ع ؟) یونانی حکیم اور مورخ - ایتھنز میں تعلیم حاصل کی - ایشیا میں مصر اور شام کا سفر کیا - اس کی ایک کتاب کا نام ''سیر الرجال العظام'' ہے -

کہ آدمی علومِ معقول فلسفہ و قانون سیکھے، شہرت و ناموری حاصل کرے، حسنِ خُلق جو انسان کی فطرت کے موافق ہے، پیدا کرے۔ غرض الحاد سے گو انسان کے دل میں مذہب کا خیال نہ ہو تو کوئی فرق حسنِ اخلاق میں نہیں واقع ہوتا، برخلاف اس کے باطل پرستی اور توہّماتِ باطلہ میں کہ وہ حُسنِ اخلاق اور تعلیمِ معقولات کو اپنی شان سے گراتے ہیں اور دل میں فقط ذہنی و خیالی سلطنت جماتے ہیں۔

الحاد سے کبھی کوئی سلطنت درہم برہم نہیں ہوئی کیونکہ ملحد مذہب سے بے پروا ہوتا ہے، کوئی فساد و عناد مذہب کی بنا پر نہیں قائم کرتا۔ چنانچہ آگسٹس قیصرِ روم[1] کے عہد میں الحاد کا زور تھا مگر اس کا عہدِ سلطنت لڑائی جھگڑوں کے فساد سے پاک صاف تھا۔ لیکن باطل پرستی نے تو بہت سی سلطنتوں کو[2] ستیاناس ملا دیا۔ وہ تو مجسّم ہو کر سلطنت کی تمام گردن کو اپنی کشش کے زور سے کھینچ کر اپنی گرہ میں لے آتی ہے۔ الحاد سے بڑھ کر باطل پرستی گناہ ہے اس لیے کہ الحاد کچھ تمدّنی اور ملکی معاملات میں بداخلاقی کی تعلیم نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے باطل پرستی حسنِ اخلاق کو اپنے پایے سے گراتی ہے اور گورنمنٹ کی جڑ کو گُھن لگاتی ہے۔ باطل پرستی اور توہّماتِ باطلہ کا آغاز تو عوام الناس احمقوں سے ہوتا ہے مگر بعد ازاں عاقل بھی مذہب میں سے دلائل کو اُلٹ پلٹ کر ان کی[3] تائید کے واسطے نکال دیتے ہیں۔ انسان کو ایسے رسوم کے ادا کرنے میں، جن میں حواس کو احتظاظ اور التذاذ ہو، خوشی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ رسومِ مذہبی کی صورتیں، جن کو

۱۔ آگسٹس قیصرِ روم: (۶۳ ق م—۱۴ ق م) پہلا رومی شہنشاہ۔ اسی کے عہد میں حضرت عیسیٰ علیہ اسلام بیتِ لحم میں متولّد ہوئے۔

۲۔ اصل: کذا۔ ۳۔ اصل: کے۔

وہ مقدس جانتا ہے ، اپنی مرضی کے موافق ایجاد کر لیتا ہے ، یا وہ ہمیشہ جہالت اور وحشی زمانے سے چلی آتی ہیں ۔ اکثر پروہت اور پیر و مرشد اپنے اقتدار اور اختیار بڑھانے کے واسطے مذہبی باتوں کے اظہار کو رسومِ ظاہری کی صورت میں ڈھال دیتے ہیں ، اور اپنی قوتِ متخیلہ اور زمانۂ جہالت کے خیالات کو ملا کر توہماتِ باطلہ لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیتے ہیں ۔ ایسی ایک راہ کھل جاتی ہے کہ جس سے انسان اپنی عقل کو اسرارِ الٰہی میں دوڑاتا ہے اور خدا کی باتوں میں دخل دینے لگتا ہے ۔ جیسے کہ بندر کی شکل ، جب وہ انسان سے مشابہ کی جاتی ہے تو نہایت مکروہ نظر آتی ہے ، ایسے ہی باطل پرستی کی شکل جب مذہب سے ملائی جاتی ہے تو نہایت بد اور کریہہ دکھائی دیتی ہے ۔ جیسے عمدہ گوشت سڑنے سے چھوٹے چھوٹے کیڑوں میں بدل جاتا ہے ، ایسے ہی مذہب کی عمدہ صورت اور انتظام خراب ہو کر توہماتِ باطلہ کی صورت بن جاتے ہیں ۔

قاعدہ ہے کہ دریا کبھی ایک خطِ مستقیم میں ، جہاں کی زمین نرم ہوتی ہے ، نہیں بہتا ۔ اس کی دھار ہمیشہ اِدھر اُدھر کے کناروں کو کاٹ کر اپنا رستہ ٹیڑھا بنا کے چلتی ہے ۔ ایسے ہی انسان کے سارے معاملاتِ ملکی اور مذہبی کا حال ہے کہ وہ سیدھی رفتار سے نہیں چلتے ، اِدھر اُدھر مڑتے جاتے ہیں ۔ مذہب میں علما اور مرشدوں کی چالیں شامل ہوتی جاتی ہیں ، توہماتِ باطلہ کا زور ہوتا جاتا ہے اور اس کے طریق کو پیچ در پیچ بناتا جاتا ہے ۔ جب مذہب کی ہر سچی بات میں جھوٹی باتیں شامل ہوتی جاتی ہیں تو مُصلحانِ دین جب اس کی اصلاح کرنے بیٹھتے ہیں تو وہ جھوٹی باتوں کو مُضر جان کر نکالنا چاہتے ہیں ، مگر جو سچ ، جھوٹ کی بغل میں بیٹھا ہوا

ہے ، اس کو بھی وہ اس بری صحبت کے سبب سے ذلیل جان کر الگ کرنے لگتے ہیں - اصلاح کے وقت اس بات میں بڑی احتیاط چاہیے کہ بری چیزوں کے ساتھ اچھی چیزیں نہ نکل جائیں - مشکل ہے کہ فصد سے خونِ فاسد ہی صرف نکلے اور خونِ صالح نہ نکلے -

۲- باطل پرستی کے توہمّاتِ باطلہ ایک دہشت ناک خواب ہیں[1] جو ایسے اندھیرے میں آدمی پڑا دیکھتا ہے جس کے پاس روشنی نہیں جا سکتی اور اس میں اذیّتوں کے زہر بھرے پیالے اور بد خوابی کے جُرعے[2] پیتا ہے - گھاس پُھوس کے[3] روشن کرنے سے آسمان کے ستارے چھپ جاتے ہیں مگر وہ معدوم نہیں ہوتے ، پھر نمودار ہوتے ہیں - ایسے ہی مذہب گو توہمّاتِ باطلہ کے سبب سے کچھ دیر کے لیے چھپ جائے مگر وہ معدوم نہیں ہوتا ، پھر اپنے تئیں نمودار کرتا ہے - باطل پرستی کے سبب سے توہمّاتِ باطلہ کا بار بھی انسان کے سر پر بڑا بھاری ہے ، فقط رسومِ ظاہری کا نہیں ، بلکہ دل پر بھی خیالی اور ڈرانے والے گناہوں کا -

ہم باطل پرستی کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو تمّدن میں خلل انداز ہو اور نہ مذہب کا زیادہ ادب کر سکتے ہیں جو اس کو سہارا دے - باطل پرستی سے بچنے کا عمدہ علاج بعد کلامِ الٰہی کے علومِ طبیعیات ہیں - جو شخص مذہب کے راہِ رواں و کشادہ میں چلنا نہیں پسند کرتا تو وہ صحرائے تجربہ میں گمراہ ہو کر جا پڑتا ہے جس میں کہیں راہ نہیں بنی ہوئی جو اس کو ملے ، یا خیالات کی بھول بھلیّوں میں پھنس جاتا ہے - بعض دفعہ توہمّاتِ باطلہ کو توہمّاتِ باطلہ ہی دور کرتے ہیں ، آگ کا جلا آگ سے ہی اچھا ہوتا ہے -

---

۱- اصل : ہے - ۲- جُرعہ = گھُونٹ - ۳- اصل : کی -

۱۱۲- سفر کرنا

۱- سفر کرنا چھوٹوں کی تعلیم کا اور بڑوں کے تجربے کا ایک جزو ہے - جو شخص اجنبی ملک میں جاتا ہے اور وہ پہلے سے اس کی زبان سے واقفیت نہیں پیدا کرتا ، وہ سفر نہیں کرتا بلکہ مدرسے میں زبان سیکھنے کے لیے جاتا ہے - جب نوجوان ایسے غیر ملکوں میں سفر کریں جہاں کی زبان سے نا آشنا ہیں تو لازم ہے کہ کسی معلّم یا کسی شخص ملازم کو ساتھ لے جائیں جو اس ملک کو پہلے دیکھ چکا ہو اور اس سے واقف ہو اور زبان وہاں کی جانتا ہو - وہ بتلا دے گا کہ یہاں کون کون سی چیزیں قابل دیکھنے کے ہیں اور کون کون سے آدمی ملاقات کے قابل ہیں ، کہاں کہاں تعلیم و تادیبِ روحانی اور ورزشِ جسمانی ہوتی ہے - اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو ان کا سفر ایسا ہو گا جیسے کہ برقع اوڑھ کر پھرنا کہ جس میں تھوڑا ہی نظر آتا ہے -

بحری سفروں میں سوائے پانی اور آسمان کے کچھ نظر نہیں آتا - کبھی کبھی کچھ حادثات بھی دیکھنے میں آتے ہیں - بّری سفروں میں بہت چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں ، اس لیے سفر کے اندر خشکی کی سیر میں روزنامہ بنانے کی زیادہ ضرورت بہ نسبت تری کے سفروں کے ہے - حادثاتِ بحری سے زیادہ مشاہداتِ بّری ہوتے ہیں جن کا لکھنا مفید ہوتا ہے - سفر میں جو چیزیں قابل دیکھنے کے ہوتی ہیں ، اُن کی تفصیل یہ ہے :

بادشاہ اور اُن کے دربار؛ خصوصاً اُس وقت کہ غیر سلطنتوں کے سفیر اس میں موجود ہوں - کچہریاں سب قسم کی ، جس وقت ان میں حاکموں کے اجلاس ہو رہے ہوں اور مقدّمات فیصل - کلیسا ، معابد ، خانقاہیں ، کالج ، کتب خانے - وہ مجالس جن میں مباحثے و مناظرے ہو رہے ہوں - وہ عمارات جو وہاں بطور یادگار باقی

ہوں۔ قدیمی شہر، عمارات ِ افتادہ کے کھنڈر، شہر کا سواد اور شہر پناہ، بندرگاہ، گھاٹ، بادشاہی باغ اور وہ[1] باغ جو صرف تفریح کے لیے شہر کے پاس لوگوں نے بنا رکھے ہوں، مکانات ِ شاہی، سلح خانہ، توشہ خانہ، میگزین، صرافے کی دکانیں، بنک، سپاہ کی قواعد، خزانے، جواہرات، لباس، پوشاک۔ سوائے ان کے جو اشیا وہاں نادر ہوں اور قابل یاد رکھنے کے ہوں، ان میں بعض باتیں معلّم و ملازم، جو ساتھ ہوں، تحقیق کر کے بتلائیں۔ دھوم دھام کے میلے، تماشے، دعوتیں، ضیافتیں، شادی بیاہ، تجہیز و تکفین اور اس قسم کی چیزوں پر توجہ نہیں چاہیے۔

جب کسی نوجوان کو تھوڑا سا سفر کرنا ہو تو وہاں کی زبان سے پہلے واقف ہو اور معلّم و ملازم، جو اس ملک سے واقف ہوں، ساتھ لے۔ کتاب جس میں اس مقام کا بیان اچھی طرح ہو اور نقشہ، یہ دونوں بھی ساتھ لے اور اپنے سفر کا روزنامچہ بنائے کہ اس میں روز روز کا حال لکھتا جائے۔ وہ سفر میں ایک ہی جگہ نہ پڑا رہے بلکہ مقامات کے مناسب ِ حال اپنا قیام کم و بیش مقرر کرے۔ جب وہ کسی شہر میں زیادہ دنوں ٹھہرے تو اس کے ایک محلے میں نہ رہے بلکہ مختلف محلوں میں رہے جو دور دور شہر کے سروں پر ہوں۔ اس طرح رہنے میں سارے شہر کے حالات خوب معلوم ہوں گے۔ وہاں اپنے وطن کے آدمیوں کی صحبت میں وقت ضائع نہ کرے، ان سے جدا رہے۔ جو لوگ وہیں کے منتخب ہوں اُن کے ساتھ ہم کلام و ہم نوالہ ہو۔ اگر ایک شہر سے دوسرے شہر میں جائے تو یہاں کے عمائد سے وہاں کے عمائد کے نام خطوط لے جائے تا کہ

۱۔ ''وہ'' اضافۂ مرتّب۔

وہاں لوگ مہربانی سے وہ چیزیں دکھا دیں جو قابل دیکھنے کے ہوں اور وہ باتیں بتائیں جو یہ جاننا چاہتا ہے۔ یوں اِس مختصر سفر سے بہت سے فائدے حاصل ہوں گے۔ شہر میں آدمی زیادہ تر ملاقات سیکرٹریوں اور غیر ملکوں کے سفیروں اور ان کے اہلِ دفتر سے کرے۔ ایسی ملاقاتوں سے بہت سے غیر ملکوں کا حال بھی معلوم ہو جائے گا۔ جو اہلِ کمال وہاں کسی علم و ہنر اور پیشے میں مشہور و معروف ہوں یا کسی اور طرح کی امارت و ثروت رکھتے ہوں، اُن سے ملو اور دیکھو کہ انھوں نے اپنی زندگی کے کیا طریقے اختیار کیے ہیں کہ جن سے وہ نامور ہوئے ہیں۔

سفر میں بڑی احتیاط یہ چاہیے کہ کسی سے لڑائی جھگڑا و دنگا فساد نہ ہو جائے۔ جھگڑالُو اور فسادی آدمیوں کی صحبت میں بہت ہوشیاری اور عقل مندی کے ساتھ جائے۔ جب سفر کر کے آدمی اپنے گھر صحیح سلامت آئے تو جن ملکوں میں سفر کیا ہے، وہاں کے آدمیوں سے یہ نہیں کہ بالکل قطع تعلق کر دے، بلکہ اپنے لائق واقف کار آشناؤں سے خط و کتابت برابر جاری رکھے۔ خاص اپنی سیاحت و سیر کو علم کے پیرائے میں ظاہر کرے، نہ لباس اور گفتگو میں۔ اُن سوالوں کا جواب دے جو کوئی پوچھے، نہ یہ کہ کہانیاں بنا بنا کے کہنے لگے۔

مسافر کو یہ بھی چاہیے کہ اپنے ملک کی وضع و طرح کو ایسا نہ چھوڑے کہ غیر ملک کا آدمی معلوم ہونے لگے۔ مگر ہاں جو اُس نے باہر کی وضع و طرح کے پھول دیکھے ہوں، ان کو اپنے ہاں کے اوضاع میں کانٹوں سے لگا دے۔

۲۔ بعض مسافر اندھے بن کر، یعنی دونوں آنکھیں بند کر کے، سفر کرتے ہیں اور کچھ نہیں دیکھتے۔ بعض خوب مبصّر بن کر

دونوں آنکھیں خوب کھول کھول کر دیکھتے ہیں۔ مگر اکثر مسافر ایک آنکھ بند کر کے سفر کرتے ہیں، یعنی ایک خاص چیز کی اُن کو دُھن ہوتی ہے، اُسی کی تحقیق و تدقیق کے درپے رہتے ہیں اور باقی سب چیزوں کے دیکھنے میں اندھے بن جاتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کو زمانۂ قدیم کی تاریخ کا شوق ہے۔ پس وہ سفر میں اُنھی مقامات کو دیکھتا بھالتا ہے جو اس تاریخ سے متعلق ہیں، باقی چیزوں پر وہ خیال بھی نہیں کرتا[1]۔ جو مسافر عالمانہ تحقیق کے لیے سفر کرتے ہیں، ان کو اپنے استقرا اور تحقیقات میں بڑا صبر چاہیے۔ یہ نہیں کہ چند جزئیات دیکھے اور ایسے بے تاب ہوئے کہ اُسی سے نتیجہ نکال کے ایک کلیّہ بنا لیا۔ کسی شہر میں گئے، دو چار بھلے مانسوں سے ملے اور ان کو دیکھا کہ وہ اپنے ماتحت ملازموں سے بہ لطف و مدارا پیش آتے ہیں، تو جلد یہ کلیّہ بنا لیا کہ اس شہر کے آدمی بڑے خلیق اور متواضع و منکسر ہیں۔ یا برخلاف اس کے دو چار بدمعاشوں سے مل کر اس کے برعکس نتیجہ پیدا کر لیا۔ کسی ملک کے اصل مزاج و سیرت دریافت کرنے کے واسطے بہت سے جزئیات پر علم حاصل کر کے استقرا سے کلیّہ بنانا چاہیے۔ یہی سبب ہے کہ جب ایک ملک میں مختلف آدمی سیاحت کرتے ہیں اور وہ بالکل سچا حال بیان کرتے ہیں اور ان کی نیّت میں نہیں ہوتا کہ ہم کوئی بات گھڑ کر اس میں ملا دیں، پھر بھی ان دونوں سچے مسافروں کا بیان ایک دوسرے کے مخالف ہوتا ہے اور آپس میں نہیں ملتا۔ ایک سواری میں دو آدمی پیٹھ سے پیٹھ ملا کر اِس طرح بیٹھیں کہ ہر ایک کو[2] سڑک کی ایک طرف دکھائی دے۔ ایک کو بنجر زمین

۱۔ اصل: کرتے۔

۲۔ "ہرایک کو" کے الفاظ مرتّب کا اضافہ ہیں۔

نظر آئے ، دوسرے کو باغ اور کھیت ؛ تو ایک اس ملک کو بنجر بتائے گا اور دوسرا مزروعہ ؛ دونوں سچے ہیں ، مگر ان کا کلیّہ بنانے کا قاعدہ غلط ہے ۔ مسافروں کو بڑی احتیاط یہ چاہیے کہ اپنے مختصر تجربے سے غلط نتائج نکالنے میں بے صبر نہ ہوں ۔

۳۔ سفر میں یہ مشکلات پیش آتی ہیں کہ کہیں دریا ، پانی ، دلدل میں تیرنا ، ڈوبنا ، پایاب چلنا پڑتا ہے ۔ کہیں ہموار و ناہموار راہوں کے نشیب و فراز میں اور بستی اور ویرانے میں پاؤں کا تھکانا اور گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل چلنا پڑتا ہے ۔

۴۔ سفر کرنے میں یہ فائدے حاصل ہوتے ہیں کہ اگر ہم کسی ایسے ملک میں گئے جہاں کا حال ہمارے ملک سے اچھا ہے تو اس ملک کی ترقی کے طریقے سیکھتے ہیں ۔ اور اگر اپنے ملک سے بد تر ملک میں جاتے ہیں تو اپنے ملک کو غنیمت جان کر اس کی نعمتوں سے زیادہ متمتّع ہوتے ہیں ۔ ملک ملک کا سفر کرنا ایک خوانِ بوقلموں ہماری نظروں کے سامنے لاتا ہے کہ جس سے ہمارے حواسِ خمسہ محظوظ ہو کر ان پر فریفتہ ہوتے ہیں اور وہ چپ چاپ ہمارے دل میں پاک مسرت پیدا کرتا ہے ۔ جن[1] کو سفر کا مذاق نہیں ہے ، اُن کو وہ بُرا معلوم ہوتا ہے ۔ وہ مہد سے لحد تک ایک ہی چیزوں کو دیکھا کرتے ہیں اور کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی جگہ میں پھرتے ہیں ۔ جہاں پیدا ہوتے ہیں ، وہیں اندھے اور لنگڑے ہوتے ہیں ۔ ان کے اصطبل میں گھوڑے فقط اس لیے مقیّد ہوتے ہیں کہ شہر ہی کے بازاروں میں فقط ناچ کود کر اپنے آقاؤں کا دل خوش کر دیں ۔ بعض آدمیوں کا دل پاک اور مضبوط

۱۔ اصل : جس کو ۔

ہوتا ہے ۔ گو وہ شعلوں کی طرح اوپر اڑنا چاہتے ہیں اور آگ لگانی اور آگ لینی چاہتے ہیں ، مگر گھر کی چار دیواری ان کو نکلنے نہیں دیتی ، وہیں بجھ کر رہ جاتے ہیں ۔

سفر کرنا ہمارے فہم و فراست کی کثافت کو دور کرتا ہے ، ہم کو چست و چالاک بناتا ہے ، مختلف قوموں اور لوگوں کے اوضاع و اطوار کے عیب و صواب سے واقف کرتا ہے ، جس کے سبب سے ہم اپنے اطوار و افعال کی خوب اصلاح کر سکتے ہیں ۔ کوئی دانش مند سفر کے اِن فائدوں سے انکار نہیں کر سکتا ۔ اس سے دربارِ بادشاہی کے اراکین کے اوضاع و اطوار پاکیزہ و شائستہ ہوتے ہیں ، مدبّرانِ ملکی کے خیالات وسعت پاتے ہیں ۔ حکما کے آگے مشاہدات و تجربوں کا میدان وہ وسیع آتا ہے کہ جس سے سیرتِ انسانی کے باب میں صحیح نتیجے نکال سکتے ہیں ۔

۵۔ سفر میں ہم کو لباس ایسا پہننا چاہیے کہ جس سے ہم کو لوگ متین اور سنجیدہ و معزّز سمجھیں ۔ تقریر ایسی کرنی چاہیے کہ کوئی راز کی بات منہ سے نہ نکلے ۔ گفتگو میں بہت احتیاط چاہیے ۔ بہت سوچ بچار کر کے بات کرو ۔ اکثر مسافر یہ کہا کرتے ہیں کہ ہم نے یہ مقام دیکھا ، وہ چیز دیکھی مگر اصلی مذاق اس کا نہیں بیان کر سکتے ؛ اس لیے زیادہ تر رائے لوگوں کی یہ ہو گئی ہے کہ سفر میں سراسر محنت و خطر ہے ۔ جوانی میں غیر ملک کی سیر کرنے سے بہت[1] خوشی حاصل ہوتی ہے ۔ اس خوشی کو مثل اَور خوشیوں کے ہم اپنے تشخّص[2] و تعلّی کا اور آیندہ افسوس کا ذریعہ بناتے ہیں

۱۔ اصل میں "گو بہت" ہے مگر اس شرطیہ جملے میں کہیں بھی "گو" کی جزا نہیں آئی لہذا لفظ گو حذف کر دیا گیا (مرتّب) ۔

۲۔ تشخّص سے خود نمائی مراد ہے ۔

یا مستقل پائدار ترقی کا ذریعہ۔ سفر فقط تجسّس اور دل بہلانے کے لیے نہیں چاہیے بلکہ اس لیے کہ بالفعل[1] کچھ سیکھیں اور آیندہ اپنی فہم و فراست کی ترقی کریں۔

۱۱۳۔ صلاح و مشورہ

۱۔ "کونسل" ایک انگریزی لفظ ہے جس کے معنے صلاح اور مشورے کے بھی ہیں اور مجلسِ شوریٰ کے بھی، اور کونسلر کے معنے مشیر کے ہیں۔ جہاں ہم نے "کونسل" کا لفظ لکھا ہے، وہاں مراد ہماری مجلسِ شوریٰ سے ہے۔ مشیر پر جو اعتبار بادشاہ کرتا ہے وہ کسی اَور شخص پر نہیں کیا جاتا۔ اَور لوگوں پر جو اعتبار کیا جاتا ہے تو فقط ایک چیز ان کے حوالے کی جاتی ہے — معلّم کو بچے، خزانچی کو دولت، اہل کاروں کو زمین یا خاص معاملات — مگر مشیر کو تو سارے اپنی زندگی کے کام حوالے کرنے پڑتے ہیں۔ انھی کے صلاح و مشورہ پر اس کی بہبودی اور بربادی موقوف ہوتی ہے۔ جو بادشاہ بڑے دانش مند ہوتے ہیں، وہ کچھ صلاح و مشورہ لینے سے یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ ان کی شان کی برتری میں کچھ کمی ہو گئی۔ یا یہ جانا جائے گا کہ وہ اپنے کام کے لیے کافی نہیں جو اَوروں سے صلاح و مشورہ لیتے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کا قول ہے کہ ہر کام مصلحت و مشورہ سے ٹھیک ہوتا ہے۔ معاملات یا[2] صلاح و مشورہ کی تدابیر کے حوالے کیے جاتے ہیں یا تقدیر کے۔ اس دوسری صورت میں وہ تذبذب کے تلاطم

۱۔ بالفعل = بحالتِ موجودہ، زمانۂ حال میں۔

۲۔ اصل میں "یا" کی بجائے "کیا" چھپا ہے جو "کہ یا" کا مرکب ہے اور قدیم اردو میں "یا" کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔

میں آن کر ڈانواں ڈول ہوتے ہیں اور بدمست کی طرح لڑکھڑاتے ہیں۔

زمانۂ قدیم میں ایک کہانی بنائی گئی جس میں سلطنت و مشورت کو تشبیہات میں اِس طرح بیان کیا ہے کہ جیو پی ٹر (رُومیوں کا بڑا دیوتا ہے) نے می ٹس[1] سے بیاہ کیا؛ یعنی سلطنت کا بیاہ مشورت سے ہوا۔ می ٹس کو حمل جیو پی ٹر سے رہا مگر خاوند نے اس کا انتظار نہیں کیا کہ بیوی کے پیٹ میں بچہ پورے دنوں کا ہو کر پیدا ہو، اس لیے وہ اسے کھا گیا، جس سے اُسے خود حمل رہ گیا اور اس کے سر سے پالس مسلّح پیدا ہوا؛ یعنے بادشاہ جو پہلے اپنے معاملات کونسل میں پیش کرتے ہیں، وہ اول حمل سے کہانی میں تعبیر ہوا ہے۔ جب کونسل ان معاملات کی صورت بنا سنوار کے تکمیل کرتی ہے تو بادشاہ ان کو کونسل سے لے کر پیٹ میں رکھتے ہیں تاکہ خود اپنے دماغ سے ان کا فیصلہ کرکے ان کا اعلان بڑی ہوشیاری اور زور سے کریں۔ گویا یہ دوسرے حمل سے پالس مسلّح کا پیدا ہونا ہوا۔ اس سے فقط بادشاہ کی حکومت ہی نہیں ظاہر ہوتی ہے، بلکہ اس کے مدبّر اور عالی دماغ ہونے کی شہرت خوب ہوتی ہے۔

کونسل سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں اور جو ان کے رفع کرنے کے لیے علاج کیے جاتے ہیں، وہ بیان ہوتے ہیں:

اول قباحت کونسل سے یہ ہوتی ہے کہ اس کے سامنے اظہارِ معاملات سے رازداری کی باتیں کھل جاتی ہیں۔

دوسری قباحت بادشاہوں کی کسر شان ہوتی ہے کہ وہ خود کاموں کو سر انجام نہیں کر سکتے جو اَوروں کے صلاح و مشورہ سے کام چلانا چاہتے ہیں۔

۱۔ می ٹس: غالباً یہ فارسِ قدیم کا دیوتا ہے جس کی عبادت وسط ایشیا اور یونان و روم کے لوگ بھی کرتے تھے اور اس کے لیے قربانیاں دیتے تھے۔

سوم قباحت یہ خوف ہے کہ اگر مشیر مؤتمن نہ ہوئے ، بے وفا اور بے ایمان ہوئے تو ان کا صلاح و مشورہ اپنے فائدے کے واسطے ہوگا ، کچھ بادشاہوں کے نفع کے لیے نہیں -

ان قباحتوں کے دور کرنے کے واسطے کونسل خفیہ بادشاہوں کے خلوت خانے میں مقرر ہوتی تھی مگر یہ علاج مرض سے بھی بدتر تھا -

اب سنو کہ افشائے راز کی قباحت کا انسداد اس طرح ہو سکتا ہے کہ بادشاہوں کو یہ ضرور نہیں کہ وہ اپنی باتیں سب مشیروں کے روبرو اعلان کر دیں ، بلکہ جو عاقل بادشاہ ایسا ہے کہ وہ اپنی چکی اپنے ہاتھ سے پیس سکتا ہے (یعنی سب کام اپنے آپ کر سکتا ہے) وہ ایک دو مشیر عاقل ، بیدار مغز ایسے انتخاب کرے جو سب طرح سے قابلِ اطمینان ہوں - اور علاوہ اس کے بادشاہ کونسل میں وہ باتیں پیش کرے جو وہ کرنی چاہتا ہے ، نہ وہ جو کرے گا -

اب دوسری قباحت دور کرنے کے لیے ، جس سے بادشاہ کی حکومت کا ضعف کونسل کے ہونے سے معلوم ہوتا ہے ، دوا یہ ہے جو کہانی میں بیان ہوئی کہ کونسل کی اولاد کا بادشاہ باپ بن جائے ، یعنی ان کے صلاح و مشورہ کی تدابیر کو وہ خود اپنا بنا کے اعلان کرے -

تیسری قباحت بے ایمان مشیروں کے انسداد کے واسطے یہ ہے کہ بادشاہ خود اپنے سے آپ ہی مشورہ کرے - کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کا قول ہے کہ ''دنیا میں کوئی نیک نہیں''- مگر یہ مقولہ مختص بالوقت[1] ہے ؛ ورنہ یوں مخلوق میں آدمی سچے ، ایمان دار ، بے ریا ، با وفا

۱- ''مختص بالوقت ہے'' یعنی یہ مقولہ ایک خاص زمانے سے تعلق رکھتا ہے یا خاص حالات کے لیے وضع کیا گیا ہے - ہر زمانے میں اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا -

ہوتے ہیں ۔ مکر و فریب کرنا ان کے پیٹ میں نہیں ہوتا ۔ پس بادشاہ کا کام ہے کہ ایسے آدمیوں کو اپنی طرف ملتفت کرے اور ان میں سے انتخاب کرے ۔ سوائے اس کے مشیر باہم متفق نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسرے کے رقیب و حریف ہوتے ہیں ۔ کوئی بات ان کی بادشاہ کے کان تک پہنچنے سے باقی نہیں رہ سکتی ۔ اگر صلاح و مشورہ میں جھگڑے اور خانگی امور کو دخل ہوتا ہے تو بادشاہ کو معلوم ہو جاتا ہے ۔ سب سے بہتر اس قباحت کے دور کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ بادشاہ اپنے مشیروں کے حال سے ایسا واقف ہو جیسے کہ مشیر بادشاہ کے حال سے خوب واقف ہوتے ہیں ۔ سب سے بڑی خوبی بادشاہ کی یہ ہے کہ وہ اپنے آدمیوں کو خوب جانے ۔

مشیروں پر لازم ہے کہ وہ بادشاہ کے مشورہ کار ہوں ، نہ خوشامدی ۔ بادشاہ کو چاہیے کہ وہ اپنے مشیروں سے معاملاتِ سلطنت میں خلوت میں الگ بھی مشورہ لے ، پھر مجموع کونسل میں بھی ۔ قاعدہ ہے کہ آدمی خلوت میں رائے اپنی بڑی آزادی سے ظاہر کرتا ہے اور اس کی طبیعت کو بڑی جرأت ہوتی ہے ، مگر مجمع میں یہ آزادی اور جرأت اوروں کی خاطر داری و ادب و لحاظ کے دباؤ سے دب جاتی ہے ۔ دونوں طرح کا مشورہ لینا مصلحت ہے ۔ اس کے اندر خلوت میں چھوٹوں کو آزادی ہوتی ہے اور مجمع میں بڑوں کو لحاظ و ادب ہوتا ہے ۔ بادشاہ کو معاملاتِ ملکی میں صلاح و مشورہ لینا بیکار ہے اگر وہ اہل کاروں کے باب میں صلاح و مشورہ نہ لے ۔ اس واسطے کہ معاملات تو مردہ تصویریں ہیں اور کارکن ان کی جان ہیں ۔ ان کے انتخاب میں صلاح و مشورہ مقدّم ہے ۔ اس انتخاب میں رائے کو بہت زور لگانا پڑتا ہے ، پھر بھی اس میں غلطیاں ہوتی ہیں ۔

کتابیں ایسی مشیر ہو سکتی ہیں جو خوشامد نہیں کرتیں ۔

یہ سچ کسی نے کہا ہے کہ مردہ سب سے زیادہ عمدہ مشیر ہوتا ہے - کتابیں صاف صاف مشورہ دیتی ہیں ، برخلاف زندہ مشیروں کے کہ وہ رُو رعایت مشورے میں کرتے ہیں - پس ان کتابوں سے خوب واقف ہونا چاہیے ؛ خصوصاً اُن کتابوں سے جو خود اسٹیج پر ایکٹر ہوتی ہیں -

ایجنڈا (جو باتیں کہ کونسل میں بحث کے لیے پیش ہوں) کی اطلاع پہلے سے دینی چاہیے - درخواستوں کے واسطے دن مقرر ہوں - کمیٹیاں جو مقرر ہوں ، اُن کے ممبر ایسے مقرر ہوں کہ کسی کی پاسداری نہ کریں - نہ ایسے ہوں کہ ان کی مخالفت آپس میں موازنت کرتی ہو - کمیشن مقرر ہوں ؛ جیسے کہ تجارت ، خزانہ ، لڑائی ، بعض خاص مقدّمات کے واسطے خاص اضلاع میں مقرر ہوں[1] - پھر جو ان کے سامنے شہادت پیش ہو تو اس میں معزّز پیشوں کے آدمیوں کی جیسے کہ قوانین دان وغیرہ ہیں ، مگر گواہی کی بھیڑ بھاڑ گستاخانہ دنگہ فساد ، غل شور مچاتے ہوئے نہ آئے ، بلکہ شہادت اس طرح لی جائے کہ جس سے معلومات میں علم حاصل ہو[2] - کونسل کے کمرے کی موزوں شکل و صورت بھی خالی از اثر نہیں ہوتی - جب بادشاہ میرِ مجلس ہو تو اس کو جن باتوں کی طرف میلانِ طبع ہو ، ان کا اظہار نہایت ہوشیاری سے کرنا چاہیے - اگر وہ خود بولنے لگے گا تو اس کے مشیر خوشامدی بن جائیں گے اور صرف اس کا دل خوش کر دیں گے -

---

۱- یہ جملہ اور اس سے پہلے کے دو جملے اصل میں اسی طرح چھپے ہیں - غالباً کاتب سے کچھ الفاظ چھوٹ گئے ہیں کیونکہ عبارت مربوط نہیں ہے -

۲- یہ جملہ بھی اصل کے مطابق ہے - غالباً مراد یہ ہے کہ معلومات میں اضافہ ہو -

۲- کمیٹیوں اور کونسلوں میں معاملاتِ ملکی کا فیصلہ زیادہ تر کثرتِ رائے پر ہونا: جو لوگ بچوں کی سی معمولی سمجھ رکھتے ہیں یا علمِ تاریخ سے ناواقف ہیں، یا جو دنیا میں گزر رہا ہے، اُس کا مشاہدہ نہیں کرتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہی اصول اِجرا پاتے ہیں جن پر غلبہٗ آرا ہوتا ہے اور باقی رائیں سب نابود ہو جاتی ہیں، ان پر کچھ لحاظ نہیں ہوتا؛ جیسے کہ ایک جسم پر بہت زور اثر کریں تو جو زبردست زور ہوگا، اُس کی طرف جسم متحرّک ہوگا، ایسے ہی زبردست رایوں کی طرف فیصلہ کھنچے گا۔ یہ دونوں باتیں وہ غلط سمجھتے ہیں۔ جسم تو کسی زور کی سمت میں حرکت نہیں کرے گا بلکہ ایسی سمت میں جائے گا جو کسی زور کی بھی سمت نہ ہوگی۔ ایسے ہی معاملاتِ ملکی میں تجربہ بتاتا ہے کہ جو اصول جاری ہوتے ہیں، وہ کسی خاص مشیر کی رائے کے مطابق نہیں ہوتے۔ بلکہ ایک اور نیا اصول ہوتا ہے جو کسی کی رائے سے نہیں ملتا۔ انگلستان کی تاریخ کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ایک گروہ خالص حکومتِ شخصی کا طرف دار تھا، وہ چاہتا تھا کہ وہ قائم ہو۔ دوسرا اس کا مخالف گروہ سلطنتِ جمہوری کا خواہاں تھا۔ ان اختلافِ آرا کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کی وہ تیسری صورت قائم ہوئی کہ نہ شخصی تھی نہ جمہوری۔

قاعدہ ہے کہ گو مخالف گروہوں میں کسی گروہ کی رایوں کی کثرت اور غلبہ ہو مگر مغلوب رائیں بھی اپنا اثر ضرور کرتی ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک مجمع، خواہ کیسے ہی بڑے عقلا کا ہو، وہ کسی امر کے فیصلے کے لیے بیٹھے تو ان میں اختلاف آرا نہ ہو۔ مگر یہ اختلاف ایک دوسرے کو روکتا نہیں بلکہ تائید کرتا ہے۔ اگر دنیا میں اختلافِ آرا کا اثر نہ ہوتا اور ایک طرف کی رائیں مغلوب ہو کر

نیست و نابود ہو جاتیں تو دنیا کا انتظام اس سے بدتر ہوتا جو اب ہے - خلاصہ یہ ہے کہ اگر کونسل قابلِ اعتبار و اعتماد ہو تو اس سے سلطنت کا استظہار و اعتضاد[1] ہوتا ہے -

۱۱۴ - تاخیر

۱- معاملات کے انصرام کرنے اور سرانجام دینے میں جو تاخیر اور سرعت کی جاتی ہے ، ان دونوں کی تائید اور رد میں معقول دلائل پیش ہو سکتی ہیں - ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ "کارِ امروز بر فردا مگذار" (آج کا کام کل پر نہ ٹالو) - دوسرا گروہ یہ کہتا ہے جو کام کل کر سکتے ہو اس کو آج نہ کرو - غرض تاخیر و شتابی کے واسطے ایسے قواعد منضبط نہیں ہو سکتے کہ ان پر چلنے سے کام کا سرانجام پورا ہو جائے - قاعدے جلد ختم ہو جاتے ہیں ، پھر فکرِ عملی کو سوچ بچار کر کے منصوبے باندھنے پڑتے ہیں اور ان کے موافق آگے قدم چلانا پڑتا ہے - تاخیر سے کبھی موقع ہاتھ سے جاتا رہتا ہے ، کبھی اس سے کاموں کی تکمیل ہو جاتی ہے - قسمت کا حال بازار کا سا ہے کہ کبھی اس میں ٹھہرنے سے بھاؤ گر جاتا ہے ، چیز سستی ملتی ہے ، کبھی بھاؤ بڑھ جاتا ہے ، چیز مہنگی ملتی ہے - جو بڑے دانش مند ، عالی مرتبہ ہیں وہ بہت تاخیر بھی کرتے ہیں ، بہت جلدی بھی کرتے ہیں - مگر بہت سے آدمی اِن عاقلوں کا منہ بھی چڑاتے ہیں - انھی کی مثل تاخیر اور سرعت کرتے ہیں مگر بے موقع اور بے محل - ایک امر کا فیصلہ جلدی کرتے ہیں مگر اس کے موافق عمل کرنے میں تاخیر کرتے ہیں - ایک کام کے شروع کرنے میں نہایت

۱- استظہار و اعتضاد = تقویت ؛ مطلب یہ کہ سلطنت کو ایسی کونسل سے تقویت حاصل ہوتی ہے اور وہ مضبوط ہو جاتی ہے -

جلدی مگر اس کی تکمیل میں نہایت تساہل - وہ اپنے توپ خانوں کو جلدی کھول کر لگا دیں گے مگر توپوں کو بھرنے میں اتنی دیر لگائیں گے کہ اپنی ہری کھیتی کو ملیامیٹ کر دیں گے - درختوں پر جو پکّے پھل لگے ہوتے ہیں ، ان کے توڑنے میں اِتنی تاخیر کریں گے کہ وہ ہوا سے زمین پر گر کر گل سڑ جائیں گے -

جو لوگ تاخیر کے عادی ہوتے ہیں وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے ہیں کہ ابھی دنیا ان تدابیر کے عمل میں لانے کے لیے تیار و پختہ نہیں ہے ، ابھی ان کا وقت نہیں آیا - مگر وہ اس امر کی تحقیق کو بھول جاتے ہیں کہ جب وہ پک رہی ہے تو کب اور کیوں کر و پختہ اور تیار ہو گی - اس کا پکانے والا اور کامل کرنے والا وقت نہیں ہوتا - جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وقت نے یہ تبدیلیاں کیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس وقت میں یہ تبدیلیاں ہوئیں - وقت فاعل نہیں ہوتا - وہ اور چیز ہوتی ہے جو بتدریج تبدیلیاں کرتی ہے - اس واسطے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کون سی چیز ہے جو تبدیلیاں کر رہی ہے اور کس سمت میں تبدیلی کرتی ہے ، اور تبدیلی خاص جو اُس سے ہو گی ، وہ مشکلات ڈالے گی یا آسانی کرے گی - مثلاً ہم پانی میں گھر گئے ہوں تو ہم کو یہ سوچنا چاہیے کہ پانی کا اُتار ہے یا چڑھاؤ - اگر چڑھاؤ ہے تو خواہ کیسی ہی جوکھوں اُٹھانی پڑے ، اُس میں سے جتنا جلد ممکن ہو باہر نکلنا چاہیے - اگر اُتار ہے تو صبر کرنا چاہیے - اگر پانی ٹھہرا ہوا ایک حال پر ہے تو سمجھنا چاہیے کہ گو ڈوبنے کا تو خوف نہیں ہے مگر پانی میں کھڑا رہنا مناسب نہیں ہے ، اس سے ایک ہی دفعہ میں نکل آنا چاہیے -

قسمت جلد بازوں سے چیزوں کی قیمت لیتی ہے اور تاخیر کرنے والوں کو مفت چیزیں دیتی ہے - جب ہم کسی چیز کو جلد شروع

کر دیتے ہیں تو اس کے سایے کو مٹھی میں پکڑتے ہیں - کوئی چیز ڈگمگا رہی ہو تو جب تک وہ بحالِ خود نہ آئے اس پر عمل کرنا نہیں چاہیے - جب کسی کام کا آغاز کرو تو اس کو سو آنکھوں سے دیکھ لو اور جب اس کی تکمیل کرو تو سو ہاتھ اس میں لگاؤ، یعنی کام کے آغاز میں سوچ بچار کرو اور اس کی تکمیل میں جلدی - جب کسی کام کے کرنے کا موقع و محل ہوتا ہے تو وہ تمھارے ہاتھ میں استادی کا دستہ دیتا ہے جس کا پکڑنا نہایت آسان ہے، مگر بعد اس کے وہ پیٹ پکڑاتا ہے جس کی گرفت مشکل ہے - اس سے بہتر کوئی دانائی نہیں کہ آدمی موقع اور وقت پر کام کا آغاز کرے اور اس پر حملہ آور ہو - شتابی اور تاخیر زیادہ تر خوفوں کے محل پر کرنی پڑتی ہے - جو خوف ہلکے اب معلوم ہوتے ہیں وہ دیر کے بعد ہلکے نہیں رہتے - بہت سے خوف آدمی کو دھوکا دیتے ہیں اور چڑھ کر وہ دباتے ہیں - بہتر ہے کہ بعض خوفوں کو ہم چل کر آدھے ہی رستے میں لے لیں، کیونکہ دیر تک ان کی چوکسی کے واسطے پہرہ دینے میں احتمال ہے کہ نیند نہ آ جائے - کبھی اس کے برخلاف لوگ[1] کرتے ہیں، مگر ابھی خوف آیا نہیں کہ اس کے دور کرنے میں شتابی کرتے ہیں - جیسے چاند نیچا دشمنوں کی پیٹھ کی طرف چمک رہا ہو تو یہ ان کے لمبے سایے پر گولیاں لگانی شروع کر دیتے ہیں - غرض تاخیر و شتابی اپنے اپنے محل پر شروع کرنی چاہیے - بعض کام تاخیر سے خاک میں مل جاتے ہیں، بعض شتابی سے -

۲- جس شخص نے اول یہ مقولہ کہا کہ ''کارِ امروز بر فردا مگذار'' اس کو دانش مند کہنے میں کوئی تأمل کرے مگر کوئی

۱- اصل : لوگ یہ کرتے ہیں -

اُسے احمق نہیں کہے گا - اگر آدمی آج کے کام کو کل پر ٹالتا جائے تو اس قدر کاموں کا ہجوم ہو جائے گا کہ پھر وارثوں ہی کو ان کا پورا کرنا پڑے گا - آج ہی کے سینکڑوں کام ایسے ہوتے ہیں کہ آج کے آج نہ کرنے سے بڑا نقصان ہوتا ہے - مثلاً بڑے آدمیوں کے چھوٹے آدمیوں سے وعدے، سینکڑوں بنج بیوپار میں روپے کے دینے کا اقرار، اگر آج کے آج نہ پورے کیے جائیں تو بات میں اور ساکھ میں اُن کے فرق آتا ہے کہ آگے اعتماد اور اعتبار جاتا ہے -

۱۱۵- سیان پت

۱- جس انگریزی لفظ کا ترجمہ ہم نے ''سیان پت'' کیا ہے، اُس سے مراد ٹیڑھی ترچھی عقل کے ہیں - سیان پت کے ساتھ مکاری کرنی ایک ہنر ہے مگر کج عقلی کے ساتھ - سیانے مکار اور عقل مند میں فرق صرف بہ لحاظ راست بازی کے ہی نہیں ہوتا بلکہ لیاقت اور قابلیت کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے - کسی شخص کی عقل خواہ کیسی ہی ہو، مگر اخلاق اس کے رذیل ہوں تو وہ انسان کی سرشت کے خراب اور ضعیف حصے سے واقف ہو سکتا ہے اور نیک حصے سے نہیں - شریر مکار کو یقین ہوتا ہے کہ میری ہی سی طبیعت اور سرشت سارے آدمیوں کی ہے - بعض آدمی انسانوں کی تقسیم احمقوں اور شریروں میں کیا کرتے ہیں - جب ان کو کوئی راست باز آدمی ملتا ہے تو وہ حیران ہوتے ہیں کہ اس کو انسانوں کی کس قطار میں شمار کریں -

نپولین[۱] بونا پارٹ جب کسی کو پہلے دولت کی تحریص اور

۱- نپولین: (۱۷۶۹ء — ۱۸۲۱ء) مشہور فرانسیسی فاتح - قصبۂ جاکیسو میں پیدا ہوا - اس نے اٹلی، مصر، فلسطین، روس پر حملے کیے - آخر واٹرلو کے معرکے میں شکست کھائی اور جزیرۂ سینٹ ہیلینا میں فوت ہو گیا -

پھر جاہ و منصب عالیہ کی ترغیب دیتا ، اور وہ اس کے دام میں نہ آتا ، تو اس کو پرلے درجے کا احمق جانتا یا آدھا پاگل ، خواب دیکھنے والا - گویا کونشنس کو وہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا - اگر شریر مکار اور راست باز میں سب باتیں برابر ہوں تو راست باز کو یہ فائدہ زیادہ حاصل ہے کہ وہ انسان کی سرشت کو بہ نسبت شریر کے زیادہ سمجھنے کی قابلیت رکھتا ہے - حیوان کے تمام اوصاف انسان سمجھ سکتا ہے ، مگر انسان کی وہی صفتیں حیوان جان سکتا ہے جو خود اس میں ہیں - پس ایسے ہی شریر مکار ، راست کردار کے اوصاف نہیں سمجھ سکتا ہے مگر راست کردار اس کے اوصاف کو خوب سمجھ سکتا ہے ، بشرطیکہ بالکل بھولا بھالا نہ ہو - بعض آدمیوں میں لڑائی ، فساد ، جھگڑوں میں معاملہ فہمی کی بڑی عقل ہوتی ہے مگر اور معاملات میں سب طرح سے ضعیف العقل اور کم فہم ہوتے ہیں - ان کا حال ایسا ہوتا ہے کہ جیسے کوئی گنجفہ کے شعبدے دکھانے خوب جانے مگر اس کا کھیلنا نہ جانے -

ایک مردم شناسی ہے ، دوسری معاملہ فہمی - بعض آدمی مردم شناس ہوتے ہیں مگر معاملہ فہم ایسے نہیں ہوتے کہ معاملے کی اصل تہہ پر ان کی طبیعت پہنچ جائے - وہ زیادہ تر کتابوں سے آدمیوں کا مطالعہ کیا کرتے ہیں - ایسے آدمی سازشوں کے لیے بہ نسبت کونسل کے زیادہ مناسب ہوتے ہیں - وہ لوگ جو اپنی روش کے عادی ہیں ، اس پر خوب چالیں چلتے ہیں ، مگر اس سے ذرا پھیر کر ان کو نیا رستہ بتا دو تو پھر وہ ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ ان کی اپنے مقصد تک رسائی نہیں ہو سکتی - احمق اور عقل مند پہچاننے کا یہ پرانا قاعدہ ہے کہ دونوں کو ننگا کر کے بیگانے آدمیوں میں بھیج دو - پھر جان لو کہ وہ کیا ہیں - یہ اِن مکاروں پر صادق

نہیں آتا - اِن مکاروں کا حال ٹُٹ پونجیے بساطیوں کا سا ہوتا ہے کہ جن کی دوکان کے اسباب کی تفصیل میں مشکل نہیں پڑتی - ایسے ہی ان کے مدِ نظر چھوٹے چھوٹے مکر و فریب رہتے ہیں - ان کے شمار کرنے میں کچھ دقّت نہیں - سو ہم ان کو شمار کرتے ہیں -

(۱) جس سے وہ باتیں کرتے ہیں اُس کے چہرے کو خوب اپنی نظروں سے تاکتے ہیں - گویا چہرے سے باتیں وہ سمجھتے ہیں جو زبان کے کہنے سے جانتے - بُشرے کو دل کا عنوان جانتے ہیں - بہت سے دانش مند ایسے ہوتے ہیں کہ جو باتیں ان کے دل میں ہوتی ہیں ، وہ ان کے چہرے پر عیاں ہوتی ہیں -

(۲) جن لوگوں سے مطلب نکالنا ہو ، ان کو اَور باتوں میں ایسا متوجہ کر لینا کہ ان کو موقع اور وقت ان کے مطلب پر اعتراض کرنے کا نہ رہے ؛ جیسے کہ کسی حاکم سے کاغذات پر دستخط کرانے ہوں تو حاکم کو ایسی باتوں میں لگائیں کہ کاغذات پر دستخط کرنے میں اس کو اعتراض کرنے کے لیے وقت ہی نہ رہے یا ایسے وقت پیش کریں کہ حاکم کو جلدی ہو -

(۳) کسی کام پر ان کو اعتراض کرنا مقصود ہوتا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ دوسرا شخص اس کو بہت خوبی اور سلیقے سے پیش کرے گا تو بظاہر وہ اس کام کے حامی اور خواستگار ہو کر خود پیش کرتے ہیں ، اور اس کو پیش کرنے میں ایسی شرارت کرتے ہیں کہ وہ کام خاک میں مل جاتا ہے -

(۴) معاملات میں اپنی معلومات بڑھانے کے واسطے باتیں ایسی ملاتے ہیں کہ دوسرا آدمی ان کی باتیں سننے کا شائق ہو جاتا ہے -

(۵) بعض وقت ان کو یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی بات جب کہیں کہ کوئی ہم سے پوچھے ؛ تو اس مطلب کے لیے

وہ اپنی عادت اور دستور کے برخلاف چہرے کو بدل کر ایسی صورت بناتے ہیں کہ بے اختیار لوگ پوچھیں کہ خیر تو ہے؟ آپ کی صورت ایسی کیوں بن رہی ہے؟ مثلاً بادشاہ کے روبرو بشاش بشاش روز جاتے تھے مگر مطلب کے دن چہرے کو اداس بنا کر گئے تو خواہ مخواہ بادشاہ پوچھے گا کہ چہرہ کیوں بنا ہوا ہے؟ اس وقت اپنے مطلب کا اظہار کریں گے۔

(۶) جن باتوں کو وہ چاہتے ہیں کہ ان کی اپنی نہ معلوم ہوں تو وہ ان کو اوروں کے نام سے بیان کرتے ہیں۔ یا کہتے ہیں کہ باہر ان کی شہرت ہو رہی ہے اور ایک دنیا ان کو کہہ رہی ہے۔

(۷) دوسرے کے بیان میں ایک بات ایسی کہہ دیتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ کہنے والا اپنی عظمتِ بیان سے ماہر نہ تھا یا حیران تھا۔

(۸) اپنے حریف یا رقیب کے کان میں ایسی بات ڈال دیتے ہیں کہ جس کے کہنے سے وہ تباہ اور برباد ہو جائے۔ مثلاً کسی شخص کو عہدہ ملتا ہو تو وہ اس عہدے کے قبول کرنے کی شرائط ایسی بیان کریں گے کہ اگر امیدوار ان کو کہے تو عہدہ دینے والا بیزار ہو جائے۔

(۹) اپنی حفاظت کا بہانہ بنا کر دوسرے پر حملہ کرتے ہیں۔ ایک بات خود کہتا ہے مگر بتاتا یہ ہے کہ دوسرا شخص کہتا ہے۔ یہ معاملہ دو آدمیوں میں ہوتا ہے۔ اس کے جھوٹ سچ کی تحقیق بھی مشکل ہوتی ہے کہ کس نے پہلے وہ بات کہی۔

(۱۰) اپنے مطلب کو داستان کی لپیٹ میں بیان کرتے ہیں۔ پہلے بہت سی تمہیدیں کہانی کے طور پر کہتے ہیں جس سے اور لوگ بھی محظوظ ہوتے ہیں اور ان کو خود بھی مزہ آتا ہے۔ یوں بہت دیر تک باتیں بنانا اور اصل مطلب کو پیے بیٹھے رہنا بڑے صبر

کا کام ہے مگر فائدہ مند بھی زیادہ ہے -

(۱۱) ایک آدمی کے منہ میں وہ جواب رکھ دیتے ہیں جو ان کا خود مطلب ہوتا ہے - یکایک سوال ایسا کرتے ہیں کہ جس کے جواب میں دوسرا آدمی کھل جاتا ہے -

(۱۲) اپنی تقریر کے لیے جب تک موقع اور وقت ہاتھ نہ آئے ، انتظار کرتے ہیں -

(۱۳) دوسرے کی سچ بات کو دفعتاً سوال کرنے سے بہ زور چھین لیتے ہیں -

اس مکاری میں بعض دفعہ بڑی ذہانت خرچ کی جاتی ہے - ایک دفعہ کسی جلیل القدر افسر کو گورنمنٹ نے یہ حکم بھیجا کہ اگر تم اپنے وطن سے باہر رہو تو تم کو بڑی پنشن دی جائے گی اور اگر تم اس حکم سے راضی نہ ہو گے اور وطن میں آؤ گے تو تمھارے جرموں کی تحقیقات کی جائے گی - ایک مکار صلاح کار نے جو پانی ہلا کے مچھلی پکڑنا چاہتا تھا ، اس کو یہ صلاح دی کہ اگر تم اپنی تحقیقات میں مجرم ہو تو گورنمنٹ کا حکم بسر و چشم قبول کرو اور اگر بے گناہ ہو تو وطن میں جا کر تحقیقات کر آؤ - اس صلاح سے وہ افسر یہ سمجھا کہ اگر میں وطن نہ جاؤں گا تو یقینی مجرم سمجھا جاؤں گا - وہاں گیا اور مجرم قرار پا کر سزایاب ہوا - صلاح کار اپنے مطلب میں کامیاب ہوا -

سیان پت کی چھوٹی چھوٹی باتیں بہت ہیں - ان کی فہرست بنانی اچھا کام ہے ، کیونکہ ان کی برابر سلطنت کے کاموں میں کوئی خلل انداز نہیں - بہت سے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی سیان پت سے سلطنت کے کاموں میں چھلانگیں مار جاتے ہیں ، مگر ان میں قوت اور استعداد ایسی نہیں ہوتی کہ وہ مستقل طور پر نظم و نسق

کر سکیں ۔ ان کا حال ایسے مکانوں کا سا ہوتا ہے کہ جن کا دروازہ اور زینہ تو بہت عمدہ ہو مگر کوئی کمرہ اچھا نہ ہو ۔ عاقل آدمی اپنے قدموں کو دیکھ کر چلتا ہے ۔ احمق مکروں کی طرف چل کر پھندے میں پھنستا ہے ۔

۲۔ سیانے نیکی کا پاس لحاظ نہیں کرتے ۔ فرزانگی کا منہ چڑایا کرتے ہیں ۔ یہ سیان پت کی صفت بہت اچھی ہے ، نہ بہت بری ، وہ نیکی اور بدی کے درمیان تیرا کرتی ہے ، لیکن اگر وہ ایک قدم اپنا بڑھا کر جھوٹ سے اپنے تئیں ملا دے تو پھر وہ شرارت بن جاتی ہے ۔ کوئی ضرورت نہیں پیش ہوتی ہے کہ جس میں وہ اپنا قدم نہیں اڑاتی ، لیکن فرزانگی اسے نکال کر اس کی جگہ لے لیتی ہے ۔

۳۔ سیانے آدمیوں کی تقریروں میں ہمیشہ یہ سوچ کر سمجھنا چاہیے کہ مآلِ کار ان کا کیا ہے ۔ جو باتیں وہ جانتے نہیں ، ان سے یہ کہنی چاہئیں ۔ ان کے ساتھ تمام مشکل معاہدوں میں آدمی یہ سمجھے کہ ایک دن میں بویا اور کاٹا نہیں جاتا ۔ بتدریج اس کے پختہ ہونے کا انتظار کرے ۔

۴۔ **سیان پت اور ہوشیاری میں فرق :** سیانے کے تمام مقاصد اپنی خود غرضی اور خود مطلبی کے ہوتے ہیں ۔ وہ کسی بات پر ایسا نہیں جمتا جس سے کامیابی ہو ۔ سیان پت کوتاہ نظر ہوتی ہے جو ہاتھ تلے کی چھوٹی چیزوں کو خوب دیکھتی ہے مگر دور کی چیزوں کو وہ نہیں دیکھ سکتی ۔ ہوشیاری وہ بصارتِ ناقد اور بصیرتِ نافذ رکھتی ہے کہ بڑے بڑے[1] منظروں کو اور سارے افق کو زیرِ نگاہ رکھتی ہے ۔ ہوشاری جتنی ظاہر ہوتی جاتی ہے ، آتنی ہی ہوشیار کی

۱۔ اصل : بڑی بڑی ۔

حکومت بڑھاتی ہے - اور سیان پت جو ایک دفعہ ظاہر ہو جاتی ہے تو سیانے کو بھولے بھولے سے آدمی سے بھی بدتر بنا دیتی ہے ، اور پھر اُس کے کام اِتنے بھی نہیں چلتے جیسے کہ ایک سیدھے سادے آدمی کے - ہوشیاری عقل کا کمال ہے اور وہ تمام زندگانی کے فرائض میں رہنمائی کرتی ہے - سیان پت ایک عقلِ حیوانی ہے جو بالفعل کی بھلائی اور منفعت کو دیکھ لیتی ہے - ہوشیاری نیک فہم عاقل میں ہوتی ہے ، سیان پت وحشی حیوانوں میں ، یا انسانوں میں جو ان سے کچھ ہی بہتر ہوں ، پائی جاتی ہے -

۵- **سیان پت اور فرزانگی کے درمیان فرق :** سیان پت اور فرزانگی میں ایسا فرق ہے جیسا کہ شفق اور دن کی دھوپ میں - جو شخص آفتاب کی روشنی میں چلتا ہے تو وہ دلیرانہ پاس کے رستے پر جاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کہاں راہ سیدھی اور ہموار ہے ، وہاں وہ آسانی سے چلا جاتا ہے ، اور جہاں دیکھتا ہے کہ راہ کج اور پُر نشیب و فراز ہے تو اپنی سدِّ راہوں[1] سے بچتا ہے - لیکن جو آدمی شام کی تاریکی میں سفر کرتا ہے تو جتنا اس کو کم سُجھائی دیتا ہے اُتنا ہی وہ خوف کھاتا جاتا ہے اور ہر قدم پر خائف رہتا ہے - پُھونک پُھونک کر قدم اٹھاتا ہے اور جو آواز کان میں آتی ہے اس سے ڈرتا ہے کہ کہیں وہ خطرناک نہ ہو -

فرزانگی ایک ہی دفعہ کسی کام کے انجام اور وسائل کو سمجھ جاتی ہے اور اس کی آسانی اور دشواری کا تخمینہ کر لیتی ہے اور اس کے مناسبِ حال ہوشیاری کو اختیار کرتی ہے - سیان پت کو یہ حال بہت کم معلوم ہوتا ہے اور اس کو کوئی اَور چارہ کرنا سوائے فضول مکر اور فریب کے بے شمار شبہوں کے آتا نہیں - سیانے آدمی

۱- سدّ راہوں : "سدِّ راہ" کی جمع بطریقِ ہندی - سدِّ راہ = راستے کی دیوار ، رکاوٹ -

کو کبھی طمانیتِ خاطر نہیں ہوتی اور وہ اپنے تئیں ایمن اور محفوظ نہیں جانتا، اس لیے اپنے تئیں ایک ایسے غلاف میں چھپائے رکھتا ہے کہ کبھی رقیب اور جاسوس کی نگاہ کی رسائی اس تک نہیں ہوتی -

۶- لومڑی بڑی سیانی ہوتی ہے - جہاں اس کی ناک اندر چلی جاتی ہے وہاں اس کا سارا جسم چلا جاتا ہے - یہی حال سیانے آدمی کا ہے کہ جہاں کوئی بات اس کی چل جاتی ہے، پھر وہاں بہت باتیں اس کی چل جاتی ہیں -

۱۱۶- اپنی ذات کے لیے دانائی

۱- اپنی ذات کے لیے دانائی سے مراد یہ ہے کہ آدمی دانائی کا کام فقط اپنی ذات کی محبت کے سبب سے کرے - ایک اپنی ذات سے محبت ہے جس کو خود مہری کہتے ہیں - دوسرے خود مطلبی یا خود غرضی - جس انگریزی لفظ کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے، اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے اغراض اور مقاصد کو اوروں کے اغراض اور مطالب پر تقدیم اور ترجیح دے اور اپنی خوشی کے آگے اوروں کی خوشی کا خیال نہ رکھے - خود مہری انسان تنہائی میں بھی کر سکتا ہے مگر خود غرضی میں سوسائٹی کا ہونا ضرور ہے - جو لوگ اپنی ذات سے محبت رکھتے ہیں وہ اوروں کو تباہ کرتے ہیں - آدمی پر لازم ہے کہ اپنی محبت کو اپنی ذات اور سوسائٹی کے درمیان تقسیم کرے اور اپنی خود مہری اور غیروں کی محبت میں مصالحت رکھے - اپنی ذات کے ساتھ محبت میں سچا ایسا ہونا چاہیے کہ دوسرے کے ساتھ محبت میں جھوٹا نہ ہو - خاص کر اپنے ملک اور بادشاہ کے ساتھ تو جھوٹ کا سایہ بھی نہ پڑا ہو - اپنی ذات کو اپنے سارے کاموں کا مرکز اور مرجع نہیں بنانا چاہیے - اجرامِ فلکی جب اوروں

کے مرکز کے گرد پھرتے ہیں تو وہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔ بادشاہ کی ذات تنہا نہیں ہوتی ، اس کی برائی بھلائی میں اور لوگ بھی شریک ہوتے ہیں ، اس لیے بادشاہ کی خود مِہری سے وہ خرابیاں نہیں پیدا ہوتیں جو اراکینِ سلطنت اور وزرا کی خود مِہری سے ہوتی ہیں۔ ان کی یہ خود مِہری کی اغراض سلطنت کی اغراض سے ان کو منحرف کر دیتی ہیں اور ان کی خود غرضی کی چھوٹی چھوٹی[1] باتیں سلطنت کے بڑے بڑے کاموں کو بگاڑ کر بھی بادشاہ کو راضی رکھتی ہیں۔ ان کو بادشاہ کی خوشامد کا ڈھب ایسا یاد ہوتا ہے کہ وہ اس کو کام بگڑنے پر ناراض نہیں ہونے دیتے۔ یہ خود غرض دو ہی باتیں پیشِ نظر رکھتے ہیں ؛ ایک اپنی مطلب برآری ، دوم بادشاہ کو راضی رکھنا۔ ان دونوں غرضوں کے واسطے وہ اپنے آقا کی خیر خواہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر بادشاہ کے جلیل القدر افسر مثل جنرل ، سفیر ، خزانچی اور اور چھوٹے ملازم نمک حرام اور بد خواہ ہوتے ہیں اور ان کی خود غرضی کے دائرے کا مرکز سلطنت کے اغراض کے مرکز سے متّحد نہیں رہتا تو جتنا بادشاہ کا نقصان ہوتا ہے ، اتنا ان نوکروں کو فائدہ نہیں ہوتا۔ جب نوکر کے فائدے اور آقا کے نقصان میں تناسب نہیں رہتا — نوکر اپنے ٹکے کے فائدے کے لیے آقا کے روپے کے نقصان کا خیال نہیں کرتا — تو نہایت مضر اور زبوں اثر پیدا ہوتے ہیں۔ بعض کم بخت خود غرض وہ ملازم ہوتے ہیں کہ آقا کے گھر میں آگ اس واسطے لگاتے ہیں کہ اپنے انڈوں کو پکائیں۔

جن خود غرضوں میں خود مِہری ہوتی ہے ، ان میں جانوروں کی دانائی پائی جاتی ہے ؛ کسی میں چوہے کی کہ وہ چند روز پہلے

۱۔ اصل : جھوٹی جھوٹی باتیں۔

اُس گھر کو چھوڑ دیتا ہے کہ جو گرنے کو ہوتا ہے - کسی میں لومڑی کی کہ بجّو جو اپنا گھر بناتا ہے ، اس کو ڈھا دیتی ہے - کسی میں مگرمچھ کی کہ جب وہ کسی کو نگلتا ہے تو پہلے آنکھوں سے آنسو بہاتا ہے - سب سے زیادہ دانائی جو قابلِ یاد ہے اُن کی ہے جو اپنی ذات کے پیار کرنے والے بغیر کسی رقیب کے ہوتے ہیں - وہ اپنا سارا وقت اپنی ذات کے لیے وقف کر دیتے ہیں ، مگر قسمت ان کو خود ذبح کرتی ہے اور بد نصیبی کے دن دکھاتی ہے - جن بازوؤں اور پروں سے وہ اُڑنا چاہتی ہے ، وہی بندھ جاتے ہیں - یہ خود سپہری انسانوں میں بالکل حیوانوں کی سی ہوتی ہے -

۲- تُو کسی سے محبت نہیں کرتا مگر اُس سے جس سے اور کوئی محبت نہیں رکھتا ، یعنی خود اپنے سے - انسان کا خوشامدی کوئی اپنی محبت سے زیادہ نہیں ہے - وہ سچ کو دھندلی روشنی میں دیکھتی ہے - وہ اور خوشامد دونوں جڑواں بہنیں ہیں اور انھوں نے اپنی آنکھیں ایسی ایک کر رکھی ہیں کہ اگر ایک کو پھوڑو تو دوسری خود پھوٹ جاتی ہے -

۳- اپنی ذات کی محبت جیسی خطاؤں کو بڑھاتی ہے ، ایسی ہی نیکیوں کو - جیسے تالاب کے اندر ، جس کا پانی ٹھہرا ہوا ہو ، ایک چھوٹا سا پتھر پھینکو تو وہ ایک مرکز پر سے موجوں کے دائروں پر دائرے پیدا کرے گا ، اِسی طرح اپنی محبت نیک آدمیوں کے دلوں میں مربیوں ، دوستوں ، ہمسایوں ، مُلک ، کل انسانوں کی محبت کی موجیں اُٹھا کر پھیلاتی ہے -

۱۱۷- ایجاد

۱- جس انگریزی کا لفظ ترجمہ ''ایجاد'' کیا ہے اُس کے معنی یہ

ہیں کہ کسی جدید چیز کا یا نئی تبدیلی کا داخل کرنا، خواہ وہ بری ہو یا بھلی - ایجاد جوان کی ذہانت اور پیر کی ججمنٹ[1] ہوتا ہے - جیسے مخلوق میں ہر چیز ابتدائے پیدائش میں بد شکل و بھونڈی ہوتی ہے، ایسے ہی زمانہ جو ایجاد کرتا ہے، ابتدا میں وہ بدنما معلوم ہوتا ہے - جیسے کوئی شخص، جو اول ہی ابتدا میں اپنے خاندان کی عزت و حرمت قائم کرتا ہے، وہ اکثر اپنے قائم مقاموں سے زیادہ لائق ہوتا ہے، ایسے ہی جو شخص کسی چیز کا موجدِ اول ہو، خواہ اُس کا ایجاد کیسا ہی بے ڈول اور بھونڈا ہو، وہ اپنے مقلدین پر ترجیح و تقدیم رکھتا ہے - کہا کرتے ہیں کہ زمانہ بڑا موجد ہے - اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ زمانہ ایجاد کیا کرتا ہے - زمانہ خود کچھ نہیں کرتا مگر اس کے اندر اور اسباب ایسے جمع ہو جاتے ہیں کہ وہ چپکے چپکے اندر ہی اندر تبدیلیاں کیا کرتے ہیں، جو بظاہر نہیں معلوم ہوتیں مگر ان کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے کہ اس میں وہ نمایاں ہوتی ہیں - اگر یہ اسباب اپنا کام نہ کریں تو ہزاروں برس میں کوئی تبدیلی نہ واقع ہو - اُمورِ سلطنت میں جو تغیّرات ہوتے ہیں ان کے باعث ارا کینِ سلطنت اور رعایا ہوتے ہیں نہ زمانہ - مگر یہ ہمارا محاورہ ہے کہ جو کام زمانے کے اندر ہوتا ہے اس کا فاعل زمانے کو کہتے ہیں - ظرف کو مظروف کی بجائے مجازاً فاعل کہتے ہیں - محاورے کے موافق بولا یوں کرتے ہیں کہ زمانہ یہ کر رہا ہے - اگر زمانہ چیزوں کو برا بنائے اور دانائی اور تدابیر اُن کو بہتر نہ بنائے تو معلوم نہیں کہ دنیا کا انجام کیا ہو -

یہ سچ ہے کہ رسم و رواج و دستور کے موافق جو اُمور فیصل

۱- Judgement -

ہوتے ہیں ، گو وہ اچھے نہ ہوں مگر وہ مناسب کچھ نہ کچھ ہوتے ہیں - جو چیزیں کہ مدت تک رفاقت رکھتی ہیں ، ان میں باہم الفت ہو جاتی ہے - برخلاف نئی چیزوں کے کہ گو وہ فائدہ پہنچائیں مگر ان کو پرانی باتوں سے پیوستگی نہیں ہوتی - وہ اپنی ناموافقت سے تکلیف دیتی ہیں - ان سے وحشت ہوتی ہے - ان کا حال بیگانوں کا سا ہوتا ہے کہ جن کی تعریف تو زیادہ ہوتی ہے مگر ان سے محبت تھوڑی - گو آدمیوں کو اپنی پرانی باتوں سے زیادہ موانست ہوتی ہے — وہ اپنے قدیمی آئین اور دستور اور قوانین نہیں بدلتے ، خواہ اُن کے بدلنے سے کیسا ہی فائدہ پہنچے — مگر اس کے برخلاف یہ بھی ہے کہ انسان بالطبع ایجاد کا شوقین ہے - ایک ہی باتوں کو برتتے برتتے وہ تھک اور اکتا جاتا ہے - ''کل جدید لذیذ[۱]'' مشہور ہے - نئی تبدیلیاں ، اگرچہ وہ اچھی بھی نہ ہوں ، تو بھی اس کو زندہ دل بناتی ہیں - اصل بات یہ ہے کہ آدمی بڑی[۲] باتوں میں تبدیلی کسی طرح پسند نہیں کرتا مگر چھوٹی چھوٹی باتوں میں وہ جدّت کو پسند کرتا ہے ؛ جیسے لباس ، زیورات ، اسبابِ آرائش وغیرہ - اس کا حال درخت کا سا ہے کہ وہ اپنے تنے اور کُندوں کو تو نہیں بدلتا مگر پتّوں اور پھلوں اور پھولوں کو بدلتا رہتا ہے - زمانے کو قرار نہیں ، وہ جلدی جلدی تبدیلیاں کرتا رہتا ہے - اس کے سبب سے قدیمی دستوروں سے بھی ایسی تکلیفیں ہونے لگتی ہیں جیسے جدید دستوروں سے -

ایک لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ زمانۂ قدیم کا بڑا ادب کرتے ہیں اور زمانۂ حال کی تحقیر - وہ اپنے پرانے دستوروں کے بدستور

۱- یعنی ہر نئی چیز خوشنما معلوم ہوتی ہے -
۲- اصل : بڑے -

قائم رکھنے میں بڑی ضد و ہٹ کرتے ہیں - یہ ضد بھی ایسی بری ہے جیسے کہ نئی تبدیلیوں کے ساتھ گرویدگی - جن قوموں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ ہم اپنی پرانی رسم و آئین کو ، خواہ ان سے ہم کو کیسے ہی نقصان پہنچیں ، نہیں تبدیل کریں گے ، وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا ایسے دانش مند تھے کہ جو کچھ اُن کا مقرّر کیا ہوا ہے اس میں تبدیلی[1] کرنے کے لیے لیاقت اور قابلیت ہمارے فہم و فراست میں نہیں - ہم کسی طرح ان سے بہتر کوئی جدید قاعدہ نہیں مقرر کر سکتے - اس خیال میں وہ دو غلطیاں کرتے ہیں : اول وہ اپنی اولاد کو اس بات کا یقین نہیں دلا سکتے کہ ان کے بزرگوں میں ایک نسل ایسی گزری ہے کہ جن کی عقل و دانش ایسی کامل تھی کہ بالکل سہو و خطا سے خالی تھی ، اور ان میں یہ قابلیت تھی کہ وہ ہمیشہ اپنی نسلوں پر حکومت کیا کریں[2] - اگر یہ کمال ان کا مان لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ زمین زندوں سے چھین کر مُردوں کے حوالے کی جائے - دوسرے یہ کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ہاں ان کے آبا و اجداد کی[3] کسی نسل کی عقل ایسی تھی کہ قصور و خطا سے پاک و صاف تھی ، مگر زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے - وہ بہت سی صورتیں ایسی پیش کرتا رہتا ہے جو اُن کے زمانے میں موجود نہیں تھیں - اگر وہ خود زندہ ہوتے تو ضرور اپنے دستوروں

۱- اصل : تبدیل -

۲- یعنی ایسے لوگ جو اپنے بزرگوں کی رسوم و عادات کو کسی طرح نہیں چھوڑنا چاہتے ، وہ اپنی اولاد کو اِس بات کا یقین نہیں دلا سکتے کہ ہمارے بزرگ ہر قسم کی خطا سے پاک تھے اور انھوں نے جو قوانین بنائے وہ آیندہ کی تمام نسلوں کے لیے کافی ہیں -

۳- اصل : کے

میں تغیّر کرتے - پس بہتر یہ ہے کہ آدمی ایجاد میں زمانے کے موافق چال چلے اور اپنی پرانی باتوں کی ترمیم کرے یا تنسیخ - زمانہ اُنھی کا مددگار ہوتا ہے جو اس کی چال پر چلتے ہیں - وہی خوش نصیب ہوتے ہیں جن کا زمانہ یار و یاور ہو - وہی آدمی عقل مند ہوتا ہے جو زمانے کی مصلحت پر چلتا ہے - مُصلحانِ قوم اور سلطنت جو تبدیلیاں اختراع کرتے ہیں، بہ نظرِ اصلاح و فلاح کرتے ہیں - اصلاح کا خیال تبدیلی کے خیال پر مقدّم ہوتا ہے - یہ نہیں ہوتا کہ پہلے ان کے دل میں تبدیلی کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اس کو اصلاح کا بہانہ بناتے ہیں - جو تبدیلیاں وہ داخل کرتے ہیں، گو لوگ اُن کو رد نہ کریں، مگر ان میں مشتبہ ضرور رہتے ہیں - تبدیلی کرنے میں کتابِ مقدّس[1] کا یہ مقولہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ "پرانے راستے پر کھڑے رہو اور اپنی چاروں طرف دیکھو اور یہ دریافت کرو کہ کون سا راستہ سیدھا اور ٹھیک ہے؛ اُسی پر چلو" - یعنی قدیمی آئین و دستور پر رہ کر یہ تحقیق کرو کہ کون سی راہ اچھی راہ ہے - دستور اور آئین اور طریق اس ادب کے مستحق ہیں کہ آدمی اُن پر قائم رہے اور یہ تحقیق کرے کہ کون سا بہتر راستہ ہے - جب اس کو یہ بات منکشف ہو جائے تو پھر وہ اس پر چل کر ترقی کرے - اپنے پرانے قوانین اور آئین جو جاری ہیں ان کو دفعتہً تبدیل نہ کرے - امورات سلطنت میں جب تک کوئی سخت ضرورت آن کر نہ پڑے اور یہ نہ تحقیق ہو جائے کہ اس تبدیلی سے اصلاح و فلاحِ سلطنت یقینی ہوگی، وہ تب تک نہ کی جائے - کیونکہ اس امر کا تحقیق ہونا کہ جو ہم قدیم آئین کو جدید آئین سے بدلتے ہیں، اس میں کوئی برائی نہیں ہے، آسان نہیں ہے -

---

۱- کتابِ مقدّس سے مراد انجیلِ مقدّس ہے کیونکہ زیر نظر کتاب کے تمام مطالب عیسائی مؤلفین کی تالیفات سے ماخوذ ہیں -

کیونکہ آج تک انسان نے کوئی بات ایسی نہیں ایجاد کی جو ایسی کامل ہو کہ اس میں تبدیلی کی ضرورت نہ ہو اور وہ بالکل عیب سے خالی ہو - یہ انسان کی حماقت ہے کہ وہ کسی چیز کے قبول کرنے سے انکار اس وجہ سے کرے کہ وہ کامل نہیں یا بے عیب نہیں -

غرض نہ پرانے دستوروں کے ماننے میں ضد و ہٹ چاہیے کہ ہم ان کو مانیں گے ، خواہ وہ کیسے ہی برے ہوں - نہ خواہ مخواہ نئی باتوں کو بے ضرورت داخل کرنا چاہیے - اصلاح اور فلاح کے لیے جو تبدیلیاں ضروری ہوں ، وہ پرانی باتوں میں ہمیشہ اور جلدی اور استقلال کے ساتھ کرنی چاہییں - یہ صلاح و فلاح خواہ جمہوری ہو یا شخصی - شخصی اصلاح بھی جمہوری اصلاح ہو جاتی ہے - اگر گلی میں ہر مکان دار اپنے مکان کے آگے سے کوڑا کرکٹ ، غلاظت ، نجاست صاف کر دے تو کل گلی پاک صاف اور ستھری ہو جائے گی -

خلاصہ یہ ہے کہ نئی راہ پر قدم نہ رکھیں جب تک اس کو خوب ہوشیاری سے دیکھ بھال نہ لیں ، اور نہ اُن پرانی راہوں میں چلیں جن پر ہمارے نشانِ قدم دھوکا دے کر کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی چکر میں پھراتے رہیں - نہ پروانہ بنیں کہ اُڑ کر شمع پر جل جائیں ، نہ گھوڑے بنیں کہ اصطبل میں جب آگ لگے تو بھی اَڑیل بن کر کھڑے کے کھڑے جل جائیں - بہت سے آدمی دنیا میں ایسے ، مخالف خصلتوں کے ، نظر آتے ہیں کہ ان کی خصلتیں یا پروانے کی سی ہوتی ہیں یا گھوڑے کی سی - یا وہ نئی باتوں کو بے سوچے سمجھے اختیار کر لیتے ہیں یا پرانے قانون پر ایسے جمے ہوئے ہوتے ہیں کہ اس کو کسی طرح نہیں چھوڑتے - مگر جو عقل مند ہوتے ہیں وہ بہت سوچ بچار کر نئی باتوں کو اختیار کرتے ہیں اور پرانی باتوں کو چھوڑتے ہیں -

۲- ہر دوا ایک ایجاد ہے - نئی دواؤں سے پرہیز کرنا نئی خرابیوں کا منتظر رہنا ہے - زمانہ بڑا موجد ہے - اس کی تقلید ہم کیوں نہ کریں ؟ سابق دستوروں کے موافق کام کرنے کو احمقوں اور حیلہ جویوں پر چھوڑ دو - خود بخود چیزیں بدل کر بری ہوتی جاتی ہیں - اگر ان کا انتظام صلاح و مشورہ و تدبیر سے بہتر ہونے کا نہ کیا جائے تو معلوم نہیں برائیوں کا ڈھیر کیا لگ جائے - زمانہ ہی ایسے حکومت رکھتا ہے جس کے آگے سب خوشی سے سر جھکاتے ہیں - جو لوگ رسم و رواج کے غلام ہوتے ہیں وہ ہنسی کے قابل ہوتے ہیں - کوئی نئی چیز ایسی نہیں ہوتی جس میں کوئی نقصان نہ ہو - نئے کپڑے کے پیوند پرانے کپڑے کو زیادہ پھاڑ دیتے ہیں - جس بات کی کچھ توقع نہ ہو وہ دفعتاً ہو جائے تو جس کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے وہ خوش ہوتا ہے اور جس کو نقصان پہنچتا ہے وہ زیادہ رنج کرتا ہے -

۳- نئی باتوں کے ایجاد کا زیادہ تر شوق جن لوگوں کو ہوتا ہے ، وہ اکثر خود غرض اور تنگ خیال ہوتے ہیں - جیسا ان کو پہلے اپنے بزرگ آبا و اجداد کا پاس لحاظ نئی تبدیلی میں نہیں رہتا ، ایسے ہی ان کو پچھلی اپنی اولاد کا خیال نہیں ہوتا - صرف اختراع میں اپنے مطلب کا خیال ہوتا ہے - وہ نئی راہوں پر اپنے نام کو بلند کر کے اڑاتے ہیں کہ جس سے شہرت حاصل ہو جائے -

۴- سب سے زیادہ زمانہ جلد جلد تبدیلیاں ، جو معلوم نہیں ہوتیں ، زبان میں اختراع کرتا ہے - کتنی ہی زبانوں کی اس نے چپکے چپکے جان نکال کر مردہ بنا دیا - یا وہ زندوں کی زبانوں پر بولی جاتی تھیں یا کتابوں کے اندر مُردوں کی طرح قبر میں خاموش پڑی ہیں -

۱۱۸- کارہائے بزرگ کا جلد سرانجام دینا

۱- جیسا کہ اطبّا کے نزدیک کچّی غذا کا معدے سے قبل از وقت ہضم نکل جانا جسم میں بیماریوں کا بیج بوتا ہے ، ایسے ہی کسی کارِ بزرگ کی ، حد سے زیادہ جلد ، سرانجام ہونے کی خواہش مضرّتوں کی جڑ جماتی ہے ، مضرّتیں پیدا کرتی ہے - گو کارہائے بزرگ کے انصرام کرنے کے لیے وقت پیمانہ ہے جو اس کا اندازہ کرتا ہے ، مگر ان کی زود انجامی کے لیے اجلاسِ کار کے وقت کو پیمانہ نہ بناؤ ، بلکہ ان کی نیک انجامی اور خوش اسلوبی اور ترقی کو - گھُڑدوڑ میں کچھ لمبی ڈگوں سے سرعتِ رفتار نہیں پیدا ہوتی - ایسے ہی دفعتاً بہت کام کرنے سے کام نہیں چلتا - بلکہ کام جب خوب ہوتا ہے کہ آدمی صبر سے لوگوں کی باتیں سنے ، اُن کو ذہن میں محفوظ رکھے ، اصل مطلب کو ان سے اخذ کرے ، پھر خوش اسلوبی کے ساتھ حصولِ مقصد کے لیے بندوبست کرے - بعض آدمی کام کرنے میں متأمل اور سلامت رَو کہلاتے ہیں - وہ فرصت میں کام پر بہت تأمل اور غور کر کے اپنی سچی رائے قائم کرتے ہیں ، پھر اس کے موافق تدابیرِ درست کام میں لاتے ہیں - گو وہ اپنی رائے قائم کرنے میں دیر لگاتے ہیں ، مگر ان کے کام کا انجام و آغاز یقینی اچھا ہوتا ہے - ہاں ایسے سوچ بچار کے ساتھ کام کرنے والے اُن کاموں کے لائق نہیں ہوتے جن میں مستعدی اور جلدی و چالاکی درکار ہو - ایسے کاموں میں وہ ہمیشہ ناکام رہتے ہیں - بعض آدمی بڑے روشن خیال ہوتے ہیں اور قیاس کرنے میں تیز و ہوشیار اور عین وقت پر نہایت ذہانت کی تدبیر کرنے والے ، مگر وہ ایسے کاموں میں ، جن میں سرعت کی ضرورت نہیں ہے ، بہت غور و خوض کرنے کی عادت نہیں رکھتے اور اس میں اپنے وقت کو نہیں لگاتے - ان کا کام کرنا ایسا ہوتا ہے

جیسے کوئی ہوا پر تیر مارے اور نشانے پر نہ لگائے ۔

بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ خوب سوچ بچار کرتے ہیں مگر تاخیر وہاں کرتے ہیں جہاں سرعت و چستی اصل کام چلانے والی ہوتی ہے[1] ۔ ان کا حال ایسا ہے جیسے کوئی مریض کو سخت دوا پہلے دے دے اور پھر اس کی نبض اور زبان کو دیکھے ۔ بعض آدمی ایسی طبیعت کے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی رائے سے جو فیصلہ کریں اس کے درست اور صحیح ہونے میں ذرا شبہ نہیں کرتے ۔ ہر اعتراض کا جواب فوراً دے دیتے ہیں اور ایک نتیجہ نکال کے کہہ دیتے ہیں ، خواہ اس کی کوئی بنیاد ہو یا نہ ہو ۔ جو شخص ان کا معترض ہوتا ہے اس کو وہ اپنا مخالف جانتے ہیں ۔ بعض آدمی ، جب کسی معاملے میں طرفین کی دلائلِ معقول ہم وزن ہوتی ہیں تو ، شبہے میں پڑتے ہیں لیکن جب ایک طرف ذرا بھی غلبہ ہو جائے تو پھر اس کے وہ طرف دار ہو جاتے ہیں ۔ اکثر دنیا میں آدمی معاملات کا فیصلہ اِسی طرح کیا کرتے ہیں کہ ان میں کسی طرف کوئی وجہِ ترجیح نہیں ہوتی ۔ اگر ایک آدمی کے سامنے روپیوں سے بھری ہوئی دو تھیلیاں ایک سی رکھ دو تو وہ ان میں کوئی ایک بلا وجہِ ترجیح اٹھا لے گا ۔ تھوڑے ہی آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ طرفین کی دلائل کو خوب سوچ بچار کر کے ، ایک طرف کی ترجیح کی وجوہ کو تلاش کر کے ، فیصلہ کریں ۔ بعض آدمی تحقیق کرتے ہیں مگر فیصلہ نہیں کرتے ، بعض آدمی فیصلہ کرتے ہیں مگر تحقیق نہیں کرتے ۔

۲۔ کارہائے بزرگ کے انصرام میں وقتِ مناسب کا انتخاب کرنا بھی بڑی بات ہے ۔ نپولین کہا کرتا تھا کہ اگر دشمن کی حملہ آوری

۱۔ اصلی : والی ہوتے ہیں ۔

آکے وقت کا حساب کرنے بیٹھو ، اور جو وقت اپنے حساب سے تم مقرر کرو اُس سے دس منٹ پہلے وہ تم پر حملہ کرے ، تو خواہ تم اپنی حفاظت میں کیسی ہی زبردست سپاہ لاؤ ، وہ تم کو شکست دے دے گا ۔ اگر تم طغیانیِ آب میں گِھر جاؤ اور دس منٹ تک سوچا کرو کہ کس طرف بچ کر جائیں تو تم ضرور ڈوب جاؤ گے ۔ بعض آدمی بڑے کاموں کو جلد سرانجام کرنا چاہتے ہیں اور کام کے واسطے تھوڑا وقت مقرر کرتے ہیں تا کہ اس سے معلوم ہو کہ وہ کارہائے بزرگ کو جلد سرانجام دینے والے ہیں ۔ مگر کسی چیز کا مختصر کرنا ایک تو اُس کو سکیڑنے سے ہوتا ہے ، دوسرا قطع کرنے سے ۔ پس یہ ان کا اختصار وقت کو قطع کرنا ہے ۔ ایک دفعہ کسی دانش مند نے خوب جلسے میں کہا تھا کہ تم تھوڑی دیر ٹھہرو تو اس کا انجام نیک بہت جلد ہو جائے گا ۔

۳۔ جیسا کہ اشیا کی قیمت کا اندازہ روپے سے ہوتا ہے ، ایسے ہی کام کا اندازہ وقت سے ہوتا ہے ۔ اس لیے کسی کام کا نیک انجام جلد ہو جانا بڑی دولت ہے ۔ اگر کام کے انصرام میں جلدی کم ہو تو وہ زیادہ مہنگا ہو جاتا ہے ۔ کام کے لیے مناسب وقت کا انتخاب کرنا وقت کا بچانا ہے اور نا وقت کسی کام کا کرنا ہوا پر کوڑے مارنا ہے ۔ سب سے زیادہ کاموں کے سرانجام کرنے کی یہ خوبی ہے کہ اس کی ترتیب و تقسیم خوش اسلوبی کے ساتھ ہو ۔ کاموں کے علٰیحدہ علٰیحدہ حصے ہونے چاہییں ۔ جو شخص کام کے حصے نہیں کرتا ، وہ کام میں دخل ٹھیک نہیں رکھتا ۔ جو اُس کو بہت سے حصوں میں تقسیم کرتا ہے وہ بھی اس کو صفائی سے نہیں انجام دے سکتا ۔ ہر کارِ بزرگ کے تین حصے کرنے چاہئیں : اول حصہ ابتدائی تیاری کا ، دوم اس پر مشورہ و مباحثہ کا ، سوم

اس کے انجام دینے کا - اول اور سوم حصہ تو چند آدمیوں کے حوالے کرنا چاہیے اور دوسرے حصے میں جتنے آدمی کثرت سے ہوں، مناسب ہے - اطبّا کہتے ہیں کہ انسان کے معدے کے واسطے غذا کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ وہ اس کو وسیع کرے تا کہ معدہ اپنا کام با فراغت کرے - اِسی لیے گھوڑوں کو دانے کے ساتھ گھاس دینی چاہیے کہ جس سے معدے میں وسعت پیدا ہو - ایسے ہی کاموں کے کرنے کے واسطے معلومات اور اطلاعوں کا دفتر چاہیے کہ جن میں ذہن اپنا کام وسعت کے ساتھ کر سکے - جو ایک مجلّد کتاب کے پڑھنے سے فیصلہ ہو سکتا ہے، وہ ایک چھوٹے رسالے کے مطالعے سے نہیں ہو سکتا - غرض تحریری معلومات بھی انفصالِ خیالات میں بڑا اثر رکھتی ہیں -

۴- کارہائے بزرگ کے انصرام میں بڑے عقل مندوں کا کام یہ ہے کہ یہ معلوم ہو کہ کس کی صورت میں زیادہ تأمّل اور غور کی ضرورت ہے اور کس میں نہیں - اِس لیے بزرگ معاملات میں دو قسم کے مشورہ کار جمع کرنے چاہییں؛ ایک وہ جو متأمّل ہوں، دوسرے وہ جو مستعجل ہوں - پہلے قسم کے آدمیوں کے سبب سے فیصلے میں التوا ہوگا - فیصلے کا نہ ہونا یا اس میں التوا ہونا بھی ایک فیصلہ ہے - اگر کسان زراعت کے وقت بیج بونے کا فیصلہ نہ کرے تو یہ بھی ایک فیصلہ ہے کہ وہ زراعت کرنی نہیں چاہتا -

۱۱۹- بہ ظاہر عاقل معلوم ہونا

بعض آدمی اپنے رنگ ڈھنگ دکھانے میں تدبیر ایسی کرتے ہیں کہ وہ زیادہ تر دانش مند معلوم ہوں، گو وہ دراصل ویسے نہ ہوں - بعض قوموں کے ظاہری اطوار ایسے ہوتے ہیں کہ وہ عقل مند معلوم

ہوتی ہیں مگر حقیقت میں نہیں ہوتیں ۔ اس کے برخلاف بعض ایسی عقل مند نہیں معلوم ہوتیں جیسی وہ ہوتی ہیں ۔ ایک جواری کا قول ہے کہ وہ دیانت داری کی صورت میں ہو کے خدا کی قدرت کا انکار کرتے ہیں ۔ ایسے ہی بعض لوگ دانش مندانہ صورت بنا کے عقل کے خلاف کام کرتے ہیں ۔ ایسے آدمی پہلے سے یہ جانتے ہیں کہ کاموں میں عاقل کبھی متامّل ہوتے ہیں ، کبھی مستعجل ۔ کبھی کسی کام میں خرچ کرتے ہیں ، کبھی کسی کام میں نہیں کرتے ۔ کہیں خوف کی جگہ تہوّر کو کام میں نہیں لاتے ۔ کہیں دلیری کی جگہ نامردی نہیں دکھاتے ۔ نہ بخل کرتے ہیں ، نہ اِسراف ۔ غرض ہر کام میں ان کے اعتدال ہوتا ہے ۔ پس وہ کاموں میں اس طرح ان کی نقل اُتارتے ہیں مگر غلط محل و موقع پر ۔ جہاں وہ تاخیر کرتے ہیں ، یہ تعجیل کرتے ہیں اور جہاں وہ خرچ کرتے ہیں ، یہ بخل کرتے ہیں ۔ جہاں وہ تہوّر نہیں کرتے ، یہ تہوّر کر کے بڑے خوفوں میں جانبازی کرتے ہیں ۔ غرض وہ ، جو کام عقل کے موافق ہوتے ہیں ، ان کو بے محل کرتے ہیں ۔ وہ دانائی کا کام نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو بہت تھوڑا ، وہ بھی بڑی محنت و جانکاہی سے ۔ وہ گُھنّے[1] ہو جاتے ہیں ۔ اپنے راز کی بات کبھی نہیں بتلاتے ۔ اوروں کی حقارت کرتے ہیں ۔ گو خود چھوٹے آدمی ہوتے ہیں مگر بڑے بڑے آدمیوں کی تحقیر کرتے ہیں ۔ اپنے اوپر اعتماد و اعتبار بہت کرتے ہیں ۔ اپنی قابلیت اور دانائی کو کافی سمجھتے ہیں ۔ عیب بیں اور نکتہ چیں ایسے ہوتے ہیں کہ اگر مور کو دیکھیں تو اس کے دُم کے[2] پروں اور تھگلیوں کو بتا دیں کہ وہاں وہاں نہیں ہیں ۔

۱۔ گُھنّا : بات کو بخوبی سمجھ کر انجان بن جانے والا ۔

۲۔ اصل : کی ۔

اعتراض کرنے میں جب لیں گے نفی کی طرف ، کہ بارِ ثبوت اپنے ذمے نہ ہو - جب وہ ایک بات کو جانتے ہیں اور اس میں گفتگو کرتے ہیں تو ایسے اعضا کی حرکتیں کرتے ہیں اور چہرے کی لیتے ہیں کہ لوگ یہ جانیں کہ وہ اس بات سے خوب واقف ہیں ، اور بڑے بڑے الفاظ اور محاورے بولتے ہیں - غرض باتیں خوب بناتے ہیں - وہ عاقلوں کے نزدیک تو عقل سے خالی معلوم ہوتے ہیں مگر جو عقل سے خالی ہوتے ہیں وہ اُن کو دانش مند جاننے لگتے ہیں - استقلال ایسا دکھاتے ہیں کہ جس سے لوگ ان کی عقل و دانش کو تسلیم کریں - جیسا کہ دیوالیہ سوداگر اپنی ساکھ رہنے کے واسطے طرح طرح کے فریب کرتا ہے ، ایسے یہ ہی بہت سے فریب و مکر اس لیے کرتے ہیں کہ لوگ ان کو عقل مند جانیں - وہ عقل مندوں کی تصویر ایسی بنتے ہیں جیسی کہ آئینے میں آدمی کی شبیہ ہوتی ہے کہ وہ بعینہٖ ہوتی ہے ، مگر دائیں طرف کی بائیں طرف اور بائیں طرف کی دائیں طرف - وہ اپنے تئیں ایسا شیشہ بناتے ہیں کہ جس میں تصاویر مجسّم دکھائی دیں ؛ یعنی کہ سطاحت کو جسامت بنا کے دکھاتے ہیں کہ جس میں عُمق[1] اور سمک ہو - ان کا حال اُس لڑکے کا سا ہوتا ہے جس کی نقل مشہور چلی آتی ہے کہ اپنی آستین میں ، جس میں سُوئی رہا کرتی ہے ، چاقو لٹکایا اور جیب میں ، جس میں چاقو رکھا جاتا ہے ، بھیڑ کا بچہ رکھا - سچی عقل کا بڑا کام یہ ہے کہ وہ دنیا کے معاملات میں تمثیلات اور نظائر کا انتخاب ٹھیک ٹھیک کرے - اگر آدمی اس میں مغالطہ کھاتا ہے تو زمانۂ سابق کا علم

۱- عُمق : (ع) مذکر - گہرائی ، تہہ - کنویں ، حوض یا دریا کی تہہ - (فقرہ) ''اس کنویں کا عمق بہت ہے''- سمک : سب سے نیچا طبقہ -

(نوراللغات)

اس کو کچھ نہیں سکھاتا بلکہ فریب دیتا ہے - ایسے آدمیوں کو شہرت حاصل کرنے دو مگر ان کو کام نہ سپرد کرو، کیونکہ احمق ان سے زیادہ اچھی طرح کام کر سکتے ہیں -

۱۲۰- دوستی

۱- ارسطاطالیس[۱] کا قول ہے کہ انسان کو اپنی خوشی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی دوسرے آدمی سے دوستی کرے - اگر کسی شخص کو دوستی کی ضرورت ظاہر و باطن میں نہ ہو تو وہ انسان نہیں ہے - یا[۲] اس سے نہایت کمتر ہے یا نہایت اعلیٰ درجے پر ہے - اسی مضمون کو یوں بھی بیان کیا ہے کہ جس شخص کو تنہائی پسند ہے، وہ یا[۳] وحشی حیوان ہے یا دیوتا ہے - اس مختصر بیان میں پہلی بات کو سب مانتے ہیں کہ جس شخص کو صحبتِ انسانی سے نفرت ہو، اس میں ضرور کوئی وحشی حیوان کی صفت ہوتی ہے - مگر دوسری بات میں اختلاف ہے؛ بعض تو اس کو بالکل غلط جانتے ہیں کہ کہیں تنہا نشینی سے بھی آدمی کو خدا ملتا ہے؟

ارسطو اس کا قائل ہے کہ بعض آدمی سوچنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی ذات کے لیے کافی ہوتے ہیں اور شہری آدمیوں سے بوتر ہوتے ہیں - ظاہری حالتوں کے وہ محتاج نہیں ہوتے اس لیے وہ خدا کی طرف بالکل توجہ رکھتے ہیں - مگر افلاطون اس سے انکار

۱- ارسطاطالیس یا ارسطو: (۳۸۴ ق م—۳۲۲ ق م) اسکندر اعظم کا استاد - مشہور یونانی فلسفی جس نے انسانیت کی عظیم خدمت کی - ''فلسفۂ مشائین'' کا مؤسس - منطق، طبیعیات، الٰہیات اور اخلاق میں اس کی اہم کتابیں یہ ہیں: المقولات الجدل، العبادة او التفسیر، الخطابة، السماء و العالم، الکون و الفساد، کتاب مابعد الطبیعة -

۲، ۳- اصل: کیا -

کرتا ہے اور حکیموں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ جمہوری سلطنت میں معاملاتِ ملکی میں متوجہ ہوں ، یہی کام خدا تک پہنچائے گا۔ محض تنہائی سے خدائی صفات نہیں آتیں۔ رشی مُنی ، فقرا ، راہب بھی خلوت گزیں اس لیے ہوتے تھے کہ مجلسِ خاص میں بیٹھیں اور خدا سے باتیں کریں۔ لوگ تنہائی کے معنی نہیں سمجھتے۔ تنہائی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی ہمراہ نہ ہوں ، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوست پاس نہ ہوں۔ اگر آدمی بہت سے ہوں اور اُن میں محبت نہ ہو تو وہ ایک مرقعِ تصاویر ہے اور ان کا بولنا ایک باجے کی ٹن ٹن ہے۔ بڑا شہر بڑا جنگل ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں دوست دور دور رہتے ہیں ، وہ آپس میں ملتے جلتے بہت کم ہیں۔ وہ شریکِ حال باہم ایسے نہیں ہو سکتے جیسے کہ پاس پاس کے ہمسائے۔ اُس شخص کی تنہائی سب سے زیادہ مصیبت ناک ہے کہ جس کے سچے دوست نہ ہوں۔ سچے دوستوں بغیر دنیا ایک ویران جنگل ہے۔ اس دنیا کے تماشوں میں جو شخص تنہائی کو پسند کرتا ہے اُس کی طبیعت و سرشت ایسی ہے کہ وہ دوستی کے قابل نہیں ہوتا۔ وہ حیوان ہوتا ہے ، انسانیت نہیں رکھتا۔

اول سب سے بڑا پھل دوستی کا یہ ہے کہ اس سے دل ہلکا ہوتا ہے۔ جو باتیں دل میں بھری ہوتی ہیں ، وہ سب زبان پر آتی ہیں۔ سب سے زیادہ سخت تکلیف آدمی کے جسم کو گلے کے گُھٹنے اور بھنچنے سے ہوتی ہے۔ پس ایسے ہی دل کا حال ہے کہ اگر دوست نہ ہوں تو بڑا گُھٹتا اور بھنچتا ہے۔ دل جب تک کہ منبسط[1] نہیں ہوتا ، سچا دوست نہیں ملتا۔ آدمی اپنے ساری رنج ، خوشی ،

۱۔ مُنبسط = خوش۔

آمید و بیم ، شک و یقین ، صلاح و تدبیر غرض جو دل میں بھرا ہوتا ہے ، وہ دوست کے رو برو نہایت محبت سے بیان کرتا ہے ۔ بڑے تعجّب کی بات ہے کہ اِس دوستی کو بڑے بادشاہ اور فرماں روا اپنی جان و شان کو جوکھوں میں ڈال کر خریدتے ہیں ، اس لیے کہ بادشاہ اور رعایا و ملازمین کے اقبال اور دولت میں زمین آسمان کا بُعد ہوتا ہے ۔ دوست پیدا کرنے کے لیے ضرور ہے کہ رعایا میں سے لوگوں کو اول ادنیٰ درجے سے اعلیٰ درجے پر پہنچائیں اور پھر ان کو اپنا رفیق بنائیں ۔ اس کام کے کرنے میں ان کو بہت تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں ۔ بادشاہِ عاقل ، شجاع ، اہلِ دل ، زبردست اپنی ذات سے محبت کرنے والے ، یہ سب جانتے ہیں کہ بغیر دوستوں کے دل کو چین اور آرام نہیں ملتا ۔ اگر وہ ان کو نہ پیدا کریں تو ان کے کام ادھورے پڑے رہیں ۔ دوستوں سے دل کو جو تسلی و تشفی حاصل ہوتی ہے وہ بھائی بندوں سے نہیں حاصل ہوتی ۔ فیثا غورث کا قول ہے کہ جو شخص ایسا دوست نہیں رکھتا کہ اس کے آگے اپنے دل کی باتیں کہے ، وہ مردم خوار ہے جو اپنے دل کو کھاتا ہے ۔ جو شخص اپنے احباب کے رو برو اپنی رنج و خوشی کو بیان کرتا ہے ، اس سے یہ دو فائدہ مند متضاد اثر پیدا ہوتے ہیں کہ خوشی اس کی دوچند ہوتی ہے اور رنج آدھا ہوتا ہے ۔ کوئی شخص ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی خوشی کو دوستوں میں بیان کرے اور اس سے اس کی خوشی نہ بڑھ جائے اور غم کو بیان کرے ، وہ نہ بٹ کر گھٹ جائے ۔

دوستی کا حال مقناطیس کا سا ہوتا ہے کہ وہ جسم پر مثبت اور منفی دونوں اثر پیدا کرتا ہے اور دونوں فائدہ مند ہوتے ہیں ۔ جیسا کہ قانونِ قدرت ہے کہ اجسام کے[1] باہمی اتحاد سے قوّت پیدا

۱۔ اصل : کی ۔

ہوتی ہے ، ایسا ہی دلوں کا حال ہے کہ ان کے اتحاد سے قوّت پیدا ہوتی ہے : ع

دو دل یک شود بشکنند کوہ را[1]

دوستی کا دوسرا پھل بڑا یہ ہے کہ اس سے فہم ہماری درست اور ٹھیک ہوتی ہے - دوستی کا پہلا پھل یہ لکھا تھا کہ اس سے ایسی محبت پیدا ہوتی ہے جس سے غم کی طغیانی کی گھٹا ہٹ کر مطلع کو صاف کر دیتی ہے - اِس دوسرے پھل سے انتشارِ خیالات اور فہم کی تاریکی روزِ روشن بن جاتی ہے - یہ کچھ ضرور نہیں کہ دوست سے صلاح و مشورہ ہی لیا جائے بلکہ اس کے سامنے فقط خیالات بیان کیے جائیں تو اِس اظہار سے تقریر صاف ہوتی ہے اور یہ معلوم ہے کہ الفاظ میں آن کر خیالات کی صورت کیا ہوتی ہے - بیان کرنے سے پہلے اپنے خیالات کی ترتیب درست کرنی پڑتی ہے - اس سبب سے جو ایک گھنٹے کی گفتگو سے دانائی حاصل ہوتی ، وہ ایک دن کے سوچنے سے نہیں حاصل ہوتی - جو خیالات کہ ایک گھڑی میں بندھے ہوئے تھے وہ کھل جاتے ہیں - ان کی صورت منتظم ہو جاتی ہے - اس سے خیالات روشن ہو جاتے ہیں اور اپنا حال کھل جاتا ہے ، اور ذہانت کی باتیں اُس خراد پر اُترتی ہیں جو اپنی بنائی ہوئی نہیں ہوتی - دل و دماغ میں خیالات گھونٹ گھونٹ کر رکھنے سے تو یہ بہتر ہے کہ وہ کسی پیکر یا بُت کے سامنے بیان کیے جائیں - سوائے اس کے دوستوں سے صلاح و مشورہ لیا جاتا ہے جس کو وہ ایمان داری اور وفاداری کے ساتھ دیتے ہیں - صاف روشنی ہمیشہ تیز ہوتی ہے - آدمی دوست کے صلاح و مشورہ سے جو روشنی پاتا ہے وہ زیادہ صاف ہوتی ہے - اپنی فہم کی روشنی میں اپنی محبت اور

۱- کذا - یعنی اگر دو دل مل جائیں تو وہ پہاڑ کو بھی توڑ سکتے ہیں -

رسم و رواج کی آلائش ہوتی ہے - اپنے اور دوست کے صلاح و مشورہ میں ایسا فرق ہوتا ہے جیسے کہ دوست اور خوشامدی کے صلاح اور مشورہ میں کیونکہ آدمی کا کوئی خوشامدی اس کے اپنے آپ سے زیادہ نہیں ہوتا - اس اپنے آپ کی خوشامد کا علاج دوستی کی آزادی سے زیادہ کوئی اچھا نہیں ہوتا -

اپنے دوستوں سے جو صلاح و مشورے ہوتے ہیں ، وہ دو قسم کے ہوتے ہیں : ایک اوضاع و اطوار و اخلاق کے باب میں ، دوسرے معاملات کے باب میں - اول صورت میں دوست کی پند و نصائح سے دل کی درستی اور اصلاح ہوتی ہے - آدمی کا اپنے آپ سے محاسبہ لینا حقیقت میں بڑا علاج دل کی درستی اور اصلاح کا ہے ، مگر وہ بڑا جان خراش اور دل تراش ہوتا ہے - اخلاق کی اچھی کتابوں کا مطالعہ بھی بے جان ہے - اَوروں کی خطاؤں کو دیکھ کر اپنی اصلاح کرنی بھی کچھ مناسبِ حال نہیں ہوتی ، کیونکہ ہم اَوروں کی برائیوں کو دیکھ کر ٹھیک طور پر ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے - آدمی کا قاعدہ ہے کہ وہ ایک ہی خطاؤں پر لعنت ملامت کرتا ہے اور انھی سے بری کر دیتا ہے - یہ نہیں ہوتا کہ وہ کچھ خطاؤں کے دیکھنے میں اندھا ہوتا ہے - مگر اس کے دل میں ایک اَور بات ہوتی ہے کہ وہ اَوروں کے انصاف کرنے میں ان کی دردناک لغزش کو دیکھتا ہے مگر یہ نہیں دیکھتا کہ وہ کیونکر لغزش سے غم زدہ ہوئے - اور اپنی ذات کے لیے انصاف کرنے میں وہ یہ دیکھتا ہے کہ میں کیسا لغزش سے غم زدہ ہوں مگر یہ نہیں دیکھتا کہ کیوں لغزش ہوئی - آدمی اپنے افعال میں سخت غلطیاں و بیہودگیاں اس سبب سے کرتا ہے کہ اس کے دوست نہیں ہوتے جو اس کو ان پر مطلع کرتے - اور اس سے دولت کا نقصان جدا ہوتا ہے اور شہرت و ناموری میں جدا فرق آتا ہے - ان کا حال ایسے آدمیوں کا سا ہوتا ہے

کہ بعض دفعہ آئینے میں اپنے تئیں دیکھتے ہیں اور اپنی صورت و چہرے کو بھول جاتے ہیں۔

اب دوسری صورت معاملات میں صلاح و مشورہ کی یہ ہے کہ ایک آدمی اگر چاہے تو یوں خیال کر سکتا ہے کہ دو آنکھیں ایک آنکھ سے زیادہ نہیں دیکھ سکتیں۔ جواری ہمیشہ تماشائی سے زیادہ دیکھتا ہے۔ آدمی غصّے میں زیادہ دانش مند بہ نسبت اُس عاقل کے ہوتا ہے جو غصّے کے وقت چوبیس حرف الف بے تے کے پڑھا کرتا تھا۔ اور ایک تپنچہ ہاتھ سے ایسا ہی چھوٹ سکتا ہے جیسے کہ بیٹھک پر رکھنے سے۔ اور بہت سی اِسی قسم کی بیوقوفی کی باتیں خیال کر کے وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ میں ہی سب کچھ ہوں۔ مگر جب سب کچھ کام ہو چکتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دوست کی نیک صلاح ہی سے کام سنورتے اور درست ہوتے ہیں۔

آدمی اگر بہت سے صلاح کاروں سے مشورہ اپنے کاموں کا ٹکڑے ٹکڑے کر کے لے گا، یعنی ایک کام میں کسی سے مشورہ لیتا ہے اور دوسرے کام میں کسی دوسرے سے اور علیٰ ہذاالقیاس، اگرچہ اس طرح صلاح و مشورہ لینا بالکل صلاح و مشورہ نہ لینے سے اچھا ہو مگر اس میں دو خطرے ہیں: اول یہ کہ ایسے آدمی کو کوئی نیک صلاح، جس پر بھروسا و اعتماد ہو، نہیں دے گا۔ دوم یہ کہ وہ صلاح و مشورہ ایسا ہوگا کہ اس میں کچھ برائی ہوگی، کچھ بھلائی۔ اگر تم اپنے مرض کے علاج کے لیے اُس طبیب کو بلاؤ جو اس مرض کا علاج کرنا خوب جانتا ہو مگر تمھارے مزاج سے نا آشنا ہو تو وہ اس مرض کو تو دور کر دے گا مگر آیندہ موت کو قریب کر دے گا۔ یہ امر شاذ و نادر ہے کہ کوئی دوست ایسا ملے کہ جو تمھاری حالت سے خوب واقف نہ ہو اور تم کو کسی معاملے میں ایسی صلاح و مشورہ

دے جو اور معاملات میں خلل انداز نہ ہو۔ بہت سے آدمیوں سے صلاح و مشورہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے مرض کے علاج کے لیے بہت سے طبیبوں کو بلانا کہ وہ بجائے اچھا کرنے کے اور زیادہ مرض کو بڑھائیں گے۔

علاوہ اِن دو پھلوں کے جو اوپر بیان ہوئے، کہ ایک محبت سے دل کو مامون اور دوسرا رائے کو خطا سے مصئون کرتا ہے، آخر پھل یہ ہے جو انار کی طرح بہت سے دانے رکھتا ہے، یعنی دوست سارے کاموں اور موقعوں پر مُعین اور مددگار ہوتا ہے۔ متقدمین کا کیا عمدہ مختصر مقولہ ہے کہ دوست اپنی ذاتِ ثانی ہوتی ہے بلکہ دوست اپنی ذات سے بھی بہتر ہوتا ہے۔ پس انسان دوستی سے اپنی زندگی کو اِس طرح بڑھا سکتا ہے کہ اِس سے بہت سی امثال اپنی ذات کی، جو مختلف کام جانتے ہیں، پیدا کرے۔ آدمیوں کے واسطے مرنے کا ایک وقت مقرر ہے۔ وہ بہت دفعہ دل میں اپنے بہت سے ارمان لیے دنیا سے سدھار جاتے ہیں؛ جیسے بچوں کی شادی اور بعض اور شوق کے کاموں کی ناتمامی۔ مگر ان کاموں کو اُن کے بعد دوست ایسا ہی پورا کر دیتے ہیں جیسے وہ خود کرتے۔ آدمی کے ایک جسم ہوتا ہے اور وہ ایک ہی جگہ مقیّد ہوتا ہے جہاں وہ کام کر سکتا ہے، مگر دوستوں کے ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت جگہ کام کر رہا ہے۔ بہت سے کام آدمی خود اِس خوش اسلوبی کے ساتھ نہیں کر سکتا جو اس کے دوست کر دیتے ہیں۔ مثلاً اپنی لیاقت کا اظہار اور اپنی تعریف وہ خود کرنے سے شرماتا ہے مگر وہ دوستوں کی معرفت بخوبی ہو سکتی ہے۔ اور اِسی قبیل کی بہت سی باتیں ہیں کہ جن کے کرنے سے خود آدمی کو شرم آتی ہے مگر وہ دوستوں کی معرفت بخوبی سرانجام پاتی ہیں۔

آدمی کے بعض رشتہ دار ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو وہ جدا نہیں

کر سکتا مگر ان سے باتیں موافق اپنے رشتے کے کرتا ہے ؛ جیسے کہ بیٹے سے باپ بن کر ، بیوی سے میاں بن کر - دشمن سے بعض شرائط کے ساتھ باتیں کر سکتا ہے مگر دوست سے جیسا موقع و محل ہو ، ویسی باتیں کر سکتا ہے - وہ کسی ذاتِ خاص سے مخصوص نہیں ہوتیں - تھیٹر میں جو اپنے حصے کا کام بغیر دوست کی شرکت کے پورا نہ ہو سکے تو بہتر ہے کہ اُسے چھوڑ کر چلا جائے -

۲- ہر نعمت میں ایک شیرینی و لطافت دوستی پیدا کر دیتی ہے - وہی تنہائی بڑی ہولناک ہے جس میں دوست نہ ہوں - بے ایمانی کی بڑی سزا یہی ہے کہ بے ایمانوں کو دوستوں کی نعمت سے وہ محروم کر دیتی ہے - جو شخص دوستی اختیار کرتا ہے وہ نئی ضرورتوں کی بیڑیاں پاؤں میں ڈالتا ہے -

۳- اگر ساری دنیا قبضے میں ہو اور کوئی دوست نہ ہو تو وہ ہیچ ہے - اگر ساری دنیا کے بدلے میں ایک دوست ہاتھ لگے تو ارزاں ہے - جیسا کہ مشتبہ دوست سے خوف لگتا ہے ، ایسا دشمن سے نہیں ہوتا -

۴- جو شخص اپنی ذات سے محبت رکھتا ہے اور دوستی سے بھاگتا ہے ، وہ سخت الزام کے قابل ہے - جو شخص کہ دوستی رکھتا ہے مگر اس سے عام بھلائی کا خیال نہیں رکھتا ، وہ نکوکاری کے بڑے حصے سے محروم رہتا ہے -

۵- جب شکاری کے ہاتھ سے ہرن زخمی ہو کر اپنے گلے میں جاتا ہے تو اَور ہرن اس کو اپنے سینگوں سے مار کر بھگا دیتے ہیں - گویا وہ بھی اصولِ حفاظتِ ذات پر عمل کرتے ہیں - غرض خواہ حیوان ہو یا انسان ، دونوں کو مصیبت کے وقت سچّا دوست ملنا مشکل ہے -

۶- دنیا میں دوستی کا حال ایسا ہے جیسا کہ خزاں میں درختوں کے پت جھڑ کا ؛ کہ جب تک درخت میں پتّوں کی پرورش کا رس بھرا

ہوتا ہے وہ لگے رہتے ہیں، جہاں وہ ختم ہوا اُسے چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے ہی جب تک آسودہ حالی کی بہار رہتی ہے، دوستوں کی بِھیڑ لگی رہتی ہے۔ جب مفلسی و محتاجگی آتی ہے تو سب چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے جس کو مصیبت کے وقت کوئی سچا دوست مل جائے۔ اور اُس سے زیادہ وہ خوش نصیب ہے کہ جو دوستوں کا محتاج ہی نہ ہو۔

۷۔ دوستی چاند کے گرہن دیکھنے کے لیے اور دشمنی پورا چاند دیکھنے کے لیے آنکھیں بند کر لیتی ہے[1]۔ بُرے آدمیوں کی دوستی صبح کے سایے کی طرح گھٹتی ہے، بَھلوں کی دوستی شام کے سایے کی طرح بڑھتی ہے، اور جب تک آفتابِ حیات غروب ہوتا ہے، قائم رہتی ہے۔

۸۔ جو دوستی پاک اور مقدّس ہوتی ہے موت سے پہلے اس میں کمی نہیں آتی، بلکہ مرنے کے بعد وہ آلائش سے اور پاک و صاف ہو جاتی ہے۔ دوست کے عیب نظر سے چھپ جاتے ہیں اور خوبیاں اس کی جس کا چہرہ اب نظر نہیں آتا ہے، قبر کی تاریکی میں روشن نظر آتی[2] ہیں۔

۹۔ دوستی دولت اور حکومت ہے، دوستی زندگی کا ایک عنصر ہے۔ آگ اور پانی دنیا کو وہ آرام نہیں پہنچاتے جو دوستی پہنچاتی ہے۔ دوست کی خدمت کے لیے سب طرح کے کام کرو جس سے تم خوش رہو۔

۱۰۔ دنیا کے اندر دوستی زیادہ تر جلسۂ عیش و طرب اور برے کاموں کے واسطے ہوتی ہے۔ مگر جس دوستی کی نیکی پر بنا

۱۔ یعنی اگر کسی کی خوش حالی میں گرہن لگ جائے تو دوست منہ پھیر لیتے ہیں اور اگر اس میں چار چاند لگ جائیں تو دشمن اسے نہیں دیکھ سکتے۔

۲۔ اصل: آتے۔

ہوتی ہے ، وہ مرنے پر ختم ہوتی ہے ۔

۱۱۔ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا ہوتا ہے ۔ ارسطو کا قول ہے : ''دوست ایک جان دو قلب ہوتے ہیں ۔''

۱۲۔ آدمی دوست کو اُس وقت برا خیال کرنے لگتا ہے جب اس کی قدر و منزلت کو اپنی توقع سے زیادہ لوگوں میں دیکھتا ہے ۔

۱۳۔ جھوٹی دوستی کا حال اُس بیل کا سا ہوتا ہے کہ جس دیوار پر پھیلے ، اُسی کو کمزور کر دے یا گرا دے ۔ سچی دوستی کا درخت ایسا نہیں ہے کہ وہ جلد نشو و نما پائے ۔ گو وہ قدر و منزلت کی زمین کی گہری کھدائی میں لگایا گیا ہے ، پھر بھی وہ بہت سہج سہج محبت آمیز ملاقاتوں کے پانی دینے سے پورا ہوتا ہے ۔

۱۴۔ نیک آدمی اچھا دوست ہوتا ہے ، اس کو جلد پسند کرو اور دیر تک اس کے ساتھ نباہ کرو ۔ اُس وقت چھوڑو کہ اس میں وہ نیکی ، جس کے سبب سے پسند کیا تھا ، نہ رہے ۔

۱۵۔ ایک دوستی کی بنیاد آزادی کی محبت اور ملک کی عظمت کے[1] دو مضبوط پہاڑوں پر رکھی جاتی ہے ۔ خدا پرستی ، بہادری اور مربیانہ محبت کے[2] پائے اس پر بنائے جاتے ہیں اور نیک دلی ، فیاضی ، اخلاق کے اعتبار کی عمارت اس پر چنی جاتی ہے ، اور یوں یہ عالی شان مکان ختم ہوتا ہے ۔ ایک دوستی کی بنیاد ریت پر ہوتی ہے جس کو بیماری ، ناراضی اور ہوائے نفسانی کی ہوا کے جھکڑ ایسا بدل دیتے ہیں کہ نشان بھی باقی نہیں رہتا ۔

۱۶۔ خالی آؤ بھگت سے دوستی نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ ایسی باتوں سے پیدا ہوتی ہے جس سے محبت ثابت ہو ۔ یہ کام بڑی لیاقت کا

۱۔ اصل : کی ۔ ۲۔ اصل : کی ۔

ہے کہ ہم سچے طریقے سے کسی دوسرے آدمی کا دل تسخیر کر لیں۔ زور سے کوئی دوست نہ بنتا ہے، نہ رہتا ہے۔ وہ تو ایسا جانور ہے کہ سوائے مہربانی اور مرضی کے کسی اور چیز سے نہ پکڑا جائے، نہ ہلایا جائے۔

۱۷- ایسی محبت کی باتیں کرو کہ جس سے لوگوں کے دلوں میں گدگدیاں ہونے لگیں اور یہ ثابت ہو کہ سوائے ان کی خوشیِ خاطر کے تم کچھ اپنی غرض نہیں رکھتے۔ دل سے ان پر تم احسان کرو اور اپنے تئیں پیش کش ان کا بنا لو۔

۱۸- جو شخص دوست کے لیے کوئی کمینہ کام کرتا ہے تو وہ اس طلائی زنجیر کو توڑتا ہے جو ان کے دلوں کو وابستہ رکھتی تھی۔

۱۹- جو دوست تحفہ تحائف دے کر بنتے ہیں، وہ ان کے دینے تک دوست رہتے ہیں۔ موقوف ہونے پر ان کی محبت نہیں رہتی۔

۲۰- سچی محبت کمیاب اور اس سے زیادہ سچا دوست نایاب۔ خوش اقبالی کے زمانے میں سچے دوست بُلانے سے آتے ہیں اور بداقبالی میں بِن بُلائے۔

۲۱- دوستوں کے درمیان باتیں بڑے مزے کی ہوتی ہیں۔ آزادی، نصیحت، تعلیم یہ سب کچھ ان میں ہوتا ہے۔ جو دل میں ہوتا ہے، وہی زبان پر۔ کوئی بات پردے کے اندر نہیں رکھی جاتی۔ جو دل میں جذبات اٹھتے ہیں اور خیالات آتے ہیں، جو کسی چیز یا شخص کی نسبت رائے ہوتی ہے، یہ سب باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور ایک دوست دوسرے کے سامنے اپنا دل کھول کے رکھ دیتا ہے اور ایک دوسرے کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہ خوبیاں بھلا کس مجمع میں ہوتی ہیں۔ خواہ ان میں کیسے ہی مختلف مضامین پر آزادی اور وسعت کے ساتھ مباحثہ ہو اور خواہ کوئی مضمون ہو؛ موسمِ بہار یا خزاں یا وضع طرح،

تراش خراش[1] -

۲۲- دوستی کے باب میں یہ دانش مندانہ مقولے یاد رکھنے چاہئیں : خیر خواہ بہت ہوتے ہیں مگر دوست چند ہوتے ہیں - شیریں کلامی دوستوں کو بڑھاتی ہے اور خوش کلامی صاحب سلامتیوں کو زیادہ کرتی ہے - صلح ہزاروں سے رکھو مگر صلاح ہزار میں ایک سے لو -

دوستوں کے انتخاب کرنے میں اِن نصائحُ کو یاد رکھو : جب کسی شخص کو دوست بناؤ تو اس کا اول امتحان کر لو - جلدی سے دوست نہ بنا لو کیونکہ بہت سے اپنی خود غرضی کے موقع پر غلط نما دوست بن جاتے ہیں اور رنج و تکلیف کی حالت میں دوست نہیں رہتے - بعض دوست ایسے ہوتے ہیں کہ دشمن ہو جاتے ہیں اور لڑنے لگتے ہیں اور عیبوں کو ظاہر کرتے ہیں - بعض دوست دسترخوان کے ہوتے ہیں ، وہ مصیبت کے دن میں پوچھتے بھی نہیں - تمھاری اقبال مندی میں وہ ایسے دوست ہوتے ہیں کہ دانت کاٹی روٹی کھاتے ہیں اور ایک قالب دو جان معلوم ہوتے ہیں ، اور وہ تمھارے امین و مختار ایسے بن جاتے ہیں کہ تمھارے نوکروں پر حکم چلاتے ہیں ، لیکن جب تمھارے بُرے دن آتے ہیں تو وہ علاحدہ ہو جاتے ہیں اور پھر کبھی منہ بھی نہیں دکھاتے - کیا کسی نے خوب کہا ہے کہ جیسا تم اپنے تئیں دشمنوں سے بچاتے ہو ، ایسے ہی اپنے دوستوں سے بھی ہوشیار رہو - وفادار دوست آدمی کے لیے ایک حِصنِ حصین[2] ہوتا ہے - جس کو ایک دوست مل گیا اُس کو گویا ایک خزانہ مل گیا - سب

۱- یہ جملہ پچھلے جملے سے مربوط نہیں ہے - غالباً کاتب سے کچھ عبارت چُھوٹ گئی ہے -

۲- حصنِ حصین = مضبوط قلعہ -

سے اچھا مقولہ یہ ہے کہ وفادار دوست دوا ہوتا ہے - درد و رنج جو مرضوں کی طرح تجھے لپٹتے ہیں ، ان کو وہ اچھا کر دیتا ہے - نیک آدمیوں کی دوستی نیک ہی آدمیوں سے ہوتی ہے - پرانے دوست کو نہ چھوڑو ، نیا دوست اس کی برابر نہیں ہو سکتا - نئے دوست کا حال نئی شراب کا سا ہوتا ہے کہ جب تک وہ پرانی نہ ہو تو خوشی سے نہیں پی جا سکتی -

دوستوں کی یہ خوب تمثیل ہے کہ جو شخص بیٹھے ہوئے پرندوں پر پتھر مارتا ہے ، وہ ان کو ڈراتا ہے - ایسے ہی جو شخص دوستوں پر تبرّا کرتا ہے ، وہ دوستی کو توڑتا ہے - اگر دوست پر تلوار کھینچو یا اس کو برا کہو تو ایسی مایوسی نہیں ہوتی کہ پھر منانے سے وہ مہربان نہ ہو - لیکن اگر دوست پر لعنت بھیجو یا اس سے غرور کرو یا اس کا راز افشا کرو یا فریب سے زخمی کرو تو ان باتوں سے رشتۂ دوستی بالکل منقطع ہو جاتا ہے - جو شخص دوست کا راز افشا کرتا ہے ، وہ اپنا اعتبار کھوتا ہے ، پھر کوئی اس کا دوست نہیں ہوتا - تم کو چاہیے کہ دوست سے محبت اور وفاداری کرو - اگر تم اس کا راز افشا کرتے ہو تو اس کے پیچھے نہ چلو - جیسے کوئی شخص اپنے دشمن کو غارت کرتا ہے ، اسی طرح تم نے اپنے دوست کی محبت کو تباہ کیا ہے - جیسے کسی آدمی کے ہاتھ سے نکل کر چڑیا اڑ جاتی ہے کہ وہ پھر ہاتھ نہیں آتی ، ایسے ہی تم نے دوست کو ہاتھ سے کھویا ہے کہ وہ پھر ہاتھ نہیں آئے گا - جیسے ہرن جال سے نکل کر دور بھاگ جاتا ہے ، ایسے ہی دوست تم سے دور چلا گیا ہے - جو دوست کے زخم لگاتا ہے وہ اچھا ہو سکتا ہے ، اس سے گالم گلوچ کے بعد صلح ہو سکتی ہے ، مگر جب تُو اس کا راز افشا کرے تو کچھ نہیں ہو سکتا -

آدمی اکثر ایسے آدمیوں سے رشتۂ اتحاد جوڑ لیتے ہیں جن کا حال ان

کو نہیں معلوم ہوتا - خوب ایک برس تک ان میں باتیں چیتیں ہوتی رہتی ہیں ، تو ان کے وہ عیب کھلتے[1] ہیں کہ جن کا دلی دوستی کے وقت سان گمان بھی نہ تھا - بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ ایک خاص عمر تک اُن میں خصائلِ نیک و پسندیدہ ہوتی ہیں ، پھر وہ بگڑ کر بدخصلت ہو جاتے ہیں - پس جو شخص ایسے آدمیوں کا دوست ہوتا ہے کہ وہ کبھی فرشتہ کبھی شیطان بن جاتے ہیں ، تو اس کو بڑی تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے - مگر بڑی دانش مندی یہ ہے کہ اپنی خصائل کی خوبی اور نیکی کو ہاتھ سے نہ جانے دے -

۲۳- جب دو آدمیوں میں میلانِ طبع اِس طرف ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی خوشی اور بہبودی کو زیادہ کرے تو اسے دوستی کہتے ہیں - اگرچہ ہم نے بہت سے دانش مندوں کے قول اس باب میں نقل کیے ہیں مگر ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ان پر عمل شاذ و نادر ہی ہوتا ہے - ہر شخص اُن خوبیوں اور نیک صفات کی ، جو دوست میں ہونی چاہئیں ، ایک لمبی فہرست بنانے کو تیار ہے - مگر چاہیے کہ ان میں سے کوئی صفت اپنے میں پیدا کرے ، سو نہیں کرتا - دوستی کے دو بڑے اصول یہ ہیں کہ محبت و قدر و منزلت ہو - جب تک یہ دونوں باتیں جمع نہ ہوں ، کامل دوستی نہیں ہو سکتی - جس آدمی کی ہم قدر و منزلت نہیں کر سکتے ، اس کی دوستی سے ہم کو شرم آتی ہے - جس شخص کی قابلیت اور لیاقت سے خوب واقف ہیں اور اس کی قدر و منزلت کرتے ہیں ، لیکن ہم اس کی دوستی کا دم نہیں بھر سکتے جب تک اس کے ساتھ ہم کو نیک نیتی سے محبت کا مَیلان نہ ہو - حسد خواہ کسی بھیس میں چھپی ہوئی ہو اس کو دوستی نکال دیتی ہے -

---

۱- اصل : تو ان کی وہ عیب کھلتی ہیں -

جس شخص کو دوست کے زیادہ خوش ہونے سے خوشی نہ حاصل ہو، اس کو جان لینا چاہیے کہ وہ دوستی کو جانتا ہی نہیں - جو دوستی چپ چاپ ہوتی ہے وہ زیادہ فائدہ مند ہوتی ہے؛ اس لیے کہ دانا دوست اُس دوست سے بہتر ہوتا ہے کہ اظہارِ محبت میں گرم جوش و پُر خروش ہو -

دوستی کے لیے یہ ضرور نہیں کہ جن میں وہ ہو اُن میں میلانِ طبع ایک ہی چیزوں کی طرف ہو اور ان میں مماثلت و مشابہت ہو - دو مختلف مزاج کے آدمیوں میں بھی اتحاد ہوتا ہے، اور اس میں زیادہ لطف یہ ہوتا ہے کہ آدمی دوست میں وہ خوبیاں اور صفتیں دیکھتا ہے جو اپنے میں نہیں، اس لیے وہ خود جن صفات سے محروم تھا، اُن پر بھی علم اُسی دوست کی بدولت حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ دوست بھی آدمی خود دوسرا ہوتا ہے -

سب سے زیادہ مشکل بات، جو دوستی میں پیش آتی ہے، وہ یہ ہے کہ دوست کو اُس کی خطاؤں اور غلطیوں پر اِس خوش اسلوبی سے مطلع کرے کہ وہ یہ سمجھے کہ دوست نے جو کچھ کہا ہے، وہ میرے ہی فائدے کے لیے کہا ہے، کوئی خود اس کی غرض نہیں ہے - جب دوست کو کسی برے کام پر لعنت ملامت کرو تو انصاف اور سچ کے ساتھ، اور وہ بھی بار بار نہ ہو - جس دوست پر ملامت کرتے ہیں، اس کے خوش کرنے میں اس سبب سے مایوسی ہوتی ہے کہ جس برائی کے لیے اس پر ملامت کی جاتی ہے، وہ اس سے خود آگاہ نہیں ہوتا - جس دل میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ وہ دوستی کے سبب سے ترقی اور انسانیت قبول کرے، وہ زیادہ تر دوستوں کی ملامت کا متحمّل نہیں ہو سکتا - اُس سے یا تو اس کا دل بجھ جاتا ہے یا دوست کی قدر و منزلت کم ہو جاتی ہے - دوستی کا بڑا کام یہ ہے کہ دوست میں ہمّت

و جرأت پیدا کر دے ، اس کو زندہ‌دل بنا دے - جن دلوں کو اس سے سہارے مل جاتے ہیں ، وہ زیادہ کام کرتے ہیں - برخلاف اس کے جو دوستوں کے سہارے سے محروم ہو جاتے ہیں تو وہ پست اور سست ہو جاتے ہیں -

۲۴- دوستی اور رشتہ داری میں یہ فرق ہے کہ دوستی آدمی خود اپنے انتخاب اور اختیار سے پیدا کرتا ہے اور رشتہ داری قدرتی ہوتی ہے ، اس میں خود اس کو دخل نہیں ہوتا - اس لیے اگر آدمی دوستی کے حق نہ ادا کرے تو وہ رشتہ داروں کے حق نہ ادا کرنے سے زیادہ الزام کے قابل ہوتا ہے - اگر کسی دوست کی خطا کے سبب سے کوئی شخص ترکِ دوستی کر دے تو اس سے یہ معلوم ہوگا کہ دوست کے انتخاب کرنے کی قابلیت اس میں نہیں ہے - دوست جو بمنزلہ خزانے کے ہے ، اگر وہ جاتا رہے اور اس کا اظہار کوئی نہ کرے تو یہ بھی بڑے استقلال اور مضبوطی کا کام ہے -

۲۵- اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ آدمی مستقل دوستی ان سے کرتے ہیں جو اپنے سے اعلیٰ درجے کی لیاقت نہیں رکھتے بلکہ وہ اپنے سے کچھ کم ہوتے ہیں - وہ کبھی چھوٹی چھوٹی باتوں میں خوشامد کر کے دوستوں کا دل بھی خوش کر دیا کرتے ہیں اور ان کو خود اپنے سے کم دیکھ کر اپنی بھی آپ خوشامد کر لیا کرتے ہیں -

۲۶- جیسے زندگی میں دوستوں کی ملاقات سے مسرت ہوتی تھی ، ایسے ہی اُن کی یاد سے بعدِ مرگ خوشی ہوتی ہے ، گو آنکھوں میں آنسو ہی کیوں نہ بھرے ہوئے ہوں -

۲۷- یہ سارا عالم جو ہم کو نظر آتا ہے اس پر غور کریں تو یہ معلوم ہوگا کہ عالمِ جسمانی ، عالمِ روحانی اور عالمِ اخلاق کے اجزا میں باہم مطابقت اور اعمال میں آپس میں مشابہت و مماثلت ہے ،

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سارے عالم کا مدبّر ایک ہی ہے اور اُسی کے سارے قوانین بنائے ہوئے جاری ہیں، کہ جس کے سبب سے وحدتِ ارادی سب جگہ ایک ہی طرح کی موجود ہے۔ اجسام کی ترکیب اور حرکات دیکھنے سے حکما کو یقین ہے کہ نظامِ فلکی میں گو باہم بُعدِ عظیم ہے مگر اس میں کشش ہے۔ جتنے اجرامِ سماوی آفتاب کے گرد گھومتے ہیں، وہ ایک اصولِ مستمّرہ و قانونِ دائمی کے موافق باہم اور آفتاب کی طرف کشش کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ زمین آفتاب کے گرد پھرتی ہے اور اپنے ہمراہیوں کو چھوڑ کر بھاگ نہیں جاتی۔ اب اس عالمِ جسمانی سے عالمِ اخلاق کی طرف ذہن دوڑائیے تو یہ معلوم ہوگا کہ انسانوں کے دلوں میں بھی[1] کشش ایک اصولِ مستمّرہ و قانونِ دوامی کے موافق عمل کرتی ہے جس[2] سے ان کا اجتماع ہوتا ہے اور اس کے نام، گروہ و فرقے، مجلسیں و محفلیں اور بہت سے اسی طرح کے نام رکھے جاتے ہیں۔ جیسے اجرام میں بُعد کے متناسب کشش ہوتی ہے، یعنی جو قریب ہیں اُن میں زیادہ کشش ہوتی ہے اور جو بعید ہیں اُن میں کم، ایسے ہی آدمیوں کے دلوں کا حال ہے۔ جتنی ان میں قربت زیادہ ہوتی ہے اُتنی ہی ان میں کشش زیادہ ہوتی ہے۔ جیسے اجرام و اجسام میں، گو وہ کیسے ہی دور دراز فاصلے پر ہوں، اُن میں بھی ضرور کشش ہوتی ہے، گو معلوم نہ ہو، ایسے ہی انسانوں کے دلوں میں جو یوں بُعد باہم رکھتے ہیں، کشش ہوتی ہے۔ مگر ان کے ساتھ کشش قریبوں کی کشش کے سبب سے نہیں معلوم ہوتی۔ اگر یہ اقربا نہ ہوں تو وہ معلوم ہونے لگے۔ اگر ایک شخص کے رشتہ دار نہ ہوں تو وہ دوستوں، ہمسایوں کے ساتھ کشش کرے گا۔ اگر یہ دوست بھی نہ ہوں گے

۱- اصل: یہی کشش۔ ۲- اصل: جن سے۔

تو اپنے اہلِ وطن و ملک کے ساتھ - جب کسی غیر ملک میں ایک ملک کے آدمی ملتے ہیں تو وہ بہت جلد دوست ہو جاتے ہیں - خدائے تعالیٰ نے اجرامِ فلکی میں ایک زور ایسا بھی رکھا ہے جو ان کو آپس میں ملنے نہیں دیتا اور ایک کو دوسرے سے دور رکھتا ہے - پس یہی قاعدہ اجتماعِ انسانی میں ہے کہ نفس کی بعض خواہشات و جذبات ایسی ہیں کہ آدمی کو ایک دوسرے کے ساتھ وہ فیاضی نہیں کرنے دیتیں[1] جو انسان کی جبلّت میں داخل ہے - جب یہ روکیں[2] دور ہو جاتی ہیں تو وہ فیاضیاں ہونے لگتی ہیں - جیسے کہ اجرام کے درمیان کششِ ثقل کا سبب کوئی نہیں بتلا سکتا ، اِسی طرح یہ جو انسانوں کے دلوں میں کشش ہے ، اُس کا باعث بھی کوئی نہیں بتلا سکتا - خدا نے یہ دونوں راز کسی انسان پر کھولے نہیں - جیسے کہ یہ کششِ[3] اجسام ہزاروں مظاہرِ قدرت کے ظہور کا باعث ہوتی ہیں ، ایسے ہی یہ انسانوں کے[4] دلوں کی کشش[3] ہزاروں باتیں اجتماعِ انسانی کی[5] ظاہر کرتی ہیں اور وہی تمام اخلاق کا باعث ہوتی ہیں - اسی کے سبب سے انسانوں میں باہم محبت ہوتی ہے جس سے انتظامِ گیتی برقرار رہتا ہے - ساری دنیا کی بہبودی اِن دلوں کی کشش پر موقوف ہے -

۲۸- سچّی دوستی کے لیے کن کن باتوں کی ضرورت ہے ؟ :

ایتھنز میں سقراط اپنا ایک چھوٹا سا مکان بنواتا تھا - ایک شخص نے اس سے کہا کہ آپ جیسا بڑا آدمی ایسا چھوٹا مکان کیوں بنواتا ہے ؟ اپنی شان کے لائق مکان تعمیر کرنا چاہیے - سقراط نے اس کا جواب یہ دیا کہ میں اس تنگ مکان کو بڑا عالی شان اور باسامان سمجھوں گا

۱- اصل : دیتے -　　۲- روکیں : یعنی رکاوٹیں -

۳- یہاں لفظ ”کشش“ بطورِ جمع استعمال ہوا ہے -

۴- اصل : کی -　　۵- اصل : کے -

اگر وہ سچّے اور اصلی دوستوں سے معمور ہوگا۔ اِس سے اُس عالی منش روشن ضمیر حکیم کی رائے ظاہر ہوتی ہے کہ اس کو بھی سچّے اور اصلی دوستوں کے ملنے کی ایسی توقع[1] نہ تھی کہ وہ تنگ مکان ان سے بھر جاتا اور ان کے دل اس سے سچّی محبت استقلال کے ساتھ رکھتے[2]۔ یوں تو اس کے پاس ایسے آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی کہ جو اس سے ملنے کو اپنا فخر جانتے تھے یا اس سے کچھ سیکھنا چاہتے تھے یا اپنے اخلاق کی وجہ سے اس کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔

سچّی دوستی کے واسطے اِتنی باتیں ضروری ہیں اور اِتنے اتفاقات کا بہم ہونا لازم ہے کہ بڑا حصّہ آدمیوں کا ایسا ہے کہ کوئی سچّا دوست اُس کا نہیں ہوسکتا۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ایسے ہی دوستوں پر اکتفا کرے کہ جن سے اپنا کام نکل جائے اور ملنے سے دل خوش ہو جائے۔ آدمی اپنی خود غرضی اور ہوائے نفسانی میں ایسا مبتلا ہے کہ اس کے گرد گروہ ہا گروہ آدمی ایسے ہیں کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ فیّاضی و احسان کرنا نہیں چاہتے بلکہ اپنے مطلب و مقصد پر نگاہ رکھتے ہیں۔ سوائے اس خود غرضی کے انسانوں کی طبائع میں ایسا اختلاف ہے کہ وہ دلوں میں دوستی کو خارج کرتا رہتا ہے۔ بعض آدمی اپنی فیّاضی اور احسان کرنے میں بڑے گرم جوش ہوتے ہیں مگر ان میں استقلال نہیں ہوتا، اس لیے وہ پرانے دوستوں کو بغیر دشمن ہونے کے چھوڑ دیتے ہیں اور نئے دوستوں پر مہربانی کرنے لگتے ہیں۔ بعض آدمی ایسے نرم دل، موم کی ناک اور کان کے کچّے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی حسد و عناد یا خوشامد کے سبب سے کسی کی طرف سے ان کے کان بھر دے تو پھر ان کو دوست پر شبہ ہو جاتا ہے۔ ہر صلاح و مشورہ دینے والے[3] کی صلاح پر چلتے ہیں لیکن آخر

۱۔ اصل: توقع بھی نہ تھی۔ ۲۔ اصل: رکھتی۔ ۳۔ اصل: والی۔

میں جو ان سے کہے ، اُسی کے موافق وہ مڑ جاتے ہیں - وہ شوق کی دوستی دو آدمیوں میں مستقل ہوتی ہے کہ ہر ایک میں نیکی برابر نہ ہو بلکہ ایک قسم کی ہو اور دونوں کا ایک ہی مقصد نہ ہو بلکہ اس کے حصول کے وسائل ایک ہی ہوں - بعض آدمیوں کی ہم قدر کرتے ہیں ، محبت نہیں کرتے - بعض سے محبت کرتے ہیں مگر ان کی قدر نہیں کرتے - مگر سچی دوستی میں دونوں باتیں ہوتی ہیں ؛ قدر بھی کرتے ہیں ، محبت بھی کرتے ہیں -

کہتے ہیں کہ رفیقوں اور حریفوں یعنی ہم پیشوں میں سچی دوستی نہیں ہو سکتی - اُن میں رقابت کا رشک ایسا ہوتا ہے کہ وہ سچی دوستی کو نہیں قائم ہونے دیتا - سچی دوستی ہمیشہ بہت کم اُن آدمیوں میں قائم رہتی ہے جو ہم حالت نہ ہوں - ایک جانب اگر بزرگی ہو تو دوسری جانب میں کوئی اور صفت ہو جو اس کو ہم وزن کرے - فائدے جن کا معاوضہ نہ ملے اور وہ احسانات جن کا بدلا نہ ملے ، وہ اکثر دوستی کو نہیں بڑھاتے - وہ احسان مندی کو بڑھاتے ہیں ، تعظیم و عزت پیدا کرتے ہیں ، بلکہ اس کے سبب سے بے تکلّف ملاپ جُلاپ ، جو دوستی پیدا کرتی ہے ، کم ہو جاتا ہے -

۲۹- تمام آدمیوں سے محبت کرنی انسان کا فرض ہے - یعنی ایسی فیّاضی اور مہربانی کی عادت اختیار کرے کہ اس سے سارے آدمیوں کو فائدہ پہنچے - لیکن سب آدمیوں کو برابر چاہنا ناممکن ہے - یہ تو جب ہی ہو سکتا ہے کہ آدمی کی تمام خواہش ہائے نفسانی مُردہ ہو جائیں -

۳۰- دوستی کا نازک ہو جانا اور اس کی شکستگی کے اسباب :

انسان کے واسطے دوستی سے زیادہ کوئی خوشی عمدہ نہیں ہے - مگر نہایت افسوس ہے کہ اس عمدہ خوشی کے جاتے رہنے کے صد ہا اسباب

ہوتے ہیں اور وہ ایسی نازک ہے کہ ایک ذرا سی بات میں ٹوٹ جاتی ہے - اور کوئی انسان کے پاس ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کے جانے کا خطر ایسا ہو جیسا کہ دوستی کا - اگرچہ اس کی اِستواری کے باب میں بہت سے دانش مندوں نے اپنی فصاحت اور بلاغت کو خرچ کیا ہے اور اس کے استظہار و اعتضاد اور اعتبار و اعتماد کو نہایت مستقل بتلایا ہے ، اور اس کی مثالیں بیان کی ہیں کہ دوستوں نے اپنی جان و مال دوستوں پر قربان کی ہے اور دولت و افلاس میں یکساں رہتے ہیں ، اور ابتدائے عمر سے آخرِ عمر تک دوستی کے حق کو ادا کیا ہے ، لیکن ایسی مثالیں اِس سبب سے یاد کے قابل ہوتی[1] ہیں کہ وہ بہت ہی شاذ و نادر دیکھنے میں آتی ہیں - انسانوں میں دوستی کی بنا منفعت یا مسرّت پر رکھی جاتی ہے - پس جہاں یہ باہمی مسرّت اور منفعت ختم ہوئی ، دوستی نے بھی سلام کیا -

بہت سے اتفاقات دنیا میں ایسے واقع ہوتے ہیں کہ دوستوں میں دوستی نہیں رہتی اور طرفین سے کوئی حرکت پاجیانہ اور تلوّن مزاجی کی بھی سرزد نہیں ہوتی - کیونکہ ہمارے اختیار میں کسی کا خوش کرنا ہمیشہ نہیں ہوتا - اور وہ شخص اپنے حال سے بڑا ناواقف ہے جو یہ یقین کرتا ہے کہ ہمیشہ دوسرے سے خوش ہو سکتا ہوں - جو دوست ابھی رات دن خوشی سے بسر کر رہے تھے ، وہ مختلف سببوں سے آپس سے جدا ہو گئے - اب یہ مفارقت تھوڑے دنوں کی ہے تو پھر ملنے سے دوستی اَور بڑھ جائے گی اور اگر زیادہ دنوں کی بات ہے تو ان میں ، جیسے کہ عشق مدت کی مہاجرت میں قائم نہیں رہتا ، یہ دوستی بھی قائم نہیں رہے گی - جس چیز کو ہم کھو دیتے

۱- اصل : ہوتے ہیں -

ہیں اور اس کی ضرورت باقی رہتی ہے تو وہ جتنے دنوں کے بعد دوبارہ ملتی ہے ، اتنی عزیز ہوتی ہے - مگر جب جدائی ایسی ہو کہ اسے بھول جائیں اور کچھ ضرورت نہ رہے تو اس کے ملنے سے بہت کم خوشی ہوتی ہے کیونکہ اس کی قائم مقام بہت سی چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں - وہ دوست جس کے سامنے ہم اپنی ساری دل کی باتیں کہہ دیتے تھے اور رات دن اس کے ساتھ دل لگی رہتی تھی ، اگر وہ جدا ہو جاتا ہے تو اول اس کی جدائی کا ایک ایک دن کاٹنا پہاڑ معلوم ہوتا ہے ، ہر گھڑی اُس کا تصّور اور خیال رہتا ہے اور اُس کی باتیں یاد آتی ہیں ، مگر یہ بےقراری اور بےچینی بہت دنوں تک نہیں رہتی کیونکہ اَور دوست اس کی جگہ دل کے بہلانے والے مل جاتے ہیں ، اور جو تعلقات اُس کے ساتھ تھے وہ اَوروں کے ساتھ پیدا ہو جاتے ہیں اور دل لگی اور ہنسی خوشی کی باتیں ہونے لگتی ہیں -

جب مدت کی جدائی کے بعد پرانے دوست ملتے ہیں تو جو اُمیدیں ان کو آپس میں ہوتی ہیں ، اُن میں جو مایوسی ہوتی ہے اُس کی برابر کوئی مایوسی نہیں ہوتی - وہ چاہتے ہیں کہ پھر پرانی دوستی از سرِ نو زندہ ہو جائے اور وہی باتیں جو پہلے ہوتی تھیں ، اب بھی ہونے لگیں - مگر وہ یہ نہیں تحقیق کرتے کہ زمانے نے کیا انقلاب ان میں پیدا کر دیا ہے اور کیا دونوں کو نیا کر دیا ہے - اول ہی ملاقات کے گھنٹے میں ان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ خوشی ، جو ہم کو پہلے ملاقات میں ہوتی تھی ، اُس کا خاتمہ اب ہوگیا - اب عالم ہی کچھ اَور سے اَور ہوگیا - رایوں میں فرق پڑ گیا - جو وضع طرح میں مشابہت و مماثلت تھی ، اس میں مخالفت ہوئی - غرض وہ سب باتیں جن کے سبب سے ایک دوسرے کو پسند کرتا تھا ، جاتی رہیں -

دوستی اِس سبب سے بھی جاتی رہتی ہے کہ اغراض میں تضاد واقع ہو - کچھ ضرور نہیں کہ جاہ و دولت سے یہ اغراض متعلق ہوں ، بلکہ بہت سی چھوٹی چھوٹی و مخفی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں باہم رقابت پیدا ہوتی ہے اور ان کی خبر بھی ان کو نہیں ہوتی - کوئی شخص شاید ایسا ہو کہ وہ ایک ادنیٰ بات کو عزیز رکھتا ہو جس کو وہ مہتم بالشان و اعلیٰ نہ جانتا ہو ؛ مثلاً کچھ اپنی تعریف و ادب چاہنا - اگر کوئی وہ نہ کرے تو اس کا دل شکستہ ہو جاتا ہے - اب دوست تو یہ جانتا نہیں کہ تعریف نہ کرنا یا ادب نہ کرنا گستاخی میں داخل ہے اس لیے وہ یہ دونوں کام نہیں کرتا - اس سے گو ظاہر میں دوستی شکستہ نہیں ہوتی ، اس لیے کہ شرم مانع ہوتی ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں رنجیدگی ظاہر کی جائے ، مگر وہ تھوڑی تھوڑی جمع ہوتے ہوتے بہت بڑھ جاتی ہے ، ایک دن بھانڈا پھوٹ جاتا ہے - گو نیک آدمی ایسی باتوں کو اپنے میں پیدا ہونا نہیں چاہتے ، اور جہاں تک ہو سکتا ہے ان کو دباتے ہیں ، مگر بعض اوقات اس طرح دبانے کے صدمے سے بھی انسان کو رنج پہنچ جاتا ہے -

کبھی کبھی دوستوں میں دوستی چُہل اور ہنسی کی باتوں سے بھی جاتی رہتی ہے - ہنسی کی پھنسی ہو جاتی ہے ؛ پہلے ایک بات پر باہم چھیڑ چھاڑ شروع ہوتی ہے اور ابتدا میں اس کی پروا دونوں کو نہیں ہوتی ، مگر آخر کو اس کے بڑھنے سے طرفین کو غصہ آجاتا ہے اور ایک لڑائی بندھ جاتی ہے ، شکررنجی ہو جاتی ہے - گو تھوڑی دیر کے بعد وہ آپس میں پھر مصالحت کر کے دوستی قائم کرتے ہیں مگر جب دوستوں میں ایک دفعہ رنجش ہو جاتی ہے تو پھر وہ صفائی ان میں نہیں رہتی ہے جو پہلے ہوتی ہے - دوستی کی شیرینی کو اس لڑائی کی

یاد زہر آلود کرتی رہتی ہے -

دوستی کے اور بھی دشمن ہیں ؛ اہلِ حزم کے دل میں ہمیشہ شبہ دوستی میں خلل ڈالتا رہتا ہے - نازک مزاجوں میں نفرت دوستی کو ہٹاتی رہتی ہے - بعض دفعہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اپنے وطن سے دو آدمی جب گئے ، دوست تھے اور جب پھر کر آئے تو محض نا آشنا - سب سے زیادہ بری علّت دوستی کے پیچھے یہ لگی ہوئی ہے کہ دوستوں میں بہ تدریج ہر ساعت ناپسندی ایسی ایسی چھوٹی باتوں میں بڑھتی جاتی ہے کہ نہ جن کی باہم شکایت ہو سکے ، نہ وہ رفع ہو سکیں - جن کو غصّہ آئے اُن سے حفاظت ہو سکتی ہے ؛ جن کو مضرّت پہنچائے ، منفعت سے اس کا معاوضہ ہو سکتا ہے ، لیکن جب دوستوں میں ایک دوسرے کے خوش کرنے کی خواہش رفتہ رفتہ نامعلوم جاتی رہتی ہے تو پھر دوستی از سرِ نو پیدا ہونے کی اُمید کچھ نہیں رہتی - جن قُوا میں جان ہی نہ رہے ، پھر ان کا علاج طبیب کیا کر سکتا ہے -

١٢١- خرچ

دولت خرچ کرنے کے واسطے ہوتی ہے اور خرچ عزّت اور بھلے کاموں کے واسطے ہوتا ہے - عزّت سے مراد یہ ہے کہ جس میں اظہارِ دولت ہو - جو لوگ غریب نہیں ہوتے وہ اظہارِ دولت میں اپنی عزّت سمجھتے ہیں اور دولت کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں کہ بہت سی وہ اشیا خریدتے ہیں کہ جو بیش بہا ہوں اور ان کے نہ خریدنے سے وہ کنجوس یا غریب سمجھے جائیں - چاندی اور گلٹ کی گھڑی سے وہی کام نکلتا ہے جو سونے کی گھڑی سے - پھولوں کے گہنے سے آرائش اور زیبائش کچھ جواہر سے کم نہیں ہوتی - مگر اِس سبب سے کہ سونا اور جواہر بیش قیمت ہوتے ہیں اس لیے ان کے رکھنے میں وہ اپنی عزّت

سمجھتے ہیں - اگر یہ چیزیں بھی ارزاں ہو جائیں تو انھیں بھی وہ چھوڑ دیں اور اپنی آرائش اور بیش بہا چیزوں سے شروع کریں -

بعض دفعہ ایسے موقع آن پڑتے ہیں کہ ان میں اپنی دولت کو قربان کرنا پڑتا ہے ؛ جیسے کہ اپنے ملک اور قوم کی عزت تھامنے میں - ایسی صورتوں میں بڑے بڑے تونگر مفلس ہو جاتے ہیں - مگر اس افلاس کی حالت میں ان کی عزّت پہلے کی نسبت زیادہ ہو جاتی ہے - ایسے موقعوں میں دولت کو اتنا خرچ کرنا چاہیے جتنا وہ مناسب ہو - مگر معمولی خرچ کا ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ وہ مقدور سے باہر نہ ہو - حسبِ حیثیت و مقدور ہو اور نوکروں کو فریب دینے کا اور روپیہ بری طرح اڑانے کا موقع نہ ملے - اور خوش انتظامی کی یہ خوبی ہے کہ جو چیزیں دکھلانے کے واسطے رکھی جائیں ، وہ ایسی ہوں کہ اور لوگ ان کی اصلی قیمت سے زیادہ ان کی قیمت کا تخمینہ کریں - یہ بڑی حماقت ہے کہ کوئی شخص نمائش کے لیے خرچ رکھ کر اپنے تئیں مفلس بنائے - اظہارِ دولت سے عزّت حاصل کرنے میں یہ بھی شرط ہے کہ اس میں تکلیف نہ ہو - اس لیے جو لوگ اپنے مقدور سے زیادہ نمائشی خرچ رکھتے ہیں ، ان کے دل کو چین نہیں ہوتا ؛ مثلاً وہ ایک عمدہ جوڑا پہنتے ہیں تو اس کے میلے ہونے اور کھوچ[1] لگنے یا پھٹ جانے کا خوف ان کو لگا رہتا ہے - چینی کے برتن بہت عمدہ خرید لیتے ہیں ، ان کے ٹوٹنے کا ڈر رہتا ہے - ایسی[2] صورت میں مقدرت[3] سے زیادہ اظہارِ دولت عذابِ جاں ہو جاتا ہے - اگر ایسے تردد پیدا ہوں تو بہتر ہے کہ وہ ان چیزوں ہی کو سرے سے نہ رکھیں -

---

۱- : لغات میں یہ لفظ نہیں ملا -

۲- اصل : ایسے صورت میں -

۳- مقدرت = مقدور ، توفیق -

اگر آدمی اعتدال سے رہنا چاہے تو آمدنی سے آدھا خرچ رکھے اور اگر دولت مند ہونا چاہے تو ایک تہائی آمدنی کا خرچ رکھے۔

بڑے آدمی اگر اپنی جائداد کی خود دیکھ بھال رکھیں تو اس میں ان کی کسر شان نہیں ہے۔ اگر وہ یہ کام نہ کریں تو ان کو چاہیے کہ وہ اچھے ملازم تلاش کریں اور ان کو بدلتے رہیں کیونکہ نئے نوکر خوف زیادہ کرتے ہیں اور مکر و فریب کم۔ بعض آدمی کچھ غفلت کے سبب سے اپنی جائداد کے محاسبے سے باز نہیں رہتے بلکہ اِس وجہ سے کہ ان کو اس سے رنج ہوتا ہے۔ مگر زخم تو بغیر داغ کے اچھا نہیں ہوتا۔

دولت مند آدمیوں کو خیالی ضرورتیں بہ نسبت غریب آدمیوں کے[1] زیادہ ہوتی ہیں۔ گو دولت مندوں کی تعداد بہ نسبت غریب آدمیوں کے بہت کم ہوتی ہے مگر اُن کے قرض کی مقدار بہ نسبت غریب آدمیوں کے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے ان کو تکلیفات بہ نسبت غریب آدمیوں کے زیادہ ہوتی ہیں[2]۔ جو لوگ اپنی جائداد کی دیکھ بھال کمتر کرتے ہیں، اُن کو چاہیے کہ اپنی آمدنی اور خرچ کی مقدار ایسی مقرر کر دیں کہ اس میں فرق نہ آئے اور ان میں کوئی شبہ نہ ہو۔ جو شخص کسی ایک طرح کا خرچ زیادہ کرے تو اس کو چاہیے کہ وہ دوسری طرح کے خرچ میں کمی کرے؛ مثلاً ایک شخص خوراک میں زیادہ خرچ کرتا ہے تو اس کو پوشاک میں تخفیفِ خرچ کرنی چاہیے۔ اگر نوکروں میں حویلی کے اندر زیادہ صرف کرتا ہے تو اصطبل میں گھوڑوں کا خرچ کم کرنا چاہیے۔ جو شخص ہر طرح کے خرچ میں مُسرف[3] ہوگا، آخر کو وہ تنگ دست و مفلس

۱- اصل : کی۔ ۲- اصل : ہوتی ہے۔

۳- مُسرف = فضول خرچ آدمی۔

ہو جائے گا ۔ مُسرف آدمی ہر خرچ کو یہ جانتے ہیں کہ ہم کرسکتے ہیں ، وہ ہمارے مقدور کے موافق ہے ، اس لیے وہ مفلس ہو جاتے ہیں ۔

قرض داروں کو چاہیے کہ وہ قرض کے ادا کرنے میں نہ جلدی کریں ، نہ تاخیر ۔ جلدی کرنا ایسا ہی مُضر ہے جیسا کہ تاخیر کرنا ۔ اس واسطے جو شخص کہ جلد قرض ادا کر دیتا ہے تو وہ اپنے تئیں جانتا ہے کہ میں سبک دوش ہوگیا ، اس لیے پھر اپنی عادت کے موافق قرض لے لیتا ہے ۔ مگر جو شخص بہ تدریج قرض ادا کرتا ہے ، وہ اپنی آمدنی کی جیسی اصلاح کرتا ہے ، ایسی ہی اپنی عادت کی بھی اصلاح کرتا ہے ۔ جیسا جائداد سے فائدہ اٹھاتا ہے ، ایسا ہی اپنے دل کے اخلاق سے ۔ جو شخص اپنی آمدنی کی اصلاح چاہتا ہے تو وہ چھوٹے چھوٹے خرچ ، جو ہمیشہ جاری رہیں ، ان سے گریز کرے ۔ ان چھوٹے خرچوں کے کم کرنے سے وہ بے عزتی نہیں ہوتی جو چھوٹی آمدنیوں کی طرف میلان کرنے سے ذلّت ہوتی ہے ۔ غرض جو خرچ کہ ہمیشہ کے لیے ہوں ، اُن میں بڑی احتیاط چاہیے ، مگر جو خرچ ایک ہی دفعہ ہوں ، ان میں کچھ زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں ۔

۱۲۲۔ تدابیرِ صحت

۱۔ آدمی کے واسطے سب سے بہتر طبابت و دوا یہ ہے کہ وہ خود مشاہدہ و تجربہ کرتا رہے کہ کون سی چیزیں میرے مزاج کے موافق ہیں کہ میری صحت کے لیے مفید ہوتی ہیں ۔ مگر یہ بھی یاد رکھے کہ کچھ ضرور نہیں کہ جو چیزیں کہ ایک عمر میں موافق و مخالف ہوں وہ دوسری عمر میں بھی ایسی ہوں ۔ آدمی کی سرشت میں داخل ہے کہ اُن کے قُوا اور مزاج بہ لحاظ عمر کے بدلتے رہتے ہیں ۔ کچھ ضرور نہیں ہے کہ جو چیزیں کہ لڑکپن میں موافقِ مزاج تھیں وہ

جوانی میں اور جو جوانی میں موافقِ مزاج تھیں وہ پیری میں بھی موافق رہیں، اس لیے ان کو بمقتضائے سِن تبدیل کرتا رہے - جب کھانے میں دفعۃً تبدیلی ہو تو اس کے ساتھ اَور چیزوں کو بھی بدلو - یہ نیچر کا قاعدہ ہے کہ بہت چیزوں کا بدلنا بہ نسبت ایک چیز کے بدلنے کے آسان ہوتا ہے - جب بادشاہ کوئی نیا ملک فتح کرتا ہے تو اس کی ساری چیزوں کو نیا بنا دیتا ہے - تم کھانے، سونے، لباس، ورزشِ جسمانی کی عادات کا امتحان کرو اور جس چیز کو اس میں سے اپنے لیے مضر پاؤ، اس کو تھوڑا تھوڑا چھوڑ دو اور اگر تبدیلی میں تکلیف ہو تو پھر اپنی عادتِ قدیم پر غور کرو - یاد رکھو کہ بعض دوائیاں گو علی العموم اچھی ہوں مگر خاص آدمیوں کے لیے مُضر ہوتی ہیں - اگر زندگی بڑھانی چاہتے ہو تو کھانے، سونے، ورزش کرنے کے[1] وقت فارغ البال اور خوش مزاج رہو[2] - دل میں حسد رکھنا، خوفوں سے دہشت کرنا، غصّے ہونا، دل‌خراش و جاں‌گزا باتیں کرنی، مکاری، ایچ پیچ کا تجسّس، کثرت سے خوش ہونا یا غم گیں ہونا، ان سب باتوں سے دل کو بچاتے رہو - اچھی اچھی امیدیں رکھو - ایسا مطالعہ کرو جس سے دل خوش ہو؛ جیسے تاریخ و قصص و طبیعیات ہیں - یہ باتیں تمھاری صحّت کو مؤیّد ہوں گی - اگر تم صحّت میں ہمیشہ دوائیاں کھایا کرو تو مشکل ہے کہ بیماری میں کوئی دوا تمھاری صحّت کے لیے[3] مفید ہو - جہاں مزاج دواؤں کے استعمال کا عادی ہوا، دوا غذا بن گئی - پھر وہ دوا کا اثر نہیں کرتی - دواؤں کے استعمال سے

۱- اصل : کی وقت - ۲- اصل : خوش مزاج ہو -

۳- "لیے" اضافہ مرتّب -

غذا کی اصلاح بہتر ہوتی ہے ، کیونکہ جسم کے بدلنے میں جیسا کہ غذا کا اثر ہوتا ہے ، دوا کا نہیں - غذا جسم کو تکلیف نہیں دیتی - اگر جسم پر کوئی ناگہانی آفت آجائے تو اس کے علاج کے لیے تدبیر کرو - بیماری میں صحت کا بڑا خیال رکھو اور صحت میں کام کا - جو لوگ صحت میں اپنے جسم کو برداشت کرنے کا عادی بناتے ہیں ، اُن کی بہت سی بیماریاں ، جو سخت نہیں ہوتیں ، اُن کو فقط غذا اور احتیاط کے ساتھ تیمارداری سے وہ کھو سکتے ہیں -

ایک حکیم نے احکامِ صحت میں بڑا حکم یہ دیا ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ متضاد چیزوں میں تبادلہ کرتا رہے ، اور جو اُن میں زیادہ ملائم ہو اُس کی طرف زیادہ میل رکھے - کھائے بھی ، فاقے بھی کرے مگر کھانے کی طرف میلان زیادہ رکھے - سوئے بھی ، جاگے بھی مگر سونے کی طرف زیادہ میلان رکھے - بیٹھے بھی اور ورزش بھی کرے مگر زیادہ ورزش کی طرف رغبت کرے ، اور اسی قبیل کی اور باتیں کرے - اس سے طبیعت میں ایسی قوت آئے گی کہ بیماری پر وہ غالب رہے گی - بعض حکیم ایسے نیک مزاج اور نرم دل ہوتے ہیں کہ وہ مریض کی خاطر سے اپنے قواعدِ طبابت کی سخت پابندی نہیں کرتے ، اور بعض ایسے سخت دل ہوتے ہیں کہ وہ اپنے قواعدِ طبابت کی تعمیل میں مریض کی خاطرداری ذرا بھی نہیں کرتے - تم کو چاہیے کہ اپنے لیے کوئی طبیب ایسا تلاش کرو کہ وہ فنِ طبابت سے بھی خوب آگاہ اور تمھارے مزاج سے بھی آشنا ہو -

۲- جو شخص ہمیشہ اپنی صحت کے تردّد میں لگے رہتے ہیں ، اُن کا دل سست اور حوصلہ پست ہو جاتا ہے - وہ گویا اپنے جسم کے مستغیث ہو جاتے ہیں - تندرست جسم روح کا میزبان ہے اور بیمار جسم روح کا جیلر ہے - تندرست جسم کاموں کے واسطے مستعد رہتا ہے اور

بیمار جسم کاموں کے لیے معطّل رہتا ہے - بیماری کے بعد تندرست ہونا از سرِ نو جوان ہونا ہے - جو زیادہ مریض رہتے ہیں وہ کام کرنے کے لیے بیماری کا عذر پیش کرتے ہیں - بیماری کی حالت میں جو عذر معقول ہوتا اُس کو صحت کی حالت میں بھی خوشی سے کام میں لاتے ہیں - صحت جسم و روح کے[1] وصل کا سبب ہوتی ہے - بہت سے آدمی کاؤچ[2] اور بستر پر پڑے پڑے سلطنتوں اور سپاہیوں پر حکومت کرتے ہیں - سخت تدابیر سے صحت کو قائم رکھنا خود ایک مرضِ گزند رساں ہے -

۳- ایک مثل انگریزی زبان میں چلی آتی ہے کہ جو سویرے سوتا ہے اور سویرے اُٹھتا ہے ، وہ تندرست اور دولت مند اور عقل مند ہوتا ہے - ایک صاحب جج ، مقدّمات میں جو بوڑھے گواہ آتے تھے ، اُن سے ہمیشہ اُن کی عادات پوچھا کرتے تھے - ان کی سب عادتوں میں اختلاف تھا مگر سویرے سونے اور اُٹھنے کی عادت میں سب کا اتفاق تھا - اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جو شخص دن بھر محنت کرتا ہے وہ تھک کر سویرے سو رہتا ہے ، اور سویرے سوتا ہے تو سویرے اُٹھتا ہے - بوڑھے آدمی کام سے سرِ شام تھک جاتے ہیں اس لیے سویرے سو رہتے ہیں ، اور سویرے سونے سے ہی ان کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ اُٹھ بیٹھتے ہیں - اگر یہ کہا جائے کہ سویرے اُٹھتے ہیں اس لیے سویرے سوتے ہیں اور سویرے سوتے ہیں اس لیے سویرے اُٹھتے ہیں ، تو پھر وہی بات ہو جائے کہ زمین ہاتھیوں پر اور ہاتھی کچھوے پر اور کچھوہ پانی پر اور پانی زمین پر -

صحت کے لیے بعض آدمی اپنے سونے کے لیے گھنٹے مقرر کرتے ہیں ، خواہ وہ کسی وقت سے کسی وقت تک یکساں ہوں ؛ مثلاً

۱- اصل : کی وصل -   ۲- اصل : کوچ -

سات گھنٹے خواہ رات کے نو بجے سے ۱۰ بجے تک ہوں یا رات کے بارہ بجے سے دن کے سات بجے تک - غرض یہ سونا جاگنا تو عادت پر موقوف ہے - مگر جو لوگ زیادہ زندگی چاہتے ہیں وہ ایسی مہمّاتِ عظیم سے ، جن میں محنتِ شاقہ اٹھانی پڑتی ہے ، پرہیز کرتے ہیں اور آسائش کے ساتھ عزلت اختیار کرتے ہیں -

۴- صحت بھی ایک نور کا فرشتہ ہے - ساری مخلوق اپنے جینے کی دعا مانگتی ہے اور پھر اس فرشتے کی مہربانی کی - اگر وہ کسی جھونپڑی میں جلوہ افروز ہوتا ہے تو اسے محلِ شاہی بنا دیتا ہے - اُس کی نظرِ التفات سے قید خانے کی زنجیریں آسائش اور آرام کا سلسلہ بن جاتا ہے اور اُس کی نامہربانی سے افسرِ[1] شاہی سے بھی سر میں درد پیدا ہوتا ہے - وہی انسان کی تمام خوشیوں کی جان ہے - اس کے بدون ساری خوشیاں بے لطف اور پژمردہ ہیں ، گو مردہ نہیں - دسترخوان پر لطیف لطیف کھانے چنے جائیں مگر بیمار کو کیا ، وہ بھوکا ہی رہتا ہے - کیسے ہی عمدہ عمدہ شربت و شرابیں آئیں ، اُن سب پر وہ منہ بناتا ہے - دولت کے ڈھیر اور خزانے آگے لگے ہوئے ہیں مگر وہ ان سے بد نصیب ہے - چھوٹی چھوٹی بیماریوں سے قُوا ضعیف ہوتے ہیں ، جوانی کا جوبن خاک میں ملتا ہے ، کانوں کو خوش آوازی اور گفتگو دونوں ناگوار ہوتی ہیں ، بڑے محل جیل خانے معلوم ہوتے ہیں ، ان میں رہنا قید سے کم نہیں ہوتا - دولت بیکار ، جاہ و حشم سر پر بار ، افسر سر کا بوجھ - بڑی بیماریوں میں گدا اور بادشاہ میں کچھ فرق نہیں رہتا - سب کی حالتیں یکساں معلوم ہوتی ہیں - پتھری کا غش اور پیٹ میں مروڑ کا درد کچھ شکنجے میں کھنچنے سے کم نہیں ہوتا -

---

۱- افسر = تاج -

اگر ان دو مرضوں میں بادشاہ مبتلا ہو تو اس کو جو دکھ درد ہوگا، وہ اس نے ساری عمر میں کسی مجرم کو اپنی رعایا میں سے نہ دیا ہوگا۔

۵۔ اگر دولت مند تندرست رہنا چاہیں تو ورزش اور پرہیز اختیار کریں اور غریبوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ زندگی کے معنی جینے کے نہیں ہیں بلکہ تندرست رہنے کے ہیں۔ سب سے بڑی نعمت، جو خدا نے انسان کو دی ہے، وہ تندرستی ہے مگر انسان اس کو سمجھتا نہیں۔

٦۔ دماغی محنت کی کثرت سے ہمارے جسم میں آدھی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ سارے اسباب تہذیب و شائستگی کے ایسے مہیّا ہوتے ہیں کہ دل و دماغ آرام نہیں لیتا۔ سینکڑوں تردّد اور تفکّر میں مبتلا رہتا ہے۔ ہمارے باپ دادا کے پٹھے تھکتے تھے مگر ہماری رگیں تھکتی ہیں، اس لیے ہم اُن سے زیادہ امراض میں مبتلا رہتے ہیں۔

۷۔ سقراط کا قول ہے کہ پیری صحت اور سچّے دوست کے ساتھ نہایت مسرّت ناک ہے۔ ایک حکیم کہتا ہے کہ وہ آدمی بڑا ہی بد نصیب ہے جو ساٹھ برس کے بعد جینا چاہتا ہے۔ عمر کا حال شراب پینے کا سا ہے کہ جو اچھی طرح شراب پیتا ہے، وہ تلچھٹ کو چھوڑ دیتا ہے۔ جوان آدمیوں کو جب رنج ہوتا ہے کہ کوئی خوشی کی بات ان کو نہ ہو۔ بوڑھے آدمی، جب کوئی رنج کی بات نہ ہو، خوش ہوتے ہیں۔ جوان آدمی اپنے حال کی خوشیوں کو آئندہ کی بیہودہ اُمیدوں اور ناحق کے خوفوں سے تلخ کرتے ہیں۔ بوڑھے اپنے زمانۂ ماضی کی باتوں کو یاد کر کے مسرور ہوتے ہیں۔ اس لیے جوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی صحت اور تنومندی کے زمانے میں ایسے نیک اور لیاقت کے کام، خواہ خاص اپنی ذات کے لیے یا عوام کے لیے، کریں کہ اُن کی یاد پیرانہ سالی میں دل کو خوش کیا کرے۔

۸- اگر صحت سونے سے خریدی جاسکتی تو کون ایسا شخص ہے کہ طامع اور کنجوس نہ ہوتا؟ اگر صحت کو زور اور حکومت مول لے سکتی تو کون ایسا ہوتا کہ عالی ہمّت اور اولوالعزم نہ ہوتا؟ مگر افسوس ہے کہ گٹھیا کی بیماری میں چاندی کا عصا بانس کے ٹونٹے سے زیادہ پاؤں کی مدد نہیں کرتا - زخموں پر پٹی باندھنے میں ریشم کا ڈورا سُوت کے ڈورے سے زیادہ فائدہ نہیں دیتا - سونے اور ہیرے کی چمک بیمار آنکھوں کو کچھ آرام نہیں دیتی بلکہ اور زیادہ آزار پہنچاتی ہے[1]- جس سر میں درد ہو اُس کو افسرِ شاہی سے[2] سکھ چین ٹکیل ٹوپی[3] سے زیادہ حاصل نہیں ہوتا -

۱۲۳- شبہات

۱- خیالات میں شبہات کا حال ایسا ہے جیسا کہ پرندوں میں چمگادڑوں کا کہ وہ جُھٹ پُٹے ہی کے وقت اُڑتی ہیں (یعنی جن آدمیوں کے دل میں حسنِ اخلاق کی اور دماغ میں عقل کی روشنی دھندلی ہوتی ہے وہ شبہات کرتے ہیں) - ہم کو چاہیے کہ شبہات کو ڈھائیں اور ایسا قید میں رکھیں کہ وہ باہر نہ جانے پائیں، اس لیے کہ وہ دل پر ایک گھٹا چھا دیں گے، دوستوں کو کھو بیٹھیں گے، کام میں وہ خلل ڈالیں گے کہ وہ متواتر استقلال سے نہیں چل سکیں گے - وہ بادشاہوں کو ظالم بنائیں گے، خاوندوں کے دلوں میں حسد و حقد[4]

۱- اصل میں یہ جملہ یوں چھپا ہے: "سونے اور ہیرے کی چمک بیمار آنکھوں کو کچھ آرام نہیں دیتیں بلکہ اور زیادہ آزار پہنچاتی ہیں -

۲- اصل: "افسیر شاہی سے زیادہ سکھ چین ٹکیل ٹوپی سے زیادہ . . ."

۳- ٹکیل ٹوپی = معمولی ٹوپی -

۴- حقد = بغض، کینہ -

پیدا کریں گے ، عاقلوں کو متزلزل اور ناکام کر دیں گے ۔ شبہات دل کے قصور سے نہیں پیدا ہوتے بلکہ دماغ کے فتور سے ۔ اگرچہ بہادروں کے دلوں میں بھی شبہات پیدا ہوتے ہیں مگر ان کو تکلیف کم دیتے ہیں ۔ مگر نامردوں کے دلوں میں جلد پیدا ہوتے ہیں اور ان کو سخت تکلیف دیتے ہیں ۔

شبہات کے پیدا ہونے کا سبب کم علمی ہوتی ہے ۔ اس لیے ان کے دور کرنے کا علاج یہ ہے کہ علم پڑھایا جائے اور شبہات گھونٹ کر نہ رکھے جائیں ۔ آدمی کو یہ خوب سمجھنا چاہیے کہ جن آدمیوں کے ساتھ ہم معاملہ کرتے ہیں یا جن کو اپنے کام حوالے کرتے ہیں وہ فرشتے تو نہیں ہیں ۔ ان کو اپنا نفس ہم سے زیادہ عزیز ہے ۔ وہ اپنے[1] ساتھ بہ نسبت ہمارے زیادہ صداقت رکھتے ہیں ۔ پس اگر کوئی بات اُن پر قابل شبہے کے پیدا ہو تو ان کی کمینگی نہیں جاننی چاہیے بلکہ ضعیفی ۔ مگر شبہات میں اعتدال پیدا کرنے کا طریقہ اس سے زیادہ بہتر نہیں ہے کہ سچّے شبہوں کو معذور جانے اور جھوٹے شبہوں کو روکے ۔ وہاں تک آدمی سچّے شبہات پیدا کرے جہاں تک اس کو ان سے کچھ فائدہ حاصل ہو ۔ اور جس پر بھی[2] شبہہ کرے اس کو تکلیف نہ پہنچائے ۔ جس آدمی یا گروہ پر شبہہ تم کو ہو اس کے روبرو آزادانہ طور پر اُس[3] کو بیان کر دو ۔ اس سے تم کو علم بھی زیادہ ہوگا اور طرفِ ثانی ایسی ہوشیاری آیندہ کریں گے کہ جن سے شبہات نہ پیدا ہوں ۔ مگر یہ کام کمینوں کے ساتھ نہ کرنا چاہیے ، اس لیے کہ جب اُن کو تمھارے کہنے سے یقین ہوگا کہ تم ان کو مشتبہ جانتے ہو تو اِس کو

۱۔ اصل : اپنی ۔
۲۔ اصل : جس پر شبہہ بھی کرے ۔
۳۔ اصل : ان کو ۔

وہ یہ جانیں گے کہ تم ان کو اجازت دیتے ہو کہ ہمیشہ خیانت کے ساتھ کام کیا کرو۔ اہلِ اٹلی کا قول ہے کہ شبہات سے ایمان چھوٹ جاتا ہے، یعنی شبہات سے ایمان کو چالان عبورِ دریا کا مِل جاتا ہے۔ مگر ایسی حالت میں آدمی کو چاہیے کہ وہ ایمان کو زیادہ روشن کرے اور اس پر سے شبہات کی تاریکی کو اٹھائے۔

۲۔ حزم کے پٹھے بے اعتباری سے مضبوط ہوتے ہیں اور اس کے جوڑوں کی دوا شبہات سے ہوتی ہے۔ جس شخص کا ایمان شبہات سے ہل جائے، وہ مستحق اس کا ہے کہ لوگ اس کو مشتبہ جانیں۔ شبہات، ضعیف ایمان کو ڈھیلا اور قوی ایمان کو مضبوط کر دیتے ہیں۔ بے اعتدالی کے ساتھ شبہات کرنے ایسی دیوانگی ہے کہ دوا سے نہیں اچھی ہوتی۔

۱۲۴۔ دولت و مال

سپاہ کے واسطے خیموں ڈیروں کا مع اپنے اسباب کے ہونا لازم و ضروری ہے اور ایسا ضروری ہے کہ نہ ان کو چھوڑ سکتے ہیں، نہ ان میں تخفیف کر سکتے ہیں۔ مگر وہ ہمیشہ سفر کے ہارج اور مانع ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ان کی نگہداشت میں فتح مندی ہاتھ سے جاتی رہتی ہے، یا اس میں خلل پڑ جاتا ہے۔ پس ایسی ہی نیکی کے واسطے دولت ہے۔ نیکی کے خیمے ڈیرے دولت ہیں۔ زیادہ دولت و مال آدمی اپنی خاص ذات کے کام میں نہیں لا سکتا، سوائے اس کے کہ اس کو تقسیم کر دے۔ باقی صرف دولت مندی ایک خیال ہے۔ جیسا حضرتِ سلیمان[۴] نے فرمایا ہے کہ جب مال کی فراوانی ہوتی ہے تو اس کے کھانے والے بھی بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے مالکوں کو کیا فائدہ ہے، مگر یہ کہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ خود مالک

اپنی ذات سے دولتِ کثیر سے متمتّع نہیں ہو سکتا ۔ وہ فقط دولت کا رکھوالا ہے ۔ اُس سے معاملات کرنے کا مقدور رکھتا ہے ، بخشش کر سکتا ہے ، مشہور و نامور ہو سکتا ہے ، مگر کوئی فائدۂ استوار مالک کو نہیں ملتا ۔ وہ فقط اظہارِ دولت کے لیے چھوٹے چھوٹے کمیاب پتھروں کی بڑی بڑی قیمتیں لگا کر اپنی بھڑک دکھاتا ہے اور نمائش کرتا ہے ۔ گویا یہ دولتِ کثیر کے خرچ کا ایک ذریعہ قرار دیا گیا ہے ۔ دولت و مال کے بڑے فائدے یہ ہیں کہ آدمی اس کے طفیل سے اپنے تئیں تکالیف اور خوفوں سے بچا سکتا ہے ؛ جیسا حضرتِ سلیمانؑ نے فرمایا ہے کہ مالدار آدمی کی دولت اُس کے خیال میں حصنِ حصین ہے ۔ اس قول کی جان فقط خیال[1] ہے ۔ حقیقت میں خیال میں وہ ایسی ہوتی ہے ، واقعے میں نہیں ۔ اس واسطے کہ دولتِ کثیر آدمیوں کو بیچتی زیادہ ہے ، خریدتی کم ہے ۔

کبھی دولت ناجائز طور سے نہ حاصل کرو ، ہمیشہ جائز اور حلال طریقوں سے پیدا کرو ۔ اعتدال کے ساتھ خرچ کرو ۔ خوشی کے ساتھ اسے تقسیم کردو ۔ رضامندی سے چھوڑ دو ۔ زاہد بن کر دولت کی حقارت نہ کرو بلکہ اس کے اندر تمیز کرو ۔ جیسا کہ مسرو نے ایک شخص کی نسبت کہا تھا کہ اُس نے اپنی دولت مندی بڑھانے میں طمع و حرص کو راضی نہیں کیا بلکہ اس کو فیّاضی و سخاوت کا وسیلہ بنایا ۔ حضرتِ سلیمانؑ کی بات بھی دل پر لکھ لو کہ جلد دولت مند ہونے کی آرزو نہ کرو ۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو دولت مند ہونے کے لیے جلدی کرتا ہے وہ بے سزا نہیں چُھوٹے گا ۔ دولت جو نیک کمائی اور محنت مشقت سے حاصل ہوتی ہے وہ تو آگے بڑھنے میں لنگڑاتی ہے اور

۱- یعنی یہ فقط خیالی بات ہے کہ دولت انسان کی محافظ ہے ۔

بہت سہج سہج قدم اٹھاتی ہے۔ اور جو دولت مندوں کے مرنے کے سبب سے ورثے ترکے میں یا وصیّت کے موافق اور ایسے ہی وسائل سے ہاتھ لگتی ہے تو وہ دفعتہً مالامال کر کے نہال کر دیتی ہے[1]۔ جو دولت مکر و فریب، ظلم و ستم سے ہاتھ آتی ہے وہ خوب آگے دوڑتی ہے اور جلد بڑھتی ہے۔

دولت مند ہونے کے بہت طریقے ہیں مگر اکثر ان میں سے برے ہیں۔ کفایت شعاری اور جُزرسی ایک عمدہ طریقہ دولت جوڑنے کا ہے مگر وہ بھی خالی از گناہ نہیں؛ اس لیے کہ اس میں فیّاضی اور خیرات سے آدمی باز رہتا ہے۔ ایک زراعت سے دولت حاصل کرنے کا نہایت نیک طریقہ ہے۔ زمین ہماری ماں ہے، اس کی ترقی میں سعی کرنا ہمارا قدرتی فرض ہے؛ مگر اس میں دولت مِن مِن کر کے چلتی ہے۔ ہاں اس میں بہت سی دولت پہلے خرچ کرو تو پھر وہ بھی بہت سی دولت دیتی ہے۔ معمولی تجارت سے دولت جب حاصل ہو سکتی ہے کہ یہ دو باتیں ہوں: اول توجہ سے محنت، دوم خوش معاملگی میں شہرت۔ سَودوں کے خریدنے میں اگرچہ فائدہ یقینی نہیں ہوتا، اس لیے کہ ان کا بکنا اوروں کی ضرورت پر موقوف ہوتا ہے، مگر[2] وہ سلیقے سے خریدے اور بیچے جائیں تو فائدہ ہوتا ہے۔ شرکت سے بھی دولت پیدا ہوتی ہے، بشرطیکہ ساجھی نیک ہوں۔ سُود لینے سے بھی دولت کا بڑھنا یقینی ہے مگر وہ معیوب اس سبب سے ہے کہ اس میں دوسرے کی پیشانی کے پسینے (محنت) سے روپیہ کماتے ہیں۔ سوائے اس کے کبھی کبھی سُودخوار اور بیچ کے دلال کھوٹے آدمیوں کو کھرا جان کر پھنس جاتے ہیں۔ اشیا کے اختراع اور ایجاد سے بھی

۱- اصل: کر دیتی ہیں۔ ۲- اصل: اگر۔

ابتدا میں یقینی خوب دولت کمائی جاتی ہے - جو شخص کوئی چیز ایجاد کرتا ہے ، اس کے فروخت کرنے سے وہ بہت نفع کما لیتا ہے -

یہ بات روزمرّہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض آدمی معاملات ایسے کرتے ہیں کہ وہ گویا جؤا کھیلتے ہیں - اگر داؤں نکل آیا تو واہ واہ ہے ، نہیں پھر دِوالا ہے - ایسے آدمی اکثر تباہ اور مفلس ہی ہوا کرتے ہیں - جن کا طریقہ سلامت روی کا معاملات میں ہوتا ہے ، وہ[1] اُنھی معاملات کو کرتے ہیں کہ جن میں منفعت یقینی ہو ، اور اگر نقصان ہو تو قابلِ برداشت ، گو وہ دولت مند بڑی مشکل سے ہوتے ہیں - ٹھیکہ داری میں بھی فائدہ ہے - آڑتیا ہونے میں بھی بڑے فائدے ہیں ، بشرطیکہ یہ عقل ہو کہ پہلے سے سمجھ جائیں کہ کس چیز کی مانگ ہونے والی ہے ؛ اس کو پہلے سے بہم پہنچائیں - ملازمت سے بھی دولت حاصل کرنی اچھی ہے بشرطیکہ نوکری میں کوئی عیب کی بات نہ ہو ؛ جیسے مسخرگی ، خوشامد ، بھڑواپن اور ایسی ہی باتیں - بعض تجربہ کاروں کا قول ہے کہ تھوڑی دولت جوڑنی بڑی مشکل ہے اور تھوڑی دولت سے بڑی دولت جمع کرنی کچھ مشکل نہیں -

۳- دولت کے پر ہوتے ہیں ؛ کبھی وہ خود اُڑ جاتی ہے اور پھر نہیں آتی - بعض دفعہ وہ اس طرح اُڑتی ہے کہ اَور دولت کو ساتھ لے کر پھر چلی آتی ہے -

۴- آدمی جو مرنے کے بعد دولت چھوڑتا ہے وہ یا اپنی اولاد کے لیے یا پبلک کے لیے ، یعنی جمہور کے فائدے کے واسطے - دونوں کے لیے دولت کا اعتدال کے ساتھ چھوڑنا مفید ہوتا ہے - جب وارثوں کو

۱- اصل : اور وہ -

بڑی جائداد ہاتھ لگتی ہے اور کم عمری کے سبب سے نا تجربہ کاری ہوتی ہے تو بہت سے آدمی شکاری جانوروں کی طرح اس کے گرد جمع ہو کر دولت کو اڑا لے جاتے ہیں ۔ اولاد اس دولت کو جب ہی بچا سکتی ہے کہ وہ عقل اور تجربے میں پوری ہو ، یہ صورت اکثر کمتر ہوتی ہے ۔ اور ایسے ہی جب پبلک کے لیے بڑے بڑے[1] عطیات چھوڑ جاتے ہیں تو قربانیوں کے گوشت کا سا حال ہوتا ہے جو بے نمک ہو۔ خیرات کا اندازہ اس کی مقدار سے نہ کرو بلکہ اس کے انداز سے ۔ جب تک مرو نہیں ، خیرات نہ بند کرو ۔ اگر خیرات کو ٹھیک طور سے سمجھو تو اس میں اپنی دولت نہیں برباد ہوتی بلکہ دوسرے کی[2] (یعنی وارثوں کی) ۔

۵۔ دولت کی وہی آدمی حقارت[3] کرتے ہیں جن کو اس کی تحصیل سے مایوسی ہوتی ہے ۔ یہ دولت ہی کی حسد کا سبب ہے کہ نیکی دیوتا بنتی ہے ۔ جب اِس میں شبہ حکما تک کو ہو کہ انسان کی زندگی کا مقصدِ اقصیٰ[4] نیکی ہے یا عیش ، تو تم دونوں کا خزانہ جمع کرو ۔ یہ دولت ہی کا طفیل ہے کہ اوروں کے ساتھ بھلائی آدمی کر سکتا ہے ۔ دنیا کی اور نعمتوں میں سے ہر ایک کو انسان کی زندگی کے ایک جزو پر حکومت حاصل[5] ہے مگر دولت کو کل پر ۔ بہت دولت کا جوڑنا صرف اس کا خزانچی بننا ہے ، اور کوئی فائدہ نہیں ۔ بہت سی دولت خرچ کرنے کی ترکیب انسان نے یہ نکالی ہے کہ وہ

۱۔ اصل : بڑی بڑی ۔
۲۔ اصل : "بلکہ دوسرے کے (یعنی وارثوں کی ہے) ۔"
۳۔ حقارت کرنا بمعنی حقیر سمجھنا ۔
۴۔ مقصدِ اقصیٰ = منتہائے مقصود ۔
۵۔ اصل : حکومتِ خاص ہے ۔

جواہر، جو چھوٹے چھوٹے پتّھر نایاب ہوتے ہیں، اُن کو بڑی بڑی قیمت دے کر لیتا ہے اور ان سے اپنی بھڑک دکھاتا ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اپنی دولت سے ہر ایک چیز خرید سکتے ہیں، وہ خود دولت کے ہاتھ بکتے ہیں۔ دولت کو سوائے اس کے نہیں کہہ سکتے کہ وہ نیکی کے لیے ضروری اسباب ہے مگر اس کے ساتھ اس کا بوجھ بھی ہے[1]۔

۶۔ دولت ایک اچھی ملازمہ ہے مگر ملکہ نہیں ہے۔ غریب قانع بڑا دولت مند ہوتا ہے۔ کچھ پاس نہ ہو اور دولت کی افراط ہے۔

۷۔ جلد دولت مند ہونا اندیشے سے خالی نہیں۔ اس کا حال ایسا ہے کہ کوئی شخص جلد تیراک بننا چاہے؛ دو تونبوں[2] پر بھروسا کر کے جلدی جلدی تیرے اور اُن لوگوں پر ہنسے جو آس گہرے پانی میں جاتے ہوئے ڈرتے ہوں جس کا انھوں نے امتحان نہ کیا ہو۔ غرض وہ اپنے تونبوں سے اپنی قوّتِ بازو سے خوب تیرتا ہو، یہاں تک کہ بیچ دھار میں اس کے تونبے پھٹ جائیں اور وہ ڈوب جائے، یا بچے بھی تو اُن بزرگوں کی عنایت و مہربانی سے جن پر وہ ہنستا تھا کہ کیسے ڈرپوک ہیں۔

۸۔ جو دولت مندی کہ صحت کا نقصان کرے اور اخلاق کو برباد کرے، وہ دولت مندی نہیں ہے بلکہ افلاس ہے، گو وہ ظاہر میں اپنے ُطمطراق اور دھوم دھام دکھائے۔

۹۔ جو شخص دولت مند آہستہ آہستہ ہونا چاہتا ہے، وہ یقین ہے آخر کو دولت مند ہو جائے گا۔ جو شخص اپنے سرمایے کو اپنی

۱۔ اصل: وہ نیکی کے لیے ضروری اسباب ہیں مگر اس کی ساتھ ان کا بوجھ بھی ہے۔

۲۔ تونبا: ایک قسم کی چمڑے کی مشک جس میں ہوا بھر کے تیرتے ہیں۔

مُٹھی میں رکھ کر کام میں لاتا ہے اُس کو اول تو نقصان نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو اُتنا جس کا وہ متحمّل ہو سکتا ہے۔ جہاں بہت فائدہ ہوتا ہے وہاں نقصان کا بھی احتمال ہوتا ہے۔ جس لاٹری میں بڑے بڑے پرائز ہوتے ہیں اُسی میں خالی چٹھیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔

۱۰۔ کفایت شعاری کا یہ مقولہ ہے کہ اپنے ساتھ بھلائی کرنا اَوروں کے ساتھ بھلائی کرنا ہے۔ حسنِ ُخلق کا یہ مقولہ ہے کہ اَوروں کے ساتھ بھلائی کرنا اپنے ساتھ بھلائی کرنا ہے۔

۱۱۔ بعض آدمی رات دن دولت کے بڑھانے کی اُدھیڑ ُبن میں لگے رہتے ہیں اور اس کے لیے محنت کرتے ہیں۔ ان کی دولت بڑھ بھی جاتی ہے، مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ دولت کے اختیار میں خوش کرنا نہیں ہے۔ ایک بڑے دانش مند کا قول ہے کہ دولت کے دونوں طرف اِدھر اُدھر ایک سی مضرّتیں اور آفتیں موجود ہیں۔

۱۲۔ دولت کی کوئی حد مقرر نہیں کہ جس پر پہنچ کر آدمی کہے کہ بس دولت مند ہو گیا، اور افزائش کی گنجائش نہیں۔ جتنی دولت آدمی کو حاصل ہوتی جاتی ہے اُتنی ہی احتیاج بڑھتی جاتی ہے۔ اس احتیاج کے بڑھنے سے وہ محتاج ہوتا جاتا ہے۔ اس لیے وہی شخص بڑا دولت مند ہے کہ وہ کسی کا قرض دار نہ ہو اور جو کچھ پاس ہو اُس سے وہ اپنی اوقات بسر کر کے خوش رہتا ہو۔ سونے سے دانائی بہتر ہے کیونکہ وہ تھوڑی سی بھی ہماری خوشی کے لیے کافی ہے۔ جو شخص خوش ہے وہی بڑا دولت مند ہے۔ سونے سے نہ عقل خریدی جا سکتی ہے، نہ آدمی کی خواہش ہائے نفسانی فرو ہو سکتی ہیں۔

۱۳۔ کوڑی کوڑی جوڑنے میں عقل نہ خرچ کرو اور دولت کے واسطے اپنے اوپر جبر نہ کرو۔ وہ ایسے بازو رکھتی ہے کہ ُہما کی

طرح آسمان میں اڑ جائے گی اور پھر نہیں دکھائی دے گی - دولت کا حال ان کیڑوں کا سا ہے کہ وہ چھپے ہوئے، موسم کے انتظار میں، پڑے رہتے ہیں - جہاں موسم آیا ان کے پر نکلے اور وہ اڑ کے چلے گئے - دولت اکثر ان کو ستاتی ہے جن کے پاس ہوتی ہے - آنے میں وہ خوشی نہیں جو اس کے جانے میں رنج ہے - بغیر گناہ کے بہت سی دولت نہ جمع ہو نہ محفوظ رہے - زیادہ دولت مند ہونا بڑی غلامی ہے - وہی شخص کافی دولت رکھتا ہے جو کافی خیرات کرتا ہے -

۱۴- جب کسی پاس دولت دیکھتے ہیں تو اس سے حسد کرتے ہیں - اور جب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ فضول کاموں میں خرچ کرتا ہے تو رحم کرتے ہیں - دولت مندوں کے نیک اور خوش بنانے کے لیے جو دولت خدمت نہیں کرتی وہ اکثر آزار پہنچاتی ہے -

۱۵- اگر آدمی دولت مند ہو تو وہ اپنی دولت کی بڑائی یوں دکھائے کہ غریبوں کے ساتھ مسکینی سے باتیں کرے، چھوٹی آمدنی کے آدمیوں کے ساتھ ہو، آفت زدوں کو سہارا دے، غفلت زدوں کے ساتھ مربیانہ سلوک کرے - اپنے تئیں یہ خیال کرے کہ میں ایک ظرف ہوں جس میں روپے رکھے گئے ہیں - سقراط کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی دولت پر فخر کرے تو اس کی تعریف نہ کرو، جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ وہ دولت کو کس طرح کام میں لاتا ہے - بعض نوجوان، جب دولت ان کے پاس نہیں ہوتی تو، دولت کے خرچ کرنے میں بڑے ارادے کرتے ہیں، مگر جب بڑے ہونے پر دولت پاس ہو جاتی ہے تو کچھ نہیں خرچ کرتے -

۱۶- غریبوں کے پھٹے کپڑے ذرا ذرا سی برائیوں کو نہیں چھپنے دیتے - دولت مندوں کے سمور و قاقم کے کپڑے بڑے بڑے گناہوں کو چھپا دیتے ہیں اور سونے کے ڈلے ان کی برائیوں پر ملمع کرتے ہیں -

۱۲۵- تقریر (گفتگو)

[ہم نے انگریزی لفظ ''ڈسکورس'' کا ترجمہ تقریر کیا ہے - اِس انگریزی لفظ کے معنی زبان، بیان، گفتگو، بات چیت، مباحثے، بحث و تکرار، وعظ و استدلال و رسالہ کے ہیں - ہم زیادہ تر تقریر کے معنی اُس گفتگو کے لیں گے جو بہ استدلال ہو]

بعض آدمی اپنی تقریر میں استدلال کی قدرت اور لیاقت و استعدادِ علمی کو دکھا کر فقط یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ذہانت و ذکاوت کی تعریف سامعین کریں اور ان کی نسبت نیک رائے لگائیں - حق کے بیان کرنے پر تو ان کی ایسی نظر نہیں ہوتی جیسی کہ اپنی تعریف و ستائش پر - بعض آدمی اپنی تقریر میں سخنانِ کامل بیان کرتے ہیں اور ان کو اپنی ذات کا کچھ خیال نہیں ہوتا کہ سامعین ان کی نسبت کیا رائے لگائیں گے اور کیا فرمائیں گے - آدمی کو یہ تو خیال نہیں ہوتا کہ سامعین ان کی تقریر کو پسند کر کے تعریف کریں مگر اِس کا بڑا خیال ہوتا ہے کہ وہ ناپسند کر کے ہجو نہ کریں - اُرسطو کا قول ہے کہ ایک تقریر کرنے والے اپنی تقریر سے اپنا دل بہلانا چاہتے ہیں اور دوسرے سامعین کا - بعض تقریر کرنے والے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے شرماتے ہیں اور چہرے پر اُن کے رعب و خوف چھایا ہوا ہوتا ہے یہ حالت اکثر اُن نوجوانوں پر طاری ہوتی ہے کہ جن کو تردّد و فکر ہوتا ہے کہ سامعین معلوم نہیں ہماری تقریر سن کر کیا رائے لگائیں اور کیا کہیں - ان کو اپنی ذات کا اور سامعین کی رائے کا، جو ان کی نسبت ہو، خیال کرنا نہیں چاہیے - وہ خوب جان لیں کہ بہت سے سننے والے تو ایسے ہیں کہ وہ اپنے دل و دماغ کو تمھاری

تقریر کے سوچنے اور سمجھنے میں تکلیف بھی نہیں دیں گے - ہاں بعض ضرور سخت عیب بینی اور نکتہ چینی کریں گے - اس کی پروا تم کو نہیں کرنی چاہیے - تم کو حق بات کہنی چاہیے ، خواہ سامعین کچھ ہی خیال کریں اور کہیں - جو شخص اپنے بیان میں سر تا پا مستغرق ہوگا ، اس کو نہ اپنا نہ اپنے سامعین کا کچھ خیال ہوگا -

بعض آدمی خلوت میں جب ایک دو آدمی کے سامنے کسی مضمون کو بیان کرتے ہیں تو تقریر نہایت فصاحت اور بلاغت سے کرتے ہیں ، لیکن اسی مضمون کو انھی الفاظ میں وہ کسی مجمع میں بیان کرنا چاہیں تو ان کے گلے میں پھندا پڑتا ہے اور زبان لکنت کرتی ہے - اس کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ وہ سامعین کی رائے کو اعلیٰ درجے کا اپنی رائے سے جانتے ہیں اس لیے وہ ان کے رعب میں آن کر تقریر میں لکنت کرتے ہیں ، بلکہ وہ اپنے ایک جانی دوست کی لیاقت اور قابلیت کو زیادہ جانتے ہیں اور اس کی رائے کی وقعت رکھتے ہیں - اور مجمع کے لائق سے لائق دو تین آدمیوں کے سامنے وہ تقریر کرنے میں پریشان نہیں ہوتے مگر مجمع کے روبرو خوف کے مارے ان کی زبان سے مشکل سے الفاظ نکلتے ہیں - بعض اوقات تقریر کی تاثیر جو ایک مجمعِ عام پر ہوتی ہے وہ دو چار آدمیوں پر نہیں ہوتی - بھیڑوں کا سا حال ہوتا ہے کہ دو چار کے چلانے سے ریوڑ کا چلانا آسان ہوتا ہے -

بعض تقریر کرنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ دو چار ہی مضمون ان کو خوب بیان کرنے آتے ہیں اور انھی کو ہیرپھیر کر بیان کیا کرتے ہیں - گائے کی بچھیا اور بچھیا کی گائے بناتے ہیں - سوائے ان کے کسی اور مضمون پر گفتگو نہیں کر سکتے - پس جب لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ تو ایک ہی راگ گایا کرتے ہیں تو وہ نظر سے گر جاتے ہیں اور لوگ ان کی ہنسی اڑانے لگتے ہیں - ہنسی کا قاعدہ ہے

کہ وہ تنہائی میں نہیں آتی ۔ اگر آتی بھی ہے تو اُس وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ میں مجمع میں بیٹھا ہوا ہوں ۔ اس لیے مجمع میں تقریر کا کرنا ان کا زیادہ خاکہ اُڑاتا ہے ۔

تقریر میں یوں بڑا لطف آتا ہے کہ بہ مناسبتِ مقام و موقع ایک بات شروع اور ختم ہو اور اس پر اَوروں کو اپنے اظہار کے لیے وقت دیا جائے اور بعد اس کے کچھ اَور ذکر چھیڑا جائے ۔ جب کسی موقع پر کہ تھوڑی دیر کے لیے ہو ، تقریر میں کوئی بات کہی جائے تو اس کے دلائل اور اس کی نسبت رائے ایسی مستحکم اور چست طور پر بیان کی جائے کہ وہ مدتوں کے لیے ایک دل‌چسپ مضمون ہو جائے ۔ سوال و جواب بغیر تقریر پھیکی ہوتی ہے ۔ تقریر اگر کوئی کہانی کے طور پر بھی سنی سنائی ہو تو اس کی بھی وجوہ بیان کر دی جائے ۔ تقریر میں کچھ ظرافت بھی چاہیے ، مگر ایسی تقریروں میں ظرافت سے پرہیز چاہیے جیسے مذہب کے باب میں یا معاملاتِ سلطنت یا بزرگانِ عالی منش کے ذکر میں ، یا واجب الرحم آدمیوں کے بیان میں ، یا کسی شخص کے بڑے کام میں جس میں وہ سر تا پا مستغرق ہو ۔ مگر بعض تیز ذہن ایسے ہوتے ہیں کہ جب تک وہ تقریر میں لوگوں کے دلوں میں چٹکیاں نہ لیں اور جاں خراش باتیں نہ کریں ، وہ یہ جانتے ہیں کہ ہماری ذکاوت یا مر گئی یا سو گئی ہے ۔ ان کو چاہیے کہ وہ اس عادت سے باز رہیں ۔ زبان کو لگام دیں اور لگام کو خوب مضبوط دونوں ہاتھوں سے پکڑیں اور مہمیز مارنے سے پرہیز کریں ۔ تقریر ایسی طول طویل نہ ہو کہ سامعین کی طبیعت سنتے سنتے تھک جائے ۔ تقریر نمکین ہو مگر نہ تلخ ۔ جو شخص تقریر میں لوگوں پر آوازے کستا ہے ، طعن و تشنیع[1] سے باز نہیں رہتا

۱۔ اصل : طعن و تشنے ۔

اور یوں اپنی ذکاوت سے اَوروں کو ڈراتا ہے، اُس کو خود بھی ڈرنا چاہیے کہ اَور لوگ موقع پا کر اپنا عوض اس سے لیں گے۔

جو شخص اکثر سوال کرنے کی عادت رکھتا ہے، اس کا علم بہت جلد بڑھ جاتا ہے۔ اگر وہ اہلِ ہنر سے ان کے ہنر کی نسبت سوال کرے تو وہ اس کے جواب دینے سے خوش ہوں گے اور اس کا علم بڑھ جائے گا۔ مگر سوال کرنے میں ہمیشہ اِس بات کا خیال رہے کہ وہ ایسے پیچ دار اور دشوار نہ ہو جائیں کہ ان کے جواب دینے میں تکلیف اور دقّت ہو۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ خود ایسا نہ بولے کہ دوسرے کے بولنے کی نوبت نہ آنے پائے۔ بلکہ کوئی ایسا بکواسی اگر ہو کہ کسی دوسرے کو بولنے نہ دے تو اس کو کسی تدبیر و حکمت سے خاموش کر دے تاکہ اَور آدمی بھی بولیں۔ تقریر میں آدمی نہ خود اپنی تعریف کرے اور خاص متعیّن شخصوں کی تعریف سے بھی حتی الامکان پرہیز کرے۔ اگر اپنے ذکر کی کوئی خاص ضرورت آن پڑے تو اس کو ایک فصاحت اور نفاست سے ادا کرے۔ ایک طریقہ اپنی تعریف کرنے کا یہ بھی ہے کہ آدمی اُس صفت کی دوسرے شخص میں تعریف کرے جو اپنے میں موجود ہے۔

تقریر میں ایسی چھپی ہوئی باتیں نہ کہے جو کنایۃً یا صراحۃً دوسروں پر لگتی لگاتی ہوں۔ تقریر کا تو لطف یہ ہے کہ وہ سب کو بھلی معلوم ہوتی ہو۔ میدان کا سا حال ہو کہ وہ کسی خاص گھر کی طرف کا رستہ نہیں ہوتا۔ بعض آدمی تقریر خوب کرتے ہیں مگر کوئی اعتراض آن پر جڑ دے تو بغلیں جھانکتے ہیں۔ بعض کی تقریر تو ایسی خوب نہیں ہوتی لیکن اس پر کوئی اعتراض کرے تو جواب خوب دیتے ہیں۔ ان کا حال جانوروں کا سا ہے کہ بعض خوب دوڑتے ہیں مگر مڑتے خوب نہیں، بعض مڑتے خوب ہیں مگر دوڑتے

خوب نہیں -

۱- ہم کو اپنی تقریر میں کسی بات کے لیے نہ تمہیدیں بہت سی کرنی چاہئیں ، نہ ان کو بالکل چھوڑنا چاہیے - اول صورت میں سننے والے تھک جائیں گے اور دوسری صورت میں باتیں لنڈوری معلوم ہوں گی اور ہم کند ذہن -

۲- مقرّروں کی مثال چاند سورج کی سی ہے - رات کو جب چاند چمکتا ہے تو ہم چاندنی کو کہتے ہیں کہ کیا خوب چاندنی ہے - دن کو یہ کہتے ہیں کہ گل و بستان پر کیا بہار ہے اور چیزوں پر کیا رونق ہے - آفتاب کا ذکر نہیں کریں گے جس کی روشنی کے سبب یہ رونق پیدا ہوئی ہے - پس جو اعلیٰ درجے کے مقرّر ہیں ، ان کا حال آفتاب کا سا ہے کہ ان کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ اُن باتوں کا لوگوں کے دلوں میں خیال پیدا ہوتا ہے جو انھوں نے بیان کیں - ان کے بعد دوسرے درجے کے مقرّروں کا حال چاند کا سا ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ان کا اور ان کی فصاحت کا خیال ہوتا ہے -

۳- کُل تقریر میں کافی باتوں سے زیادہ باتیں بیان ہوتی ہیں اور کافی تقریر میں کل باتیں بیان ہوتی ہیں - طول طویل تقریروں کا حال ایسا ہے جیسا کہ بہت سے تیروں کا جو نشانے پر چھوڑے جائیں اور اس پر لگیں نہیں ؛ جس کے سبب سے توجہ ایسی بٹ جائے کہ محنت اکارت جائے اور شکار ہاتھ نہ آئے -

۱۲۶- پیشین گوئیاں

پیشین گوئیاں کئی طرح کی ہوتی ہیں ؛ ایک وہ ہیں جن کو مؤرخ اپنی تاریخوں میں لکھتے ہیں اور وہ معاملاتِ ملکی سے متعلق

ہوتی ہیں - مؤرخ زمانۂ ماضی کے واقعات کو دیکھ کر پیشین گوئی کرتا ہے - اگر وہ پوری ہوتی ہیں تو باور کی جاتی ہیں اور مؤرخ کی ذہانت کی داد دی جاتی ہے ، اور اگر وہ پوری نہیں ہوتیں تو فراموش کر دی جاتی ہیں - دوسری وہ ہیں جو یوں ہی اٹکل پچّو بڑ کی طرح ہانک دی جاتی ہیں ؛ جیسے مجذوب بڑیں کہا کرتے ہیں - سوم جعلی بنائی ہوئی - یہ اکثر بزرگوں کے حالات میں لکھی جاتی ہیں - پیراں نمی پرند مریداں می پرانند[1] - مرید اپنے مرشد کی پیشین گوئیوں کے بھی قائل ہوتے ہیں ؛ اس لیے بہت سی بشارتیں ان کی گھڑ کر ان کے حالات میں تحریر کر دیتے ہیں ، جس سے معلوم ہو کہ ان کو عالمِ غیب کی باتیں پہلے سے معلوم ہو جاتی تھیں -

۱۲۷- جاه جُوئی

(یعنی اپنی برتری کی خواہش)

۱- جسمِ انسان میں خلطِ صفرا ہوتا ہے کہ اس کی روانی انسان کو چست ، چالاک ، مستعد ، سرگرم ، دل چلا بنائے رکھتی ہے - مگر اس کا بند ہونا اس کو تیز و گرم کر کے کڑوا زہر بناتا ہے اور اس سے آدمی کو پُر اضطرار اور بے قرار کرتا ہے - یہی حال جاه جُو کا ہوتا ہے کہ جب تک اس کی ترقی اور بہتری ہوتی جاتی ہے تو وہ اپنے شغل اور کام میں تندہی کرتے رہتے ہیں اور کسی کو ایذا نہیں دیتے ، لیکن جہاں ان کی کام روائی کا رستہ بند ہوا اور ان کی آرزوئیں پوری نہ ہوئیں تو پھر ان کے دل میں کدورت کا انبار لگ جاتا ہے - آدمیوں کو کاٹنے کو دوڑتے ہیں ، کاموں کے بگڑنے

۱- یعنی پیر خود نہیں اُڑتے بلکہ مرید انہیں اُڑاتے ہیں -

سے ناخوش ہوتے ہیں ۔

۲۔ بعض سلطنت کی ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں بغیر ایسے اولوالعزم جاہ طلبوں کے کام اچھی طرح نہیں چل سکتا ۔ اول میدانِ کارزار کے لیے عمدہ افسر ایسے انتخاب ہونے ضرور ہیں جو بڑے عالی حوصلہ اور اولوالعزم اور عالی ہمّت ہوں ۔ ضرور ایسے کام وہ کریں گے جو ان کی جاہ جُوئی کے عیب پر پردہ ڈال دیں گے ۔ ایسا سپاہی لڑائی میں بھیجنا جو عالی حوصلہ نہ ہو ، ایسا ہے کہ اس کو بدون ہتھیار کے بھیجیں ۔ دوم ایسی خطرناک خدمات کے لیے جن میں کینہ و پیکار کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ۔ ایسے کاموں میں جاہ طلبوں کی آنکھوں پر جاہ طلبی کا پردہ ایسا پڑا ہوتا ہے کہ کوئی خوف و خطر ان کو نظر نہیں آتا ۔ وہ اُس کبوتر کی طرح آسمان پر اُڑ جاتے ہیں جس کی آنکھوں پر ٹوپی ہو کہ اپنے گرد خوف کو نہ دیکھے ۔ سوم رعایا میں سے جو لوگ اعلیٰ درجے پر پہنچ گئے ہوں ، ان کے غرور ڈھانے اور نیچا دکھانے کے واسطے ان عالی ہمتوں سے خدمت لینی مناسب ہوتی ہے ۔

۳۔ جو جاہ طلب یہ چاہتا ہے کہ مجھے لائق اور بزرگ لوگ بڑا مانیں ، وہ ایک مہمِ عظیم اپنے آگے رکھتا ہے اور اس سے عام لوگوں کو سوائے فائدے کے نقصان کچھ نہیں ہوتا ۔ لیکن جو جاہ طلب یہ آرزو رکھتا ہے کہ ادنیٰ آدمیوں میں مَیں ہی بڑا سمجھا جاؤں ، اور اس کے لیے وہ سازشیں کرتا ہو ، تو اس سے لوگوں کو آزار پہنچتا ہے ۔

۴۔ جاہ حاصل کرنے کے واسطے ان تین باتوں میں کوشش کرنی پڑتی ہے : اول بھلائی کرنے کے مواقع کی جستجو ۔ دوم سلاطین اور اراکینِ سلطنت تک رسائی ۔ سوم اپنے لیے دولت پیدا کرنی ۔ ان

آرزوؤں کے حاصل کرنے میں جس کی نیّت بخیر ہے ، وہ نیک ایماندار آدمی ہے - جو جاہ طلبی انصاف و دانائی کے ساتھ ہوتی ہے اس میں ظاہر و باطن میں موافقت ہوتی ہے - وہ ایک عزّت کی آرزو مردانہ ہوتی ہے - بادشاہوں اور رئیسوں کو یہ چاہیے کہ وہ وزیر اور اپنے اہل کار ایسے انتخاب کریں کہ جن کو اپنے کام کا بہ نسبت اپنی ترقی اور منفعت و جاہ کے زیادہ خیال ہو اور اپنے کام کو ایمان سے کرتے ہوں ، نہ نمائش و فخر سے -

۵- جاہ طلبی دل کی بے حیائی کا نام ہے - یہ جاہ و حرص دو دیو ہیں جو آدمی کی کھلڑی کو اپنے آروں سے گودتے رہتے ہیں - جاہ طلبی مہد سے لحد تک سفر کو نہایت کڑا کر دیتی ہے اور جا بجا وہ سر کو جھکواتی ہے -

٦- جو لوگ جاہ طلب ہیں وہ سلطنت کرنی چاہتے ہیں ، خواہ وہ دوزخ ہی کی کیوں نہ ہو - وہ بہشت کی خدمت گاری سے دوزخ کی فرماں روائی کو اچھا جانتے ہیں -

۷- جاہ طلب جس کام کو چاہتے ہیں کہ اس طرح وہ اچھا ہو ، اگر وہ حسبِ دل خواہ نہ ہو تو پھر اس کو وہ ہاتھ بھی نہیں لگاتے - وہ یہ چاہتے ہیں کہ یا تو کام بالکل نہ کریں اور اگر کریں تو سب سے اچھا و بہتر - مگر آدمی کو چاہیے کہ جتنا وہ کام اچھا کر سکے ، اُسی کے کرنے میں اپنی ہمّت صرف کرے - کل قرض کا بار سر سے نہ اتار سکے تو اس کا کوئی حصّہ ہی اتار دے جس سے کچھ بوجھ تو ہلکا ہو - آدمی کو چاہیے کہ وہ اونچا نہ بیٹھے کہ بے عزّتی سے نیچے اُتارا جائے ، بلکہ نیچے بیٹھے کہ عزّت کے ساتھ اوپر بلند کیا جائے - وہاں نہ چڑھو جہاں گرنے کا ڈر ہو - عجز و انکسار سے اپنی دولت و عزت بڑھاؤ - غرور و نخوت سے بلندی پر چڑھ کر اپنے تئیں نیچے نہ گراؤ -

۸- ایک فقیر جو جاڑے میں اکڑ رہا ہو ، پہاڑ کے اندر مینہ کی بوچھاڑ سے تربتر ہو ، کہیں اس کو سایہ بیٹھنے کو نہ ملتا ہو ، وہ کہیں پیٹ کے بل زمین سے لگا ہوا پڑا ہو اور اسی کو اپنا گھر سمجھتا ہو ، اسے[1] کوئی جاہ طلب کے سینے کو دکھا کر کہے کہ تُو اپنی حالت کو اِس سے بدل لے تو وہ ہرگز نہیں بدلے گا - کہے گا کہ اس کے سینے میں تو بڑی خوف ناک آفات بھری ہوئی ہیں ؛ کہیں اس میں انتقام نے زخم لگا رکھے ہیں ، کہیں کینہ و حسد نے چُھریاں ماری ہیں ، کہیں غصّہ و غضب نے پاؤں پھیلا رکھے ہیں - غرض جو مصیبتیں اس کے حال میں ہیں وہ میرے حال میں نہیں اس لیے میں اپنی حالت اس سے نہیں بدلتا -

۱۰- جیسے کہ مرضِ استسقا میں جتنا پانی پیو ، آتنی ہی زیادہ پیاس لگتی ہے ، اس میں بڑا پرہیز یہی ہے کہ پیاس کے موافق پانی نہ پیا جائے ، ایسے ہی روح کے واسطے یہ جاہ طلبی ہے کہ جتنی عزّت بڑھتی جاتی ہے ، آتنی اس کی طلب زیادہ ہوتی جاتی ہے - پس اس کا علاج یہی ہے کہ زیادہ جاہ طلبی سے پرہیز کیا جائے -

۱۱- جس جاہ طلبی میں چین آرام نہ ہو اور ساری برائیاں ہوں ، وہ ملعون ہے ، اور جس میں اوپر اڑنے کا ہمیشہ خیال رہے ، وہ پا در ہوا ہے - جس میں عوام کی بھلائی کا نقصان ہو ، وہ سیاہ رُوئی ہے - جس میں شہرت و ناموری کا خیال ہو ، وہ سینہ سوز ہے - جس میں کمینوں کے احسان اٹھانے پڑیں ، وہ رزالت ہے - جس میں شرارت و فساد و عناد ہوں ، وہ شیطنت ہے - جس میں سلطنت ، دولت ، شہرت کی تشنگی نہ بُجھے ، وہ مرضِ استسقا ہے - جس میں آسمان پر

۱- اصل : اُس سے -

بلند پروازی کا قصد ہو، وہ ہُما بننا ہے۔ جس میں نیکی کا گلا گُھٹے، وہ گندگی ہے۔ جس میں شہوت پرستی و کینہ توزی و غرور ہو، وہ فرعونی ہے۔ جس میں عشق کی سی بے صبری ہو، وہ مجنونی ہے۔ جس میں شیخ چلّی کے سے خیالات ہوں اور پُھنکنیوں[1] کے پھونکنے سے دریا میں تلاطم پیدا کرنے کا ارادہ ہو، وہ دیوانگی ہے۔ جس میں ناہموار راہوں پر چل کر نیچے زمین پر پہنچنا ہو، وہ سینہ زوری ہے۔ جس میں ایسی آتش و حرارتِ روحانی پیدا ہو کہ جو ایک دفعہ بھڑکے پھر وہ بجھے نہیں، وہ آتش کدہ ہے۔ جس میں خالی نمائش اور بے معنی آوازیں ہوں، وہ اس کی عزّت ہے۔ جس میں قید خانے اور تخت ایک ہی گھنٹے میں معمور ہوں، وہ خود مختاری ہے۔ جس میں فراموشی اور نابینائی ہو، وہ بدحواسی ہے۔ جس میں آدمی کی اوقات گزاری کا سارا سرمایہ برباد ہو جائے، وہ اسراف ہے۔ جس میں انتقام اور کینہ ہو، وہ بیہودگی ہے۔ جس میں فریب ہو، وہ پاجی پن ہے۔

۱۲- جو بڑے درخت ہوتے ہیں وہی ہوا کے بس میں ہوتے ہیں۔ ایسے ہی جاہ طلب، صدماتِ دولت کے قابو میں ہوتے ہیں۔

۱۳- جاہ طلبی کو اگر دور سے دیکھو تو وہ ایسی خوش نما معلوم ہوتی ہے جیسے کہ پہاڑ اور اس کی چوٹیاں جن کے منظر اور فضا روح افزا معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ ان کی بنیاد ریت پر رکھی گئی ہے جس کو پانی کی طغیانی ہلا دے گی اور ہوا کے طوفان ڈھا دیں گے۔

۱۴- دنیا میں بہت تھوڑے آدمی ایسے ہوتے ہوں گے کہ جن کی طبیعتیں جاہ طلب نہ ہوتی ہوں اور وہ ملک یا قوم میں اپنا معزّز ہونا

۱- اصل: پھنکنوں۔

نہ چاہتے ہوں - ہر شخص چاہتا ہے کہ میں جن لوگوں میں رہتا ہوں وہ میرا لحاظ و پاس کریں - برتری اور ادب وہ ہے جس کو ارزل سے ارزل اور کمینہ سے کمینہ آدمی بھی چاہتا ہے کہ وہ مجھے اپنے دوستوں اور آشناؤں کے چھوٹے حلقے میں حاصل ہو - نہایت غریب کیا بلکہ ایک ٹکڑ گدا کی بھی تعریف کرنے والے ہوتے ہیں اور وہ اپنی برتری سے کمتروں میں خوش ہوتا ہے - یہ جو انسان کے دل میں قدرتی آرزو اپنی برتری کی ہے، اگر وہ نیک طور سے اپنے کام میں آتی ہے تو آدمی کو فائدہ پہنچاتی ہے - ایسا ہی کام دیتی ہے جیسے اس کے بے صبر و بے آرام کرنے میں - آدمی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ جانوروں کی سی قناعت اختیار کرے - اس کو عزت کی آرزو میں صرفِ ہمت چاہیے - مگر یہ اس کی نوبت یہاں تک نہ پہنچنے دے کہ وہ صفاتِ بہیمی کو پیدا کریں اور فانی ہونے کے خیال کو دل سے اڑا دیں -

۱۵- آفتاب سارے عالم کو روشن کرتا ہے اور کُل مخلوق کو شاد و خرم - مگر وہ اس جاہ طلب پر نہیں چمکتا جو مایوس ہوا ہے - اس کے گرد تاریکی چھائی ہوئی ہے - جس میں شعاعیں جو چمکتی ہیں، وہ اس کی سودا زدگی اور افسردگی کو دکھاتی ہیں - اِس افسوس ناک حالت میں صرف اس کو یہ تسلی ہے کہ اس کا یہ مرضِ متعدی اَوروں میں بھی پھیلا ہوا ہے - جاہ طلبوں کو غلطی سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہبودگیٔ خلائق میں نہایت جوش سے محنت کرتا ہے - لیکن اس کو اپنے مقاصد حاصل ہو جائیں اور آرام مل جائے تو پھر وہ وسائل اور نتائج سے کچھ غرض نہیں رکھتا - اپنے محسنوں کا احسان نہیں مانتا، یہاں تک کہ جن سے اس کا خون ملا ہوتا ہے ان کو بھی چھوڑ دیتا ہے -

۱۶- جاہ طلبی ایک دائرہ پانی پر ہوتا ہے - وہ جب تک بڑھتا رہتا ہے کہ وسعت پا کر بالکل نیست و نابود نہیں ہو جاتا -

۱۷- جاہ طلبی کو اِن تشبیہات میں مختلف مصنّفوں نے بیان کیا ہے کہ وہ مُردار خوار گِدھ ہے جس کو غرور کی غذا دل سے ملتی ہے - وہ ایک دیوانگی بہادرانہ ہے - وہ زہر ہے جس کا ذائقہ زبان کو اچھا معلوم ہوتا ہے - ایک وبا ہے جو نظر نہیں آتی - وہ زہر ہے جو کسی کو دکھائی نہیں دیتا - وہ سوہانِ روح ہے - مقدّس چیزوں کے لیے گُھن ہے - فریب و مکر کی مادر ہے - جو اس کو اختیار کرتا ہے، اس کو بے چین و بے آرام کر کے دیوانہ، سودا زدہ بناتی ہے -

۱۸- غلام کا ایک آقا ہوتا ہے مگر جاہ طلب کے وہ سب آقا ہوتے ہیں جن کی امداد سے وہ اپنی ترقیِ آیندہ چاہتا ہے -

۱۹- جاہ طلبی کا ٹھیرنا ایسا ہوتا ہے جیسے کہ آندھی کا کہ اگر وہ ایک منٹ بھر ٹھیر جاتی ہے تو پھر وہ بڑی زور سے آتی ہے - وہ ایک بے انتہا محنت اپنے تئیں کم بخت بنانے کے واسطے ہے - اس میں ابتدا کے اندر تکالیف و مصائب کا اٹھانا یقینی اور اس سے عزت کا حاصل ہونا موہومی -

۱۲۸- طبیعتِ انسانی

۱- طبیعتِ انسانی سے مراد ہماری اُن خصائل سے ہے جو انسان کی فطرت اور جبلّت میں داخل ہیں - انسان کی طبیعت کو سوائے عادت کے کوئی چیز مغلوب اور بدل نہیں سکتی - طبیعت کے مغلوب کرنے کو آدمی نہ بڑا کام جانے نہ چھوٹا، اس لیے کہ اس کے مغلوب کرنے کا ارادہ جب پہلی دفعہ ہوتا ہے تو ناکامی ہوتی ہے، جس سے رنجیدگی ہوتی ہے - دوبارہ ارادے میں کچھ کام چلتا ہے - پھر بار بار

ارادہ کرنے سے کامیابی ہوتی ہے - مرتبۂ اول میں آسانی کے لیے کسی چیز کو اپنے ارادے کا معین بناؤ، جیسے کہ ابتدا میں تیرنے کے لیے تیراک تونبوں کو بناتے ہیں - پھر تکلیف کی کچھ برداشت چاہیے، جیسے کہ ناچنے والے بھاری جوتے پہن کر ناچتے ہیں جس سے ناچنے میں کمال حاصل ہو - ان کو جیسی اس مشق میں تکلیف آٹھانی پڑتی ہے، ویسی بعد اس کے ناچنے میں نہیں ہوتی - طبیعت جیسی زیادہ قوی ہوگی ایسی ہی اس کے مغلوب کرنے میں مشکل پیش آئے گی - اول طبیعت کو قید کرنا اور روکنا چاہیے، جیسا اس شخص نے کیا تھا جس کو غصہ بہت آتا تھا - وہ غصے کی حالت میں پہلے چوبیس حرف الف بے تے کے پڑھ لیتا - پھر اس کو کمزور کرنا چاہیے اور بعد ازاں بالکل مغلوب - لیکن اگر آدمی مضبوط اور مستقل ہو تو دفعتہً طبیعت کو مغلوب کر سکتا ہے - وہ شخص اپنے دل کا بڑا استقلال دکھاتا ہے جو ایک ہی دفعہ میں تمام سینہ فگار قیود کو توڑ ڈالے - ان کی اور ساری تکالیف کی برداشت کرے - یہ پرانا قاعدہ غلط نہیں ہے کہ جس چھڑی کو سیدھا کرنا چاہیں تو اس کو مخالف جانب میں بالکل موڑ دیں جس سے وہ سیدھی ہو جائے - مگر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مخالف جانب غلط نہ ہو - پس اسی طرح طبیعت کی کجی کو سیدھا اِس طرح کرو کہ اس کو بالکل جانبِ مخالف میں موڑو جس سے وہ سیدھی ہو جائے -[۱]

۲- آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی عادات کو بالجبر متواتر جاری نہ رکھے بلکہ بیچ میں وقفہ دے - جب لڑائی میں آرام لینے کی مہلت

۱- اصل میں جملہ یوں چھپا ہے: ''پس اسی طرح طبیعت کے کنچی کو سیدھا اس طرح کرو کہ اس کو بالکل جانبِ مخالف میں موڑو جسے وہ سیدھے ہو جائے -''

مل جاتی ہے تو حملہ سخت ہوتا ہے - پس اِسی طرح جب عادت کو وقفہ دو گے تو اچھی عادتیں مضبوط ہوں گی اور بری عادتیں ضعیف - وقفہ دینے سے پرانی ترغیبوں کو بالکل دور کرو یا اُن سے ایسی کثرت سے واقفیت پیدا کرو کہ وہ ذرا دل پر اثر نہ کریں - انسان کی اصل طبیعت کا حال امورِ خانگی سے یا غصّے سے یا کسی نئے تجربے سے معلوم ہوتا ہے - تم یہ نہ سمجھو کہ میں طبیعت کو بالکل مغلوب کر لوں گا ، کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے کسی موقع یا ترغیب پر اپنی حالت پر 'عود[1] کرے گی - جیسا کہ لقمان کی حکایات میں لکھا ہے کہ جب ایک عورت کو بلّی بنا دیا تو وہ چپکی بڑی متانت سے بیٹھی رہی مگر جب چوہیا اس کے روبرو آئی تو اُس پاس لپک کر گئی -

وہ آدمی بڑے خوش نصیب ہیں کہ جن کو زندگی میں وہ کام کرنے پڑے جو اُن کی طبیعت کے موافق تھے - جن میں طبیعت پر زور ڈالنے کی ضرورت کچھ نہیں پڑی - جب کام طبیعت کے مخالف کرنے پڑتے ہیں تو بڑے زور سے طبیعت کو اُس طرف لے جانا پڑتا ہے - آدمی کی طبیعت کا حال کھیت کا سا ہے کہ اُس میں اناج اور گھاس پھوس دونوں اُگتے ہیں - آدمی کو چاہیے کہ موسم میں ایک میں آبپاشی کرے اور دوسرے کو اُکھیڑ کر پھینکے -

۳- طبیعت کے موافق سلسلۂ ضرب میں اور عادت کے موافق سلسلۂ جمع میں ترقی ہوتی ہے - جو سلطنت میں قوانینِ عامہ کو رسم و رواج سے نسبت ہوتی ہے ، وہی نسبت آدمی میں طبیعت کو عادت سے ہوتی ہے - جب طبیعت کے مخالف عادت ہوگی تو وہ سلطنت شخصی ہے جو جلد غارت ہو جائے گی - قاعدہ ہے کہ ہم اپنی طبیعت

۱- عود کرنا = لوٹ آنا ، واپس آ جانا -

کے موافق خیال کرتے ہیں ، تعلیم کے موافق بیان کرتے ہیں ، عادت کے موافق کام کرتے ہیں - طبیعت تو ایک معلّم کتاب آموز ہے اور عادت مجسٹریٹ (حاکمِ فوجداری) ہے -

۴- جیسے کہ ہوا کا رخ صرف ایک چھوٹے تنکے کے اُڑنے سے معلوم ہوتا ہے ، لوہے کی سلاخ سے نہیں معلوم ہوتا جس پر ہوا کا اثر کچھ نہیں ہوتا ، ایسے ہی آدمی کی طبیعت کا حال اُس کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے معلوم ہوتا ہے ، بڑے کاموں سے نہیں - کیونکہ ان کو وہ بہت سوچ بچار سے[1] کرتا ہے اور وہ بعض اوقات میلانِ طبیعت کے بالکل برخلاف ہوتے ہیں -

۵- مختلف زمانوں اور ملکوں میں انسان کے اوضاع و اطوار اور چال چلن بے انتہا مختلف صورتوں میں نمودار ہوتے ہیں مگر طبیعتِ بشری ہمیشہ ایک سی رہتی ہے ، وہ نہیں بدلتی - وہ ایک ہی درخت ہے جس کے حالات میں موسم ، آب وہوا ، زمین ، طریقۂ زراعت کے سبب سے اختلافات نمایاں ہوتے ہیں - پس اگر کوئی حماقت اور خطا مخصوص کسی ملک اور زمانے کے ساتھ ہوتی ہے تو وہ زیادہ پھیلنے نہیں پاتی کہ اُڑ جاتی ہے - مگر جو طبیعتِ بشری کے ساتھ باتیں متعلق ہوتی ہیں ، ان کا اثر بار بار ہر زمانے میں ہر ملک میں ظاہر ہوتا رہے گا - جو درخت کسی غیر ملک کا لا کر بوؤ تو جہاں اس کی احتیاط میں بے خبری ہوئی ، وہ برباد ہوا ، مگر جو زمین کی طبیعت کے موافق درخت اُگتا ہے اس کو جتنی دفعہ چاہو اُکھیڑو ، پھر وہی پیدا ہوگا - زمانے میں جو کام طبیعتِ بشری کے موافق ہوئے ہیں ، وہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ سب مشابہ اور یکساں ہیں ، گو ان کی صورت بظاہر

۱- ''سے'' اضافۂ مرتّب -

ایسی مختلف معلوم ہوتی ہے کہ ان میں مماثلت دیکھنا بڑی ذہانت اور ذکاوت کا کام ہے۔ اگر یہ ایسا نہ ہوتا تو انسان زمانۂ گزشتہ کے تجربوں کے دفتر سے فائدہ کیسے اُٹھا سکتا تھا۔

۱۲۹- عادت اور تعلیم

۱۔ انسان کی طبیعتوں کے جو میلان ہوتے ہیں اُنھی کے موافق خیالات ہوتے ہیں۔ جیسی اُن کی تعلیم اور ذہن میں رائیں جمی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، ویسی ہی ان کی گفتگو اور تقریر ہوتی ہے، مگر ان کے کام عادت کے موافق ہوتے ہیں۔ اس واسطے ایک شخص نے یہ خوب کہا ہے کہ نہ طبیعت کے اقتضا پر، نہ زبانی بہادری پر بھروسا ہو سکتا ہے، جب تک ان کی تائید عادت[1] نہ کرے۔ وہ کہتا ہے کہ بڑی بڑی سازشوں کے کرنے میں ایسے آدمیوں سے کام نہیں چلتا کہ جو بڑے سفّاک، قوی، زبردست مستقل ہوں، جو ان کے کرنے میں حیران پریشان ہوں گے، بلکہ ایسے آدمیوں سے کام نکلے گا کہ جن کو سازشوں کے کرنے کی عادت اور تجربہ ہو۔ گو اس کے برخلاف مثالیں موجود ہوں مگر سچ یہ ہے کہ نہ طبیعت کے، نہ الفاظ کے عہد و پیمان میں وہ زور ہے جو عادت میں ہے۔ باطل پرستی کے اوہامِ باطلہ بھی ایسے بڑھے ہوئے ہیں کہ ان میں بھی قدرت عادت سے کم نہیں ہے۔ وہ ان کو بھی، جو پہلی دفعہ خون کرتے ہیں، قسائی بنا دیتے ہیں۔ عادت کو جو انسان کے معاملات میں غلبہ ہے، وہ بھی بڑا تعجب خیز ہے اور حیرت انگیز ہے کہ اقرار ہوتے ہیں، عہد و پیمان کیے جاتے ہیں، قسمیں کھائی جاتی ہیں، غرض سب کچھ ہوتا ہے مگر کام وہی کیا جاتا ہے جو پہلے سے عادت نے سکھا رکھا

۱۔ اصل میں "عادات" چھپا ہے۔

ہے - یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک کٹھ پُتلی ، مُردہ یا کل ہے کہ جس کو عادت کے پہیے چلا رہے ہیں -

عادت کی اِس فرماں روائی کو دیکھو کہ کس ظلم کے ساتھ ہے کہ ہندوؤں کے ہاں ایک فرقۂ عقلا تھا جو چِتا میں زندہ بیٹھ کر جل جاتا تھا - عورتیں اپنے خاوندوں کے ساتھ ستی ہو جاتی تھیں - سپارٹا کے لڑکے دائنا[1] کے معبد میں کوڑے کھاتے تھے اور ان کے سارے بدن سے خون ٹپکتا تھا مگر رونا چلّانا تو کیا ، ایک آہ بھی منہ سے نہیں نکلتی تھی - روس میں راہب توبہ کے لیے پانی کے برتن میں رات کو بیٹھے رہتے تھے یہاں تک کہ پانی جم کر برف ہو جاتا تھا - غرض بہت سی مثالیں جسمانی اور روحانی عادت کی ایسی موجود ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عادت کے برابر کوئی انسان پر فرماں روا نہیں ہے - پس جب عادت ایسی چیز ہو تو آدمی پر فرض ہے کہ وہ نیک عادتوں کے پیدا کرنے میں ہمہ تن ساعی ہو - وہ عادتیں مستقل اور پائدار ہوتی ہیں جو آدمی میں بچپنے سے پڑتی ہیں - بچپنے میں تعلیم سے عادتیں پڑتی ہیں کیونکہ تعلیم کے معنی ابتدائی عادت کے ہیں - یہ چھوٹی عمر ایسی ہوتی ہے کہ اس میں زبان ایسی ملائم ہوتی ہے کہ جن الفاظ کو چاہو اس سے تلفّظ کرا لو - تمام اعضا میں ایسی قابلیت ہوتی ہے کہ جن حرکات کو چاہو ان میں پیدا کر لو - بعد بچپنے کے یہ قابلیتیں کم ہو جاتی ہیں - شاذ و نادر ہی بڑی عمر کے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے دل کو کسی چیز پر زیادہ نہیں لگاتے اور ایسا کھلا رکھتے ہیں کہ اس میں ترمیم و اصلاح برابر داخل ہوتی رہتی ہے - تعلیم کا حال بعینہٖ ایسا ہے جیسا کہ

۱- دائنا : رومی اساطیر کی ایک دیوی - چاند ، جنگلات ، فن شکار اور فرقۂ نسواں اس کے منسوبات میں شامل ہیں - اس کا یونانی نام آرٹے مس (Artemis) ہے -

درختوں میں پیوند لگانے کا کہ جب درخت پودا ہو تو اس میں پیوند آسانی سے لگ سکتا ہے، کہ ایک قلم اس کی جڑ پر لگا دی جس سے تمام شاخیں پھیل گئیں - بڑے درخت میں جو پیوند لگاتے ہیں تو اس کی تمام شاخوں میں قلمیں لگانی پڑتی ہیں - ہر شاخ کی نہایت خبرداری باغ بانوں کو کرنی پڑتی ہے - اِسی طرح اگر کوئی شخص بچپنے میں تعلیم نہ پائے اور بڑے ہونے پر اپنی اصلاح کے درپے ہو تو اس کو بہت سی باتوں میں اپنے تئیں روکنا پڑتا ہے - ارسطو کا قول ہے کہ نیک عادتیں بچپنے ہی سے ڈالنی چاہییں - جب اکیلے آدمی کی عادت ایسی زور آور ہوتی ہے تو ایک مجمعِ کثیر کی عادات، جو ایک سی ہوں، وہ کیسا زور رکھیں گی اور وہ آپس میں ایک دوسرے کی کیسی تائید کرکے تقویت دیں گی اور اُس گروہ کی شان و شکوہ بڑھائیں گی - سچ ہے کہ انسان کی طبیعت میں نیک عادتوں کا پیدا ہونا اُن مجالس کی صحبت پر موقوف ہے جو منتظم اور تربیت یافتہ ہوں -

۲- گو آدمی کے کاموں میں عادت غالب ہوتی ہے مگر یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ آدمی کے سارے کام عادت پر موقوف ہیں - اس لیے کہ عادت خود کاموں سے پہلے نہیں پیدا ہوتی ہے - جب ایک کام کو آدمی بار بار کرتا ہے تو عادت پیدا ہوتی ہے - جیسے کہ پانی کی رَو جہاز کو بھنور میں بتدریج اس طرح لے جاتی ہے کہ جہازراں کو مطلق خبر نہیں ہوتی کہ جہاز کہاں جاتا ہے، اسی طرح آدمی کو یہ پہلے نہیں معلوم ہوتا کہ عادات کس طرف بتدریج اس کو لے جاتی ہیں اور کہاں پہنچاتی ہیں - جیسے دریا کا پانی اپنے لیے خود جگہ کھود لیتا ہے اور پھر اسی میں مقیّد ہو کر بہتا ہے، اِسی طرح عادت خود اپنے لیے دل میں جگہ کر لیتی ہے اور اُسی میں رہتی سہتی ہے -

۳- تعلیم کو ہم نے بیان کیا ہے کہ اُس کا حال درختوں میں

پیوند لگانے کا سا ہے - انھی دو درختوں میں پیوند لگتا ہے کہ جن کی طبیعتوں میں مشارکت و مناسبت ہوتی ہے - پیپل میں خربوزے کا پیوند نہیں لگ سکتا - ایسے ہی آدمی کی طبیعت اور تعلیم میں مناسبت ضرور ہے - اگر آدمی کی طبیعت کو شاعری سے مناسبت ہو، اُس کو ریاضی سکھائی جائے اور جس کی طبیعت کو ریاضی سے مناسبت ہو، اس کو شاعری سکھائی جائے تو کوئی نیک نتیجہ نہیں پیدا ہوگا - نہ پہلا مہندس ہوگا، نہ دوسرا شاعر -

۴- ارسطو نے لکھا ہے کہ بعض اوقات ایک ہی چیزوں سے آدمیوں میں مختلف عادتیں پیدا ہوتی ہیں ؛ مثلاً انسانوں کی مصائب اور تکلیف کو دو آدمی دیکھا کریں، ایک ان میں سے ان مصیبتوں کو رفع کرنے میں کوشش کیا کرے اور دوسرا بے پروائی، تو ایک کی عادت یہ ہو جائے گی کہ جہاں اس کو کوئی مصیبت کا مارا نظر پڑا وہ اس کی مصیبت کے رفع کرنے کے علاج میں ہمہ تن مصروف ہوا اور دوسرا ایسا کڑ دل[1] ہو جائے گا کہ ہزاروں مصیبت زدوں کو بھی دیکھے گا تو اس کو خبر نہ ہوگی -

۱۳۰- قسمت و نصیب

۱- جس انگریزی لفظ کا ترجمہ نصیب و قسمت میں نے کیا ہے، اس کے اصلی معنی اُن چیزوں کے ہیں جو زندگی میں اتفاقیہ پیش آئیں - زبان کے محاورے کے موافق کہیں اس کا ترجمہ بھاگ، بخت، تقدیر، دولت و اقبال بھی کیا ہے - ہم ظاہرا دیکھتے ہیں کہ بعض کو اَوروں کی یاری و مددگاری سے، بعض کو نوازش و سفارش سے، بعض

۱- کڑ دل : کڑے دل والا، یعنی سخت دل -

کو دوسروں کی موت سے ، بعض کو موقعوں کے ہاتھ لگنے سے ایسے اتفاقات پیش آتے ہیں کہ ان میں مناسبِ حال خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس سے ہم کو قسمت کا قائل ہونا پڑتا ہے ۔ مگر ہر شخص اپنی قسمت کے قالب کو آپ ڈھالتا ہے ۔ کسی شاعر کا قول ہے کہ ہر شخص اپنی قسمت کا آپ کاریگر ہے ۔ ظاہر میں جو اسبابِ خارجی ، قسمت کے ، دیکھنے میں آتے ہیں ان میں اکثر یہ ہیں کہ ایک آدمی کی حماقت دوسرے کی خوش نصیبی کا سبب ہوتی ہے (چو احمق در جہان باقی است کس مفاس نمی ماند[1]) ۔ جب کوئی آدمی دفعتاً آسودہ حال ہو جاتا ہے تو وہ اوروں کی غلطیوں اور حماقتوں سے ہوتا ہے ؛ جیسا سانپ اور سانپوں کے کھانے سے اژدہا بنتا ہے ۔

آدمی میں جو اوصاف ظاہر معلوم ہوتے ہیں اُن کے اعتبار سے تو اس کی تعریف کی جاتی ہے مگر اس کے اندر ایسے چھوٹے چھوٹے اوصاف مخفی ہوتے ہیں کہ جن کے نام بھی کچھ نہیں ہوتے ؛ وہی آدمی کی قسمت ڈھالنے کے سانچے ہوتے ہیں ۔ اچھے کاموں میں جو نیک صفات ظاہر ہوتی ہیں ، وہ ستائش آفریں ہوتی ہیں ، مگر جن اوصاف میں مخفی قابلیتیں ہوتی ہیں وہ قسمت آفریں ہوتی ہیں ۔ یہ اوصاف ایسی قابلیتیں اور عادتیں ہوتی ہیں کہ جن میں تھوڑی حماقت ہوتی ہے اور ذہانت بہت نہیں ہوتی ۔ آدمی کی طبیعت میں وہ رکاوٹیں نہیں ہوتیں جن کے سبب سے اس کے دل کا پہیا قسمت کے پہیّے کے برابر رستہ چلتا ہے ۔ آدمی غور سے دیکھے تو قسمت کو دیکھ سکتا ہے کہ گو وہ خود اندھی ہے مگر وہ اوروں کو دکھائی دیتی ہے ۔ ایک شخص نے کہا ہے کہ آدمی میں ایسی جسمانی طاقت اور روحانی قدرت معلوم

۱۔ یعنی جب تک احمق اس دنیا میں باقی ہیں ، کوئی آدمی مفلس نہیں رہ سکتا ۔

ہوتی ہے کہ وہ جہاں چاہے اپنی قسمت آپ بنا سکتا ہے - وہ ہر فن مولیٰ ہے - قسمت کا حال کہکشاں کا سا ہے کہ ایک بے شمار ستاروں کا مجموعہ ہے جو چمکتا ہے، مگر کوئی ستارہ ان میں سے جدا چمکتا نظر نہیں آتا - پس ایسے ہی آدمی بے نام اور مخفی وصفوں کا مجموعہ ہے، یعنی اس میں قابلیتیں اور عادتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ نظر نہیں آتیں، مگر وہ سب مل کر نصیبے کو چمکاتی ہیں -

جب آدمی ایسے کام کرتا ہے کہ اس میں کوئی نشانہ خالی نہیں جاتا تو اس کو یوں کہتے ہیں کہ وہ تھوڑا سا احمق ہے اور بہت سا دیانت مند نہیں ہے - اسی واسطے جو لوگ اپنے ملک یا اپنے آقا کے سچے خیر خواہ ہوتے ہیں وہ خوش نصیب نہیں ہوتے - وہ اپنے خیالات جو ظاہر کرتے ہیں وہ اوروں کی بھلائی کے لیے ہوتے ہیں، اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتے - جب ایک شخص کا اقبال دفعۃً چمک جاتا ہے تو وہ دلیرانہ منصوبے کرنے لگتا ہے، مگر قابل نہیں ہوتا - قابل جب ہی ہوتا ہے کہ اس کی خوش اقبالی کا امتحان اور عمل، بُرد باری اور تحمّل کے ساتھ ہوتا ہے - قسمت کی دو بیٹیاں ہوتی ہیں: ایک حکومت، دوسری نام وری - اس سبب سے اس کی بڑی عزت اور آؤ بھگت ہوتی ہے، ورنہ وہ خود قابلِ عزت نہیں ہوتی - بڑے بڑے عالی ہمّت اور بزرگ دانش مند[1] تقدیر کی ایسی خاطر داری کرتے ہیں کہ وہ اپنی تمام خوبیوں اور اوصاف کو مشیّتِ ایزدی اور قسمت کے حوالے کرتے ہیں تاکہ لوگوں کی حسد سے بچیں - وہ یہ کیوں کرتے ہیں؟ یہ کیا آدمی کی تھوڑی بزرگی ہے کہ وہ اس کا قائل ہو کہ وہ قدرتِ اعظم اس کی خبر گیر اور دستگیر ہے - جو دانش مند اس کے

۱- اصل میں صرف 'دانش' تھا -

قائل نہیں ہوتے وہ دنیا میں کامیاب نہیں ہوتے - قیصرِ روم جہاز میں بیٹھا تھا - جب وہ طوفان میں آیا تو اس نے ناخدا سے کہا کہ تیرے جہاز میں قیصر اور قیصر کی قسمت دونوں سوار ہیں - تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن بڑے فرماں رواؤں[1] نے اپنے کارہائے بزرگ کو اپنی قابلیت اور لیاقت سے منسوب کیا وہ بدنصیب رہے - یونانیوں کا ایک فرماں روا تھا - جب اس نے اپنی گورنمنٹ کے حسنِ انتظام کا بیان کیا تو اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اس میں کچھ قسمت کو دخل نہ تھا - اِس پر اہلِ ملک اُس سے خفا ہوئے کہ اس کو جلاوطنی نصیب ہوئی -

۲- سارے کاموں میں قسمت پر بھروسا احمق کیا کرتے ہیں اس لیے قسمت کی بھی مہربانی ہمیشہ احمقوں پر ہوتی ہے - جب کوئی احمق کسی آفت سے بچ جاتا ہے یا کسی کام میں کامیاب ہوتا ہے تو لوگ یہی کہتے ہیں کہ وہ اپنی[2] قسمت سے بچ گیا یا کامیاب ہوا - اور اگر کوئی عاقل ، بیدار مغز اپنے کام میں کامیاب ہوتا ہے تو کہتے ہیں وہ اپنی ہوشیاری اور دانائی سے کامیاب ہوا - عاقل آدمی زیادہ تر تقدیر کے رستے پر چلتے ہیں اس لیے وہ زیادہ تر خوش نصیب ہوتے ہیں ؛ مثلاً ایک عاقل جہاز کو وہاں روانہ کرے گا جہاں ہوا اور موسم کو موافق دیکھے گا - احمق جہاز کو اٹکل پچّو یوں ہی روانہ کر دے گا - اگر وہ سلامت پہنچ جائے گا تو کہیں گے کہ اس کی قسمت سے بچا - اگر عاقل کا جہاز سلامت پہنچے تو کہیں گے کہ اس نے تقدیر کے موافق تدبیر کی تھی اس لیے پہنچا - غرض دونوں کو کچھ نہ کچھ قسمت کا ممنون ہونا پڑتا ہے - بعض کام ایسے

۱- اصل : فرماں روایوں - ۲- اصل : اپنے قسمت -

ہوتے ہیں کہ اُن میں عاقلوں کو خوف معلوم ہوتا ہے اس لیے ان کے کرنے میں سو پس و پیش کرتے ہیں۔ احمق جاہل کو ان میں کچھ خوف نہیں معلوم ہوتا، اس لیے ان کو بے دھڑک کر بیٹھتے ہیں اور ان میں کامیاب ہوتے ہیں، اور عاقل ناکام رہتے ہیں۔ اس لیے یہ ضرب المثل ہے کہ بچّوں کی، بدمستوں کی[1]، کودنوں کی خبر گیری پریاں کیا کرتی ہیں (بھولے بھالے کا خدا مالک ہے)۔

۲۔ بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اپنی قسمت کو جھینکا[2] کرتے ہیں اور کسی حال میں خوش نہیں رہتے ہیں۔ وہ گزشتہ حالت اور آیندہ حالت کو اچھا جانتے ہیں اور بالفعل کی حالت کو برا سمجھتے ہیں۔ ایک دفعہ مسافر صحرا میں جاتا تھا کہ اس کو اپنے پیچھے اور آگے ایک تالاب پانی سے بھرا ہوا نظر پڑا۔ جب وہ وہاں کوشش کر کے پہنچا تو وہی تپتا ریگستان یعنی سراب تھا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ اِس آدمی کی خوشی میں زمانۂ حال نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو آگے اور پیچھے، زمانۂ ماضی اور استقبال سراب دکھاتا ہے اور حال ان کو خوش حال نہیں رکھتا۔

۱۳۱۔ سُود و بیاج

[سود سے[3] مراد اُس روپے سے ہے جو ایک شخص
دوسرے آدمی کے روپے کے استعمال کے عوض میں
دیتا ہے]

سُود کی مذمّت کرنے میں اور اس پر لعنت ملامت بھیجنے میں

۱۔ اصل: بدمستوں کی کو دونوں کی۔
۲۔ جھینکنا = کڑھنا، شکوہ کرنا۔
۳۔ اصل میں "سے" نہیں تھا۔

بہت سے آدمیوں نے اپنی ذہانت و فصاحت خرچ کی ہے اور بہت سیان پت سے اس کے روکنے کی تدابیر کی ہیں ، مگر کوئی کارگر نہ ہوئی - کسی نے افسوس سے کہا کہ انسان سود کیا لیتا ہے ، خدا کا حصہ شیطان لیتا ہے[1] - کسی نے کہا کہ سود خوار ایسا ہوتا ہے جیسا کہ شہد کی مکھیوں کے چھتے میں نروں کا جتھا جو بیکار رہتا ہے ، اس لیے اس کا نکالنا ہی بہتر ہوتا ہے - کسی نے کہا کہ سود خوار خدا کا پہلا ہی حکم توڑتا ہے کہ ''تُو اپنی پیشانی کے پسینے سے روٹی کھائے گا'' - وہ دوسرے کی پیشانی کے پسینے سے روٹی کھاتا ہے - بعض نے کہا کہ سود کی اجازت جو ہے ، اس کا حال ایسا ہے جیسے کہ حضرتِ موسیٰؑ نے یہودیوں سے فرمایا تھا کہ تم بڑے سنگ دل ہو اس لیے جوروؤں[2] کے چھوڑنے کی اجازت دی جاتی ہے - ایسے ہی ، آدمی ایسا سخت دل ہے کہ وہ اپنا روپیہ بے سود کسی کو نہیں دے گا اس لیے اس کو سود کی اجازت[3] دی گئی - جب کسی طرح قرض کا لینا دینا بند نہیں ہو سکتا تو سود کا لین دین کیسے بند ہو سکتا ہے - اس کے فائدے اور نقصان ہم بیان کیے دیتے ہیں - ان کو پڑھ کر چاہے لوگ سود لیں یا نہ لیں -

---

۱- اس جملے کے دو لفظ نہیں پڑھے گئے جنھیں حذف کر دیا گیا - اصل میں جملہ یوں چھپا ہے : ''انسان سود کیا لیتا ہے ، خدا کا حصہ وہ بکی کا شیطان لیتا ہے -'' ''وہ بکی کا'' کے الفاظ حذف کر دیے گئے -

۲- جوروؤں = جورو کی جمع ، یعنی بیویاں -

۳- اس کتاب کے بیشتر مضامین چونکہ غیر مسلموں کی کتابوں سے ماخوذ ہیں لہٰذا سود کی یہ اجازت بھی غیر اسلامی مذاہب سے تعلق رکھتی ہے - اسلام نے سود کا لین دین قطعی طور پر حرام قرار دیا ہے -

سود کے نقصان :

اول : وہ سوداگروں کی تعداد کو کم کرتا ہے ؛ اس لیے کہ اگر یہ کاہلی کا پیشہ سود خواری کا نہ ہوتا تو جس روپے پر سود لیا جاتا ہے ، وہ تجارت میں لگتا اور اس سے بڑی رونق تجارت کو ہوتی جو ملک کی ترقی کی جان ہے -

دوم : تاجروں کو سود مفلس بناتا ہے ؛ جیسے کہ کسان کو زمین زیادہ لگان پر ہاتھ لگے تو وہ کھیتی سے فائدہ زیادہ نہیں اٹھا سکتا ، ایسے ہی تاجر کو روپیہ اگر سودی ہاتھ لگے تو وہ تجارت سے فائدہ کم اٹھا سکتا ہے اس لیے مفلس رہتا ہے -

سوم : بادشاہوں کے خراج کی آمدنی میں نقصان ہوتا ہے ، اس لیے کہ ان کی آمدنی کی کمی بیشی تجارت کی کمی بیشی پر موقوف ہے - جب اول دو سببوں سے تجارت کی کساد بازاری ہوئی تو ان کی آمدنی کا کیسا بازار گرم ہو سکتا ہے -

چہارم : سلطنت کی دولت چند آدمیوں کے ہاتھ میں ہو جاتی ہے - سود خواروں کو تو اپنے سود کا یقین ہوتا ہے اور اَوروں کو اپنے کاموں میں تذبذب ہوتا ہے ، اس لیے بہت سا روپیہ سود خواروں ہی کے صندوقوں میں بند رہتا ہے - اور سلطنت کے خزانے کی ترقی کا مدار اس پر ہے کہ لوگوں کا روپیہ باہر برابر پھیلا ہو -

پنجم : زمین کی قدر گھٹ جاتی ہے ؛ اس لیے کہ روپیہ یا تجارت کے کام میں آتا ہے یا زراعت کے کام میں - سود خوار دونوں سے روپے کو روک لیتا ہے - جب زراعت میں نقصان آیا تو زمین کی قدر خود کم ہو جائے گی -

ششم : صنعتوں اور ترقیوں اور ایجادوں کو سست و مریل وہ کر دیتا ہے ؛ اس لیے کہ ان میں روپے کی ضرورت ہوتی ہے ، وہ ملتا نہیں -

ہفتم : بہت سے آدمیوں کی جائداد کو وہ برباد کر دیتا ہے ، جس سے ایک خاص مدت میں عام افلاس پھیل جاتا ہے -

اب سود کے فائدے یہ ہیں کہ اگرچہ سود تجارت کا سدِ راہ ہوتا ہے مگر نوجوان تاجروں کا وہ مددگار ہوتا ہے ، کیونکہ ان نوجوانوں کی سوداگری کا زیادہ مدار سودی روپے پر ہوتا ہے - اگر یہ بیاج کے کھانے والے اپنے روپے کو تجارت سے نکال لیں تو پھر تجارت ٹھٹھر جائے -

دوم : اگر روپیہ سودی آسانی سے نہ ملا کرے تو آدمیوں کو ایسی شدید ضرورتیں پیش آتی ہیں کہ وہ اپنی جائداد کو ، خواہ زرعی ہو یا اور اسباب ہو ، ارزاں بیچ ڈالتے ہیں ، اس سبب سے برباد ہو جاتے ہیں - سود تو ان کو کُترتا ہے مگر یہ بازار ان کو نگل جائے گا -

سوم : سُودی روپے سے صد ہا طرح کی تکلیفیں رفع ہو جاتی ہیں - مگر گورنمنٹ کی طرف سے اس کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ سود کے دانت ایسے تیز نہ رہیں کہ وہ آدمیوں کو بھنبھوڑ کر کھا ہی جائیں - سود کی دو شرحیں ہونی چاہئیں ؛ ایک کم ہو جس سے قرض لینے والوں کو آسانی ہو اور اس سے زمین کی قدر بڑھے ، صنعت و محنت کو ترقی ہو - دوم زیادہ ہو جو خاص شخصوں اور خاص تجارتوں کی صورت میں ہو -

۱۳۲- جوانی اور پیری

۱- برسوں میں آدمی جوان ہوتا ہے لیکن اگر وہ وقت اپنا ضائع نہ کرے تو گھنٹوں میں بوڑھا ہو جاتا ہے (یعنی بوڑھوں کا سا تجربہ کار) ، مگر ایسا شاذ ہوتا ہے - گو نوجوانی میں پیری کی بہ نسبت دانائی کم ہوتی ہے مگر قوّتِ متخیّلہ اور قدرتِ ایجاد بڑی زبردست

ہوتی ہیں - جن جواں طبیعتوں میں حرارت زیادہ اور بڑی سخت آرزوئیں اور تشویشیں ہوتی ہیں ، وہ کارکنی کے واسطے جب تک پختہ نہیں ہوتیں کہ ان کی عمر اپنے نصف النہار سے ڈھل نہیں جاتی - وہ بوڑھی طبیعتیں بھی خام کار ہوتی ہیں جن میں تُندی ہوتی ہے - دنیا میں نوجوانوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں کیے ہیں - اگر تاریخ میں سے واقعاتِ عظیم ، خواہ جنگ و پیکار میں یا ملکی معاملات اور علمی اختراعات اور ایجادات میں ، انتخاب کیے جائیں تو ان کے کرنے والے اکثر نوجوان ہی نکلیں گے - جن کاموں کی صورتیں نئی ہوتی ہیں ان کو نوجوان ہی خوب سرانجام دیتے ہیں - مگر وہ غلطیاں بھی ایسی سخت نابکار کرتے ہیں کہ جن سے سارا کام تباہ ہو جاتا ہے - بوڑھوں کی فقط اِتنی غلطی ہوتی ہے کہ وہ کام کو دیر میں کرتے ہیں اور نا تمام رکھتے ہیں - نوجوانوں کی بڑی غلطیوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ بہت سا کام جلدی کرنا چاہتے ہیں - اس لیے مناسب ہے کہ کاموں کی تکمیل کے لیے کہ جس سے اُن کے ثمرے حاصل ہوں ، دونوں — نوجوان اور بوڑھوں — کو کام میں لگائیں تاکہ دونوں کے نقصوں اور عیبوں کی اصلاح ہو جائے - نوجوان کام سیکھ لیں اور بوڑھے کر دیں - دیرینہ سال معاملاتِ ملکی میں زیادہ تر ماہر ہوتے ہیں مگر اخلاق ان کے نوجوانوں سے اچھے نہیں ہوتے - یہ ایک آیت[1] ہے کہ تمھارے نوجوان رؤیائے صادق[2] دیکھیں گے اور تمھارے بوڑھے سونے میں سپنے - اس کی تفسیر میں ایک یہودی عالم نے یہ لکھا ہے کہ نوجوان بہ نسبت بوڑھوں کے خدا کے نزدیک زیادہ جائیں گے ، اس لیے کہ رؤیائے صادق

۱- اس آیت سے غالباً انجیل مقدّس کی آیت مراد ہے -

۲- رؤیائے صادق = سچّے خواب -

میں اِلہام کا زیادہ تر حصہ بہ نسبت خواب کے ہوتا ہے۔ جو شخص دنیا کی شراب زیادہ پیتا ہے، وہ زیادہ بد مست ہوتا ہے۔ آدمی کی عمر اس کی فہم و فراست میں پختگی کرتی ہے مگر اس کی محبت و نیّت میں خامی لاتی ہے۔

بعض دفعہ نوجوانوں سے بڑے بڑے کاموں کی توقّعیں اور اُمیدیں ہوتی ہیں مگر ان میں مایوسی اس وجوہ سے ہوتی ہے کہ بعض آدمیوں کی سمجھ جیسی قبل از وقت جلد پختہ ہو جاتی ہے، ایسی ہی[1] وقت سے پہلے پژمردہ بھی[2] ہو جاتی ہے۔ ان کی ذکاوت کی دھار تیز ہوتی ہے مگر جلد کرّ[3] ہو جاتی ہے۔ ان کی طبیعتیں نازک ہوتی ہیں، دیرپا نہیں ہوتیں۔ جیسے تم بعض مصنّفوں کی ابتدائی تصنیفات کو دیکھتے ہو کہ ان میں بلا کی فصاحت و بلاغت ہوتی ہے مگر انتہا کی تصنیفات ان کی بے لطف اور پھیکی۔ بعض آدمیوں کی طبیعتیں فطرتی ایسی ہوتی ہیں کہ وہ بچپنے میں بڑی ذہانت دکھاتی ہیں اور پھر ٹھٹھر جاتی ہیں۔ ایسے لوگ بڑھاپے تک ذہین لڑکے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ جن کاموں کی ان سے توقع کی جاتی ہے وہ ان کی نوجوانی کے مناسب ہوتے ہیں مگر بڑی عمر کے نہیں۔ سوم، بعض آدمیوں کو نوجوانی میں کام ایسے پیش آتے ہیں جن کے سرانجام دینے سے ان کی بڑی شہرت اور ناموری ہوتی ہے، مگر بڑھاپے میں ان کے سامنے کام ہی ایسے نہیں آتے کہ ان کی طبیعت کے جوہر کھلیں۔

۲۔ ارسطو نے جوانی اور پیری کے باب میں جو مضمون لکھا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھا پھر بالک ہو جاتا ہے۔

۱۔ ”ہی“ اضافۂ مرتّب۔ ۲۔ ”بھی“ اضافۂ مرتّب۔

۳۔ کرّ ہونا = کُند ہو جانا۔

یہاں یہ[1] ضرب المثل مشہور ہے کہ بوڑھا بالک برابر - کوئی شخص اپنی فطرتی حالت میں رہے اور کوئی اصول مقدّس ، پاک کرنے والا اُس کے دل میں نہ بٹھایا جائے تو وہ روز بروز بد تر ہوتا جائے گا - بعض حکیم اس کے برخلاف لکھتے ہیں کہ آدمی کی جتنی عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے ، اس کی اصلاح خود بخود بغیر کسی کوشش کے ہوتی جاتی ہے ؛ جیسے جنگلی سیب کا درخت جتنا پرانا ہوتا جاتا ہے ، اُتنے ہی اس میں پھل زیادہ آتے جاتے ہیں - لیکن یہ صحیح نہیں ہے - جب تک آدمی کے دل میں کوئی اصول اصلاح کرنے والا نہیں قائم ہوگا ، اُس کی نو عمری کی بے وقوفیاں اور برائیاں اُترتی جائیں گی اور ان کی جگہ زیادہ بدتر برائیاں اور بے وقوفیاں جڑ پکڑتی جائیں گی - ایک جنگلی پودے میں اگر کسی اچھے پھل دار درخت کا پیوند لگا دو تو وہ جتنا عمر میں بڑھتا جائے گا ، اُتنے اچھے پھل لاتا جائے گا - اسی طرح دل میں کوئی اصول اصلاح کرنے والا جما دو تو جتنی عمر بڑھتی جائے گی ، اس کے پھل اچھے آتے جائیں گے -

۳- جوانی کی تدابیر میں اور ابتدائی خیالات میں زیادہ تر حصہ اِلہامی ہوتا ہے - کُہن سال اپنے لیے عقل مند ہوتے ہیں ، وہ اپنے ملک اور ہمسایے کے واسطے کافی دانش مند نہیں ہوتے - عمر جیسی آدمی کی صورت بگاڑتی ہے ، اس سے زیادہ آدمی کے دل کو بگاڑتی ہے (اگر آدمی دل کو دیکھ سکتا تو اس کا مشاہدہ ہو جاتا) - بوڑھے آدمی سوائے خدا کے سب سے ڈرتے ہیں - نوجوانی توبہ کے بیج بونے کے واسطے اچھی کھیتی ہے - نوجوانی کی جبلّت میں بوڑھوں کی حکومت و استناد کی حقارت داخل ہے - وہ چاہتے ہیں کہ خود تکلیف و محنت

۱- اصل : یہاں بھی -"یہ" اضافہ مرتّب -

کر کے دانائی حاصل کریں - جیسے کہ نوجوانی پیرانہ سالی سے بدل جاتی ہے ، ایسے ہی محبت صرف خالی عنایت سے بدل جاتی ہے -

۴- نوجوان میں حیا و شرم و نرمی ہوتی ہے ، کہن سال میں سختی ، سنگ دلی - نوجوان میں رحم و شفقت ، بوڑھے میں بے رحمی اور کٹھور پن - نوجوان میں ستائش کے قابل رشک ہوتا ہے ، بوڑھے میں بدبختی سے حسد - نوجوان مذہب کی طرف تھوڑا راغب اور اپنی عبادت میں کم شاغل ہوتا ہے ، اس لیے کہ اس کو برائی کی ہوا اب تک نہیں لگی ہوتی اور کوئی تجربہ اس کا نہیں ہوتا - بڑھاپے میں فیاضی میں ان کی سردمہری آ جاتی ہے ، اور برائی کے ساتھ مدت تک تعلق رکھنے سے اور یقین کرنے کی قابلیت جاتی رہنے سے خدا پرستی کی گرم جوشی سرد ہو جاتی ہے - نوجوان کی آرزوئیں پُرجوش و پُرشوق ہوتی ہیں ، بوڑھے کی آرزوئیں اعتدال کے ساتھ - نوجوان غیر مستقل اور متلوّن ہوتا ہے ؛ بوڑھا بہت سنجیدہ ، متین اور مستقل - نوجوان فیّاض ، سخی ، خیر خواہِ خلائق ہوتا ہے ؛ بوڑھا طامع ، دانا ، اپنے واسطے جویا ہوتا ہے - نوجوان اپنے اوپر اعتبار کرنے والا اور ہوشیار ہوتا ہے ، بوڑھا بے اعتبار اور وسواسی - نوجوان آرام دینے والا اور بے ریا ہوتا ہے ؛ بوڑھا خرّانٹ ، گُھنّا ، بد ظن - نوجوان بڑی بڑی آرزوئیں کرتا ہے ، بوڑھا حسبِ ضرورت - نوجوان حال کے زمانے کو خوب غور سے دیکھتا بھالتا ہے ، بوڑھا ماضی کے زمانے کو - نوجوان اپنے بزرگوں کا ادب کرتا ہے ، بزرگ اس کی خطائیں پکڑتے ہیں -

۵- تُو اپنی نوعمری کو اِس طرح نہ گنوا کہ وہ جب تجھ کو یاد آئے تو دل سے سرد آہیں نکلیں اور تجھے غم زدہ اور افسردہ کریں - کیا تم اپنے بچپنے میں یہ خیال کرتے ہو کہ ہمارا بچپن ختم نہ ہوگا ؟

ضرور ختم ہوگا - دن خواہ کتنا ہی بڑا ہو ، کیا اس کی شام نہ آئے گی ؟ ضرور آئے گی - یہ نوعمری تمھاری کھیتی کا وقت ہے ، جو بوؤ گے وہ کاٹو گے - ایسی زراعت کرو کہ جس سے اتنا ذخیرہ جمع ہو جائے کہ آخر عمر تک زندگی بہ خوشی بسر ہو - اگر تم بڑا انعام حاصل کرنا چاہتے ہو تو تم کو محنت و مشقّت کی برداشت اور سب طرح کی تدابیر کرنی چاہئیں - ہر عمر کا ایک موسم ہوتا ہے ، اس کے موافق بیج بوؤ گے تو پھل پاؤ گے - بڑھاپے کی خوشیاں یہ ہیں کہ پہلی عمر میں پاپ نہ کیے ہوں جن کی یاد افسوس دلائے ، اور بال بچے نیک گِرد ہوں - بڑھاپے میں جلسوں اور صحبتوں میں آدمی نہیں جا سکتا تو گھر میں اپنے بال بچوں کے پاس ہونے سے بڑا دل خوش ہوتا ہے -

۶- تم اپنی نوجوانی کو اپنے عیش و طرب کا زمانہ نہ جانو - اس میں تم بڑی بڑی آرزوئیں کرتے ہو اور ان میں مایوس ہو کر روز رنج و غم اٹھاتے ہو - مگر جب تمھاری عمر بڑی ہوتی ہے تو تم کو اپنی امیدوں کا پورا تجربہ حاصل ہوتا ہے - ان کے لیے اضطراب و اضطرار نہیں ہوتا اور اپنی حالت میں خوش رہتے ہو -

۷- نوجوانی بڑے بڑے دلیرانہ منصوبوں اور امیدوں کا وقت ہوتا ہے - تم کو ابھی ایسا موقع پیش نہیں آیا کہ تمھاری طاقت کا مقابلہ کسی مخالف سے ہوتا جس سے اس کی کیفیّت معلوم ہوتی - تم اپنے اسی گھمنڈ میں بیٹھے ہو کہ کیسا ہی پہاڑ ہمارے آگے روکنے کے واسطے آئے تو ہم اپنی کوشش سے اسے ہٹا دیں گے - لیکن جب پہلی دفعہ اپنی جگہ سے سرکائے جاتے ہو تو اس سے کچھ ہوشیاری نہیں سیکھتے بلکہ اَور زیادہ طیش کی آتش تمھاری بھڑکتی ہے - جس کا دل فیّاض اور جری ہوتا ہے اس کو مدتوں کے بعد اپنے ضعف کا شبہ

ہوتا ہے - جن مشکلات کو وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے حملے سے ہٹا دوں گا، ان کو صبر کے ساتھ اٹھاتا ہے - پہلے اس سے کہ احکامِ فلسفہ کا زور تم کو مایوس کرے، تم یہ سمجھتے ہو کہ اول سبب اور آخر مسبّب کا روک دینا ہمارے اختیار میں ہے - تم اس بزدلانہ تاخیر پر، جو انڈے سینے والی محنت میں ہوتی ہے، ہنستے ہو اور سمجھتے ہو کہ زیادہ آگ روشن کر کے ہم اپنے منصوبوں کو سریع بنا لیں گے - تم اعتبار اوروں پر بہت کرتے ہو - بوڑھوں کی صلاح و مشورہ نہ ماننے کا میلان جو تم میں ہے، وہ معقول ہے - اس لیے کہ تم فیاضی سے، حقارت کے ساتھ شبہات کو رد کرتے ہو -

۸- سچ پوچھو تو دنیا کے باغ میں کوئی گلِ رعنا اس نوجوان کی برابر نہیں ہے جو اپنی شگفتگی سے خدا کی قدرتِ کاملہ دکھاتا ہے اور اپنا رخ خدا ہی کی طرف اِس طرح رکھتا ہے جیسے سورج مُکھی کی کلیاں آفتاب کی طرف -

۹- جوانی کی مستی پر شراب کی مستی جان کے لیے آتش پر آتش ہے - جو نوجوان شراب سے پرہیز نہیں کرتا، نہ وہ اپنی عمر طبیعی پر پہنچتا ہے، نہ تندرست رہتا ہے - نوجوانی کے خیالات رنگین کو قوتِ متخیّلہ اُن چیزوں پر کہ معلوم نہیں ہوتیں یا نئی ہوتی ہیں، بہت شوخ چمکتے ہوئے رنگوں میں چمکاتی ہے -

۱۰- وہ موسمِ نوجوانی بڑا خوش و خرّم ہے کہ جس میں حیا اور شرم ایسی سدِّ راہ ہوں کہ کوئی بے حیائی اس کے اندر نہ جا سکے، اور امید کے مقدّس ہوائی شہر برباد ہو کر اصل حقیقت کے مٹّی کے جھونپڑے بن گئے ہوں - اپنی فطرت کے موافق آزادی ہو اور بے اعتنائی -

۱۱- جو نوجوان ورزشِ جسمانی نہیں کرتا اور دل کو خوش نہیں رکھتا، وہ دراز عمر نہیں ہوتا - بہت سوچ بچار کرنا روح کو تحلیل

کرتا ہے - اکثر کام سوچ بچار ہی میں رہ جاتا ہے -

۱۲- وہ نوجوان پسند کے قابل ہے کہ جس میں بوڑھوں کی بعض باتیں ہوں - اور وہ بوڑھا نفرت کے قابل ہے جس میں بچوں کی باتیں ہوں -

۱۳- شباب اور جوانی کو خدماتِ ملکی کی نذر کرو اور بڑھاپے کو اپنی خدمت میں بسر کرو -

۱۴- اگر دنیا میں بوڑھے نہ ہوں تو وہ انسانیت سے خارج معلوم ہو ، اور اگر بچے نہ ہوں تو وہ دیوانی باولی معلوم ہو -

۱۵- نوجوانی میں جب تک اوپر چڑھتے چلے جاؤ کہ شان و شکوہ کے کوہ کی چوٹی پر پہنچو ، جس کے سبب سے تمھارا نام ملک کے افسانوں میں مدت تک یادگار رہے - محنت کر کے علم کی کانیں گہری کھودتے چلے جاؤ اور پھاوڑے مار مار کر وہ جواہر نکالو جو تاجوں کے ستاروں سے بھی زیادہ چمک دار ہوں - مکتبوں اور مدرسوں سے نیچر (فطرت) کی دولتیں اور علموں کی نعمتیں لُوٹو - اپنے ادائے فرائض کی راہ میں قدم بڑھاتے چلے جاؤ - نیکی ہی اصل خوشی ہے ، خوبی ہی سچی خوبصورتی ہے - دل آسمانی پیدائش ہے ، زمین کو اس سے آسمان بنا دو - نوجوانی صبحِ زندگانی ہے - اگر آفتابِ صداقت نے اخلاق کے کُہر کو دوپہر سے پہلے نہ ہٹا دیا تو سارا دن تنگ و تاریک رہے گا - مذہب کی بزرگی کے بیج جمانے کا وقت یہی وقت ہوتا ہے -

۲۶- بوڑھے آدمی ایسے مرتے ہیں جیسے کہ آگ خوب جل کر خود بجھ جاتی ہے ، اور جوان آدمی ایسے مرتے ہیں جیسے کہ آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے کہ دیر تک اس میں دھواں اٹھتا رہتا ہے اور مشکل سے دیر میں بجھتی ہے -

۱۷- عمر کا حال شراب کا سا ہے کہ جو اُس کو صاف پینا چاہے وہ تلچھٹ چھوڑ دے - مگر بڑی عمر دنیا کی نعمتِ عظمٰی سمجھی جاتی ہے - بڑی عمر میں گو ہوش، حواس، اعضا قائم رہیں لیکن عزیز، اقربا، دوستوں کا مرنا اس کو ایسا بنا دیتا ہے جیسے کوئی درخت کہ جس کے سب پتے جھڑ جائیں اور شاخیں گر جائیں اور ٹُنڈ رہ جائے جو ہوا کے جھونکوں سے ہلا کرے -

۱۳۳- خوب صورتی و بدصورتی

۱- اگر حُسنِ صورت کے خانے میں حُسنِ سیرت کا نگینہ جڑا جائے تو وہ بہت ہی بیش بہا ہو جائے - اس نگینے کے واسطے کوئی بہتر خانہ اِس سے زیادہ نہیں ہے - حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت کا کمال کمتر دیکھنے میں آتا ہے - حسنِ صورت میں جو کامل ہوتے ہیں وہ اکثر بڑے اولوالعزم نہیں ہوتے (گو بعض اِس کی مستثنٰی صورتیں بھی ہیں) اور وہ خوش وضعی پر بہ نسبت نیک کرداری کے زیادہ نظر رکھتے ہیں - ادا و انداز، آن تان میں جو حسن ہوتا ہے وہ چہرے کے رنگ میں نہیں، گو وہ گل و لالہ کا سا ہی کیوں نہ ہو - حسانت وہی ہے نہ جس کی[1] تصویر بن سکے، نہ اُس کا بیان الفاظ میں ہو سکے، نہ اُس کے لیے قواعد مقرر ہو سکیں - ہر خوبصورتی میں ایک عجیب تناسب ہوتا ہے - بہت سے چہرے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر الگ الگ ان کی ایک ایک چیز کو دیکھو تو وہ خوبصورت نہیں نظر آتے مگر بحیثیتِ مجموعی وہ سب مل کر مناسبت کے سبب سے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں - مخلوقات میں ہر چیز بحیثیتِ مجموعی ہمارے دل پر اثر کرتی

۱- اصل : نہ جس کی نہ تصویر -

ہے - اگر ایک عالی شان بُرج کو دیکھیں تو اس کا طول ، عرض ، ارتفاع الگ الگ دل پر کچھ اثر نہیں کرے گا ، بلکہ اس کی کل صورت آنکھوں میں سما کر دل پر اثر کرے گی -

کوئی چیز دنیا میں بے عیب نہیں ہوتی - ضرور اُس کے اجزا میں عیب ہوں گے - اگر یہ سچ ہو کہ خوبصورتی کا بڑا حصہ ادا و انداز و حرکات و سکنات کے ہاتھ میں ہے تو بڑی عمر کے آدمی بھی حسین ہو سکتے ہیں - مشہور ہے کہ خوبصورتی کی خزاں بھی خوبصورت ہوتی ہے - ایک شخص کہتا ہے کہ سال کی تمام اچھی فصلوں میں خزاں کی فصل ، جو سب سے آخر ہوتی ہے ، زیادہ اچھی ہوتی ہے - بچہ حقیقت میں خوبصورت نہیں ہوتا مگر پیار کے سبب سے وہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے - خوبصورتی کا حال بہار کے پھولوں اور بیلوں کا سا ہوتا ہے کہ وہ جلدی سے سڑ آبس جاتے ہیں - خوبصورتی زیادہ تر تو نوجوانوں کو آوارہ کرتی ہے مگر کبھی وہ لائق آدمیوں میں ہوتی ہے تو اُس سے اُن کی نیکی بڑی چمک جاتی ہے ، اور وہ اپنی برائیوں سے ایسے شرمندہ ہوتے ہیں کہ ان کو چھوڑ دیتے ہیں - یا اُن کی خوبصورتی نیکی کے ساتھ ، ہاتھ میں ہاتھ دیے ، چلتی ہے جس سے برائی نہایت بد شکل معلوم ہوتی ہے اور اوروں کے آگے شرمندہ ہو جاتی ہے -

۲- بد صورت آدمی اکثر نیچر سے مقابلے میں برابری کرتے ہیں - جیسا کہ نیچر نے ان کے ساتھ برائی کی ہے ، ایسے ہی وہ نیچر کے ساتھ برائی کرتے ہیں اور اس سے اپنا انتقام لیتے ہیں ؛ یعنی جیسے نیچر نے ان میں بدصورتی کا عیب بنایا ہے ، وہ اس کے مقابل میں ایسی خوبی پیدا کرتے ہیں کہ اس کو ہرا دیتے ہیں - جسم اور روح میں موافقت و مطابقت ہوتی ہے ؛ نیچر جیسا ایک کو بُرا بناتا ہے ، ویسا دوسرے کو ، اس لیے بد صورتی کے ساتھ بد سیرتی ہوتی ہے - مگر انسان میں ایک

انتخاب کی قوت ہے جس سے وہ اپنے قلب کے قالب کو ڈھال سکتا ہے اور تربیت و تعلیم و نیکی کے آفتاب سے اپنے تمام میلانِ طبعی کے (بُرے) اختروں کو تاریک کر سکتا ہے - جس شخص کے جسم میں کوئی بد صورتی کا ایسا عیب ہوتا ہے جس کے سبب سے لوگ اس سے متنفر ہوتے ہیں اور اس کو حقیر جانتے ہیں، تو یہ نفرت اس کے دل کو ہمیشہ آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے تئیں کسی نہ کسی طرح اس حقارت سے نجات دے، اس لیے وہ اپنے میں ایک ایسی خوبی پیدا کرتا ہے جو اس عیب کو چھپا دیتی ہے - اس لیے بعض بد صورت بڑے بہادر ہوتے ہیں - اول اُن کو اپنی حفاظت میں بہادری کرنی پڑتی ہے جس سے کوئی ان کی حقارت نہ کرے اور پھر ایک مدت میں ان کی عادت میں وہ داخل ہو جاتی ہے - وہ اَوروں کے ضعف اور عیوب کے دیکھنے میں بھی کوشش کرتے ہیں جس سے ان کے عیب کا معاوضہ ہو، اس لیے بعض اوقات بد صورت آدمیوں کا نہایت قابل و لائق ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں -

۳- نیکی حسنِ باطنی ہی کا نام ہے اور حسنِ ظاہری اظہارِ نیکی کا - کمینے آدمی کا خوش رُو ہونا ایسا ہے جیسے کوڑھی کا پاکیزہ لباس پہننا - خوبصورتی نیکی کو روشن کرتی ہے اور برائی کو تاریک - حُسن دونوں — رکھنے والے اور دیکھنے والے — کو مست کرتا ہے، اس لیے اس کی مستی شراب کی بد مستی سے زیادہ ہے - یہ ایک قانون دائمی ہے کہ جو حسن میں اول ہے، وہ طاقت میں اول ہے - جہاں حُسن وکالت کر رہا ہو وہاں اس کے سامنے بڑے بڑے مقرر گونگے ہیں - حُسن جس کو سیر کرتا ہے، اس کو زیادہ بھوکا کرتا ہے -

۴- حسن کی برابر کوئی چیز دنیا میں نہیں ہے جو انسان کے دل و جان کو اپنے اوپر فریفتہ کرتا ہے - بڑے بڑے زبردست، اس کی

دل چرانے والی[1] آنکھوں کے سامنے ، اپنی قوّت کو بھول جاتے ہیں اور سر جھکا دیتے ہیں ۔ سنگ دل اور آہنی تن اُس کی زلف کی زنجیروں میں پھنستے ہیں اور اپنی تاب و تواں کھوتے ہیں ۔ خدائے تعالیٰ نے خوبصورت چیزیں سب انسانوں کے واسطے یکساں بنائی ہیں اس لیے ادنیٰ اعلیٰ سب حُسن کے شائق ہیں ۔

۵۔ دُور کی چیزیں زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہیں ۔ بادلوں کو دور سے دیکھو تو وہ اپنے رنگ روپ کیسے خوش نما دکھاتے ہیں ۔ پاس جا کر دیکھو تو ایک بد منظر کُہر نظر آئے گی ۔ پہاڑوں کی چوٹیاں بڑی پُربہار معلوم ہوتی ہیں مگر ان پر چڑھ کر دیکھیں تو کچھ نہیں ۔

۶۔ حسن کی سب جگہ فرماں روائی ہے ۔ موسمِ بہار کے بے شمار درختوں میں وہ جلوہ گر ہے ، سبزے کی پتّیوں میں وہ لہریں مارتا ہے ، درختوں کے پتّوں میں وہ شوخیاں کرتا ہے اور سمندر و زمین کی تہوں کے اندر آمد و رفت رکھتا ہے ۔ گھونگوں اور جواہر میں اپنی چمک دکھاتا ہے ۔ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں کیا بلکہ بڑی بڑی چیزوں میں — جیسے سمندر ، پہاڑ ، آسمان ، ستارے ، آفتاب کے طلوع و غروب -- جلوہ افروز ہوتا ہے ۔ سارا عالم حسن کی عبادت گاہ ہے ۔ ستارے ، پھول ، پہاڑ ، درختوں کے جنگل ، دھاریں ، یہ سب حروف ، الفاظ ، آوازیں ، رسل و رسائل ، وعظ حُسن ہیں ۔ جن کے سننے ، پڑھنے ، سمجھنے سے خدا تعالیٰ نظر آتا ہے ۔ حسنِ خداداد کا دیکھنا ہی عبادتِ الٰہی ہے ۔ وہی گناہ کے غم کے اندھا کرنے والے اور باطنی

۱۔ یعنی اُس کی دل کو چُرا لینے والی آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے زبردست بے بس ہو جاتے ہیں ۔ اصل میں یہ جملہ یوں چھپا تھا : ”بڑے بڑے زبردست اس کے دل چرانے والے آنکھوں . . .“۔

خیالات کے دھندلا کرنے والے آنسوؤں کو پونچھتا[1] ہے۔ مردانِ خدا اِن تمام خارجی حسین چیزوں کو ایک سنہری گلاس میں رکھ کر شانِ کبریائی دیکھتے ہیں ۔ جو اِس حُسن کو نہیں دیکھتا ، وہ اندھا ہے اور زمین آسمان اس کے واسطے بندی خانہ ہے۔ اس نہ دیکھنے سے انسان کی بے انتہا خوشی کا حصہ دنیا میں سے جاتا رہتا ہے۔ افسوس ہے کہ انسان ایسی[2] روحانی خوشی کو چھوڑ دے۔ حُسن سب جگہ موجود ہے مگر وہ ڈھونڈنے سے ملتا ہے ، جوینده یابنده۔ بعض جگہ حُسن ایسا کونے میں جا پڑتا ہے جہاں کسی کو اس کی توقع نہیں ہوتی ۔ حُسن کا حال پری کا سا ہے ؛ کبھی بھٹوں اور پتّوں میں چھپ بیٹھی ، کبھی پرانے عشق پیچاں کے بیچوں میں چلی گئی ۔ کہیں آفتاب کی شعاعوں میں آنکھ مچولی کھیلنے لگی ، کہیں عماراتِ شکستہ میں بسیرا لینے لگی ۔ کہیں نوجوان چہروں میں بس گئی ، کہیں سفید بادلوں کا روپ بھر کے ناچتے ہوئے سبز کھیتوں میں گتیں بھرنے لگی ۔ کہیں نیلے سمندر پر ، لہروں کے اندر تاریک صورت بنا کے فرشتوں کے پروں کے سائے کی طرح گزر گئی ۔ غرض یہ ناز پرداز و کرشمہ ساز ہر موسم و فصل میں رنگا رنگ لباس پہنتی ہے ۔ اب یہ بتلانا تو بہت مشکل ہے کہ اس کے کون سے ادا و انداز سب سے بہتر ہیں جن پر انسان کو فریفتہ ہونا چاہیے ، مگر یہ یاد رکھو کہ جس ادا پر چاہو ، اس کی مرو ۔ لیکن اس میں شانِ جمالِ الٰہی دیکھو جس سے تم کو روحانی مسرّت حاصل ہو ۔

۷۔ سقراط نے فرمایا کہ حُسن ایک کم عمر عطیۂ الٰہی ہے ۔ افلاطون نے کہا کہ حُسن ایک قدرتی قانون مخصوص انسان کے فائدے

۱۔ اصل : پوچھتا ہے ۔ ۲۔ اصل : اسی روحانی ۔

کے لیے ہے۔ ارسطو نے کہا کہ کوئی سفارش نامہ حُسن سے زیادہ انسان کے واسطے نہیں ہو سکتا (الصورت نصف الرزق[1])۔ ہومر[2] نے لکھا ہے کہ دیوتاؤں کا عطیہ کوئی حسن سے بڑھ کر نہیں ہے۔ اور حکیموں کے مقولے یہ ہیں کہ حُسن ایک خاموش عیّار ہے۔ حُسن ایک تنہائی کی سلطنت ہے (یعنی ایسی سلطنت جس میں خدم و حشم کی ضرورت نہیں)۔ حُسن سے زیادہ کوئی محسن نہیں۔ حُسن ایک نقصان خوش کرنے والا ہے۔

۸۔ اگر تُو کسی عورت کو فقط حسین دیکھ کر نکاح کر کے عمر بھر اپنے تئیں وابستہ کرے گا تو شاید ایک سال بھی خوش نہیں رہے گا۔ جب وہ تیرے پاس آ جائے گی تو کوڑی کے برابر بھی نہیں معلوم ہوگی۔ حُسن قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔ اس کا رنگ چمکتا ہوا دفعتہً اُتر جاتا ہے۔ کلی کی طرح کھِل کر پژمردہ ہو جاتا ہے۔ نازک شیشے کی طرح ٹوٹ جاتا ہے۔

۹۔ جو شخص اپنے خداداد حُسنِ صورت کو حُسنِ سیرت سے رونق نہیں دیتا تو وہ تصویر اور رنگین کپڑوں کی طرح آنکھوں کی تفریح کا سبب ہوتا ہے مگر دل کی مسرّت و انبساط کا سبب نہیں۔

۱۰۔ حُسن میں یہ جادو ہے کہ سنگ دل سے سنگ دل بھی اس کے ساتھ نرم دلی برتتے ہیں۔ یہ سب کے نزدیک مُسلّم ہے کہ خوبصورت کا یہ حق ہے کہ سب سے پہلے اس کی بات سنی جائے اور

۱۔ یعنی حسنِ صورت آدھا رزق ہے۔

۲۔ ہومر: نویں صدی قبل مسیح میں زندہ تھا۔ یونانِ قدیم کا معروف ترین شاعر۔ اس کی تصانیف میں ''ایلیڈ'' اور ''اوڈیسی'' خاص طور پر مشہور ہیں۔ ''شاہنامۂ فردوسی'' کی طرح ''ایلیڈ'' اور ''اوڈیسی'' بھی جنگی کارناموں کی داستانیں ہیں جنھیں ایپک کہا جاتا ہے۔

اس پر خیال کیا جائے۔

۱۱- حُسن بھی کیا عجب چیز ہے: اس کو نزلہ ہوتا ہے، بخار چڑھتا ہے، اس کے دانت سردی سے کڑکڑاتے ہیں، رخساروں کے پھول گرمی سے کملاتے ہیں۔ اس کی قیمت جلدی سے چڑھاؤ سے گھٹاؤ پر آتی ہے۔ آج ہزار روپیوں کو وہ بِکتا تھا، کل کوڑیوں کے مول بکنے لگا۔ اس کے خریدنے کا چاؤ بہت ہوتا ہے۔ قیمت اس کی بے اندازہ دی جاتی ہے، مگر جب خرید لیں تو کچھ نہیں۔ نہ قیمت رہتی ہے، نہ قدر۔

۱۲- حُسن کا مدار شکل و بناوٹ پر موقوف ہے، کسی خاصیت پر نہیں۔ دائرے کا حُسن اس کی اِس خاصیّت پر موقوف نہیں ہے کہ اس کے محیط کے ہر ایک حصّے کا فاصلہ خاص نقطۂ مرکز سے برابر فاصلے پر ہے۔ یا کسی اور خاصیت پر جو علمِ ہندسہ میں ثابت ہو، بلکہ اس کا حُسن اس کی شکل کی بناوٹ میں ہے۔

۱۳- خوبصورتی کے مختلف خیال[1] دنیا میں ہیں۔ خوبصورتی کا خیال ہر قوم جدا جدا رکھتی ہے۔ جس چیز کو ایک قوم نہایت بدصورتی سمجھتی ہے، اسی کو دوسری قوم نہایت خوبصورتی۔ گِنی[2] کے ساحل کے رہنے والے سفید چہرے کو حد سے زیادہ بدشکل جانتے ہیں۔ موٹے ہونٹوں اور چپٹی ناک کو بڑی حسانت سمجھتے ہیں۔ بعض قوموں میں لمبے کان، جو کندھے تک لٹکتے ہوں، ان کے نزدیک

۱- یہاں ''خیال'' سے مراد معیار ہے: یعنی ہر قوم میں حسن کے معیار مختلف ہیں۔

۲- گِنی: براعظم افریقہ کا ایک منطقہ جو سینیگال اور کانگو کے درمیان واقع ہے اور تین ملکوں میں منقسم ہے۔

تحسین کے قابل ہوتے ہیں[1] - چین میں اگر عورت کے پاؤں ایسے ہوں کہ جن سے وہ پاؤں سے[2] چل سکے تو اسے چڑیل سمجھتے ہیں - شمالی امریکہ میں بعض وحشی قومیں اپنے بچوں کے نرم سروں کو تختوں میں چاروں طرف سے اِس طرح کَس دیتی ہیں کہ وہ مربّعی[3] بن جاتے ہیں - اہلِ یورپ ان کی اس حماقت پر ہنستے ہیں اور میشنری ان وحشیوں کی عقل کی بڑی خاک اڑاتے[4] ہیں - مگر اپنی خبر نہیں رکھتے کہ ایسے کام وہ اپنے بناؤ سنگار کے لیے کتنے کرتے ہیں -

۱۴- ارسطو کا قول ہے کہ چھوٹے قد کے آدمی خوبصورت نہیں ہوتے ، گو وجیہ[5] و فہیم ہوں - مگر جو آدمی بھاری بھرکم جسم کے ہوتے ہیں اُن کے دماغ میں ایک حُسن ہوتا ہے جو ان کی روح کو بزرگ اور مقدّس بناتا ہے -

۱۵- جو لوگ صورت و سیرت کو جدا کرتے ہیں وہ الزام کے قابل ہیں - اُن کو چاہیے کہ وہ ان میں ہمیشہ وصل و پیوند رکھیں - عقل کی مدح میں ایسے محو نہ ہو جائیں کہ جسم کی خوبصورتی کو بھول جائیں -

۱۶- بعض ملکوں میں حسنِ صورت اور قوّت کے اعتبار سے زمین کی تقسیم کرتے ہیں کیونکہ خوبصورتی اور قوّت انسان کے دل پر اول اثر کرتی ہے - بادشاہ اسی کو بناتے تھے جو حسین اور قوی ہوتا تھا - حسن انسان کی ایسی صفت ہے کہ وہ سب سے اول اوروں

۱- یہ تمام رسوم تاریک دور سے تعلق رکھتی ہیں - موجودہ چین یا امریکہ وغیرہ میں اب اس قسم کی حماقتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا -

۲- "سے" اضافۂ مرتّب -   ۳- مربّعی = چوکور -

۴- خاک اڑانا = ہنسی اڑانا ، تنقید کرنا -

۵- وجیہ = خوش شکل - فہیم = عقل مند -

کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے - یہاں تک کہ وحشی جنگلی آدمیوں کو بھی اس کی طرف رغبت ہوتی ہے - جسم کو انسان کی قدر و منزلت کرانے میں بڑا دخل ہے - حُسنِ صورت کی ایک سفارش ہزار سفارشوں کے برابر ہے -

۱۷- جب سے حُسن پیدا ہوا ہے ، وہ دنیا کو راحت اور رنج دیتا آتا ہے - حکما میں سے ہر ایک نے ایک نہ ایک مقولہ اس کے باب میں کہا ہے - بعض ہم نے پہلے نقل کیے ہیں ، کچھ اور نیچے لکھتے ہیں : ایک حکیم نے کہا کہ حُسن ایک خدا داد چیز ہے ، اس میں خود آدمی کی کوئی خوبی نہیں - دوسرے نے کہا کہ وہ ایک تھوڑی دیر کا جور و ظلم ہے - تیسرے نے کہا کہ وہ ایک خاموش دغا ہے کیونکہ وہ کچھ زبان سے نہیں بولتا ، مگر سب سے کرتا ہے - کسی نے یہ اچھا کہا ہے کہ وہ بادشاہ بغیر سپاہ کے ہے -

۱۸- جن چیزوں کو ہم خوبصورت یا جمیل کہتے ہیں ، ان کے جمال کے مفہوم میں دو باتیں ضرور ہوتی ہیں ؛ اول یہ کہ جب ہم ان کا ادراک حواس سے کریں یا ان کا خیال کریں تو وہ ہمارے دل میں پسندیدہ اثر اور تحریک پیدا کریں - دوم اس اثر یا تحریک کے ساتھ ہم کو یہ متصوّر ہو کہ ان میں کوئی کمال یا خوبی ہے جو اُن کی ذات سے متعلق ہے - ایک جمالِ مطلق ہے ، وہ مخصوص خدا ہی کے ساتھ ہے ؛ نہ جس کی تصویر بن سکتی ہے ، نہ نقل اُتر سکتی ہے - دوسرا جمالِ اصلی ہے جو مظاہرِ قدرت و مناظرِ فطرت و افعالِ بشر میں دکھائی دیتا ہے -

۱۳۴- معاملہ و معاہدہ کرنا

اکثر معاملہ و معاہدہ کرنا زبانی ، بہ نسبت تحریری کے ، اور

تیسرے شخص کی معرفت کرنا ، بہ نسبت خود کرنے کے ، بہتر ہوتا ہے - مگر اس کی یہ مستثنیٰ صورتیں ہیں : تحریری معاملہ کرنا وہاں اچھا ہوتا ہے کہ جہاں ہم اپنی تحریر کا جواب اہلِ معاملہ سے تحریری پائیں ، یا معاملے کی صورت ایسی ہو کہ ہم کو اپنے اثباتِ دعویٰ کے لیے اُس تحریر کو دکھانا پڑے ، یا یہ خوف ہو کہ کوئی خرابی اس میں خلل انداز ہوگی - خود معاملہ کرنا وہاں اچھا ہوتا ہے جہاں اپنی وجاہت کچھ کام آئے ؛ جیسا کہ اکثر اپنے سے چھوٹے آدمیوں کے ساتھ معاملے کے اندر واقع ہوتا ہے - یا ایسے معاملات میں جن میں ضرور ہو کہ آنگلیوں سے کوئی شخص ان کو بتلائے اور اس کی آنکھیں طرفِ ثانی کے چہرے پر اِس طرح پڑیں کہ اس کو ہدایت کریں کہ یہاں تک تو چل - یا ایسے معاملات میں کہ جن میں آدمی کو ، جو الفاظ غلط اُس کی ذات کی نسبت لگائے جائیں ، ان کو قبول نہ کرنا پڑے ، یا اس کے الفاظ کے معنی غلط سمجھے جائیں تو صحیح معنی سمجھانے پڑیں - جب کوئی شخص اپنے معاملات میں تیسرے شخص کو مقرر کرے تو وہ صاف دل ہو اور جو کام اس کو کرنے کو کہا جائے وہ اسے پسند کرے ، اور معاملے میں جو گفتگو ہو اس کی اطلاع سچّی و صحیح دے - یہ نہیں کہ وہ ایسا مکّار ہو کہ اطمینان کی باتیں ایسی بناوے کہ جس سے اس کی حسنِ کار گزاری کا اعتبار ہو اور صرف دھوکا ہی دھوکا ہو - یا ایسا آدمی انتخاب کرے کہ وہ اس معاملے کے لیے لائق اور مناسب ہو اور وہ اس کو دل لگا کے کرے - معاملات میں جہاں کہیں ترغیب دینے کا موقع ہو ، وہاں خوش تقریر آدمی کو مقرر کرے - جہاں کسی امر کی تحقیق منظور ہو وہاں چال باز ، چالاک آدمی - جہاں ردّ و کد و فساد کا احتمال ہو وہاں دلیر و جری - ایسے آدمیوں کو بھی انتخاب کرو جو خوش نصیب

مشہور ہوں ۔ وہ تمھارے معاملات میں پہلے بھی فتح یاب ہو چکے ہوں ۔ ان پر پورا بھروسا ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی کوشش و سعی کریں گے جس کی اُن سے توقع ہے ، تاکہ ان کی[1] پہلی عزت قائم رہے ۔ معاملات کرنے میں اِس کی احتیاط چاہیے کہ ابتدا میں دفعتہً ، بشرطیکہ اُس کی سخت ضرورت نہ ہو ، وہ بات نہ کہو جس کا تمھیں کرنا منظور ہے ۔ چھوٹے چھوٹے سوالات معاملات کی نسبت ابتدا میں کرو ۔ ضرورت مندوں سے معاملہ کرو ، پیٹ بھروں سے نہیں ۔ معاملات کی شرائط ٹھیرانا مشکل کام ہے ۔ ان کی ابتدا کا درست رکھنا بڑی بات ہے ۔ اپنے دل کی باتیں ، جب تک اُن کا وقت نہ آئے ، ہرگز منہ سے نہ نکالو ۔ اُن وسائل کو دیکھتے رہو جو تم پر اثر کریں ۔ اگر معاملہ سیانے اور مکّار آدمیوں سے آن پڑے تو ان کی باتوں پر خوب غور کرتے رہو ۔ اپنی امیدوں کے بر آنے کے لیے صبر کرتے رہو ۔

۱۳۵ ۔ ملازم و دوست

اِتنی قسم کے ملازموں کا رکھنا نہ پسند کرو :

اول جن کے رکھنے سے خرچ زیادہ ہو اور تھیلیاں خالی کرنی پڑیں ۔ ان کے رکھنے سے آدمی طاؤس بنتا ہے کہ دُم بڑھاتا ہے اور بازو گھٹاتا ہے ۔ دوم ایسے ملازم کہ مفسد و بکھیڑیے[2] ہوں ۔ وہ اپنے ہم پیشوں کے ساتھ سلوک کے ساتھ نہیں رہیں گے ۔ سوائے اِس کے اَور طرح طرح کے جھگڑے بکھیڑے کریں گے جس سے عافیت تنگ ہوگی ۔ سوم ایسے ملازم کہ نمودیے[3] اور ڈینگیے ہوں ۔ وہ اپنی نمائش

۱۔ اصل : ان کے پہلے ۔
۲۔ اصل : بکھیڑے ۔ بکھیڑیے = جھگڑالو ۔
۳۔ نمودیے = خود نمائی کرنے والے ۔ ڈینگیے = ڈینگیں مارنے والے ۔

کے لیے تمھاری تعریف کی نفیری بجائیں گے کہ جس سے تمھاری بہت سی باتیں راز نہ رہیں گی اور ناحق تم سے لوگوں کو حسد پیدا ہوگا۔ چہارم، ایسے ملازم کہ جاسوس ہوں کہ تمھارے گھر کے رازوں کو دریافت کر کے افشا کریں اور آوروں کے سامنے تمھاری کہانیاں بنا بنا کے کہیں۔ اکثر ایسے نوکر کار گزار بہت ہوتے ہیں اور آوروں کی کہانیاں وہ تم کو ایسی سناتے ہیں کہ ان سببوں سے تم زیادہ تر اُن پر مہربان ہوتے ہو۔

ملازموں کی عزّت ملازمت کی مشابہت کے اعتبار سے نہیں کرنی چاہیے بلکہ اُن کی لیاقت کے اعتبار سے۔ جب کوئی کڑا وقت آئے تو اُس وقت ایسے ملازم اِس میں کام پر لگاؤ جو مناسب ہوں۔ لائق ہونے کے خیال کو چھوڑ دو۔ جو ملازم یکساں درجہ رکھتے ہیں، ان سب کی خاطر یکساں کرو۔ اگر ایک کی اُن میں سے خاطر زیادہ کرو گے تو وہ گستاخ اور بے ادب ہو جائے گا اور باقی ناراض ہو جائیں گے، کیونکہ اس میں وہ اپنی حق تلفی سمجھتے ہیں۔ پس کسی ایک ملازم کو ایسا سر پر نہ چڑھاؤ کہ وہ تمھارا حاکم معلوم ہو۔ نہ بہت سے ملازموں کو ناراض رکھو۔

اب دوستوں کا حال سنو کہ چند سچّے دوستوں کی صلاح لینی فائدہ مند ہوتی ہے؛ اس واسطے کہ بہت دفعہ دیکھنے والے کو کھیلنے والے سے زیادہ بات سوجھ جاتی ہے۔ گھاٹی سے پہاڑ اچھی طرح نمایاں ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں دوستی بہت کم ہوتی ہے، خصوصاً ہمسروں اور برابر والوں میں تو بہت ہی کم ہوتی ہے۔ مگر عادت یوں پڑ گئی ہے کہ ہم دوستی کو بڑھا کر دیکھتے ہیں۔ دوستی اُن اعلیٰ اور ادنیٰ آدمیوں میں ہوتی ہے جب ان کے اندر دولت و اقبال میں مشارکت ہو۔ دوستی کے مضمون کو پڑھو۔

۱۳۶۔ کتب کا مطالعہ

۱۔ مطالعہ تنہائی و عُزلت میں خوش کرتا ہے۔ گفتگو و تقریر میں حُسنِ بیان پیدا کرتا ہے۔ معاملات کے فیصلہ کرنے اور مقدّمات کے اندر رائے دینے میں قابلیّت کو ظاہر کرتا ہے۔ پس مطالعے سے خوشی و حسنِ بیان و قابلیت ہوتی ہے۔ گو معاملات اور مقدّمات کو تیز و چالاک آدمی بھی فیصلہ کر دیتے ہیں مگر مقدّمات اور منصوبوں کی ترتیب اور عام صلاح کی تدابیر اچھے عالم فاضل ہی کرتے ہیں۔ مطالعے میں بہت سا وقت صرف کرنا مجہول پن ہے۔ مطالعوں کو بہت سا حسنِ بیان میں کام میں لانا نمائش و دکھاوٹ ہے۔ ان کے قواعد کے موافق رائے دینا عالم کے مزاج کا ایک خلط ہے۔ وہ طبیعت کو کامل بناتے ہیں۔ خود تجربے سے کامل ہوتے ہیں۔ فطرتی قابلیتیں مثل قدرتی جنگلی درختوں کے ہوتی ہیں جن کی چھانٹ اور تراش کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود مطالعے بہت سی وسیع ہدایتیں کرتے ہیں، بشرطیکہ تجربے نے ان کو محدود نہ کیا ہو۔ متفنّی آدمی مطالعے کی حقارت کرتے ہیں، سیدھے سادے آدمی ان کی نمائش کرتے ہیں، دانش مند ان کو کام میں لاتے ہیں۔ مطالعہ اپنے استعمال کو سکھاتا نہیں بلکہ مشاہدہ اس کا استعمال بتاتا ہے؛ جس سے ایک دانائی، جو آن سے باہر اور اوپر ہے، حاصل ہوتی ہے۔ تم اس واسطے نہ پڑھو کہ لوگوں کے خلاف باتیں کہیں گے اور ان کی باتوں کو یاد کریں گے، یا سب باتوں کو یقین اور تسلیم کریں گے، یا ہم خود بہت سی باتیں بنائیں گے۔ بلکہ مقصدِ اعظم پڑھنے سے یہ ہو کہ ہم باتوں کو تولیں گے اور سوچیں گے۔ بعض کتابوں کا مزہ چکھا جاتا ہے، یعنی کچھ ان کا حصہ پڑھا جاتا ہے۔ بعض بالکل نگلی جاتی ہیں، یعنی

کل پڑھی جاتی ہیں ، مگر توجہ و غور سے نہیں - بہت تھوڑی کتابیں چبا چبا کے ہضم کی جاتی ہیں ؛ یعنی یہ کتابیں کل بہت توجہ اور غور و خوض سے پڑھی جاتی ہیں - کتابوں کے انتخابات سے جو کتابیں بنتی ہیں ، ان کا حال آبِ مقطّر[1] کا سا ہوتا ہے جو بے مزہ ہوتا ہے - وہ ارزل شمار ہوتی ہیں -

آدمی پڑھنے سے کامل ہوتا ہے - مجالس میں بیٹھنے سے حاضر جوابی کا ملکہ پیدا ہوتا ہے - تحریر سے درست ہوتا ہے - اسی واسطے اگر آدمی کم لکھتا ہے تو اس کا حافظہ زبردست ہونا چاہیے اور اگر مجالس میں کم بیٹھتا ہے تو بڑی ذہانت چاہیے - اگر کم پڑھتا ہے تو ریا کاری بڑی آنی چاہیے کہ جو آدمی نہ جانتا ہو ، اس کو بھی ظاہر کر دے کہ میں جانتا ہوں -

تاریخ کا مطالعہ آدمی کو دانش مند بناتا ہے - نظم کا طبیعت میں جودت پیدا کرتا ہے - علومِ ریاضیہ کا طبیعت کو ذکی بناتا ہے اور علومِ طبیعیہ کا ذہانت کو عمیق - علمِ اخلاق کا سنجیدہ متین - منطق ، علمِ بلاغت و فصاحت کا مباحثہ و مناظرہ کی قابلیت پیدا کرتا ہے - مطالعے کا اثر ضرور انسان کے اوضاع و اطوار و کردار پر ہوتا ہے - انسان کی ذہانت کے لیے کوئی روک ٹوک ہے تو مطالعہ ہی ہے - انسان کے امراض کے جیسے خاص علاج ہیں ، ایسے ہی امراضِ ذہنی کے مخصوص علاج ہیں - پتھری اور گردوں کے خلل کا علاج مُشت بازی[2] ، سینہ و شش[3] کا علاج شکار ، معدے کا علاج سہج سہج قدم چلنا ، دماغ کا علاج گھوڑے پر سوار ہونا اور اِسی طرح کے اَور علاج ہیں -

---

۱- آبِ مقطّر = distilled water -

۲- مُشت بازی سے غالباً مکّہ بازی مراد ہے واللہ اعلم -

۳- سنیہ و شش : کذا -

اسی طرح ذہن میں اگر آوارگی و پریشانی ہو تو علومِ ریاضیہ کا مطالعہ اُس کا علاج ہے کہ[1] اس کے اثبات، ذہانت میں جمعیّت پیدا کر دیں گے اور پریشانی کھودیں گے۔ اگر ذہن بے تمیز ہے کہ وہ دو چیزوں میں تمیز اور فرق نہیں کر سکتا تو حکمت و فلسفہ اس کا علاج ہے۔ اگر ذہن ایسا ہے کہ وہ ایک بات کے ثبوت سے دوسری بات کی توضیح نہیں کر سکتا تو قانون دانوں کے فیصلہ جات کا پڑھنا اس کی دوا ہے۔ غرض امراضِ ذہنی کے ایسے ہی علاج ہوتے ہیں۔

۲۔ مطالعۂ کتب میں تو عاقلوں سے باتیں ہوتی ہیں اور کاروبارِ زندگی کے معاملات میں بے وقوفوں سے۔ جو مطالعۂ کتب ہمارے کاروبارِ زندگی میں کام نہیں آتا، اس کو بیکار نہ جانو اگر وہ ہمارے عقل و فہم کو درست کرتا ہو۔ مطالعہ ہی ایک ایسا فن ہے جو اور فنون کے استعمال کو سکھاتا ہے۔ حضرتِ سلیمانؑ کا قول ہے کہ بہت مطالعہ کرنا جسم کا تھکانا ہے۔

۳۔ دانش مندوں کے کلام کے مطالعے پر جو نوجوان اپنے دماغ کو متوجہ کرے گا تو ابتدا میں مسرّت حاصل ہوگی، پھر دانائی کے ساتھ مواصلت ہوگی۔

۴۔ کسی مطالعے سے مضرّت نہیں ہوتی۔ ہر مطالعے کے ساتھ مسرّت ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ علم کے پیچھے پڑنے سے صحت کو مضرّت پہنچتی ہے، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ کرنے والوں کی عمریں ایسی ہوتی ہیں جیسی کہ اور پیشے والوں کی۔ اس مشاہدے کی صداقت کی شہادت تاریخ بھی دیتی ہے۔ طالب علموں کی باقاعدہ اور آرام کی زیست

۱۔ اصل: جو اس کے۔

صحت و تندرستی کو زیادہ کرتی ہے اور بہت سی تکالیف اور امراض سے بچاتی ہے ، مگر اس کے ساتھ یہ شرط ضرور ہے کہ وہ اپنی فضول حرارتِ جسمانی کو معتدل ورزشِ جسمانی سے کم کرتے رہیں اور جسم کو کاہلی کا عادی نہ بنائیں[1] ۔

۵- آدمی اپنے وقت کاٹنے کے لیے حقّہ پیتے ہیں ، ہُلاس[2] سونگھتے ہیں ، شراب اُڑاتے ہیں اور اِن سے مسرور ہوتے ہیں ۔ اب اس سے سمجھ لینا چاہیے کہ جو لوگ کسی فن یا علم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں اُن کا وقت کیسا خوشی سے کٹتا ہوگا ۔ ابتدا میں جو اِس کے اندر کچھ محنت معلوم ہوتی تھی وہ تفریحِ طبیعت ہو جاتی ہے ۔

۶- جب آسمان پر چاندی کا لمپ چاند کا روشن ہو تو یہ وقت تیرے مطالعے کے لیے اچھا ہے ، کہ تیری کتاب کے صفحوں پر چاندنی پڑے اور تُو اس میں باریک اور تاریک معانی کو دیکھے اور چاند اور ستاروں کی سحرکاری کو سمجھے ۔

۷- نفس کے واسطے مطالعہ ایسا ہے جیسے جسم کے واسطے ورزش ۔ ورزشِ جسمانی سے تنومندی اور تندرستی حاصل ہوتی ہے ۔ مطالعے سے نیکی ، جو روحانی صحت ہے ، ہاتھ آتی ہے ۔ ورزش سے ، جو خاص جسم کی تناوری کے لیے کی جائے ، کچھ تکان ہوتی[3] ہے ۔ ایسا ہی مطالعے سے جو فقط نکوکاری کے واسطے کیا جائے ۔ مگر جب کسی پسندیدہ کام سے مسرّت پیدا ہوتی ہے تو اس کی تکان کی پروا نہیں ہوتی ۔ شکار کھیلنے سے مسرّت و صحّت ایسی حاصل ہوتی ہے کہ اس کی محنت راحت معلوم ہوتی ہے ۔ ایسے ہی تمثیلات و نقل و

۱- اصل : کم کرتا رہے اور جسم کو کاہلی کا عادی نہ بنائے ۔

۲- ہُلاس = نسوار ۔

۳- اصل : ہوتا ہے ۔

حکایات کے نصائح کے مطالعے سے انبساط و صحتِ روحانی حاصل ہوتی ہے اور اس کی محنت کچھ نہیں معلوم ہوتی۔

۸- بعض مطالعہ کرنے والے ایسے[1] ہوتے ہیں کہ متقدمین کی کتابوں کو مطالعے میں رکھتے ہیں جن کا بہت سا حصّہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن جہاں کہیں کوئی مضمون اُن کی سمجھ میں آ گیا تو خوشی کے مارے اُچھل پڑتے ہیں اور کپڑوں میں پُھولے نہیں سماتے۔ ان کی شرح و توضیح میں پھر صفحے کے صفحے سیاہ کرتے ہیں اور متأخّرین پر منہ آن کے اپنا منہ کالا کرتے ہیں۔ ان کا دماغ خالی ہوتا ہے۔ اس میں وہ اور مصنّفوں کے ہزاروں منصوبے پُر کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ بغیر ارسطو کے استناد کے دلیل اندھی ہے اور عقل مندی حماقت[2]۔

۱۳۷- مراسمِ تعظیم و ادب[3]

۱- انسان کی خوش اخلاق کا جزوِ اعظم یہ ہے کہ وہ ظاہر میں مراسمِ تعظیم و ادب و قاعدوں کا پابند ہو۔ جب وہ ان کے برتاؤ میں قصور کرے گا تو اس کے حسنِ اخلاق میں نقصان آ جائے گا۔ بنی آدم اِسی لیے بنائے گئے ہیں کہ وہ بغیر اِن ظاہری مراسمِ ادب، قاعدے کے رہ نہیں سکتے۔ ان[4] کی باطنی خوبیاں بغیر اِن ظاہری رسوم کے خود بخود زائل ہونے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ جب رسوم کثرت سے

۱- اصل: ''ایسے ایتر ہوتے ہیں''۔ لفظ 'ایتر' سمجھ میں نہیں آیا لہٰذا حذف کر دیا گیا۔

۲- یہ جملہ اور اس سے پہلے کی عبارت واضح نہیں ہے۔

۳- اصل میں یہ عنوان یوں تھا: ''مراسمِ تعظیم و ادب کے قاعدے''۔

۴- اصل: اس کی۔

ہو جاتی ہیں اور ان میں تکلّفات بڑھ جاتے ہیں تو وہ بارِ خاطر ہوتی ہیں ۔ بعض[1] آدمی ان کے گھٹانے سے اور ان کے کم ہونے سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر پھر اور رسوم ان کی جگہ قائم ہو جاتی ہیں ۔ جو لوگ ان رسوم کو جلد زائل کرنا چاہتے ہیں ، وہ گٹھیا کا علاج کرچ سے کرنا چاہتے ہیں ۔ ان مراسم کا برتنا حُسنِ اخلاق کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جو روزمرّہ پیش آتی ہیں ۔ انھی سے انسان کی نیکی کا بڑا حصہ ظاہر ہوتا ہے ۔ ان کا حال فائدوں کا سا ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے فائدے ہی تھیلیوں کو بھاری کرتے ہیں ۔ بڑے بڑے فائدے گاہے ماہے ہوتے ہیں ۔ ایسے ہی آدمی کو اپنے حُسنِ اخلاق کی اعلیٰ نیکیوں کے اظہار کا موقع شاذ و نادر ہی ملتا ہے ، مگر ان رسموں کا برتاؤ روزمرّہ درپیش رہتا ہے ۔ وہی انسان کی نیک چلنی کے سفارشی خطوط ہیں جو اوروں سے اچھی طرح ملاتے ہیں ۔ ان رسوم کے پابند نہ ہونے سے تکلیف پہنچتی ہے اور ان میں بہت تکلّفات کرنے سے تصنّع کا شبہ ہوتا ہے ۔ اصلی باطنی اخلاق کے اظہار کی علامات یہ رسومِ ظاہری ہوتی ہیں ۔ دونوں میں سے ہر ایک کا ترک کرنا یکساں اندیشہ ناک ہے ۔

بعض آدمی کہتے ہیں کہ جس شخص کی سلامتی ہم دل سے چاہتے ہیں ، اس سے سلام علیک کرنا ضرور نہیں ۔ جس شخص سے دل میں محبت ہو اُس کے پاس محبّت نامہ بھیجنے کی ضرورت نہیں ۔ مگر یہ فقط ایک خیالی ڈھکوسلا ہے جس پر عمل نہیں ہو سکتا ۔ دوستی خواہ کیسی ہی صدقِ دل سے ہو مگر اس میں رسومِ ظاہری کا برتاؤ لازمی ہے ۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ سچّے دوستوں میں رسوم کے تکلّفات نہ

۱۔ اصل : تو بعض آدمی ۔

ہوں - ہمسروں اور برابر والوں سے رسومِ ظاہری برتنے چاہئیں - ادنٰی آدمیوں سے بے تکلّف ملنا چاہیے، مگر یہ خیال رہے کہ ان رسوم کے برتاؤ میں اپنے تئیں آدمی ارزل[1] نہ بنائے اور کوئی بات ایسی نہ ہو کہ جس سے لوگ اُس پر خوشامدی ہونے کا شبہ کریں - دانش مند یہ نہیں چاہتا ہے کہ اُس کی یہ شہرت ہو کہ وہ بڑا خُلقِ ظاہری رکھتا ہے - اور اُس کے خُلق کا حال کپڑوں کا سا ہے کہ جیسا موسم ہوتا ہے ویسے ہی پہنتا ہے؛ یعنی جیسا موقع ملتا ہے ویسا خُلق بنا لیتا ہے - اس امر میں کوشش کرنی کہ لوگ مراسمِ آداب و تعظیم کے پابند نہ رہیں، یہ چاہنا ہے کہ لوگ ہمارا ادب نہ کریں -

۲- صورت کا خندہ پیشانی ہونا نیک دلی کے لطف کو بڑھا دیتا ہے - جب ہم عوام کی تقلید بول چال میں کرتے ہیں تو وضع و انداز میں کیوں نہ کریں - جو شخص روزمرّہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں رسوم کے موافق شائستگی نہیں برتتا، وہ بڑا آدمی تو ہو سکتا ہے مگر تم یقین کر لو کہ وہ دانش مند نہیں ہو سکتا، مگر کبھی کبھی - نیکی اور دانائی بغیر مراسم کے برتاؤ کے ایک اجنبی زبان ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی - مراسم کا برتنا اپنی نیکی کا اپنی زبان میں ترجمہ کرنا ہے جس کو سب سمجھتے ہیں - انسان میں جو باتیں بالطبع بے تکلّف ہوتی ہیں وہ پسندیدہ ہوتی ہیں، جو تکلّف و تصنّع کے ساتھ ہوتی ہیں وہ مکروہ ہوتی ہیں - آدمی رخساروں پر گُلگونہ ملے، زلفوں کو بل دے، مگر اپنے اوضاع و اطوار کو نہ رنگے، نہ بل دے - جو شخص ذرا ذرا سے مراسم پر گردن جھکاتا ہے وہ عالی خیال نہیں ہوتا - جو تصنّع و بناوٹ کرتا ہے وہ آزادی کو سڑاتا ہے -

---

۱- ارزل = بہت رزیل، بہت کمینہ -

۳- دنیا کے مراسمِ ادب و قاعدے بے فائدہ نہیں ہوتے - وہ اگرچہ دوستی کی گرم جوشی کا ایک حصّہ لے لیتے ہیں مگر سرد مہری کو بالکل چھپا دیتے ہیں -

۴- بہت سے آدمی جو خدا پرستی میں مراسمِ ظاہریِ عبادت کو منظورِ نظر رکھتے ہیں ، وہ کپڑوں کو بجائے جسم کے اور الفاظ کو بجائے معانی کے اور میان کو بجائے تلوار کے اور پوست کو بجائے مغز کے دیکھتے ہیں - وہ کسی کام کے بندگانِ خدا نہیں ہوتے -

۵- یہ مراسمِ آداب بھی بہت سے آدمیوں کو بیوقوف بناتے ہیں - امیر آدمیوں کی ملاقات کو سخت تکلیف بناتے ہیں - چہروں کو زرد کرتے ہیں ، ہاتھ پاؤں میں رعشہ ڈالتے ہیں اور ایسے ہی ناحق خوف اور دلاتے ہیں -

۶- اِن رسوم کا حال کھوٹ بھرے سکّے کا سا ہے کہ وہ جس حاکم کے حکم سے بنتا ہے اُسی کے ملک میں چلتا ہے اور کھرے سکّوں کا کام ہر کام میں دیتا ہے - لیکن اگر اُس کو کہیں باہر لے جاؤ تو وہ بالکل نکمّا ہے - جو اس کو غیرملک میں چلانا چاہتا ہے اُس پر لوگ ہنستے ہیں یا اس کو مجرم بناتے ہیں - وہ شخص بڑا بھلامانس اشراف ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ کن خصوصیّاتِ قومی کی ، جو اس میں بڑے ادب قاعدے کے ساتھ برتی جاتی ہیں ، عزّت کرنی چاہیے اور کن کی ذلّت - جن شاعروں کا مذاق صحیح ہوتا ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ عقل مند سب جگہ خوش اخلاق ہوتے ہیں ، مگر احمق صرف اپنے گھر میں -

۷- رسوم چیزوں کے برقرار رکھنے میں وہی کام کرتی ہیں جو ظرف شراب اور پانی کے رکھنے میں - اگر ظرف نہ ہوں تو پانی اور

شراب دونوں کیھنڈ[1] جائیں ۔

۸- مراسمِ ادب عقل مندوں کا ایجاد اس لیے ہے کہ احمق فاصلے پر دُور رہیں ، مگر عالی نسبی احمقوں اور عاقلوں کو برابر کر دیتی ہے[2] ۔

۱۳۸- تعریف

۱- نیک آدمیوں کی تعریف ایسی ، عوام الناس ، نہیں کرتے جیسی کہ نمودیے اور ڈینگیے آدمیوں کی ۔ اور یہ تعریف ان کی جھوٹی اور ارزل ہوتی ہے ۔ عمدہ نیکیوں کا سمجھنا اُن کے فہم سے پرے ہوتا ہے ۔ وہ ادنٰی درجے کی نیکیوں کی تعریف کیا کرتے ہیں ؛ جیسے کہ مہماں نوازی ، فیّاضی ، احسان کرنا ، خوش مزاجی ، لوگوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا ، اور اِسی طرح کی باتیں ۔ متوسّط درجے کی نیکیوں کی تعریف وہ متحیّر ہو کے کرتے ہیں ؛ جیسے کہ شجاعت ، استقلال ، دوستوں کے ساتھ وفاداری میں ثابت قدمی ، اپنے گروہ و جتھے کی پَچ ۔ اعلٰی درجے کی نیکیوں کو وہ سمجھتے ہی نہیں کہ کیا ہوتی ہیں ؛ جیسے کہ خود غرض نہ ہونا ، عام بھلائی کے لیے کمر باندھنا اور عوام کی بُرائی کو دور کرنا ، عدالت میں کسی کی رُو رعایت نہ کرنا ، ایسا راستی دوست ہونا کہ دوستوں کے ساتھ جھوٹی باتوں میں نہ شریک ہونا ، عوام کی ناپسندی کا خیال نہ کرنا ۔ ایسی نیکیوں کو عوام الناس نہیں سمجھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک جو شخص یاروں کے

۱- کیھنڈ جانا = بِکھر جانا ۔

۲- یعنی عالی نسب آدمی احمق ہونے کے باوصف چونکہ محض اپنی عالی نسبی کی بنا پر مراسمِ ادب سے واقف ہوتا ہے لہٰذا مراسمِ ادب کو عقل مندی اور حماقت کی کسوٹی قرار نہیں دیا جا سکتا ۔

ساتھ جھوٹی باتوں میں نہیں شریک ہوتا، وہ بے وفا، بے مروّت ہوتا ہے - اگر کوئی عدالت کے موافق کسی اپنے دوست کو سزا دلانے میں رُو رعایت اس کے ساتھ نہیں کرتا ہے تو اُس کو پاجی جانتے ہیں - غرض وہ ایسے نکوکاروں کو صد ہا گالیاں بے نُقط سناتے ہیں اور دل سے ان کو بے ایمان، سنگ دل، مکّار، جھوٹا جانتے ہیں - کاموں کا اچھا برا ہونا آدمی کی نیّت پر موقوف ہے - نیک نیّتی اور بدنیّتی دونوں سے ایسے کام ہوتے ہیں جن کی صورت ایک سی ہوتی ہے؛ مثلاً ایک ظلم کے کام میں، جس کے اندر جرأت و ہمّت کی ضرورت ہو اور تکلیف بھی اٹھانی پڑے، کوئی شخص نہ شریک ہو تو اس کے نہ شریک ہونے کے دو سبب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ وہ نامرد ہو، دوم یہ کہ اس کو عدالت کا ایسا پاس ہو کہ وہ ظلم کے پاس نہ جاتا ہو؛ تو جو لوگ اعلیٰ درجے کی نیکی نہیں سمجھتے وہ اس کا سبب بُرا ٹھہرا کے اُس آدمی کی مذمّت کرنے لگیں گے - ایسے تھوڑے ہی آدمی ہوں گے کہ وہ یہ جانیں گے کہ صرف عدالت کی نیّت سے وہ اس میں نہیں شریک ہوا - یا ایک شخص مذہب میں متعصّب نہ ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ ایک شخص مذہب سے بے پروا ہو، دوسرے یہ کہ ایک شخص یہ جانتا ہو کہ سچّے مذہب میں تعصّب نہیں ہوتا - پس ایسے آدمی پر عوام لا مذہبی یا بد مذہبی کا الزام لگائیں گے کیونکہ وہ مذہب میں خیالاتِ بلند نہیں رکھتے - جیسا شیشے میں[1] جسم ہوتا ہے، ویسا ہی اُس سے انعکاسِ شعاع ہوتا ہے - اِسی طرح جیسے آدمیوں کی نیکی ہوتی ہے، ویسے ہی ان سے تعریف کا

۱- اصل میں یہ جملہ یوں چھپا ہوا تھا: "جیسا شیشہ یا جسم ہوتا ہے ویسا ہی اُسے انعکاسِ شعاع ہوتا"۔ تصحیحِ قیاسی سے عبارت کو موجودہ شکل دی گئی -

انعکاس ہوتا ہے -

نام وری ایک دریا ہے کہ جس کی[1] سطح کے اوپر ہلکی چیزیں نمایاں ہو کر تیرتی پھرتی ہیں اور بھاری چیزیں تہہ پر بیٹھ جاتی ہیں - اگر صاحبِ لیاقت اور اہل الرائے کسی شخص کی تعریف کرنے میں متفق ہوں تو اس پر یہ آیت[2] صادق آئے گی کہ نیک نامی مہنگ مولی عطر سے اچھی ہوتی ہے - عطر کی خوشبو چاروں طرف پھیلتی ہے اور پھولوں کی خوشبو سے زیادہ دیر پا ہوتی ہے - جھوٹی تعریفیں خواہ کسی طرح ہوں ، اُن میں آدمی کو شبہ ہی رہتا ہے - بعض دفعہ تعریف صرف خوشامد کے سبب سے ہوتی ہے اور پھر خوشامد کرنے والے بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں - کوئی معمولی ہؤا تو ہر ایک شخص کی خوشامد کرے گا اور اپنی صفاتِ رزیل کو دکھائے گا اور اگر کوئی متفنّی مکار ہوگا تو وہ جانچ کر ایسی تعریف کرے گا جیسی کہ آدمی خود اپنی تعریف کرتا ہے - سب سے بڑا خوشامدی آدمی کا اپنا آپا ہے - پس جن خوبیوں کو آدمی اپنے آپ میں اچھی سمجھے ہوئے بیٹھا ہے ، وہ اُنھی کی ستائش و تحسین کرے گا - اور اگر کوئی اناڑی خوشامدی ہؤا تو وہ تعریف بھی ایسی اَن گھڑ کرے گا کہ آدمی کے دل کو وہ گوارا نہ ہوگی - وہ خود جان جائے گا کہ اُن عیبوں کی وہ تعریف کرتا ہے جو مجھ میں بھرے ہوئے ہیں -

بعض تعریفیں نہایت قابلیت اور لیاقت اور ادب و تعظیم کے ساتھ اُمرا اور سلاطین کی کی جاتی ہیں - جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ایسے

۱- اصل : جس کے -

۲- اگر یہ اصطلاحاً آیت ہے تو پھر انجیل مقدّس کی آیت ہوگی بصورتِ دیگر یہاں آیت سے ضرب المثل مراد ہوگی -

اور ایسے ہو تو اس سے یہ غرض ہوتی ہے کہ تم کو ایسا ہونا چاہیے، اس لیے یہ تعریف تعلیم ہوتی ہے۔ بعض دفعہ تعریف دشمنی کے سبب سے ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ دشمنوں کو منظور ہوتا ہے کہ اپنے دشمنوں کی تعریف کرکے لوگوں کے دلوں میں حسد اور دشمنی ان کی طرف سے پیدا کریں۔ یہ تعریف سب سے بد تر ہے جو دشمن کرتے ہیں۔ اہلِ یونان کے ہاں ایک ضرب المثل ہے کہ جس شخص کی تعریف اُس کی ضرر رسانی کے واسطے کی جائے، اُس سے یہ بہتر ہے کہ اس کی ناک کے اوپر پھوڑا نکل آئے۔ جیسے انگریزی میں ضرب المثل ہے کہ جو شخص جھوٹ بولے، اُس سے یہ بہتر ہے کہ اس کی زبان پر پھنسی نکل آئے۔ جو تعریف جاہلانہ نہ ہو اور اعتدال کے ساتھ موقع پر کی جائے تو اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ حضرتِ سلیمان[۴] نے فرمایا ہے کہ وہ جو صبح سویرے اُٹھ کے اپنے دوست کے حق میں بلند آواز سے دعاے خیر کرتا ہے اس کے لیے یہ ایک لعنت محسوب ہوگی۔ جب کسی آدمی کی ستائش بڑی دھوم دھام سے کی جاتی ہے تو اُس کی ایک نقیض و ضد پیدا ہوتی ہے، یعنی نفرین اور حسد۔

خود ستائی شائستگی کے خلاف ہے (گو اس کی خاص صورتیں مستثنٰی ہیں) مگر اپنے عہدے اور پیشے کی ستائش نہایت خوبی اور عمدگی سے آدمی کر سکتا ہے۔ زاہد، صوفی طبع تمام دنیا کے کاموں پر، خواہ کیسی شان و شکوہ کے ہوں، تبّرا بھیجتے ہیں اور اپنے پیشے کو سب سے اعلیٰ درجے کا بتلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا کی سلطنت، حکومت، سفارت، سطوت، امارت سب خاک ہیں؛ باوجودیکہ جیسے اچھے کام اُن عہدہ داروں سے ہوتے ہیں، ایسے اُن سے نہیں

ہوتے۔ پولوس[1] مقدّس نے اپنا ذکر کیا تو کہا ”میں حماقت سے بولتا ہوں“۔ جہاں اپنی خدمتِ رسالت کا بیان کیا تو کہا کہ ”میں اپنی خدمت کی بڑائی کرتا ہوں“۔

۲۔ لوگوں کی رضامندی تعریف پیدا کرتی ہے، سلطنت جاہ و منصب عطا کرتی ہے اور آزادی تعریفیں۔ آوازِ خلق میں کوئی چیز خدائی ہوتی ہے (آوازۂ خلق نقّارۂ خدا) کیونکہ بغیر اس کے ایک مطلب پر اِتنے آدمیوں کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔ بڑے آدمیوں کی نسبت اگر عوام سچ زیادہ بولیں تو کچھ تعجّب نہ کرو، کیونکہ وہ زیادہ سلامتی کے ساتھ بولا کرتے ہیں۔ شہرت بُرا قاصد اور بدتر جج ہوتا ہے۔ تعریف کچھ استحقاق پر موقوف نہیں ہوتی، بلکہ سچّے آدمیوں کی بہ نسبت نمائش کاروں کی زیادہ تعریف ہوتی ہے، کیونکہ وہ بڑی نمائش سے اپنے تئیں دکھاتے ہیں۔

۳۔ وہ تحسین شیریں ہے کہ اُن لوگوں کے منہ سے نکلے جو خود قابلِ تعریف ہیں اور بڑی قابلیّت اور لیاقت رکھتے ہیں۔ ایک شخص نے ایک آدمی سے کہا تھا کہ آپ کی تعریف سے اس لیے خوش ہوتا ہوں کہ ساری دنیا آپ کی تعریف کرتی ہے۔ اپنے منہ سے اپنی تعریف نہیں کرنی چاہیے، بیگانے آدمیوں کے لب و دہن سے وہ نکلنی چاہیے، جس سے آدمی کو خوشی ہو۔ آدمی جتنا ذکر اپنا کرتا ہے، اُتنا ہی

۱۔ پولوس مقدس: اس کا پہلا نام شاول تھا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور عیسائیوں کو، جنھوں نے حضرت عیسیٰؑ کا مذہب قبول کر لیا تھا، بہت تنگ کیا۔ ۳۳ عیسوی میں دمشق میں مرتد ہوا اور تین سال تک شمالی جزیرۃ العرب میں مارا مارا پھرتا رہا۔ دو مرتبہ یروشلم میں قید ہوا، بالآخر ۶۷ عیسوی میں اسے روم میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے تیرہ خطوط مشہور ہیں جو اُس نے اپنے مختلف پیروکاروں کو لکھے تھے۔

جھوٹ بولتا ہے۔

۴۔ مرنے سے ایک مدّت کے بعد آدمی کو اپنی تعریف کا وہ حصّہ مل جاتا ہے جس کا استحقاق اس کو ہوتا ہے، ورنہ زندگی میں تعریف میں دوست مُسرف اور دشمن بخیل ہوتے ہیں۔

۵۔ کسی شخص کو اِتنا منہ نہ لگاؤ کہ وہ تمھارے منہ پر تمھاری تعریف کرے، اس لیے کہ اُس سے قدر و منزلت کی آرزوے دلی تو سیر ہو جائے گی مگر شیخی و نمود بھوکی رہ جائے گی۔

۶۔ تعریف کا اثر دلوں پر مختلف ہوتا۔ دانش مند کے مزاج میں وہ اعتدال پیدا کرتی ہے۔ احمق کو وہ زیادہ متکبّر و مُدمّغ[1] بنا دیتی ہے۔ آفرین و تحسین میں بڑی قوّت ہوتی ہے، وہ تعریف کے قابل کاموں کی طرف تحریک کرتی ہے اور مہمّاتِ عظیم کے انصرام میں تازہ دم بنا دیتی ہے۔

۷۔ جو تمھارے افعال و اقوال کی تعریف کریں اُن کو اپنے ساتھ وفادار نہ جانو، بلکہ جو تم کو تنبیہ کریں اُن کو وفادار سمجھو۔ جب کوئی شخص تمھاری تعریف کیا کرے تو اس کی رائے پر شبہ کیا کرو اور جب کوئی تم پر لعنت ملامت کیا کرے تو اپنی رائے پر شبہ کیا کرو۔

۸۔ تعریف ابتدا میں مثل ایک عزیز کے معلوم ہوتی ہے، مگر جب اُس کی بوچھاڑ چاروں طرف سے ہوتی ہے تو وہ ایک قرض ہو جاتا ہے جس کو لیاقت ہی ادا کر سکتی ہے۔

۹۔ اصلی تعریف مثل اُور سچّی باتوں کے ہوتی ہے کہ وہ تحقیقاتِ

۱۔ مدمّغ = صاحبِ دماغ کو بھی مدمّغ کہتے ہیں مگر یہاں بد دماغ مراد ہے۔

کامل سے ثابت ہوتی ہے، مگر جھوٹی تعریف تحقیقات سے گھبراتی ہے۔ سچّی تعریف کرنے والا اور قبول کرنے والا دونوں خوش ہوتے ہیں ۔ جھوٹی تعریف کرنے والا اور قبول کرنے والا دونوں شرمندہ ہوتے ہیں ۔

۱۰۔ جس شخص کو یہ شوق ہوتا ہے کہ عوام میری تعریف کریں ، وہ بہت ناخوش رہتا ہے ۔ جاہل آدمی کسی لائق آدمی کی لیاقت کے اچھے جج نہیں ہو سکتے ۔ وہ تو یہ اپنی مہربانی جانتے ہیں کہ تعریف کرتے ہیں ۔ یہ مہربانی ان کی اُلٹی اُن کو دے دینی چاہیے۔ اُن کی تعریف سے خوش ہونا کم ظرفوں اور نالائقوں کا کام ہے ۔ وہ اکثر حکومت اور دولت کی تعریف کیا کرتے ہیں جو ایک کے ہاتھ سے دوسرے کے ہاتھ میں جاتی رہتی ہے ۔ جو انسان کے اصلی جوہر اور ذاتی ہنر ہیں ، ان کو وہ جانتے ہی نہیں ۔ نیکی کی تعریف عاقل اور دولت کی ستائش جاہل کیا کرتے ہیں ۔ کسی نیک اور لائق آدمی کو اپنی نیکی اور لیاقت کا کسی ایسے آدمی کی تعریف سے بڑھانا ، جو اُس جیسا نہ ہو ، ایسا ہے جیسے کہ کسی دولت مند آدمی کا کسی مفلس سے قرض مانگنا ۔ لائق آدمی عوام کی تعریف کی وقعت ذرا نہیں کرتے ۔ ہاں کوئی لائق آدمی تعریف کرے تو اسے اپنی تعریف سمجھتے ہیں ۔ خدا پرست اُسی تعریف کو تعریف جانتے ہیں جو اُن کی کونشنس (ضمیر) کرے ۔

۱۱۔ عوام الناس اِسی غلطی میں پڑے ہوئے ہیں کہ انسان کامل ہوتا ہے ۔ پس جن کو وہ اپنے عقیدے کے موافق کامل سمجھتے ہیں ، جب اُن کا کوئی سچا عیب بتایا جاتا ہے تو بتانے والے کو برا کہتے ہیں ۔ خدائے تعالیٰ نے انتظامِ گیتی میں یہ نہایت عمدہ انتظام رکھا ہے کہ ایک شخص کو تمام کمالات میں کامل نہیں کرتا ۔ جب کوئی شخص ایک کام میں کامل ہوتا ہے تو دوسرے کام میں ناقص ہوتا ہے اور

اِس دوسرے کام میں کوئی دوسرا شخص کامل ہوتا ہے - اِسی سے دنیا کا کام چلتا ہے اور ایک انسان دوسرے انسان کے کام آتا ہے - بالکل اس کا حال تجارتِ اشیا کا سا ہے کہ ایک چیز ایک ملک میں نہایت عمدہ ہوتی ہے اور دوسرے ملک میں خراب یا بالکل نہیں پیدا ہوتی - تجارت سے دونوں ملکوں کو فائدہ ہوتا ہے - ایک ملک کا پیداوار دوسرے ملک میں جاتا ہے - اِسی طرح جب ایک آدمی کا ذہن ایک اَور قسم کا ہوتا ہے ، دوسرے آدمی کا دوسری قسم کا ، تو ان کے درمیان باہم خیالات کا مبادلہ ہوتا ہے - کسی کا ذہن تیز ہے ، کسی کی رائے سلیم ہے ، ان دونوں کے ملنے سے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہیں -

بت پرستوں کے یہاں قاعدہ تھا کہ جب وہ کسی انسان میں کسی ایک بات کا کمال دیکھتے تھے تو اس کو کامل سمجھ کر دیوتا اور بزرگِ کامل جانتے تھے اور اس کی کسی برائی کی مذمّت نہیں کرتے تھے - مگر اب اس کے برخلاف زمانہ ہے کہ اگر ایک انسان میں سو ہنر ہوں اور ایک عیب ہو تو اس عیب سے لوگ چشم پوشی نہیں کریں گے - ہزار نیکیوں پر خاک ڈال کر اُس کی ایک بدی کو گاتے پھریں گے - بت پرستوں کی یہ دانش مندی تھی کہ وہ صرف ایک کمال کے سبب سے صاحبِ کمال کے نام کو بقاے دوام دیتے تھے - مگر اب بہت سے نیک کام کرنے والوں کو صرف ایک برائی کے سبب سے بدنام کرتے ہیں - ہجو کرنے والے تو کسی شخص کی برائی کو مبالغے سے بیان کرتے ہیں مگر بدنام کرنے والے نیک ناموں کی نیکیوں کو ملیامیٹ کرنا چاہتے ہیں - اور لوگ اُن کی معاونت ایسی کرتے ہیں کہ جس سے اُن کو اس کام کے کرنے کی جرأت ہوتی ہے - جو نیک ناموں کو بدنام کرتے ہیں وہ بڑے فرومایہ و سفلے و کمینہ و پاجی ہیں -

وہ نیک لیاقتوں سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ قاتل اور مجسٹریٹ میں جو فرق ہوتا ہے، وہی نیک نام اور بد نام کرنے والے میں ہوتا ہے۔ ہجو میں جو حروف لام کاف بولتے ہیں اور حرفوں کو ملا کر الفاظ و فقرے بناتے ہیں، ان میں نہ کوئی سچّی بات ہوتی ہے، نہ کچھ ان میں معانی ہوتے ہیں، نہ کوئی ظرافت ہوتی ہے۔ جو ہجو میں ہنر کو خاکروب بنا کے اُس کے سر پر غلاظت کا ٹوکرا رکھتے ہیں، وہ اہلِ ہنر کے نزدیک کوچۂ ہنر میں گھاس سے زیادہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ بد شعار جو نیک ناموں کی بد نامی کرتے ہیں وہ تھوڑے دنوں میں کسی کو یاد نہیں رہتی، لیکن اُن کی بد ذاتی ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ جن لوگوں کی ہجو ہوتی ہے اُن کو اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ اس کا کتنا حصّہ سچ ہے۔ تعریف جس کا استحقاق نہ ہو، اُس سے نالائق، ریاکار اور بدکار خوش ہوتے ہیں۔ اور صاحبِ لیاقت اُس مذمّت سے، جس کے وہ مستحق نہیں ہوتے، کچھ خوف نہیں کرتے۔

جو درحقیقت سچّے اور نیک ہیں اُن کو اپنی نیکی پر توجہ چاہیے، بد نام کرنے والوں کی مذمّت اور ہجو پر کچھ خیال نہیں چاہیے اور نہ ان سے رنجیدہ ہونا چاہیے۔ اگر ہم اس بات کو نہ قبول کریں گے تو سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہیں کہ ایک کونے میں بیٹھیں، جس کو دل کب قبول کر سکتا ہے۔ اِس کا کوئی علاج ہی نہیں کہ ہم لوگوں کے طعن و اعتراض سے بچ سکیں۔ سکندر کا ذکر ہے کہ وہ ایک وحشت ناک جنگل میں بڑی کٹھن منزلیں کاٹتا ہوا ایک چشمے پر پہنچا اور وہاں بیٹھ کر کہنے لگا کہ میں کیسی تکلیفیں اپنے اوپر گوارا کرتا ہوں، اس لیے کہ ایتھنز والے مجھے اچھا کہیں۔ اہلِ ایتھنز سکندر کے دشمن تھے۔ علم اُن کا مشہور تھا۔ وہ سکندر کی ہجو کیا کرتے تھے اور صاف کہا کرتے تھے کہ وہ ہمارے جان و مال،

عزّت و آبرو کا دشمن ہے۔

طبیعتِ بشری کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنی شہرت اور نیک نامی کو دل سے چاہتا ہے۔ پس ہر معزّز اور اشراف کا کام ہے کہ شرفا کا پاسِ عزّت و ناموس کرے۔ جیسے مکان جلتا ہے تو اس کی آگ بجھانے کے واسطے سارے ہی آدمی دوڑتے ہیں، اسی طرح جب کسی نیک نام کی بدنامی ہو تو اس کی حمایت کے لیے سب کو سعی اور کوشش کرنی چاہیے۔ جس نیک نامی کا وہ مستحق ہے اس کو برباد نہ ہونے دینا چاہیے۔

۱۲۔ سچّی تعریف: بعض دانش مندوں کی رائے یہ ہے کہ کسی کی سچّی تعریف کی جائے تو رمز و کنایہ کے ساتھ ہو، صراحت کے ساتھ نہ ہو۔ روم کے جلسۂ سینٹ میں اموراتِ ملکی میں مباحثہ ہو رہا تھا کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر نہایت سنجیدگی سے بیان کیا کہ سلطنتِ جمہوری کے اعزاز و اکرام کے واسطے ٹائی بیرس[1] خدا سمجھا جائے اور اس کی پرستش خدا کی سی کی جائے۔ سینٹ یہ سن کر نہایت متحیّر ہوا اور اِسی مضمون کو اُس نے یوں ادا کیا کہ سلطنتِ جمہوری کے معاملے میں وہ کسی انسان کا محکوم نہیں۔ ڈیوک بکنگھم نے لارڈ لاری سے کہا کہ تم پر یقینی لعنت ملامت ہوگی۔ لارڈ نے کہا کہ میں کیا برا کام کرتا ہوں کہ مجھ پر تبرّا ہو۔ اِس پر ڈیوک نے یہ انجیل کی آیت پڑھی کہ ”جس کو سب اچھا جانتے ہیں، اُس پر لعنت ہوگی“۔ ایک امیر نے کسی شخص کو ایک اعلیٰ درجے کا عہدہ عطا کیا۔ جب وہ اُس اپنے محسن کا شکرگزار ہو کے کہنے لگا

۱۔ ٹائی بیرس: (۴۲ ق م–۳۸ع) روم میں پیدا ہوا۔ دوسرا رومی بادشاہ اور آگسٹس کا بیٹا۔

کہ آپ کا احسان میرے اوپر پرلے درجے کا ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ، اِس پر اُس فیّاض محسن نے کہا کہ میرا احسان تم پر ذرا بھی نہیں ۔ اگر تم سے کوئی اَور آدمی زیادہ لائق ملتا تو تم کو اس عہدے پر مَیں ممتاز نہ کرتا ۔ اس رمز و کنایہ کی تعریفوں میں دیکھو کہ کیا لطف آتا ہے ۔

۱۳۹۔ نمائشِ عظمت و شان

۱۔ حکایاتِ لقمان میں لکھا ہے کہ گاڑی کے پہیے کی دُھری پر ایک مکھّی بیٹھی اور کہنے لگی کہ دیکھو مَیں کتنی خاک اُڑاتی ہوں ۔ بعینہٖ یہ حال اُن لوگوں کا ہے جو اپنی یہ تعلّی و تشخّص کر رہے ہیں کہ ہم نے اپنی جُوتیوں کے صدقے سے فلاں فلاں ادنٰی ادنٰی آدمیوں کو عالی جاہ بنا دیا ہے ؛ باوجودیکہ اُن کے عزّ و جاہ کے بڑھانے میں ذرا بھی ان کو دخل نہیں ہوتا ۔ وہ اپنے اَور وسائل سے بڑھتے ہیں ۔ جن شخصوں کی عادت میں تعلّی ہو جاتی ہے وہ جھگڑالُو ضرور ہو جاتے ہیں ، کیونکہ تعلّی میں ضرور ہے کہ اپنی برتری کو اَوروں پر دکھائیں ۔ اس لیے اپنے ہمسائے کا فرو تر ہونا دکھاتے ہیں تو ان سے جھگڑا کھڑا ہوتا ہے ۔ اور وہ اپنی بے اصل شان کے دکھانے میں بڑا تشدّد کرتے ہیں ۔ کوئی خوبی ان میں مخفی نہیں ہوتی اس لیے ان کے کام بے اثر بہت ہوتے ہیں ۔ فرانسیسی ضرب المثل ہے کہ ”جہاں غل بہت ہے وہاں پھل تھوڑا ہے“۔ پس جو اپنی خوبیوں کی ڈینگیں بہت مارتے ہیں وہ کچھ مال نہیں ہوتے ۔ مگر معاملاتِ ملکی میں جو لوگ اپنے[1] اوصاف کی نفیری بجاتے ہیں اِس سے بڑی دھوم دھام اُن کی

۱۔ اصل : اپنی اوصاف ۔

ہو جاتی ہے ۔ ایسے موقعوں پر تعلّی اور ہیر پھیر کی[1] جھوٹی باتوں سے بڑے کام نکل آتے ہیں ۔ جیسے کوئی شخص دو بادشاہوں کے درمیان معاہدہ کراتا ہو تو دونوں بادشاہوں کی فوجوں کی ایک دوسرے کے سامنے بڑے مبالغے سے تعریف کرتا ہے ۔ یا دو آدمیوں میں باہم معاملہ کراتا ہے تو ہر ایک کے سامنے ایسی باتیں بناتا ہے کہ جس سے اس کا اعتبار بڑھے اور ہر ایک یہ جانے کہ وہ میرا بڑا خیر خواہ ہے ۔ ایسی جھوٹی باتوں سے کوئی نہ کوئی بات معدوم سے موجود ہو جاتی ہے جس[2] پر لوگ رائے لگا کے ایک اصل بات کھڑی کر دیتے ہیں ۔

سپہ سالاروں اور سپاہیوں کے لیے تو نمائشِ شان اور تعلّی ایک ضروری بات ہے ۔ جیسا لوہا لوہے کو کاٹ دیتا ہے ، ایسے ہی ایک بہادری کی نمائش دوسرے پر اثر کرتی ہے ۔ ایسے آدمیوں کا اجتماع کہ جن کی طبیعتیں تعلّی کی خوگر ہوتی ہیں ، مہمّاتِ عظیم میں جان ڈال دیتا ہے ۔ شہرتِ علمی کے[3] بھی جب تک نمائش و نمود کے شہپر نہ لگائے جائیں وہ پرواز نہیں کرتی ۔ وہ مصنّف جو کتابیں ایسی تصنیف کرتے ہیں جن میں نمائشِ شان کے[4] ذلیل جاننے کو فرض بتلاتے ہیں ، کتابوں[5] کے اول صفحے پر اپنا نام اور دیباچے میں ایک دو باتیں تعلّی کی ضرور لکھتے ہیں ۔ غرض مصنّف تو اگر اپنی عظمت و شان کی نمائش نہ کریں تو کوئی ان کو پوچھے بھی نہیں ۔ یہ نمائشِ شان اُن پر وارنش کر کے خوب چمکا بھی دیتی ہے اور مضبوط بھی کر دیتی ہے ۔ عُلوِ شان کی نمائش کی خواہش کچھ خودستائی اور خود فروشی ہی کے سبب سے نہیں پیدا ہوا کرتی بلکہ وہ بلند حوصلگی

۱- اصل : ہیر پھیر کے جھوٹی باتوں ۔

۲- اصل : ان پر ۔ ۳- اصل : کی ۔

۴- اصل : شان کی ۔ ۵- اصل : مگر کتابوں کے ۔

اور عالی دماغی سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ عذر کرنے میں، قبول کرنے میں، حیا کرنے میں نمائشیں اچھی ہوتی ہیں؛ خصوصاً وہاں زیادہ تر خوش نما معلوم ہوتی ہیں جہاں آدمی اپنے رقیبوں کی اُس وصف میں تعریف کرتا ہے جس میں اس کو خود کمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جن رقیبوں کی تعریف کرے گا، دو حال سے خالی نہ ہوں گے: کہ یا اُس سے کمتر ہوں گے یا برتر۔ اگر کمتر ہیں تو اُن کی تعریف سے اس کی زیادہ تعریف ہو جائے گی اور برتر ہیں تو اُن کی تعریف نہ ہونے سے اس کی تعریف اور کمتر ہو جائے گی۔ جو لوگ اپنی تعلّی کرتے ہیں وہ عاقلوں کے نزدیک قابلِ نفریں اور احمقوں کے نزدیک نہایت قابلِ تحسین و آفرین ہوتے ہیں۔ گو وہ اپنی نمودوں کے غلام ہوتے ہیں مگر بےوقوفوں کے آقا۔

۲۔ **غیروں کے لحاظ سے اپنی عظمت دکھانے کے طریقے:** رومی اپنی فتوحات کی شان و شکوہ دکھانے کے واسطے دربارِ عام کرتے اور اِس امر کے دکھلانے کے واسطے کہ جس جواں مرد سپہ سالار نے فتح پائی ہے، آج اُس سے زیادہ کوئی بڑا نہیں ہے، اُس کے ہاں سب اُمرا اور کونسل جا کر مہمان بنتے۔ اِس دربار میں دشمن، جو میدانِ جنگ میں قید ہوتے، اُن کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر دکھاتے۔ یہ حرکتِ ناشائستہ جب زیبا تھی کہ وحشیوں پر وحشی فتح پاتے تھے۔ سپہ سالار کی شان اس میں نہیں ہے کہ وہ یہ دکھائے کہ آج کوئی میرا ثانی عظمت و بزرگی میں نہیں ہے، بلکہ بڑی شان اُس کی یہ ہے کہ وہ یہ دکھائے کہ آج خوشی کا دن ایسا ہے کہ کوئی ناخوش نہیں۔ قیدی جو کل میدانِ جنگ میں اُس کے برابر درجہ رکھتے تھے اور میدانِ جنگ میں کلّہ بکلّہ لڑتے تھے اور اتّفاقاتِ جنگ سے وہ اسیر ہو گئے، ان کو اِس حقارت کے ساتھ دکھانا اور ان کی

زنجیروں کی چھن چھن کی آواز کو اپنی مجلس کا باجا بنانا نہایت مبہک حرکتی ہے۔

۳۔ انسان کی سچّی عزّت اَوروں پر احسان کرنے میں ہے، ظاہری تزک اور تجمّل اور احتشام میں نہیں ہے۔ دوستوں کے دلوں میں اُس کی عزّت جب ہی پیدا ہوگی کہ وہ اس کی آمدنی سے متمتّع ہوں۔ پہلے زمانے میں اعزاز فقط مہمان نوازی اور فیّاضی اور خوش اخلاقی کے لحاظ سے کیا جاتا۔ کچھ نوکروں چاکروں کی کثرت اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نمائشی اسباب پر نہیں۔ بہت سے آدمی قرض لے کر اپنے گھر کو اسباب سے سجاتے ہیں کہ ان کی عزت کی نمود ہو، مگر ان کا دیوالہ اس میں نکل جاتا ہے، اور لوگ ان کو تماشا گر سمجھتے ہیں کہ تماشاگاہ کی آرائش مستعار اسباب سے کرتے ہیں۔

۱۴۰۔ عزّت و ناموری

بعض آدمی اپنی لیاقت کا نقش بڑھا کر اور بعض اس کو توڑ مروڑ کر لوگوں کے دلوں پر مُرتسم کرتے ہیں۔ مگر حقیقی و تحقیقی عزت میں وہی لوگ بازی لے جاتے ہیں جو اپنی لیاقت کا نقش جوں کا توں، نہ بڑھا کر نہ توڑ مروڑ کر، اَوروں کے دلوں پر مُرتسم کرتے ہیں۔ ان کو کسی طرح کا نقصان نہیں ہوتا۔ بعض آدمی اپنے کاموں کی عزت و شہرت بہت چاہتے ہیں۔ بے شک اس سے ان کا چرچا جا بجا زبانوں پر بہت ہوتا ہے مگر دلوں میں ان کی تحسین کم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس بعض آدمی اپنی خوبی کو اس طرح دکھاتے ہیں کہ وہ بہت تاریک ہو جاتی ہے اور کسی کو نظر نہیں آتی، اس کی قدر کم ہو جاتی ہے۔ جو کام تقلیداً کیے جاتے ہیں، خواہ وہ کیسے ہی مشکل اور دشوار ہوں، مگر اُن سے وہ ناموری اور عزت نہیں حاصل

ہوتی جو اُن کاموں کے کرنے سے حاصل ہوتی ہے جو پہلے کسی نے نہ کیے ہوں، یا کیے ہوں مگر نا تمام چھوڑ دیے ہوں، یا کچھ اضافہ نہ کیا ہو۔ اگر آدمی اپنے کاموں کو ایسا معتدل بناتا ہے کہ جس سے لوگ راضی ہو جائیں اور اس کے ساتھ سب متفق ہو جائیں تو اس کی عزت کا راگ پورا گایا جاتا ہے۔ جو اہلِ ہمّت ایسے کام کرتے ہیں کہ جن کے اندر ناکامی کی صورت میں جیسی ذلّت ہوتی ہے، ایسی کامیابی کی صورت میں عزت نہیں ہوتی، تو وہ اپنی عزت و آبرو کے حق میں اچھے منتظم نہیں ہوتے۔ ساری عزت کا مدار اِس پر ہے کہ اپنے ہمسر رقیبوں پر آدمی سبقت لے جائے اور سب سے اچھا کام کر کے دکھاوے اور اپنے کمال سے ان کو ماہر کر دے۔ اسی سے عزت کی جوت و چمک دمک الماسِ تراشیدہ کی طرح عکس فگن ہوتی ہے۔

آدمی کے نامور ہونے میں اس کے ہوشیار، عاقل نوکر چاکر بڑے مددگار ہوتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ آدمی کی شہرت کا آغاز گھر ہی سے ہوتا[1] ہے۔ معزّز، حاسدوں کی حسد سے اپنے تئیں یوں بچا سکتے ہیں کہ وہ اپنی شہرت سے قطع نظر کریں، اور اصل مقاصد کے حاصل کرنے میں پیروی کریں، اور اپنے کاموں کی کامیابی کو مشیّتِ ایزدی سے منسوب کریں، اور کہیں کہ اس میں ہماری خوبی و حُسنِ لیاقت کو دخل نہیں، فقط تقدیر کی بات ہے۔

بعض حکما نے اعزاز اور ناموری کی ترتیب اس طرح مقرر کی ہے کہ اول وہ شخص معزّز و نامور ہے جس نے مذہب یا خدا کی عبادت کو قائم کیا ہو۔ دوم وہ جنھوں نے کسی سلطنتِ شخصی یا جمہوری کی بنا قائم کی ہو۔ سوم وہ بڑی سپاہوں کے سپہ سالار جنھوں

۱۔ اصل: آغاز گھر ہی سے شروع ہوتا ہے۔

نے اپنے ملک کو فتوحات سے بڑھایا ہو - چہارم عالِم ، خواہ وہ کسی علم و فن کے ہوں ، باعتبار تعدادِ علوم کے جن سے وہ ماہر ہوں ، اُن کی عزت کی جائے گی - پنجم ، سب سے آخر صنّاع و کاریگر جن کی شہرت و عزت موافق اُن کے ہنر اور صنعت و ذہانت کے ہوتی ہے -

بعض عزت و ناموری کی دو قسمیں کرتے ہیں : ایک سلطنت سے متعلق ، دوم رعیّت سے متعلق - شاہانہ عزت کی ترتیب یہ ہے : اول وہ بادشاہ جو بانی مبانیِ سلطنت اور بہبودیِ رعایا کے قائم کرنے والے ہوں - دوم سلطنت کے بانیِ ثانی یعنی جنھوں نے قوانینِ سلطنت ایسے بنائے اور بتلائے ہوں کہ اُن کے مر جانے کے بعد بھی وہ سلطنت و حکومت کرتے ہوں - سوم وہ بادشاہ جو ملک کو لڑائی اور جھگڑوں سے بچائیں اور ظالموں کے پنجوں سے چھٹائیں اور غیر ملکوں کی غلامی سے نکالیں - چہارم ، جو لڑائیوں میں عزت کے ساتھ فتح یاب ہو کر اپنے ملک کو بڑھائیں اور دشمنوں کے حملوں سے ملک کو بچائیں - پنجم وہ بادشاہ جو عدالت سے سلطنت کریں ، اپنے عہد کو اچھا رعایا کے لیے بنائیں - اب رعیّت کے اعتبار سے عزت اور ناموری کی یہ ترتیب ہے کہ اول اراکینِ سلطنت جن کو بادشاہ اپنا دایاں ہاتھ بنا کے اپنے کار ہائے بزرگ حوالے کرے - دوم اہل کار اور کار کن جو بادشاہ کے نائب ہوں اور لڑائیوں میں بڑے کار ہائے نمایاں دکھائیں - سوم جو بادشاہ کے منہ بہت چڑھے ہوں اور ناک کا بال بنے ہوئے ہوں - اور وہ دل سے بادشاہ کے خیرخواہ ہوں ، اور رعایا کے آزار کا خیال ان کے دل میں نہ آتا ہو - چہارم بادشاہی عہدہ دار جو اپنے کاموں کے لائق ہوں - اصل عزت جو سب پر فوقیت رکھتی ہے ، وہ یہ ہے کہ اپنے ملک کی بھلائی اور خیرخواہی میں اپنی جان وقف کر دے ، مگر یہ امر شاذ و نادر کسی میں ہوتا ہے -

۲- بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک کام میں جو اصل بانی مبانی اس کا ہوتا ہے وہ عزّت سے محروم رہ جاتا ہے اور دوسرا آدمی ، جو نمودیہ ہوتا ہے وہ اس کی عزّت غصب کر لیتا ہے - مثل ہے کہ چھوٹے کتّے خرگوش کو دریافت کرتے ہیں اور بڑے کتّے پکڑ لیتے ہیں - بعض وقت یہ ہوتا ہے کہ جو چیز بڑی مشکل اور ضروری ہوتی ہے اُس پر لوگوں کی نظر نہیں جاتی ، بلکہ اس سے جو کمتر ، آسان اور قدرتی ہوتی ہے اس کی بڑی تعریف ہوتی ہے - اس کی مثال چھاپہ اور سستا کاغذ ہے - اکثر لوگ چھاپے کی بہت تعریف کرتے ہیں ، مگر یہ نہیں جانتے کہ ہزاروں برس[1] پہلے سے آدمی اس سے واقف تھا - پومپئی[2] کے اور ہرکیولانم[3] کے شہروں کے کھنڈروں میں جو روٹیاں نکلیں تو اُن پر اُن کے پکانے والوں کے نام منقّش تھے - مگر چھاپے کی اشاعت جب تک نہیں ہوئی کہ کاغذ ارزاں نہیں ہوا - اگر کاغذ ارزاں نہ ہوتا تو چھاپے کا رواج نہ ہوتا -

۳- آدمی ایسے مختلف الطبائع ہوتے ہیں کہ ان پر ایک اصول برابر اثر نہیں رکھتا[4] - مثلاً ایک وہ لوگ ہیں کہ مذہب کے سبب سے ، دوسرے وہ جو عزت کے سبب سے نیک کام کرتے ہیں - عزت کے معنی ایسے نازک ہیں کہ جب سمجھ میں آتے ہیں کہ نیک آدمی

۱- اصل : ہزاروں برسوں -

۲- پومپئی : اٹلی کا ایک قدیم شہر جو ۷۹ عیسوی میں زلزلے سے تباہ و برباد ہو گیا تھا - کہتے ہیں کہ پومپئی کے باشندوں کی بدکاریاں اور ظلم اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو نیست و نابود کردیا -

۳- ہرکیولانم : یہ بھی اٹلی کا ایک قدیم شہر ہے جو ۷۹ عیسوی ہی کے زلزلے سے تباہ ہو گیا تھا -

۴- اصل : نہیں رکھتی -

نے اچھی طرح عمدہ تعلیم پائی ہو اور بڑے بڑے معزّز آدمی دیکھے ہوں اور بالطبع شریف ہو - اول ہم کو اُن لوگوں پر خیال کرنا چاہیے جو عزت کے صحیح معنی سمجھتے ہیں ، دوم جو غلط معنی سمجھتے ہیں ، سوم جو سرے سے عزت ہی پر ہنستے ہیں -

اول سچّی عزت ، خواہ اس کا اصول مذہب سے مختلف ہو مگر نتیجہ و اثر وہی پیدا کرتی ہے جو مذہب پیدا کرتا ہے - کاموں کے کرنے کے خطوط خواہ جدا جدا ہوں مگر آن کر سب ایک نقطے پر ملتے ہیں - مذہب کے سبب سے جو آدمی نیکی اختیار کرتا ہے وہ خدا کے قوانین و احکام کے موافق ، اور عزت کی وجہ سے جو نیکی اختیار کرتا ہے تو وہ انسانیت کی زیب و زینت کے سبب سے - برائی سے پابندِ مذہب خوف کرتا ہے ، پابندِ عزت نفرت رکھتا ہے - اور بدی کرنے کو معزّز اپنی شان میں بٹّا لگانا سمجھتا ہے اور صاحبِ مذہب خدا کا ناراض کرنا جانتا ہے - پہلا بدی کو اپنی شان کے شایاں نہیں جانتا ، دوسرا نواہیِ الٰہی میں سمجھتا ہے - سینیکا نے کہا ہے کہ اگر خدا برائی کا دیکھنے والا اور اس کی سزا دینے والا نہ ہوتا تو بھی معزّز برائی اس سبب سے نہ کرتا کہ اس کے کرنے کو پاجی پن و کمینہ پن و رزالت جانتا ہے -

عزت مقدّس بندش ہے ، بادشاہوں کا آئین ہے ، اشرافوں کا ممتاز کرنے والا کمال ہے - وہ نیکی کو جہاں دیکھتی ہے اُس کی تقویت کرتی ہے - جہاں نہیں دیکھتی وہاں اس کی تقلید کرتی ہے - عزت کو ، چاہیے کہ ، آدمی لہو و لعب نہ سمجھے - جو اصول نیکی کو پیدا کریں ان کو سہارا دینا چاہیے -

دوم وہ جو عزت کے معنی غلط سمجھتے ہیں - یہ وہ لوگ ہیں کہ جن باتوں کو عزت ٹھہراتے ہیں یا تو وہ خدا کے احکام کے برخلاف

ہوتی ہیں یا ملک کے برخلاف - وہ جرم کے انتقام لینے کو عفو کرنے کی نسبت زیادہ معزّز کام جانتے ہیں - وہ جھوٹ بولنے کو برا نہیں سمجھتے لیکن اگر کوئی ان کو جھوٹ کا الزام دے تو اس کے مار ڈالنے کو عزت جانتے ہیں - اپنی عزت اور جرأت کے کاموں کو نیکی کے کاموں پر ترجیح دیتے ہیں - استقلال اور ثبات و تحمّل انسان کی ایسی نیکیاں ہیں کہ بغیر ان کے آدمی کو انسان نہیں کہنا چاہیے ، مگر وہ ان کو ذلیل سمجھتے ہیں اور فقط اپنی درندوں کی سی دلیری کو بڑی عزت سمجھتے ہیں - ایسے بہت سے آدمی ہم میں ہیں جو فقط اس صفتِ سبعی[1] کے سبب سے اپنے تئیں معزّز جانتے ہیں - غرض جو آدمی مروج فرائضِ انسانی کا خون کر کے اُن کاموں کو معزّز جانتا ہے جن سے کہ خدائے تعالٰی ناراض ہو یا اُن سے اجتماعِ انسانی غارت و تباہ ہو ، تو ایسا آدمی معزّز شمار نہیں ہو سکتا - وہ تو ایسا ذلیل ہے کہ اگر پھانسی پر چڑھاؤ تو اس کے تختے کو بھی ذلّت ہو - بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کے سامنے خدائے تعالٰی کو برا کہو تو ہنس کر چپکے ہو رہیں مگر[2] اُن کے کسی دوست کو برا کہو تو برا کہنے والے کی جان مارنے کے لیے تیار ہو جائیں - اگر جُوئے میں قرض روپیہ لے کر ہاریں تو خیانت کر کے اُس کے ادا کرنے کو عزت جانیں - غرض ایک اصول کے معنی غلط سمجھنے سے ستم برپا ہوتا ہے -

تیسرے وہ جو عزت ہی کو مسخرا پن سمجھتے ہیں - کوئی مذہب کا پابند ہوتا ہے ، کوئی بدعتی ، کوئی لا مذہب - وہ مذہب کو

۱- صفتِ سبعی = صفتِ درندگی یا درندہ صفتی -

۲- اصل : اگر ان کے -

ایک ڈھکوسلا جانتے ہیں - اُن کے نزدیک سب کے سب برابر ہیں - اکثر آدمی جو رند مشرب ، اوباش ہوتے ہیں وہ عزت کو کچھ خیال نہیں کرتے - اس سبب سے وہ بہت شرارت و شیطنت کے کام کرتے ہیں - وہ ہر چیز پر ہنستے ہیں - وہ عزت کے انعام کو خیالی چیز جانتے ہیں - اگرچہ ایسے شخص بعض وقت اچھی حکومت اور خوب دولت پیدا کر لیتے ہیں - لیکن جو شخص عزت کے دربار میں نیک کاموں کے دروازے سے داخل ہوتا ہے ، صرف وہی ملک کی تاریخ کے خطوں میں اپنا نام نیک نامی کے ساتھ ثبت کرتا ہے -

۱۴۱- غصّہ

[اس تمام مضمون میں غصّے سے مراد اُس جذبۂ قلبی سے ہے جو دوسرے کے تکلیف پہنچانے سے جوش میں آئے - وہ ایک تھوڑی دیر کا جنون ہوتا ہے]

بعض فرقۂ حکما کی یہ شیخی ہی شیخی ہے کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم غصّے کو بالکل دور کر سکتے ہیں - غصّے کے باب میں انجیل کا یہ ارشاد ہے کہ غصّے تو ہو مگر گناہ نہ کر - ایسا نہ ہو کہ سورج ڈوب جائے اور تُو خفا کا خفا رہے - غصّے کے اثروں پر یہ غور کر کے کہ وہ کتنا انسان کی زندگی کو تلخ اور بے مزہ کرتا ہے ، یہ سوچنا چاہیے کہ اس کو ہم کتنا کم کر سکتے ہیں - سینیکا کا کیا خوب قول ہے کہ غصّے کا حال مینہ کا سا ہے کہ جس پر پڑتا ہے اُسی کو شکستہ کرتا ہے - کتبِ مقدّسہ یہ تعلیم کرتی ہیں کہ تم صبر سے اپنی جان بچائے رکھو - جو آدمی صبر نہیں کرتا وہ اپنے دل پر

ابو نہیں رکھتا۔ تم مکھّی نہ بنو کہ زخموں میں پھنس کر اپنی جان کھوؤ۔ غصّہ انسان کے ضعف کی نشانی ہے۔ وہ اکثر بچوں، عورتوں، بڈھوں، بیماروں کو زیادہ تر آتا ہے۔ آدمیوں کو تین سببوں سے غصّہ آتا ہے: اول ضرر پہنچنے پر، دوم اپنی حقارت کے شبہے پر، سوم اپنی نیک نامی کے جاتے رہنے پر۔ آدمی کو جب تک اپنے ضرر کا ادراک نہیں ہوتا، اس کو غصّہ نہیں آتا۔ اسی واسطے نازک مزاجوں اور ضعیفوں کو جن باتوں پر زیادہ غصّہ آتا ہے، قوی مزاج اُن سے باخبر[۱] بھی نہیں ہوتے، کیونکہ وہ چیزیں ان کو ضرر رساں معلوم نہیں ہوتیں۔ یہ ضعف ہی کا سبب ہوتا ہے کہ بہت سی چیزیں مضرّت پہنچانے والی معلوم ہوتی ہیں۔ تحقیر ایسی چیز ہے کہ وہ غصّے کی دھار کو تیز کر دیتی ہے اور تحقیر سے وہ تکلیف نہیں ہوتی جو اس پر غصّہ آنے سے۔ نیک نامی میں فرق آنے پر جو آدمی کو غصّہ آتا ہے اس کے لیے ایک دانش مند کا قول یاد رکھنا چاہیے کہ اشراف اپنی عزت کا جال ایسا مضبوط و کشادہ بنائیں کہ اس میں چھوٹی چھوٹی چیزیں نہ پھنسا کریں، اور ایسی نیک نامی کی بنا استوار وہ ڈالیں کہ اس پر چھوٹے چھوٹے حملوں سے کچھ اثر نہ ہو۔ انسان کو چاہیے کہ جس وقت غصّہ آئے، نہ کچھ کہے، نہ کچھ کام کرے۔ یہ سمجھے کہ ابھی انتقام کا وقت نہیں آیا۔ اس کے آنے کا منتظر رہے اور یہ جانے کہ توقّف کر کے میں بدلہ اچھی طرح لے سکوں گا۔ غصّے کے وقت میں بولنا یا کام کرنا ایسا زبوں کار برآری کے حق میں ہوتا ہے کہ پھر اس کا کچھ علاج ہی نہیں ہو سکتا۔

۱۔ اصل: خبر بھی نہیں ہوتے۔ ''با'' اضافۂ مرتّب۔

۱۴۲- زمانے کا دَور اور انقلاب

اجرامِ فلکی میں ہم دیکھتے ہیں کہ اُن میں ایک دَور رہتا ہے۔ جب وہ اپنا ایک دَورہ، خواہ کیسا ہی طول طویل ہو، پورا کر چکتے ہیں تو ان کا پھر دوسرا دَورہ اِس طرح شروع ہوتا ہے جیسا کہ پہلا، اور وہی باتیں وقوع میں آتی ہیں جو پہلے آ چکی ہیں۔ ثوابت میں جو باہم فاصلے ہیں، اُن میں کچھ انقلاب نہیں ہوتا اور وہ متغیّر نہیں ہوتے۔ آفتاب کی گردش کا جو دَور ہے اس میں سر مُو فرق نہیں آتا۔ موسموں کے تغیّر و تبدّل کا ایک دَور ہے کہ وہ مسلسل چلا جاتا ہے۔ غرض جیسے یہ متسلسل دَورہ اجرامِ فلکی میں ہے، ایسا ہی بعض عقلا کے نزدیک اَور واقعاتِ دنیا میں بھی ہے۔ اس لیے بعض والاخیرد یہ فرماتے ہیں:

حضرت سلیمان[۴]: سورج کے نیچے کوئی نئی چیز نہیں۔ کل نئی ایجاد ایک فراموشی ہے۔

افلاطون: کل علم صرف یاد ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مادے کو ایک حال پر قرار نہیں، ہمیشہ اس میں انقلاب ہوتا رہتا ہے۔ مگر یہ ممکن ہے کہ ان انقلابوں کا ایک دَور ہو کہ ایک مدت کے بعد پھر اُسی طرح انقلاب ہونے لگیں؛ جیسے کہ اجرامِ فلکی میں طوفانوں اور زلزلوں سے وہ انقلابات ہوتے ہیں کہ ان کے آگے آتش زدگی اور قحط سالی کے انقلابات کچھ حقیقت ہی نہیں رکھتے۔ وہ تو انسانوں کو ایسا برباد کرتے ہیں کہ ان کے واقعات بیان کرنے کے لیے بھی کوئی زندہ آدمی نہیں ملتا۔ ان کے ہاتھ سے فقط پہاڑوں پر جاہل کندہ ناتراش، جن کو کسی بات کے بیان کرنے کی لیاقت نہیں ہوتی، زندہ رہتے ہیں۔

آپس کے حسد اور دشمنی سے جو ہنگامہ ہائے کارزار گرم ہوتے ہیں ، ان کے انقلابات بالکل فراموش نہیں ہوتے - سب سے بڑا انقلاب ، جو انسان کی حالت میں واقع ہوتا ہے ، وہ اس کے مذہب اور فرقوں میں تفریق کے سبب سے واقع ہوتا ہے - ان چیزوں کا مدار انسان کے دل میں رہتا ہے - سچّے مذہب کی بنا پہاڑ پر ہوتی ہے اور باقی اور مذہب یوں ہی ڈانواں ڈول اور متزلزل زمانے کے اندر رہا کرتے ہیں - جب کوئی قدیمی مذہب آپس کی نا اتفاق سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ٹکراتا ہے اور علماے مذہبی کی تقدیس میں تنزّل ہوتا ہے اور جہالت ، حماقت ، وحشت کا زمانہ آتا ہے تو اس وقت نئے نئے فرقوں کے پیدا ہونے کا خوف ہوتا ہے - اگر کوئی عالی ہمّت عاقل ان کا سردھرا[1] بن گیا تو اور زیادہ خوف کا محل ہوتا ہے - اگر اس نئے فریق میں دو باتیں ہوں تو اس سے سلطنت کو کچھ خوف نہیں ہوتا : اول ، جو سلطنت قائم ہو ، اس کا قائم مقام بنانا وہ اپنے تئیں نہ چاہتا ہو اور نہ سلطنت کا مقابلہ کرتا ہو - دوم ، وہ اوباشی اور عیّاشی کی اجازت نہ دیتا ہو - غرض اس میں فقط فکرِ خیالی ایسے ہوں کہ جو دل پر اثر کریں مگر فکرِ عملی نہ ہوں -

نئے فرقے تین طرح سے پیدا ہوتے ہیں : اول معجزات ، کرامات ، خرقِ عادات سے - دوم بلاغت ، فصاحت کی تقریر اور حکمت اور دانائی سے - سوم بزورِ شمشیر - اِن فریقوں کے لیے سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ وہ نرمی اور ملائمت سے منا لیے جائیں ، اور ان کے عیبوں کی اصلاح کی جائے ، اور ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں مان لی جائیں ، اور ان پر لعنت ملامت نہ کی جائے ، اور کوئی سختی ان کے ساتھ نہ ہونی

۱- اس سے سربراہ مراد ہے -

چاہیے - ایسے ہی لڑائیوں کے اندر تین طرح کے انقلابات واقع ہوتے ہیں : اول جب بڑی سلطنتوں میں جنگ و پیکار کے طوفان اٹھتے ہیں تو وہ برباد ہو جاتی ہیں - جب کوئی سلطنت قائم ہوتی ہے، وہ جن ملکوں کو فتح کرتی ہے، ان کے سپاہیوں کا زور گھٹا دیتی ہے اور اپنی سپاہ سے ملک کی حفاظت کرتی ہے - مگر جب اس سپاہ میں خلل آ جاتا ہے تو وہ سلطنت بالکل برباد اور تباہ ہو جاتی ہے اور خود اوروں کا شکار بن جاتی ہے - جب بہت چھوٹی چھوٹی ریاستیں متحد ہو جاتی ہیں تو بھی ہنگامۂ جنگ وہ برپا کرتی ہیں، اس لیے کہ جب پانی کی طغیانی ہوگی تو وہ ابلے گا - جب اِس اتحاد سے قوت پیدا ہوگی، وہ اپنا اثر ضرور دکھائے گی - اور جب وحشی قوموں کے جتھے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور سلطنتوں کی جنگ کی قوتیں کم ہو جاتی ہیں تو بڑے انقلاب پیدا ہوتے ہیں - دوم جنگ میں انقلاب بڑا ہتھیاروں سے ہوتا ہے - گو ان کے لیے کوئی قاعدہ مشاہدے سے نہیں مقرر ہو سکتا ہے مگر پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ اسلحۂ آتشی نے جنگ میں بڑا انقلاب پیدا کیا ہے - وہ اول ہندوستان میں ایجاد ہوئے جن کو اہلِ مقدونیہ نے بجلی و کڑک اور جادو لکھا ہے - ان اسلحۂ آتشی کے استعمال کو چینی دو ہزار برس سے جانتے تھے - ہتھیاروں کی ترقی ان باتوں[1] پر موقوف ہے : اول، دُور سے مارنے پر کیونکہ ان سے دشمن کو دور سے ہی ہٹا کے بے خوف ہو جاتے ہیں، جیسا کہ توپ بندوق میں دیکھتے ہیں - دوم، صدمہ پہنچانے پر - اب اسلحۂ آتشی سے جو[2] صدمے پہنچتے ہیں، وہ پرانے اسلحہ مثل منجنیق و سنگ انداز و تیر سے کب پہنچتے تھے - سوم، ان کی آسانیِ استعمال پر - یہ

۱- "باتوں" اضافۂ مرتّب - ۲- "جو" اضافۂ مرتّب -

اسلحہ سب موسموں میں کام آ سکتے ہیں - ان کی بار برداری آسان ہے - سب جگہ ان کو لے جا سکتے ہیں - تیسرا انقلاب طریقۂ جنگ میں یہ[1] واقع ہوا ہے کہ پہلے زمانے میں زیادہ تر اعتماد سپاہ کی تعداد پر ہوتا تھا ، اب سپاہ کے علم و ہنر پر اعتبار ہوتا ہے - علم کے انقلابات کا حال بھی سلطنت کا سا ہوتا ہے ؛ جیسے سلطنت کے عہدِ طفلی ، جوانی ، پیری ہوتے ہیں ، ایسے ہی علم کی عمر میں انقلابات ہوتے ہیں - غرض مذہب ، حرب اور علم میں انقلابات ہوتے رہتے ہیں - ان سے انسان کے حالات میں انقلابات واقع ہوتے ہیں - اگر ہم دنیا کے کُل انقلابوں اور گردشوں کا حال لکھیں تو ہمارا سر چکرا جائے ، اس لیے اسے ختم کرتے ہیں -

۱۴۳- زبان

۱- اکثر آدمی زبان کا یہ فائدہ جانتے ہیں کہ جن چیزوں کو ہمارا دل چاہتا ہے اُنھیں الفاظ کا لباس پہنا کے ظاہر کریں ، جن سے وہ حاصل ہو جائیں - آدمی کی احتیاجوں اور خواہشوں کو ایسی خوبی سے زبان ظاہر کرتی ہے کہ اور لوگ ان کو رفع کر دیتے ہیں - لیکن عاقلوں کی رائے اس کے برخلاف ہے ؛ کہ خواہشوں اور احتیاجوں کے ظاہر کرنے میں زبان اِتنی کام نہیں آتی جتنی وہ اُن کے چھپانے کے کام میں آتی ہے - دنیا کا تجربہ شہادت دیتا ہے کہ جو شخص اپنی احتیاجوں کا چھپانا جانتا ہے ، غالباً زیادہ تر کامیاب ہوتا ہے - جو لوگ عاقل اور ہوشیار ہوتے ہیں وہ دوستوں سے ضرورت سے زیادہ قرض لینے کی ایسی تمہیدیں بناتے ہیں جس سے کسی کو یہ گمان بھی

۱- ''یہ'' اضافۂ مرتّب -

نہیں ہوتا کہ ان کو تھوڑے روپے کی ضرورت ہے - اس حکمت سے حسبِ ضرورت قرض مل جاتا ہے ؛ مثلاً ایک شخص اپنے دوست سے ہزار روپے قرض مانگتا ہے تو وہ دو سو روپے دے دیتا ہے - اگر وہی آدمی نہایت عجز و انکسار کے ساتھ تھوڑا سا قرض مانگتا تو غالباً اس کا اعتبار پیسے کا بھی نہ کیا جاتا اور کچھ بھی نہ ملتا - جب کبھی درزی سے قرض پر کچھ[1] سلوانا منظور ہوتا ہے تو وہ بڑی بھڑک کی پوشاک پہن کر اس کی دکان پر جاتے ہیں اور ایسی باتیں بناتے ہیں کہ جن سے یہ معلوم ہو کہ یہ کوئی بڑے آدمی ہیں - اس طرح درزی اُدھار کی سلوائی پر راضی ہو جاتا ہے -

احتیاج کے ظاہر کرنے میں ضرورت یہ آن کر پڑتی ہے کہ دوسرے آدمی کے دل میں اپنے حال پر رحم پیدا کریں جس سے اپنا مطلب نکلے - اب مفلس آدمی کو، پہلے اس سے کہ وہ اپنا افلاس کسی دوست پر ظاہر کرے ، یہ سوچنا چاہیے کہ سوال کر کے اپنی قدر و منزلت کا کھونا اور دوستی کو رحم سے بدلنا مناسب ہے کہ نہیں ؟ خصائلِ انسانی میں دو بڑے جوہر رحم اور دوستی کے ہیں - دوستی تعظیم اور خوشی سے پیدا ہوتی ہے ، رحم افسوس اور حقارت سے ، اس لیے یہ دونوں باتیں ایک وقت میں دیر تک مل کر دل میں نہیں رہ سکتیں - دل ان دونوں کے درمیان معلّق رہتا ہے ، مگر ان کو جمع نہیں رکھ سکتا - وہ ایک دوسرے کو زائل کرتے ہیں - کوئی دل رحم سے خالی نہیں ہوتا ، مگر رحم کا قاعدہ ہے کہ وہ تھوڑی دیر رہتا ہے ، اس لیے غریبوں کو اس سے کم مدد ملتی ہے -

بعض آدمیوں کے دلوں میں رحم کی زُود زوالی[2] کا حال یہ ہوتا

۱- ''پر کچھ'' اضافہ مرتّب -
۲- زود زوالی = جلدی زائل ہو جانا -

ہے کہ اگر ان کو کسی مفلس محتاج کے حال پر رحم آئے اور جی کچھ دینے کو بھی چاہے ، مگر اِتنی دیر میں وہ بدل جاتا ہے کہ جیب میں ہاتھ جائے یا رومال کھولا جائے ۔ بعض آدمیوں میں وہ کچھ دیر تک قائم رہتا ہے ۔ اور جو نہایت نرم طبیعت کے رحم دل ہوتے ہیں ، اُن کے اندر آدھ گھنٹے سے زیادہ وہ نہیں ٹھہرتا ۔ پس اس لیے رحم سے غریب آدمیوں کو کم امداد ملتی ہے ۔ دوستی کے کاموں میں آدمی بہت روپے صرف کر دیتا ہے مگر رحم کے کاموں میں صرف پیسے ہی خرچ کرتا ہے ۔ اگر کوئی شخص کسی بلا میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کے حالِ زار کو دیکھ کر دل میں رحم آتا ہے تو رحم کی جو کیفیت اول دفعہ میں ہوگی ، وہ دوسری دفعہ میں نہیں ۔ اگر اس کو پہلی دفعہ میں ایک روپیہ دے دیں تو دوسری دفعہ شاید آٹھ آنے دیں اور تیسری دفعہ وہ ہاتھ پھیلائے تو معلوم بھی نہ ہو ۔ اس کی صدا کا حال گنبد کی صدا کا سا ہوتا ہے کہ ہر دفعہ میں زور اس کا کم ہوتا جاتا ہے ، یہاں تک کہ آخر کو ہمارے دل میں افسوس اور ترس کا نشان باقی نہیں رہتا ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص آسودہ حال و مال دار ہے ۔ بھلے مانس اس کو اپنی بیٹیاں دینے اور روپیہ قرض دینے کے لیے جو منتّیں کرتے تھے اور تحفہ تحائف دیتے تھے اور وہ انکار کرتا تھا ، جب مفلس وہ ہوگیا تو وہ نظر بھی اٹھا کر نہیں دیکھتے ۔

مفلسی میں آدمی کی میٹھی باتیں بھی کڑوی معلوم ہوتی ہیں ۔ اس کی خوشامد کی باتیں بھی کانوں کو زہر لگتی ہیں ۔ اے محتاجو! تم رحم کے سوا کسی اور جذبۂ انسانی سے اپنا کام نکالو ۔ انسان کی خود فروشی ، خود مطلبی ، حریص ہونے سے تم اپنا مطلب زیادہ رحم سے نکال سکتے ہو ۔ غرض انسان افلاس اور اپنی احتیاجوں کے چھپانے

میں زبان کو طرح طرح سے کام میں لائے ۔ اگر سو روپے کے قرض لینے کی ضرورت ہو تو فقیر بن کر بھیک نہ مانگے بلکہ دوستوں کی دعوت کرے اور ان سے باتوں باتوں میں سو روپے کی ضرورت اپنی بیان کرے ۔ اگر کوئی پچاس روپے دے تو کہے کہ بیس روپے میرے پاس ہیں ، تیس روپے میں کسی اور دوست سے قرض لے لوں گا ۔ اگر کوئی شخص تم کو دیکھے کہ روٹی ساگ پات سے کھا رہے ہو تو کسی نامور طبیب کا نام لے کر کہو کہ اس نے ہم کو یہ پرہیزی کھانا بتایا ہے ۔ سوائے اس کے میں شکم پرست بھی نہیں ہوں ۔ اکثر پُر تکلف کھانے سے میں بیمار ہو جاتا ہوں ۔ اگر کپڑے جاڑے میں گرم نہ پہنے ہوئے ہوں تو کہو کہ معلوم نہیں ، مزاج میں حرارت کہاں سے آ گئی ہے کہ اس جاڑے میں بھی سردی نہیں لگتی ۔ اگر کپڑے میلے ہوں تو کہو کہ کم بخت دھوبی ایسا قسمت سے ملا ہے کہ چار چار جوڑے اکٹھے ہو جاتے ہیں مگر وہ دھو کر نہیں لاتا ۔ اگر کپڑوں میں پیوند لگے ہوں یا وہ کہیں سے پھٹے ہوئے ہوں اور ان کو کسی طرح کی نشست سے نہ چھپا سکو تو کہو کہ درزی پر خدا کی مار ہے کہ جلدی نئے کپڑے سی کر نہیں لاتا ۔ یا یہ کہ مجھے خوش‌پوشی پسند نہیں ۔ میرے درزی تو افلاطون اور سینیکا ہیں کہ جن کا قول ہے کہ صرف اتنے لباس کی ضرورت ہے کہ جس سے بدن ڈھک جائے ۔ امیر جو اپنی خوش لباسی دکھاتے ہیں ، وہ ہنسی کے قابل ہیں ۔ مجھے وہ لباس پسند ہے جس کی ہدایت انبیا اور حکما نے کی ہے ۔ غرض اور جو افلاس کی برائیاں ظاہر ہوں ، ان کو اسی طرح چھپاؤ اور بجائے افلاس کے اپنی کفایت شعاری کا اظہار کرو ۔ کنجوس پن اپنا بتلاؤ مگر نہ افلاس بتاؤ ۔

آدمی مفلس ہونے سے یا مفلس معلوم ہونے سے کبھی قدر و منزلت

نہیں پا سکتا - جب امرا ڈینگ مارتے ہیں تو ان سے نفرت ہوتی ہے اور جب عقل مند شیخی کرتے ہیں تو ہنسی آتی ہے - مگر مفلس جو نمود کرے تو وہ معذور و مجبور ہے اور قابلِ معافی ہے - اب تم نے دیکھ لیا کہ زبان جتنی احتیاجوں کے چھپانے میں کام آتی ہے آتنی ظاہر کرنے میں نہیں -

۲- **زبانوں کی صفات :** عبرانی زبان رمز و کنایہ کا لباس پہنے ہوئے ہے - حکماے یونان کی زبان میں پاکیزہ الفاظ میں خوب ازدواج ہے - رومیوں کی زبان فصیح ، اہلِ ٹسکنی کی زبان سنجیدہ و متین ، اہلِ ہسپانیہ کی زبان بہادرانہ ، فرانس کی زبان ملائم اور شیریں -

۳- زبان سے ہمیشہ کچھ پیدا ہوتا رہتا ہے - یہ مت خیال کرو کہ زبان ایسا مولود ہے کہ ایک ہی دفعہ پیدا ہوتی ہے اور مر جاتی ہے - بلکہ جان دار ہے جس سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ پیدا ہوتا رہتا ہے - انسان کے خیالات ، عقل و دانش کی ترقی کے ساتھ مکمل اور دقیق ہوتے جاتے ہیں اور ان خیالات کا اظہار زبان ہی کے ذریعے سے ہوتا ہے - اس واسطے کوئی محاورہ اپنی ایک حالت پر قائم نہیں رہ سکتا - وہ آگے چلتا ہے ، منکشف ہوتا ہے ، بڑھتا ہے ، اپنے تئیں محصور کر کے محفوظ بناتا ہے ، پرانا ہوتا ہے ، آخر کو پیرِ فرتوت ہو جاتا ہے -

۴- **زبان کا متغیّر ہونا :** زبانوں میں جو تغیّر و تبدّل ہوتے رہتے ہیں وہ خدا کے انتظام میں داخل ہیں جس سے علی العموم ساری دنیا کو اور علی الخصوص مصنّفوں کو فائدہ پہنچتا ہے - زبانوں کا حال اقسامِ نباتات کا سا ہے کہ وہ طرح طرح کے خوبصورت ہوتے ہیں - اول وہ زمین سے پھوٹتے ہیں ، پھر نمو پاتے ہیں ، تھوڑی مدت کے بعد وہ کھیتوں اور باغوں کو رونق دیتے ہیں ، پھر مرجھا کر خاک

ہو جاتے ہیں تاکہ ان کی جگہ اور آن کے قائم مقام آئیں - اگر ان کی یہ صورت نہ ہوتی تو نیچر کی یہ بار آوری بجائے نعمت کے مصیبت ہو جاتی - زمین پر وہ نباتات کا انبار ہوتا کہ اس کا بار زمین سے اٹھایا نہ جاتا - اس سے سب جگہ اس کی سطح پر وہ گلجھٹیاں پڑی ہوتیں جو سلجھائی نہ جاتیں - پس یہی حال نباتات کا سا تصنیفات کا ہے کہ ان کا تنزّل ہوتا رہتا ہے اور وہ مٹتی رہتی ہیں[1] کہ آن کی جگہ اور قائم مقام ان کے آباد کریں - زبان بتدریج بدلتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ اس کے مصنّفوں کی تصنیفات بھی ایک خاص مدت تک شگفتہ رہتی ہیں - اگر یہ حالت نہ ہوتی تو ذہن کی قوائے مولّدہ دنیا کو کتابوں سے اتنا بھر دیتیں کہ اس میں سمائی نہ ہوتی اور انسان کا دل علم و ادب کی بے انتہا بھول بھلیّوں میں بھٹکتا رہتا اور سرگردان و پریشان ہوتا -

زمانۂ سابق میں تو ان کی افراط کے واسطے یہ روکیں تھیں کہ کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں جو ایک بڑی محنت کا کام تھا کہ سہج سہج ہوتا تھا - سوائے اس کے وہ ایسی چیزوں پر لکھی جاتی تھیں جو نہایت گراں قیمت ہوتی تھیں ، یہاں تک کہ ان کے اوپر سے ایک کتاب کو حکّ[2] کر کے دوسری کتاب لکھتے تھے - پھر ایسی نازک چیزوں پر لکھنا شروع ہوا جو جلد خراب ہو جاتی تھیں - مصنّفوں کی تعداد بھی محدود تھی - قلمی کتابیں بہت روپیہ خرچ کرنے سے ایک مدتِ دراز میں جمع ہوتی تھیں - پس یہ حالتیں ایسی تھیں کہ نتائجِ عقلیہ کی طغیانی ایسی نہیں ہوئی کہ وہ ہمارے خیالات کے چشموں کو بند کرتی اور اس کا طوفان زمانۂ حال کی ذہانت کو ڈبو دیتا -

---

۱- یہاں اصل میں ”ہے“ چھپا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فاضل مصنف نے ”تصنیفات“ کو ہر جگہ واحد کے طور پر استعمال کیا ہے -

۲- حکّ کرنا = مٹا دینا -

اب زمانۂ حال میں چھاپے اور کاغذ کی ایجادوں نے پہلی[1] روکوں کو دور کر دیا - ان کے سبب سے ہر شخص اپنے تئیں مصنّف[2] بنا سکتا ہے اور اپنے خیالات کو پریس کے اندر رکھ سکتا ہے اور کل عقلی دنیا میں پھیلا سکتا ہے - چھاپے اور کاغذ کے نتیجوں کے دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے اور خوف لگتا ہے کہ علم و ادب کی دھار بڑھی اور تُرو ہو گئی، اور دریا بن کے وہ پھیلی کہ سمندر معلوم ہونے لگی - چند صدی پہلے اگر کسی کتب خانے میں پانچ چھ سو کتابیں ہوتیں تو وہ بڑا کتب خانہ سمجھا جاتا تھا - اب بعض کتب خانوں میں تین تین چار چار لاکھ کتابیں ہیں[3] - مصنّفوں کا ایک لشکر موجود ہے جو اپنے کام میں مستعدی اور چالاکی سے مصروف ہے - اور پریس وہ سحر کا کام کر رہا ہے اور ہتھیلی پر سرسوں جما رہا ہے کہ خیال ہے کہ اوپر کے کتب خانوں میں کتابوں کو دوچند سہ چند کر دے گا - ظاہر میں اس علم و ادب کی موت کا کوئی وہم بھی نہیں ہو سکتا - پس اگر اس کو موت نہ آئی اور یہی حال رہا جو اب ہے تو علم ایسا کثیرالاولاد ہو جائے گا کہ آیندہ کو لوگ اس سے خوف کھایا کریں گے - اب اندیشہ ہے کہ زبانوں کا بدلنا بھی اس کے انسداد کے واسطے کافی نہ ہوگا - نکتہ چینی اور عیب بینی خواہ وہ اچھی ہو یا بری، اس کی طغیانی کو نہیں روک سکتی - نکتہ چیں اپنی نکتہ چینی اور عیب بیں اپنی

۱- اصل: پہلے روکوں -

۲- اصل میں 'مصنّف' کی بجائے 'منصب' چھپا تھا -

۳- اس وقت روس کی لینن میموریل لائبریری دنیا کی سب سے بڑی لائبریری ہے جس میں تقریباً بارہ کروڑ کتابیں ہیں - دوسرے نمبر پر امریکہ کی لائبریری آف کانگریس ہے جس میں ساڑھے چھ کروڑ کتابیں ہیں - برطانیہ، فرانس اور بعض دوسرے ملکوں کی لائبریریوں میں بھی کتابوں کی تعداد کروڑوں میں ہے -

عیب گوئی کیا کریں ، مصنّف اپنی تصنیفات کیے جائیں گے اور چھاپنے والے چھاپے جائیں گے - دنیا عمدہ کتابوں سے معمور ہو جائے گی - فقط ان کے ناموں کے یاد کرنے کے لیے ایک عمر درکار ہوگی - ابھی سے لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر اخبار اور رسالے میں[1] ریویو وغیرہ پڑھتے ہیں تو کسی کتاب کے پڑھنے کی فرصت نہیں ملتی - کچھ مدت نہیں گزرے گی کہ فاضل عالم فقط ایک فہرست رواں کتابوں کے ناموں کی ہوگی[2] -

۵- زبان کا نشو و نما درخت کا سا ہوتا ہے کہ پہلے جڑ ہوتی ہے ، پھر شاخیں اُس میں پھوٹتی ہیں ، پھر پتّے نکلتے ہیں ، پھر کلیاں - زبان خیالات کے ساتھ ایسی حرکتیں کرتی ہے جیسا کہ سمندر کا پانی ستاروں کی تاثیر سے - جیسے علمِ کیمیا کی ترقّی سے دنیا کی ظاہری زیبائش ہوتی جاتی ہے ، ایسے ہی زبان کی ترقی سے خیالات کی آراستگی ہوتی جاتی ہے - جب پرانی زبان مُردہ اور مقطوع الاستعمال[3] ہوتی ہے تو نئی زبان اس پر حملہ آور ہو کے اس کی جگہ چھین لیتی ہے اور خود بڑے زور سے دبا کے ہو بیٹھتی ہے - زبان امورِ حق کا ایک چشمہ ہوتا ہے - کچھ گنواروں ہی سے زبان زیادہ دانا نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے بولنے والوں ، دانش مندوں سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے - اس کا

۱- ''میں'' اضافہ مرتّب -

۲- اصل میں یہ جملہ اسی طرح چھپا ہوا ہے - غالباً کاتب نے کچھ الفاظ چھوڑ دیے ہیں ورنہ کتابوں کی فہرست کے عالم فاضل ہونے کا کچھ مطلب نہیں - ممکن ہے مصنف کی مراد یہ ہو کہ جس نے کتابوں کی فہرست یاد کر لی وہی عالم فاضل کہلائے گا -

۳- مقطوع الاستعمال : جس کا استعمال چھوڑ کر دیا جائے -

حال کہربا[1] کا سا ہوتا ہے کہ اِدھر الیکٹرسٹی کے تاروں پر راستی کو دنیا میں رواں کرتی ہے ، اُدھر قدیمی مُردوں کی ہڈیوں کو اپنا روغن چڑھا کے سلامت اور قائم رکھتی ہے - پہلے زمانے کے تمام اُمورِ حقہ کو قفل میں بند رکھتی ہے - عقل کے اُفق کے نیچے بہت سی حق کی شعاعیں ہوتی ہیں جن کو وہ ابھار کے چمکا دیتی ہے - استعارات اور تشبیہات کو دیکھو کہ وہ کیا کیا نورانی جلوے دکھاتے ہیں اور کلام کو الہام بنا دیتے ہیں - جو اُن میں زیادہ کاوش کرتے ہیں ، وہ روحانی عطیے پاتے ہیں -

۱۴۴- نصیحت کرنا

ہم کسی بات کے سننے سے ایسے کشیدہ و رنجیدہ خاطر نہیں ہوتے جیسے کہ نصیحت کے سننے سے - ناصح کو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہم کو نادان بچہ ، احمق سمجھ کے ہمارے فہم و عقل کی ہتک اور نصیحت کے ضمن میں ہماری فضیحت کرتا ہے - جتنی وہ ہماری بھلائی کے لیے گرم جوشی کرتا ہے ، اُتنا ہی ہم اس کو مغرور اور بیہودہ جانتے ہیں - حقیقت میں ناصح جس کام میں نصیحت کرتا ہے اُس میں وہ اپنی برتری دکھاتا ہے - سوائے اِس کے کوئی اَور وجہ نصیحت کرنے کی نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے تئیں بمقابل ہمارے بڑا جانتا ہے اور ہمارے طور طریقے ، فہم و فراست کو ناقص سمجھتا ہے - ایسا ناصح بننا کہ پند و اِندرز اِس طرح کرے کہ وہ لوگوں کو خوشگوار ہوں اور تلخ نہ معلوم ہوں ، نہایت دشوار ہے - ناصح ہونے کا فن نہایت مشکل ہے - جس کو جتنا وہ آتا ہے ، اُتنا وہ مشہور ہوتا ہے - ناصحوں نے

۱- کہربا = مقناطیس -

اپنے اپنے وہ طور اور طریقے جداگانہ مقرر کیے کہ جن سے پند و نصیحت کی تلخی میٹھی معلوم ہو۔ کسی نے نصائح کو فصاحت و بلاغت کا لباس پہنایا، کسی نے نظم میں اپنی لَے کے ساتھ گایا، کسی نے انھیں ظرافت کا لباس پہنایا، کسی نے مختصر ضرب المثل میں انھیں سمویا[1]۔ مگر ان سب سے بہتر طریقہ نصیحت کرنے کا یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ بے زبان حیوانوں کی حکایات و نقلیات قصص میں، خواہ کسی رنگ ڈھنگ کی ہوں، وہ بیان کی جائیں۔ اس طریقے سے کوئی صدمہ دل کو نہیں پہنچتا اور نہ ان پر وہ اعتراض ہوتے ہیں جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ ان کے پڑھنے میں افسانے کی تفریح کے سوا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے تئیں آپ نصیحت کرتے ہیں۔ مصنّف نے تو کتاب کو فقط دل خوش کرنے کے لیے بنایا ہے اور ہم اس سے نصائح اخذ کرتے ہیں۔ یہ ہماری ذکاوت اور طبیعت کی جودت ہے۔ بڑی خوبی اس میں یہ ہے کہ ہم کو ذرا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم کسی دوسرے شخص کی پیروی کر رہے ہیں، بلکہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم اپنی[2] آپ ہدایت کر رہے ہیں۔ غرض یوں اِن قصّوں کے دموں[3] میں آن کر ہم زیادہ ہوش مند و خرد مند ہوتے جاتے ہیں اور کوئی نصیحت تلخ اور ناگوار نہیں گزرتی۔ انسان کی خِلقت میں یہ امر داخل ہے کہ وہ اُن باتوں سے خوش ہوتا ہے کہ جن سے اپنی قابلیت اور لیاقت کے کمال کا خیال پیدا ہو۔ یہ بات اُن قصص و حکایات کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہے کہ جس سے وہ یہ فخر کرتا ہے کہ میں آدھا مصنّف ہوں۔ الفاظ مصنّف کے ہیں اور معانی میرے ہیں، اور جو کچھ نتائج اس سے پیدا

۱- اصل : سمایا۔ ۲- اصل : اپنے۔

۳- دم میں آنا = فریب میں آنا۔

ہوتے ہیں وہ میری طبیعت اور فکرِ رسا کے پیدا کیے ہوئے ہیں ۔ اس سے دل راضی ہوتا ہے اور اپنی خوش فہمی پر ایک ناز ہوتا ہے ۔ اور وہ دل سے ایسی کتابوں کو ، جن سے یہ کیفیت حاصل ہو ، عزیز رکھتا ہے ۔ گو یہ طریقہ نصیحت و پند کرنے کا ذرا پھیر پھار کا ہے اور ناک کو پھیر کر بتلانا پڑتا ہے ، مگر وہ ایسا مرنج و مرنجان ہے کہ پہلے زمانے نے بادشاہوں اور بادشاہ زادوں کی تعلیم اور نصیحت کے لیے اس طریقے کو زیادہ پسند کیا تھا ۔ ان کے پڑھنے کے واسطے بہت سی کتابیں ایسی حکایات کی تصنیف ہوئیں جو اب تک موجود ہیں ۔

ہم یہاں صرف سلطان محمود غزنوی[1] کی ایک نقل لکھتے ہیں ۔ اِس سلطان کا دستور تھا کہ جن ملکوں کو فتح کرتا ، اُن کو برباد زیادہ کیا کرتا تھا ۔ چنانچہ آدھا ایران اس کے ہاتھ سے تباہ ہو کر خاکِ سیاہ ہو گیا ۔ اس کا ایک وزیر تھا جو سب جانوروں کی بولیاں سمجھتا تھا ۔ منطق الطیر سے خوب واقف تھا ۔ اتفاق سے وہ اور سلطان دونوں شکار کو گئے ۔ شام کو خیمہ گاہ پر واپس آئے ۔ راہ میں ایک کھنڈر کی پرانی دیوار کے پاس ایک درخت پر دو اُلّو بیٹھے ہوئے بول رہے تھے ۔ سلطان نے وزیر سے پوچھا کہ تم ذرا جا کر سنو تو سہی کہ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں ۔ تم تو ان کی بولی خوب

۱۔ سلطان محمود غزنوی : (۹٦٧ع — ۱۰۳۰) سبکتگین کا بیٹا اور اسلامی تاریخ کا عظیم ہیرو ۔ افغانستان کو فتح کرنے کے بعد ہندوستان پر چڑھائی کی ۔ اس عظیم مسلمان بادشاہ نے ہندوستان پر ۱۷ حملے کیے اور ہندوؤں کا قدیم ترین بت خانہ سومنات جو سونے چاندی اور زر و جواہرات سے بھرا ہوا تھا اسے فتح کیا اور سومنات دیوتا کا سونے کا بت غزنی لے گیا ۔ ۱۰۳۰ع میں ٦۳ سال کی عمر ، ۳۲ برس کی سلطنت کے بعد پیمانۂ عمر لبریز ہوا ۔

۲۔ منطق الطیر : پرندوں کی زبان ۔ اس نام کی ایک کتاب بھی ہے ۔

سمجھتے ہو - وزیر یہ حکم سن کر درخت کے پاس گیا اور وہاں کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا - پھر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ میں حضور سے ان کو گزارش نہیں کر سکتا - سلطان کو وزیر کے اس کہنے سے اور زیادہ شوق ہوا اور اس نے تاکید کی کہ تم ضرور ذرا ذرا ان باتوں کو سنا دو - ایک بول بھی ان کا نہ چھوڑو - تو وزیر نے مجبور ہو کر عرض کی کہ جہاں پناہ سلامت! یہ دونوں آپس میں اپنے بیٹے بیٹی کے بیاہ کی باتیں کرتے تھے - بیٹے والے نے بیٹی والے سے کہا کہ میں اپنے بیٹے کا بیاہ تمھاری بیٹی کے ساتھ اِس شرط سے کروں گا کہ تم جہیز میں پچاس ویران گاؤں دو - بیٹی والے نے کہا کہ تم پچاس گاؤں کیا کہتے ہو، میں پانچ سو اجڑے ہوئے گاؤں دے دوں گا - خدا سلطان محمود کو زندہ سلامت رکھے، ویرانِ دہات کی پھر کیا کمی ہے - اس کی بدولت ملک کے ملک ویران پڑے ہیں -

کہتے ہیں کہ وزیر کے اس کہنے سے سلطان محمود کے دل پر وہ اثر ہوا کہ اُس نے تمام شہر اور قصبے اور دِہات جو ویران پڑے تھے، پھر از سرِ نو آباد کر دیے اور جب تک زندہ رہا، کسی بستی کو ویران نہیں کیا -

تم یہ سن کر بڑے ہنسو گے کہ حکیم دیمو قریطس[1] نے لکھا ہے کہ چند پرند ہیں کہ اگر ان کے لہو کو ملاؤ تو اِس سے ایک سانپ پیدا ہوگا - اگر کوئی اُس سانپ کو کھا جاوے تو وہ تمام پرندوں کی زبان سمجھنے لگے گا - اگر حکیم صاحب نے یہ نسخہ نہ ایجاد کیا ہوتا تو اوپر کی حکایت میں کچھ لطف نہ ہوتا اور سلطان محمود وزیر

۱- حکیم دیمو قریطس : (۵ قبل مسیح) یونان قدیم کا معروف فلسفی -

کی بات نہ سنتا۔

۲- سود مند نصائح اور نیک صلاح اکثر کیوں نہیں مانی جاتیں؟:
دنیا میں بہت تھوڑی چیزیں ایسی مفت ملتی ہیں جیسے کہ سود مند نصائح اور نیک صلاح ۔ وہ بڑی دریا دلی اور فیاضی سے تقسیم ہوتی ہیں ، مگر لوگ ان کو ایسا نہیں قبول کرتے کہ جس سے ان کی اصلاح ہو جائے بلکہ متمردانہ ان کا مقابلہ کرتے ہیں ۔ اب کوئی اس کا سبب نصیحت پانے والوں کا قصور بتلاتا ہے کہ لوگوں کا دل ایسا سخت ہوتا ہے کہ اب امید باقی نہیں رہی کہ نصیحت ان پر اثر کر کے ان کی اصلاح کرے ۔ لیکن بعض اربابِ دانش ، حقیقت آگاہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ مُصلحین اور ناصحین کی خطا ہے کہ وہ آن قوانین اور قواعد سے ماہر نہیں ہوتے کہ جن سے اُس نیک ساعت کی علامات معلوم ہوتی ہیں کہ جس میں آدمی کا دل عقل و راستی کی طرف ایسا راغب ہوتا ہے کہ وہ نیک صلاح اور سودمند نصیحت کو قبول کر لیتا ہے ۔ غرض ان کے وقت شناس نہ ہونے سے نصائح اپنی تاثیر نہیں کرتیں ۔ اِن دونوں باتوں میں سے کوئی بات ہو ، ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ دنیا کی حالت ایک ہی سی چلی جاتی ہے کہ نصیحت و پند بڑی کراہیت کے ساتھ قبول کی جاتی ہے ۔ اب تک کوئی ترکیب ایسی ایجاد نہیں ہوئی کہ اس سے دوا کی تلخی کم ہوتی اور اس کے اثر کی قوّت زیادہ ۔ گو ناصحین اور مصلحین بڑی گرم جوشی و مستعدی اور محنت و مشقّت سے اپنا کام کرتے ہیں مگر ان کے اوضاع و اطوار ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے قول کا اثر کچھ مترتّب نہیں ہوتا ۔

نصائح چند مسائل اور احکامِ شرعی ہوتے ہیں کہ جن کی تکمیل کی تاکید و تنبیہ ہوتی ہے مگر ان کی تعمیل کا محل اور موقع نہیں دیکھا جاتا ۔ اٹکل پچّو وہ گائے جاتے ہیں ۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ

ناصح کو دوسرے آدمی کا علم ایسا نہیں ہوتا جو ہدایت اور نصیحت کے اثر قبول کرنے کے لیے ضرور ہونا چاہیے - پس جو شخص اَوروں کے امراضِ روحانی کا علاج کرتا ہے اور اسبابِ امراض سے لا علم ہوتا ہے، اُس کے نسخے کب کارگر اور پُر اثر ہو سکتے ہیں - بعض اوقات ان کو اپنا ہی علم ایسا نہیں ہوتا کہ اپنے افعال کے اسباب کو صحیح جانیں - جب یہ اسباب ان کو معلوم ہو جاتے ہیں تو ان کو وہ عموماً لوگوں سے چھپاتے ہیں - خصوصاً اُن بزرگوں سے جو حکومت کے سبب سے یا عقل و فراست کی وجہ سے ان کے نگرانِ حال ہو سکتے ہیں - ناصح بننے میں ایک طرح کی بزرگی کا اظہار دوسرے پر ہوتا ہے، اسی لیے ہر شخص دوسرے کو نصیحت کرتا ہے، اور اِسی سبب سے دوسرا شخص اسے قبول نہیں کرتا - نیک اور عقل مند ہونے میں بزرگی اور علوِّ جاہ بڑی قیمت دے کر ہاتھ آتی ہیں، مگر جہاں سرافرازی اور عالی مرتبگی فقط اَوروں کی خطائیں اور حماقتیں بتلانے اور دکھلانے سے حاصل کی جاتی ہیں وہاں لوگ ایسے غافل نہیں ہوتے کہ اس بلندی کو پستی نہ سمجھیں -

نصیحت و اصلاح کے طریقے لوگ کوشش کر کے اس لیے اختراع کرتے ہیں کہ جن سے ان کی شہرت پر پر لگ جائیں اور وہ آسمان پر اُڑ جائیں اور سب ان سے نیچے نظر آئیں - اکثر لوگ جو نصیحت کرتے ہیں اور صلاح کی اصلاح بتاتے ہیں وہ اَوروں پر بغیر اُن کی اجازت کے حکومت جمانی چاہتے اور اپنی نیک چلنی اپنی آنکھوں کے سامنے بڑی بنانا چاہتے ہیں - اور اس سے اکثر اپنا تفاخر و تکبّر و تشخّص مقصود ہوتا ہے - اسی لیے لوگ ان کی بات کو نہیں مانتے اور تمام قوّت کو ان کے مقابلے میں لاتے ہیں، بغیر اس کے کہ وہ یہ دریافت کریں کہ نصیحت و اصلاح نیک اور سودمند ہے - ہر شخص کو دوسرے کی

نگرانی اپنے حال کی اصلاح کے لیے ایسی بری معلوم ہوتی ہے کہ اصلاح و نصیحت میں خواہ کیسی ہی نرمی اور ملائمت کوئی برتے، وہ اس سے انتقام کے درپے ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ احسان بھی مانتا ہے تو انتقام کے طور پر، کہ فوراً احسان کا معاوضہ کر کے اس کا بوجھ اپنے سر سے آتارتا ہے - جب تک وہ نہیں آترتا ہے، اس کا دل دُکھتا ہے - اپنی فروتری کا خیال ایسا دل دُکھاتا ہے کہ وہ ناصحِ مُصلح کی برتری کو نہیں دیکھ سکتا - اصل بات یہ ہے کہ انسان کی بھلائی کے نامحقّق ہونے کا زور ایسا ہے کہ وہ نصیحت اور اصلاح پر یقین نہیں ہونے دیتا -

جو مُصلح و ناصح سخت زبان و متکبّر و ضدی ہوتے ہیں، وہ یہ دیکھ کر کہ ملائم و نرم ناصح سے بھی لوگ انتقام کے درپے ہوتے ہیں، اِس شبہے میں پڑ جاتے ہیں کہ ان کی سخت زبانی اور تکبّر نے لوگوں کے دلوں میں انتقام کا جوش نہیں پیدا کیا - گو بدافعال ناصحین کی تعداد زیادہ نہ ہو مگر اس میں شبہ نہیں کہ اُن ناصحین و مصلحین کی تعداد بہت ہی کم ہے کہ جن کی غرض نصیحت و اصلاح سے اپنا تشخّص و تفاخر مقصود نہ ہو اور وہ موعظتِ حسنہ کرتے ہوں: یعنی وہ پند و نصیحت محض دوسرے کی بھلائی کے لیے کرتے ہوں اور اس میں کوئی غرض اپنی مقصود نہ ہو -

ایک حکیم کا قول ہے کہ مردہ مُصلح و مشیر بے خوف ہوتے ہیں - قبر میں ان کی ریاکاری اور خوشامد گری دفن ہو جاتی ہے - جو کتابوں سے ہم کو آگاہی ہوتی ہے، وہ خود غرضی اور خوف اور جاہ جُوئی سے پاک صاف ہوتی ہے - پس اس لیے وہ ناصحین سے زیادہ پند و اِندرز حاصل کر سکتے ہیں - ان کو لوگ زیادہ ادب و تعظیم سے سنتے اور مانتے ہیں - جن آدمیوں سے رقابت اور مقابلے کا خوف نہیں

ہوتا ، اگر ان کی لیاقت سے ہم کو فائدہ پہنچتا ہے تو ہم ان کو اپنے سے زیادہ عاقل تسلیم کرنے میں دریغ نہیں کرتے - ان کے تجربے کی روشنی سے ہم فائدہ بغیر اس کے اُٹھاتے ہیں کہ ان کی گستاخی کے شعلے ہماری آنکھوں کو جلائیں - کتابوں سے صلاح و مشورہ لیتے ہیں ، خواہ وہ مردہ مصنّفوں کی تصنیف سے ہوں یا زندہ مصنّفوں کی - وہ جھگڑے ٹنٹے اور مقابلے و مجادلے نہیں پیش آتے جو زبانی نصائح سننے میں -

مصنّف سے جو صلاح و نصیحت پوچھی نہیں جاتی ، وہ اس کے سنانے کے لیے جبر نہیں کرتا - کوئی اس پر خباثتِ حقد و کینہ کا شبہ نہیں ہوسکتا کہ جس کے سبب سے وہ پڑھنے والوں پر اپنی ذہانت و علمیّت سے طعن و طنز کرتا ہو - مگر انسان میں دوسروں سے اپنے تئیں مقابلہ کرنے کی وہ غضب کی عادت پڑی ہوئی ہے کہ کتابیں بھی بالکل بے تعصّب و جانب داری کی سوائے اُن مصنّفوں کی کتابوں کے وہ بہت کم پڑھتا ہے جو اُس سے ایسے دور رہتے ہیں کہ جن کے جینے مرنے کی پروا اس کو نہیں ہوتی -

ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی جلدیں کی جلدیں پڑھتے ہیں ، اور پڑھتے بھی ہیں سوچ سمجھ کر ، مگر اس کا اثر بہت تھوڑا ہوتا ہے - بہت سے مسائل ، عقل اور نیکی کے ، حافظے میں ذخیرہ ہو جاتے ہیں مگر چال چلن پر وہ کچھ مؤثر نہیں ہوتے - ہزاروں آدمی ایسے ہیں کہ ساری زندگی کتابوں میں صرف کرتے ہیں مگر ان میں بہت تھوڑے ایسے ہیں کہ جن کی پڑھنے سے یہ غرض ہو کہ ہم اپنے تئیں عقل اور نیکی میں روز بروز برتر بناتے چلے جائیں ، اور اپنی برائیوں پر تبرّا کریں ، اور عدالت اور راستی کے موافق اپنے چلن کو درست کریں - اکثر پڑھنے والوں کا پڑھنے سے اُس وقت کا کاٹنا مقصود ہوتا ہے جس

میں کوئی اَور کام دل بہلانے کے لیے نہیں ہوتا ۔ اور یہ بھی کچھ مطلب ہوتا ہے کہ علم کے سبب سے کچھ فائدہ ، کچھ عزت بھی حاصل ہوتی ہے اور معلومات بھی نئی نئی ہوتی ہیں ۔ غرض علم کو وہ ایسا خزانہ بناتے ہیں جو زمین میں دفن کیا ہو یا فراموش ہو کہ جس سے نہ خود کچھ فائدہ حاصل ہو اور نہ اَوروں کو نفع پہنچے ۔

ایک عالم کہتا ہے کہ واعظ ممبر پر بیٹھ کر گھنٹا بھر تک ایک آیت کی تفسیر یا ایک مسئلے کی مفصّل تقریر کرتا ہے مگر اس کا اثر کچھ بھی نہیں ہوتا ، کیونکہ اس کا مقصود سوائے اس کے نہیں ہوتا کہ میرا گھنٹا کام سے خالی نہ رہے ۔ ایک طالب علم اپنی ساری عمر مذہب و اخلاق کے مسائل کی تحقیقات میں عالموں کا مقابلہ کرتا ہے مگر کچھ اس کو اپنے اخلاق اور مذہب کی درستی کا خیال نہیں ہوتا ۔ وہ علم اس لیے نہیں سیکھتا کہ کیونکر زندگی نیک طور پر بسر کرے بلکہ اس لیے کہ کیونکر بحث اچھی طرح کرے ۔ وہ تمام استدلال کی استواری اور عبارت کی فصاحت و بلاغت کو اور ان کی ترکیب کی صحت کو اس لیے دیکھتا ہے کہ اَوروں کی نکتہ چینی اچھی طرح کر سکے اور مخالفین سے مباحثہ و مناظرہ خاطر خواہ کرے ۔ کتابوں کا جو اصل نفع ہے اس پر وہ خیال نہیں کرتا ۔ ان کا اثر اس کے دل پر ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی زندگی کی اصلاح کرے ۔

گو راستی کو اکثر شکستیں ، غرور اور حماقت ، ضد و ہٹ سے ہوتی رہتی ہیں مگر ہم کو راستی سے بھاگنا نہیں چاہیے ۔ جو ذہین آدمی خاص اپنے واسطے کوئی طریقہ ذہانت کا مقرر کرتا ہے ، وہ اَور آدمیوں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے ۔

تزکیۂ نفس کے دلائل کی ناکامی کا سبب ان کا رد ہونا نہیں ہوتا بلکہ ان کی طرف بے توجہ ہونا ہوتا ہے ۔ تم کو چاہیے کہ جہاں نیکی

دیکھو ، اُس کو پیار کرو اور جہاں حق سنو ، اُس کی اطاعت کرو۔

۱۴۵- سخاوت و رحم

۱- سخی خاں ایک بڑے نامور ، دوسرے حاتم طائی دنیا میں مشہور تھے۔ ان کی دریا دلی ایک عالم میں مشہور تھی۔ سائل کے منہ سے سوال نکلنے نہ پاتا تھا کہ وہ اس کو پورا کر دیتے تھے۔ ان کی فیّاضی کا فیض عام تھا۔ ان کا ابرِ کرم سب پر برستا تھا۔ یگانہ بیگانہ ، دوست و دشمن سب پر یکساں تھا۔ کسی کے ساتھ اس کی خصوصیت نہ تھی۔ اس داد و دہش کی دھوم تھی۔ مگر چند آدمی ان میں یہ عیب بتاتے تھے کہ وہ اپنا قرضؔ نہیں چکاتے۔ اگرچہ یہ عیب سخاوت کی نقیض معلوم ہوتا ہے مگر اس کا سبب بتانا چنداں مشکل نہیں ہے۔ قرض خواہوں کا قرض ادا کرنا انصاف ہے ، سخاوت کا کرنا عظمت و شان کا دروازہ اپنے اوپر کھولنا ہے۔ سخاوت اُن عالی ؔمنشوں کا کام ہے کہ جن کی طبیعت عوام کی طرح دوں ہمّت نہیں ہوتی۔ جیسے شجاعوں کی شجاعت کی تعریف ہوتی ہے ، ایسے سخیوں کی سخاوت کی۔ سخاوت میں کچھ باتیں شجاعت کی پائی جاتی ہیں۔ سخاوت کو دل و جان سے لوگ اچھا جانتے ہیں۔ برخلاف اس کے انصاف ایک غریب نیکی ہے جس کا برتاؤ روزمرہ کے کاموں میں سوداگر ، دلال وغیرہ کیا کرتے ہیں۔ قرض چکانا اپنا فرض ادا کرنا ہے ، کوئی ناموری اور نیک نامی کی بات نہیں۔ اگر خاں صاحب اپنا قرض چکا دیتے تو کس کی بلا کو غرض پڑی تھی کہ ان کی عطا و سخا کی حکایتیں ہر ایک کو سناتا پھرتا۔ مگر سخاوت ایسی نیکی ہے کہ منظرِ بلند پر بیٹھ کر اپنے وہ ادا و انداز دکھاتی ہے کہ لوگ اس پر فریفتہ ہو کر اس کی طرف خود کھنچے چلے جاتے ہیں۔

انسان کی عادت ہے کہ وہ انصاف کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے اور سخاوت کو ادب کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مگر عدالت ایسی نیکی ہے کہ اجتماعِ انسانی کے واسطے ضروری اور لازمی ہے۔ سخاوت کا ظہور فقط آدمی کی تیز مزاجی سے ہوتا ہے، کچھ اس کو عقل سے علاقہ نہیں ہے۔ اگر سخی خاں صاحب کا نوکر جا کر عرض کرتا کہ مہاجن کھڑا ہے، اپنے قرض کے چار سو مانگتا ہے؛ اور ایک آپ کا مفلس آشنا بھی کھڑا ہے، وہ بھی اتنے ہی روپے مانگتا ہے، تو خاں صاحب بے تأمل آشنا کو روپے دے دیتے اور مہاجن کو یہ سمجھ کر ٹال دیتے کہ ایک احسان کا متوقع ہے اور دوسرا قرض کا۔ احسان کرنا قرض ادا کرنے سے اچھا ہے۔ اصل حال یہ ہے کہ آدمی انصاف کی عظمتِ معنی سے خوب آگاہ نہیں۔ وہ انصاف کے فقط یہ معنی سمجھے بیٹھا ہے کہ سوسائٹی کا قانون جن فرائض کا پابند کرے، اُن کا کاربند رہے۔ ہاں انصاف کے مروج معنی یہی ہیں لیکن جب انصاف کے معنی اصلی عدل کے لیں تو وہ تمام نیکیوں کی اصل ٹھیر جاتی ہے۔ عدل وہ نیکی ہے جو اِس امر کی تاکید کرتی ہے کہ جس کا جو حق ہو وہ ادا کیا جائے۔ اس معنی میں وہ کل نیکیاں داخل ہیں جن کا حکم عقل اور اجتماعِ بنی آدم دونوں کرتے ہیں۔

ہم پر حقوق تین طرح کے ہیں: حقوقِ الٰہی، حقوقِ عباد (یعنی دوسروں کے)، حقوقِ نفس (اپنی ذات کے)۔ پس جب یہ سارے حقوق عدل کے سبب سے ادا ہوں تو سب نیکیوں کی اصل عدل میں شامل ہوگی۔ عظمت، سخاوت، شجاعت جب ہی نیکیاں کہلا سکتی ہیں کہ ان میں اعتدال یعنی عدالت ہو۔ ان کا نیکیوں میں جب ہی شمار ہو سکتا ہے کہ وہ بمقتضائے عدالت ہوں۔ اگر ان میں عدل نہ ہوگا تو ان کا نام نیکیوں سے خارج ہو جائے گا۔ عفّت بے عدالت شرارت

ہے ۔ شجاعت بے عدالت کے جُبن یا تہوّر ہے ۔ سخاوت بے عدالت کے بخل یا اِسراف ہے ۔ اگر کسی بے غرض کام میں عدل ہادی نہ ہو ، وہ ایک بے اعتنائی کا کام سمجھا جائے گا اور اکثر اس کا نتیجہ برا ہی ہوگا ۔ اگر دوستوں کے جلسوں کے تحفہ تحائف دینے کے ، ضیافتوں کے کرنے کے اور خوشی کے سامانوں کے خرچ ، فاضل آمدنی کو کسی بہتر کام میں لگانے سے باز نہ رکھیں تو نہ کوئی ان کو اچھا کہے گا ، نہ برا ۔ مگر یہ خرچ اُس وقت برے کہلاتے ہیں کہ وہ ایسے بڑھ جائیں کہ آدمی کو اور کسی اچھے کام میں اعانت کرنے کے قابل نہ رکھیں ۔ عقل نے جو فرائض انسان پر واجب کیے ہیں ، ان میں سے ایک سخاوت بھی ہے ، اس لیے عاقل کو اس کی پابندی واجب ہے ۔ مگر سخاوت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اپنے جذباتِ دلی میں ایسے دیوانے ہو جائیں کہ جس کام پر مروت تحریک کرے تو ایسی فیّاضی بڑھ کر کریں کہ پھر کسی سخاوت کے کام ہی کے نہ رہیں ۔

بخیل ، کنجوس مکھّی چوس مشہور ہوتے ہیں ۔ لوگ ان کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کو انسانیت سے اس لیے خارج سمجھتے ہیں کہ وہ صرف دولت کے جوڑنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں ، اور ان کو پاگل جانتے ہیں کہ صرف خیالی ضرورتوں کو اصلی ضرورتیں جان کر تمام عیش چھوڑ دیتے ہیں ۔ مگر دنیا میں ایسے کنجوس تھوڑے ہوں گے کہ جن میں وہ سارے عیب پائے جائیں جو اُن کی نسبت بیان ہوتے ہیں ۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ کاہل ڈینگ مارنے والے ، شیخی باز بخل کی تہمت اُن لوگوں پر رکھتے ہیں جو بڑے جفا کش ، محنتی ، کفایت شعار ہوتے ہیں اور اپنی نیک خوئی اور خوش وضعی سے اپنے برابر والوں سے برتر ہو جاتے ہیں ۔ یہ لوگ خواہ اِن کی نسبت کچھ ہی کہیں ، مگر ان کی افزائش سے سوسائٹی کو بہت

فائدہ پہنچتا ہے ۔ لالچی آدمیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں شاید اِتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا کہ فضول خرچ اور مُسرف آدمیوں کے ساتھ ۔

ایک پادری صاحب ایک شہر میں رہتے تھے ۔ سارے شہر نے ان کا نام کنجوس مکھی چوس رکھ چھوڑا تھا ۔ ان کے پاس خواہ کوئی محتاج ، آفت زدہ ، مصیبت کا مارا اپاہج آتا ، مگر وہ کبھی کسی کو جھنجی کوڑی بھی نہ دیتے ۔ ان کے پاس انگوری باغ تھے ، ان کے عمدہ انتظام سے بہت روپیہ جمع کر لیا تھا ۔ سارا شہر ان سے نفرت رکھتا تھا ، ذلیل و خوار ان کو سمجھ کر ان کی عزت کوئی نہ کرتا تھا ۔ مگر پادری صاحب کو اِس کی کچھ پروا نہ تھی ۔ ان کی جو اپنی سیدھی چال تھی ، اسی پر چلتے تھے ۔ کفایت شعاری کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے ۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اس شہر میں غربا کو پانی بڑی مشکل سے میسّر ہوتا ہے اور بہت کچھ روپیہ ان کو اس کی قیمت میں دینا پڑتا ہے ، اس لیے انھوں نے اپنی ساری جمع کی ہوئی کمائی ایک نہر کے بنانے میں خرچ کر دی کہ جس سے شہر والوں کو چین آرام ملا ۔ اب اگر وہ اپنے دروازے پر فقیروں کی بھیڑ لگا کے پیسے بانٹا کرتے تو کب ایسا فائدہ غریبوں کو پہنچا سکتے تھے ۔ نہر کے جاری کرنے سے خیرِ جاری ہمیشہ کے لیے کر سکتے تھے ۔ یہ خیرِ جاری ان کی اور خیراتوں سے ہزار درجے بہتر تھی ۔ اکثر طلبہ میں ، جو کتابوں کو زیرِ مطالعہ بہت رکھا کرتے ہیں ، وہ بے جا نیکیاں زیادہ تر ہوتی ہیں جن کی شکایت اوپر لکھی ہے ۔ اہلِ علم کے دل میں ان نیکیوں سے بڑی خوشی پیدا ہوتی ہے اور وہ ان کے بڑے بڑے نام رکھ لیا کرتے ہیں ۔

فلسفی اپنے رنگین خیالات کو فضول فرائض کے بیان میں ، بہ نسبت ضروری فرائض کے ، کام میں لاتا ہے ، اس لیے جو صرف کتابوں کے

ذریعے سے انسانیت کا مطالعہ کرتے ہیں ، وہ آدمیوں کی جھوٹی بناوٹ کی تکالیف کو جب دیکھتے ہیں تو ان کا دل موم کی طرح پگھلتا ہے اور وہ بے جا فیّاضیاں ایسے موقعوں پر اِتنی کرتے ہیں کہ خود مثل محتاجوں کے ہو جاتے ہیں ۔ اب ہم اس مضمون کو ایک پرانے عالم کی نصیحت پر ختم کرتے ہیں جو اس نے ایک نوجوان کو کی تھی ۔ اس عالم نے دیکھا کہ ایک نوجوان نے اپنا کل سرمایہ ایک مکار فقیر کو دے دیا ، تو اس نے نوجوان کو یہ نصیحت کی کہ تمھارے ایمان دار ہونے کا مجھے یقین ہے اور[1] جس کو تم نے سرمایہ دیا ہے وہ بھی ممکن ہے کہ شاید ایمان دار ہو ، لیکن یہ تمھاری فیّاضی اس شخص کا مال چُرانا ہے جو اِس مال کا مستحق ہے اور اس شخص کو[2] دینا ہے جو ممکن ہے کہ بدمعاش ہو ۔ پس جب تم ایسی ناانصافی سے ایک ایسے آدمی کو صلہ عطا کرتے ہو جس کا استحقاق نا تحقیق ہے تو تم اپنے تئیں محتاج بنا کے دوہرا گناہ کرتے ہو ۔ (یعنی مستحق سے لیتے ہو ، غیر مستحق کو دیتے ہو) ۔

۲۔ سخاوت کو بھی عبادتِ الٰہی کا ایک جزو اکثر آدمی سمجھتے ہیں ۔ غریبوں و مسکینوں کی اعانت کو فرضِ مذہبی جانتے ہیں ۔ دنیا کی تاریخ میں سخاوت کی بہت سی مثالیں بے نظیر موجود ہیں ۔ مگر اب جو زمانۂ حال میں خیرات کے طریقے ایجاد ہوئے ہیں ، وہ پہلے متقدّمین کو معلوم نہ تھے ۔ آن کی سخاوت خود غرضی پر مبنی ہوتی تھی ۔ ایک آدمی کو انھوں نے مصیبت زدہ دیکھا جس کا روبرو ہونا ان کو برا معلوم ہوا ۔ اس کو کچھ دے دیا ، وہ چلا گیا ، دینے والے کے دل کو چین آ گیا ۔ یا کوئی مذہبی خیال کا آدمی ہوا تو وہ یہ سمجھا

۱۔ اصل : مگر جس کو ۔ ۲۔ اصل : کا ۔

کہ خدا کے نام پر یہ رشوت دینے سے جنّت مجھے مل جائے گی ۔ گو بہ تحقیق نہیں معلوم ہوتا کہ پرانے طریقوں سے جو خیرات میں روپیہ دیا جاتا تھا اُس سے اب کچھ زیادہ دیا جاتا ہے ، جس سے معلوم ہو کہ اب زیادہ فیّاضی کرتے ہیں ، مگر اِس میں شک نہیں کہ اب جن طریقوں سے روپیہ دیا جاتا ہے وہ ایسے ہیں کہ پہلے طریقوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں ۔ لیڈی ڈفرن فنڈ کے واسطے جو چندہ جمع ہوتا ہے ، اِس قسم کا چندہ پہلے کبھی نہیں جمع ہوا ۔ تعلیم کے لیے جن طوروں اور طریقوں سے روپے لیے جاتے ہیں ، وہ پہلے کبھی سننے میں بھی نہیں آئے ۔ آنریبل سر ڈاکٹر سید احمد خاں[1] نے جن طوروں سے مسلمانوں کی اعلیٰ درجے کی تعلیم کے واسطے روپے کو جمع کیا ہے ، اُس کی نظیر مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں ہے ، گو اس سے کہیں زیادہ مسلمانوں کے ہاں روپے کی سخاوت کی مثالیں موجود ہیں ۔

۱۴۶۔ کامل و کمال

۱۔ کمال کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کی تمام جسمانی ، روحانی ، عقلی ، اخلاقی قابلیتوں اور استعدادوں کا ظہور ایک موزونیت و مسرّت کے ساتھ ہو ۔ مسرّت سے مراد ہماری اُس خوشی سے ہے جو اَور تمام خوشیوں کی مہتمم ہو ۔ ایسی مسرّت و کمالِ انسانی[2] دو طرح کے

۱۔ سر سید احمد خاں : (۱۸۱۷ء—۱۸۹۸ء) مسلمانانِ ہند کی نشاۃ الثانیہ کے مؤسس اول ۔ آپ عربی الاصل تھے ۔ دہلی میں متولّد ہوئے ۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے ان کے مقالات کی سولہ اور خطبات کی دو جلدیں شائع کی ہیں ۔ ان جلدوں کے مرتّب مولوی محمد اسماعیل پانی پتی مرحوم نے سر سید احمد خاں کی اٹھائیس مستقل تصانیف کا سراغ لگایا ہے ۔

۲۔ اصل : ایسی مسرّت و کمال انسانی کمال ۔

ہوتے ہیں : ایک اضافی ، دوسرا مطلق ۔ کمالِ اضافی یہ کہ کسی فرد میں اپنی نوع کی کل صفات اعلیٰ درجے کی ہوں ۔ کمالِ مطلق وہ ہے جو خدا کے ساتھ مخصوص ہے ۔ وہ کسی دوسرے میں نہیں ہو سکتا ۔ خدا کے کمال میں وہ اوصاف داخل ہیں جو اس نے حیوانِ ناطق کو عطا کی ہیں ۔ مگر یہ اوصاف اس کی ذات میں بے انتہا اعلیٰ درجے کے ہیں جن سے بڑے[1] اور بہتر عقل کے تصوّر میں بھی نہیں آ سکتے ۔

۲۔ کمال کے معنی جو اوپر بیان کیے ہیں وہ انسان کو ، خواہ افراد کے اعتبار سے خواہ اجتماع کے لحاظ سے ، اپنی عمر میں حاصل ہو سکتا ہے ۔ تاریخ اور تجربے سے یہ امر یقینی ثابت ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ ترقی کرتا اور بہتر ہوتا چلا آیا ہے ۔ مگر یہ ترقی اور بہتری اس کمال کے درجے پر نہیں پہنچ سکتی کہ کل جسمانی اور روحانی برائیاں اس پر اثر نہ کریں ۔ جیسا کہ حال ایک فردِ انسانی کا ہے کہ وہ روز بروز علم میں بڑھتا جاتا ہے ، ایسا ہی کل نوعِ انسانی کا حال ہے کہ جتنی دنیا عمر میں بڑھتی جاتی ہے ، اتنی وہ علم میں ترقی کرتی جاتی ہے ۔ گویا نوعِ انسانی کو ایک فردِ انسانی ایسی سمجھو کہ وہ متواتر زمانوں میں علم سیکھتی چلی آئی ہے اور سیکھتی چلی جائے گی ۔ فردِ انسانی کو ترقی اور بہتری کے لیے جو معاملات پیش آتے ہیں ، وہی نوعِ انسانی کو ۔ ہم جو پہلے لوگوں کی دانائی کی بزرگی کی تعریف کرتے ہیں اور ان کی بزرگی پیری کے سبب سے مانتے ہیں ، اس میں غلطی کرتے ہیں ۔ پیری وہ ہے جو طفلی سے بعید ہو ۔ دنیا کا زمانہ جتنا پہلا لیتے جاؤ وہ اس کے عہدِ طفلی کے قریب ہوتا جائے گا اور عمر میں کم ہوتا جائے گا ، اور آگے جتنا زمانہ لیتے جاؤ وہ عہدِ پیری

۱۔ اصل : اعلیٰ درجے کی ہیں جن سے بڑی ۔

کے قریب ہوتا جائے گا۔ پس جو زمانۂ حال ہے وہی بزرگ ہے۔ اس میں دنیا کی عمر بڑی بہ نسبت پہلے زمانے کے ہے۔ اس لیے ہم زیادہ پرانے بہ نسبت پہلے لوگوں کے ہیں۔ پس جب پرانے آدمیوں کا ذکر ہو تو اس سے مراد ہم سے ہونی چاہیے، نہ وہ جو پہلے زمانے میں گزرے ہیں۔ ہمارے زمانے کی عمر اُن کے زمانے کی عمر سے بڑی ہے۔ ہم بڑے ہیں، وہ چھوٹے ہیں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ زمانے کی عمر جتنی بڑھتی گئی، انسان کی حالت طفلی سے نکلتی گئی اور اس کی عمر بڑھتی گئی۔ اُس نے تمام علوم و فنون میں، معاشرت کے اسباب و آرائش میں، عدالت میں، غلاموں کے آزاد کرنے میں، آزادی میں اور اس طرح کی سب باتوں میں ترقی کی، اور آیندہ وہ ترقی کرتا چلا جائے گا۔ مگر یہ ترقی ایک حد سے آگے نہیں چلے گی اور اُس کو کبھی وہ کمال نہیں حاصل ہوگا کہ اس کو مسرّت کے اسباب ایسے بہم پہنچ جائیں کہ رنج نہ ہو۔ اُس کی عقل ایسی صائب اور باصواب ہو جائے کہ خطا نہ کرے اور اپنی تدابیر میں غلطی نہ کرے۔ غرض اس میں کمالِ اضافی حاصل کرنے کی قابلیت ہے اور وہ حاصل کرتا ہے، مگر کمالِ مطلق حاصل کرنے کی قابلیت ہی نہیں ہے، وہ حاصل کیسے ہو سکتا ہے؟

۳- اگر ہم کو کسی علم و ہنر و فن میں یا کسی اور کام میں کمال کے درجے پر پہنچنا منظور ہو تو ایک ایسا بلند نشانہ اپنے لیے تجویز کریں کہ جس تک رسائی ہماری قابلیت اور استعداد سے باہر ہو۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری تحقیقات کا میدان وسیع ہوگا جس میں ہماری طبیعت خوب جولانیاں کرتی پھرے گی۔ جب کوئی شخص اپنے ہمراہیوں کو چھوڑ کر ایسے رستے میں چلے گا جو پہلے جانا بوجھا نہ ہو تو احتمالِ قوی ہے کہ وہ اپنی منزلِ مقصود پر نہ پہنچے گا۔ مگر

یہ ممکن ہے کہ راہ میں بہت سی نئی چیزیں دیکھے جو پہلے کبھی نہ دیکھی ہوں گی - اگر آدمی اُن راہوں پر چلے جن میں کچھ خوف و خطر نہ ہو اور اُن پر تھوڑے فائدے کا ملنا بھی یقینی ہو تو بھی اس سے عالی ہمّتوں کو خوشی حاصل نہیں ہوتی - فقط پہلی طرح راہ چلنے میں بڑے صِلوں کے ملنے کی امیدیں ان کو ہوتی ہیں[1] - اب تو زمانہ ایسا ہے کہ بزرگ مَنش عالی ہمّت ہمارے ملک میں نہیں پیدا ہوتے جو کوئی نئی بات ایجاد کریں، بلکہ جو شخص زمانے کی مسلّمہ رایوں کے خلاف کام کرتا ہے اور پہلے زمانے کی تقلید نہیں کرتا، اور مسائلِ قدیمہ کی تفسیر میں ذہانت نہیں صرف کرتا، پرانی لکیر نہیں پیٹتا، وہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ شیخ چلّی کے سے خیالات بے اصل رکھتا ہے - سینکڑوں آدمی اُس کی غلطیاں بتلانے ہی کے لیے نہیں کھڑے ہو جاتے بلکہ ہزاروں بے نُقط سناتے ہیں - جو پہلے لوگوں کی براہینِ ظنّی تھیں وہ اب یقینی سمجھی جاتی ہیں - جو مشکلات پہلے حل ہونے سے باقی رہ گئی تھیں، اب ان کا حل ہونا ناممکن سمجھا جاتا ہے - پہلے زمانے کے مصنّف ایسے یکتا اور بے نظیر سمجھے جاتے ہیں کہ اب ثانی اُن کا محالات سے سمجھا جاتا ہے - مگر قدیم فلسفے کا حال قابلِ افسوس ہے کہ وہ روشن ضمیر اتنا نہیں بناتا جتنا فہم و ذہانت کو تاریک کرتا ہے اور ان کی ترقی کو روکتا ہے اور ان کی جرأت ہمّت کو مٹاتا ہے - اس لیے ہم ایجاد اور اختراع کی راہِ مستقیم کو چھوڑے بیٹھے ہیں - اُس پر چلنے کا ارادہ نہیں کرتے - اسی کو غنیمت گنتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس آئے، اُسی کو حفاظت سے رکھیں - یہ امر تحقیق ہے کہ جو مصنّف پہلی راہ کو چھوڑتا نہیں اور خیالاتِ جدید کی تکلیف گوارا

۱- اصل : تھیں -

نہیں کرتا اور کوئی نیا جملہ زبان سے نکالتا نہیں ، اس کے دوست بہت تعریف کرتے ہیں اور نکتہ چیں بھی مری ہوئی آواز سے اُس کی مدح کر دیتے ہیں - مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ کمال کے درجے پر پہنچے - مصنّف کو قدر و منزلت مستقل فقط اِسی سے نہیں حاصل ہوتی کہ اس کے کلام میں غلطیاں بہت کم ہوں بلکہ اس میں حسن و خوبی و لطافت بھی ہو - جو عمدہ کتابیں ہیں اُن میں بہ افراط یہ دونوں باتیں موجود ہیں - عمدہ مصنّفوں کی عادت ہے کہ وہ اپنے خیالات کو زیادہ تر ضیافتِ طبائع کے لیے نقلوں میں منتقل کرتے ہیں - اگر وہ اس میں ایک دفعہ[1] غلطی کرتے ہیں اور ایک دفعہ صحیح لکھتے ہیں تو بھی لوگ اُن[2] کی غلطیوں کو معاف کر دیتے ہیں -

کوئی علم ایسا نہیں کہ اس میں اسرار ایسے نہ ہوں جو اب تک کسی پر نہ کھلے ہوں - پس آدمی کو چاہیے کہ اِن اسرار میں سے کسی ایک کو لے کر اس کی تحقیقات کے پیچھے پڑ جائے ، اور اِس سے شکستہ خاطر نہ ہو کہ پہلے محقّق اس تحقیقات میں ناکام رہے ہیں - ہمیشہ سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ ہر تفحّصِ جدید کا نتیجہ عمدہ یہ ہوا کرتا ہے کہ آیندہ تحقیقات کی راہ آسان گزار ہو جاتی ہے - ہم نے مانا کہ سنگِ پارس و اکسیر ہاتھ نہ آئے مگر اس کی جستجو میں بہت سی نئی چیزیں مل جاتی ہیں - جو دانا غیروں کے مشکل عقدوں کے حل کرنے پر قناعت کیے بیٹھے ہیں ، وہ اگر ان مصنّفوں کی شان و شکوہ و نیک نامی کو دیکھ کر متحیّر نہ ہوں اور خود اپنے لیے ایک راہ نیک نامی کی نکالیں اور جو تجربے کہ پہلے کسی نے نہیں کیے ہیں ، اُن کو آزمائیں تو وہ فقط دانش مند ہی نہیں ہوں گے

۱- اصل : دفعۃً -   ۲- اصل : اس کی

بلکہ اعلیٰ درجے پر منصوبے باندھنے والے اور موجد نئی چیزوں کے نکالنے والے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض قومیں ایسی ہیں کہ جنھوں نے علوم کے سمندر میں اپنا جہاز ڈال دیا ہے، اس کی سلامتی کے اسباب کو جمع نہیں کیا۔ اور بعض قومیں ایسی ہیں کہ وہ ساحل پر بیٹھی ایسی لرزاں ہیں کہ گویا ان کا جہاز تباہی میں آ گیا ہے۔ اور ایسے نادان ہیں کہ بادِ نرم کو بھی وہ اپنے لیے طوفان سمجھتے ہیں۔

کوئی کمال بغیر اس کے نہیں حاصل ہوتا کہ اول ہم اپنی شہرت اور اپنے دوستوں سے دست بردار ہوں اور بہت سی اپنی چیزوں کو جو کھوں میں ڈالیں۔ یہ خرابیاں متوسّط درجے کے حاصل کرنے میں نہیں ہیں مگر ان سے عوام الناس کی خدمت گزاری بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ ایک عاقبت اندیشی ہے، دوسرا کمال حاصل کرنا؛ یہ دونوں ہم کو متضاد جانبوں میں لے جاتے ہیں۔ ایک کہتی ہے کہ تم اپنی حالت میں خوش حال رہو اور اپنی حاجتوں کو حد سے باہر قدم نہ رکھنے دو۔ دوسری یہ کہتی ہے کہ سب سے برتر ہو اور کسی ایسی خوشی سے خوش نہ ہو جو تم کو اپنے آپے سے باہر نہ کر دے۔ ایک کہتی ہے کہ اَور آدمی جن طریقوں پر چل رہے ہیں، اُن پر چلو اور جو اَور کرتے ہیں وہی تم سوچو اور کرو۔ دوسری کہتی ہے کہ ان آدمیوں کی بھیڑ کو چھوڑو اور جہالت اور حسد کے تیروں کے نشانہ نہ بنو۔ متوسّط درجے کے اوصاف پیدا کرنے میں صلہ جلد مل جاتا ہے، کمال پیدا کرنے کا صلہ مدتوں کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ادنیٰ طبیعت کے آدمی اپنے نفس سے بہت محبت رکھتے ہیں، وہ عوام الناس کے خیالات کے پابند ہوتے ہیں۔ عالی‌طبع؛ بزرگ مَنش اُن راہوں میں چلنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں جن پر پہلے لوگ چل

چکے ہیں ۔ وہ عوام کی فیض رسانی کے خیالات میں بہادرانہ سودائی ہوتے ہیں ۔

۴۔ **کمال حاصل کرنے کا طریقہ** : اگر تم یہ چاہتے ہو کہ جو ہم نہیں وہ ہوں تو جو ہو اُس سے ناخوش ہو؛ اس لیے کہ جو ہو، اس سے اگر خوش ہو گئے تو وہیں ٹھیر کر بس جاؤ گے ۔ جب تم یہ جانو گے کہ ہم کمال کو پہنچ گئے تو زوال شروع ہو جائے گا ۔ ''ہر کمالے را زوالے'' کا مطلب یہی ہے ۔ اگر کمال چاہتے ہو تو ہمیشہ کچھ قدم بڑھاؤ، سدا آگے بڑھے چلو ۔ نہ کبھی ٹھیرو، نہ اُلٹے جاؤ، نہ گمراہ ہو ۔ ہر چیز میں کمال کی آرزو کرو ۔ اگرچہ بہت سی باتوں میں وہ تم کو حاصل نہیں ہوگا مگر جب تم اس کو حاصل کرنا چاہو گے اور استقلال کے ساتھ اس کے لیے آگے بڑھو گے تو اُن لوگوں سے زیادہ تر کمال کے قریب پہنچ جاؤ گے جو سست کاہل پڑے رہتے ہیں، اور اُس تک پہنچنے کا قصد نہیں کرتے ہیں، اور بغیر کوشش اور ارادے کے کہہ دیتے ہیں کہ ہم اُس تک نہیں پہنچیں گے ۔

۵۔ اخلاق میں کمال پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے دوست بے ریا اور دشمن قدیمی ہوں ۔ کیونکہ وہ ایک کی نصیحت سے اور دوسرے کی فضیحت سے اپنے اخلاق کی برائی بھلائی سے واقف ہوگا اور اس سے اخلاق میں کمال حاصل ہوگا ۔

۶۔ جو درخت سایے میں خشک ہوتے ہیں اُن کی رنگت اور سبزی زیادہ تر دیرپا بہ نسبت اُن درختوں کے ہوتی ہے جو دفعۃً دھوپ میں یا آگ میں جھلسائے جائیں ۔ ایسے ہی وہ ذکاوت زیادہ مستقل و کامل ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ فرصت میں تعلیم پانے سے پختہ ہوتی ہے، بہ نسبت اس کے کہ دفعۃً زبردستی سے پیدا کی جائے ۔ ایسے ہی وہی خُلق کامل ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ عادت سے پیدا کیا جائے، نہ یہ کہ

اتفاقیہ کوئی کام اخلاق کا کیا جائے - کمال کے حاصل کرنے میں سستی سے وہ نقصان نہیں ہوتے جو جلدی کرنے سے ہوتے ہیں - غرض کمال حاصل کرنے میں وقت کی دست گیری سہج سہج چلانے میں ضرور ہے -

۱۴۷- رات کے دیکھنے سے دنیا کی بے ثباتی کا خیال پیدا ہونا

ابھی دو بجے ہیں ، میری شمع جل جل کر گھل رہی ہے - چوکیدار بے خبر پڑے سوتے ہیں ، اُن کو کچھ خبر نہیں کہ کیا بجا ہے - غریب جفا کش بھی اور امیر بے فکر بھی آرام کرتے ہیں - کوئی چیز نہیں جاگتی ہے - مگر فکر ، عصیاں ، عیش ، مایوسی ، بد مست شرابی اپنے پیالے کو پُر کر رہا ہے جو اسے اور زیادہ خراب و خستہ کرے گا - چور بھی اِدھر اُدھر داؤں گھات لگاتا پڑا پھرتا ہے - جو شخص خود کشی کا ارادہ رکھتا ہے ، وہ اپنے گناہ بھرے ہاتھوں سے گلا کاٹ رہا ہے - میں نے بھی نئی پرانی کتابوں کو ، جن کا مطالعہ کر رہا تھا ، اُٹھا کر طاق پر رکھ دیا اور اس سنسان شب کی سیر کرنے لگا - سوچنے لگا کہ تھوڑی دیر ہوئی کہ یہاں خود نمائی کیا کیا اپنے جلوے دکھا رہی تھی اور تھوڑی دیر میں اپنی سواری کا ٹھاٹھ دکھاتی تھی ، یا ایک شوخ لڑکے کی طرح ہٹ کرتے کرتے چپ چاپ ہو بیٹھی - سارے شہر پر کیا اُداسی چھا رہی ہے - چراغ ٹمٹماتے جاتے ہیں - سوائے گھنٹے کی کھٹ کھٹ کے اور چوکیدار اور کتّوں کی آوازوں کے کوئی اور آواز نہیں آتی - انسان کی نخوت کا جو غل شور تھا ، وہ چپ چاپ پڑا سوتا تھا - یہی ساعت ایسی ہے کہ جس میں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی خود نمائی ایک خواب ہے اور کچھ ہستی اس کی نہیں ہے - ایک وقت آنے والا ہے کہ یہی سنسان پن ، جو

تھوڑی دیر کا ہے، ہمیشہ متواتر رہنے لگے گا اور شہر مثل اہلِ شہر کے مردہ ہو کر ایک جنگل بن جائے گا۔

دنیا میں بہت سے بڑے بڑے شہر ایسے تھے کہ جن میں ایک زمانے میں بڑی دھوم دھام رہتی تھی۔ فتحوں کے شادیانے اور نقارے بجتے تھے۔ عیش و نشاط بے انتہا ہوتے تھے۔ کوتاہ اندیش نخوت تھوڑی دیر کے لیے یہ گھمنڈ پیدا کرتی تھی کہ یہ حالت ہمیشہ دوام کے لیے ہے۔ اب ان شہروں کا پتا مشکل سے ملتا ہے۔ سیّاح غم زدہ ہو ہو کر ان شہروں کے کھنڈروں میں پھرتا ہے، اور عبرت پکڑتا ہے، اور اس سے دنیا کی بے ثباتی پر دانا ہوتا ہے، اور کہتا ہے کہ وہاں قلعہ تھا جہاں گھاس آگی ہوئی ہے، یہاں دربار اور کچہریاں ہوا کرتی تھیں جہاں اب سانپ بچّھو اور سب طرح کے حشرات الارض آباد ہیں۔ جہاں معبد اور تماشا گاہ تھے، وہاں پھر مٹّی پتّھر کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ان کو[1] عیش و نشاط اور نفس پرستی و بد مستی نے ضعیف کیا۔ جن کو دل بہلانا اور مسخرا پن آتا تھا، وہ اہلِ سلطنت سے خلعت و انعام و اکرام پاتے تھے اور بے چارے کار کن ارکانِ سلطنت بے کار بیٹھے رہتے تھے۔ کوئی صلہ خدمات کا اُن کو نہیں ملتا تھا۔ یہاں کے دولت و مال نے حملہ آوروں کو لالچ دیا۔ وہ حملہ کرتے رہے، مگر پہلی دفعہ شکست پا کر چلے گئے۔ مگر استقلال کے ساتھ پھر حملہ آور ہوئے اور فتح یاب ہوئے، اور حفاظت کرنے والوں کو وہ تہ و بالا کیا کہ پہچانے نہیں جاتے۔ وہ جمگھٹے جو بازاروں میں اہلے گہلے[2] پڑے پھرتے تھے، ان میں سے دو چار ہی نظر آتے ہیں۔

۱۔ اصل : اول ان کے۔

۲۔ اصل : ایلے گیلے۔ اہلے گہلے پھرنا = اٹھکیلیاں کرتے پھرنا، اکڑتے پھرنا۔

وہ پری رُو جو روز اپنا رخ نقاب میں چھپائے رکھتے تھے ، وہ اپنی مصیبت کو نہیں چھپا سکتے - ایک وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی گلی ہی کو اپنی گھاٹ بنا رکھا ہے - کچھ دولت مندوں کے دروازوں پر بصد تکلّف آرام پاتے ہیں - بہت آدمی آوارہ گرد ، مسافر اور یتیم بچے ایسی حالت میں پھرتے ہیں کہ جن کے افلاس اور مصیبت کو کسی کی مرحمت اور شفقت دُور نہیں کر سکتی - ان کے حال دیکھنے سے دل میں خوفِ الٰہی پیدا ہوتا ہے - بعضوں کو چیتھڑے تک پہننے کے لیے نہیں میسّر ہوتے - فاقے اور بیماریوں کے مارے دُبلے ہو رہے ہیں ، بھوکے ننگے پھرتے ہیں - ان کی طرف کوئی دیکھتا نہیں ، کوئی ان کو پوچھتا نہیں ، سب نے چھوڑ دیا - وہ لوگوں کے آگے گڑ گڑاتے ہیں مگر کسی کا دل نہیں پسیجتا - بہت سی غریب عورتیں ، جنھوں نے کسی زمانے میں بڑے عیش کیے تھے اور جن کے حُسن کی ایک دھوم تھی ، اب وہ اپنے یاروں کے پاس جاتی ہیں کہ جن کی بغلیں گرم کی تھیں تو وہ ان کو جاڑے میں اکڑا ہوا دیکھتے ہیں مگر رحم کر کے گرم کپڑے نہیں دیتے - وہ بھی اِن شیطانوں کی ڈیوڑھیوں پر ڈھئی دیے پڑی ہیں - غریب مفلسوں کے پاس نہ گھر ہے ، نہ در ہے - ان کو لوگ گالیاں دیتے ہیں مگر گرہ سے کھول کر پیسا نہیں دیتے -

اگر امیر آدمیوں کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے بیان کرنے میں مبالغے اور فصاحت کا کوئی دقیقہ چھوڑا نہیں جاتا - سب آدمیوں کی توجہ اس کے سننے پر ہوتی ہے اور بڑی دل سوزی اور ہمدردی کے ساتھ اس پر افسوس کرتے ہیں مگر کوئی غریبوں ، مفلسوں کے حال پر رحم نہیں کرتا - ظالم تو ان پر اَور ظلم کرتے ہیں ، مَرے پر سَو دُرّے - جن سے وہ اپنی حفاظت کی توقع کرتے ہیں ، وہ ان کے دشمن ہو جاتے ہیں - مجھے اپنے انسان ہونے پر افسوس

تھا اور اس کی حسرت تھی کہ ہائے میرے پاس اِتنی دولت کیوں نہ ہوئی جو اپنی مرضی کے موافق اِن مصیبت زدوں کی تکلیف گھٹانے میں مدد کرتا۔ ہائے میں کیوں ایسا سنگ دل ہوا کہ یہ آفتیں دیکھوں اور جیتا رہوں۔

قاعدہ ہے کہ رحم دل آدمی جب مصیبت زدوں کی مصیبت کو دور نہیں کر سکتا تو اس کا حال خود مصیبت زدوں سے بدتر ہو جاتا ہے۔ یہ مفلسوں کا حال دیکھ رہا تھا کہ میری توجہ اُن مقدّس ریاکاروں کی طرف ہوئی کہ جو سونے کے وقت تک نیکی کی تعلیم کرتے ہیں مگر پھر چھپ کر آدھی رات کے پردے میں کھلے گناہ کرتے ہیں۔ وہ گناہ گاری نہایت سخت ہوتی ہے جس کے چھپانے میں کوشش کی جاتی ہے۔ اگر رات کو ان کی بدکاری پکڑی جائے تو وہ صبح کو شرمندہ نہیں ہوتے۔ بدکاری کے کھل جانے سے بدکار اس کو چھوڑتا نہیں بلکہ اور ہوشیاری کا حاشیہ مکاری پر چڑھاتا ہے۔ دن بھر وہ ایسے آدمیوں کی صحبت میں رہتا ہے کہ جن سے وہ نفرت رکھتا ہے اور رات کو اُن کی صحبت میں رہتا ہے جو اس سے دلی نفرت رکھتے ہیں۔

۱۴۸- خاندان کی تعلیم

تم پر واجب ہے کہ اپنی اولاد کو علم سکھاؤ اور اطاعت کی عادت ڈلواؤ، مگر اِن دونوں باتوں میں نہ کوئی سختی ہو، نہ گُھرکی جِھڑکی۔ تم اپنے بچوں کی تعریف تو لوگوں کے سامنے کرو مگر ان کو تنبیہ و تاکید پوشیدہ کرو کہ کسی کو معلوم نہ ہو۔ ہمیشہ ان سے بہ خندہ پیشانی پیش آؤ۔ ان کی آسائش و پرورش میں کبھی کنجوسی نہ کرو۔ اگر کنجوسی کرو گے تو اُن کو تمہارا جینا دو بھر معلوم ہوگا۔ جب مرو گے تو وہ تمہارے شکر گزار نہیں ہوں گے بلکہ تمہاری

موت کا شکریہ ادا کریں گے جس نے ان کو قید سے چُھٹایا - بہت سے آدمی اپنے میلانِ طبع سے بد کردار نہیں ہوتے ، بلکہ اِس سبب سے کہ ماں باپوں نے یا تو ان کو احمقانہ لاڈ پیار بہت کیا ہے یا ہمیشہ تنبیہ و تاکید ، سختی درشتی سے[1] کی ہے - لڑکیوں کی شادی مناسب وقت میں کردو ، ایسا نہ ہو کہ وہ خود شادی کر لیں -

۱۴۹- ضمانت و قرض

خواہ کوئی شخص تمہارا کیسا ہی دوست ہو مگر تم اُس کی ضمانت سے ، جہاں تک ممکن ہے ، پرہیز کرو - جو شخص اَوروں کا قرض ادا کرتا ہے وہ اپنی دولت گھٹاتا ہے - اگر کوئی دوست تم کو بہت ہی ضمانت کے لیے تنگ کرے تو خود روپیہ قرض لے کر اس کو قرض دے دو اور دستاویز بہت مستحکم لکھا لو - اس سے تمہارا دوست بھی خوش ہو جائے گا اور تم بھی نقصان سے بچو گے - کبھی بھول کر بھی دوست اور ہمسایے سے روپیہ قرض نہ لو ، بلکہ اجنبی آدمیوں سے ادھار لو کہ جب قرض ادا ہو جائے تو پھر اس کا تذکرہ نہ ہو - دینا دونوں کو برابر ہی پڑتا ہے - اگر ایسا نہ کرو گے تو اپنی ساکھ میں بٹّا لگاؤ گے ، آزادی کھوؤ گے - قرض لینے میں کبھی ایسا نہ کرو کہ وعدہ وفا نہ ہو - جو شخص وعدے کے دن پر قرض ادا کرتا ہے ، وہ دوسرے کی تھیلی کا مالک ہوتا ہے -

۱۵۰- علم

۱- انگلستان میں ہر ایک آدمی ، تھوڑے مقدور کا ، اپنے چاروں

۱- "سے" اضافہ مرتب -

طرف دیکھ بھال کر یہ فخر کر سکتا ہے کہ جیسے میری حالت خوش ہے ، چند صدیوں پیشتر بادشاہوں کی بھی حالت ایسی نہ تھی - جو سامانِ آرائش و آرام میرے گھر میں موجود ہے وہ پہلے امیروں اور سلاطین کو بھی میسّر نہ تھا - سب طرف جہاز سمندروں میں رواں ہیں تا کہ میرے کام کے اسباب وہ فراہم کریں - ملکِ چین میں چینی میرے لیے چائے کے پتّے اکٹھے کر رہے ہیں ، امریکہ میں میرے لیے کسان روئی بو رہے ہیں ، جزائرِ ایسٹ انڈیا میں شکر اور قہوہ میرے لیے تیار ہو رہا ہے ، اٹلی میں ریشم کے کیڑوں کی پرورش میرے ریشمی کپڑوں کے واسطے ہو رہی ہے ، سکسنی میں بھیڑوں پر سے اُون میری پوشاک کے لیے کُتری جا رہی ہے - یہاں اپنے وطن میں بڑی زبردست دُخانی کلیں چل رہی ہیں - سُوت کاتتی اور کپڑے بُن رہی ہیں ، اور چاقو چھری ، قینچی اور کاٹنے کے آلات بنا رہی ہیں - کانوں میں پمپ لگے ہوئے پانی نکال رہے ہیں کہ میرے کام کی دھات نکالیں - مجھے ورثے میں تھوڑی دولت ملی ہے مگر میرے گرد چاروں طرف سواریاں کھڑی ہیں - ڈاک گاڑیاں میرے لیے رات دن رواں ہیں - میرے خطوں کو بہت جلد چاروں طرف پہنچا دیتی ہیں - نہریں ، سڑکیں ، پُل ، کوئلہ سب میرے لیے کام کر رہے ہیں - میری جان و مال و عزّت کی حفاظت کے واسطے سپاہی موجود ہیں جو میرے چین اور آرام میں کسی طرح کا خلل اور خوف نہیں آنے دیتیں - ایڈیٹر ، پرنٹر میری یہ خدمت کر رہے ہیں کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اس کے سارے سماچار[1] سنا دیتے ہیں -

میرے مکان کے ایک گوشے میں کتابیں رکھی ہیں جو میری

۱- سماچار = خبریں -

ملکیت کی چیزوں میں سب سے زیادہ بیش بہا ہیں۔ وہ یہ معجزے مجھے دکھاتی ہیں کہ خط اِستوا سے قُطبوں تک اور ابتدائے زمانہ سے اب تک، جس ملک اور جس زمانے میں کہتا ہوں کہ تم مجھ کو وہاں پہنچا دو، وہ پہنچا دیتی ہیں۔ ان کے طفیل سے میں یہ سحر کا کام کرتا ہوں کہ جو بڑے بڑے نامور، نیک، مقدّس آدمی گزرے ہیں، ان کو زندہ اپنے سامنے کھڑا کرتا ہوں اور ان سے کہتا ہوں کہ جو کسی زمانے میں تم نے کارہائے نمایاں کیے ہوں، وہ مجھے کر کے دکھا دو، وہ مجھے دکھا دیتے ہیں۔ میرے سامنے بڑے بڑے اوریٹر (مقرّر) کھڑے تقریر کر رہے ہیں۔ مؤرخ اپنی تاریخیں اور شاعر خوش الحانی سے اپنے شعر سنا رہے ہیں۔ یہ سارے سامان کس نے مہیّا کیے ہیں؟ علم نے۔

۲۔ **علم کے فائدے اور استعمال:** آدمی کے 'قوائے سبعی'[1] اور بہیمی کو علم ضعیف کر دیتا ہے۔ اگرچہ تھوڑے علم کا اثر اچھا نہیں ہوتا مگر زیادہ علم آدمی میں سے سِفلہ پن، اوچھا پن دور کر دیتا ہے۔ گستاخی اور بے باکی و بیہودگی کو کم کر دیتا ہے۔ مشکلوں کو آسان اور شُبہوں کو دور کرتا ہے۔ دل کو یہ عادت ڈلوا دیتا ہے کہ وہ معاملات کے سب پہلو دیکھتا ہے اور ان کی دلیلوں کو ذہن میں تولتا ہے۔ جس طرف پلڑا بھاری دیکھتا ہے، اُس طرف جھکتا ہے۔ وہ سریع الاعتقادی کو دور کرتا ہے۔ یہ نہیں کرتا کہ جو چیز نئی یا بڑی دکھائی دے، اُس کی تعریف میں ایسا دیوانہ ہو جائے جس سے ضعفِ عقل معلوم ہو۔ وہ تمام امراضِ روحانی کا علاج کرتا ہے، دل کی اصلاح اُسی پر موقوف ہے۔ جاہل آدمی اپنے اندر یہ نہیں جانتا

۱۔ 'قوائے سبعی = درندگی کا ملکہ۔ قوائے بہیمی = حیوانی ملکہ۔

کہ تنزّل کی باتیں کون سی ہیں اور میں کیونکر ان سے بچ سکتا ہوں ۔ اور نہ وہ اس خوشی اور لطفِ زندگی کو جانتا ہے کہ ہر روز بہتر حالت ہونے سے کیا کیا نعمتیں ملتی ہیں ۔ اس میں جو اچھی باتیں ہوتی ہیں اُن کو وہ بخوبی دکھاتا ہے اور اُن کو اپنے کام میں وہ بخوبی لاتا ہے ، مگر وہ ان کو بڑھانا نہیں جانتا ۔ اور جو خطائیں اور برائیاں اس میں ہوتی ہیں ، اُن کا رنگ بدلنا اور چھپانا جانتا ہے مگر ان کی اصلاح کرنی نہیں آتی ۔ اُس کا حال گھسیارے کا سا ہے کہ گھاس کاٹے چلا جاتا ہے مگر کُھرپے کا تیز کرنا نہیں جانتا ۔ برخلاف اس کے عالم اپنے علم کو کام میں لا کر اپنے دل کی برائیوں کی ہمیشہ اصلاح اور خطاؤں کی تصحیح کرتا رہتا ہے ۔ جیسے تمام پھولوں میں ، جن میں کڑوے پھول بھی داخل ہیں ، شہد موجود ہے مگر اس کو فقط مکھّی ہی چُوس کر نکالنا جانتی ہے ، پس اسی طرح ہر علم میں ، خواہ کسی قسم کا ہو ، اُس میں عالم غور و فکر کر کے استدلال اور استنباط کر سکتے ہیں ۔

۳۔ علم کی کشش : اس سبب سے کہ علموں میں عمدہ لیاقتوں کے حاصل کرنے سے عزت حاصل ہوتی ہے ، ہم اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں ۔ برخلاف اس کے جہالت سے ذلّت ہوتی ہے اس لیے اس سے دور بھاگتے ہیں ۔ مطالعہ کرنا کیا ہے ؟ ایک جماعت کا جمع کرنا ہے ، جس میں خوبی یہ ہے کہ اگر ان میں سے ایک سے زیادہ باتیں کیجیے تو دوسرا رنجیدہ نہیں ہوتا ، نہ کوئی آپس میں رشک و حسد پیدا ہوتا ہے ۔ جس سے ہمارا دل چاہتا ہے ، اُس سے باتیں کرتے ہیں اور پھر دفعۃً اس سے قطعِ سخن کر دیتے ہیں ، مگر وہ ہماری اس حرکت سے رنجیدہ خاطر نہیں ہوتا ۔ اس میں آپس میں بحثیں اور تکراریں ہوتی ہیں ، جن کا فیصلہ ہم اپنی فرصت میں سوچ سمجھ کے کرتے ہیں ۔ وہ

اختلافِ آرا سے غصے آپس میں نہیں ہوتے - نہ جھگڑے فساد کھڑے کرتے ہیں -

۴- علم کا ذلیل ہونا : چار جگہ علم کی مٹی خراب ہوتی ہے : اول جہالت میں اس کی حقارت سے - دوم تحقیق میں عیش و عشرت اور شوخی و بے باکی کے داخل ہونے سے - سوم رائے میں نقص اور شبہات کے ہونے سے - چہارم غلطی میں ضد اور مقابلہ کرنے سے -

۵- اوپری علم : اگر علم خانۂ دل کا فقط اسباب ہے اور اس کی غذا نہیں ، وہ سطاحت ہے ، اس کی کچھ اصل نہیں ، فقط دکھاوے کا دھوکا ہے - جیسے کہ خون میں غذا تحلیل ہوتی ہے ، ایسے ہی دل کے اندر علم تحلیل ہونا چاہیے جس سے دانائی اور قوت بڑھے - علمِ سپہ گری میں بہت سے جنرل نپولینِ اعظم کی برابر تھے مگر وہ ان پر ہمیشہ اِس سبب سے فتح یاب ہوتا تھا کہ فتح فقط ایک لحظے کی دانش مندانہ حرکت پر موقوف ہوتی ہے - سو نپولین کے دل میں علم نفوذ کیے ہوئے تھا اور اوروں کے دل پر چسپاں تھا ، اس لیے اس کو وہ لحظۂ فتح فوراً معلوم ہو جاتا تھا - اوپری علم کا حال ایسا ہے جیسے کہ ایک حکیم کا جو دولت کی تعریف کرے اور اس کے اوصاف پر بحث کرے مگر ٹکا پاس نہ ہو - یا ایک مہندس کا کہ کل زمین کے امتداد صحت سے دریافت کرے مگر بالشت بھر زمین پاس نہ ہو -

۶- ابتدائے علم : ایک کہانی مشہور ہے کہ ایک صندوق میں ہمیشہ ایک چوہیا رہتی تھی - ایک دن اس نے صندوق کے کنارے پر سے جھانک کر دیکھا تو وہ متحیّر ہو کے کہنے لگی کہ میں نہیں جانتی تھی کہ دنیا اِتنی بڑی ہے - اس کو اول[۱] اپنی جہالت پر حیرت

۱- یعنی پہلی مرتبہ اس کو اپنی جہالت پر حیرت ہوئی -

ہوئی - پس علم کے میدان میں اول قدم یہی ہے کہ ہم اپنے تئیں جانیں کہ جاہل ہیں اور سمجھیں کہ کس محل پر کھڑے ہیں - جب اپنے[1] معاملاتِ خانگی کے صندوق سے نکل کر باہر جھانکیں گے تو حکیم بنیں گے ، ہر چیز سے واقف ہوں گے - جو خدا کی عمیق مصلحتوں میں جھانکے گا ، وہ یہ نہیں خیال کرے گا کہ آدمی ایسا محدود ہے کہ اس میں کوئی استعداد ایسی نہیں کہ جسمانی اشیا کی بڑی تدابیر اور منصوبوں کو نہ سمجھ سکے اور ان کا فیصلہ نہ کر سکے - مگر انسان روحانی اشیا کا علم اُتنا ہی حاصل کر سکتا ہے جتنا خدا نے خود اُس کو اپنے کلام میں بتلایا ہے - جہاں اس نے ہم کو روکا ہے ، وہاں رکنا چاہیے -

۷- علم کی بلندی : ہم جتنے بلند ہوتے ہیں ، اُتنا ہی ہمارے آگے فضائے منظر بڑھتا جاتا ہے اور اس میں دور دور کی چیزیں دھندلی نظر آتی جاتی ہیں - عالم کا فضائے علم فراخ ہوتا ہے اس لیے اس کو بہت سی چیزیں دھندلی نظر آتی ہیں ، مگر جاہل کے پیشِ نظر چھوٹا فضا ہوتا ہے ، اُس کو خوب نظر آتا ہے اور اس سے وہ بڑا لطف اٹھاتا ہے - دل بھر کے اس کی بہار لوٹتا ہے - برخلاف حکیم کے کہ وہ اسی میں رہتا ہے کہ میں تمام عالم کے فضا پر فائز ہوں -

۸- ضرورتِ علم : جب تک کسی مضمون کو ہم اچھی طرح نہ سمجھتے ہوں ، اس میں بولنا یا کہنا اپنے فرض کا توڑنا اور ایک جرم کرنا ہے ، گو اُس کی قانوناً سزا نہ ہو - جہاں آزادی کا بازار گرم ہوتا ہے ، وہاں بے معنی بکواس کا ہونا اور اُس کا چھپ کر شائع ہونا

۱- اصل : اپنے ہی -

ایک لازمی امر[1] ہے۔ اس کے جانچنے اور پرکھنے اور کرنے[2] کے لیے علم کی ضرورت ہے۔

۹۔ **تحصیلِ علم:** علم کا حال ایسا ہے جیسے کہ زمین کا کہ اول بڑی کاوش کی جاتی ہے تو اس کے اندر سے صاف پانی نکلتا ہے۔ مگر جب سوت نکل آتی ہے تو اس سے پانی نکل کر اوپر آٹھتا ہے اور ہم کو بے تکلّف ملتا ہے۔ پس علم کے تحصیل کرنے میں اول بہت تکلیف آٹھانی اور دل سے توجہ کرنی پڑتی ہے، مگر جب علم حاصل ہو جاتا ہے تو یہ حال نہیں رہتا۔ علم کا حال آگ کا سا ہے کہ اول اس کے سلگانے میں دوسرے کی مدد درکار ہے[3]۔ پھر وہ اپنے آپ بڑھتی ہے۔ ایسے ہی[4] تحصیلِ علم میں ابتدا میں استاد کی ضرورت ہوتی ہے، پھر اُس کی خود افزائش ہوتی ہے۔

۱۰۔ **علمِ قدیم سے استفادہ:** متقدّمین ایک بڑی تھیلی علم کی اپنی اولاد کو ورثے میں دے گئے ہیں جس[5] سے کہ ہر نسل مستفید ہوتی ہے۔ پس ہم کو بھی چاہیے کہ ان بزرگوں کی تھیلی میں کچھ نقدی بڑھا کر اپنی[6] آیندہ نسلوں کے واسطے چھوڑ جائیں جس[7] سے وہ

۱۔ ''امر'' اضافۂ مرتّب۔

۲۔ اصل میں ''کرنے'' کی بجائے ''خرنے'' چھپا ہے۔

۳۔ اس آگ سے غالباً زمانۂ ماقبل تاریخ کی آگ مراد ہے جو بے پناہ محنت سے ایک لکڑی کو دوسری لکڑی میں رگڑ کر سلگائی جاتی تھی۔ ایک آدمی نیچے کی لکڑی کو مضبوطی سے پکڑتا تھا اور دوسرا آدمی لکڑی کی ایک قلم اُس میں پوری قوت سے رگڑتا تھا، تب کہیں آگ کی چنگاری پھوٹتی تھی۔ اب آگ سلگانے کے لیے کسی معاون کی ضرورت نہیں رہی۔

۴۔ اصل: ایسی۔

۵۔ اصل: جن سے۔

۶۔ اصل: اپنے آیندہ۔

۷۔ اصل: جن سے۔

فائدہ اٹھائیں ۔

۱۱- علم کی تمنّا : جب ہماری نگاہ عالَم پر پڑتی ہے تو ہم اس کا حال دریافت کرنا چاہتے ہیں ؛ ستاروں اور بُرجوں کے نقشے بناتے ہیں ، زمین کے گولے کو کھود کھود کر کانیں نکالتے ہیں ، سمندر کے مدّ و جزر کا اندازہ کرتے ہیں ، سمندر کی ریت کے ذروں کو گنتے ہیں ۔ زمانۂ گزشتہ میں جو واقعات گزرے ہیں ، اُن کی چھان بین کرتے ہیں ؛ مردہ بادشاہوں کی عمریں دریافت کرتے ہیں ؛ جن سلطنتوں کا نام و نشان مٹ گیا ہے ، اُن کا سراغ لگاتے ہیں ؛ مُردوں کے منہ کے کلام کی اور ہاتھ کے کام کی جستجو کرتے ہیں ۔ جیسے دولت جتنی بڑھتی ہے اُس کے ساتھ اُس کی طمع بھی بڑھتی ہے ، ایسے ہی علم کی خواہش بھی اُتنی ہی بڑھتی ہے جتنی اُس کی افزائش ہوتی ہے ۔

۱۲- مَیں علم کی تعلیم میں اپنے سر کو قبر بنانا نہیں چاہتا بلکہ خزانہ علم کا بنانا چاہتا ہوں ۔ میں علم کا ٹھیکہ لے کے خود ہی فائدہ حاصل کرنا نہیں چاہتا ہوں بلکہ اَوروں کو اس سے فائدہ پہنچانا ۔ میں اپنے لیے مطالعہ نہیں کرتا بلکہ اُن کے لیے جو مطالعہ نہیں کرتے ۔ میں اُن لوگوں سے حسد نہیں کرتا جو مجھ سے زیادہ علم جانتے ہیں ، بلکہ اُن پر رحم کرتا ہوں جو مجھ سے کم علم رکھتے ہیں ۔ میں علم اس لیے نہیں سکھاتا کہ میری مشق اس میں بڑھے اور علم سے میرا دل و دماغ زندہ رہے[۱] بلکہ اس لیے کہ اَوروں کے دماغوں میں وہ بسے اور پھیلے ۔ میں اپنی کوششوں میں اس سے بڑا آزردہ دل ہوتا ہوں کہ میرا علم میرے[۲] ساتھ دفن ہو جائے گا ۔ میرے[۲] معزّز عزیزوں کو اس میں سے کچھ ورثہ نہیں ملے گا ۔

۱- اصل : ہوتا رہے ۔ ۲- اصل : میری ۔

۱۳- علم کا مآل : ظاہر ہے کہ جو علم اس دنیا میں کوئی حاصل کرتا ہے وہ اُس کی زندگی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے (عقبیٰ کے خیالات کو جانے دو) - اب یہ دیکھنا چاہیے کہ دنیا میں اس کا مآل کیا ہے - سو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے تئیں اور اَوروں کے تئیں نفع پہنچائیں - لیکن اگر اس علم کی تحصیل میں اپنی صحت کو کھو بیٹھیں تو جو علم ایسی محنت سے حاصل ہوا ہے ، بے فائدہ ہو جائے گا - اگر ہم اپنے جسم کو مشقّتِ شاقّہ اس لیے دیں کہ ہزاروں کے لیے زیادہ کام کے ہو جائیں تو حقیقت میں اُن قابلیتوں اور استعدادوں سے اپنے تئیں محروم کرتے ہیں جو خدا نے ہم کو اَوروں کے فائدہ پہنچانے کے لیے دی تھیں - ذہانتِ خداداد کو زیادہ علم کی تحصیل کرنے کی محنت سے ضعیف کرتے ہیں اور طاقت ور نہیں کرتے ، جس کے سبب سے ہم خدا کی خدمات میں بھی قاصر رہتے ہیں - اگر متوسّط علم حاصل کرتے تو زیادہ فائدہ پہنچاتے - جو شخص اپنے آقا کے جہاز کو سونے چاندی اور بیش قیمت جواہر بھر کر ایسا وزنی کرتا ہے جس سے وہ ڈوب جائے تو وہ شخص اپنے آقا کا قصور کرتا ہے - اِسی طرح اگر ہم دماغ پر علم کا بوجھ ڈال کر خراب خستہ کرتے ہیں تو خطا کرتے ہیں -

۱۴- علم کا سُرور : عیش و طرب سایہ ہے ، دولت خود نمائی ہے ، حکومت تھوڑی دیر کی دھوم دھام کی سواری برات کی دولھا کی سی ہے - مگر علم کی مسرّت جاوداں ہے - وہ بے انتہا خوش کرنے والا ہے - وسعت میں بے پایاں ، قیام میں جاوداں - وہ اپنے مقدّس کاموں میں کسی سے خائف نہیں - خرچ کرنے میں کفایت نہیں کرتا - آتش فشاں پہاڑوں کے اندر گھستا ہے ، سمندروں میں غـوّاصی کرتا ہے ، زمین میں سوراخ کرتا ہے ، پر لگا کے آسمان پر اُڑتا ہے ، زمین کے گولے کو زرخیز بناتا ہے ، بحر و بر میں تفحّص و تحقیق کرتا ہے ، فاصلوں پر

غور کرتا ہے ، چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کا امتحان کرتا ہے ، بڑی بڑی چیزوں کا امتحان کرتا ہے ، بلندیوں پر پرواز کرتا ہے ۔ اس کی گرفت سے کوئی چیز دور نہیں ۔ علم وہ قوّتِ بازو انسان کا ہے کہ اس کو آسمان پر چڑھا کے لے جاتا ہے ۔ انسانوں کی مصیبتوں کا آپس میں وہی مقابلہ کرتا ہے ۔ وہ ایسا مسرور کرتا ہے کہ انقباضِ خاطر دور کرتا ہے ۔ جہالت تو محرومی کا نام ہے جس سے کوئی چیز نہیں پیدا ہوتی ۔ وہ ایک خلا ہے جس میں روح بت بنی بیٹھی رہتی ہے ۔ جہالت روح پر ورم چڑھا کے موٹا کرتی ہے ۔ علم اس کی توانائی بڑھا کے فربہ کرتا ہے ۔

۱۵ ۔ جب علم کی ترقّی ہوتی ہے تو آنکھ کی خوشی کان میں چلی جاتی ہے اور جب تنزّل ہوتا ہے تو کان کی خوشی پھر آنکھ میں آ جاتی ہے ۔ دماغ میں جو علم ہوتا ہے وہ ہماری ظاہر حالت کو زیب و زینت دیتا ہے ۔ جو دل میں ہوتا ہے وہ روحانی کام کر کے باطن کو مہذّب کرتا ہے ۔ کوئی علم انسان کو اس لیے نہیں دیا جاتا کہ اس کو چھپا کر رکھے ، بلکہ اس لیے کہ وہ اَوروں کو دے ۔ یہ جوہرِ بے بہا ایسا ہے کہ چھپانے سے خاک میں مل جاتا ہے ۔ علم وہ ارتفاع ہے جس کی انتہا نہیں ، وہ عُمق ہے جس کی تھاہ نہیں ، وہ راہ ہے جس کا انجام نہیں ، وہ دائرہ ہے جو سب پر محیط ہے ۔ مگر اُس کا خود احاطہ محدود نہیں ، وہ خود بے انتہا ہے ۔ جب اس میں خدائے بے انتہا آتا ہے تو دل اس سے راضی ہوتا ہے ۔

۱۶ ۔ **علم کے واسطے آدمی بنایا گیا ہے :** آدمی کو خدا نے فہم عطا کی ہے جس سے وہ علم حاصل کرے ۔ وہ شخص بڑا سعادت مند ہے کہ اُس کی تحصیل میں اپنی ساری عمر ، خاص کر ابتدائے عمر ،

کو[١] صرف کرتا ہے اور محنت کرتا ہے ۔ اس کو نئی نئی چیزیں معلوم ہوتی ہیں ۔ جہالت کی تو خِلقت میں نا سود مند ہونا داخل ہے مگر علم خواہ کسی قسم کا ہو ، فائدہ مند ہوتا ہے ۔ جو شخص تحقیقاتِ علم کے درپے ہوتا ہے ، وہ اپنی تحقیقات سے بعض دفعہ بڑی بیش بہا چیزیں دریافت کر لیتا ہے ۔ اگر خدا کا فضل شاملِ حال ہو تو علم خدا کی حکمت سکھاتا ہے ۔ وہ مصحفِ فطرت کی سیر کرا کے دل کو خدائے تعالیٰ دکھاتا ہے ۔ آسمان کوئی اپنا معجزہ نہ دکھائے تو بھی وہ اس خدا کی شان اور اس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کاموں کو دیکھ لیتا ہے ۔

١٧ ۔ افلاطون کی بڑی نصیحت آدمی کے لیے یہ ہے کہ وہ اپنا کام کرے اور اپنے تئیں پہچانے ۔ اس نصیحت کے دو حصّے ہیں : ان میں ایسا اتحاد ہے کہ وہ ایک ہی ہیں اور اس ایک میں تمام فرائضِ انسانی آ جاتے ہیں ؛ اس لیے کہ جو شخص اپنا کام اول کرے گا وہ ضرور اپنے تئیں جانے گا ، اور جو شخص اپنے تئیں جانے گا وہ دوسرے کا کام غلطی سے کیوں کرے گا ، اپنا ہی کام کرے گا ۔ جو شخص اپنے تئیں جاننے میں ہمّت صرف کرتا ہے ، وہ روز بروز دانا زیادہ ہوتا جاتا ہے ۔ ساری دانائیاں اس کی ذات میں جمع ہو جاتی ہیں ۔ تعصّب و طرف داری سے پاک ہو جاتا ہے ۔ عقلی اساس پر اپنی امیدوں کو مستحکم کرتا ہے ۔ وہ دوڑ سے پہلے اپنے زور کو آزماتا ہے ۔ وہ اپنے تئیں کبھی بے عزت نہیں کرتا ۔ وہ جانتا ہے کہ جہاز بغیر کمپاس اور چپّو کے نہیں چلتا ، اس لیے جہاز کو بغیر ان کے وہ کنارے سے نہیں

---

١ ۔ اصل : ”کو اس میں صرف کرتا ہے“ ۔ ”اس میں“ کے الفاظ زائد تھے لہذا حذف کر دیے گئے ۔

ہٹاتا ۔ عمارت[1] بنانے سے پہلے وہ اس کی لاگت کا تخمینہ کرتا ہے ۔ کسی کام میں مغرورانہ پیروی نہیں کرتا ۔ وہ عقلِ انسانی کی حدود کو پہچانتا ہے ۔ وہ وہیں قدم رکھتا ہے جہاں کچھ خطر نہیں ہوتا ۔ وہ اپنے عیبوں اور نقصوں سے ایسا واقف ہوتا ہے کہ اپنے غرور اور عُجب کو روکتا ہے ۔ مگر سچ یہ ہے کہ کوئی کام دنیا میں اپنے جاننے سے زیادہ مشکل نہیں ۔ جس نے اپنے تئیں جان لیا ، ساری دانائیوں کا مرکز اس نے اپنے تئیں بنا لیا ۔

۱۸ - **علم اور سوچنا** : علم کے ساتھ جب تک سوچنے کی عادت نہ ہو وہ بہت کام نہیں آتا ۔ جو علم فقط دل میں گزر کر چلا جاتا ہے اُس کا حال اُس مسافر کا سا ہے جو کسی ملک میں ڈاک گاڑی میں بیٹھا ہوا گزر گیا ۔ یا اُس پرند کا جو کسی ملک میں جانے کے لیے کسی دوسرے ملک کے اوپر سے اُڑ کر چلا گیا ۔ اِس سے کیا حاصل ہوتا ہے ۔

۱۹ - **علم و عقل** : علم و عقل دونوں ہرگز ایک نہیں بلکہ بعض اوقات ان میں کچھ تعلق ہی نہیں ہوتا ہے ۔ علم دماغ میں رہتا ہے اور غیروں کے خیالات سے معمور رہتا ہے ۔ عقل دل میں رہتی ہے اور اپنے کاموں پر متوجہ ہوتی ہے ۔ علم ایک اَن گھڑ ڈھیا[2] ہے ، عقل اس کی معمار ہے جو اس کو ہموار اور چوکور بنا کے اپنی جگہ عمارت میں چسپاں ہونے کے قابل بناتی ہے ۔ علم کو غرور اِس پر ہوتا ہے کہ مَیں نے اِس قدر سیکھا ہے ، عقل کو اپنی لاعلمی پر عجز و انکسار ہوتا ہے ۔ علم صرف خواہشیں کرتا ہے ، عقل اس کو کام میں لاتی

۱- اصل میں ''عمارت'' کی بجائے ''عبارت'' چھپا ہے ۔
۲- اَن گھڑ ڈھیا = ایسا روڑا یا ڈھیلا جسے تراشا نہ گیا ہو ۔

ہے ۔ علم بعض آدمیوں کو احمق بناتا ہے مگر عقل کسی کو احمق نہیں بناتی ۔ سب کو عقل مند بناتی ہے ۔ اگر علم کی رہنما عقل نہ بنے تو اس کا حال منہ زور ، سر کش گھوڑے کا سا ہے جو اپنے سوار کو گراتا ہے ۔

۲۰۔ یہ امر ہماری طبیعت میں داخل ہے کہ جب تک ہم کو کسی امر کی علّت و لِم[1] پر علم نہ ہو ، ہم خوش نہیں ہوتے ؛ اور جب سیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور جب بھولتے ہیں تو رنجیدہ ہوتے ہیں ۔

۲۱۔ **محبّتِ علم** : اشراف زادوں اور امیر زادوں کی آوارگی بڑے افسوس کے قابل ہے ۔ وہ سارا دن اپنا لہو و لعب و عیش و عشرت میں ضائع کرتے ہیں ۔ بناؤ سنگار ، سیر و شکار میں اکثر اوقات مصروف رہتے ہیں ۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ طبیعت لہو و لعب سے سیر ہوتی ہے تو بڑی عمر میں علم سے بھی شغل کی سوجھتی ہے ۔ لیکن جب ایامِ شباب کی بہار گزر جائے تو خزاں میں کب بوستانِ زندگی علم کی بہار سے شگفتہ ہو سکتا ہے ۔ اِن امیر زادوں کو قیصر و سکندر کے حالات پڑھنے چاہئیں کہ اُنھوں نے تحصیلِ علم کے بعد وہ کام کیے کہ دنیا میں اُن کے برابر شاذ و نادر ہی کسی نے کیے ہوں ۔ سکندر کہا کرتا تھا کہ میں باپ سے زیادہ اپنے استاد ارسطو کا ممنون ہوں ۔ جب ارسطو نے لکچر ، جو سکندر کے لیے تیار کیے تھے ، شائع کر دیے تو سکندر نے یہ خط استاد کو لکھا ، جس کا مضمون یہ تھا کہ مجھے آپ سے بڑی شکایت یہ ہے کہ جناب نے اُن علمی مضامین کو شائع کر دیا جو میری تعلیم کے لیے خاص تیار کیے تھے ۔ جب اور شخصوں کو

۱۔ لِم = اصلیت ، حقیقت ۔

بھی ان مضامین پر علم ہو جائے گا تو میرے لیے کون سا فخر باقی رہے گا کہ جس سے میں آوروں پر سبقت لے جاؤں گا۔ میں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ میں علم میں سربلندی بہ نسبت فتح کے زیادہ چاہتا ہوں۔

پس اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سکندر کو علم کا شوق ایسا تھا کہ ملک گیری کا نہ تھا۔ علم کا درجہ نیکی کے بعد ہے، وہ بھی انسان کو بلند پایہ بناتا ہے۔

۲۲۔ اظہارِ علمیّت: یہ ایک خود نمائی ہے کہ کوئی شخص بڑا کتب خانہ اس لیے رکھے کہ وہ بڑا عالم معلوم ہو۔ کیا کوئی شخص ہتھیار بہت سے لگائے تو وہ بڑا بہادر ہو جائے گا؟ کیا کوئی شخص گھر میں خالی چولھے بہت سے بنا لے، اور ان[۱] میں کبھی آگ نہ جلائے، تو کیا اس سے وہ بڑا مہماں نواز معلوم ہوگا؟ لوگ تو راکھ دیکھ کر جانیں گے کہ کیا پکتا ہے۔ پس ایسے ہی[۲] کتابوں کے بڑا کتب خانہ بنانے سے کوئی عالم نہ معلوم ہوگا۔

۲۳۔ جتنا علم بڑھتا ہے اتنا لا علمی کا دائرہ فراخ ہوتا ہے۔ جب آدمی علم شروع کرتا ہے اور تھوڑا سا علم حاصل ہوتا ہے اور نئی نئی باتوں کے معلوم ہونے سے وہ ایسا خوش ہوتا ہے جیسے کوئی آدمی نئے ملک میں جا کر نئی چیزوں کے دیکھنے سے محظوظ و مسرور ہوتا ہے، تو[۳] وہ یہ جانتا ہے کہ روز بروز مجھ پر روشنی چمکتی ہے۔ وہ عالموں فاضلوں کو جانتا ہے کہ یہ سب کچھ جانتے ہیں۔ جن کتابوں کو وہ خود نہیں سمجھتا اور آور[۴] لوگ سمجھتے ہیں تو

۱۔ اصل: اس میں۔
۲۔ اصل: ایسی کتابوں۔
۳۔ "تو" اضافۂ مرتّب۔
۴۔ "آور" اضافۂ مرتّب۔

اُن کی تعریف بہت کرتا ہے ، اور سمجھنے والوں کو جانتا ہے کہ یہ کوئی بڑے فاضل عالم ہیں۔ غرض اس کو یہ خیال نہیں آتا کہ انسان کو علم جن چیزوں کا ہے ، وہ بہت تھوڑی بہ نسبت اُن چیزوں کے ہیں جن کا علم نہیں ہے - جب آدمی کے علم کا دائرہ فراخ ہوتا ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ سب چیزوں پر تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ میرا علم بہ نسبت بے علمی کے بہت ہی کم ہے - جتنے یہ فاضل عالم ہیں ، سب ناکامل ہیں - جن لوگوں کو دانائی اور علم کا دعویٰ ہے ، وہ سب جہالت کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں۔ غرض انسان کو جتنا علم زیادہ ہوتا ہے، اُتنا وہ جانتا ہے کہ میں ناقص ہوں۔ دنیا میں زیادہ تر چیزیں ایسی ہیں کہ اُن کا علم ایک عالم اور بچے کو برابر ہوتا ہے۔ زیادہ علم کا نتیجہ یہی ہے کہ آدمی اپنی لاعلمی سے ماہر ہوتا ہے۔

۱۵۱۔ مال کے باب میں مآل اندیشی

دنیا کی ساری چیزوں میں تم اپنی جائداد کی بڑی خبرداری رکھو۔ اگر اِن تین باتوں کو تم ملحوظِ خاطر رکھو گے تو جائداد تلف نہ ہوگی : اول یہ جانو کہ جائداد میں کیا کیا چیزیں ہیں اور ہر ایک چیز کی قیمت کیا ہے - کوئی نوکر یا افسر تو ایسا نہیں کہ اس کو ضائع کر رہا ہے - دوم کبھی قرض لے کر خرچ نہ کرو[1] ؛ اس لیے کہ قرض جائداد کے لیے اول تپ دق اور آخر کو موت ہے - سوم ، غیروں کی خطاؤں کے لیے زخمی نہ ہو اور اَوروں کے جرموں کی سزا میں کوڑے نہ کھاؤ ؛ یعنی کسی دوسرے شخص کے ضامن نہ ہو - اس طرح سے ضامن ہو کر لاکھوں آدمی برباد ہو کر فقیر ہوگئے ہیں۔

۱- اصل میں جملہ یوں تھا : ”نہ کبھی قرض لے کر خرچ کرو“۔

اَوروں کی خرمستی کی سزا خود انھوں نے اٹھائی ہے ، اَوروں کی نادانی کا جرمانہ بھگتا ہے ۔ اگر سزا بھگتو تو اپنے گناہوں کے لیے ، نہ یہ کہ غیروں کے لیے ۔ غرض اَوروں کے بوجھ اُٹھانے کے واسطے گدھے نہ بنو ۔ اگر کوئی دوست تم سے فرمائش کرے کہ تم میرے ضامن ہو جاؤ تو اُس کو کچھ اپنے پاس سے دے دو ۔ اگر وہ اس پر راضی نہ ہو تو اس کو اپنا دوست بالکل نہ جانو ؛ کیونکہ دوستوں کا کام یہ نہیں ہے کہ دوستوں کو تکلیف دیں ، بلکہ خود تکلیف اٹھائیں ۔ اگر تمھارے پاس دولت ہوگی تو وہ تندرستی میں خوش رکھے گی ، بیماری کی حالت میں تسکین و تشفی کرے گی ، جسم و جان کو وہ فارغ رکھے گی ، بہت سی مضرّتوں سے بچائے گی ، بڑھاپے میں بڑے کام آئے گی ۔ دیانت دار دوستوں اور مفلسوں کی حاجت روا ہوگی ، تمھاری اولاد کی پرورش کرے گی ، اُن کی حمایت کرے گی ، تم کو نامور بنائے گی ۔

امثالِ سلیمان[۴] میں لکھا ہے کہ جو بیگانے آدمی کی ضمانت دیتا ہے وہ اپنے بدن میں ناسور ڈالتا ہے جو ہمیشہ تکلیف دے ۔ اور جو ضمانت سے نفرت کرتا ہے وہ سلامت رہتا ہے ۔ مفلس سے تو اس کے ہمسایے بھی بیزار رہتے ہیں ۔ دولت مند کے بہت سے دوست ہوتے ہیں ۔ جو شخص تم سے زیادہ زبردست ہو ، اُس کو کبھی قرض نہ دو ۔ اس کو قرض دینا روپے کو ڈبونا ہے ۔ جب ضامن ہو تو یہ سمجھ لو کہ ضمانت کا روپیہ ہم کو دینا پڑے گا ، اس لیے اپنے مقدور سے باہر ضامن نہ ہو ۔

۱۵۲ ۔ عقلی قوّت

آدمی کی قوّتِ عقل میں کمال نہیں حاصل ہوتا جب تک یہ تین

باتیں نہ ہوں : اول طبیعت ۔ دوم تعلیم و تربیت ، سوم محنت ۔ یہی شجرِ کمال کی تین شاخیں ہیں ۔ اگر ان میں سے ایک بھی نہ ہوگی تو وہ مرجھا جائے گا ۔ طبیعت بغیر تعلیم و تربیت کے بہت کمزور ہوتی ہے اور تعلیم و تربیت بغیر طبیعت کے بہت ہی ضعیف ۔ محنت ان دونوں میں سے بغیر ایک کے کچھ بھی نہیں ہے ۔ زراعتِ زمین میں تین چیزیں ہوتی ہیں : اول زمین شاداب ، دوم کاشت کار ہوشیار ، سوم عمدہ تخم ۔ طبیعت تو زمینِ شاداب ہے ، معلّمِ دانا کاشت کارِ ہوشیار اور قابلیت و علوم تخمِ خالص ۔ جو پہلے صاحبِ کمال گزرے ہیں اُن میں یہی تین باتیں ہوا کرتی تھیں ۔ انھی تین باتوں نے فیثاغورث ، سقراط اور[1] افلاطون کو فخرِ یونان ، علومِ حکمیہ کا پیغمبر ، حکما کی فہرست میں اول بنایا ۔ خدا کا خاص عطیہ عظمیٰ یہ ہے کہ کسی شخص کو یہ تینوں صفات عطا کرے ۔ بغیر ان کے آدمی بے کس و ناتواں ہے ۔ مذہبِ حکما میں وہ شخص بڑا بدعتی کافر ہے جو یہ کہے کہ جس آدمی کو نیکی کی راہ پر چلنا آتا ہو اور نیکی کرنے کی عادت رکھتا ہو ، اُس کو علومِ حکمیہ کے حاصل کرنے کی ضرورت کیا ہے ۔ جب طبیعت آدمی کے حصے میں نہ[2] آئے تو محنت اکارت ہے ، اور ایسے ہی اگر مطالعے اور مشق ہی میں محنت نہ کی جائے تو طبیعت بے فائدہ ہے ۔ کاہلی ذہانت کو کُند کرتی ہے ، محنت ذہانت کو تیز بناتی ہے ۔ ایک شے خواہ کیسی ہی آسان ہو ، ایک کاہل کو دشوار معلوم ہوگی ؛ اور ایک بات خواہ کیسی ہی مشکل ہو ، وہ محنت سے مطالعہ کرنے والے کو آسان معلوم ہوگی ۔

دنیا میں بہت چیزوں میں عادت ، یعنی بار بار ایک کام کرنے کا

۱۔ ''اور'' اضافۂ مرتّب ۔ ۲۔ اصل : نہیں آئے ۔

اثر، نمایاں دیکھتے ہیں۔ کیسی مینہ کی چھوٹی چھوٹی بوندیں سنگ مرمر میں سوراخ کر دیتی ہیں، لوہا بار بار ہاتھوں کے استعمال سے گھس گھسا کے فنا ہو جاتا ہے۔ محنت کا اثر دیکھو کہ زمین خواہ کیسی ہی شاداب ہو، وہ جوتی نہ جائے تو بنجر ہو جائے گی۔ ایسے ہی طبیعت خواہ کیسی ہی عمدہ ہو، وہ کاہلی و غفلت کی عادت سے کمینہ ہو جائے گی۔ درخت قلم نہ کیے جائیں تو ان میں پھل نہ آئے گا۔ انگور کے درخت چھانٹے نہ جائیں تو انگور زیادہ نہ لگیں گے۔ نزاکت اختیار کرنے سے جسم کی بہت سی قوّت زائل ہو جاتی ہے۔ محنت وہ چیز ہے کہ زبردست گینڈے کو مطیع اور وحشی باز کو اہلی[1] بناتی ہے۔ جو شخص آرام طلب ہوتا ہے وہ دین و دنیا دونوں کے کام کا نہیں رہتا۔ نوجوان، صاحبِ کمال بغیر محنت کے نہیں ہو سکتا۔

۱۵۳۔ کوئی شخص نہ ایسا بُرا، نہ ایسا بھلا ہوتا ہے جیسا ظاہر میں معلوم ہوتا ہے

آدمی کو جب تک دنیا کا تجربہ نہیں ہوتا وہ آدمیوں کی بُرائی بھلائی ٹھیک ٹھیک پرکھ نہیں سکتا۔ بعض آدمیوں کو بُرا، بعض کو بھلا جتنا وہ جانتا ہے وہ ویسے نہیں ہوتے۔ جو شخص دور سے بہت نیک نظر آ رہا ہے، اگر اس کے قریب تم آؤ اور اس کا خوب امتحان کرو تو معلوم ہوگا کہ اس میں بہت سے نقص و عیب ہیں۔ اکثر یہ بات اُن لوگوں میں زیادہ ہوتی ہے جو مذہب کا پیشہ کرتے ہیں اور اَوروں کو نیکی کی تعلیم کرتے ہیں۔ وعظ و پند بڑی فصاحت سے کرتے ہیں مگر گھر میں جا کر وہ خباثت کے کام اور گناہِ کبیرہ کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ:

۱۔ اہلی = پالتو۔

واعظان کین جلوہ در محراب و ممبر می کنند
چون بہ خلوت میروند آن کارِ دیگر می کنند[1]

بعض آدمی بے شک ایسے بد ہوتے ہیں کہ انسانیت کے خلاف ایسے کام کرتے ہیں کہ شیطان سے زیادہ تر مشابہت پیدا کرتے ہیں، اور آن کے دشمن کینہ توز اور مذہب کے عالم اُن کی برائی ازحد کرتے ہیں، مگر تم ان کو ٹٹولو تو بعض خوبیاں اُن میں دیکھو گے کہ جن سے اَوروں کو فائدہ ہوتا ہے؛ اور وہ خدا کو دل سے مانتے ہیں اور اس کی تقدیس کے قائل ہیں۔ جب کوئی وعظ میں اپنا حسنِ بیان ظاہر کرتا ہے، نماز کا پابند ہوتا ہے اور ظاہری مراسمِ مذہبی ادا کرتا ہے تو لوگ اس کی تعریف کرنے لگتے ہیں۔ مگر حقیقت میں بہت سے وہ لوگ قابلِ تعریف ہیں جو گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں۔ نہ اُن کی عبادت کوئی دیکھتا ہے، نہ ریاضت۔ وہ سچّی عبادت کرتے ہیں، اپنے تئیں زمانے کو دکھانے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ نہ وہ مذہبی فرائض کے ادا کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر ان کی زندگی گناہوں کے لوث[2] سے پاک صاف ہوتی ہے۔ خدا پرستی ان کی سچّی ہوتی ہے۔ مگر جو لوگ خدا پرستی کے لباس میں ناخداپرستی کرتے ہیں، وہ جہنّم و جنّت کو ساتھ ملاتے ہیں۔

۱۵۴۔ اچھے معلّم اور متعلّم کی صفات

جمہور انام کے واسطے جیسے کہ پیشۂ معلّمی کی ضرورت ہے شاید ہی کسی اَور پیشے کی ہو۔ مگر اس میں پرلے درجے کی سہل انگاری ہوتی ہے اور کچھ احتیاط نہیں کی جاتی۔ اکثر معلّم ان چار قسموں

۱۔ یعنی واعظ، جو ممبر پر پند و نصیحت کی نمائش کرتے ہیں، جب تنہائی میں جاتے ہیں تو دوسرے کام کرتے ہیں۔
۲۔ لوث = آلودگی۔

میں سے کسی ایک قسم کے ہوتے ہیں : اول نوجوان طالب علم جن کی ابھی تحصیل بھی پوری نہیں ہوئی اور یونیورسٹی کی ڈگری بھی کوئی نہیں ملی کہ وہ دہات اور قصبات میں مدرسے کھول بیٹھے ہیں کہ جس سے ان کی بسر اوقات ہو ، اور جانتے ہیں کہ میاں جی گری کے واسطے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے ۔ سوائے اس کے ایک قمچی ہاتھ میں ہو ۔ دوم ، لائق آدمی بھی معلمی اختیار کرتے ہیں ۔ وہ اس کو کسی اچھی ملازمت پانے کی[1] اول سیڑھی جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہماری دولت مندی میں جو بالفعل کساد بازاری ہے ، اس کی درستی اِس پیشے سے ہو جائے گی ۔ اس ذریعے سے آیندہ کوئی اچھی نوکری مل جائے گی ۔ سوم ، وہ بد نصیب معلم ہیں کہ باوجودیکہ انھوں نے لڑکوں کی تعلیم میں اور ان کے ماں باپوں کی غلامی میں بہت سرزنی کی مگر اس کا صلہ اُن کو ایسا تھوڑا ملا کہ جس سے شکستہ دل ہو کر اس پیشے کو بے دلی سے کرنے لگے ۔ چہارم وہ معلم کہ اس پیشے کی بدولت ایسے دولت مند ہوگئے کہ پھر اس پیشے سے مستغنی ہوگئے ۔ اور اُن کو خود مدرسے کے کام کرنے سے ننگ آنے لگا اور اپنے کام کو اپنے نائبوں اور خلیفاؤں کے ذریعے سے کرنے لگے ۔

اب سنو کہ معلم میں اِن باتوں کا ہونا ضروری ہے کہ اُس کا میلانِ طبیعت اس پیشے کی طرف ایسا ہو کہ اس کے کرنے سے دلی خوشی ہو اور اُس میں یہ قابلیت ہو کہ وہ اپنے طلبہ کی طبیعتوں سے بہت احتیاط کے ساتھ واقف ہو ۔ متعلم جیسے کتابوں سے واقف ہونے چاہئیں ، معلم ایسے طلبہ کی طینتوں سے ۔ اگرچہ بڑے[2] مکتبوں

۱۔ اصل : کے ۔

۲۔ اصل : بڑی مکتبوں ۔

میں کُل طلبہ کی طبائع سے ماہر ہونا دشوار ہے مگر تجربہ کار معلّم اُن کی طبائع کی تنویع و تقسیم کرکے ان کی قواعدِ کلّیہ کی کتاب ایسی بناتے ہیں جیسی کہ قواعدِ صرف و نحو کی ہوتی ہے ، جس[1] میں چند صورتیں مستثنٰی قواعدِ کلّیہ کی ہوتی ہیں۔ اب طلبہ کی تقسیم اس طرح پر ہے :

اول ، طلبہ جو ذہین محنتی ہوں : یہ دونوں باتیں بچپنے میں جمع ہونی قِران السعدین[2] کی طرح مسعود ہے۔ ایسے لڑکوں کے واسطے استاد کا تیوری چڑھانا تسمہ مارنے کی برابر ہے اور تسمہ مارنا موت کی برابر۔ اگر ایک تسمہ استاد لگائے تو اس کی شرم ان پر ہفتوں تسمہ لگاتی ہے۔ ایسی طبائع کے واسطے استاد ہمیشہ نرمی اور ملائمت برتتے ہیں۔

دوم ، ذہین مگر کاہل : ان کا حال ایسا ہوتا ہے جیسا کہ خرگوش اور کچھوے کی کہانی میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ سب اپنے ہم سبقوں کو کچھوا ہی جانتے ہیں۔ ایسے طلبہ بھی اپنے درجے پر پہنچ جاتے ہیں۔ ہوشیار ہونے سے پہلے وہ بہت خوابِ خرگوش میں رہتے ہیں مگر استاد کے کوڑوں کی پھٹکار ان کی نیند کو بھگاتی رہتی ہے۔

سوم ، کُند ذہن مگر محنتی و جفاکش : ان کا حال انگوری شراب کا سا ہوتا ہے کہ ابتدا میں نئی ایسی تیز نہیں ہوتی جیسی کہ پرانی ہونے پر۔ ایسی ان کی ابتدا اچھی نہیں ہوتی مگر انتہا خوب ہوتی ہے۔ وہ ابتدا میں کُوڑ مغز[3] ہوتے ہیں مگر محنت ان کے دماغ

١- اصل : جن میں۔
٢- قِران السعدین = دو نیکیوں یا اچھائیوں کا یک جا ہونا۔
٣- کُوڑ مغز = کند ذہن ، غبی۔

سے اس کُوڑے کرکٹ کو نکال کے خوب صاف کر دیتی ہے۔ برسٹول کے ہیرے گو خوب چمکتے ہوئے، چوکور ہوتے ہیں اور قدرتی ان کی نوکیں نکلی ہوئی ہوتی ہیں مگر نرم ہونے کے سبب سے کسی کام کے نہیں ہوتے۔ برخلاف اس کے مشرق ہیرے انڈیا میں سخت اور کُھردرے ہوتے ہیں۔ پس ایسے لڑکوں کی طبائع کا سخت اور کُند ہونا کام کا ہوتا ہے۔ وہ آخر کو اپنے ملک کے جواہر بن جاتے ہیں۔ محنتی ہونا ان کی کند ذہنی کا معاوضہ کر دیتا ہے۔ ایسے طلبہ کی گوشمالی معلّم نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ جبلّت و طبیعت کو مار سے بدلنے کا قصد کرنا اپنے اوپر تازیانہ لگانا ہے۔ دنیا میں نیچر کی کوئی چیز کوڑوں کے مارنے سے بدل نہیں سکتی۔ جو وقت نیچر نے مقرر کیا ہے، کیا اس کو کوئی ایک منٹ ساری دنیا پر کوڑے مارنے سے بڑھا سکتا ہے؟

چہارم، جو طلبہ کودن، کند ذہن، کاہل ہوں: کاہلی کی اصلاح تو ممکن ہے مگر کند ذہنی کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ جس قینچی کی دھار میں لوہا نہ ہو، اس کو دنیا کے[1] تمام سان تیز نہیں کر سکتے۔ ایسے طلبہ کو اَور پیشوں کی طرف رغبت دلانی چاہیے۔ ان کو طالب علمی کے پیشے کو چھوڑنا چاہیے اور کوئی پیشہ تجارت، صنعت کا اختیار کرنا چاہیے۔

استادوں کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ شاگردوں کی خوش لیاقتی سے ان کا نام بھی روشن ہوتا ہے اور ان کی ناموری سے وہ بھی نامور ہوتے ہیں۔ بہت سے ایسے معلّم ہوتے ہیں کہ کوئی اُن کا نام نہ لیتا اگر اُن کے شاگرد نامور نہ ہوتے۔

١- اصل: کی تمام سان۔

١٥٥- مرنے پر افسوس کرنا حماقت ہے

جب آدمی مرتا ہے تو فقط یہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنی لذائذِ جسانی سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ وہ اپنی ساری خوشیوں سے - نہ وہ علم اور مطالعے سے محظوظ ہو سکتا ہے ، نہ دانش مندوں اور خدا پرستوں سے باتیں کر سکتا ہے - نہ پڑھنے سے نہ سیکھنے سے لطف اٹھا سکتا ہے ، گھر میں نہ کسی عبادت خانے میں عبادت کر سکتا ہے - وہ اپنا کتب خانہ چھوڑ جاتا ہے جس کی کتاب کا ایک ورق اُلٹنا اس کو نصیب نہیں ہوتا - نہ وہ زندوں میں واپس آتا ہے ، نہ وہ کسی عزیز کا چہرہ دیکھتا ہے - نہ کوئی آدمی اُسے دیکھتا ہے ، نہ کوئی شہر ، نہ کوئی کوچہ و بازار ، نہ کوئی کھیت دیکھنے میں آتا ہے - نہ دنیا کی خبر معلوم ہوتی ہے کہ کیا اس میں ہو رہا ہے ؛ کہاں لڑائیاں اور فساد ہو رہے ہیں ، کہاں خدا پرستی اور دانائی کی ترقی ہو رہی ہے - پس اگر مرنے کے وقت ان خیالات سے افسوس و حسرت ہو تو سوچنا چاہیے کہ یہ دنیا ایک تماشا گاہ ہے کہ جس میں بے شمار آدمی مرنے کے لیے بیٹھے ہیں - اگر مرنا کچھ میری ذات سے مخصوص ہوتا تو البتہ افسوس کرنا چاہیے تھا کہ ایک خاص قانون ایسا سخت ، جو قابلِ برداشت نہیں ہے ، میرے لیے بنایا گیا - لیکن نہ پہلے زمانے میں نہ آئندہ زمانے میں جب کوئی اس قانون سے بچا ہو تو کیوں ایسی لابدّی اور ضروری چیز کا مقابلہ کر کے بے فائدہ اپنے تئیں زحمت پہنچائے - یہ شاہراہِ فنا وہ ہے کہ جس میں سب کو چلنا پڑا ہے اور چلنا پڑے گا - وہی ہم سب کا گھر ہے - بے شمار آدمی اس میں چل چکے ہیں اور اَن گنت چلنے کو بیٹھے ہیں - یہ وہ بلائے عالم گیر ہے کہ جس کی فریاد کوئی نہیں سنتا - جب بڑے بڑے محلِ شاہی جل

رہے ہوں تو تیرے جھونپڑے کا جلنا کیا نقصان ہے ؟ کیا تیری فریاد اور آہ و واویلا سے آسمان اپنے چرخ کی حرکتِ دوامی کو ٹھیرا کے تیرا مجرئی بنے گا ؟ اس کی یہ سریع دوامی حرکت کیا ہے ؟ ہماری عمروں کا لپیٹنا اور کھولنا ہے ۔ موت پر انتظامِ گیتی موقوف ہے ۔ دنیا کی زندگی موت پر موقوف ہے ۔ دنیا جب ہی تک دنیا ہے کہ ایک مخلوق مرتی ہے ، دوسری اِس کی جگہ پیدا ہوتی ہے ۔ برابر یہ کون و فساد چلا جاتا ہے ۔ اس میں مقامِ دوام نہیں ہے ۔ دنیا میں مادے کا حال وہی ہے جو سمندر کا کہ اس میں متواتر تلاطم ہوتے ہیں ، جوار بھاٹے آتے ہیں ، لہروں پر لہریں چڑھتی ہیں ، موجیں اُٹھتی ہیں اور ہٹتی ہیں ، مگر اُس کا پانی ایک ہی رہتا ہے ۔ پس اسی طرح دنیا میں آدمی موجوں کی طرح پیدا اور فنا ہوتے ہیں ، دنیا وہ کی وہی رہتی ہے ۔ زمین ایک تختہ ہے ، آدمی اشتہار ہیں جو اس پر لگتے اور اُترتے ہیں ۔ خدائے تعالٰی نے دنیا میں موت سے عجیب و غریب تماشے دکھا رکھے ہیں ۔ موت کا حکم اُس نے وہ لگایا ہے کہ کسی کے ٹالے سے نہیں ٹلتا ۔ جو حیات و موت کا قانون اُس نے مقرر کیا ہے ، وہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے اور ہمیشہ چلا جائے گا ۔ کسی کا مقدور نہیں کہ اس میں کوئی ترمیم یا تغئیر کر سکے ۔ اس میں تغیّر چاہنا ایک ناممکن بات کا چاہنا ہے ۔ اس سے زیادہ کوئی حماقت نہیں کہ خدا کے اس حکم پر انسان افسوس کرے ۔

١٥٦ ۔ مصائب کے رنجوں کا علاج

انسان کے مصائب یا[1] عام ہوتے ہیں یا خاص ۔ عام یہ ہیں :

---

١ ۔ اصل : کیا عام ہوتے ہیں ۔

لڑائی ، وبا ، گرانیِ اجناس ، قحط سالی ، آتش زدگی ، موسموں کا غیر موسم ہونا ، وبائی امراض - یہ سب وہ سخت بلائیں ہیں کہ جس میں شہر کے شہر ، ملک کے ملک مبتلا ہوتے ہیں - خاص آفات یہ ہیں : اِفلاس ، اِحتیاج ، تردّد و تفکّر ، عزیزوں کی موت ، بیماری ، نقصان ، بے عزتی وغیرہ - انسان کی کوئی حالت ایسی نہیں کہ جس میں شادی و غم توام[1] نہ ہوں - ہماری کُل زندگی تلخ و شیریں جذباتِ قلبی سے بھری ہوئی اور اس کے شہد میں زہر ملا ہوا ہے - اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہم سب ناخوش و دکھی ہیں ؟ پس جب رنج و غم کا ہونا انسان کے لیے لازمی اور ضروری ہوا تو کوئی ایسا آدمی نہ ہوگا کہ رنج سے آزاد ہوگا ، فانی نہ ہوگا - جب رنج و الم سب کے واسطے عام ہو ، کوئی اس سے خالی نہ ہو ، تو پھر کس لیے آدمی رنج میں بے صبر و بے قرار دوسرے آدمی سے زیادہ ہو - اگر رنج کا ہونا مخصوص کسی شخص کی ذات کے ساتھ ہوتا تو البتہ اس کو حسرت ہوتی کہ میرے لیے یہ مصیبت بنی ہے جو مجھ سے اٹھائی نہیں جاتی ہے - مگر جب سب اس میں شریک ہیں تو :

مرگِ انبوہ جشنے دارد[2]

غرض کوئی میری خاص صورت نہیں ہے کہ جس کے سبب سے حسرت و افسوس میں اپنے تئیں گُھلاؤں -

علاوہ ان خاص رنجوں کے دشمنوں کا خوف بھی ہمارے پیچھے لگا ہوا ہوتا ہے - لڑائی ہم کو خوشی کے باجوں کی آوازیں ، توپوں

۱- توام = جُڑواں -
۲- فارسی محاورہ ، جس سے یہ مراد ہے کہ جب سب لوگ ایک ہی مصیبت میں مبتلا ہوں تو ایسی مصیبت ایک طرح کا میلہ بن جاتی ہے -

کی دُھؤاں دُھوں اور نقاروں کی دُوں دُوں سے سناتی ہے۔ اپنی نفیریوں کی آوازیں کانوں میں بھرتی ہے۔ شادیوں کی مشعلوں کی جگہ شہروں اور قصبوں کو جلا کر شعلوں کو دکھاتی ہے۔ شادیوں کی دھوم دھام کی جگہ آہ و نالوں کا فغاں سناتی ہے۔ ہنسنے کی بجائے رلاتی ہے۔ یہ باتیں ہمیشہ سے ہوتی آئی ہیں اور ہمیشہ ہوتی رہیں گی۔ جب تک انسان زندہ رہے گا، اس کی زندگی میں شادی و غم کا دَور رہے گا۔ ایک کے پیچھے دوسرا آئے گا۔ اس حالتِ ناگزیر سے کوئی بچنے کا چارہ نہیں ہے۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ جو بات ضرور اور ناگزیر ہو، اس پر آدمی کو رنج کرنا نہیں چاہیے، بلکہ اپنے تئیں تسلّی اور تشفّی دینی چاہیے؛ اس لیے کہ اس کی تو خواہ نخواہ برداشت کرنی پڑے گی۔ پھر صبر و تحمّل کر کے اپنے تئیں متحمّل بناؤ۔

جو رنج بہت دنوں رہتے ہیں وہ امتدادِ زمانہ سے خفیف ہو جاتے ہیں۔ جو رنج بھاری ہوتے ہیں وہ زیادہ دیرپا نہیں ہوتے۔ خود ختم ہو جاتے ہیں یا دوسرے کا خاتمہ جلد کر دیتے ہیں۔ رنج کو وقت دور کر دیتا ہے۔ عادت اس کے اثر کو مٹا دیتی ہے۔ سب رنجوں کی عام[1] دوا فراموشی ہے۔ جب یہ رنج گزر جاتے ہیں تو دل کو ایسا چین اور آرام آتا ہے کہ لطف زندگی کا بڑھ جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی چیز کی محرومی باعثِ مسرّت ہوتی ہے۔ ہم کو یہ خیال بھی[2] کرنا نہیں چاہیے کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا خوش ہے کہ اس کو رنج کبھی نہ ہوا ہو:

۱۔ اصل میں ''عام'' کی بجائے ''عالم'' چھپا ہے جو درست معلوم نہیں ہوتا۔

۲۔ اصل: خیال کرنا بھی۔

تو فکر معقول بفرما کہ گل بے خار کجاست[۱]

آسمان کو ستاروں سے آرائش ہے، زمین کو آدمیوں سے۔ آسمان پر ستاروں کی گردش کا مانع اور حارج ایسا نہیں کہ ان کی حرکت کو روک دے یا بدل دے مگر زمین پر آدمیوں کی یہ حالت نہیں ہے۔ اس کے کاموں کے واسطے بہت سی مشکلات سدِّ راہ ہوتی ہیں۔ سعی و کوشش میں بہت سی مزاحمتیں پیش آتی ہیں۔ کوئی انسانِ فانی اس قانونِ فطرت سے بری نہیں۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کی آرزو اور خواہش کے موافق کُل کام ہوئے ہوں اور قسمت نے اس کی آرزوؤں کی مزاحمت نہ کی ہو۔ دنیا میں کوئی چیز ایسی صاف نہیں کہ جس میں دُرد[۲] نہ ہو۔ جو چیز چاند کے نیچے ہے[۳] اس میں تغیّر اور بربادی ضرور ہے۔ انسان کی تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ جب تک وہ دنیا میں زندہ رہے، خوشی و رنج دونوں کا دَور چلے۔ وہ دنیا میں بغیر ان دونوں چیز کے رہ نہیں سکتا۔ آسمان پر ستاروں کی حرکتوں کو دیکھو کہ کبھی ان کی حرکت سیدھی، کبھی اُلٹی، کبھی مشرق کو، کبھی مغرب کو ہوتی رہتی ہے۔ ایسے ہی دنیا میں آدمیوں کا حال رہتا ہے کہ مدّ و جزر اس میں ہوتے رہتے ہیں؛ جیسے زندگی تلخ ہوتی ہے، حادثات و واقعات بہت نشیب و فراز دکھاتے ہیں، طرح طرح کے دل میں جوش اٹھاتے ہیں۔ اپنا اور اوروں کا ضعف، بوقلمونیِ روزگار دکھاتا ہے۔

۱۔ یعنی تمھیں سوچنا چاہیے کہ کوئی پھول، کانٹے کے بغیر نہیں ہوتا۔

۲۔ دُرد = شراب کی تلچھٹ۔ یہاں میل مراد ہے۔

۳۔ اصل: ہیں۔

۱۵۷- روشنی خدا کا سایہ ہے

روشنی جیسے ہزار ہا اشیا کو دکھاتی ہے ، ایسے ہی سینکڑوں چیزوں کو نظر سے چھپاتی ہے - اگر زمین کا سایہ نہ ہو اور اس پر تاریکی نہ ہو تو خالقِ جہاں کی مخلوق کا وہ حصہ نظر سے پنہاں ہو جو سب سے زیادہ ذی شان ہے - پھر ان کا وہ حال ہو جو آفرینشِ عالم کے روزِ چہارم میں تھا کہ خدا نے اُن کو افق پر آفتاب کے ساتھ بنایا تھا جب کوئی آنکھ اُن کو دیکھنے والی نہ تھی - سایے کے نام سے چیزیں بیان ہو سکتی ہیں ؛ مذہبی اسرار سایے ہی سے تعبیر ہوئے ہیں - عیسائی مذہب نے اپنا سایہ یہودیوں کے مذہب میں دکھایا ہے - موت کا سایہ حیات ہے - جو روحیں جسم سے جدا ہوگئی ہیں ، وہ حیات کا سایہ ہیں - آفتاب خود سیاہ سایہ ہے اور روشنی خدا کا سایہ ہے -

۱۵۸- محبت و تزویج

مرد جو عورت سے عقدِ نکاح باندھتا ہے ، وہ نہایت اپنی ضرورت اور غرض کا پانسہ پھینکتا[1] ہے - اگر وہ پلٹ گیا تو پھر جینا مرنا دونوں خراب ہیں - اس عقد کی گرہ میں ساری خوشیاں اور رنج اس کے وابستہ ہیں - جب نیا نیا بیاہ ہو تو دونوں میاں بیوی کو اس کا بڑا لحاظ اور پاس چاہیے کہ کوئی بات ایسی نہ کریں کہ جس سے ایک دوسرے سے خفا اور رنجیدہ ہوں - تازی کلی ذرا سی ہوا کے جھونکے سے گر جاتی ہے - جب انگور کے چھوٹے چھوٹے حلقے ایسے نکلتے ہیں جیسے نئے دودھ چھوٹے ہوئے بچے کے گھونگر والے بالوں میں ہوتے ہیں ، تو

۱- اصل : پاسہ پھیکتا ہے -

اُن کو جنوبی ہوا برباد کر دیتی ہے - مگر جب کچھ دن ان پر گزر جاتے ہیں تو وہی مضبوط شاخیں ہو جاتی ہیں ، اور جب آفتاب ان کو بغل میں لے لیتا ہے اور آسمان ان پر بوسے دیتا ہے تو ان میں وہ خوشے پکتے ہیں کہ شمالی ہوا کے جھکّڑ بھی نہیں گرا سکتے - وہ آندھی اور ہوا کے طوفان کی آواز بھی نہیں سنتے - پس یہی حال نئے[1] بیاہ کا ہے کہ ابتدا میں دونوں کو بہت احتیاط چاہیے کہ ایک دوسرے کے کاموں کو دیکھے اور حالات کو تحقیق کرے - اپنی محبت میں ایک دوسرے پر رشک کریں ، کام میں مصروف رہیں اور نامہربانی کا جو لفظ کسی کے منہ سے نکل جائے تو اس کی خبر رکھیں - مگر جب بیاہ پر مدت گزر جائے اور میاں بیوی کا دل ایک ہو جائے اور ایک کو دوسرے کا تجربۂ محبت ہو جائے اور باہم اعتبار ہو جائے ، اور وہ تکلّف بر طرف ہو جائیں جو تصنّع و مکاری کے سبب سے ہوتے ہیں ، تو پھر بہت سی باتیں جو بالفعل موجود ہوتی ہیں اور بہت سی پہلی یاد ہوتی ہیں کہ ان کے سبب سے جو باتیں چھوٹی چھوٹی نامہربانیوں کی اب واقع ہوتی ہیں تو ان کا کچھ خیال بھی نہیں ہوتا -

دنیا میں کوئی چیز بغیر محبت کے لطف نہیں دیتی - اگر کوئی شخص مقدّس عاقلانہ وعظ سننے سے یہ[2] کہے کہ میں تھک جاتا ہوں اور امن و عافیت سے نفرت رکھتا ہوں تو وہ شخص فردوس سے کانٹے اپنے دامن میں چن کر رکھتا ہے ، کیونکہ اس میں محبت نہیں ہے - آسائش و آرام کی شیریں کرنے والی کوئی شے سوائے محبت کے نہیں ہے - جو شخص اپنی بیوی سے محبت رکھتا ہے تو وہ اپنے گھر کو قبلہ و کعبہ جانتا ہے ، اپنے باغوں کو بہشت سمجھتا ہے - بیوی کو

١- اصل : نئی بیاہ - ٢- ''یہ'' اضافۂ مرتّب -

ایک چشمۂ سربند جانتا ہے جو اس کی تشنگی کو بجھاتی ہے، اس کے تردّدات کو فارغ البالی سے بدلتی ہے، اس کی آنکھیں آسمان کی روشنی سے زیادہ خوش نما معلوم ہوتی ہیں، اس کے سینے کو اپنی آرام گاہ جانتا ہے۔ وہ اپنے سارے رنج و الم کو اتار کے اس کی گودی میں رکھ دیتا ہے۔

جو لوگ بچوں سے محبت رکھتے ہیں وہ ان کیفیتوں کی لذّتوں کو سمجھتے ہیں کہ بچوں کی پُھدک، چُلبلا پن کیا پیارا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے بولنے کی نرم آواز، توتلا پن، ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا کہنا کانوں کو کیا خوش لگتا ہے۔ ان کا تھوڑی سی بات پر غصّہ ہونا، پھر جلدی سے مٹ جانا اور ان کا ناز آٹھانا جان کو توانا کرتا ہے۔ ان کا معصوم اور خام ہونا دل کو آرام دیتا ہے۔

۱۵۹۔ مصائبِ زندگانی

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے[1]

آہ! افسوس! دنیا میں کتنے تھوڑے آدمی خوش حال ہیں۔ بے شمار آدمی بھیک مانگتے ہیں، غلامی کرتے ہیں۔ آفت، مصیبت، بلا میں مبتلا ہیں۔ زمین میں کوئی کونہ نہیں جس میں ان کی آہ و فغاں کا

۱۔ خواجہ میر درد کی جس غزل کا یہ شعر ہے اُس کا مطلع ہے:

تہمتِ چند اپنے ذمّے دھر چلے — جس لیے آئے تھے ہم سو کر چلے

اسی غزل کے دو اور نہایت مشہور شعر دیکھیے:

شمع کی مانند ہم اس بزم میں — چشم نم آئے تھے، دامن تر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے، ساغر چلے

غُل نہ ہو رہا ہو؛ بلکہ ان کی فریادیں، رونے کی چیخیں، دعاؤں کے غُل آسمان تک پہنچتے ہیں۔ ایک سخت لڑائی دیکھو کہ وہ کیسی صوبے اور ضلعے غیر آباد کر دیتی ہے۔ کبھی کبھی[1] اُس کی خوں خواری سے سارا ملک بے چراغ ہو جاتا ہے۔ بعض ملکوں میں موقّت[2] امراضِ وبائی آیا کرتے ہیں جو ان کو خاکِ سیاہ کر دیتے ہیں۔ ان کے سوائے ہزاروں آدمیوں کو بُھوت پلید نظر آتے ہیں جن سے اُن کا ناک میں دم ہوتا ہے۔ جنّ اور پری کا سایہ ان کو دیوانہ بناتا ہے۔ تم آسمان پر چڑھ کر نیچے زمین پر نگاہ کرو تو تم کو نظر آئے گا کہ کتنے عورت و مرد غش میں پڑے ہیں[3]، بھوکے مرے جاتے ہیں۔ کتنے نوجوان تلوار سے کٹے پڑے ہیں، کتنے یتیم بچے اپنے ماں باپوں کی قبروں پر کھڑے رو رہے ہیں جن پر اُن کی زندگی بسر کرنے کا مدار تھا۔ کتنے ملاح اور مسافر سمندر میں طوفانوں سے غرق ہو رہے ہیں اور چیخیں مار رہے ہیں۔ کتنے جہاز پہاڑوں سے ٹکرا کے پاش پاش ہو رہے ہیں اور اہلِ جہاز غرقابِ فنا ہو رہے ہیں۔ کتنے آدمی اپاہج پڑے رو رہے ہیں۔ بہت سے ایسے ستم رسیدہ ہیں کہ دیوانے ہو گئے ہیں۔ بعض کی آسودگی چھن گئی ہے، اس سے بے چین ہو رہے ہیں۔ بہت سے بیمار پڑے مر رہے ہیں۔ غرض چاروں طرف تم کو انسان کے مصائب نظر آئیں گے۔ اگرچہ تمھارا دل اس وقت خوش ہوگا کہ خدا نے ہم کو ان مصائب سے بچا رکھا ہے، مگر خوب سمجھ لو

۱۔ اصل: کبھی نہ کبھی۔

۲۔ موقّت = وقتِ مقرّر پر۔ ''موقّت امراضِ وبائی'' سے غالباً ایسے وبائی امراض مراد ہیں جو ہر سال ایک خاص موسم میں پھوٹ پڑتے ہیں۔ جیسے ہیضہ اور چیچک وغیرہ۔

۳۔ اصل: کتنی عورت و مرد غش میں پڑی ہیں۔

کہ دنیا بڑی مصیبت کی جگہ ہے ، اس سے چلے جانے کا جلد سامان تیار کرو ۔

۱۶۰۔ ہر جگہ موت

کہیں بنی آدم کا قدم نہیں پڑتا جہاں کسی مردہ کی ہڈی اُس کے پاؤں کے[1] نیچے نہ آئے ۔ ایک شخص جہاز میں بیٹھا چلا جاتا تھا کہ وہ جہاز شکستہ ہو کر تباہ ہوا ۔ اس کو ایک تختہ ہاتھ لگ گیا ، اُس پر سوار ہو کر یہ ساحل پر اُترا ۔ وہاں پہاڑی پر بیٹھا دھوپ میں اپنے تئیں سُکھا رہا تھا کہ اُس کی نظر ایک آدمی پر پڑی کہ وہ امواج پر اُلٹ پلٹ ہوتا چلا آتا ہے ۔ اُس کے کپڑوں کی شکنوں میں ریت بھرا ہے ۔ اُس کا دشمن بھلامانس — سمندر — اُسے کندھے پر لیے ساحل کی طرف قبر میں دفن کرنے کے لیے لاتا ہے ۔ یہ دیکھ کر اس کے دل میں جوش اُٹھا اور اس مردہ کے کنبے کی طرف خیال دوڑا کہ اُس کی بیوی چین آرام سے کہیں اس ملک میں بیٹھی ہوئی دن گن رہی ہوگی کہ اگلے مہینے میں میرا پیا گھر آ جائے گا ۔ اس کے لڑکے کو خیال بھی نہ ہوگا کہ اس طوفان میں باپ غرقابِ فنا ہوا ہوگا ۔ باپ کے گالوں پر بوسۂ رخصت کی گرمی ہنوز باقی ہوگی اور خوشی کے مارے اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے آتے ہوں گے کہ اب میرا بیٹا آئے گا اور میرے ہاتھوں کے حلقے میں مجھ سے گلے ملے گا ۔ انسانِ فانی کے خیالات اور ارادوں کا مجموعہ اور ان کا انجام یہی ہوا کرتا ہے ۔ ایک اندھیری رات ، ایک غلط رہنما ، ایک متلاطم سمندر ، جہاز کے ایک پُرزے کی شکستگی ، ایک سخت پہاڑ ، ایک جھکڑ کی ہوا نے

۱۔ "کے" اضافہ مرتب ۔

اس سارے کنبے کو ڈبو دیا - گو خود اس طوفان میں نہیں آئے مگر ان پر وہی مصیبت گزرے گی جو جہاز کی تباہی سے گزری - وہ اس حادثے کو سن کر خوب رو رو کر چیخیں ماریں گے - جب وہ لاش میرے پاس آئی اور اس کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ خود مالکِ جہاز کی لاش ہے جو ایک روز پہلے اپنی دولت اور تجارت کا حساب لوگوں سے تیار کرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ فلاں تاریخ میں اپنے گھر پہنچ جاؤں گا - اب دیکھو کہ وہی شخص ، جو دو روز پہلے غصے ہو رہا تھا ، کیونکر تیر رہا ہے - اس کے تمام دل کے جوش و جذبے طوفان نے اتار دیے ، اس کے سارے حساب نقش بر آب کر دیے ، اس کی تمام عقل و ہوش کو ختم کر دیا ، سفر کو سفرِ آخرت پر تمام کر دیا - معلوم نہیں کہ وہاں پر کیا بُری بھلی بنے[1] - جو زندہ ہیں وہ مُردوں کی بُری بھلی سے کیا کام رکھتے ہیں -

انسان کی حالت میں موت سے زیادہ کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں - کسی زندہ کو مردہ سے مقابلہ کر کے دیکھ لو - بچپنے کی خوشیوں اور بے فکریوں کو ، رخساروں کی تازگی کو ، آنکھ کی چمک دمک کو - اور پھر پچیس برس کی عمر میں جسم کی توانائی اور جوڑوں کی خوش اسلوبی اور پٹھوں کے کَس کو ؛ اور پھر مرنے کی زرد رنگی اور ضعف و ناتوانی کو دیکھو کہ ان حالتوں میں کیا کیا بُعد بیّن[2] ہے - انسان کا حال گلاب کا سا ہے کہ ابھی وہ ٹہنی سے ٹوٹا - صبح کو کِھلا ، اس پر اوس پڑی جس سے وہ بھیڑ کے بچے کی اُون کی طرح سفید ہو گیا - تھوڑی دیر بعد اس کا یہ رنگ بدلا ، شگفتگی کا جامہ اُترا ، پتیاں جھڑیں ، خود زمین پر گرا ، خاک ہو گیا - یہی انسان کی

۱- اصل : بنی - ۲- بُعد بیّن = واضح دُوری -

پیدائش و نمو اور وقوف و انحطاط و فنا کا حال ہے - آدمی کا یہ حصہ ہے کہ کیڑوں اور سانپوں کا ورثہ[1] ہو - سڑے ، اُبسے ، مٹی خوار ہو[2] -

مرنے کے بعد آدمی کا سارا حسن اور جوبن ایسا بدل جاتا ہے کہ دوست آشنا بھی اُس کو نہیں پہچان سکتے - مرنے کے[3] ساتھ ہی مردہ سے خوف سب کو لگنے لگتا ہے - وہ لوگ جو اپنی محبت و اُلفت سے یا عالی ہمتی سے اُس کی خدمت کرتے تھے ، وہ ایسے خائف ہو جاتے ہیں کہ اُس کمرے میں نہیں آتے کہ جس میں اُس کا جسمِ بے جان رکھا ہوتا ہے -

ایک جرمن کا حال لکھا ہے کہ وہ بہت حسین تھا - دوست اس کی تصویر کے بڑے خواست گار تھے - مگر وہ اپنی تصویر کھنچوانے سے انکار کرتا تھا اور دوستوں سے کہتا تھا کہ جب میں مر جاؤں تو تیسرے روز میری قبر پر مصوّر کو بھیجنا کہ وہ مجھ مُردہ کی تصویر کو زندہ کرے - جب وہ مر گیا تو مصوّر اس کی قبر پر تصویر کھینچنے گیا اور تصویر اُتاری - اُس کا آدھا چہرہ جانور کھا گئے تھے - پیڑو اور ریڑھ کی ہڈی میں سانپ لپٹے ہوئے تھے - سن لو کہ حسینوں کی صورتیں قبر میں یہ ہو جاتی ہیں - کیا تبدیلیِ عظیم ہے کہ ہر ایک حسین صورت کی یہ صورتِ بد ہو جاتی ہے - نہ کوئی نوکر خدمت کرنے آتا ہے ، نہ کوئی دوست ملاقات کرنے ، نہ کوئی

۱- یہاں ''ورثہ'' کا لفظ غیر موزوں لگتا ہے - غالباً مراد یہ ہے کہ انسان کا انجام یہ ہے کہ بالآخر وہ قبر میں پہنچ کر کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بنتا ہے -

۲- یعنی اُس کی لاش سڑ جائے ، اُبس جائے اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جائے -

۳- اصل : کی ساتھ -

قبر کے گنبد کو جھاڑو دے کر صاف کرنے -

اگر کوئی آدمی بادشاہوں کے قبرستان میں چلا جائے تو وہاں قبروں کو دیکھ کر ایک وعظ ایسا سن سکتا ہے جو کبھی نہ سنا ہو - سپین کے بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ جس مکان میں وہ اپنی شاہانہ شوکت و عظمت کو دکھاتے ہیں ، وہیں ان کے باپ دادا کا قبرستان ہوتا ہے - بادشاہوں کے سر پر افسرِ شاہی[1] جب رکھا جاتا ہے تو ان کو اپنے باپ دادا کے سروں پر قدم رکھنا پڑتا ہے - قبرستان اس تبدیلیِ عظیم کی ایک نقل ہوتی ہے جس میں فقیر و غنی ، ضعیف و قوی ، چھوٹے بڑے سب پڑے سوتے ہیں - اس کے دیکھنے سے شہوت پرستی کی آگ بجھ جاتی ہے ، غرور کا سر نیچا ہو جاتا ہے ، ہوا و ہوس کی خارش مٹ جاتی ہے ، خیالی مصنوعی شہوت خیز خوبصورتی مٹّی میں مل جاتی ہے - جنگ جُو ، امن خواہ ، خوش نصیب ، بد نصیب ، عزیز و مردود سب اپنے تئیں خاک میں ملاتے ہیں اور اپنے فنا ہونے کی نشانیاں دکھاتے ہیں ؛ اور تمام دنیا سے کہتے ہیں کہ یہاں ہماری خاک بادشاہوں کے برابر ہوگئی - وہاں ہمارا محاسبہ آسان ہوگا -

۱۶۱- ظاہرا ناممکن[2]

یہ کاہلی اور سُستی کا کام ہے کہ وہ بہت سی چیزوں کو ناممکن بناتی ہے - جہاں کسی کام کے کرنے کی[3] لوگوں کو پروا نہیں ہوتی

۱- افسرِ شاہی = تاجِ شاہی -
۲- یعنی کسی کام کا بظاہر ناممکن نظر آنا -
۳- اصل : کے -

تو اس کے لیے یہ بہانہ بناتے ہیں کہ بھلا یہ کام کہیں ہو سکتا ہے ؟ کسی کام کے ممکن ہونے کا مختصر اور تحقیق طریق یہ ہے کہ ہمہ تن اس کے سرانجام دینے میں مصروف ہو جائیں ۔ پھر دیکھ لیں کہ وہ کیسا ناممکن سے ممکن ہو جاتا ہے ۔ اکثر ایسا تجربہ ہوا ہے کہ جو کام ظاہر میں ناممکن معلوم ہوتا ہے ، وہ محنت سے سرانجام ہو جاتا ہے ۔

۱۶۲۔ خاندان میں نفاق

سلطنت ایک بڑا خاندان ہوتا ہے اور خاندان ایک چھوٹی سلطنت ہوتی ہے ۔ جیسا کہ سلطنت کے لیے لازم ہے کہ فتنہ و فساد سے خالی نہ ہو ، اس میں انقلابات پیش آتے رہیں اور جھگڑے بکھیڑے اٹھتے رہیں ، ایسے ہی[۱] خاندان میں ضرور ہے کہ ایسی باتیں ہوتی رہیں ۔ یہ تصوّر کرنا نادانی ہے کہ اولاد اور والدین کے درمیان محبت ہمیشہ یکساں رہتی ہے ۔ عہدِ طفلی کے بعد اس اُلفت کی صورت بدلنے لگتی ہے ۔ جب اولاد جوان ہوتی ہے تو وہ ماں باپوں کی تنبیہ اور تاکید کو نہیں سن سکتی اور بجائے شکرگزار ہونے کے شکایت کرنے لگتی ہے ۔ ہر اولاد یہی چاہتی ہے کہ ماں باپ مجھ ہی کو زیادہ چاہیں اور میرے ہی ساتھ ان کی بہت سی باتیں مخصوص ہوں ، مگر ماں باپ اپنے تئیں ساری اولاد کے حوالے کرتے ہیں ۔ بعض اولاد ماں کی لاڈلی اور بعض باپ کی پیاری ہوتی ہے ، اس لیے بہن بھائیوں میں رشک کا آغاز ہوتا ہے ۔ ان میں مکر و حیلے بہانے کی جلی کٹی باتیں ہونے لگتی ہیں ۔ آخر کو نوبت فساد و عناد پر پہنچ جاتی ہے ۔

۱۔ ''ہی'' اضافۂ مرتّب ۔

ماں باپ مُسن[1] ہوتے ہیں، اولاد جوان ہوتی ہے۔ بوڑھے جوان ہم رائے نہیں ہوتے۔ پیری اور جوانی کے خیالات کا اور اوضاع و اطوار کا اختلاف ایسا ہی ہوتا ہے جیسا بہار و خزاں میں باغ کے درختوں کا۔ دونوں کی حرکات مختلف ہوتی ہیں اور اس سبب سے باہم اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ ایسے ماں باپ تو گوگرد سرخ کا حکم رکھتے ہیں کہ جو اپنی نصیحت کے موافق خود عمل کریں۔

بڑھاپے میں کسی ایجاد کی قدر نہیں ہوتی۔ تھوڑی ترقی پر صبر ہوتا ہے۔ دولت سے محبت ہوتی ہے، غور و تأمّل کے ساتھ کام ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے جوانی میں دل امنگوں سے بھرا ہوتا ہے۔ اپنے اوضاع و اطوار کو عقل روز بروز سرعت سے درست کرتا ہے۔ عزت پر مرتا ہے، نیکی کی تعظیم کرتا ہے، عالی ہمتی اور خوش نصیبی کے حوالے اپنے تئیں کرتا ہے۔ اولاد جو اپنی نیک نیتی سے کوئی نیک کام کرنا چاہتی ہے تو بوڑھا باپ اپنے تجربے کے سبب سے اس میں شک پیدا کرتا ہے، اس کی تیزی و سرعت سے ناراض ہوتا ہے۔ اولاد کو باپ کا یہ تامّل اور شک ناپسند ہوتا ہے۔ غرض اس طرح رفتہ رفتہ ان کی باہمی محبت و الفت میں فرق ہوتا جاتا ہے۔ گو اس طرح کا نفاق ضروری نہیں ہے لیکن ایسا کم اتفاق ہوتا ہے کہ کسی خاندان میں کُل آدمی نکوکار اور پرہیزگار ہی ہوں۔ اگر خاندان میں ایک بھی بد ہوگا تو رشتۂ اتفاق گسستہ ہو جائے گا۔ ایک مچھلی سارے جل[2] کو گندہ کرتی ہے۔ اس سے زیادہ دشوار امر یہ ہے کہ بُروں ہی میں ناموافقت نہیں ہوتی بلکہ بھلوں میں بھی اتفاق

۱- مُسن = سن رسیدہ، بڑی عمر کا۔
۲- جَل = پانی۔

نہیں رہتا ۔ جب نیکیاں حدِ اعتدال سے تجاوز کریں گی تو ان میں اختلاف پیدا ہوگا ۔ نیکیاں بھی آپس میں متضاد ہوتی ہیں ۔ ایک کفایت شعار ہو ، دوسرا سخاوت شعار تو دونوں میں ضرور اختلاف ہوگا ۔ ایک شخص کی نیک عقل اور صلاحیت سے اتنے آدمی خوشی نہیں حاصل کر سکتے جتنے ایک آدمی کی شرارت یا حماقت سے رنج و مصیبت اٹھاتے ہیں ۔ غرض خاندان میں نفاق فقط ایک آدمی کے بُرا ہونے سے پھیل جاتا ہے ۔ اس لیے خاندان کا اتفاق اس پر موقوف ہے کہ کوئی ایک بھی خاندان میں بُرا نہ ہو ۔ ایسا ہونا مشکل ہے ، اس لیے خاندان کا اتفاق دشوار ہے ۔ گو سعادت مند اولاد ، نیک اعمال والدین کی عزت و تعظیم کرتی ہو ۔

۱۶۳۔ زندہ جو مردہ ہیں

بعض عاقلوں کی رائے یہ ہے کہ انھی آدمیوں کو سچ مچ زندہ کہہ سکتے ہیں جو اَوروں کے فائدے کے لیے مستحسن کام کر کے اور مفید صنائع بنا کے شہرتِ دوام حاصل کرتے ہیں ۔ اس طرح مُردوں اور زندوں میں آدمیوں کا تقسیم کرنا لوگ ایک خیالی مضمون جانیں گے اور ہم کو کہیں گے کہ ہم مضامین فقط خوش کرنے اور دل بہلانے کے لیے لکھتے ہیں ، کچھ یقین دلانے اور تعلیم کرنے کے لیے نہیں لکھتے ۔ یہ بھی ایک ڈھکوسلا گھڑ دیا کہ جس شخص کی زندگی سے اَوروں کو فائدہ پہنچتا ہے ، وہ زندہ ہے ورنہ[1] مردہ ۔ اس ہمارے خیال کو لوگ بہت پڑھیں گے مگر یقین کم کریں گے ، اس لیے ہم اپنے خیالِ دانش آموز کی تائید میں بڑی شہادتیں پیش کرتے

۱۔ اصل : اور نہیں مردہ ۔

ہیں کہ بے کار و نکمّا آدمی مردہ ہوتا ہے - فیثاغورث کے مدرسے کا قاعدہ تھا کہ جو طالب العلم حکمت و علم کے سیکھنے میں ہمّت ہار دیتا اور سُست کاہل ہو کر مدرسہ چھوڑ کر چلا جاتا تو اَور طلبہ اُس کی قبر بناتے اور قبر کی لوح پر یہ لکھ دیتے کہ وہ مر گیا ، تاکہ اَور طلبہ کو اس سے عبرت آئے کہ وہ اپنے تزکیہ و تکمیلِ نفس کی تحصیل کو چھوڑ کر ایسی کم بخت زندگی ، جو موت کے برابر ہے ، نہ اختیار کریں - رومن کیتھولک عیسائیوں میں جو عورتیں نن (تارک الدنیا ، بیراگن) بنتی ہیں ، وہ کفن اپنے ساتھ لیتی ہیں ، جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اب ہم دنیا کے کسی کام کی نہیں رہیں - مذہبی کتابوں میں اکثر مقامات پر نیک و مقدّس آدمیوں کو زندہ اور جاہل بدکاروں کو مردہ سے تعبیر کیا گیا ہے -

مُردوں کی تعداد میں وہ سب آدمی شامل ہیں ، خواہ وہ کسی قوم و ملّت اور مذہب و مرتبے و شان کے ہوں ، جو اپنا سارا وقت کھانے پینے کی درستی میں اور لباسِ بدن کی آرائش اور زیبائش میں بسر کرتے ہیں - گو جاہل گنوار اُنھی کو اصل مرد و زن جانتے ہیں - غرض جو شخص اپنی حیات کے مقصد کو نہیں سمجھتا ، کوئی کام فائدہ مند نہیں کرتا ، وہ مُردہ ہے - زندہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے نفس کی تہذیب میں اور اَوروں کے فائدہ پہنچانے میں اور لوگوں کے دلوں کے پاک کرنے میں سعی کرے - اگر زندگی کے معنی یہ لیے جائیں گے تو دنیا کی بہت آبادی زندہ درگور ہو جائے گی اور سارا عالم گورستان بن جائے گا - یہ معلوم ہوگا کہ کوئی بیس برس ، کوئی تیس برس کا پیدا ہوا ہے - بعض مرنے سے پہلے فقط ایک ہی گھنٹہ زندہ رہے ہیں - لاکھوں کروڑوں بغیر زندہ ہونے کے مردہ ہو گئے - گو جاہلوں کی نظروں میں وہ زندہ نظر آتے ہوں مگر درحقیقت

ان میں زندہ تھوڑے ہی ہیں ۔ گو ان آدمیوں کو مردہ سمجھتے ہیں مگر بہت سے ان میں اچھی رعیّت ہیں ۔ گھروں میں صلح و خیر کے ساتھ رہتے ہیں ، محصول ادا کرتے ہیں ۔ ان کی عمریں بھی برسوں کی ہیں مگر ان کی زندگی آتنی چند گھنٹوں یا دنوں کی ہوتی ہیں جو کارہائے خیر میں گزرتی ہے ۔ ہمارا ان مضامین کے لکھنے سے بڑا مطلب یہی ہے کہ جو آدمی ایسے مردہ ہو رہے ہیں ، آن کو سکھا کر کہ وہ اَوروں کو اپنی زندگی سے فائدہ پہنچائیں ، زندہ کریں ۔

زرگزیس شاہِ ایران اپنے لشکرِ فراواں کو دیکھ کر اس لیے رویا تھا کہ سو برس کے اندر کوئی اس سپاہ میں سے زندہ نہیں رہے گا ۔ مگر ہم بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر کے کہتے ہیں کہ اب بھی ہمارے بے شمار آدمیوں میں تھوڑے زندہ ہیں ۔ ہم دل سے کوشش کرتے ہیں کہ ان مُردوں کو زندہ بنائیں ۔ سُستی و کاہلی کی وبا نے جو آن کو بے جان کر رکھا ہے آس کو دفع کر کے ان میں جان ڈالیں ۔ اس اپنے کام سے نوجوانوں کے زندہ کرنے کی تو نہایت قوی آمید ہے لیکن بوڑھوں سے کچھ آمید نہیں ، وہ مرے ہی بھلے ۔

۱۶۴۔ نیکی و عیش

ہرکیولیز[1] (یعنی یونانیوں کا دیوتا) کی نوجوانی کا عالم تھا ۔ وہ اس تردّد میں رہتا تھا کہ زندگی کا کیا دستور العمل تجویز کروں کہ

۱۔ ہرکیولیز یا ہرکولیس : یونانِ قدیم کا ایک دیوتا ۔ نیز ایک رومی پہلوان جس کی طاقت اور قوت ضرب المثل تھی ۔ اسی پہلوان کے نام پر جبلِ طارق کی ناقابلِ عبور گھاٹیوں کو ''عوامیدِ ہرکول'' کا نام دیا گیا کیونکہ سوائے غیرمعمولی قوت کے ان کو عبور کرنا ناممکن سمجھا جاتا تھا ۔

جس کے موافق عمل کرنے سے میری عمر خوشی کے ساتھ بسر ہو۔ اسی سوچ بچار میں وہ ایک دن کسی سنسان جنگل میں جا نکلا۔ اس نے دیکھا کہ سامنے سے بڑی تنومند و قد آور دو عورتیں اس کے پاس چلی آتی ہیں۔ ایک عورت کا لباس نفیس و پاکیزہ برف سے زیادہ اُجلا تھا۔ وہ عجب حسنِ خداداد رکھتی تھی۔ اس کے سارے ادا و انداز و حرکات و سکنات میں حیا و شرم کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حیا کے مارے آنکھیں نیچے کیے ہوئے تھی، اوپر نظر نہ اُٹھاتی تھی۔ دوسری عورت کی پوشاک بھڑکیلی، رنگ برنگ کی چمکتی تھی۔ چہرے میں سرخی جھلکتی تھی۔ غازہ و گلگونہ کے رنگوں نے اَور زیادہ سرخ و سفید بنا دیا تھا۔ صحت و تندرستی اس کے چہرے پر برستی تھی۔ حرکتیں ایسی شوخ شوخ کرتی تھی کہ جن سے اس کی صورت اَور بھی بھلی لگتی تھی۔ وہ ایسی خوبصورت نہ تھی جیسی وہ اپنے تئیں خوبصورت دکھانا چاہتی تھی۔ بار بار مڑ مڑ کر اپنے سایے کو دیکھتی تھی۔ ہر حرکت اپنی کسی مطلب کے لیے کرتی تھی۔ پندار و تکبّر سے بھری ہوئی تھی۔ پہلے اپنے تئیں دیکھتی تھی، پھر اپنے دیکھنے والوں پر اس نظر سے نظر ڈالتی تھی کہ کس وقعت کی نگاہ سے اُسے دیکھ رہے ہیں۔

اس نے پہلے آگے قدم بڑھا کے نہایت ادب و تعظیم کے ساتھ ہرکیولیز سے یہ عرض کی کہ میری جان! تم جو بیٹھے یہ[1] تردّد کر رہے ہو کہ کیونکر زندگی بسر کروں، اسے چھوڑ کر بے تامّل میرے ہمدم اور ہم قدم بنو۔ میں تم کو خوشی کے خزانے کا مالک بناؤں گی۔ رنج و غم، دکھ درد کو کبھی پاس پھٹکنے نہ دوں گی۔

۱- اصل: یہ بیٹھے تردّد۔

سارے کاموں کے بکھیڑوں سے چھٹاؤں گی - صلح یا جنگ کے معاملات میں تردّدات کو پاس نہ آنے دوں گی - حواسِ خمسہ کو یوں محظوظ کروں گی - دسترخوان پر طرح طرح کے مزے دار کھانے چنوں گی جن کی خوشبو سے دماغ مہک جائے گا - سیوتی کے پھولوں کی سیجیں بچھاؤں گی - خوشبوؤں کا مینہ برساوں گی ، پریوں کا جمگھٹ آپ کے گرد لگاؤں گی ، مُطربانِ خوش نوا کے نغمے سنواؤں گی - پس تمام تردّد اور تفکّر کو سلام کر کے میرے ساتھ اس عالمِ مسرّت میں چلا آ ، جہاں کوئی تکلیف و رنج نہیں - ہرکیولیز نے جب اس عورت کی یہ خوش بیانی سنی تو اس نے نام اس کا پوچھا ، جس کا جواب اس نے یہ دیا کہ میرے قدر شناس عزیز دوست تو میرا نام راحت لیتے ہیں ، میرے دشمن مجھے بدنام کرنے کے واسطے عیش کہتے ہیں -

دوسری عورت عیش کی یہ باتیں سن کر ہرکیولیز کے سامنے یوں سخن آرا ہوئی کہ میں تجھ سے اس لیے مخاطب ہوتی ہوں کہ تُو دیوتاؤں کی اولاد ہے - تُو نیکی کو عزیز رکھ کہ جس سے تیرا پاک نہاد ہونا ثابت ہو اور اُن کاموں پر توجہ کر جو تیری عمر کے مناسبِ حال ہوں - تُو اپنے کاموں سے اپنے تئیں بھی اور مجھے بقاے دوام بخش - میں پہلے اس سے کہ تجھے اپنا ہم صحبت اور ہمراہ بناؤں ، اپنی صاف دلی کے سبب سے یہ کہے دیتی ہوں کہ یہ سچّا مسئلہ مسلّم ہے کہ کوئی قیمتی چیز ہاتھ نہیں لگتی جب تک اس کی قیمت میں محنت مشقّت نہ دی جائے - دیوتاؤں نے تمام اصلی خوشیوں کے واسطے ایک قیمت مقرر کی ہے - خدا کی مہربانی جب تک ہاتھ نہیں لگتی کہ عبادت میں ریاضت نہ کی جائے - نیک آدمیوں کے دلوں میں محبت نہیں پیدا ہوتی جب تک ان پر کوئی احسان نہ کیا جائے - ملک

میں عزت و آبرو نہیں پیدا ہوتی جب تک کوئی اس کی حسنِ خدمت نہ بجا لائی جائے ۔ صلح یا جنگ میں عظمت و بزرگی جب تک نہیں حاصل ہوتی کہ کوئی کارِ بزرگ نہ کیا جائے ۔ غرض کہ جو مسرّت و نشاط میرے سبب سے حاصل ہوگی اُس کے واسطے بعض شرائط ضرور ہیں ۔

یہ وہ کہہ رہی تھی کہ عیش نے اس کی بات کاٹ کے عرض کی کہ حضور ! یہ عورت خود کہتی ہے کہ اس کی خوشی کی راہ طویل اور مشکل گزار ہے ۔ میں نے جو خوشی کی راہ بتائی ہے وہ مختصر اور آسان گزار ہے ۔

عیش کی یہ باتیں سن کر وہ عورت طیش میں بھر آئی اور اس کو رحم اور حقارت کی نگاہ سے دیکھ کر ایک آہ بھری اور یہ بات کہنے لگی کہ عیش ! یہ بتا کہ کون سی خوشی تُو پیش کرتی ہے ؟ کیا کوئی نئی اشتہا ، جو خدا نے انسان میں نہیں پیدا کی ، وہ تُو پیدا کرتی ہے ؟ کیا بغیر اشتہا کے کھانا کھلا سکتی ہے ؟ بغیر پیاس کے پانی پلا سکتی ہے ؟ بغیر تکان کے سُلا سکتی ہے ؟ جب تک اشتہائیں اُٹھتی نہیں اُن کو بجھا سکتی ہے ؟ تجھے تو کوئی راگ اپنی تعریف کے سوا اچھا ہی نہیں معلوم ہوتا ، کوئی کام اپنے ہاتھ کے کام کے سوا بھلا نہیں لگتا ۔ جو تیرا چیلا بنا ، اس نے اپنی نوجوانی جھوٹی خوشیوں کی نیند میں گنوائی اور بڑھاپے کے لیے عذابِ جان مول لیا ۔ میں دیوتاؤں ، نیک خصائل ، پاکیزہ شمائلوں کی سچّی وفادار دوست ہوں ۔ کاریگروں کی مددگار ، کنبے کے سرپرستوں کی محافظ ، نوکروں کی سرپرست ، سچّی فیّاضی اور دوستی کی رفیق ۔ میرے مریدوں کے دسترخوانوں پر بڑے مزے دار کھانے چُنے جاتے ہیں ، گو وہ گراں بہا نہیں ہوتے ، اورکوئی شخص ان پر بلایا

ہی نہیں جاتا ، جب تک کہ اس کو بھوک پیاس نہ ہو - ان کی نیندیں گہری ، تندرستوں کی سی ہوتی ہیں - وہ خوشی کے ساتھ چلتے پھرتے پڑھتے ہیں - واقف کار ، آشنا اُن کو عزیز رکھتے ہیں - جب ان کی محنت مشقّت ختم ہو جاتی ہے تو آیندہ نسلیں ان کی ممنون ہوتی ہیں - سارا ملک اُن کی عزت کرتا ہے - بوڑھے ان کی تعریف کرتے ہیں ، جوان اُن سے محبت رکھتے ہیں -

خلاصہ اس تشبیہ کا یہ ہے کہ عیش اپنی صورت کو دلکش و دل رُبا بناتا ہے مگر آخر کو وہ مسخ ہو کر مار و اژدہے کی شکل کا ہو جاتا ہے - کوئی حقیقی حسن اس میں ہوتا نہیں جو پائدار ہو - بناؤ سنگار کا حسن اس کا مستعار ہوتا ہے - وہ تھوڑی دیر کے لیے جوبن دکھا دیتا ہے ، پھر کچھ نہیں - اسی کو لوگ اصل حسن سمجھ کر فریفتہ ہونے لگتے ہیں اور آخر کو خراب و خستہ ہوتے ہیں -

اس تشبیہ میں نام ہرکیولیز کا لیا گیا ہے جس نے ابتدائی عمر سے گُرز ہاتھ میں لے کر اور شیر کا پوستین پہن کر ظالموں اور راکھشسوں کو مارنا شروع کیا تھا - اگرچہ تم ہرکیولیز سے عالی مرتبہ و ذی جاہ نہیں ہو سکتے کہ کام بڑے دھوم دھام کے کرو ، جس سے نام ہو ؛ مگر تم میں خواہ کوئی کیسا ہی غریب ہو ، منصف ، ایمان دار ، راست گفتار ، اعتدال شعار بن سکتا ہے - پس ایسے تم بنو ، گو ہرکیولیز سے عالی جاہ نہ ہو -

۱۶۵- مستحق کو اپنا حق عدالت سے ملنا

ایک باغ مجھے پسند تھا ، اس میں سیر کرنے ایک دن گیا - وہاں مجھے اپنے دوست آشناؤں ، ہمسایوں کا خیال آیا کہ بعض ان میں ایسے کم نصیب تھے کہ عمر ان کی ختم ہونے کو آئی ، مگر ایک

دن بھی کوئی ترقی کا نصیب نہ ہوا ؛ اور بعض ایسے خوش نصیب تھے کہ ان کو نوجوانی میں دولت ، عزّت ، شہرت حاصل ہو گئی ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں میں دولت و عزت ، خدائے تعالیٰ کی نعمتیں انصافاً تقسیم نہیں ہوتیں ۔ اسی سوچ بچار میں رات ہو گئی کہ دفعۃً نظر آسمان پر جا پڑی جہاں شانِ کبریائی جلوہ فرما تھی ۔ صحیفۂ فطرت کے مطالعے سے جو خوش ہونے والے ہیں ، اُن کو آسمان کا ورقِ زر اندود جو صانعِ قدرت کی حکمتِ بالغہ کا سبق پڑھاتا ہے ، وہ کوئی اور ورق نہیں سکھاتا ہے ۔ یہی حکمت مذہب کی اور مذہب اس حکمت کی باہم معاونت کرتے ہیں ۔ مطلع صاف تھا ، آدھے آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے ، بُرج صاف نظر آتے تھے ۔ چند گھنٹے میں اس تماشے کو دیکھتا رہا ، جس طرح حیوانِ ناطق کو چاہیے ، پھر میں اپنے گھر جا کر سو رہا ۔

بیداری میں جو آسمان کا نقشہ دیکھا تھا ، قوتِ متخیّلہ نے خواب کی صورت میں پھر اُس کو دکھایا ۔ میں بہت غور سے بروجِ آسمانی کو دیکھنے لگا کہ بُرجِ میزان پر نظر جا پڑی ۔ وہاں دفعۃً ایسی عجیب و غریب روشنی ہوئی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آدھی رات کو سورج نکل آیا ۔ جب یہ روشنی وسعت اور تیزی میں بڑھی تو وہ زمین کی طرف چلی ۔ پھر مجھے ایک سایہ بڑی شان کے ساتھ پھرتا ہوا نظر آیا ۔ میں نے غور سے اس کو دیکھا تو تھوڑی دیر کے بعد اس میں ایک عورت نظر آئی ۔ میں نے خیال کیا شاید یہ کوئی فرشتہ ہے یا خود عقل ہے جو برجِ میزان کی رہنمائی کرتی ہے ۔ مگر میں نے اس کو پاس جا کر دیکھا تو اس کی شکل میں وہ تمام

علامتیں دیکھیں جو عدالت کی دیوی[۱] میں اکثر بیان کی جاتی ہیں۔ اس کے چہرے پر وہ جاہ و جلال برستا تھا کہ جن کی آنکھیں اُس کے جمال کی متحمّل ہو سکتی ہیں، اُن کو وہ نہایت جمیلہ دکھائی دیتی تھی۔ آدمیوں کو اس کا تبسّم عبرت ناک بنا کے ہنساتا تھا اور اس کا تیوری چڑھانا مایوسی سے ڈرا کر رُلاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں راستی کا آئینہ تھا جس میں سے ایک روشنی کی رَو رواں تھی کہ دوپہر کو بجلی کی چمک معلوم ہوتی تھی۔ جس وقت آئینے کو وہ ہلاتی تو زمین آسمان سارے روشن ہو جاتے تھے۔ جب وہ میرے پاس ایسی آئی کہ اُس کی صورت دکھائی اور آواز سنائی دینے لگی تو اُس نے اس لیے کہ خَلق اُسے اچھی طرح دیکھے، تاریکی اور بادلوں کو اپنے اوپر چھا لیا۔ اس طرح اس کی روشنی یا[۲] نظر کو خیرہ کرتی تھی یا اس میں ہزاروں رنگ اور سایے نظر آنے لگے۔ خلق اس تماشے کو دیکھ کر متحیّر ہوئی اور ایک وسیع میدان میں جمع ہوئی۔ اس میں مجھے سب قسم کے آدمی نظر آتے تھے۔ بادلوں سے اس کی ایک آواز آئی کہ میں یہاں اس لیے آئی ہوں کہ حق داروں کو حق دلاؤں اور جن کی حق تلفی ہو گئی ہے، اُن کی حق رسانی کروں۔ اس اعلان سے جو خلق میں خوف و اُمید اور خوشی و رنج پیدا ہوئے، وہ بیان نہیں ہو سکتے۔

پہلا حکم یہ صادر ہوا کہ جن کے پاس دولت و جائداد ہے وہ اس کی دستاویزیں لائیں۔ اصلی مالکوں کو وہ دلائی جائیں گی۔ یہ حکم سن کر ساری خلق اپنی تمام دستاویزیں جائداد کی جو چمڑے،

۱۔ اصل: ''عدالت کے دیبی'' ۔ قیاساً اسے ''کی دیوی'' بنایا گیا۔

۲۔ اصل: کیا نظر کو۔

کاغذ موم پر لکھی ہوئی تھیں یا کچھ اور طرح کی تھیں ، لائے ۔ پس عدالت نے راستی کے آئینے کو ہاتھ میں لیا ۔ جوں ہی اس کی روشنی ان دستاویزوں پر پڑی ، ووہیں جو جعلی ، دغا و فریب کی دستاویزیں تھیں ، اُن میں آگ لگ گئی ۔ بعضے تو بالکل جل کر خاک ہو گئیں ، بعض کی دو تین سطریں جل کر رہ گئیں ۔ کسی کا بین السطور جلا ، کسی کا آخر خاتمہ ۔ غرض جو حصّہ جعلی تھا وہ سلامت نہ رہا ۔ کاغذوں کا جلنا ، موم کی مُہروں میں سے شعلوں کا اُٹھنا ، چمڑے کا چُرمُر ہونا ایک عجب تماشا دکھاتا تھا ۔ پھر اس کی روشنی دنیا کے تاریک سے تاریک حصّوں میں چمکی اور جہاں جہاں اتفاقات اور درازیٔ زمانہ کے ہاتھ سے چُھپی ہوئی دستاویزیں پڑی تھیں ، وہ اس روشنی میں سب نکل آئیں ۔ اس سے عجب انقلابِ عظیم واقع ہوا کہ جو غصب اور مکر و دغا ، جعل فریب ، چوری ، غارت گری ، رشوت دینے سے نعمتیں ہاتھ لگی تھیں ، اُن کا ڈھیر لگایا گیا اور اس کا نام ''کوہستانِ بحالی'' رکھا گیا ۔ ستم رسیدہ مظلوم سب بلائے گئے ۔ جو اُن کا مال تھا وہ اُن کو دلایا گیا ۔ حق بحق دار رسید کا معاملہ ہوا ۔ بہت سے آدمی چیتھڑے لگائے ، لیتڑے پہنے آئے تھے جنھوں نے اُن آدمیوں سے کپڑے بدلے جو زردوزی کے لیس دار پہنے ہوئے تھے ۔ غرض اس حکم سے بعض امیر متوسّط حال میں ہوگئے ، بعض بڑے صاحب جائدادوں کے پاس اتنا سرمایہ رہا کہ جس سے اپنی اوقات گزاری کر سکیں ۔ سب سے زیادہ افسوس کا مقام یہ تھا کہ ایک بازار کا بازار ، جس کی بڑی ساکھ تھی ، وہ دیوالیہ ہوگیا ۔

بعد اس[1] حکم کے دوسرا حکم یہ صادر ہوا کہ لوگ اپنے اپنے خاندانوں کو ساتھ لے کر جدا جدا کھڑے ہوں۔ جب وہ سب کھڑے ہوئے ، جب آئینہ اُن پر چمکا تو ہر بچے میں یہ سمجھ آ گئی کہ وہ اپنے اصلی ماں باپوں پاس چلا جائے - جب یہ بچے اپنے ماں باپوں پاس جانے لگے تو بڑا تہلکہ مچا - یہ واقعہ بھی بڑا غم ناک و ہولناک تھا کہ ابھی ایک شخص بہت سے بچوں کا باپ بنا ہوا کھڑا تھا کہ اس کے بیٹے بیٹیاں سب چھن گئیں ، وہ اکیلا رہ گیا - ایک بچہ جس کو یہ اُمید تھی کہ ایک بڑی جائداد کا وارث ہوں گا ، اب وہ ایک کوچوان کی مہربانی کا متوقع ہے - ایک امیر کا لڑکا اپنے گھر کے خدمت گار کا بیٹا بن گیا - بہت سے آدمی جو اپنے تجرّد پر فخر و ناز کرتے تھے وہ بہت سے بچوں کے باپ بن گئے - ان مربّیوں کی تبدیلی سے چاہیے تھا کہ آہ و فغاں کا بڑا غل شور مچتا مگر یہ ایک مصیبت عام تھی - سوائے اس کے جن کے بچے چُھٹتے تھے ، وہ اکثر ان کے دوستوں ہی کے پاس جاتے تھے جن سے ان کی تسلّی ہوتی تھی -

پھر تیسرا حکم یہ صادر ہوا کہ تمام معزّز و اعلیٰ عہدے و خدمتیں اُن آدمیوں کو دی جائیں گی جو سب سے زیادہ لائق و فائق ، صاحبِ کمال ہوں گے - خوبصورت ، زور آور ، دولت مند ان عہدوں کے لینے کے لیے لپکے مگر جب آئینے کی روشنی ان پر پڑی تو وہ اس کے متحمّل نہ ہوئے اور اُلٹے پاؤں ہٹ کر ہجومِ خلائق میں شریک ہو گئے - پھر عدالت نے اپنے آئینے کی روشنی میں ہر ایک کا امتحان اس طرح شروع کیا جیسے کہ عقاب اپنے بچوں کا آفتاب کی روشنی میں کرتا ہے ؛ تو جو لوگ علم ، نیکی ، کار کنی ، ملکی جنگی

۱- اصل : اسی حکم -

مہمات میں ممتاز نہ تھے ، سب نے اپنا منہ پھیر لیا ۔ جو اس کے بعد باقی رہے[1] ، ان کی منتخب جماعت وسطِ ازدہام میں کھڑی ہوئی ۔ اور آدمی چاروں طرف اُن کو گھیرے ہوئے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کاہل ، سست آدمی پلٹن کی قواعد کو چاروں طرف کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں ۔ اب اس جماعت کی تین صفیں بنائی گئیں : ایک نیک آدمیوں کی ، دوسری علم والوں کی ، تیسری کارگزاروں کی ۔

اول صف کی طرف مشکل تھا کہ کوئی ادب کی نگاہ سے نہ دیکھے ۔ ان کے چہروں پر صدق و صفا کا نور چمکتا تھا ۔ ان کی نگاہ میں غور و خوض موجود تھے ۔ صورت سے استقلال و ثبات ، جرأت و ہمّت دکھائی دیتی تھی ۔ نیکی کی مخفی عادت نے اُن کے اوضاع و اطوار کو نہایت پسندیدہ بنایا تھا ۔

دوسری صف میں صاحبِ علم تھے ۔ اُنھوں نے آگے پیچھے کھڑے ہونے میں اور ترتیبِ مراتب میں بڑا جھگڑا کھڑا کیا ۔ اور جب تک نچلے نہ بیٹھے کہ عدالت نے یہ حکمِ قطعی نہیں نافذ کیا کہ عالم جو ذکاوت اور عقل ایسی رکھتے ہیں کہ خود مُوجد ہیں ، وہ صف کے سرے پر کھڑے رہیں اور جو ایسے عالم ہیں کہ انھوں نے اَور ہی کی تصنیفات کے مطالعے میں مُوشگافی کی ہے ، وہ ان کے بعد کھڑے ہوں ۔ سب سے پیچھے اُن عالموں کی صف ہو جو ذکاوت زیادہ عقل سے اور علم زیادہ فہم سے رکھتے ہیں ۔ تمام زندہ مصنّف ایک صف میں کھڑے کیے گئے جن میں بہت سے اخباروں کے ایڈیٹر ، عیب بیں ، نکتہ چیں اور شارح ، نجومی تھے ۔ ان سب نے مل کر دعویٰ کیا کہ ہم کو اول صف میں جگہ ملنی چاہیے مگر عدالت نے

۱۔ اصل : باقی رہی ۔

اس درخواست کو نامنظور کر کے حکم یہ فرمایا کہ تم اپنے تئیں عالم نہ جانو بلکہ اپنے تئیں عالموں کا خدمت گار سمجھو۔ ان کے پیچھے کھڑے رہو۔

جو صف کارگزاروں کی تھی، ان میں ملکی و جنگی مہمّات کے کارگزار، اہلِ سیف و اہلِ قلم آگے بڑھے اور باقی اَور ان کے سامنے کھڑے ہوئے۔ اگرچہ اس پیش قدمی پر بہت آدمیوں نے سر ہلائے مگر جھگڑا ان سے کرنا مناسب نہ جانا۔ جب یوں صفوں کی ترتیب ہو چکی تو یہ روبکار سنایا گیا کہ جن آدمیوں میں تین صفتیں، خواہ وہ کسی درجے کی ہوں، پائی جاتی ہیں وہ اعلیٰ عہدے پائیں، اور بعد ان کے جو دو صفتیں ان تین میں سے رکھتے ہوں، وہ دوسرے درجے کے عہدے پائیں۔ جن میں صرف ایک ہی صفت ہو تو وہ اپنے مناسبِ حال نوکریاں پائیں۔ اِس طرح بہت سی خدمتیں کہ جن میں صرف اعتبار و اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے، خالی رہیں تو ان کے واسطے یہ تجویز ہوئی کہ جن آدمیوں میں یہ صفاتِ ثلاثہ ظاہری پائی جائیں گی یا جن کی وہ صفاتِ ثلاثہ رکھنے والے سفارش کریں، وہ کسی خدمات پر مامور کیے جائیں۔ اس طرح بہت سے نئے آدمی ان عہدوں پر مقرر کیے گئے۔ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی کہ اکثر اُن میں سے میرے دوست تھے۔

غُرور

۱۔ انسان کی طبیعت کے ساتھ جیسا غُرور کو اختلاط ہے ایسا کسی اَور خصلت کو نہیں ہے۔ وہ ہزاروں روپ بدلتا ہے، لاکھوں طرح سے اپنی نشانیاں دکھاتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ میرے دل میں رہتا ہے مگر اپنے ہمسائے کے دل میں اسے دیکھ کر تعجب

کرتا ہے - نہایت ذلیل اور رزیل آدمیوں میں بھی وہ اپنے جلوے دکھاتا ہے - ایک جوتیاں گانٹھنے والا چمار[1] تھا جس کو بالطبع اپنی تعظیم پسند تھی - اس نے ایک لکڑی کی پُتلی بنائی جو اس کے آگے بڑے ادب سے جھکی ہوئی کھڑی رہتی - گویا یہ معکوس بُت پرستی ہوتی تھی؛ یعنی قاعدہ ہے کہ آدمی بُت کو پوجتا ہے، یہاں آدمی کو اُلٹا بُت پوجتا تھا - جب چمار تک میں یہ شوق ہو تو اُن سے اوپر کے درجے کے آدمیوں میں اور ان سے اعلیٰ مرتبے کے آدمیوں میں اَور زیادہ کیوں نہ ہو - چمار میں غرور جب مضحکے کے قابل ہو تو اَور بڑے آدمیوں میں کیوں نہ وہ ہنسی کے قابل ہوگا - ہر برائی کے مقابل میں ایک نیکی ہوتی ہے - پاکی کو ناپاکی دور کرتی ہے، آزادی کو طمع کھوتی ہے، مگر غرور مرضِ متعدی کی طرح سارے تندرست اعضا کو خراب کرتا ہے اور ہر نیک کام کو بگاڑتا ہے اور اس کی خوبی و خوش نمائی کو بدنما بناتا ہے - غرور کی بنیاد حماقت ہے اور اس کے اوپر کی عمارت دیوانگی ہوتی ہے - جیسا احمقوں کا بنانا آسان ہے، ویسا ہی مغروروں کا - مغرور اگر سربلند ہو جاتا ہے تو تھوڑی دیر کے بعد پھر وہ خاک میں مل جاتا ہے -

۲- یہ بھی ایک بڑے غرور کی بات ہے کہ کوئی شخص کہے کہ مجھ میں غرور نہیں - اگر آدمی گناہ گار نہ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مغرور ہوتا - اگر جاہل نہ ہوتا تو بھی غرور نہ کرتا - اگر وہ کم بخت مصیبت زدہ نہ ہوتا تو نخوت کے پاس نہ جاتا - انھی تین سببوں سے آدمی مغرور ہوتا ہے اور انھی کے سبب سے اس کو مغرور ہونا نہیں چاہیے -

---

۱- اصل میں ''چمار'' کے بجائے ''چملہ'' چھپا ہے جو سہو کتابت ہے -

۳- مغروروں کے سوا سب اس مقولے کو تسلیم کرتے ہیں کہ مخلوقات میں مغرور نہایت حقارت کے قابل ہے - جس نے غرور کو اپنے دل کا ہم صحبت بنایا ، اُس نے اپنی مسرّت کو گھٹایا اور ذلّت کو بڑھایا - غرور مغالطے میں ڈالتا ہے ، سرکش و ہیکڑ بناتا ہے - گو غرور کرنا احمقوں کا کام ہے مگر بعض اوقات عقل مندوں کے پیچھے بھی یہ بلا لگ جاتی ہے - مگر وہ ذرا سمجھانے سے یا خود سمجھنے سے اس سے اپنا پیچھا چھڑا لیتے ہیں - ایک یونانی حکیم کا مقولہ قدیم سے چلا آتا ہے کہ اگر تم مغرور ہو تو بڑے احمق ہو - غرور انسان کے واسطے نہیں بنایا گیا - مشتِ خاک کو غرور کب زیبا ہے ؟ یوں تو سب جگہ غرور برا ہے ، ہمیشہ مغرور ذلیل ہوتا ہے ، مگر خاص کر اب ہندوستان میں مغروروں کی بڑی مٹی پلید ہوتی ہے - اس سرزمین میں جو لوگ اب رہتے ہیں ، وہ روز بہ روز اپنی آزادی سے آشنا ہوتے جاتے ہیں - آزادی کا مقتضا یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے بے خوف و خطر ہو جائے - اگر کوئی طعنے تشنے اپنے دے تو وہ اس کے انتقام میں زیادہ سرگرم و زباں دراز ہو - غرض اب اس ملک کی حالت ایسی ہوتی جاتی ہے کہ مغروروں کے معدے کے لیے غذا بہم پہنچنی اور ان کی ضیافت ہونی دشوار ہوتی جاتی ہے ، اس لیے ان کو رونا پڑتا ہے - اب وہ دن گئے کہ اہلِ نخوت کو لوگ جھک جھک کر سلام کریں اور وہ اس کے جواب میں مکھیاں اڑائیں - اب عوام الناس اپنے حقوق اور قوّت کو جانتے ہیں اور ان کو سمجھتے ہیں کہ وہ ہم کو کسی طرح کا آزار نہیں دے سکتے - نہ ہم سے غلامی کرا سکتے ہیں ، نہ وہ ہم پر مُکّا چلا سکتے ہیں ، نہ لات مار سکتے ہیں ، نہ ہم پر جوتی اٹھا سکتے ہیں ، نہ اپنی پالکی کے آگے سے ہم کو ہٹا سکتے ہیں - غرض اب نخوت

سراسر ذلّت ہی نہیں بلکہ محلِّ خوف و خطر ہے ۔

مغرور کا کوئی آدمی دوست نہیں ہوتا ؛ اس لیے کہ دوستی میں مساوات کی ضرورت ہے جو اس کو پسند نہیں ۔ اس کو کوئی نصیحت نہیں کر سکتا ؛ اس لیے کہ ناصح ہونے میں برتری کی ضرورت ہے جس سے اسے نفرت ہے ۔ غرض وہ یوں عقل و علم دونوں سے محروم رہتا ہے ۔ غرور سے جہالت اور جہالت سے غرور پیدا ہوتا ہے ، اس لیے مغرور زمانے کی شکایت ہمیشہ کیا کرتا ہے ۔ غرور نہ اپنی ذات کے لیے نہ اَوروں کے لیے ، نہ خدا کے نزدیک اچھا ہے ۔ غصّے کو تو تھوڑی دیر کی لوگ دیوانگی کہتے ہیں مگر غرور ہمیشہ کی دیوانگی ہوتی ہے ۔ اب مغرور کو سوچنا چاہیے کہ غرور کرکے کیوں لوگوں کی نظروں میں حقیر بنوں ، احمق دیوانہ کہلاؤں ۔ ناحق غلط اپنے تئیں برتر سمجھ کر اپنے بھائی بندوں کی نظروں میں کم تر بنوں ۔

۴۔ مغرور اُلّو ہوتا ہے جو اپنے پروں کو پُھلاتا ہے کہ میرا جسم بڑا معلوم ہو ۔ وہ احمق ہوتا ہے کہ دلیے کی ہانڈی کی طرح اُبلتا اور پُھولتا ہے ۔ بر خود غلط ہونے کا ایسا پھوڑا اور ورم دل میں ہوتا ہے کہ اس کا کوئی عضو چین سے نہیں رہتا ۔ خود مبہری کا گلگونہ وہ اپنے چہرے پر مَل کر اپنا آپ صنم بن جاتا ہے ۔ وہ خود بہادر بن کر اپنی مخاطبت میں اپنی خوبیوں کی تحسین و آفرین کا قصیدہ پڑھتا ہے ۔ وہ اپنی ذات کو بُت بنا کر بت پرست و خود پرست ہو جاتا ہے ۔ وہ اپنا آپ ہی پیارا عزیز ہوتا ہے ۔ وہ اپنی لیاقتوں کو بنی آدم سے آگے بڑھا ہوا جانتا ہے ۔ وہ اَوروں کو اپنے پاس بیٹھنے کے لائق نہیں سمجھتا ۔ اُن کو دور بٹھاتا ہے اور آپ صدر پر بیٹھتا ہے ۔ اگر کسی سے کہتا ہے کہ میرے پاس بیٹھو تو جانتا ہے کہ میں نے اس پر بڑا لطف و کرم کیا ۔ گھوڑے کی قیمت

اصطبل میں بہ نسبت نخاس[1] کے زیادہ معلوم ہوتی ہے - اسی طرح وہ اپنی خودی میں اپنی قیمت زیادہ سمجھتا ہے - غرور کے سبب سے وہ اپنی حقیقت سے بھی ایسا ہی[2] نا آشنا ہوتا ہے جیسے اَور غیروں سے ، کیونکہ وہ اپنے آپ بُھولا ہوا ہے کہ میں کیا ہوں -

جیسے چھوٹے ندی نالے پانی کی ذرا سی طغیانی سے اپنے کناروں سے باہر ہو جاتے ہیں اور غُل شور مچاتے ہیں اور جھاگ لاتے ہیں ، مگر جو گہرے دریا اور سمندر ہوتے ہیں وہ کسی طغیانی سے اپنی حد سے باہر نہیں ہوتے ، ایسے ہی متکبّر ابتر ذرا سربلند ہونے سے پُھولے نہیں سماتے - اُبھرتے ہیں اور غل مچاتے ہیں اور اپنی حد سے باہر قدم نکالتے ہیں - مگر جب نیچے اُتر جاتے ہیں تو سوائے کیچڑ اور دَلدل کے کچھ اَور نہیں ہوتا - مغرور کے دماغ کو جسم سے کچھ مناسبت نہیں ہوتی ، اس لیے وہ بَڑسرا دیو[3] معلوم ہوتا ہے - اس کی بنیاد چھوٹی ہوتی ہے اور اس پر عمارت بہت بڑی بنی ہوتی ہے - ہم کبھی اپنے تئیں نہیں دیکھ سکتے جب تک نیچے نہ دیکھیں - یہ نیچے دیکھنا ہم کو ہماری قدر بتلاتا ہے - مادہ جتنا خفیف اور سبک ہوگا ، اُتنا ہی وہ زیادہ جگہ گھیرے گا ؛ جیسے کہ تکیے جب ہی پُھولے ہوتے ہیں کہ پَروں اور روئی سے بھرے ہوتے ہیں - وہ کسی سخت چیز سے بھرے جاتے تو ایسے نہ ہوتے - ایسے ہی مغرور کے دماغ میں سُبکی اور خفّت[4] بھری ہوتی ہے ، اس سے وہ پُھولا ہوا معلوم ہوتا ہے -

---

۱- نخاس = بازارِ بردہ فروشی - یہاں عام منڈی مراد ہے -
۲- ''ہی'' اضافۂ مرتّب -
۳- بڑسرا دیو = بڑے سر والا دیو -
۴- خفّت کے موجودہ معنی جھینپ کے ہیں مگر یہاں وہ اپنے لفظی معنی میں استعمال ہوا ہے ، یعنی ہلکا پن -

۵- مغرور نامراد ہوتا ہے ، اس لیے کہ وہ ادب چاہتا ہے جس کے عوض میں اس کو ذلّت و خواری ملتی ہے - غرور فقط سوسائٹی کے لیے مُضر نہیں ہوتا بلکہ خود مغرور کے حق میں کانٹے بوتا ہے - غرور کی قیمت پہاڑ کے برابر دینی پڑتی ہے - مرنے کے بعد بھی لعنت کا طوق گلے میں پڑا رہتا ہے -

٦- اگر تم یہ چاہتے ہو کہ خداے تعالٰی اور انسان کے پیارے بنو تو غرور سے دور رہو - غرور دل میں ایک پھوڑا ہوتا ہے جو پھوٹ کر اپنا زہر تمام تیرے افعال میں پہنچاتا ہے - وہ تیرے خزانے کے لیے گھن ہے جو تمام تیری جائداد کو کھا جاتا ہے - وہ کسی کا نہ مُحب ہوتا ہے نہ محبوب - نیکیوں کی بے عزتی کر کے نیکوں کو ذلیل کرتا ہے - وہ اپنی بیہودہ شیخی سے بھلائی کو اپنے انعام سے محروم کرتا ہے - وہ اپنے خوشامدیوں کا دوست ہوتا ہے - نخوت حسد کی ماں ہے ، غضب و قہر کی دایہ - وہ گناہِ شیطانی اور شیطانِ انسانی ہے - وہ بزرگوں سے عداوت ، خُردوں سے نفرت ، ہمسروں کی حقارت کرتا ہے - خلاصہ یہ ہے کہ جب تک آدمی غرور سے نفرت نہیں کرتا ، خدا اُس سے نفرت رکھتا ہے -

۷- عناد و فساد جو دنیا کو رنج و تکلیف پہنچاتے ہیں ، اگر ان کو غور سے دیکھیں تو ان کا سبب غرور ہی معلوم ہوتا ہے - غرور خود رائی سے خود پرستی پیدا کرتا ہے جس کے سبب سے آدمی اُن چیزوں کو جانتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں جن سے بالکل وہ جاہل ہوتا ہے - مغرور جنگلی چُوہی کی طرح اپنے کانٹوں دار خول میں اس طرح لڑھکتا[1] ہے کہ اُس کے پنجے نہیں دکھائی دیتے - وہ بے ایمانی کی جڑ

۱- اصل : لڑکتا -

ہے - وہ ایمان دار جب تک نہیں ہو سکتا کہ وہ غرور کو ، جو کھلڑی کی طرح اُس سے چمٹ رہا ہے ، نہ اُتارے - نہ ہل چلانے سے ، نہ نہ ہینگا پھیرنے سے اس کی زمین صاف ہوتی ہے - اس میں مینہ برسنے سے کانٹے اُگتے ہیں - سب گناہوں سے زیادہ وہ پیٹھ پر کوڑے مارتا ہے - ایسا چمچچڑ[1] ہے کہ آدمی جانتا نہیں کہ کس طرح اس سے پیچھا چھڑائے - آدمی کبھی اس سے عداوت کرتا ہے ، کبھی محبت - کبھی اس سے جھگڑتا ہے ، کبھی گلے لگاتا ہے - اس سے ڈرتا ہے مگر اس کو اپنے سینے میں جگہ دیتا ہے - بنی آدم کے دل میں کاشتکار موروثی ہونے کا دعویٰ غرور کرتا ہے - اور عجب کھاوٗ ہے کہ مرغّن کھانوں سے بھی پیٹ بھرتا ہے اور اوجھڑی سے بھی - وہ جیسا جھونپڑوں میں گرم اور ہوشیار رہتا ہے ، ایسا ہی محلّوں میں - جیسا کہ اچھی نماز سے خوش ہوتا ہے ، ایسا ہی غلیظ قسموں سے -

۸- غرور اور غصّے کا حال اُس لومڑی کا سا ہے کہ جس کا پیٹ ایسا بھرا ہو کہ وہ جس رستے میں چلنا چاہتی ہو ، اُس سے بڑا اس کا جسم ہو جائے کہ اس کو پھرنا اور نادم ہونا پڑے - غرور کے سبب سے جن لوگوں کو ترجیح دی جائے اُن کا حال اُن آدمیوں کا سا ہے کہ گھوڑے کی پیٹھ پر زینہ لگا کر سوار ہوں - غرور و غصّہ دونوں اپنی کمینگی یوں بھی دکھاتے ہیں کہ وہ ڈرپوک ہوتے ہیں - آدمی اُس سے غرور نہیں کرتا جس کو جانتا ہے کہ وہ سزا دے سکتا ہے ، اور اُس پر غصّے نہیں ہوتا جس کو اپنے سے بڑا جانتا ہے - جیسے جلتے ہوئے گھر سے ہر شخص بھاگتا ہے ، ایسے ہی مغرور اور غصیلے سے مفرور ہوتا ہے ، کیونکہ غرور

۱- اصل : چمچڑ -

دل میں اور غصّہ چہرے میں آتشِ سوزاں ہوتے ہیں -

آدمی اُس جانور کی طرح رہے جس کو بلندی کے سبب سے ساری دنیا دیکھے - نہ بھِڑ کی طرح کہ جو کوئی چھوئے ، اُسے ڈنک مارے -

۹- غرور سے پبلک کے کاموں میں بےشک سعی اور کوشش کرنے کے لیے ایک تحریک پیدا ہوتی ہے - مگر اس سے جتنی برائی پیدا ہوتی ہے ، اُتنی بھلائی نہیں - جو شخص اپنی لیاقت کا اندازہ ناحق غلط زیادہ کر لیتا ہے تو ضرور ہے کہ وہ اس کی کامیابی کی بھی کوشش کم کرے گا ، جس کے سبب سے نام رہے گا - اور جب لوگ اس پر اس سبب سے لعنت ملامت کریں گے تو وہ غصّے میں آن کر اَور غلط کاری زیادہ کرنے لگے گا - تاریخ شہادت دیتی ہے کہ جن قوموں کی مہمّات کی اصل یہ غرور تھا اور انھوں نے اپنی فتح مندی کی حالت میں یا اَوروں سے انتقام لینے کی صورت میں اپنی قوت کو بڑا جانا تو اَور غلطیوں پر غلطیاں کرتی ہوئی چلی گئیں اور آخر کو ان کا سارا گھمنڈ ناک کے رستے نکل گیا -

۱۰- یہ کچھ ضرور نہیں کہ جو مغرور ہو ، وہ بد اور شریر ہو - بہت سے محقّق صاحبِ علم بدوضع نہیں ہوتے اور ایسا چال چلن رکھتے ہیں کہ جو تعظیم کے قابل ہے - مگر ان کی تحقیق اور علم کا دائرہ ایسا فراخ ہوتا ہے کہ وہ اپنی عقل و دانش کی بزرگی کے سامنے کلامِ الٰہی کی توقیر نہیں کرتے - وہ اُن عقائد کے پابند نہیں ہوتے جو لاکھوں ہم مذہب ان کے تسلیم کرتے ہیں - وہ کچھ اپنی تحقیق اور علم سے اَور ہی گھڑتے ہیں ، اور اپنے عقل و علم پر ان کو وہ غرور ہوتا ہے کہ اس کے آگے وہ کسی اور محقّق کی تحقیق کی حقیقت نہیں گنتے - وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اور محقّقوں کی تحقیق کو مغرورانہ

نہ ماننا الف بے تے ان علموں کی پڑھنی ہے جن کی زبان میں ہم قدرتِ کامل حاصل کرنی چاہتے ہیں -

۱۱- دانش مندوں میں جب مقابلہ ہوتا ہے تو ایک دوسرے کی بات مان لینے کو اپنا فائدہ جانتے ہیں اور اُن میں جتنا مقابلہ سخت ہوتا ہے اُس کی برداشت اس طرح کرتے ہیں جیسے کہ اون کا ڈھیر پتھر کی کرتا ہے کہ اس کو وہ اُٹھاتا ہے اور اپنے اندر رکھتا ہے - مگر دو مغروروں میں جب مقابلہ ہوتا ہے ، اس کا حال ایسا ہوتا ہے جیسا کہ پتھر پر پتھر گرتا ہے کہ ایک بڑا آوازہ ہوتا ہے ؛ آگ نکلتی ہے اور شکستگی ہوتی ہے - پس ایک مغرور دوسرے سے ہمیشہ لڑتا رہتا ہے اور اُس کی حقارت کرتا رہتا ہے - ان کے دلوں میں ایک طوفان بھرا ہوتا ہے جو باہر نکل کر غل مچاتا ہے - یہ غرور میں ہی ایک بات ہے کہ دوسری کسی برائی میں نہیں - یہ اپنا آپ ہی دشمن نہیں ہوتا بلکہ عقل کا بھی بڑا دشمن ہے - اس میں اور دانش مندی میں سخت بیر ہے -

۱۲- دانائی تو صناعت کو میمون نیچر کا بناتی ہے اور غرور نیچر کو میمون صناعت کا بناتا ہے - دانش مند اپنا لباس اپنے جسم کے موافق تیار کرتا ہے ، مغرور اپنے جسم کو لباس کے موافق بناتا ہے - یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ مغرور اپنے تئیں نہ جانے کیونکہ جو وہ کل تھا ، آج اس کی اصل نہیں ہے - اور یہ کم تعجب کی بات ہے کہ نیک آدمی اپنی خودی[1] کو بالکل فراموش کر دے -

---

۱- یہاں ہر جگہ خودی سے مراد خود پسندی اور خود پرستی ہے - جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر نیک آدمی بزرگی اور بڑائی کے باوجود اپنی خود ستائی کو بھول جائے تو یہ کوئی زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے -

مجھے خوف کرنا چاہیے کہ میں اپنے ڈھانچ کو بدلوں اور[1] خدا میرا مجھ سے بدل جائے اور اپنی مخلوق سے مجھے اس وجہ سے خارج کر دے کہ میں اس کا بنایا ہوا نہیں رہا ، کچھ اَور ہو گیا ۔

۱۳- مغرور میں صرف خودی ہی خودی ہوتی ہے ۔ اس کا سارا خیال اس میں بسا رہتا ہے کہ میں کیا ہوں اور کیا خوبیاں اَوروں سے زیادہ رکھتا ہوں ۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے چاروں طرف ، جہاں جاتا ہے ، اپنی خودی کے سایے کو دیکھتا ہے ۔ تم ان خیالات سے ایسے بھاگو جیسے کہ ریچھ سے بھاگتے ہو ۔

۱۴- جب نخوت کے ہمراہ عزت ہوتی ہے تو وہ سربلندی میں اپنی خوبی و عمدگی دکھاتی ہے ، مگر زمین پر خاکساری میں بڑی سربلندی ہے ۔ جتنے خوش الحان پرند ہیں وہ زمین کے نزدیک رہتے ہیں ۔ جتنے پھول خوش نما ہیں وہ زمین کے متّصل ہوتے ہیں ۔ پس اگر ہم بھی سعادت مندی کی قدر جانیں تو زمین کی طرف جھکیں یعنی خاکساری اختیار کریں ۔ تجھے اپنے دوست اور دشمن دونوں سے اپنے عیب اور نقص دریافت کرنے چاہییں ۔ کبھی غرور کرنا نہیں چاہیے ۔ وہ تجھے ایسا اندھا کر دے گا کہ پھر عقل و رائے کی غلطیاں نہیں سُجھائی دیں گی ۔ جسم میں جہاں خون نہیں ہوتا وہاں ہوا بھرتی ہے ۔ جو دماغ عقل سے خالی ہوتا ہے وہ غرور سے پُر ہوتا ہے ۔ غرور ندامت کا سبب ہوتا ہے مگر ندامت غرور کا سبب نہیں ہوتی ۔

۱۵- فرصت کے وقت نہایت غور سے تم آدمی اور غرور کو خیال کرو تو معلوم ہوگا کہ انسان ایک بالشت برابر پُتلا ایک

۱- اصل : کو ۔

بے حد و پایاں فضا میں اکڑا پھرتا ہے۔ وہ اس عالم کے ایک ذرے پر بیٹھا ہوا ہے۔ ہوائے آسمانی کا ہر جھونکا موت کی سردی اس کو پہنچا رہا ہے۔ جیسے تار سے نغمہ نکلتا ہے، اسی طرح اس کی روح جسم سے نکل کر رات دن تیر رہی ہے۔ جیسے پہیے پر گرد غلطاں ہوتی ہے، اسی طرح وہ آسمان کے ساتھ عالموں کی بھول بھلیاں میں چکّر کھا رہا ہے اور تمام مخلوقِ الٰہی اس کے اوپر اور نیچے شعلہ زن ہے۔ جب یہ حال ہو تو انسان کو کیا زیبا ہے کہ وہ غرور کا تاج سر پر رکھ کر اپنے ہم جنسوں پر، جن کے ساتھ وہ تھوڑے دنوں کے اندر خاک میں مل کر برابر ہو جائے گا، برتری پر فخر کرے؟ کیا مغرور آدمی غلطی نہیں کرتا ہے؟ کیا وہ مرتا نہیں؟ کیا اس کو استدلال میں دشواریاں نہیں پیش آتیں؟ کیا وہ کام اس لیے نہیں کرتا کہ خوش ہو؟ کیا کوئی اس کو دکھ درد نہیں ہوتا؟ کیا مرنے کے بعد وہ قبر میں دفن ہونے سے بچ جاتا ہے؟ ان میں سے کوئی بات بھی اس کو حاصل نہیں ہے۔ پس غرور انسان کی میراث نہیں ہے۔ عجز و انکسار اس کی ناتوانی کے ساتھ رہنے چاہییں تاکہ اس کی جہالت، غلط کاری، نقصوں کا کفّارہ دیتی رہے۔

۱۶- جو مغرور عاجزوں کو دباتا ہے، وہ عاجز کیا جاتا ہے مگر خود عجز نہیں اختیار کرتا۔ غرور محبت کا خون کرتا ہے۔ مغرور کو ہنسی کے قابل بناتا ہے۔ منکسر غرور و خود ستائی سے دور بھاگتا ہے۔ جان بنیان وعظ کہہ کر ممبر پر سے جب اترا تو لوگ اس کی فصاحت و بلاغت کی تعریف کرنے لگے۔ اس نے ان کو روک کر کہا کہ تم کو ضرور نہیں کہ مجھے فصاحت و بلاغت کی تعریف سناؤ۔ شیطان نے پہلے ہی ممبر پر اترنے سے میرے کان اس سے بھر دیے ہیں۔

۱۶۷- خاموشی

۱- بعض اوقات خاموشی فصیح و بلیغ تقریروں سے زیادہ بکار آمد ہوتی ہے اور روشن ضمیری اور عالی دماغی کو ظاہر کرتی ہے : ع

خموشی معنیِ دارد کہ در گفتن نمی آید[1]

سخت کلامی سے زیادہ خوف دلاتی ہے - بہت سی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں اور وہ روزمرہ تجربے میں آتی ہیں کہ ایک خاموشی ہزار جوابوں سے بہتر ہوتی ہے - ایک ُچپ َسو کو ہراتی ہے ؛ ''جوابِ جاہلاں باشد خموشی'' مشہور ہے - دانش مند وہاں ُچپ ہی ہو جاتے ہیں جہاں ان کے برخلاف تعصّب و جہالت کا زور شور ہوتا ہے - ان کی خموشی سے خود بخود یہ زور شور کم ہو جاتا ہے - ُبت خانوں میں جو تھم تھم کر باجے بجتے ہیں تو اُن کی خاموشی میں اُن کے بجنے سے کچھ کم لطف نہیں آتا -

۲- خاموشی بڑے زبردست کام کرتی ہے - اُسی کا کام ہے کہ دل میں خیالات پر خیالات جماتی ہے اور اُن کو آفتاب کی طرح چمکاتی ہے - ولیوں کے ہونٹوں کے پٹ جب تک بند رہتے ہیں ، فیضِ الٰہی کا دروازہ اُن پر کھلا ہوتا ہے - راستی اور حق کی بارگاہِ آسانی تک رسائی خاموشی سے ہوتی ہے - وہی اُس کے ُبرج بڑے مضبوط قلعے کے سے بناتی ہے - تمام ُقوائے روحانیہ کو تقویت دیتی ہے - حسینوں کی خاموشی ُحسن کو دوبالا کر دیتی ہے - ایک حسین عورت کی خاموشی مردوں کے بولنے کی برابری کرتی ہے - ایک خاموشی تو یہ ہے کہ زبان سے کچھ نہ بولے ، یہ بھی ایک نیکی ہے - اور حد سے زیادہ

۱- یعنی خاموشی میں بعض اوقات ایسے معانی پوشیدہ ہوتے ہیں کہ تقریر میں بھی ویسے مطالب بیان نہیں کیے جا سکتے -

بولنا بدی میں داخل ہے ۔ دوسری خاموشی وہ ہے جو غیظ و غضب میں خواہشِ نفسانی کے روکنے میں کی جائے ، اِس سے دل کو بڑی راحت پہنچتی ہے ۔ تیسری خاموشی وہ ہے جو پریشاں حالی میں کی جائے ، اس سے دل میں انتظام باقاعدہ ہو جاتا ہے ۔ جب آدمی جلی کٹی باتیں کسی سے کرتا ہے تو خود گرم ہو کر چہرے کو انگارا بناتا ہے ۔ جن کو یہ ایسی باتیں سناتا ہے اگر وہ سن کر خاموش ہو رہیں تو خوف کرنا چاہیے ۔ ان کے دل میں اندر ہی اندر یا تو شیطنت کے منصوبے ہوتے ہوں گے یا نیک خیال ۔ دکھ درد ، رنج و تکلیف میں جو لوگ خاموش رہنا جانتے ہیں[1] ، وہ بڑے ضابط[2] اور بڑی خوبیوں کے آدمی ہوتے ہیں ۔ اور جو غیظ و غضب میں آن کر غل مچا کے اپنے چہرے کو پژمردہ کرتے ہیں ، وہ بُرے آدمی ہوتے ہیں ۔ جہاں سچ باتیں نہ ہوتی ہوں اور بیوقوفی اور حُمق کے کلام ہوتے ہوں ، وہاں تم چپ رہو ۔ دیوتاؤں کی سرگوشی کی باتیں جب ہی سنائی دیں گی کہ تم چپ رہو گے ۔ جن کے زبان نہیں ہوتی وہ ذی ہوش ، سر تا پا چشم و گوش ہوتے ہیں ۔

١٦٨۔ مسئلۂ تناسخ

آج صبح کو میں بہت سویرے مرغ کی کُکڑوں کُوں کا غُل سن کر جاگا ۔ اُس کی آواز بھی عجیب تُرئی[3] تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بالقصد اپنی آواز ایسی نکالتا ہے کہ دور دور کی

۱۔ اصل : چاہتے ہیں ۔ ۲۔ ضابط = ضبط کرنے والا ۔
۳۔ تُرئی = بِگل ۔

مخلوق کے آدمی جاگ اُٹھیں - اس سے میرے دل میں مسئلۂ تناسخ کا خیال آیا کہ اگر وہ سچ ہو تو ضرور اس مرغ میں روح اُس گھڑیالی کی ہوگی جو ہمیشہ سو جاتا ہوگا اور گھڑیال نہ بجاتا ہوگا - اُس کو یہ سزا دی گئی ہے کہ اِس مرغ کے پروں کے قفس میں قید کیا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ رات کی گھڑیاں گنا کرے اور سویرے اُٹھ کے غل مچایا کرے کہ جس سے سارا محلہ جاگ اُٹھے -

۱۶۹- جانوروں پر ظلم

۱- ہم اپنی جان کی حفاظت اور راحت اور غذا کے لیے جانوروں کا خون کیا کرتے ہیں - یہ امر تو بہ مجبوری کرنا پڑتا ہے مگر سوائے اس کے فقط اپنے دل بہلانے اور تماشا دیکھنے کے لیے اِن بے چاروں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتے ہیں - بہت سے پرندوں اور جانوروں کو لڑاتے ہیں اور ان کا تماشا دیکھتے ہیں - مرغوں کو دیکھا ہوگا کہ پانی میں لڑنے سے وہ کیسے زخمی ہوتے ہیں - یہ ایسے تمام کھیل بے رحمی و سنگ دلی کے ہوتے ہیں - ان کے دیکھنے سے آدمی کا دل سخت ہوتا ہے - مگر جس چیز کا رواج ہو جائے تو اُس کا روکنا مشکل ہوتا ہے - ہر قوم کے خاص و عام میں اس قسم کے کھیلوں کا رواج ہو گیا ہے کہ ان کا روکنا مشکل ہو گیا ہے - گو ان کی جان بچانے کے لیے اور تکلیف سے چُھٹانے کے لیے بعض رحم دل اپنا روپیہ خرچ کرتے ہیں ، جیسا تم نے ہندوؤں کو دیکھا ہوگا کہ وہ چڑی ماروں کے ہاتھوں سے چڑیوں ، کوّوں ، چیلوں اور اَور جانوروں کو چُھٹاتے ہیں اور جب دو جانوروں کو لڑتے دیکھتے ہیں تو ان میں بیچ بچاؤ کر دیتے ہیں ، مگر پھر بھی سینکڑوں آدمی ان کو ناحق اذیّت پہنچاتے ہیں اور اس کو اپنی

مردانگی اور دلاوری سمجھتے ہیں - مگر حقیقت میں وہ نامردی اور بے رحمی ہے - یہ بھی ایک قسم کا قتل ہے ، گو وہ انسان کے قتل بالعمد کے برابر جرم نہ ہو -

۲- خداے تعالیٰ نے جیسی جان انسان کو دی ہے ویسی جانوروں کو - تو جان کے لحاظ سے انسان اور حیوان دونوں برابر ہیں - پس جو انسان حیوان کی جان کا زیان ناحق کرتے ہیں ، وہ بڑا ظلم کرتے ہیں - اس ظلم کے روکنے کے واسطے رحم دل آدمیوں کی بہت سی سوسائٹیاں ہیں اور وہ محافظِ حیوانات کے نام سے موسوم ہیں - مگر وہ سب چوپایوں کے لیے ہیں ، پرندوں کے لیے نہیں - ان پرندوں کا جینا زیادہ تر درختوں پر موقوف ہے - وہ آنھی پر بسیرا لے کر زندہ رہ سکتے ہیں - درختوں کے احسان کے برابر کل جانداروں پر علی العموم کسی کا احسان نہیں ہے اور علی الخصوص پرندوں پر - اب کسان اپنے کھیت پر ان کو بیٹھنے نہیں دیتا ، غُلّوں سے اڑاتا ہے - باغبان باغ میں ان کے آنے کا روادار نہیں ، کھٹکے سے ڈراتا ہے ، غلیل سے اڑاتا ہے -

اب رہے جنگل ، آن کا حال یہ ہے کہ جہاں ہزاروں میل میں جھاڑی بُوٹی اور جنگلی درخت تھے اور لاکھوں بے شمار پرند ان میں رہتے تھے ، وہ اب سب کٹ کٹا کر برابر ہو گئے - بَن کے بَن چٹیل میدان اور کھیت بن گئے - جہاں پرندوں کا جمگھٹ اور غُل شور رہتا تھا وہاں اب کسانوں کا غول و غل رہتا ہے - پہلے ان زمینوں کو کوئی کوڑی کو نہیں پوچھتا تھا ، اب روپیوں کی تھیلیوں کے منہ ان کی خریداری کے واسطے کھلے ہوئے ہیں - غرض ان جھاڑیوں اور جنگلوں کی صفائیوں نے پرندوں کو صفاً صفا کر دیا ہے - کچھ عجب نہیں کہ بعض پرندوں کی نسلیں قطع ہو گئی ہوں - اور جو

پرندے پہلے لاکھوں ملتے تھے اب وہ ڈھونڈے سے بھی[1] نہیں ملتے - اب جو درختوں کے لیے جنگل رکھائے جاتے ہیں وہ اُن پہلے جنگلوں اور جھاڑیوں سے کچھ نسبت نہیں رکھتے - یوں پرندوں کے گھروں کو اُڑا کر اُن کو برباد کر دیا اور پھر کسی نے ان کے آباد کرنے کی تدبیر نہیں کی - وہ ہزاروں آندھی ، مینہ اور اولوں اور برف سے مر جاتے ہیں مگر ان کی جان بچانے کی تدبیر انسان نہیں کرتا - اگر بڑے بڑے شہروں میں دو چار رحم دلوں نے چھت پر سیر دو سیر اناج ڈلوا دیا یا کونڈے میں پانی دانہ ڈال دیا تو اس سے کیا ہوتا ہے - وہاں بھی اُن کی جان کے پیچھے بلّیاں آن لگتی ہیں جو دو چار کو کھا جاتی ہیں اور سب کا کھانا پینا تلخ کر دیتی ہیں - غرض چوپایوں پر ظلم کے انسداد کے لیے بہت سی تجویزیں آدمی کرتے ہیں مگر پرندوں کے لیے نہیں ہوتیں - یہ بھی سچ ہے کہ اگر انسان ان پر ظلم نہ کرے تو پھر وہ انسان پر ایسا ظلم ڈھانے لگیں کہ اس کا جینا دشوار کریں - نہ کھیت میں دانہ چھوڑیں ، نہ باغ میں پھل -

۳- کوئی ملک دنیا میں ایسا نہیں ہے کہ جس میں خیالی رحم اور عملی ظلم جانوروں پر ایسا ہوتا ہو جیسا کہ ہندوستان میں - مرغ بازی ، بُلبل بازی ، لال بازی ، بٹیر بازی اور کبوتر بازی ، غرض اَور بہت سی بازیاں جانوروں کے لڑانے کی یہاں ہندوستان میں ہیں - ایسے کھیل اَور دنیا کے پردے پر کسی ملک میں نہیں - ان میں جو ظلم جانوروں پر ہوتا ہے اس کو سب جانتے ہیں -

---

۱- اصل : ڈھونڈھے نہیں ملتے - "سے بھی" اضافہ مرتّب -

۱۷۰- قدیم و جدید آزاد خیال

آزادی سے خیال کرنے کے یہ معنی ہیں کہ جو امر پیش ہو اس کے مخالف و موافق شہادت کو دیکھیں اور اس کے ضعیف و قوی ہونے کے موافق فیصلہ اپنی عقل و فہم سے کریں اس لیے آزاد خیال وہ ہؤا جو تقلید کا مقیّد نہ ہو اور خود محقّق ہو۔ دنیا میں جو قدیم زمانے میں آزاد خیال گزرے ہیں وہ بڑے تعظیم و ادب کے مستحق ہیں۔ اُنھوں نے پہلے یورپ کی قوموں میں وہی کام کیے ہیں جو بڑے مصلحانِ مذہب نے کیے ہیں۔ بُت پرستی اور باطل پرستی کے خلاف ان سے جہاں تک ہو سکا، انھوں نے کوشش کی۔ یونانی حکما میں سے سقراط اور اس کے شاگردوں نے اور رومی فضلا میں سے سسرو اور سینیکا نے اپنے اپنے زمانے کی تاریکیوں کو دور کرکے روشنی پھیلائی اور ہدایت کرکے راہِ مستقیم دکھائی۔ اپنی دلالت[1] سے، ضلالت سے نجات دلائی۔ ان آزاد خیالوں کا اصولِ عظیم یہ تھا کہ انسان خالقِ عالم کو[2] مانیں اور اس کی صفات اور ذات کو اکمل جانیں۔ روح کی بقا اور قیامت کے دن سزا و جزا کا یقین کریں۔ اُنھوں نے اپنے ملک کے مذہب کی موافقت وہاں تک کی جہاں تک کہ اس میں اصولِ مذکور کے برخلاف کوئی بات نہ تھی۔

بعد ازاں ایسے آزاد خیال پیدا ہوئے کہ جنھوں نے اپنی عبارت آرائی اور دلائلِ سوفسطائیہ سے اُن اصول کی بیخ کنی میں سعی کی جن کے قائم کرنے میں پہلے آزاد خیالوں نے بہادرانہ، ستائش کے

۱- دلالت = رہنمائی۔

۲- اصل میں جملہ یوں تھا: "ان آزاد خیالوں کا اصولِ اعظم یہ تھا کہ خالقِ اعظم کو انسان مانیں۔"

قابل کوشش کی تھی - یہ لامذہب ، عالَم کی شاندار خلقت کو عقل سے دیکھتے مگر اس کے خالق کے قائل نہ ہوتے - وہ اُس قادرِ مطلق کی قدرت کو نہیں مانتے جو اس عالَم میں انقلابات و حادثاتِ عظیم پیدا کرتی ہے - وہ جانتے ہیں کہ انسان کے معاملات میں خدا کو دخل ہی نہیں - وہ انسان کو اَور جانوروں کے برابر اس طرح کرتے کہ مرنے کے بعد نہ اس کو سزا کا خوف ہے ، نہ جزا کی اُمید - دوزخ کو ناحق کے دھڑکے اور جنّت کو خالی ڈھکوسلے بتاتے - واعظانِ دین کے مکر و فریب ، جو یہ دغاباز حکیم بیان کرتے ، ان کے سننے سے کان کھڑے ہوتے - وہ تمام معزّز عالموں کے نیک کاموں کو خاک میں ملاتے - جاہلوں کے دلوں میں جو روشنی قدرتی ہے ، اُس کو تاریک کرتے اور جو اصول جاگرفتہ تھے ، اُن کو اُکھیڑتے - غرض یہ آزاد خیال انسان کے لیے روحانی وبا کا حکم رکھتے تھے -

سسرو نے بڑی فصاحت سے اُن حکیموں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے دلاوری اور بہادری سے روح کی بقا کے مسئلے کو ثابت و قائم کیا ہے - ان کے مقابل میں اُن حکیموں کی بڑی حقارت کی ہے جنھوں نے اس کے برخلاف دلائل لکھے ہیں - وہ کہتا ہے کہ اس مسئلے کے اندر میں افلاطون کی غلطیوں کے ساتھ ہونے کو پسند کروں گا مگر اس گروہِ فلاسفہ کے سچ کے ساتھ نہیں ہوں گا -

ایک اور عاقل کا قول ہے کہ اگر روح کی بقا کا مسئلہ غلط بھی ہو تو ایسی مسرّت آگیں غلطی کو اپنے دم کے ساتھ لے جاؤں گا ، گو اُن حکیموں کا مذہب سچ ہی کیوں نہ ہو جو روح کی بقا کے قائل نہیں - مجھے اپنی اس خطا پر اُن مُردہ حکیموں کے ہنسنے کی پروا نہیں - روح کی بقا کو نہ ماننا انسان کو ایک بڑی مسرّت سے محروم کرتا ہے - ایک ایمان دار اس خیال کے دور کرنے کی نسبت موت کو

اچھا جانتا ہے - جو حکیم اس مسئلے کو رد کرتے ہیں وہ باولے ہیں - نہ وہ اس سے نیکی کو بڑھاتے ہیں ، نہ بدی کو گھٹاتے ہیں - نہ خوشی کی افزائش کرتے ہیں ، نہ رنج کی گدازش[1] کرتے ہیں - اگر ان کی دلائل مستحکم بھی ہوں تو وہ اخلاق اور نیکی کو گم کرتے ہیں - بڑھاپے اور بیماری کے رنجوں کی تسکین کو گھٹاتے ہیں - مگر ہاں وہ اُن دلوں کو خوش کرتے ہیں جو برائیوں سے بھرے ہوئے ہیں - چوری ، زنا ، فریب ، دغا پر پلے[2] بیٹھے ہیں جس سے انسانوں کو ضرر پہنچاتے ہیں -

١٧١- تقریر کی بُرائیاں

بعض آدمیوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی تقریر میں ایک لفظ کی جگہ دس لفظ بولتے ہیں اور فقرے کے فقرے ایسے بولتے ہیں جو اُن کے مطلب سے تعلق نہیں رکھتے - بعض بات بات پر قسمیں کھاتے ہیں اور کفر کے کلمے کہتے ہیں - استعارات و تشبیہات کی بھرمار کرتے ہیں - ہر عاقل جانتا ہے کہ جو شخص اپنے دل کی بات کسی شخص سے کہتا ہے اس کو وہ بڑا خلیق معلوم ہوتا ہے - مگر تجربے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دس آدمیوں میں سے ایک آدمی شاید ہوتا ہوگا جس کا مطلب بولنے سے یہ ہوتا ہوگا کہ اپنے دل کی بات دوسرے کو سمجھائے - باقی کا مقصد گفتگو سے یہ ہوتا ہے کہ ان کی تعریف ہو - بہت سے الفاظ زائد فقط تحسینِ کلام کے لیے بڑھاتے ہیں - بات بات میں اَوروں کی شہادت اور سند پیش کرتے ہیں -

---

١- گدازش : 'گداختن' سے حاصل مصدر - مطلب یہ کہ نہ خوشی میں اضافہ کرتے ہیں ، نہ دکھ اور تکلیف کو نرم یا کم کر سکتے ہیں -

٢- پلے بیٹھے ہیں یعنی تیار بیٹھے ہیں -

بعض کلام سے پہلے اپنے عجز و انکسار کی باتیں بناتے ہیں۔ پھر یہ کہتے ہیں کہ میری رائے ناقص میں یہ آتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ تقریر میں یہ تمام عیب اِس سبب سے پیدا ہوتے ہیں کہ معانی کی طرف خیال نہیں کرتے اس لیے زبان سے فضول الفاظ نکالتے ہیں۔ یہ تہی مغز، پُرگفتار چاہتے ہیں کہ الفاظ کے طُمطراق سے معانی کی دھوم دھام مچاویں۔ مگر یہ ان کی حماقت ہے۔ کہیں الفاظ کی دھوم دھام سے خیالات کی بلندی کا اظہار ہو سکتا ہے ؟

۲۔ بہت سے آدمیوں کو فصاحت کا ایسا شوق ہوتا ہے کہ ابھی پورا بولنا بھی نہیں آیا کہ فصاحت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہنوز اقسامِ کلام سے ناآشنا ہیں مگر مدّعی اس کے ہیں کہ ہم اپنی زبان سے گل افشانی اور دُرفشانی کرتے ہیں۔ غرض بولنے میں یہاں یہ دستور ہو گیا ہے کہ بیس میں سے ایک آدمی سمجھانے کے لیے بولتا ہو گا۔ باقی سب اپنی طلاقتِ لسانی[1] کے اظہار کے لیے بولتے ہیں کہ ہم خوب بولتے ہیں۔ بڑے مزے کی باتیں بناتے ہیں۔ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ شاعر ماں[2] کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے لیکن یہ[3] لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فصیح ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور ہم اُن میں سے ہیں۔ غرض اب شاعری سے زیادہ لوگوں کو شوق سپیچ[4] کا ہوگیا ہے۔ اس میں وہ اپنی فصاحت کے دعوے ایسے ہی جھوٹے کرتے ہیں جیسے شاعر اپنی شاعری کے۔

۳۔ ایسی تقریروں میں کیا لطف ہے کہ طول طویل چلی جاتی ہیں۔ ایک گھنٹے کی تقریر کے بعد کوئی لطیفہ یا چُٹکلا آتا ہے جس

۱۔ طلاقتِ لسانی = زبان کی فصاحت و بلاغت اور بیان کی چستی۔
۲۔ اصل میں 'ماں' کے بجائے 'ما' ہے۔
۳۔ "یہ" اضافۂ مرتّب۔
۴۔ سپیچ (speach) = تقریر۔

سے دل خوش ہوتا ہو - آدھ گھنٹہ فقط اس بیان میں گزر گیا کہ کیا بجا ہے - اصول یہ ہے کہ آدمی باتیں اپنے خوش کرنے کے لیے نہ کرے بلکہ اَوروں کے خوش کرنے کے[1] واسطے - اس اصول کی پابندی سے آدمی اس بات پر غور کریں گے کہ میں ایسی باتیں کروں کہ جو لوگوں کے سننے کے قابل ہوں -

۴- اگر کوئی عام قسم کی گفتگو کرنے والوں کا ایک مرقّع بنائے تو وہ بہت مشابہ[2] اس مرقّع سے[3] ہوگا جس میں تمام باجے بجانے والوں کی تصویریں ایک دائرے میں بنائی جائیں اور وہ اپنے مناسبِ حال باجے بجائیں - اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بعض آدمی گفتگو میں بڑا غُل شور مچاتے ہیں اور مکان کو سر پر اٹھا لیتے ہیں - ان کو ہنسی نہیں آتی مگر وہ یوں ہی قہقہوں کی آوازوں سے اہلِ دانش کا دماغ پریشان کرتے ہیں - اُن کی اس سخت آواز سے لوگ بھاگتے ہیں - ان کی[4] گفتگو میں فصاحت ، ظرافت ، لطافت ، شرافت کچھ نہیں ہوتی - ان کی تقریر کا حال دھونسے[5] کا سا ہوتا ہے کہ جس کی دھوں دھوں کی آواز سے عاقلوں کا دماغ اُڑا جاتا ہے مگر جاہلوں کا ہجوم اس کے[6] گیرد لگا رہتا ہے - وہ اس کو پسند کرتے ہیں - اُس کا اندر سے خالی ہونا اُس کی آواز کو بڑھاتا[7] ہے - پس ایسے ہی تہی مغز ہونا تقریر کو پُرزور کرتا ہے -

اب طنبورے کی آواز بالکل دھونسے کی آواز کی ضد ہے - اس کی آواز نرم و شیریں ایسی ہوتی ہے کہ پاس ہی کے آدمیوں کو

۱- "کے" اضافہ مرتّب -
۲- اصل : متشابہ -
۳- اصل : کے -
۴- اصل : نہ ان کی -
۵- دھونسا = ڈھول یا ڈھول کی قسم کا کوئی ساز -
۶- اصل : اشکے گرد -
۷- اصل : پڑھاتا ہے -

سنائی دیتی ہے - دھونسے کی آواز کی طرح دور دور سینکڑوں آدمیوں کے کانوں میں نہیں جاتی - پس طنبورے کی آواز سے اُن کی تقریر[1] مشابہ ہے جو ذہنِ مستقیم رکھتے ہیں اور بات کو خوب تول کر ، پسندیدہ ادا و انداز سے ادا کرتے ہیں ، جن کو خوش مذاق بڑے شوق سے سنتے ہیں اور راگ کا سا مزہ اُٹھاتے ہیں -

ایک اور باجا تُرئی ہے جو ایک ایسا آلۂ موسقی ہے کہ گو اس میں سے[2] بہت سے راگوں کی آوازیں نہیں نکلتیں مگر پھر بھی جتنی نکلتی ہیں وہ کانوں کو اچھی معلوم ہوتی ہیں - پس اس آواز سے مشابہ اُن شرفا کی تقریریں ہیں جو شرافتِ خاندانی رکھتے ہیں اور تعلیمِ مروّجہ پانے کے سبب سے گفتگو کرتے ہیں - گو ان میں عالی دماغی اور روشن ضمیری نہیں ہوتی مگر ایک شرافت ان سے ایسی ٹپکی پڑتی ہے کہ وہ دلوں کو لبھاتی ہے - وہ اکثر ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بیان بڑی ظرافت و لطافت سے کیا کرتے ہیں جیسے محفلیں ، دعوتیں ، باغ ، تماشے ہوتے ہیں - جیسے تُرئی کے راگ محدود ہوتے ہیں — براتوں اور بادشاہوں کی نوبتوں میں تُرئی کی ضرورت ہوتی ہے ، گو اس سے راگ بہت سے نہیں نکلتے — ایسے ہی ایسی[3] گفتگو کرنے والوں کی بادشاہی درباروں اور محافل اور جلسوں میں حاجت ہوتی ہے -

ایک باجا سارنگی ہے کہ اس کی آواز بہت کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے اور دل پر اثر کرتی ہے - مگر جس وقت دل راگ کی طرف مائل نہ ہو تو سب باجوں سے زیادہ وہ ناگوار معلوم ہوتی ہے - اس

۱- اصل : تقریر پر مشابہ ہے -   ۲- "سے" اضافہ مرتب -

۳- اصل : ایسے ہی ایسے -

کی آواز کے مشابہ اُن لوگوں کی گفتگو ہے جو اپنی ذکاوت کو ہجو و ظرافت و لطافت کے پردے میں دکھاتے ہیں ۔ کبھی کبھی ان کے منہ سے بڑی ذکاوت کی باتیں نکل جاتی ہیں ۔

غرض اسی طرح اَور باجوں سے گفتگوؤں کی تشبیہ ہو سکتی ہے ؛ گنواروں کی باتیں دوتارے اور پونگی کی آواز سے بہت مشابہ ہیں[۱] ۔ پس جب تم کسی مجلس سے اٹھو تو دل میں سوچو کہ ہم نے لوگوں کی تقریروں میں کن باجوں کی آوازیں سنیں ۔

۱۷۲- لوگوں کی رائے

یہ آدمی کے نیک طینت اور روشن ضمیر ہونے کی دلیل ہے کہ وہ اُن رایوں سے ، جو اس کے باب میں ہوں ، ایسا اپنے تئیں علیٰحدہ کر لے کہ پھر لوگوں کے اختلافِ آرا کے پھندوں میں ایسا نہ پھنسے کہ اپنی عقل اور رائے کے برخلاف کام اَوروں کی رائے کے اتّباع کے لیے کرنے لگے ۔ گو دنیا میں علی العموم عوام کا یہ مقولہ مسلّم ہے کہ ہم ایسا کریں جیسا کہ اَور کرتے ہیں ، نہیں تو ہماری ہنسی اڑے گی ۔ تماشا گاہ میں جب ہی تماشا اچھا ، تماشاگر سے ہوتا ہے کہ وہ بالکل تماشائیوں کو بھول جاتا ہے کہ یہ میرے سامنے بیٹھے ہیں ۔ جہاں ان کا خیال ہوتا ہے وہاں وہ اپنے ہر قدم پر ، ہر حرکت پر ، ہر ادا و انداز پر اس سبب سے رکتا ہے کہ کہیں دیکھنے والوں کو برا نہ معلوم ہوں ۔ اور اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ سارے خریدار میرے پسند کرنے والے ہی بیٹھے ہیں تو اس کی ہر حرکت میں ایک مسرّت نظر آتی ہے ۔ یہ تماشے پر کیا موقوف ہے ، اسی طرح بہت سے کام بے تکلّف ، نہایت خوبصورتی سے آدمی کرتا ہے ۔

۱- صل : مشابہ ہے ۔

بعض آدمیوں کو اس درجے پر اپنی تعریف کا شوق بڑھ جاتا ہے کہ اپنے ادنٰی ادنٰی روزمرہ کے کاموں کے لیے بھی وہ تعریف کی توقع کرتے ہیں - کوئی کام ان سے برا بھلا بغیر تعریف کے نہیں ہو سکتا - بات بات پر اپنی داد چاہتے ہیں - اِدھر کسی نے داد نہ دی تو اُدھر وہ کام سے رک گئے - جب وہ پبلک میں کھڑے ہو کے بولتے ہیں تو ان کے چہرے کے ہر رگ و ریشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تعریف کے خواہاں ہیں - کم ظرفوں اور اوچھے آدمیوں میں یہ باتیں ہوتی ہیں - عالی دماغ ، بلند خیال اِس بات پر خیال بھی نہیں کرتے - اگر انسان کی قدرت میں یہ ہوتا کہ وہ اپنی مرضی کے موافق سارے کام بغیر اس کے کر سکتا کہ کوئی دوسرا دنیا میں اسے دیکھے ، تو بھی اس کو اپنے کاموں کا انصاف کرنا بغیر اس خیال کے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے ، نہایت مشکل ہوتا -

افلاطون نے کائیجس کے چھلّے سے اس مضمون کو تشبیہ دی ہے کہ گو ہمارے افعال کی لوگ مذمّت کرتے ہیں ، تو بھی ہم اپنے سے آپ کم واقف ہوتے ہیں - اگر ہم اپنی خواہشوں کے موافق اپنے کام اس طرح کرتے کہ کوئی ان کو نہ دیکھتا ، تو ہم اپنے اصلی حقیقی وصف سے بہ آسانی واقف ہوتے - اس چھلّے کا حال یہ ہے کہ کائیجس نے ایک چھلّے پر منتر پھونکا کہ جس کے سبب سے اس میں یہ صفت پیدا ہوگئی کہ جو اس کو پہنے وہ کسی کو نہ دکھائی دے اور جب آتار ڈالے تو نظر آنے لگے - وہ اپنی مطلب برآری کے لیے اس چھلّے کو کام میں لاتا - چنانچہ ایک دفعہ اس نے ایک ملکہ کی عصمت کی بہار لوٹی اور بادشاہ کو مار ڈالا ــــ ٹلی[1] اس تمثیل پر لکھتا ہے کہ جن آدمیوں کے پاس یہ چھلّا ہو ، اسے پہن کر ہزاروں نیک کام کرنے چاہییں جس کے سبب سے ان کا اظہار نہ

ہو ، اور برے کاموں سے احتراز کرنا چاہیے کہ گویا یہ چھلّا پاس ہی نہ تھا -

عدالت اور نیکی کے قوانین کے برخلاف کام نہ[1] کرنا بڑی نیکی ہے - انسانوں پر مخفی احسان و مہربانی کرنا ایسا ہی بھلا ہے جیسا کہ چپکے چپکے لوگوں کو مضرّت پہنچانا برا ہے - مخفی نیکی کرنا خدا کا کام ہے ، مخفی ضرر پہنچانا شیطان کا کام ہے - ہم اپنے زمانے میں بہت سے نیک آدمی دیکھتے ہیں کہ ان کے نیک کاموں کی بڑی تعریف دھوم دھام سے ہوتی ہے - مگر نیک کاموں کی عظمت پردۂ اختفا میں ہوتی ہے کیونکہ اس میں انسان کو اپنی تحسین و آفریں کی بڑی خوشی چھوڑنی پڑتی ہے - اس کا چھوڑنا فرشتہ خوئی ہے - غرض نیک کام کرنے میں لوگوں کی رائے کا کچھ خیال کرنا نہیں چاہیے کہ وہ ہم کو کیا کہتے ہیں -

۱۷۳- عورتوں میں ترقی کی قابلیت مردوں سے زیادہ ہوتی ہے

بڑی سہج سہج دنیا کی اصلاح ہوتی ہے - مردوں کی بہ نسبت عورتوں کے دلوں میں پند و نصیحت و تہذیب و شائستگی کا نقش آسانی سے جم جاتا ہے : اس لیے کہ کاموں کی کثرت اور بلند سودائی مردوں کے دلوں میں ، بہ نسبت عورتوں کے ، بہت کم جگہ چھوڑتی ہے - جو لوگ مصلحِ قوم بننا چاہتے ہیں ان کو عورتوں کے اخلاق ، عادات ، لباس ، وضع و انداز کی اصلاح پر زیادہ توجہ کرنی چاہیے - جن باتوں میں وہ غلطیاں اور خطائیں کرتی ہیں ، ان کو بھی بتلانا

۱- اصل : نہ کام کرنا -

چاہیے - عورتوں کے حسن و جمال کی بڑی تعریف مرد کرتے ہیں ، عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف پر مرد مرتے ہیں ، ان کی خوشامد میں لوٹے جاتے ہیں - اس خوشامد ہی سے عورتیں پندار اور غرور کے نشے میں مست ہو جاتی ہیں - اس سے بہت سی حماقتیں ان میں پیدا ہو جاتی ہیں - اگر مرد اپنی یہ خوشامد موقوف کر دیں تو پھر عورتوں کے مزاج میں خوشامد پسندی نہ رہے اور بہت سی ابلہانہ حرکتیں[1] وہ چھوڑ دیں -

۱۷۴- عیب بینی و نکتہ چینی

۱- جنھوں نے خود اپنے تئیں کسی کام میں ممتاز نہ بنایا ہو ، ان کو اَوروں کے کاموں کی نکتہ چینی اور عیب بینی زیبا نہیں ہے - بہت سے نکتہ چیں ، عیب بیں ایسے ہوتے ہیں کہ خود کچھ کام نہیں کرتے مگر اَوروں کے کاموں کے تلف کرنے کے واسطے ان کے منہ میں دانت سانپ کے سے ہوتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے - جو نیک نہاد ، ستودہ صفات مصنّف ہوتے ہیں ، گو انھیں اپنی تعریف کا شوق ہوتا ہے مگر دوسرے سے حسد ان کو نہیں ہوتی - وہ متأخّرین و متقدّمین مصنّفوں کی تعریف نہایت دریا دلی سے کرتے ہیں - ایک مصنّف ارسطو کی یہ تعریف کرتا ہے کہ وہ سونے کا دریا ، بہتا ہوا ، تھا - افلاطون کی نسبت لکھتا ہے کہ اگر جیوپیٹر بولتا تو افلاطون سے زیادہ اچھی تقریر نہ کرتا - بعض اپنی شیخی و نمود میں یاوہ گوئی کرتے ہیں مگر اَوروں کو برا نہیں کہتے -

نکتہ چیں اور عیب بیں اس کہانی کے مصداق ہیں کہ ایک

۱- اصل : بہت سی ابلہانہ حرکت - ابلہانہ حرکت = احمقانہ حرکت -

سائے کی جگہ میں اُلّو، چمگادڑ اور اَور پرند، جن کو رات کو نہیں دکھائی دیتا، جمع تھے اور اپنے ہمسائے کے پرندوں پر طعن کر رہے تھے۔ پھر آخر کو آفتاب کو برا کہنے لگے۔ جب آفتاب نے اُن کا یہ برا کہنا سنا تو اُس نے یہ کہا کہ مجھ کو تعجّب ہے کہ تم اُس کی بدگوئی پر دلیری کرتے ہو جو ابھی چاہے تو تمھیں اور تمھاری ساری اولاد کو ایک لمحے میں جھلس کر راکھ کر دے۔ مگر میں باوجود اس اقتدار کے یہ جواب دیتا ہوں کہ خواہ تم مجھ کو کتنا ہی برا کہو، میں چمکتا ہی رہوں گا۔ پس مصنّفوں کو چاہیے کہ وہ ان نکتہ چینوں کو کوئی جواب سوائے اس کے نہ دیں کہ اپنی تصنیفات سے ہاتھ نہ اُٹھائیں اور ان کو جلائے جائیں۔

قاعدہ ہے کہ دنیا اپنا خود ہی شکار کرتی ہے۔ ایک سکّھی جو ہم کو دق کرتی ہے، اُس کے گِرد ہزاروں کیڑے دق کرنے والے لپٹے ہوئے ہیں۔ ایک جُوں سَو جُوؤں سے بھری ہوئی ہے۔ ایک ہویل[1] کے پیٹ میں اتنے جانور ہیں کہ شاید دنیا میں اتنے آدمی نہ ہوں گے۔ پس اسی طرح مصنّفوں کی تصنیفات کے اوراق میں ہزاروں کیڑے لگے ہوئے ہیں جو اپنا پیٹ ان سے پالتے ہیں۔ پس ایسے ہی نکتہ چیں، عیب بیں کم سمجھ اپنی عیب بینی سے کچھ کما کھاتے ہیں۔ بڑے بڑے آدمیوں کی تصنیفات پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان اعتراضوں کے پڑھنے والے بہت سے احمق دنیا میں موجود ہو جاتے ہیں۔ اس حیلے سے رزق ان کو مل جاتا ہے۔ بڑے عالی دماغ مصنّفوں کو ان کے ساتھ ایسا سلوک کرنا نہیں چاہیے جیسے کہ ایک قسم کی لومڑی کی نسبت مشہور ہے کہ جب اس کی کھال

۱۔ یہ لفظ غالباً ''ویل'' ہے، یعنی ویل مچھلی۔

میں بہت سے کیڑے پڑ جاتے ہیں تو وہ پانی کے اندر منہ میں ان کو لے کر چلی جاتی ہے اور منہ کو باہر رکھتی ہے[1] - سارے کیڑے اس اون میں جب آ جاتے ہیں تو وہ اس کو پانی میں چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور کچھ پروا نہیں کرتی کہ وہ کیڑے جئیں گے یا مریں گے - عالی درجہ مصنّفوں کو یہ خیال بھی کرنا چاہیے کہ اگر وہ اپنی تصنیفات کو ان پاجی بدبینوں کے خوف سے چھوڑ دیں تو علم کا قحط پڑ جائے ، چھاپے خانے بند ہو جائیں ، کتاب فروشوں کا روزگار جاتا رہے -

۲- آدمی کو چاہیے کہ وہ تمام معاملاتِ زندگی میں اصل حقیقت اور ظاہری صورت میں اور فعلی اور جعلی کمالات میں اور سچّی اور جھوٹی لیاقتوں میں تمیز کیا کرے - جاہلوں میں یہ تمیز نہیں ہوتی - سونا اور سونے کا ملمّع دونوں یکساں چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں - علم و فضل سے وہ بے بہرہ ہوتے ہیں ، اس میں کیا تمیز کر سکتے ہیں - بہت سے ڈینگیے ، نمودیے ، شیخی مارنے والے جھوٹے عالم آپس میں ایک دوسرے کی تعریف کر کے اپنے تئیں جہلا میں چمکا دیتے ہیں - اور سچّے عالم جو عالی دماغ ہوتے ہیں ، خواہ حیا کے سبب سے جو اُن کی جبلّت میں داخل ہوتی ہے یا اپنی تعریف کی ان کو کچھ پروا نہیں ہوتی ، اپنے علم کے سرمایے میں مخفی خزانے کو چھپائے بیٹھے رہتے ہیں اور چپکے چپکے اپنے دل میں مسرور ہوتے ہیں - جو اِترانے والے اور بیہودہ طور پر علم کے ظاہر کرنے والے ہیں ، ان کا حال علم میں ایسا ہے جیسا کہ ریاکاروں کا مذہب

۱- لومڑی کے قصّے کی یہ عبارت اصل کتاب میں اسی طرح چھپی ہوئی ہے - غالباً کاتب سے کچھ الفاظ یا عبارت چھوٹ گئی ہے -

میں - جو علم کی صورت دکھاتے ہیں مگر اس میں قدرت نہیں رکھتے، وہ نقارے کی طرح اپنے علم کی خوب ڈھوں ڈھوں مچا کے جاہلوں کو اپنے گرد جمع کر لیتے ہیں، مگر ان کو دلی مسرّت نہیں حاصل ہوتی - فقط لوگوں کی تعریف کی خوشی ہوتی ہے - غرض جانوروں میں بھی کوئی ایسا تہی مغز اور مکار جانور نہیں ہے جیسے کہ وہ نکتہ چیں اور عیب بیں کہ کسی مصنّف کے مغزِ سخن کو نہیں پہنچتے اور مطلب کو سمجھتے نہیں مگر[1] اعتراضوں کی پوٹ کی پوٹ اس کے سر پر رکھ دیتے ہیں - انھوں نے اپنے چند قاعدے مقرر کر رکھے ہیں، ان کے موافق وہ مصنّفوں کی تصنیفات کو برا بھلا کہہ دیتے ہیں - وہ اپنے ذہن کی کل اس طرح چلاتے ہیں جیسے کہ مزدور کل کو چلاتا ہے اور سمجھتا نہیں کہ کیا ہے - چند اصطلاحیں طوطے کی طرح یاد کر رکھی ہیں، وہی اپنی حرف گیری میں کام میں لاتے ہیں - کتاب کو پڑھیں یا نہ پڑھیں مگر یہ لکھ دیں گے کہ اس کی عبارت میں ضعفِ تالیف ہے، لفظی اور معنوی تاکید سے وہ بھری ہوئی ہے، سخن میں استقامت جسے کہتے ہیں وہ نہیں، رایوں میں کجی ہے - یہ تماشا اکثر انگریزی خوانوں کی نکتہ چینی میں دیکھا ہے کہ وہ بعض حکام[2] کے[3]، جو زبان سے نا آشنا ہوتے ہیں، لال بجھکڑ بن

۱- ''مگر'' اضافہ، مرتّب -

۲- یہاں حکام سے غالباً وہ انگریز افسر مراد ہیں جو نصابی کتابیں قبول یا رد کرنے کا اختیار رکھتے تھے - چونکہ خود یہ افسر اُردو زبان کے ماہر نہیں ہوتے تھے لہٰذا مصنفین کے نصابی مسودات وہ متعلقہ موضوع اور زبان کے دیسی، انگریزی داں متخصّصین کے حوالے کر دیتے تھے اور انھی کی سفارش کی روشنی میں مسودہ قبول یا رد کرتے تھے - مولانا ذکاءاللہ کا اشارہ ایسے ہی ماہرین کی طرف ہے جنھیں وہ ''لال بجھکڑ'' کہہ رہے ہیں -

۳- اصل : احکام کی -

جاتے ہیں اور اردو زبان کی غلطیوں کا ہای لیز گریمر کے قاعدوں سے ان کو یقین دلاتے ہیں۔

۱۷۵- اشتہار

جو چیز مروج ہو جاتی ہے اور روز دیکھنے میں آتی ہے، اس کے موجد کی ذہانت کی طرف بالکل خیال نہیں جاتا۔ نہ اس کی داد دی جاتی ہے۔ اخباروں کے ساتھ اشیا اور روز مرہ واقعاتِ شادی و غمی کے اشتہاروں کا طومار ہم دیکھتے ہیں اور کبھی یہ نہیں خیال کرتے کہ وہ شخص کیسا طبّاع و عالی دماغ ہوگا جس شخص نے پہلے پہل یہ بات سوچی ہوگی کہ جس کاغذ میں میدانِ جنگ کی لڑائیوں کی اور سپاہیوں کے حملوں کی اور قلعے کے محاصروں کی خبریں مشتہر ہوں، اس کے ساتھ دوکانوں کی عمدہ تر اشیا کے اشتہا دیے جائیں۔ جس سے میدانِ رزم کے ساتھ ایسا بازار لگ جائے کہ عقل و ذہن کی اصلاح کی متاع اور جسم کی آرائش و آسائش کے اسباب فروخت ہونے لگیں۔ ایک صفحے میں یہ لکھا ہو کہ اس فاضلِ اجلّ نے علمِ اخلاق میں یا علمِ طبیعیات میں ایک اور کتاب چھاپی ہے اور دوسرے صفحے میں آنکھوں کی عمدہ دواؤں کے اوصاف اور قیمت کا بیان ہو۔ غرض بصارت و بصیرت دونوں کے لیے اشتہار ہو۔ مگر ان اشتہاروں کا فائدہ عوام کو جب پہنچتا ہے کہ اس میں راستی اور صداقت ہو۔ اگر کسی صابن کا اشتہار ہو تو اس کے ساتھ یہ نہ بیان ہو کہ پچاس کی بڑھیا چہرے پر لگانے سے بارہ برس کی بن جاتی ہے۔ کوئی نسخہ مقوّی ہو تو یہ اس کے ساتھ نہ ہو کہ پیر کو جوان بناتا ہے۔

بعض آدمی اشتہار دینے میں خبثِ طینت ظاہر کرتے ہیں کہ

اپنی چیزوں کی تعریف میں اور دوسروں کی چیزوں کی مذمّت میں مبالغہ کرتے ہیں۔ اپنی چیز کی تعریف کرنے کا مضائقہ نہیں مگر دوسرے کی چیز کی مذمّت کرنی بڑی خباثت ہے۔ غرض اشتہار میں جتنا صداقت کا اظہار ہوگا، اتنا ہی فائدہ مند ہوگا۔ مصنّف کو چاہیے کہ وہ اپنی کتابوں کا اشتہار ایسا بے معنی اور لغو نہ چھپوائیں کہ خریداروں سے سخت ندامت اٹھانی پڑے اور زمانۂ آیندہ میں نیک نامی کی جگہ بدنامی ہو۔ اشتہار نویسی آسان نہیں ہے۔ اس کو اس طرح لکھنا چاہیے کہ جمہور انام کو اس سے فائدہ پہنچے، نہ یہ کہ نقصان۔ ہم کو بڑی خوشی ہے کہ دیسی زبان کے اخباروں میں اشتہاروں کا رواج روز بہ روز زیادہ ہوتا جاتا ہے، مگر افسوس ہے کہ اکثر اشتہاروں کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اس لیے تجارت کو، جس کی جان اشتہار ہے، جیسا فائدہ پہنچنا چاہیے، نہیں پہنچتا۔ ہم کو ابھی اشتہاروں کے لکھنے کا سلیقہ نہیں آیا۔ نہ ہم ان کی عبارت میں سچے گل پھول لگا سکتے ہیں، نہ ان کی تصویریں اشتہاروں کی پیشانی پر بنا سکتے ہیں، جیسی کہ مہذّب ملکوں میں بنائی جاتی ہیں۔ خالی لفظوں کی طمطراق دکھاتے ہیں جو تصویر کے بغیر پھیکی اور بے لطف معلوم ہوتی ہے۔ کوئی مضمون دلچسپ اشتہار کے ساتھ ایسا نہیں لکھ سکتے کہ جس سے خریداروں کے دلوں میں شوقِ خریداری پیدا ہو۔ عوام الناس کو یہ اشتہار ایسی چھوٹی چھوٹی خبروں سے زیادہ فائدہ پہنچاتے ہیں کہ پشور میں دو گدھیا چوری گئیں، لکھنو میں ایک سپاہی پلٹن سے بھاگ گیا۔

۱۷۶۔ کاموں کے گھنٹوں کا اختلاف

تمام جانوروں کو دیکھو تو وہ اپنے کام معمولی وقت پر ہمیشہ

کرتے ہیں اور بڑے اپنے اوقات کے پابند ہوتے ہیں - مرغ صبح ہی اٹھ کر اذان دیتا ہے - درختوں پر چہچہانے والے پرندے صبح ہی کے وقت ہمیشہ سے بولتے چلے آئے ہیں اور بولتے چلے جائیں گے - غرض جانور اپنے تمام کاموں میں باقاعدہ ہوتے ہیں - جب سے دنیا ہے اور جب تک رہے گی ، وہ سب کام اپنے باقاعدہ ہی کیا کریں گے - مگر انسان کی ایجادوں کو دیکھو کہ وہ اپنے کاموں کے قاعدوں اور وقتوں کو کیسا بدلتا رہتا ہے - بہت سے آدمیوں نے رات کو ، جو آسائش و آرام کے لیے بنائی گئی ہے ، دن بنا رکھا ہے - وہ سارے کام رات ہی کو کرتے ہیں - دن کو سوتے ہیں - اپنے تئیں آدمی سے اُلّو چمگادڑ بنا لیا ہے کہ کبھی صبح کو آفتاب طلوع ہوتے دیکھتے ہی نہیں - ان کو آفتاب کی روشنی سے زیادہ شمع اور چراغ کی روشنی پسند ہے -

اگر آدمی کو اپنی تندرستی رکھنی منظور ہو تو وہ اپنے سارے کام دن کو کیا کرے ، رات کو چپ چاپ پڑ کر سو رہے - شب کو برے بخارات زمین سے اٹھ کر پھیلتے ہیں جن کے دفع و مغلوب کرنے کے واسطے آفتاب نہیں موجود ہوتا - جب آدمی رات کو سو کر صبح اٹھتا ہے تو وہ تازہ دم ہوتا ہے - ساری دنیا کو تاریکی سے روشنی میں نکلتے ہوئے دیکھتا ہے - اُس وقت ایک خدا کی قدرت کا جلوہ پیشِ نظر ہوتا ہے - صبح ہی کو انسان کے تمام قُوائے ظاہری اور باطنی تر و تازہ ہوتے ہیں - کام جیسا اچھا اس وقت ہو سکتا ہے ایسا کسی اور وقت نہیں ہو سکتا - گویا صبح انسان کے قُوا کی نوجوانی کا وقت ہوتا ، جس میں قوّت ، بل سب وقت سے زیادہ ہوتا ہے - پھولوں کی بہار سے فرحت ہوتی ہے ، جانوروں کے چہچہانے کی آوازوں سے دل خوش ہوتا ہے - یہ خوبیاں کسی اور وقت میں نہیں ہوتیں -

پس جو ایسے وقت سوتے ہیں وہ اپنی خوشی کو کھوتے ہیں -

۱۷۷- شکایت کی مختلف صورتیں - ان کا بیان بطورِ تمثیل

دنیا میں شکایت کرنے والے آدمی بہت سے ہیں - ہر شخص کو کسی نہ کسی بات کی شکایت ہوتی ہے - یہ کیسی تعجب کی بات ہے کہ انسان نے ہر چیز سے اپنے خیالی رنج پیدا کر لیے ہیں - زمین، مکانات، مویشی، بیل، بھیڑ وغیرہ انسانوں کی خوشی کے واسطے بنے ہیں، مگر ان سے اپنے لیے کتنے رنج اس نے پیدا کر لیے ہیں - عوام الناس کو ایسے رنج ہوتے تو تعجب کی بات نہ ہوتی، مگر تعجب تو یہ ہے کہ خواص کے پیچھے بھی یہ بلا لگی ہوئی ہے - ایک مصنّف اس رنج میں بیٹھا ہے کہ ایک شخص نے، جس کو وہ بڑا کودن جانتا تھا، اس کی تصنیفات پر اعتراض جڑ دیے - ایک جواں مرد اس پر خفا ہو رہا ہے کہ بازار میں لوگوں نے کھڑے ہو کر جھک کے اسے سلام نہیں کیا - پھر خوشیاں ہیں تو ایسی ہیچ پوچ کہ آج ہمارا گھوڑا بازار میں خوب ناچا کودا تھا - سارے میلے میں جیسی ہمارے سر پر شوخ رنگ کی پگڑی تھی، دوسرے کے پاس نہ تھی - ہماری رتھ پر کلسہ خوب چمکتا تھا، اس کی[1] جھنک کی آواز کوسوں جاتی تھی - غرض ایسی بیہودہ خوشیاں اور رنج بے شمار ہیں جن کا بیان نہیں ہو سکتا - رنج کا اندازہ خود رنج سے نہیں ہو سکتا بلکہ رنجیدہ خاطر کی طبیعت سے ہو سکتا ہے کہ وہ اس کو بڑا سمجھتا تھا یا چھوٹا - میں اس مضمون کو بطورِ تمثیل نیچے بیان کرتا ہوں -

---

۱- اصل : اُس کے جھنک -

میں اپنی آرام چوکی پر ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ اس میں یہ ایک فقرہ میرے مطالعے میں آیا کہ جیوپیٹر کے[1] پاس دو بڑے برتن تھے ؛ ایک میں خوشیاں دوسرے میں رنج بھرے ہوئے تھے ۔ ان دونوں کو ملا کر ہر انسان کو ، جو دنیا میں آتا ، وہ دے دیتا ۔ اس فقرے کو پڑھ کر میں ایسا خوش ہوا کہ مجھے نیند آ گئی اور میں نے یہ خواب دیکھا کہ جب جیوپیٹر نے سلطنتِ عالم کی عنان ہاتھ میں لی اور تخت پر جلوس فرمایا تو مخلوق کے ہر حصّے نے اپنے اپنے دیوتا کی معرفت تحفے نذر کے لیے بھیجے ۔ ایک نے ہواؤں کی بہار ، دوسرے نے اولوں کے خزانے ، تیسرے نے کڑک گرج کا انبار ، ستاروں نے اپنی تاثیرات ، زمین نے میوے ، آفتاب نے موسم ، قسمت نے آگے قدم بڑھا کے تخت کے دونوں طرف دائیں بائیں دو برتن رکھ دیے جن میں سے ایک کے اندر خوشیاں تھیں ، دوسرے میں رنج ۔ ابتدائے سلطنت میں جیوپیٹر نے دیکھا کہ دنیا میں بدکاری اور گنہ گاری ایسی پھیلی ہے جیسی کہ اس زمانے میں ، تو اس نے پہلے برتن میں سے خوشیوں کو لے کر انسانوں میں پھیلایا ۔ مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ انسان نے اپنے دامن پر گناہ کا غبار جمایا ، پیرہن میں بدی کا داغ لگایا ، تو اس نے دوسرے[2] ظرف میں سے یہ مصائب انسان پر آنڈیل دیے : رنج ، افلاس ، لڑائی ، بیماری ، حسد ، جھوٹ ، ناوقت موت ۔ اس پر بھی اس نے یہی دیکھا کہ انسان تو بالکل گناہوں میں ڈوب ہی گیا ، تو اس نے یہ چاہا کہ میں ساری نوعِ بشر کو غارت ہی کر دوں ۔ تو اس نے قسمت کو حکم دیا کہ تو نے جو خوشیاں دنیا میں بنی آدم کو دے کر ضائع کی ہیں ، ان کو پھر وہاں سے لا کر

۱- "کے" اضافۂ مرتّب ۔ ۲- اصل : دوسری ظرف ۔

جمع کرتی رہو ، یہاں[۱] تک کہ دنیا نیک مخلوق سے آباد ہو ۔ اس حکم کے سنتے ہی تین بہنیں دنیا میں آتریں تا کہ زمین پر سے خوشیاں ، جو ضائع ہو رہی تھیں ، اکٹھا کر لے جائیں ۔ مگر یہ کام ایسا دشوار نکلا جس کا ان کو سان گمان بھی نہیں تھا ۔ سب سے پہلے وہ شہروں محلوں اور بازاروں میں گئیں جہاں اُنھوں نے خیال کیا تھا کہ بہت آسانی سے وہاں خوشیوں کو جمع کر لیں گی ۔ مگر برخلاف اپنی امید کے وہاں خوشیوں کی جگہ بائیں طرف کے ظرف میں یہ رنج دیکھے : حسد ، حسرت ، بےآرامی ، مایوسی اور ایسے اور غم ۔ برخلاف اس کے اس پر اَور ان کو زیادہ حیرت ہوئی کہ جھوپڑوں ، گپھاؤں[۲] ، ویرانیوں میں یہ اصلی خوشیاں دیکھیں : قناعت ، زندہ دلی ، تندرستی ، بےگناہی ۔ اب یہاں سے زیادہ اور مایوسی آگے اپنے کام کرنے میں یہ ہوئی کہ انھوں نے دیکھا کہ بہت سی خوشیوں کا تنزّل ایسا ہو گیا ہے کہ وہ رنج بن گئی ہیں ۔ اور بہت سے رنج ایسے مروج ہیں کہ وہ خوشیاں ہوگئے ہیں ۔ جو دانش مندوں کے حصے میں رنج آئے تھے وہ تو خوشی بن گئے ہیں اور احمقوں کے ہاتھ میں جو خوشیاں آئی تھیں وہ رنج ہو گئی ہیں ۔

بعض آدمیوں نے حکومت ایسی گستاخیوں اور بےباکیوں سے چھٹ کر حاصل کی کہ وہ عذابِ جاں ان کے لیے ہوگئی ۔ نوجوانی میں بےاعتدالیوں کے سبب سے بیماریوں نے انھیں وہ گھیرا کہ بوڑھوں سے بدتر وہ ہو گئے ۔ دولت کے حاصل ہونے سے وہ حرص بڑھی کہ افلاس کے برابر دولتِ دنیوی رنج پہنچانے لگی ۔ برخلاف اس کے انھوں نے دیکھا کہ لوگوں کی مستقل مزاجی سے رنج بڑی شان دار خوشیاں

۱۔ اصل : جب تک کہ ۔ ۲۔ اصل : گپھوں ۔

بن گئے[1] - قناعت نے افلاس کا ستیاناس ملایا ، بدصورتی کو نیکی نے خوبصورت بنایا - غرض خوشیوں کا حال تو ایسا ہوا جیسے کہ نہایت لذیذ میووں کے بیج خراب زمین میں بوئے جائیں جن کا بتدریج ایسا تنزّل ہو کہ وہ بے مزہ ، پھیکے ، دیر ہضم ہو جائیں - اور رنجوں کا حال اُن بے لذّت میووں کا سا ہوا کہ جو اچھی زمین میں بوئے جائیں اور ان میں ایسی قلمیں لگائی جائیں اور ایسی چھانٹ کی جائے کہ جن سے وہ خوش ذائقہ ہو جائیں - اب تیسری اَور یہ صورت اُن کو پیش آئی کہ جس[2] سے وہ تینوں بہنیں بہت متحیّر ہوئیں کہ انھوں نے بہت سے رنج و خوشیاں پہلے ایسی دیکھیں جو اُن ظرفوں میں نہ تھیں جو جیوپیٹر کے تخت کے گرد رکھے ہوئے تھے - غرض یہ فضول رنج و راحت تھے جو یدِ قدرت[3] نے نہیں بنائے تھے بلکہ انسانیت نے اپنے خیالات اور طبیعت سے ایجاد کیے تھے - تفصیل ان کی یہ ہے کہ لباس ، القاب ، خطاب ، مکانات ، جلو کا اسباب ، جھوٹی شرم ، ناحق کا خوف اور اسی[4] طرح کی باتیں جو پوچ خیال اور تُنک ظرفوں کے تصوّرات میں پیدا ہوں -

غرض جب یہ دشواریاں اور دقّتیں دیکھیں تو انھوں نے جان لیا کہ جیوپیٹر کے حکم کی بجا آوری محال ہے ، اس لیے انھوں نے رنج اور خوشیوں کو سمیٹ سماٹ ملاجلا کر ایک ظرف میں بھرا اور لے جا کر جیوپیٹر کے قدموں تلے رکھ دیا - بڑی بہن نے آگے قدم بڑھا کر جو حال تھا ، وہ عرض کیا کہ ہم نے انسانوں کے رنج و راحت کو ملا جلا کر اس ظرف میں جمع کیا - یہ تیری ہی عقل ہے

۱- اصل : خوشیاں بن گئی -
۲- اصل : جن سے -
۳- یدِ قدرت : قدرت کا ہاتھ -
۴- اصل : ایسی طرح کی باتیں -

کہ ان کو جدا کر لے اور پھر انسانوں میں ان کو الگ الگ تقسیم کر دے ۔ تُو ہی اس بات کو جان سکتا ہے کہ انسان کو کس موقع پر رنج دینا چاہیے اور کس موقع پر خوشی ، اور کیونکر ان کے دلوں میں یہ تیری عطا رنج یا راحت پہنچائے گی ۔

۱۷۸- اخباروں کے ایڈیٹروں[۱] کے نام خطوط

اخباروں کے ایڈیٹروں کے نام جو آن کے اپنے ملک کے چاروں طرف سے اور غیر ملکوں سے خطوں کے طومار کے طومار آتے ہیں ، ایڈیٹر انھی سے اندازہ کرتا ہے کہ میری شہرت کہاں کہاں پھیلی ہوئی ہے ۔ اس خیال سے وہ خوش ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ میری برابر کوئی ڈاک خانے کی آمدنی بڑھانے والا نہیں ۔ ان خطوں کے مضامین کا ایک عجیب عالم[۲] ہوتا ہے کہ جس کی برابر شاید کسی مکتوب الیہ کے پاس ایسے مختلف مضامین کے خطوط آتے ہوں گے ۔ ان کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی شہر میں ، ایک ہی ملک میں کیسے آدمی مختلف مذاق کے رہتے ہیں ۔ ایک ایڈیٹر کو صلاح دیتا ہے کہ تم ہمیشہ متانت و سنجیدگی سے مضامین لکھا کرو ۔ دوسرا ہدایت کرتا ہے کہ تم ہمیشہ ظرافت و لطیفہ سنجی کے مضامین تحریر کیا کرو ، اس کے بغیر اخبار پھیکا ہوتا ہے ۔ تیسرا فرماتا ہے کہ جاگنے کی نسبت سویا زیادہ کیجیے ؛ جو آپ نے اپنے خواب لکھے ہیں ،

۱- اصل میں ہر جگہ ''ایڈیٹر'' کا املا ''اڈیٹر'' ہے ۔

۲- اصل میں عبارت یوں تھی : ''ان خطوں کے مضامین عجب ایک ست نجا ہوتا ہے ۔'' اس جملے کا ایک لفظ غالباً کاتب صاحب سے درست نہیں پڑھا گیا جس کی بجائے اُس نے ایک مہمل لفظ ''ست نجا'' لکھ دیا ۔ مرتّب نے قیاساً جملے کو موجودہ شکل دی ۔

اُن میں زیادہ لطف آپ کی بیداری کے مضامین سے آتا ہے ۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ رات بھر آسمان سے آنکھوں کو لگائے رکھیے اور نجوم کے مضامین لکھا کیجیے ، جس سے لوگوں کو معلوم ہو کہ آیندہ کیا ہونے والا ہے ۔ کوئی شکریہ ادا کرتا ہے کہ آپ نے متقدمین کے کلام کا خوب لُبِّ لُباب انتخاب کیا ہے ۔ کوئی تعریف کرتا ہے کہ آپ نے مُردوں کی تصنیفات کی نکتہ چینی اور زندوں کی تصنیفات کی نکتہ چینی خوب کی ہے ۔

اخبار نویسوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اخبار میں عنوان ایسے رکھیں کہ سب لوگ اپنے خطوں کی تحریر کے موافق مضامین ان میں دیکھ لیا کریں اور اُن کو پڑھ کر خوش ہو جایا کریں ۔ زیادہ تر جو خط آتے ہیں ، ان میں یہ دو بڑے مضمون ہوتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب کا اتفاق اس بات پر ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کی ہجو اور اپنی اور اپنے دوستوں کی مدح زیادہ اخباروں میں مشتہر کیا چاہتے ہیں ۔ ہجو کے مضامین کو تو پڑھ کر ایسے خوش ہوتے ہیں کہ پُھولے نہیں سماتے اور جانتے ہیں کہ ہم نے اخبار کے دام بھر پائے ۔ اگر اُن کی مدح کے خطوط نہ چھاپیے تو پھر بعض اُن میں سے یہ ٹیڑھے خط لکھ بھیجتے ہیں کہ جن کی پیشانی پر الف کی جگہ لاف کاف ہوتا ہے ۔ لکھتے ہیں کہ اے ملعون کتّے ! تُو نے کیوں ہمارا خط نہیں چھاپا ، کیا تیرا مغز چل گیا ہے ؟ غرض جب ایڈیٹر اپنی ڈاک کو کھول کر پڑھتا ہے تو بعض خطوں سے خوش ہوتا ہے ، بعض سے ملول ۔ جن کے سبب سے وہ غرور و پندار ، جو تعریف کے خطوں سے پیدا ہوا تھا ، کم ہو جاتا ہے ۔

رومیوں کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی نامور فتح یاب ہوتا تو اس کے جواں مردانہ کاموں کے ساتھ اس کی برائیاں بھی بیان کر دیتے

تھے ، جن سے اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں آدمی عاجز و ناتواں ہوں ، دیوتا نہیں بن گیا ۔ پس ایڈیٹر اخبار ایسے خطوں کے ممنون ہوں کہ انھوں نے نخوت کی بلا سے انھیں بچایا ۔ عیبوں اور نقصوں پر مطلع کیا ۔ خوشامدیوں کی خوشامد پر اُبھرنے سے روکا ۔ انھوں نے متنبّہ کیا کہ اپنے کاموں کو احتیاط سے کرو اور اَوروں کے کاموں کا حال نہایت ہوشیاری سے لکھو کہ جس کے سبب سے ان پر اعتراض نہ ہوں ۔ بعض کاتب خطوں میں گالیوں سے بڑھ کر ایسی دھمکی کے خط لکھ دیتے ہیں کہ اگر آیندہ ایسا اخبار میں لکھو گے یا اس ہماری تحریر کو نہیں چھاپو گے تو ہم تمھاری خوب خدمت کریں گے اور چہرے پر سے ناک اُڑا کر تم کو نکٹا بنا دیں گے ۔ اگر ایڈیٹر میں جواں مردی نہیں ہوتی تو وہ گھر میں چپکا ہو بیٹھتا ہے ، یا پہرہ ساتھ لے کر چلتا پھرتا ہے اور اپنا کام چھوڑ دیتا ہے ۔

بعض دفعہ خطوں میں ایڈیٹر کے ذاتی عیب ہی نہیں بیان کرتے بلکہ اس کے باپ دادا کی سات پیڑھی میں جو کوئی نقص و عیب ہوتا ہے ، اُسے لکھ کر بھیج دیتے ہیں ۔ غرض ایسے خطوط بڑے جانکاہ اور دل‌آزار ہوتے ہیں ۔ یہی حال مصنّفوں کا ہے کہ ان کی کتابوں کی نسبت لوگ مختلف خطوط تحریر کرتے ہیں ۔ اس ملک میں یہ شیوہ ہر شہر میں دس پانچ آدمیوں نے اختیار کر رکھا ہے کہ وہ اخباروں کے کارسپانڈنٹ[1] بنتے ہیں ۔ ہر ہفتے میں کاغذ کے[2] دونوں طرف اناپ شناپ ، اپنے کسی مخالف کے ذمے تہمت ، بہتان ، افترا باندھ کر بیرنگ ایڈیٹر کے[3] پاس بھیج دیا ۔ اکثر ہوشیار ایڈیٹر ایسے

۱۔ کارسپانڈنٹ = نمایندے ، کارکن ۔

۲۔ اصل : کاغذ کو دونوں طرف ۔

۳۔ اصل : ایڈیٹر پاس ۔ "کے" اضافہ مرتّب ۔

خطوں کو واپس کر دیتے ہیں ، اور اشتہار دے دیتے ہیں کہ ہم کوئی بیرنگ خط نہیں لیں گے -

۱۷۹- ناٹک

ناٹک سے جیسا یہ علم دل پر منقّش ہوتا ہے کہ انسان میں کون کون سی باتیں مفید اور عظیم الشان ہیں اور ان کا ظہور کس طرح ہوتا ہے ، وہ نہ شاعروں کی سحربیانی سے ، نہ واعظوں کے مواعظ سے ، نہ حکما کی دلائل اور براہین سے حاصل ہوتا ہے - جیسے وحشی ، جاہل آدمیوں پر بے مثل اثر سزا اور تعزیر کے دکھانے سے ہوتا ہے ، اسی طرح تعلیم یافتہ اہلِ علم کے دل پر انسانیت کا اثر ناٹک میں اہلِ کمالات کے کمال دیکھنے سے ہوتا ہے - اس کے واسطے یہ ضروری ہے کہ ناٹک کرنے والوں میں یہ خوبیاں ہوں[1] کہ آواز خوش ، قد و قامت موزوں ، حرکات ملائم ہوں - جو کام وہ کریں ، یہ معلوم ہو کہ اصل حقیقت میں اس کا کرنے والا ہی[2] کر رہا ہے ، یعنی نقل کو اصل کر کے دکھاویں - اس ناٹک نے جو نیکیاں انسانوں میں پیدا کی ہیں ، وہ کسی اور انسان کی ایجاد نے نہیں کیں - یہ رائے ناٹک پسند کرنے والوں کی ہے - اس ملک میں جو انگریزی ناٹکوں کی تقلید میں ناٹک شروع ہوا ہے ، اس کا اثر اب تک کوئی نیک دیکھنے میں نہیں آیا بلکہ اس سے بھی کچھ برائیاں ہی پھیلی ہیں -

۱۸۰- زمینداروں کی شرافت

انسان بڑی غلطیاں اِس سبب سے کرتا ہے کہ وہ اشیا اور

۱- "ہوں" اضافۂ مرتّب -   ۲- "ہی" اضافۂ مرتّب -

اشخاص میں تمیز نہیں کرتا ۔ اسٹامپ کے کاغذ کے چند تختے ، جن کے اوپر کچھری کی مُہر اور حاکم کے دستخط ہوں ، دولت مند گھروں میں جائداد کے وارث بننے کے لیے کافی ہوتے ہیں ۔ مگر کوئی شخص کسی جائداد کا مالک نہیں کہلا سکتا جب تک وہ اس سے کوئی احتظاظ اور تمتّع نہ حاصل کرے ۔ جو مالکِ زمین ناشائستہ ہوگا اس کی زمین اُفتادہ رہے گی ۔ پس جو زمیندار کہ جائداد رکھتا ہے وہ محافظِ جائداد ہے ۔ اگر وہ مالک بننا چاہتا ہے تو اس کو اشراف بننا چاہیے ۔ اشرافانہ مالک بننے سے جائداد سے روحانی انبساط حاصل ہوتی ہے اور محافظِ جائداد ہونے سے پیٹ پلتا ہے ۔ محافظِ جائداد کا کام تو فقط بسیار خوری[1] اور لڑائی جھگڑے ، عدالت میں مقدمے بازی ہے ۔ اور اشراف مالکِ جائداد کا کام فیّاضی ، خوش خُلقی ، حسنِ سلوک ، نِکوکاری ، تمام حقوقِ انسانی کا ادا کرنا ۔ جو شخص اپنے ملک سے محبت رکھتا ہے ، وہ جب دیکھتا ہے کہ میرے ملک کا بڑا حصہ ایسے[2] زمینداروں کے قبضے میں ہے کہ جو جائداد سے متمتّع نہیں ہوتے ، سوائے ظلم و ستم کے کچھ اَور نہیں کرتے ، اپنی آزادی کو بُرے[3] طور سے کام میں لاتے ہیں ، تو وہ اِس کو بہتر جانے گا کہ کوئی اس کے ملک کو دوسرا فتح کر لے ۔ جو زمیندار اشراف ہے وہ تو اپنے گاؤں یا قصبے میں اِس طرح رہتا ہے جیسے کہ فردوس میں ۔ اور جو اشراف نہیں ہے ، گنوار ہے ، وہ اپنے جذباتِ نفسانی کو کام میں لاتا ہے اور لوگوں کو ستاتا ہے اور فساد مچاتا ہے ۔ اس کے واسطے گاؤں یا قصبہ ، جس میں رہتا ہے ، جہنّم

١۔ اصل : بسیاری خواری ۔ ٢۔ "ایسے" اضافہ مرتّب ۔

٣۔ اصل : بری طور سے ۔

ہے ۔ صبح اُٹھ کر اُس پر لوگ لعنت بھیجتے ہیں اور اس کی زمینداری چھننے کی دعا مانگتے ہیں ۔

کوئی عمدہ خصلت دہاتی یا قصباتی اشراف کی برابر نہیں ہو سکتی جو یہ جانتا ہے کہ مجھے خدا نے یہ جائداد اس لیے دی ہے کہ میں اپنی رعیّت کا مائی باپ بنوں ، اپنے ہمسایوں کے ساتھ مربیّانہ نیک سلوک کروں اور اپنے سے چھوٹوں پر زیادہ تر بزرگی اپنی فیّاضی سے پاؤں ، نہ اپنی جائداد کی بڑھوتری سے ۔ وہ اپنے وقت کو خلوت و جلوت میں اِس طرح بانٹتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں ۔ وہ اپنی ساری زندگی نیک کاموں کے لیے وقف کر دیتا ہے ۔ وہ مظلوموں کا حامی ، کمزوروں کا محافظ ، جھگڑالوؤں کا بیچ بچاؤ کرنے والا ، سب کا دوست ہوتا ہے ۔ جو جاہل ، کم فہم ، سادہ لوح اس کے ماتحت رہتے ہیں اُن کی تائید میں وہ اپنے علم و مشورہ کو صرف کرتا ہے ، اور جو اس کی برابر کے دوست ہوتے ہیں اُن کی دعوتیں کرتا ہے ۔ ان کو خوش[1] کرنے میں سعی کرتا ہے ۔ پس جو زمیندار ایسی خوش حالی میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے ، اس کو وہ خوشیاں حاصل ہوتی ہیں جو شاعرانہ خوش بیانی اور عارفانہ خلوت اور حکیمانہ عزلت کی مسرّتوں سے بھی زیادہ ہوتی ہیں ۔ دریاؤں کے کنارے پر وہ کھڑا رہ کر سبزہ و پانی کی سیر کرتا ہے ۔ درختوں کے گھن کے سایے میں چلتا ہے جس میں طرح طرح کی بہاریں نظر آتی ہیں ۔ سورج کی جب روشنی چمکتی ہے تو وہ ساری قدرت کی چیزوں کو چمکتی ہوئی دیکھتا ہے ، جس میں اپنے تئیں زیادہ خوش سمجھتا ہے ۔ اس لیے کہ وہ ان سب چیزوں سے حظ اٹھاتا ہے ۔

١- اصل : ان کی خوشی کرنے میں سعی کرتا ہے ۔

۱۸۱- انسان کی زندگی کے حالات

اُن لوگوں نے دنیا کی بڑی خدمت گزاری کی جو یہ بتلا گئے کہ جن راہوں اور طریقوں پر ہم چلے ہیں ، ان میں تجربے نے یہ برائیاں اور بھلائیاں ہم کو بتلائی ہیں - سینیکا ایک بڑا رومی حکیم ہے- وہ یہ لکھتا ہے کہ[۱] لوگوں کو اِس پر یقین نہیں ہوتا کہ ہماری خوشی اور چین و آرام کے واسطے یہ امر کیسا زبوں ہے کہ ہم اپنے دل کو اُن چیزوں پر لگائیں جو دولت سے حاصل ہوتی ہوں - جانوروں کے واسطے تو یہ عذر ہے کہ ان کو عقل نہیں جو وہ دانے کے لیے دام میں پھنستے ہیں ، مگر دانش مند کیوں دولت ، شان و شوکت ، حکومت کے جال میں پھنسیں - سب سے زیادہ انسان کی کوشش خورش و پوشش کی چیزوں کے حاصل کرنے میں ہوتی ہے - اگر ہم اپنے جسم کو ناز و نعمت سے پالیں اور اپنی شہواتِ نفسانی کی باگ کو نہ روکیں تو پھر دل کا اختیار جسم پر سے بالکل اٹھ جاتا ہے - پس آدمی کو اس سے زیادہ خیال کرنا نہیں چاہیے کہ بقدرِ ضرورت پیٹ کو بھر لے ، پیاس بجھا لے ، بدن کو ڈھک لے ، گرمی سردی سے بچا لے - سوائے ازیں ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ ساری چیزیں اس قابل نہیں ہیں کہ ہم ان کے لیے فکر و تردّد کریں -

تھوڑا چاہنا حقیقت میں سچّی بزرگی ہے - تھوڑی چیز بزرگ آمنشوں کے نزدیک بہت ہوتی ہے - پس جو بزرگ اس طرح کے خیالات ترک کر کے تارک الدنیا ہوتے ہیں ، وہ عروسِ دولت کی ادا کو پسند نہیں کرتے - اس کی مہربانی و نا مہربانی دونوں کو ذلیل جانتے ہیں - گو اس طرح سے لوگ تارک الدنیا ہو جاتے ہیں اور دنیا کے

۱- اصل : کہ گو لوگوں کو -

کاموں کی تجارت کو چھوڑ دیتے ہیں مگر وہ اہلِ دنیا کو اس طرح فائدہ پہنچاتے ہیں کہ وہ اپنے مطالعے اور تصنیفات سے ان کو ہدایت کرتے ہیں کہ دنیا کی جن چیزوں کے حاصل کرنے میں تم بڑے سرگرم ہو اور محنت مشقّت سے حاصل کرتے ہو، ان کو بہت کم قیمت جانو۔ ایسے آدمی بڑے کاہل سمجھے جاتے ہیں مگر وہ بڑے کام کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ تمام چیزوں کو جو خدا اور انسان سے متعلق ہیں، اپنے خیال اور ذہن میں رکھتے ہیں۔ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ[1] جو عقلی روحانی اشیا ہمارے قبضے میں ہیں، وہی تو ہماری ہیں اور باقی اَور سب چیزیں ہمارے پاس مستعار ہیں۔

دولت جو چیزیں ہم کو دیتی ہے، وہ پھر لے لیتی ہے۔ اپنی چیز کسی کے پاس چھوڑنے کی نہیں۔ ان خیالات کو دل میں رکھ کر اگر کوئی دنیا کو دیکھے تو بالکل برعکس معاملات نظر آئیں گے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ دولت حاصل کرنے کی فکر میں ساری دنیا سرگرداں ہے۔ ہر ایک کو اس کی لَو لگی ہوئی ہے۔ ہر ایک کا طریقہ اس کے حاصل کرنے کا جدا ہے۔ بعض اس کے شوق میں بری طرح بیتاب ہیں۔ اس کے حاصل کرنے میں کسی بات کو ناجائز نہیں جانتے۔ بعض سلامت روی سے اس کی تحصیل کرتے ہیں۔ غرض سب اس کی خدمت، اپنے اوپر مہربان کرنے کے لیے، کرتے ہیں۔ اس کے مطیع بنانے کے واسطے غلامی پہلے اختیار کرتے ہیں۔ دولت کی آمید میں جو بیٹھے ہیں وہ اس پر بڑبڑا رہے ہیں اور جن کو حسبِ تمنّا حاصل ہو گئی ہے وہ اس کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔ جب وہ کسی کو اَوروں پر ترجیح دے کر پسند کرتی ہے تو اسے ہر

۱۔ ''کہ'' اضافہ مرتّب۔

شخص اندھا کہتا ہے - اور جب وہ اپنے تئیں پسند کرتی ہے تو اس کو اپنی لیاقت اور قابلیت پر محمول کرتا ہے[1] -

۱۸۲- جذباتِ نفسانی کی شرارت یا نفسِ امّارہ کی شامت

جب آدمی سنجیدگی کے ساتھ اپنی زندگی کے پچھلے کاموں پر غور کرتا ہے ، کہ کیا کیا کیے ہیں ، تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے برے کام اپنے جذباتِ نفسانی اور نفسِ امّارہ کے غلبے کے سبب سے کیے ہیں - اب تجربہ توبہ[2] کراتا ہے کہ آیندہ پھر ایسے غلط کام نہ کیے جائیں - مگر اس کے ارادے کے خلاف اس کی طبیعت پھر اس کو مغلوب کرتی ہے اور ویسے ہی کام پھر کراتی ہے - اور عقل اور طبیعت میں ایک جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے کہ کون ہم پر مسلّط ہو - اکثر ہم سے یہ جذبات دفعۃً بڑے زبوں اور زہریلے کام دوستوں کے ساتھ کراتے ہیں - ہم کو سخت حیرت ہوتی ہے کہ کیا ہم گھنٹہ بھر پہلے محبت ، شفقت ، عقل ، مذہب کے احکام کے محکوم تھے یا آن سے دفعۃً رشتہ تعلق توڑ کر ایسے سرکش ہوگئے کہ انسان سے حیوان بن گئے - نفسِ امّارہ نے وہ سر پر شیطان چڑھایا کہ کچھ سے کچھ اَور ہوگئے -

ہم اکثر لفظِ جذبہ کو[3] کام میں لاتے ہیں جس کے معنی عربی

۱- یعنی جب دولت کسی دوسرے کے پاس آ جاتی ہے تو لوگ اسے اندھا کہتے ہیں لیکن اگر یہی دولت خود اُن کے پاس آ جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی لیاقت اور قابلیت سے اسے حاصل کیا ہے -

۲- اصل : اب تو یہ تجربہ کراتا ہے -

۳- اصل : جذبے کا کام لاتے ہیں -

زبان میں غلبہ کرنے کے منازعت سخت میں اور کھینچنے کے ہیں - مگر وہ ایک انگریزی لفظ پیشن[1] کا ترجمہ کیا جاتا ہے جس کے معنی انگریزی زبان میں مختلف[2] آتے ہیں - مگر ہم نے جہاں اس کو لکھا ہے اس کے معنی یہ لیے ہیں کہ احساس[3] کی وہ حالت جو ایک اضطراب ایسا پیدا کرے کہ ہم اپنے تئیں ضبط نہ کر سکیں اور اپنے اختیار سے باہر ہو جائیں - غرض جذبہ عقل کا مقابلہ کرتا ہے - وہ دو طرح کے ہوتے ہیں : ایک جسمانی ، دوسرے روحانی -

۱۸۳- آسودہ حالوں کی زندگی

اس وقت ہم آسودہ حالوں کی زندگی کا ذکر باعتبار مذکّر و مؤنّث ہونے کے کرتے ہیں - بڑے آدمیوں کی زندگی کا بیان[4] اِس سبب سے اول کرتے ہیں کہ ان سے کمتر آدمیوں کے حال پر بھی قیاس ہو جائے گا - اس سبب سے گویا کُل انسانوں کا حال معلوم ہو جائے گا - بڑے آدمیوں کے ہاں لڑکیاں بہ نسبت لڑکوں کے زیادہ چین اور آرام سے رہتی ہیں - جس وقت لڑکیاں اپنے گھروں سے نکلتی ہیں اور اِدھر اُدھر پڑی پھرتی ہیں ، پھولوں کے درختوں سے دل بہلاتی ہیں ، اُس وقت ان کے بھائی مکتب میں استادوں کی نگاہوں کے نیچے بیٹھے ہوتے ہیں اور ان کے ایک ایک لفظ پر گرفت ہوتی ہے - استاد کی ہدایتوں کے بوجھ سے ان کی گردن جھکی جاتی ہے - جن باتوں کو

۱- Passion -

۲- اصل : جس کے معنی مختلف انگریزی زبان میں آتے ہیں -

۳- اصل : ہمارے احساس کی -

۴- اصل میں "بیان" کی بجائے "دھیان" چھپا ہے -

ان کی طبیعت چاہتی ہے وہ کر نہیں سکتے - جب لڑکیاں کچھ بڑی ہو جاتی ہیں تو ماں باپوں کی بڑی لاڈلی ہوتی ہیں - ان کی باتیں بڑی پیاری پیاری معلوم ہوتی ہیں - سارا گھر ان کو چاہتا ہے - ان کی صورت ، وضع ، انداز ، نیکی ، صفائی سے ماں باپوں کا دل ایسا خوش ہوتا ہے جیسا کہ بہشت سے ہوگا - اب اُن کے بھائیوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ان اصول کو سیکھ رہے ہیں کہ جن سے ان کو فائدے حاصل ہوں اور لوگ ان کی قدر کریں - اس آرزو میں کہ تعریف ہو ، وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں - اگر اس نوعمری میں ناموری اور شہرت کا شوق پیچھے پڑ گیا تو پھر بہت سے خوف آگے آتے ہیں -

جب لڑکیوں کی شادی ہو جاتی ہے تو فقط ان کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ خاوندوں کو اپنے تئیں پسند کرائیں ، خوب صورت بنائیں ، بچوں کی پرورش کریں ، نوکروں کے ساتھ خوش اخلاق برتیں - اب مرد اس حالت میں اپنے سب ارادوں کی تکمیل سے باز رہتا ہے - اس کو اَوروں کے لیے وہ کام کرنے پڑتے ہیں جو خود اپنے لیے وہ اپنے ذاتی معاملات میں محنت و کفایت کرتا ہے - سرکاری کاموں میں تن دہی اور دیانت کرتا ہے ، اپنی اَور لیاقتوں کو بھی سنبھالنا پڑتا ہے - اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ کاروبارِ خانگی ان میں خلل نہ ڈالیں - جیسی اس کو اپنی آسودہ حالی کے لیے جان کھپانی پڑتی تھی ، اس سے زیادہ اس کو اپنی اولاد کے لیے فکر کرنی پڑتی ہے -

خلاصہ سب کا یہ ہے کہ عورت کا کام یہ ہے کہ وہ پسندیدہ اور خوش کرنے والی ہو ، مرد کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے عاقل ہونے کا خیال رکھے - جو عورت و مرد ان کاموں کو چھوڑتے ہیں وہ اپنی زندگی کا اصل مقصد ہاتھ سے کھوتے ہیں - جو عورتیں تکلّف و وضع سے خوش کرنا چاہتی ہیں وہ لوگوں کو مکروہ معلوم ہوتی

ہیں ، اور جو مرد تصنّع سے اپنی عقل کو دکھاتے ہیں ان کی ہنسی ہوتی ہے - ایسی حالت میں یہ دونوں جھوٹی محنت کے جیل خانے میں اپنی غفلت سے قید ہوتے ہیں -

۱۸۴- مصیبت میں شجاعت

بعض آدمی ایسے بدمزاج ہوتے ہیں کہ جہاں ان پر ذرا سی مصیبت پڑی ، بیمار ہوئے ، آپے سے باہر ہوئے - کبھی گھر والوں کو برا کہتے ہیں ، کبھی کپڑے پھاڑتے ہیں ، کسی کو مارتے ہیں ، حکیم کو گالیاں دیتے ہیں - بعض وہ بہادر ، جواں مرد ، نیک مزاج ہوتے ہیں کہ خواہ وہ کیسے ہی سخت علیل ہوں اور اُن پر کیسی ہی بلا نازل ہو مگر کبھی اپنے منہ سے برا لفظ نہیں نکالتے اور ان کی حالت میں کوئی تغیّر نہیں ہوتا - وہ کسی طرح سے اپنے طیش و غضب کو جوش میں نہیں آنے دیتے - کبھی ان کی مستقل مزاجی متزلزل نہیں ہوتی -

پس جو شخص اس طرح اپنے مزاج کو قابو میں رکھتا ہے اور اپنے نفس پر قادر ہوتا ہے ، وہ بڑا صاحبِ کمال اور صاحبِ استقلال شجاع ہوتا ہے - ایسے کام گو اپنی کارروائی کے لیے ضروری ہوتے ہیں مگر اس سے اَوروں کی نظر میں بھی کمال وقعت اور عزت پیدا ہوتی ہے - یہ ادب اَوروں کے دلوں کو تسخیر کر لیتا ہے اور سب پر اپنا غلبہ رکھتا ہے - جہاں وہ ظاہر ہوتا ہے ، اس کی تقلید شرم سے یا رشک سے کرکے اس کا ادب لوگ کرنے لگتے ہیں - یہ وہ نیکی ہے جس کی ضرورت ہر ساعت میں ، ہر مقام پر ، ہر گفتگو میں پڑتی ہے - وہ پرلے درجے کی دانائی اور ہوشیاری باقاعدہ ہونے کا نتیجہ ہے - اگر آدمی اپنے تمام عمر کے واقف کاروں کو دیکھے تو اس کو

معلوم ہوگا کہ جو لوگ بڑے ضابط و مستقل مزاج تھے انھوں نے بھی بڑے بڑے کام اور خدمتیں کی ہیں ۔ جو اپنی[1] خواہش ہائے نفسانی کے غلام بن کے متلوّن مزاج تھے ، ان سے کوئی بڑا کام نہ ہو سکا ۔ جو نیک مزاج ، موم کی ناک تھے ، اُن سے کام وہی ہوتے ہیں جو بد مزاجوں سے ۔

خود آدمیوں پر خیال کرنا نہیں چاہیے بلکہ ان کے خصائل و افعال پر ۔ بعض آدمی پاک نہاد ہوتے ہیں مگر ایسے نرم مزاج ہوتے ہیں کہ وہ اپنی فیّاضی کو محدود نہیں رکھتے ہیں ، بلکہ عام کرکے سب کو خوش کرنا چاہتے ہیں ، مگر ان سے کوئی خوش نہیں ہوتا ۔ ان کے میلانِ طبع کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ وہ سب کو خوش کریں ۔ اس کے لیے وہ کچھ جھوٹ بھی نہیں بولتے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جن آدمیوں میں موجود ہوتے ہیں ، انھی کو خوش رکھتے ہیں ۔ جس مزاج کے سبب سے وہ ملاقات میں عمدہ ہیں ، خط و کتابت میں خراب ہیں ۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ جن آدمیوں کو ہم نہایت شیریں کلام دیکھتے ہیں وہ حکومت پا کر بڑے سخت دل ہو جاتے ہیں اور ان کی دوستی پر کچھ اعتبار نہیں ہوتا ۔ یہ بات کچھ ان کی اپنی بدمزاجی کے سبب سے نہیں پیدا ہوتی ، بلکہ ایسی نرم دلی کے سبب سے کہ وہ اَوروں کے کہنے پر[2] چلتے ہیں اور جو شخص اَوروں کے کہنے پر چلتا ہو وہ بڑا خوش نصیب ہو کہ بدمزاج نہ ہو جائے اور اچھی طرح زندگی بسر کرے ۔ غرض نرم مزاجی سے جو تلوّن پیدا ہوتا ہے ، وہ ہماری نیکی و بدی کو ایک کیے دیتا ہے ۔

۱- اصل : اپنے خواہش ہائے ۔   ۲- اصل : کہنے میں چلتے ہیں ۔

ایک شخص نے بڑے نیک نوجوان دولت مند کے متعلق[1] کہا کہ میں اس کے ہاتھ میں اپنا روپیہ اِس سبب سے نہ دوں گا کہ وہ اپنے روپے کو کسی سے دریغ نہیں رکھتا۔ اس کا قول تھا کہ معاملات میں محبت کو دخل دینا نہیں چاہیے بلکہ دوستوں سے بھی اجنبیوں کی طرح معاملہ کرنا چاہیے۔ جو مستقل مزاج اور شجاع ہوتے ہیں، ان کے اکثر کاموں میں ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی ذات کی محبت کو وہ گھٹاتے ہیں، جو نہایت مشکل کام ہے؛ کیونکہ اپنی ذات کی محبت انسان پر بڑا غلبہ رکھتی ہے۔ جب مستقل مزاجی آدمی کی مرضی کو عقل کا تابع بناتی ہے تو وہ خود خوب روشن ہوتی ہے اور آدمی خواہ کیسا ہی ادنیٰ درجے کا ہو، اس کو اعلیٰ درجے کا بنا دیتی ہے۔

مریض جو شدّتِ مرض میں استقلال کو ہاتھ سے نہیں دیتے ہیں، ان کی صورت خواہ کیسی ہی مرض سے قابلِ رحم ہو گئی ہو، لوگ بڑے ادب کی نگاہ سے انہیں دیکھتے ہیں اور ان کی صورت سے سمجھتے ہیں کہ اپنے تئیں خدا کی مرضی پر چھوڑ رکھا ہے۔ اِسی کو علمِ حکمت میں نفسِ امّارہ کا مغلوب کرنا کہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی اپنے اوپر آپ حکمران ہونا اور نفس کو زیرِ فرماں رکھنا تعریف کے قابل ہوتا ہے؛ کیونکہ اس حالت میں آدمی سب کام اپنی عقل کی اور اَور آدمیوں کی نیک عقلی کی پابندی سے کرتا ہے۔ مستقل مزاج آدمی سارے کام ایسے باقاعدہ اور باضابطہ کرتا ہے جیسے کہ کَل[2] اپنا کام کرتی ہے۔ اس کے دل

۱۔ اصل: دولت مند کو کہا۔ "کے متعلق" اضافہ مرتّب۔
۲۔ کَل = مشین۔

میں سب طرح کی خواہشیں پیدا ہوتی ہیں مگر کوئی اس پر غالب نہیں ہوتی - وہ کبھی گفتگو میں اپنی برتری اَوروں پر ثابت نہیں کرتا بلکہ برابری - وہ اپنے ذہنی دلائل سے لوگوں پر دباؤ نہیں ڈالتا - وہ اپنے سب کاموں میں کسی کا طرف دار نہیں ہوتا ، یہاں تک کہ اپنی نیک مزاجی کا بھی -

۱۸۵- تصنیفات کسی کے نام پر لکھنا

زمانۂ قدیم میں قاعدہ تھا کہ مصنّف اپنی تصنیفات کو سلاطین اور اُمرا کی نذر کیا کرتے تھے اور انھی کے نامِ نامی سے اپنی کتابوں کو زیب دیا کرتے تھے - یہ اُمرا اور سلاطین بھی مصنّفوں کی قدر و منزلت کیا کرتے تھے اور ان کی محنت کے عوضانہ[1] میں بڑے صلے اور انعام ملتے تھے - اس طرح دونوں کی یادگار ناموری کے ساتھ قائم رہتی تھی اور یوں اہلِ کرم و اہلِ فضل میں تجارت ہوتی تھی - ابتدا میں تصنیفات میں ناحق کی تعریفیں مصنّف نہیں بھرا کرتے تھے بلکہ جو قدرشناسی کا مقتضا ہوتا تھا ، اس کے موافق تعریف کیا کرتے تھے ، جس کو کتاب کا مربّی قبول کرتا تھا اور اَور[2] لوگ بھی اس کو حق جانتے تھے - مگر بعد ازاں مصنّفوں کی طرف سے[3] ممدوح کی مدح میں یاوہ گوئی کا ظہور ہونے لگا - اور اس کے کاموں کا بیان گو مضمونِ کتاب سے کچھ متعلق نہ ہو ، مبالغے کے ساتھ ہونے لگا - اس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ ہو گیا کہ ممدوح اور مدّاح دونوں کی ہنسی اُڑنے لگی - تعریف وہی ہے جو تعریف کے قابل آدمیوں کی کی جائے - اگر یہ نہ ہو تو پھر نیک نام

۱- اصل : عیوضانہ -
۲- ''اَور'' اضافۂ مرتّب -
۳- ''سے'' اضافۂ مرتّب -

اور بدنام دونوں مساوی ہو جاتے ہیں۔ غرض کچھ اس کام میں افراط و تفریط ایسی ہوئی کہ اب یورپ سے تو یہ رسم بالکل مفقود ہو گئی مگر ہاں ایشیا میں ابھی موجود ہے۔ مگر ہندوستان میں نہیں۔ کسی حاکم کو کوئی مصنّف اپنی کتاب نذر کرے تو کوئی صلہ اس کو نہیں ملتا۔ تصنیفات کو حکام سے کچھ تعلق ہی نہیں رہا ہے۔ صرف عوام کی قدرشناسی[1] مصنّف کا صلہ رہ گیا ہے۔

۱۸۶۔ عدالت

۱۔ عدالت اُن فضائلِ اربعہ میں سے ایک ہے، جن پر تمام اخلاق کی بنا رکھی گئی ہے۔ ارسطو اور سسرو اس کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ ہر شخص کو اُس کا اپنا حق دینا عدالت ہے۔ فیثاغورث اور افلاطون کہتے ہیں کہ عدالت میں کل فضائل شامل ہو جاتے ہیں۔ ایک عدالت یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے ساتھ فقط آدمی ہونے کے لحاظ سے کرے۔ دوسری یہ کہ اپنے گھر کے آدمیوں کے درمیان عدالت کرے۔ تیسری یہ کہ جمہور کے درمیان عدالت کرے۔ عدالت قانون میں نہیں ہوتی بلکہ ہمارے تصوّر میں جو حق کا خیال ہو۔ قانون کا عدل[2] اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ وہ اس خیالِ حق کی موافقت کرتا ہے۔ یہ کہنا کہ قانون ہی کے امر و نہی کا نام عدالت ہے اور اس کے سوائے عدالت کوئی چیز نہیں ہے، ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ دائرے کے نصف قطر آپس میں برابر جب تک نہیں ہوتے کہ محیط نہ

۱۔ اصل : عدم کی قدر شناسی صرف مصنّف۔
۲۔ اصل : قانون کا عدل و پر عدل۔

کھینچا جائے ۔

۲- ہم یہ تو اکثر لوگوں کے منہ سے سنتے ہیں کہ کام مصلحت کے موافق کرو ، یا اِس طرح کرو کہ منفعت ہو ، یا اس میں آسانی ہو ، یا نہایت عمدہ طرح سے ہو ۔ مگر یہ کبھی سننے میں نہیں آتا کہ کام اس طرح کرو کہ اس میں عدالت ہو ۔ عدالت سب نیکیوں کی بنیاد ہے ۔ پس جس نیکی کی بنیاد عدالت نہیں ، اُس کا قائم رہنا ایسا ہے جیسا کہ بالا خانے کا بغیر بنیاد کے ۔ شجاعت جب تک نیکی نہیں کہ اس میں عدالت نہ ہو ۔ چور ، رہزن بہت بہادریاں کرتے ہیں مگر اس سبب سے کہ اس کی بنا عدالت پر نہیں ہے ، وہ نیکی نہیں شمار ہوتی ۔ شجاعت فقط چہرے پر ظاہر ہو اور اس کے ساتھ دل میں عدالت کا خیال نہ ہو ، وہ فضیلت نہیں ۔ سخاوت نیکی نہیں جس میں عدالت نہ ہو ۔ عدالت تو اُس اعتدال کا نام ہے جس کو عقل تجویز کرتی ہے ۔ پس جس نیکی میں یہ اعتدال یعنی عدالت نہیں ، وہ نیکی نہیں ہے ۔

۳- عدالت کی برابر کوئی نیکی عظمت و شان نہیں رکھتی ۔ اس میں جو صفت خدا کی پائی جاتی ہے وہ کسی اور نیکی میں نہیں ہے ۔ اکثر اَور نیکیاں انسانوں کے مناسبِ حال بنائی گئی ہیں ، وہ مخلوق سے متعلق ہیں مگر عدالت خود خدائے تعالیٰ کرتا ہے ۔ کوئی اور اس کو تکمیل کے ساتھ نہیں کر سکتا ہے ۔ ہمہ جا و ہمہ وقت ہونا ، خیالات و اقوال و افعال میں جو راستی اور بدی ہو اس کے ہر ایک درجے کا معلوم ہو جانا ، پھر ان کا اندازہ کر کے سزا و جزا دینا عدالت کی تکمیل کے لیے ضروری ہے ۔ اور یہ صفات خدا کے ساتھ مخصوص ہیں ۔ اس لیے کوئی اور عدالت تکمیل کے ساتھ سوائے اس عالم الغیب کے نہیں کر سکتا ۔ عادلِ کامل ہونا

خدا ہی کی خاص صفت ہے - جس قدر انسان سے عدالت ہو سکے ، وہ اس کی شکوہ و عظمت ہے - جو آدمی انفصالِ حقوق کا اختیار ہاتھ میں رکھتے ہیں وہ گویا نائبِ خدا ہیں جو بدیوں کی تعزیر اور نیکیوں کی توقیر کرتے ہیں -

جب کسی قوم میں سے عدالت کا پاس و لحاظ جاتا رہتا ہے تو اس کا ادبار آ جاتا ہے - اس میں حاکم عادل نہیں ہوتے ، ظلم کرتے ہیں ، اور یہ ظلم اس قوم کو غارت و تباہ کر دیتا ہے - سلطنت کی بِنا عدالت پر ہوتی ہے - جب بنیاد نہیں تو مکان ہی نہیں ، عدالت نہیں تو سلطنت بھی نہیں - جو بادشاہ عدالت کرنے بیٹھیں ، وہ یہ جانیں کہ ہم تجارت کرنے بیٹھے ہیں - جتنی منفعت اٹھا سکیں ، اٹھائیں ، اور یہ نہ جانیں کہ خدا عادل ہے اور اس کے گماشتے ہم یہاں مقرر ہوئے ہیں - تو ضرور ایسی بلائیں ان پر نازل ہوں گی کہ ان کو خاک میں ملائیں گی - حکومت کی طمع ، غصّہ و انتقام کے جوش عدالت کو ضعیف کر دیتے ہیں مگر آخرِ کار عدالت ہی کو غلبہ رہتا ہے - اس کی میزان کے پلڑے برابر ہو کے اپنی ڈنڈی کے استحکام کو دکھاتے ہیں - عدالت آدمی کو رحم سے باز رہنے پر مجبور نہیں کرتی جس کے سبب سے کوئی عادل کو ظالم کہے - جو عادل عاقل ہے ، وہ جانتا ہے کہ انسان خطا و جرم کرنے میں کتنا اپنی طبیعت کے سبب سے مجبور ہے - وہ اس خیال کو اپنے ذہن میں عدالت کے لیے ملحوظ رکھتا ہے - جو وہ فتویٰ دیتا ہے اس میں رحم اور عدل دونوں شامل ہوتے ہیں ، کوئی سختی اور ظلم نہیں ہوتا -

۴- عدالت کا حال بجلی کا سا ہوتا ہے کہ وہ ڈراتی سب کو ہے مگر غارت بہت ہی تھوڑوں کو کرتی ہے -

۱۸۷۔ آتش بازی میں مظاہرِ قدرت

انسان کو بڑا شوق یہ لگا رہتا ہے کہ اِس عالم میں جو مظاہرِ قدرت و مناظرِ فطرت ہیں[1] ان کی نقل آتاروں ۔ چنانچہ اس نے بہت سی چیزوں کی نقل آتاری اور خوب آتاری ۔ چنانچہ وہ چھوٹا سا آسمان بناتا ہے اور اس میں گھنٹوں بادلوں کو کڑکاتا ہے ، اُن کی گرج سنواتا ہے ، بجلی کو چمکاتا ہے ، برف اولوں کا مینہ برساتا ہے ، مینہ کی جھڑی لگاتا ہے ۔ آتش بازی میں بھی وہ آسمان کا سماں دکھاتا ہے ۔ ستاروں کو دکھاتا ہے ، شہابِ ثاقب چھوڑتا ہے ، دھوؤں کے بادلوں کو چھاتا ہے ، قلموں اور ہوائیوں کو چھوڑ کر بروجِ آسمانی بناتا ہے ، شعلوں کے مینار چمکاتا ہے ۔ غرض آتش بازی بھی ایک عجیب الخلقت ہے جو رات کو بےشمار ستارے و پھول جنتی ہے ۔ گو بعض کفایت شعار ، مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ، آتش بازی سے دل جلائیں اور جلے پھپھولے پھوڑیں اور لال پیلے رنگ چہرے کے دکھائیں اور زبان سے فرمائیں کہ روپے میں آگ لگانے سے کیا فائدہ ، مگر آتش بازی سے زیادہ چیز اہلِ دانش کو یہ سبق پڑھانے والی نہیں کہ انسان اپنی قدرتِ صناعت کو خواہ کیسا ہی معراج پر پہنچائے مگر خدائے تعالیٰ کی قدرت کے سامنے اُس کی کچھ ہستی و حقیقت نہیں ۔ آتش بازی اپنے ستاروں میں خواہ کیسی ہی رنگ دکھائے مگر وہ آسمان کے ستاروں سے کیا نسبت رکھتی ہے ۔ صنّاعِ حقیقی کی قدرت بےانتہا ہے ۔ اس کے آگے انسان کی قدرت کا کوئی[2] وجود نہیں ۔ آتش بازی کی اصل و حقیقت کیا ہے ؟ جو ستارے

۱۔ اصل میں ''ہیں'' کی بجائے ''میں'' چھپا ہے ۔

۲۔ ''کوئی'' اضافۂ مرتّب ۔

روشن ہیں ، ان سے آتش بازی کے ستاروں کو کیا نسبت ہے؟ اگر آدمی کو تابشِ خرد منظور ہو تو اس آتش بازی سے سمجھ لے کہ خدا کی دانائی اور قدرت بے انتہا ہے ۔ انسان کی تمام دانائی و قدرت کی کچھ بھی حقیقت اس کے روبرو نہیں ہے ۔

۱۸۸۔ خدماتِ عظیم کے صلے و انعام

گو ہر قوم میں حسنِ خدماتِ ملکی کے صلے اور انعام دینے کے مختلف طریقے ہیں مگر تمام مدبّرانِ ملکی کے نزدیک یہ مسئلہ مسلّم ہے کہ جو اولو العزم ، عالی ہمّت ، والا نہمت اپنی قوم کی ایسی خدمت کرے جس سے ملک کی خوبیاں زیادہ ہو جائیں تو وہ احترام و اکرام کا مستحق ہے ۔ اور یہ اعزاز جس قدر کم خرچ ہو اسی قدر بالانشین مستحق کو کرتا ہے اور اس کے حق میں مفید ہوتا ہے ۔

رومیوں کا قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی بڑا اُولوالعزم ، عالی حوصلہ ، بزرگ منش خدماتِ ملکی بجا لاتا تو اس کے صلے میں اُسے[1] دولت اور جاگیریں دے کر ممتاز نہیں بناتے تھے بلکہ کسی درخت کے پتّوں کا ہار بنا کے گلے میں ڈال دیتے تھے ، یا کسی درخت کے پھول سر پر رکھ دیتے تھے ۔ مجلسوں میں کوئی خاص جگہ ان کے بیٹھنے کے واسطے مقرر کر دیتے تھے ۔ یہ مردانِ دلاور ان کم قیمت انعاموں کے واسطے اپنی جانیں لڑا دیتے تھے ۔ چینیوں کے ہاں حسنِ خدمات کے صلے کا ایک اور طریقہ تھا کہ مرنے کے بعد اُس شخص کو خطاب دیتے تھے جس نے اپنے ملک کی وفاداری اور بادشاہ کی خیرخواہی میں جان دے دی ۔ یہ انعام کا طریقہ ایسا تھا کہ آدمی

۱۔ ''اُسے'' اضافۂ مرتّب ۔

تادمِ مرگ ملک کی اور بادشاہ کی خدمت گزاری میں سعی کرنے سے باز نہ آتا تھا ۔ وہ جانتا تھا کہ میرے بعد میری اولاد کو عزّت و عظمت اس خطاب سے حاصل ہوگی ۔

انگریزوں کے ہاں انعام کا طریقہ ایک یہ تھا کہ جب مہمِ عظیم میں کامیابی و فتح یابی ہوتی تھی تو اس مہم کے نام کے تمغے بنائے جاتے تھے اور اُن افسروں اور سپاہیوں کو دیے جاتے تھے جنھوں نے اس مہم کو ختم کیا تھا ۔ رومیوں کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ ایسی مہمّات کے نام سے اپنے ملک میں سکّے جاری کیا کرتے تھے ۔ تمغوں سے ایسی شہرت اور ناموری نہیں ہو سکتی جیسی کہ سکّوں سے ۔ ان مہمّات کے سکّوں کو بہت عزیز رکھتے تھے ۔ ان سکّوں کا رواج پانا ہی اس مہم کی شان و عظمت کو بڑھاتا تھا ۔ ایشیا میں حسنِ خدمات کے صلے میں خطاب القاب کے ساتھ دولت و جاگیر دی جاتی تھی اور اب تک یہ طریقہ چلا آتا ہے ۔ ان کے ہاں نواب بے ملک اور راجہ بے راج کے نہیں بنائے جاتے ہیں ۔

۱۸۹- اہلِ خیال و اہلِ کار

یعنی

سوچنے والے اور کام کرنے والے

انسانوں کا بڑا حصّہ وہ ہے جو محسوسات سے محظوظ[۱] ہوتا ہے ۔ جو چیز کسی حِس کو اچھی لگے ، وہ اس کو اچھا جانتے ہیں ۔ تھوڑے ہی ایسے آدمی ہیں کہ عقل و قوّتِ فطری کے نزدیک جو چیز اچھی ہو ، اس سے محظوظ[۱] ہوں ۔ بعض کا یہ وحشیانہ خیال ہے

۱- اصل میں 'محفوظ' چھپا ہے ۔

کہ کام کرنے والے بہ نسبت سوچنے والے آدمیوں کے سوسائٹی کے حق میں زیادہ بکارآمد اور سودمند ہوتے ہیں اور سوچنے والوں کا فرقہ تو بےکار ہے - یہ رائے غلط ہے - سپہ سالار اور مدبّر جو ملکی اور جنگی خدمات بجا لاتے ہیں ، وہ ایک سرزمین کے خاص مکان و مقام میں مقیّد ہوتے ہیں ؛ جیسے وہ اپنے ملک اور قوم کی ترقی اور بہبودی میں کوشش کرتے ہیں ، ویسے ہی وہ دوسری[1] قوموں کی ضرر رسانی اور نقصان پہنچانے میں سعی کرتے ہیں - برخلاف اس کے جو سوچنے والے آدمی ہوتے ہیں ، اُن کے خیالاتِ علمیہ کسی مکان اور زمان کے ساتھ مقیّد نہیں ہوتے ، بلکہ وہ ساری دنیا کے لیے یکساں ہوتے ہیں - سوائے اس کے عمل کرنے والوں کے کارہائے نمایاں کی شہرت نسل بعد نسل فقط ایک نسل میں چلتی ہے اور جب وہ منقطع ہو جاتی ہے تو وہ ناموری بھی جاتی رہتی ہے - برخلاف سوچنے والوں کے کاموں کے کہ وہ دنیا میں ہزاروں برس قائم رہتے ہیں -

سکندر اور قیصر کی فتوحات سے ہم کو کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے لیکن فیثاغورث نے جو سینتالیسویں شکل مقالۂ اول اقلیدس ایجاد کی ، اُس سے ہمیشہ انسان تجارت میں دولت اور منفعت حاصل کرے گا - شاید لوگ اس پر تعجب کریں گے کہ ۴۷ شکل کو دولت و تجارت سے کیا تعلق ہے ! تو اس کا جواب یہ ہے کہ تمام جہاز رانی علمِ مثلّث پر موقوف ہے اور علمِ مثلّث اس شکل پر - جہاز رانی سے جو تجارت کا بازار گرم ہوتا ہے ، وہ اسی شکل کی بدولت - علمِ ریاضی ایسا علم ہے کہ جس نے انسان کو مہذّب بنایا

۱- اصل : دوسرے قوموں -

ہے اور وحشیوں سے اسے ممتاز کیا ہے۔ تمام زیب و زینت اور منفعت انسان کو اسی کی بدولت حاصل ہوئی ہے اور ہوتی ہے۔ یہ علم تو انسان کے ظاہری حال کو اچھا کرتا ہے مگر بہت سے علم ایسے ہیں کہ وہ انسان کے باطن کو مہذّب بناتے ہیں۔ تمام بزرگوں اور ولیّوں، پیغمبروں کے کلام اور علم نے بھی انسان کے دلوں میں نیکی اور اخلاق کا بیج بویا ہے۔ کیا ان عمل کرنے والوں نے[1]، جنھوں نے لاکھوں آدمیوں کے خون کے ندی نالے بہائے، کوئی نیکی کا سکّہ انسان کے دماغوں میں جمایا ہے؟ اگر یہ سوچنے والے بے کار ہی ہوں تو عمل کرنے والوں سے اچھے ہیں جو ہزاروں انسانوں کو تکلیف اپنی ناموری کے واسطے پہنچاتے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ایسے آدمی، جو اپنے سوچنے سے دنیا کو فائدہ پہنچائیں، تھوڑے پیدا کیے ہیں اور ایسے آدمی جو اپنے عملی کاموں سے دنیا کو فائدہ پہنچاتے ہیں، کثرت سے پیدا کیے ہیں۔

۱۹۰۔ پابندیٔ وقت

۱۔ انسان کے واسطے گو ہزاروں کام ہیں مگر اُس سے حیوان فقط اپنے شعورِ طبعی کے ذریعے سے زیادہ محنت کرتے ہیں اور اُن کا وقت زیادہ کام میں بہ نسبت انسان کے صرف ہوتا ہے۔ انسان میں ایسی عقل ہے کہ اس کے واسطے ایک بڑا وسیع میدان کاموں کے واسطے وہ پیش کرتی ہے کہ جو جانوروں کے واسطے نہیں ہے۔ شکاری جانور اپنا وقت کھانے، سونے میں کاٹتے ہیں یا جاگنے کا وقت شکار کی تلاش اور کھانے میں صرف کرتے ہیں۔ اب انسان

۱۔ اصل: عمل کرنے والوں سے۔

کو دیکھو کہ وہ شکایت کیا کرتا ہے کہ دن کا کاٹنا بھاری ہو رہا ہے، وقت پہاڑ معلوم ہوتا ہے، کوئی کام نہیں جو میں کروں۔ حیوانِ عاقل کو ایسی باتوں کے کہنے سے شرم کرنی چاہیے۔ اس کی جسمانی اور عقلی محنت[1] کے لیے ہزاروں کام موجود ہیں۔ اور ہنر کے کاموں کے سوا مذہبی خیالات میں، فائدہ مند کتابوں کے پڑھنے میں اور تقریروں میں وہ وقت اپنا اچھی طرح کاٹ سکتا ہے۔ علم و نیکی کا میدان ایسا وسیع ہے کہ اس کی حد و پایاں نہیں۔ جو شخص اس میں اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتا ہے، وہ ہر گھنٹے میں زیادہ عاقل اور پہلے سے بہتر ہو جاتا ہے۔ کاہلی کے گھنٹوں کے برابر کوئی برا وقت زندگی کا نہیں ہوتا۔ اگر ہر شخص اپنا امتحان اس طرح کیا کرے کہ میں کیا کرتا ہوں اور آج میں نے کیا کیا تو وہ ضرور کاہلی سے دور رہے گا، دل کو نکمّے کاموں سے ہٹائے گا اور نیک کاموں میں لگائے گا۔ غرض جو شخص اپنے وقت کو بے کار کھونا نہ چاہے، وہ اس خطا سے بچے گا کہ میں نے آج وہ کام کیے ہیں جو مجھے نہیں کرنے چاہئیں اور وہ کام نہیں کیے ہیں جو مجھے کرنے چاہئیں تھے۔ یہ خطا ایسی ہے کہ بڑے بڑے عاقل بھی اس سے نہیں بچتے۔

۲۔ جیسے نجومی اجرامِ فلکی کی سعادت و نحوست ان کے مکان اور زمان کے لحاظ سے مقرر کرتے ہیں، اسی طرح علمِ اخلاق کے عالم، آدمیوں کی نیکیوں کے انواع زمان اور مکان کے لحاظ سے تجویز کرتے ہیں۔ وہی ایک آدمی جو ایک وقت اور مقام پر شیخی بگھار رہا

۱۔ اصل میں جملہ یوں تھا: "اس کے جسمانی اور عقلی محبت کے لیے" "محنت" کی جگہ "محبت" کا استعمال سہوِ کتابت ہے۔

ہے ، دوسرے وقت اور دوسرے مقام پر خاموش بیٹھا ہے ۔ غرض حقارت و قدر و منزلت ، مدح و ذم ، نیکیاں اور برائیاں وقت و زمانہ پر موقوف ہیں ۔ مگر آدمی کو چاہیے کہ وہ نیکیاں اپنے میں پیدا کرے جن کی تعریف زمان و مکان سے مقیّد و مختّص نہ ہو بلکہ وہ ہمہ وقت اور ہمہ جا ستائش کی مستحق ہوں ۔ تاجر کی بڑی تعریف یہ ہوتی ہے کہ سارے کام اس کے پابندِ اوقات ہوں ۔ وہ تجارت میں جو وعدے کرے ، اُن کو وقت پر پورا کرے ۔ وہ کسی اور بات سے ایسا خائف نہ ہو جیسا کہ اس بات سے کہ لوگ اس کو کہیں کہ وہ اپنے وعدوں کو وقت پر ایفا نہیں کرتا ۔ پس جیسی یہ پابندیِ وقت تاجر کے لیے ضرور ہے ، ایسے ہر شخص کو اپنے کاموں کے واسطے نظمِ اوقات ضرور ہے ۔ اکثر آدمی اس پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے اور جانتے ہیں کہ یہ قید آزادی اور امارت کے خلاف ہے ۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں پابندِ اوقات نہ ہونے سے آدمی بڑی باتوں میں بھی وقت کا پابند نہیں رہتا ۔ جو وقت کسی کام کا ٹھہراتا ہے ، اُس وقت نہیں کرتا ۔ اس سبب سے اس کا اعتبار کم ہو جاتا ہے اور لوگ شبہ کرتے ہیں کہ جو اس نے وعدہ کیا ہے ، وہ وقت پر معلوم نہیں پورا کرے گا یا نہیں ۔ دعوتوں اور مجلسوں میں اس کو بلاتے ہیں مگر یہ جانتے ہیں کہ وہ وقت پر نہیں آئے گا ، اس لیے اس کا انتظار نہیں دیکھتے ہیں جس سے وہ ذلیل ہوتا ہے ۔

۳۔ جن چیزوں کو انسان اپنے نزدیک ایسا مضبوط اور مستحکم بناتا ہے کہ وہ قیامت تک قائم رہیں گی ، اُن کو وقت غارت کر کے نیست و نابود کر دیتا ہے ۔ لوہے اور پتھر کے ہتھیاروں کا نشان باقی نہیں رکھتا ، کتابوں اور پرانے نوشتوں کو کیڑوں کو کھلاتا ہے اور ایسا محسن کُش ہے کہ نیک ناموں کا نام مٹاتا ہے ۔

۱۹۱- تنہا نشینی

ہمیشہ روشن دماغوں کو، جن کا علم وسیع اور ذہن عالی ہوتا ہے، تنہائی پسند ہوتی[1] ہے۔ جن کو یہ ملکہ ہوتا ہے کہ زمانۂ حال اور ماضی کا آپس میں مقابلہ کرکے یہ دریافت کر لیتے ہیں کہ ہمیشہ سے آدمی کی ایک ہی سی خوشیاں اور آرام اور امیدیں اور ناخوشیاں متواتر واقع ہوتی رہتی ہیں، وہ خلوت میں خوشی سے بیٹھتے ہیں، اور اپنے خیالات کو وسیع کرکے ان کی بوقلمونی سے وہ مسرّت حاصل کرتے ہیں کہ جلوت[2] میں اپنے حواسِ خمسہ سے نہ حاصل کر سکتے۔ جو لوگ صاحبِ دولت اور ثروت و حکومت ہوتے ہیں وہ بھی اُن آدمیوں کی صحبت سے گھبرا کر خلوت میں جا بیٹھتے ہیں جو اُن کو ہر وقت اس لیے گھیرے رہتے ہیں کہ جو چیز ان کی مسرّت کے لیے مخل ہو، اسے دور کر دیں۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ اگر اس طرح سے ہم کو خلوت نہ نصیب ہوا کرے تو لطفِ زندگی جاتا رہے۔ غرض خواہ انسان کیسا ہی عالی شان اور با ساز و سامان ہو، وہ اس تنہائی کی آرزو سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کو سوچ بچار کرنا آتا ہے تو وہ ہزاروں طرح کی تحقیقات اور خیالات سے اپنے تئیں باز نہیں رکھ سکتا۔ وہ ضرور خلوت میں بیٹھ کر یہ کام کرے گا۔ مگر ایک امر جو عظیم الشان اس کا مانع ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ تالیفِ قلوب کے لیے رسومِ تعظیم و تکریم میں اس کا بڑا وقت ضائع ہوتا ہے۔ گھر میں تو یونانی ضرب المثل کے موافق آقا اور غلام دونوں برابر ہوتے ہیں اس لیے شانِ امارت کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ

۱- اصل: ہوتے ہے ۲- جلوت = ظاہری حالت، سر عام۔

جلوت میں وقت صرف کیا جائے - ایک بادشاہ نے اقلیدس[1] سے کہا کہ اُس کو مختصر طور پر علمِ ہندسہ سکھاوے، تو اقلیدس نے جواب دیا کہ حضور! علمِ ہندسہ کے واسطے کوئی راہ شاہی نہیں ہے - اور چیزیں حکومت و دولت سے حاصل ہو سکتی ہیں مگر علم مطالعے اور تنہا نشینی سے حاصل ہوتا ہے -

۱۹۲- تصنیفات میں عیب و صواب دیکھنا

مصنّف کا کام یہ ہے کہ آدمیوں کو وہ باتیں سکھائے جو لوگوں کو معلوم نہ ہوں - یا جو اُن کو پہلے سے معلوم ہوں اُن کا پیرایہ تازہ بدل کر خوش اسلوبی اور حسنِ ادا کی خوبی ایسی[2] پیدا کرے کہ وہ لوگوں کے دلوں کو ایسا لبھائیں کہ پھر لوگ ان کو دوبارہ شوق سے دیکھنے لگیں - یہ دونوں کام بڑی محنت کے ہیں - لوگوں کو چاہیے کہ وہ تصنیفات میں ان دونوں باتوں کو دیکھیں اور جانچیں - فقط مصنّفوں کی غلطیوں پر نظر نہ ڈالیں بلکہ ان کی خوبیوں پر بھی - ان کی جہالت ہی پر نظر نہ کریں بلکہ ان کی خوش کرنے والی وضعوں پر بھی - اور یہ سمجھیں کہ جو ہم کو سکھاتے ہیں وہ ہم سے زیادہ علم رکھتے ہیں - پس جو لوگ اپنا وقت و خیال تصنیف میں صرف کرتے ہیں، جس کے اندر ناکامی میں جوکھوں

۱- اقلیدس : (۳۰۶ ق م — ۲۸۳ ق م) اس نے بطلیموس اول کے زمانے میں اسکندریہ میں علمِ ہندسہ کی تعلیم دی اور علم ہندسہ کے مبادی وضع کیے - اس کی ایک کتاب ''الاصول'' کی شرح ناصرالدین طوسی نے لکھی ہے -

۲- اصل میں یہ جملہ یوں تھا : ''اور حسنِ ادا کی خوبیِ ادا ایسا پیدا کرے کہ وہ لوگوں کے دلوں کو ایسا لبھائے کہ پھر لوگ اس کو . . .''

بڑی اور کامیابی میں منفعت تھوڑی ہے ، ان کی ترقی کو جو روکتے ہیں وہ بڑے بد اندیش ، تیرہ دروں ، کور باطن ہیں ۔ نسل کی نسل آدمیوں کی ایسی ہے کہ وہ اپنا فرض یا دل لگی سمجھتے ہیں کہ جس کتاب میں عملی خوبی اور ذکاوت پائی جائے اس کی شہرت کے دروازے کو بھیڑ دیں اور سنتری بن کر اس پر کھڑے ہو جائیں ۔ اور اِس پر اُن کو بڑا ناز و فخر ہوتا ہے کہ ہم اپنی جہالت اور حسد کو اُس شکار کی اول اطلاع دیں ۔ اس فرقے کو اَور لوگ عیب بیں کہتے ہیں اور وہ اپنے تئیں نکتہ یاب دقیقہ شناس کہتے ہیں ۔ مصنّفوں کو چاہیے کہ تصنیف سے پہلے ان لوگوں کا علاج کریں ۔ ”دہنِ سگ بہ لقمہ دوختن بہ“[1] ۔ کچھ اُن کی دعوت کر کے راضی کر دیں یا خوشامد کا افسانہ سنا کر خوابِ غفلت میں سلائیں ۔ ان لوگوں کی ضرور یہ عادت ہوتی ہے کہ اگر مصنّف ان کو کچھ مابہ الاحتظاظ[2] پہنچا دے یا خوشامد کر دے تو پھر چپکے ہو رہتے ہیں ۔ اگر وہ اخبار نویس ہوں تو ان کا اخبار مول لے لے ، پھر دیکھیے کہ ان کی مدح سرائی میں کیا بھنّاٹی ہوتی ہے ۔ اگر محنت و صداقت کے ساتھ تصنیفات کے عیب و صواب دیکھے جائیں اور عدالت کے حوالے ہوں اور دانائی کے محل میں پرورش پائیں تو تصنیفات کے حق میں کوئی امر اس سے زیادہ مفید نہیں ہو سکتا ۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ تصنیفات کو راستی کی شمع سے نہیں دیکھتے ۔ جن سے کچھ ہاتھ لگ گیا یا آیندہ امیدِ منفعت ہے ، اُن کی خوشامد کے مارے غلام بن گئے ، ورنہ[3] ان کے پیچھے پنجے جھاڑ کر کتّے کی طرح لپٹ گئے ۔ اس سے بڑا

۱۔ یعنی کتّے کے منہ میں لقمہ دے کر اسے خاموش کرا دینا چاہیے ۔

۲۔ مابہ الاحتظاظ = وہ شے جس سے لطف حاصل ہو ، مزے دار چیز ۔

۳۔ ”ورنہ“ اضافہ مرتّب ۔

نقصان یہ ہوتا ہے کہ ان کے خوف سے بعض مصنّف اپنی تصنیف کو نہیں دکھاتے اور بعض دل شکستہ ہو کر اس کام سے ہاتھ اُٹھاتے ہیں۔

۱۹۳۔ خوشی پابند کسی فرقۂ انسان کے ساتھ نہیں

انسان کے ہر فرقے کو اپنا فن، ہنر، پیشہ، حرفہ پسند ہے اور اس کے برتر اور بزرگ ہونے کا ادعا ہے۔ خواہ اس کو کیسی ہی مشکلات اور دشواریاں پیش آئیں، وہ اپنے پیشے کی طرف داری کرتا ہے اور اس سے خوش رہتا ہے۔ یہ طرف داری وہاں بڑی دھوم دھام سے ظاہر ہوتی ہے جہاں تہذیب و شائستگی و تصنّع کم ہوتا ہے۔ چھوٹی اُمّت[۱] کے پیشہ وروں کو بھی دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے پیشوں کی تعریف اور اَوروں کے پیشوں کی ہجو ادبدا کر کرتے ہیں۔ ایک لُہار جانتا ہے کہ مجھے سارے دن ہتھوڑے مارنے پڑتے ہیں اور سخت محنت کرنی پڑتی ہے، پھر بھی وہ اپنے پیشے کو مردانہ جانتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر میرا بیٹا بگی میں نکلے گا تو کوئی اس کو یہ نہیں کہے گا کہ وہ درزی کا لڑکا ہے بلکہ ایک جواں مرد پیشہ ور کا بیٹا کہے گا۔ برّی اور بحری سپاہیوں میں بھی آپس میں یہی جھگڑا رہتا ہے۔ بحری لڑائیوں کی فتح یابی پر جب افسروں اور سپاہیوں کو اعزاز کے تمغے ملتے ہیں تو برّی سپاہی کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ کیا بیہودہ حرکت ہوگی کہ یہ سپاہیانہ عزت بحری سپاہیوں کو دی جائے۔ بہادری کے سبب سے سپاہی عزت کا مستحق ہوتا ہے، سو یہ سب جانتے ہیں کہ بحری لڑائیوں میں کوئی کام بہادری کا نہیں

۱۔ چھوٹی اُمّت = نیچ قوم، کمتی لوگ۔

ہوتا ہے۔

پیشہ وروں میں جو محاسدت[1] ہوتی ہے اس سے ہر پیشہ ور کو اختراع اور ایجاد کی طرف خیال ہوتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میری چیزوں پر لوگوں کو التفات ہو، اس لیے ہر پیشے میں بڑی ترقی ہوتی ہے۔

۱۹۴- رازداری

۱- کہتے ہیں کہ جو شخص رازداری کے قوانین کے خلاف افشائے راز کرتا تھا، اُس سے ایرانیوں کو سخت نفرت ہوتی تھی۔ ان کا قول یہ تھا کہ ایک شخص صفاتِ ستودہ میں گو ناقص ہو مگر اس کے اختیار میں یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی کام نیکی کے منافی نہ کرے؛ مثلاً ایک شخص کو اچھی طرح بولنا نہ آتا ہو مگر اس کو چپ رہنا تو ضرور آتا ہے۔ بہت سے آدمی مخفی باتوں کو اس سبب سے نہیں ظاہر کر دیتے کہ کوئی اُن کو دھمکاتا ہے یا رشوت دیتا ہے، بلکہ فقط اپنی بکواس کی عادت کے سبب سے ساری باتیں دل کی کہہ دیتے ہیں۔ وہ پیٹ کے ہلکے ہوتے ہیں کہ کوئی بات ان کو ہضم نہیں ہوتی، منہ پر آئے بغیر وہ نہیں رہتی۔ ان کا حال کیتلی کا سا ہوتا ہے کہ جس کی پیندی ٹپکتی ہو۔ اگر اس کے نیچے کے سوراخ بند کیے جائیں تو بھی سر پر سے اُس کے اندر کی چیز نکل جاتی ہے۔ ان کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ وہ اپنے راز کو یا دوسرے کے راز کو مخفی رکھیں۔

بہت سے طریقے ہیں کہ آدمی راز کی باتیں کہہ دیتا ہے اور یہ

۱- محاسدت = ایک دوسرے سے حسد۔

جانتا ہے کہ کوئی میں نے گناہ نہیں کیا ۔ وہ اپنے مربیّوں اور دوستوں کے رازوں کو اُن لوگوں کے سامنے کہہ دیتا ہے جن سے کہ وہ اپنے راز نہیں چھپاتا ۔ اُن لوگوں پر بھی ان کا اعلان کر دیتا ہے جن کو چاہتا ہے کہ وہ کچھ غرض رازوں کے افشا سے نہیں رکھتے ، باوجودیکہ اس کو یہ خوف ہی لگا رہتا ہے کہ اگر یہ راز شائع ہو جائے گا تو اس سے دوستی میں فرق آ جائے گا ۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ میں جن سے محبت رکھتا ہوں ، یا جن سے باتیں کیا کرتا ہوں ، یا جن سے دل لگی کرتا ہوں ، یا جن سے فرصت کے وقت ملتا ہوں ، وہ میری قدر و منزلت کریں ۔ اس لیے محبت اور مہربانی کے جوش میں آن کر وہ اپنا راز دوست سے اس لیے کہہ دیتا ہے کہ جس سے بےریا دوستی اور الفت ثابت ہو اور اس وجہ سے قدر و منزلت ہو ۔ غرض جو آدمی راز کہتا ہے ، اس میں اس کی شیخی اور نمود پائی جاتی ہے ۔ اپنا راز کسی دوست سے کہہ دینا فقط حماقت ہے مگر دوسرے کے راز کا افشا کر دینا سوائے حماقت کے مکاری بھی ہے ۔

بعض آدمی دوستی کے ایسے پکے اور دیوانے ہوتے ہیں کہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ دوستی کے معنی یہ ہیں کہ ”من تُو شدم تُو من شدی ۔“ جو دوست کا ہے وہ ہمارا ہے اور جو ہمارا ہے وہ دوست کا ہے ۔ پس اس لیے اس سے کسی بات کا مخفی کرنا دوستی سے بعید ہے ۔ دوست کوئی غیر نہیں ہے ، وہ بمنزلہ اپنی ذات کے ہے ۔ اس سے راز کہنے سے کوئی دوسرا رازداں زیادہ نہیں ہوتا ۔ پس اگر دوستی کے معانی یہ سمجھے جائیں تو یہ ہوگا کہ میں نے اپنا راز ایک اپنے دوست سے کہا اور اُس دوست نے یہ راز دوسرے دوست سے اور دوسرے نے تیسرے سے ۔ غرض رازداری کا دورہ

چلتے چلتے طشت از بام اُفتاد کا نقشہ ہو جائے گا اور اُس شخص کو راز معلوم ہو جائے گا جس سے چھپانا منظور ہے - اس کا حال بجلی کا سا ہوگا کہ زنجیر کے ایک حلقے سے دوسرے حلقے میں فوراً پھیلتی چلی جاتی ہے - وہی باتیں جو دوستوں کی سرگوشیوں میں ہو رہی ہیں ، وہ بازاروں میں مشتہر ہوتی ہیں - غرض رازداری کا مسئلہ بڑا مشکل ہے کہ آدمی کس پر اعتبار کرے اور کس پر نہ کرے - گو اس کے قاعدے بہت سے بیان ہوئے مگر سب سے اچھا یہ قاعدہ ہے کہ کبھی آدمی کسی کے راز پر واقف ہونا ہی نہ چاہے - جب کوئی شخص اپنا راز کہنے بیٹھے تو اس کے سننے سے انکار کر دے - اس میں آدمی کا بڑا اعتبار ہوتا ہے - نہ اپنا راز کہے ، نہ دوسرے کا سنے -

۲- جب دو یار محرمِ اسرار آپس سے جدا ہوتے ہیں تو ان کے حافظوں میں ایک دوسرے کے اسرار مقفّل ہوتے ہیں جن کے قُفلوں کی کنجیاں ایک کی دوسرے کے پاس ہوتی ہیں -

۳- اکثر ہم اس مقولے کو نقل کرتے ہوئے سنتے ہیں کہ جب اپنے راز کو ہم خود نہیں چھپاتے تو دوسرے سے اس کے چھپانے کی توقع نہیں کرنی چاہیے - اس مقولے کی بنا بالکل خود غرضی اور ناراستی پر ہے - وہ بالکل غلط ہے - دنیا میں ساری دوستی آدمیوں میں اسی پر موقوف ہے کہ ہم ایک دوسرے کے راز سے واقف ہوں اور ان کو نیک نیتی کے ساتھ مخفی رکھیں اور عقل مندی کے ساتھ ان کو مِلاپ جُلاپ میں کام میں لائیں - دوستی کے اصلی کام یہی ہیں - آدمی کی نیک نہادی کی یہ علامت ہے کہ ہم اپنے رازوں سے زیادہ دوستوں کے اسرار کی حفاظت کریں - دوست کو اپنے راز سے محرم کرنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ہم اس پر اعتماد اور اعتبار

کرتے ہیں - دوستی جس کا نام ہے وہ اس باہمی اعتبار ہی کا نام ہے - دوست کو دوست اپنا اصلی حال دکھاتا ہے ، اس سے اپنی بات کو مخفی نہیں رکھتا - دوستی کا معیار رازداری ہے ، ہمیشہ دوستوں میں اس کی تجارت کا بازار گرم رہتا ہے - جن آدمیوں کو رازداری کی خصلت نہیں ہوتی ، جب ان سے زیادہ راز کی بات کہی جاتی ہے اور اس کے اخفا کی تاکید ، تو وہ ان کے دل پر ایسا بار معلوم ہوتا ہے کہ اس کو وہ زبان پر لا کر ہلکا کر دیتے ہیں - ہم میں رازداری کی عادت بہت کم ہے - یہ ہماری تعلیم کا نقص ہے - ہم بچپنے میں جب کسی نوکر کی یا رشتے دار کی مخفی بات کو ماں باپوں یا استاد پر ظاہر کرتے ہیں تو ہماری ذہانت کی تعریف ہوتی ہے اور بہت پیار کیا جاتا ہے -[1]

☆ ☆ ☆

۱- ''محاسن الاخلاق'' کا حصہ اول یہاں ختم ہو جاتا ہے - اس کے بعد دو صفحات کا ''صحت نامہ'' تھا جو زیر نظر ایڈیشن میں شامل نہیں کیا جا رہا کیونکہ اس کی اغلاط کی تصحیح متن میں کر دی گئی ہے -

محاسن الاخلاق

حصّۂ دوم

۱۔ جاہل واعظ

دِلا تا بزرگی نیاری بدست
بجائے بزرگان نباید نشست

آج کل زمانہ چاروں طرف خوب چھان بین ، دیکھ بھال کر رہا ہے - ہر علم کی تدقیق اور ہر چیز کی تحقیق کے درپے ہے - خاص کر عیبوں اور نقصوں کو چن چن کر بتلاتا ہے اور قدیمی علمیّت کو ، خواہ وہ کیسا ہی عمدہ لباس پہن کر آئے ، جاہلیّت کی برابر سمجھتا ہے - پس ایسے زمانے میں اگر کوئی جاہل وعظ کے ممبر پر بیٹھ کر اپنی جہالت کا اظہار کرے تو نہایت نفرت اور حقارت کے قابل ہے - آنکھوں کا اندھا تو کسی اندھے کی رہبری نہیں کر سکتا ، مال اور دولت پر پہرہ نہیں دے سکتا - پھر یہ عقل کا اندھا کیا جاہلوں کی رہنمائی جہالت سے کرے گا ؟ جہالت سے زیادہ انسان کو ذلیل کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے - لیکن اگر کسی شخص میں وہ بہ سبب خِلقی نقص و ناقابلیت کے ہو تو وہ حقارت کے قابل نہیں بلکہ رحم کے قابل ہے ، کیونکہ اس میں آدمی مجبور اور بے قصور ہے - اگر کوئی اندھا پنکھا ہلانے بیٹھ جائے تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن اگر وہ کشتی کھینے بیٹھے تو لوگ اس کے مانع ہوں گے - ایسے ہی کوئی نااہل ، جاہل ، ناخواندہ اپنے گھر میں پڑا رہے تو کسی کو پرخاش نہیں - ایک شخص جاہل ہے تو اپنے لیے - اگر اُلّو نہ بولیں اور درختوں

میں چھپے رہیں ، پُھننگ[1] پر نہ آئیں تو اس سے کیا کسی کا ہرج ہے ؟ ایسے ہی ان جاہلوں کے گھر پڑے رہنے سے کسی کا نقصان نہیں ۔ لیکن اگر بزرگ مقاموں پر بیٹھ کر وعظ سنانا چاہیں یا اپنی سیاست جمانی چاہیں تو لوگ اس کے متحمّل نہ ہوں گے ۔ جب حضرت سلیمانؑ نے اپنا معبدِ عظیم بنایا تو اس میں لنگڑے اور ناقص جانور کی ممانعت ہوئی ۔ پس جب ناقص جانور کی قربانی نامقبول ہوئی تو ناقص جاہل کا وعظ کب مقبول ہو سکتا ہے ۔ گو ہم کو پیشین گوئی کی لیاقت نہیں عطا ہوئی ، مگر ہم بغیر اس کے یہ پیشین گوئی کر کے کہہ سکتے ہیں کہ علم اور نیکی جس مذہب سے جب جدا ہو جائیں گے تو وہ مذہب برباد ہو جائے گا ۔ جب مذہب میں علم کی جگہ جہالت اور عقل کی جگہ حماقت قائم ہوتی ہے تو مذہب نہیں رہتا ، بلکہ وہ بدعتوں کا مجموعہ بن جاتا ہے جس میں سوائے انتشار کے اور کچھ نہیں ہوتا ۔ فقط

۲۔ مذہب خوشی کا دشمن نہیں ہے

اس مضمون میں خوشی سے ہماری مراد یہ ہے کہ انسان کے جو قُوا ہیں، وہ راست روی کے ساتھ مناسب چیزوں پر مناسب طور پر استعمال کیے جائیں ۔ ان سے جو نتیجہ ہماری فہم میں آئے ، وہ خوشی ہے ۔ وہ دونوں ، جسم و روح ، سے متعلق ہو سکتی ہے اور وہ دونوں میں کامیابی کا نتیجہ ہے ۔ لذائذِ جسمانی بھی خوشی کا ایک حصّہ یا ایک قسم کی خوشی ہے ۔ پس اس معنی کے موافق یہ کہنا نہایت سچ ہے کہ انسان کی سب سے زیادہ بھلائی خوشی ہے ۔ بھلائی کا خیال

۱۔ پُھننگ = درخت کی چوٹی ، شاخ کا آخری سرا ۔ (نور اللغات)

ہی اصل میں خوشی ہے - مگر صرف لذائذِ جسمانی اور شہوت رانی کے معنی خوشی کے لیے جائیں تو اوپر کا کہنا جھوٹ اور نہایت مکروہ ہو جاتا ہے اور ہمارے مضمون کا مقصد ہی معکوس ہو جاتا ہے - جس مذہب میں ایسی دلائل ہوں کہ وہ انسان کو یہ ہدایت کرتی ہوں کہ انسان کی خوشی کا دشمن مذہب ہے تو وہ دلائل انسان کو دنیا کی تمام شیریں لذائذ سے محروم کرتی ہیں اور ہمیشہ بیہودہ تلاش میں رہنا سکھاتی ہیں - دنیا کو ایک زاہد خانہ بناتی ہیں - چاہیے زیادہ مذہب کو دل میں آنے سے وہ روکتی ہیں اور اس کے برخلاف تعصّب پیدا کرتی ہیں - ان کے سبب سے آدمی کی عقل اور طبیعت دونوں مذہب سے متنفّر ہوتے ہیں - خدا نے انسان کی فطرت اس طرح بنائی ہے کہ کوئی قوّت اور خواہش اس کو ایسی نہیں دی کہ جس کے استعمال اور پورا کرنے کا قدرتی سامان اس کے واسطے مہیّا نہ کر دیا ہو - بھلا یہ کب ممکن ہے کہ مذہب اس فطرت کی ضد بنایا جائے اور اس کا مخالف اور متضاد ہو - بھلا اس سے زیادہ کیا ظلم دنیا میں ہو سکتا ہے کہ دنیا کی ساری نعمتیں انسان کے رو برو رکھی جائیں اور پھر وہ ترسایا جائے اور ان میں کسی سے متمتّع ہونے کا حکم نہ دیا جائے - شدّت سے بھوکا پیاسا ہو اور طرح طرح کی کھانے کی چیزیں رکھی جائیں مگر سب پر مُہر لگا دی جائے اور اس سے کہا جائے کہ یہ سب تجھے حرام ہیں، ہرگز ہرگز ان کو چھونا اور چکھنا نہیں - اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنا ہی خونِ جگر پیا کرے اور اپنے تئیں شکار کر کے کھایا کرے - غرض یہ باتیں سب انسان کے مقتضائے فطرت و خلقت کے خلاف ہیں، اس لیے خدا کی حکمت اور کرم و فضل کے برخلاف ہیں - پس جو شخص مذہب کو رواج اور رونق دینا چاہے اس کا اول فرض یہ ہے کہ وہ لوگوں کو یہ

سمجھائے کہ مذہب کسی عقلی خوشی میں خلل انداز نہیں - وہ ہرگز ہرگز اس کو منع نہیں کرتا کہ جو تمھاری عقل کے نزدیک خوشی ہو ، اس کو ترک کر دو -

قاعدہ ہے کہ جب آدمی کا مزاج علیل ہوتا ہے یا کسی اور تکلیف میں ہو تو اس کو ایسی خوشی کے حاصل کرنے سے منع کیا جاتا ہے جو اس کو اور زیادہ رنج پہنچائے - مذہب بھی ایسی خوشی کے حاصل کرنے کو منع کرتا ہے کہ ایک چھوٹی برائی کی برداشت بڑی برائی کی گزند رسانی کو روک دے - مذہب نہ ہماری کسی خوشی کو محاصرہ کرتا ہے ، نہ اس پر حملہ کرتا ہے - ہاں وہ بعض اوقات خوشیوں کے بدلنے کا حکم دیتا ہے - یہ قسم نہیں دلاتا ہے کہ تم ان کو چھوڑ دو - خلاصہ یہ ہے کہ ایسا مذہب جو انسان کی خوشی کا دشمن ہو ، خدا کی طرف سے نہیں ہو سکتا - خدا ظالم نہیں ہے کہ وہ کج دار و مریز[1] کرے ؛ کہ انسان کی خلقت میں خواہشیں اور شہوتیں پیدا کرے اور پھر اُن کے پورا ہونے کے سامان اپنی قدرت سے مہیّا کرے ، اور پھر اُس سامان کو آنکھوں کے روبرو کرے ، اور حکم دے کہ خبردار جو تم نے ان میں سے کسی کو ہاتھ لگایا اور کسی طرح کی ان سے خوشی حاصل کی - یہ خدا کی قدرت کے اور انسان کی فطرت کے بالکل خلاف ہے کہ خدا آنکھیں اور روشنی دونوں پیدا کرے اور کہے کہ دیکھو نہیں - کان اور آواز پیدا کرے اور کہے کہ سنو نہیں -

---

۱- یعنی ایسا حکم دے جس کا بجا لانا انسانی طاقت سے باہر ہو -

۳۔ انسان کی زندگی اس کے کاموں کے واسطے تھوڑی نہیں

طوفانِ نوح[۴] سے پہلے جو آدمیوں کی بڑی بڑی عمریں ہوتی تھیں ، زمانۂ حال میں اُن عمروں کا ہونا مناسب نہیں ۔ حضرت موسیٰ[۴] نے یہ تو بتایا نہیں کہ طوفان سے پہلے آدمی کس طرح بود و باش کرتے تھے اور اپنا وقت کیونکر بسر کرتے تھے ، مگر آدمی کی درازیٔ عمر کا حال لکھا ہے ۔ اس لیے ہم کسی طرح نہیں جان سکتے کہ طوفان سے پہلے انسان کا کیا حال تھا اور کیونکر وہ اپنی عمر بسر کرتا تھا ۔ مگر اب جس طرح دنیا چل رہی ہے اور اس میں ہزاروں آدمی عمروں کے چھوٹے ہونے کے لیے رو رہے ہیں ، ان کو میں بتلاتا ہوں کہ اگر آدمیوں کی عمریں دراز ہونے لگیں تو انسان کی خوشی کے حق میں بہتر نہ ہوگا ۔ اس کی وجوہ یہ ہیں :

اول دنیا میں بالفعل انسانوں کی حالتیں مختلف ہیں ؛ ایک وہ آدمی ہیں جن کو دنیا کی بہت سی نعمتیں ملی ہیں ۔ دوسرے وہ ہیں جن کو سوائے اس کے کچھ نہیں ملا کہ نہایت محنت و مشقّت سے روٹی پیدا کریں ۔ یا اَوروں سے اپنے عجز و فقر کو دکھا کر خیرات سے زندگی بسر کریں ۔ یا دغابازی اور دُزدی ، سینہ زوری ، مکاری سے کسی کا مال مار لیں ۔ پس جو امیر ہیں اور دنیا کی نعمتیں ان کو حاصل ہیں ، وہ چند سو برس اپنی زندگی چین اور آرام سے بسر کر سکتے ہیں ، مگر جو فقیر اور غلام قیدی ہیں ، اُن کو محتاجی اور غریبی اور بے کسی میں اور جیل خانوں کی زنجیروں مین اور طرح طرح کی مصیبتوں میں ساٹھ ستّر برس کی عمر تک بھی جینا دشوار اور پہاڑ معلوم ہوتا ہے ۔ وہ اِتنی عمر کو بھی کافی سمجھتے ہیں ۔ غرض دنیا

میں بڑا حصہ ایسے آدمیوں کا ہے جو اِس کوتاہ عمری سے راضی ہے کیونکہ ان کو دنیا کی کوئی چیز ایسی حاصل نہیں جس کے لیے وہ زیادہ جینے کی آرزو کریں -

دوم دنیا کی حالت ایسی ہے کہ اس میں آدمیوں کے اندر جلد قائم مقام ہونے کی ضرورت ہے - دنیا خوب آباد ہے ، وہ اپنے باشندوں میں تقسیم ہو رہی ہے - مگر ان میں ایسے بہت تھوڑے ہیں جن کو اس کا بڑا حصہ ہاتھ لگا ہو - اب فرض کرو کہ سو دو سو برس پہلے جتنے ہمارے باپ دادا تھے ، وہ سب زندہ ہوں اور وہ اپنی تمام جائداد پر قابض ہوں اور اپنی قدیمی عزت و امارت رکھتے ہوں ، تو اس صورت میں جو نسل ان کی حال میں ہے اس کی کیا حالت ہوگی - کیا ان کو وہ امارت و ثروت ، جو وراثت یابی سے ہوتی ہے ، حاصل ہوگی ؟ ہرگز نہیں - اگر پانچ چار سو برس اس طرح گزریں تو آدمیوں کی آبادی سمائے بھی نہیں ، اور اب اگر مفلس محتاج ایک آدمی ہوتا ہے تو پھر پانچ سو سے کم نہ ہوں - اگر دنیا سب میں برابر تقسیم ہوتی اور سارے آدمیوں کی ایک سی حالت ہوتی تو پھر ایسی صورت میں خوش حال اور فارغ البال آدمی ، جو درازیٔ عمر کا شوق نہایت رکھتے ہیں ، ہر گز وہ یہ تمنّا نہ کرتے - نوجوان کفایت شعار وارث جب یہ جانتے کہ تین چار سو برس بعد کہیں ورثہ ترکہ ہاتھ لگے گا تو وہ کفایت شعاری کو سلام کرتے اور روپے کو بالکل تباہ کر دیتے - اب ان کی کفایت شعاری اس خیال سے ہوتی ہے کہ ہمارے باپ عنقریب قبر میں جائیں گے اور سب کچھ ہمارے لیے چھوڑ جائیں گے - ورنہ اگر وہ یہ جانیں کہ ہم کو ریاست اور ثروت حاصل ہونے میں برسوں کا عرصہ ہے تو وہ ساری جائداد کو فضول خرچی میں اڑانا شروع کر دیں گے اور وہ تباہ ہو جائیں گے

اور ماں باپوں کو تباہ کر دیں گے - پھر وہ ایسی زندگی نہیں چاہیں گے - مجھے یقین ہے کہ خدائے تعالیٰ نے جو انتظامِ عالم کیا ہے ، اس کی شکایت اس سبب سے نہیں کریں گے کہ ہمارے ماں باپوں کی عمریں چھوٹی ہوتی ہیں - عمروں کے چھوٹے ہونے پر بھی[1] بعض ذہین آدمی اِلحاد سے خالی نہیں ہوتے - اگر عمریں زیادہ ہوتیں تو معلوم نہیں کہ اِلحاد کا کیا زور ہوتا -

سوم دنیا بڑی خراب ہے - اس میں نیک اطوار آدمیوں کو ساٹھ ستّر برس نیکی کے ساتھ کاٹنے بھی[2] مشکل ہوتے ہیں - اگر عمریں پانچ چھ سات آٹھ سو برس کی ہوتیں تو معلوم نہیں کیسی خرابی مچتی - یہ جو عمریں چالیس پچاس برس کی ہوتی ہیں ، ان میں تو بیس برس کے عرصے میں آدمی اپنے برے کاموں اور شرارتوں کا ایک انبار اکھٹا کر لیتا ہے - اگر زیادہ عمر ہوتی تو معلوم نہیں گناہوں کے کیا پشتارے کے پشتارے پیٹھ پر لادے ہوتے -

طوفان سے پہلے جو عمریں آدمی کی سینکڑوں برس کی ہوتی تھیں ، ان میں انسان نے بدکاری اور زشت افعالی پرلے درجے کی یہاں تک اختیار کی کہ خدائے تعالیٰ نے خفا ہو کر سب کو ، سوائے حضرتِ نوح[ع] کے خاندان کے ، طوفان سے نیست و نابود کر دیا - اور اس نے نوح[ع] سے وعدہ کیا کہ پھر میں دنیا کو طوفان سے نابود نہیں کروں گا - اس لیے اس نے آدمی کی عمریں کم کر دیں کہ نہ زیادہ عمریں ہوں گی ، نہ گناہوں کا طوفان برپا ہوگا ، جس کے سبب مجھے پھر طوفان سے ان کو غرق کرنا پڑے گا - غرض عمروں

۱- اصل میں ”بھی“ کی بجائے ”تو“ ہے -

۲- اصل میں ”بھی“ کی بجائے ”میں“ ہے -

کے گھٹنے بڑھنے سے انسان کے گناہ کم و بیش ہوتے ہیں ۔ انسان کے واسطے دنیا کا انتظام اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ آدمی کی عمر تھوڑی رہے ۔

۴ ۔ طمع

۱ ۔ طمع ایک ڈراؤنا دیو ہے جس کے سو ہاتھ ہیں ۔ وہ سب ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہا ہے ، لے رہا ہے ، اکٹھی کر رہا ہے ۔ مگر ایک ہاتھ سے بھی کچھ دیتا نہیں ۔ طمع ایک ایسی عجیب چیز ہے کہ ساری دنیا میں کوئی شے اس کے مشابہ ، سوائے قبر اور موت کے ، ہو نہیں سکتی ۔ یہی دو چیزیں ایسی ہیں کہ دنیا کو لوٹتی ہیں اور جس کو لوٹتی ہیں اس کو پھر کچھ نہیں دیتی ہیں ۔ ورنہ دنیا کا بیوپار یہ ہے کہ جو قرض لیتا ہے وہ دیتا بھی ہے ۔ ساری دنیا میں لین دین برابر ہی رہتے ہوں گے ۔ طمع بھی ایک قبر ہے کہ جس میں طامع کی تمام خواہش ہائے نفسانی دفن ہوتی ہیں ۔ مگر یہ قبر ، برخلاف اَور قبروں کے ، لب ریز ہونے سے اَور زیادہ فراخ ہوتی ہے ، اور جتنی مدت اس پر گزرتی ہے اس کی کہنگی کو تازگی ہوتی ہے ۔ طمع کے لیے ایک بڑا عذر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے سبب سے دولت اس لیے جمع کی جاتی ہے کہ وہ ضرورتیں رفع کرے ۔ مگر جب دولت جمع ہو جاتی ہے تو یہ نہیں دیکھنے میں آتا کہ وہ کوئی ضرورت رفع کرے[۱] ۔ وہ تو کسی خرچ میں نہیں آتی[۲] ۔ تھوڑے تھوڑے خرچوں میں خسّت کرنے سے ذلّت اٹھانی پڑتی ہے ۔ اگر سو پچاس

---

۱ ۔ اصل : رفع کریں ۔ ۲ ۔ اصل : نہیں آئیں ۔

روپیہ سال میں[۱] خرچ کر دیا جائے تو وہ ذلتیں نہ اُٹھائی جائیں ۔ بعض آدمی یہ کہتے ہیں کہ ہم زندگی اچھی طرح اس کے سبب سے بسر کریں گے ۔ اگر ان کو سو روپیہ سال کی آمدنی ملتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس میں ہماری ضرورتیں رفع نہیں ہوتیں ۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ جتنی جائداد اور آمدنی بڑھتی ہے اُتنی ہی ضرورتیں بڑھتی ہیں ۔ ہرن زخمی ہو کر بھاگے تو زخم اُس کے ساتھ رہتا ہے ۔ وہ بھاگنے سے تو نہیں جاتا رہتا ۔ جائداد بڑھنے سے ان کی ضرورتیں نہیں رفع ہوتیں ۔ جو شخص دو سو روپے میں اپنی زندگی بسر کر سکتا ہے وہ طمع کے سبب سے اپنے تئیں چار سو روپے کی آمدنی پیدا کرنے کے لیے دوسرے کا غلام بناتا ہے ۔

حکیم سینیکا کا قول ہے کہ طمع ایسی بھوکی ہے کہ اس کا پیٹ کسی فیاضی سے نہیں بھرا جا سکتا ۔ جن چیزوں کو اپنا غلطی سے ہم کہتے ہیں ان کے خزانچی ہم ہیں ۔ پس خزانچی کو اس بات پر رونا نہیں چاہیے کہ مالک نے مجھے بہت روپیہ نوکروں کو وظیفے کے لیے نہیں دیا ، بلکہ جو اس کو دیا گیا ہے اُسی کو اچھی طرح تقسیم کر دے تاکہ مالک بھی خوش ہو اور خلق بھی برا نہ کہے ۔ گڈریے کو رونا نہیں چاہیے کہ مالکوں نے اس کو بہت بھیڑیں چرانے کے واسطے نہیں دیں ۔

۲۔ **طمع کی دیوانگی :** طمع ایسی برائی نہیں ہے جیسی کہ وہ افسوس کے قابل دیوانگی ہے ، اور جب اس کا علاج نہ ہو سکے تو پوری دیوانگی ہے ۔ جن دواؤں سے دیوانے کتّے کا علاج ہو سکتا ہے ، اُنھی سے طامع کا علاج ہو سکتا ہے ۔ سوائے اس کے کوئی

۱۔ اصل : سو پچاس روپے سال خرچ کر دیا جائے ۔ ”میں“ اضافہ مرتّب ۔

علاج نہیں ہے - براہینِ روشن ، حکمت ، فلسفہ ، عقل ، مذہب کچھ اس پر اثر نہیں کرتے - وہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ روپے کی محبت کے واسطے ہی پیدا ہوا ہے - کوئی چیز اس کو روپے کی برابر عزیز نہیں ہوتی - اس کو ابتدائے عمر سے یہ شوق دامن گیر ہوتا ہے اور اس کی عمر کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے - متوسّط عمر میں وہ بہت بڑھ جاتا ہے اور بڑھاپے میں تو ساری خواہشیں اُس کی اسی میں محو ہو جاتی ہیں - خواہ عقل و فہم کیسی ہی اعلیٰ درجے کی ہوں ، خواہ ہنرمندی کی کیسی ہی اول درجے کی لیاقتیں ہوں ، خواہ کتنا ہی بڑا خزانہ قبضے میں ہو مگر یہ سب طمع کے مقابل میں ہیچ ہیں -

۳- افلاطون کا قول ہے کہ طامع یہ نہیں سمجھتا کہ طمع سے باز رہنے سے میری جائداد کی ترقی ہوگی - سقراط کا قول ہے کہ طامع لالچی آدمی کی دولت کا حال آفتاب کا سا ہے کہ غروب ہو کر کسی کو خوش نہیں کرتا - سینیکا کا قول ہے کہ تم مطالعۂ علم اس لیے کرو کہ دل و دماغ کو عمدہ خیالات سے معمور کرے - نہ اس طمع سے کہ تھیلیوں کو روپیوں سے بھرو - سونا چاندی سب خاک آلودہ تھے ، طمع نے یا عالی ہمتی نے اُن کو پاک صاف کیا ہے - سونے کی طمع ملعون اور مضر ہے - ایمان دار کب چاہتے ہیں کہ طمع کر کے بے ایمانی سے دولت کو پائیں - طامع دولت کو اپنی اولاد سمجھتا ہے - اسی کو قانون اور عدالت جانتا ہے - طمع کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا ، ہمیشہ بھوکی رہتی ہے - طامع کا مقدور خواہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے ، وہ روپے پیسے کی قدر کو کم نہیں کرتا - جو اس کی سو روپے ماہوار کی آمدنی کی حالت میں روپے کی قدر تھی ، وہی ہزار روپے ماہوار کی آمدنی میں -

۴- حریص ، طامع ہمیشہ مفلس اپنی بے وقوفی کے سبب سے رہتا

ہے - مفلس کو بہت چیزوں کی احتیاج ہوتی ہے ، طامع کو کُل چیزوں کی - مگر سچ یہ ہے کہ مفلس کو تھوڑی چیزوں کی ضرورت ہے اور آسودہ حال کو بہت چیزوں کی اور طامع کو کُل چیزوں کی - طمع کی شہوت نے کل انسانوں کو ایسا گھیر رکھا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولت کا قبضہ انسان پر ہے ، نہ یہ کہ انسان کا قبضہ دولت پر ہے - طمع اکثر اُن آدمیوں کو ہوتی ہے جن میں نیکیاں قابلِ تعریف نہیں ہوتیں - طمع ایسی گھاس ہے جو بنجر زمین میں اُگتی ہے -

۵- اندوہ و غم و الم

۱- انسان کو غمِ روحانی اور المِ جسمانی طرح طرح کے ہوتے ہیں جن سے کہ اس کا دل بےکل ہو جاتا ہے - مگر سب سے زیادہ بھاری رنج و قلق عزیزوں کے مرنے کا ہوتا ہے جس کو ہم ماتم کہتے ہیں - اول اسی کا بیان کرتے ہیں ؛ بالاتفاق یہ مذہب کا مسلّمہ مسئلہ ہے کہ خدائے تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ میرے بندے میری بندگی کریں ، میری مرضی سے راضی رہیں - خدا کو اِس سے زیادہ کسی طرح آدمی نہیں خوش کر سکتا کہ وہ تسلیم و رضا و توکل اختیار کرے - جو کچھ خدا دے یا لے ، اُس سے خوش رہے - اِسی میں خدا کی بڑی عظمت اور انسان کی نہایت راحت ہے - خدا انسان کا خالق ہے ، اُس سے کیا جھگڑا کر سکتا ہے - وہ ماں باپوں سے زیادہ شفقت کرتا ہے ، اس پر کیا بدگمان ہو سکتا ہے - آدمی کو دل سے یقین کرنا چاہیے کہ جو کچھ خدا ہمارے لیے کرتا ہے وہ اچھا ہی کرتا ہے اور جو کچھ ہم پر گزرتی ہے ، اگر ہم اس کو برا جانیں تو سوائے رنج کے کیا حاصل ہو سکتا ہے - خدا کی مرضی کے خلاف مقابلہ کرنے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا - اب اگر ایک آسودہ حال ،

نیک اقبال ، نوجوان عورت کا بچہ مر جائے تو اس کو خدا سے نعم البدل ملنے کی امید رکھنی چاہیے - رنج و غم میں بالکل محو ہو کر یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ میری برابر کوئی کم بخت و بدنصیب نہیں - دنیا میں کوئی خوش حال ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کو رنج نہ ہو -

خوش حال اور بدحال ہونا ایک امرِ اضافی ہے - کسی کو خوش حال اِس سبب سے کہتے ہیں کہ اس کے حال میں خوبیاں برائیوں سے زیادہ ہیں - ایسے ہی بدحال اِس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس کے حال میں برائیاں خوبیوں سے زیادہ ہیں - محض خوش حال اور محض بدحال کوئی نہیں ہو سکتا - وہ سمجھے کہ میرے رونے سے کیا ہوگا - کیا میرے آنسوؤں کا پانی اس میرے نونہال کو ، جس کی جڑ کٹ گئی ہے ، پھر اگا دے گا ؟ کیا میری سرد آہوں کا بھرنا میرے اس بے دم بچے میں سانس چلا دے گا ؟ قانونِ قدرت جو ہمیشہ سے یہ چلا آتا ہے کہ قضا ہمارے عزیزوں اور بچوں کو لے لیتی ہے اور پھر ان میں سے کسی کو واپس نہیں کرتی ، تمام امیدوں کو منقطع کرتا ہے - رنج و الم جتنا زیادہ کرو ، اتنا ہی بے فائدہ ہوتا ہے - بے فائدہ کام کرنے سے کیا فائدہ ہے ؟ یہ بے فائدہ رونا دھونا ، چاکِ گریباں ہونا ، ہوا میں یوں ہی خالی تیر مارنے ہیں جو نشانے پر نہیں لگتے - ہم کو رنج و غم میں صبر کرکے خوش ہونا چاہیے - زیادہ رونا مذہب کے اعتبار سے کفر ہے اور مہذب قوموں کے لحاظ سے ناشائستہ حرکت ہے -

۲- حکمت و فلسفہ بڑی شد و مد کے ساتھ انسان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے دل کو سخت پتھر بنائے جس پر رنج و اندوہ کی

جونک[1] نہ لگ سکے - مگر انسان ایسا وحشی نہیں ہے کہ اس پر یہ حکم چل سکے - جب آدمی حماقت سے یہ کوشش کرے گا کہ میرا دل ایسا[2] سخت ہو جائے کہ اس میں غم نہ اثر کرے تو اس کے ساتھ یہ بھی لازمی ہے کہ خوشی کا اثر بھی دل پر نہ ہوگا - پس جب دل پر خوشی و رنج کے اثر باقی نہ رہے تو اس کی زندگانی کی تربیت و تعلیم درہم برہم ہوگئی - اس کے اخلاق کی ساری بہار تو نورِ سرور اور تاریکیِ غم کے آنے جانے میں ہے - جب وہ نہ تاریکی سے روشنی میں آ سکا اور نہ روشنی سے تاریکی میں جا سکا تو لطفِ زندگی کیا پائے گا - مگر مذہب ان کے خلاف حکم کرتا ہے کہ سنگ دل نہ ہو، صابر و متحمّل ہو - یہ انسان کی فطرت کے خلاف میں حکم نہیں دیتا کہ شادی و غم دونوں سے محروم ہو -

۳- غم کے اثر بھی مختلف آدمیوں پر مختلف ہوتے ہیں - غریب آدمیوں کے رنج جلد رخصت ہو جاتے ہیں مگر بادشاہوں کے اندوہ نہیں جاتے - بے چارہ ہرن جب زخمی ہوتا ہے تو وہ ایسی گھاسوں میں جا کر لوٹتا ہے کہ اس کے زخم اچھے ہو جاتے ہیں - مگر جنگل کا بادشاہ شیر جب زخمی ہوتا ہے تو غصّے ہو ہو کر پنجے سے اپنے زخم کو نوچتا ہے اور اس سے شرماتا ہے کہ خاک جیسی ذلیل چیز میرے خون کو پیے - اس لیے وہ ہوا میں اوپر چڑھ جاتا ہے -

۴- غم انسان کا بڑا دشمن ہے - اس کو دل میں رہنے نہ دو - جلدی نکالو کہ اور عمدہ خیالات اس کی جگہ آئیں - جتنی چیزیں کہ ترقی پا کر مُضر ہوتی ہیں ان کی ابتدائی پیدائش میں فساد ہوتا ہے -

---

۱- اصل : جوک - ۲- "ایسا" اضافہ مرتّب -

جب دل کے جذبات اعتدال کی حد سے پرے قدم نکالتے ہیں تو وہ بہت برے نتیجے پیدا کرتے ہیں - ان کی ابتدا ہی میں شرارت سمجھنی چاہیے - جب وہ بہت سے جمع ہوکر ان شرارتوں سے آدمی کے قلب پر حملہ کرتے ہیں تو عقل کی سلطنت کو پامال کر دیتے ہیں اور انسان کے بیڑے کو ایسے سمندر میں ڈال دیتے ہیں کہ جہاں ان کو کہیں ٹھہرنے کی جگہ نہیں ملتی - ضعیف القلب تو ان سے ایسے مغلوب ہو جاتے ہیں کہ کہیں ان کا تھل بیڑا نہیں لگتا -

۵- اندوہ و الم دل پر ایک پتھر ہوتا ہے جو دوسرے کی ہمدردی کے سہارے سے ہلکا ہو جاتا ہے - آدمی غیروں کے غم پر صبر کرتا ہے مگر اپنے غم پر نہیں - غم جو انسان کے دل میں ہوتا ہے وہ نبض کی ہر حرکت پر کم ہوتا جاتا ہے اور ایک حرکت نبض کی ایسی ہوتی ہے کہ جس پر اس کا خاتمہ ہو جائے گا - جتنا جلد اس کو اڑا دو اتنی ہی تمھاری دانائی ہے - اس کے بعد خوشی دل میں آئے گی - جو رنج و الم آدمی کے چہرے پر ہوتا ہے وہ دلی رنجوں کا سایہ ہوتا ہے - اصل رنج وہی ہوتا ہے جو دل کو جلائے ، نہ وہ جو آنسوؤں سے گالوں کو ٹھنڈا کرے -

۶- عادت و مشق

انسان کی خلقت میں ایسی قواء اور قابلیتیں خداوند تعالیٰ نے رکھی ہیں کہ ان کا کام میں لانا انسان کو تکمیل کی طرف لے جاتا ہے ، اور وہ کام بہ آسانی کرا دیتا ہے جن کا کرنا پہلے خیال میں بھی نہ آتا تھا - ایک متوسّط العمر گنوار ، جس کا بدن سب طرح سے سڈول ہو اور جوڑ بند خوب مضبوط ہوں اور جس کی جسمانی خوبصورتی بالکل اشرافانہ ہو ، اس کو نہایت دشوار ہے کہ وہ اشراف بھلے مانس

کی زبان بولے اور اس کی وضع و طرز کو برتے ۔ ایک ناچنے والے کے پاؤں اور باجا بجانے والے کی انگلیاں بے اختیار حرکاتِ موزوں ، بغیر سوچے ، تعریف کے قابل کرتی ہیں ۔ ابھی ان دونوں سے کہیے کہ وہ آپس میں اپنی لیاقتیں بدل لیں اور ایک دوسرے کا کام کریں تو ان سے ہرگز نہ ہوگا ۔ بہت سی کوششیں اور تکلیفیں ان کی رائگاں جائیں گی اور مدتیں چاہئیں کہ وہ ایک دوسرے کے کام میں کامیاب ہوں ۔ نٹوں اور قلابازوں کو دیکھو کہ وہ کیا کیا اپنے جسموں سے حرکت کرتے ہیں کہ سب دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں ۔ یہی حال تمام کاریگروں کا ہے ۔ مگر یہاں انھی کاموں کا ذکر کیا جاتا ہے کہ جن کے تماشے لوگ روپیہ دے کر دیکھتے ہیں ۔ ان سب کاموں میں جو تعجّب خیز اور حیرت انگیز ہیں ، وہ مشق و عادت و محنت کی کرامات ہیں ۔ ان کا جسم ویسا ہے جیسا کہ تعجب کرنے والے تماشائیوں کا ہے ۔

انسان کے جو جسم کا حال ہے وہی اُس کے ذہن کی کیفیّت ہے ۔ اس کو جو عطیّاتِ الٰہی دیے گئے ہیں ، وہ ان ہی کی مشق سے اپنی خوبیاں اور نیکیاں دکھاتا ہے ۔ اپنا کمال جو دکھلاتا ہے وہ اس کی فقط مشق اور بار بار عمل کرنے کا نتیجہ ہے جس کو عادت کہتے ہیں ۔ بعض آدمی بذلہ سنجی و ظرافت میں ، بعض نقل و حکایات کی تصنیف میں ، بعض قصّہ و افسانہ سازی میں مشہور اور نامور ہوتے ہیں ۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ ان کی طبیعت ہی کی لیاقت اور جودت ہے کہ وہ یہ کمال دکھلاتے ہیں ، انھوں نے کچھ ان فنون کو علم کی طرح نہیں سیکھا ، وہ کچھ قواعد و اصول جاننے سے ان سے نہیں آگاہ ہوئے ، اس میں شبہ نہیں کہ وہ خوش قسمتی سے اُسی کام میں مشغول ہوئے جس کے لیے ان کی طبع موزوں تھی ۔ اسی سے

ان کی اول ہی دفعہ اس کام کے کرنے میں تعریف ہوئی اور اس تعریف سے ان کو شوق ایسا بڑھا کہ انھوں نے اس کو بار بار کرنا شروع کیا، اور ہمہ تن اپنے خیالات کو اس طرف متوجہ کر دیا، اور خوب سعی کی کہ ان میں یہ جوہر پیدا ہوگیا جس کو وہ خود بھی نہیں جانتے کہ کیونکر پیدا ہوا۔ طبیعت سے بالکل یہ امر جو منسوب کیا جاتا ہے اس کا بڑا حصہ عادت سے منسوب کرنا چاہیے۔ اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ اول اول طبیعت ہی کی مناسبت اس کام کی تحریک کرتی ہے مگر بغیر مشق اور عمل کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ مشق ہی کا زور ہے کہ وہ ذہن میں قابلیتیں پیدا کر دیتا ہے کہ جن سے وہ کسی کام میں کمال دکھلا دیتا ہے۔

بہت سے آدمی ایسے ہیں کہ ان کی قابلیتیں تجارت میں دفن ہو رہی ہیں، بہ سبب کم مشقی کے شاعری میں ترقی نہیں کر سکتے۔ ہم یونیورسٹی اور کورٹ[1] میں دیکھتے ہیں کہ ایک ہی معاملے میں مختلف دلائل و براہین پیش ہو رہی ہیں۔ اگر ایک آدمی کالج سے اٹھ کر کسی گاؤں کی پینٹھ[2] میں چلا جائے تو وہاں دیکھے گا کہ ذہانت اَور ہی کام کر رہی ہے۔ ہر انسان کو قسمت سے جدا جدا کام ملا ہے، ''ہر کارے و ہر مردے''[3]۔ کالج کے طالب علموں اور اَور آدمیوں کی فہموں میں یہ فرق اور اختلاف جو معلوم ہوتا ہے وہ ایسا قدرتی قابلیتوں اور قُواء کے سبب سے نہیں واقع ہوا جیسا کہ عادات کے سبب سے۔ کوئی شخص نہ عمدہ تقریر کر سکتا ہے نہ استدلال، جب

۱۔ کورٹ = کچھری۔

۲۔ پینٹھ: آٹھویں روز کا بازار، ہاٹ (نور اللغات)۔ یہاں محفل مراد ہے، یعنی گاؤں کی محفل یا اجتماع۔

۳۔ ہر کام کے لیے جدا جدا آدمی ہیں، یعنی جس کا کام اُسی کو ساجے۔

تک ان دونوں باتوں میں مشّاق نہ ہو ۔ خواہ ہزار کتابیں منطق کی اُس کو گھول کر پلا دو اور لقمہ بنا کر منہ میں رکھ دو ، مگر صرف قاعدوں کے سننے سے اور ان کو حافظے میں جمع رکھنے سے کچھ نہیں ہوتا ۔ مگر مشق اور عادت وہ ہے کہ بغیر قواعد کے سوچے کام کرتی ہے ۔ جیسے کہ فقط تصویر بنانے اور ناچنے کے قواعد سننے سے مصوّر اور رقّاص نہیں ہو سکتا ، ایسا ہی قواعدِ منطق اور فلسفہ سننے سے مقرّر اور دلیل کرنے والا نہیں ہو سکتا ۔

آدمیوں کی فہم اور قوّتوں میں جو عیب اور نقص و ضعف ہوتا ہے ، اُس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذہانت کو ٹھیک طور پر استعمال نہیں کرتے ، اور ناحق الزام طبعیت پر لگاتے اور کہتے ہیں کہ ہمیں اس کی قابلیت نہیں رہی ۔ لیکن اصل غلطی یہ ہے کہ ترقی میں قصور کیا ہے ۔ بہت سے آدمی دیکھو گے کہ وہ معاملاتِ دنیا میں بڑے باخبر اور ہوشیار ہیں ، مگر مذہب کا ذکر ان سے چھیڑیے تو پرلے درجے کے احمق معلوم ہوں گے ۔ اس کا سبب یہی ہے کہ انھوں نے اپنی ذہانت کو ٹھیک طور پر استعمال نہیں کیا ۔

۲۔ عاداتِ جسمانی کا ظہور اعمالِ خارجی سے ہوتا ہے ۔ عاداتِ روحانی کا ظہور اندرونی اصولِ عملی کی سعی سے ہوتا ہے ؛ یعنی جو اصول انسان کے دل میں عمل کرتے ہیں ، جیسے اصولِ اطاعت ، دیانت ، عدالت ، سخاوت ، اُن کے موافق عمل کرنے سے اچھے کاموں کے کرنے کا قصد کرنا درست اعمالی ہے ۔ ان سب کاموں کے کرنے سے نیک عادتیں پیدا ہوتی ہیں ۔ لیکن نیکی کا کرنا صرف خیالی ، یعنی تصوّر میں اس کا نقش جمانا اور اس کی نسبت باتیں گھڑنی ، ضروری

نہیں - اس طرح کی عادت ڈالنے سے دل اور سخت ہو جاتا ہے اور پھر نیکی کا اثر دل پر بہت ضعیف ہو جاتا ہے ، اور صرف خیالات ہی کی عادت سے اخلاق کا اثر کچھ نہیں رہتا - جب ہم صرف نیکی کا خیال ہی کیا کریں اور اس کے ساتھ عمل نہ کریں تو اس خیال کی تکرار دل پر اثر کو کم کر دے گی - قاعدہ ہے کہ جو خیال بار بار آتا ہے ، اس کا اثر دل پر کم ہو جاتا ہے - خوفناک حالتوں میں پڑنے کی عادتوں سے رحم کم ہو جاتا ہے اور آدمیوں کے مرنے کی دیکھنے کی عادت سے اپنی موت کا خیال کم ہو جاتا ہے -

اس اوپر کے بیان سے یہ دو باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ اعمال کے بار بار متواتر کرنے سے عادت پیدا اور مستحکم ہوتی ہے اور خیالات کے بار بار متواتر کرنے سے ان کا اثر دل پر کم ہوتا ہے - غرض کہ جو چیزیں کہ دل میں تحریک پیدا کرتی یا خیالات دلاتی ہیں ، اُن کا اثر عادت سے ضعیف ہو جاتا ہے مگر عملی اثر مستحکم ہوتا ہے - مثلاً طبیب جو مریض دیکھتے ہی اس کے مرض کے علاج میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے ، اس کے دل پر مرض کا اثر ، جو محرکِ علاج ہے ، عادت سے ضعیف ہو جاتا ہے ، مگر عملی عادت جو علاج کرنے کی ہے ، وہ مستحکم ہوتی ہے : مثلاً طبیب پاس کوڑھی آئے تو عادت دل میں اس کی حالت دکھا کر رحم کم پیدا کرے گی مگر علاج پر جلد مستعد کر دے گی - غرض جتنی عملی عادت مستحکم ہوتی ہے اتنے خیالی عمل دل پر ضعیف ہوتے ہیں اور عملی عادتیں مشق اور بار بار کرنے سے ہوتی ہیں -

۳- بُری عادتیں بڑی چمچچڑ ہوتی ہیں - بڑی محنت و مشقت سے مدتوں میں چھوٹتی ہیں - بہت سے رنج اُن کے دور کرنے میں اُٹھانے پڑتے ہیں : اپنی خواہش کے خلاف کام کرنا ، سرکش ارادوں

کو روکنا پڑتا ہے - نیکی کرنے کی جگہ جو ہاتھ سے جاتی رہے ، وہ جب حاصل ہوتی ہے کہ دل میں وہ طبیعتِ ثانیہ بنے -

۴- ہر شخص کا تجربہ اس کو یہ سکھا رہا ہے کہ عادت ایک قسم کی طبیعتِ ثانیہ ہے - اس کے موافق ہم کام اپنی خواہش سے ، شوق سے ، اطمینان سے ، خوشی سے کرتے ہیں - وہی ہم سے ہمارے کام انتخاب کراتی ہے اور اس میں استقلال پیدا کرتی ہے - جن چیزوں سے ، خواہ ہماری عادت خواہ ہماری طبیعت ، متنفّر ہو ، دونوں صورتوں میں ہم یکساں اس کے مخالف ہوتے ہیں - مختصر یہ ہے کہ انسان پر عادت بالکل قابض اور متصرّف ہے کہ بغیر مشقّتِ شاقّہ اور محنتِ بے نہایت کے نہ اس کی قوّت کا مقابلہ کر سکتے ہیں ، نہ اس کے تسلّط کو ہٹا سکتے ہیں - نہ اس کی جڑ اکھیڑ سکتے ہیں ، نہ اسے ہلا سکتے ہیں - یہ سب باتیں گناہ کرنے کی عادت میں ظاہر ہیں - ایسا ہی حال نیکی کی عادت کا ہے کہ اس میں بھی ایسا زور ہوتا ہے اور اس کی تائیدِ غیبی بھی ایسی[1] ہوتی ہے کہ اس کا بھی ہلانا ، سرکانا ، ہٹانا نہایت دشوار ہے -

۵- انسان پر جو عادت کو قبضہ اور تسلّط حاصل ہے وہ کسی تشبیہ سے بیان نہیں ہو سکتا ہے - اور اس کے سبب سے یہ کہانی اگر سچ ہو تو تعجب نہیں کہ ایک کنجوس کو روپیہ کمانے کی ایسی عادت تھی کہ وہ لوگوں کو فریب دیتا تھا - یہاں تک اس کی یہ عادت بڑھی کہ وہ اپنے تئیں فریب دینے لگا - ایک دن اپنی جیب میں ایک اشرفی کو نکال کر ایسا خوش ہوا کہ جیسے مفت ہاتھ لگی ہے ، اس کو خوشی خوشی تھیلی میں جمع کرنے لے گیا -

---

۱- لفظ "ایسی" مرتّب کا اضافہ ہے -

۶- بشریّت کی فطرت کا ایک عمیق قانون عادت ہے - اس سے بعض حالتوں میں ہماری بڑی تقویت ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں بڑا ضعف - ایک رستے پر آدمی چلے جس پر کچھ ایسے تماشے نظر آئیں کہ پھر دوبارہ اسی پر چلنے کو جی چاہے - بار بار اس رستے پر چلنے سے اس کو بہ نسبت اَور رستوں کے اس پر چلنا آسان معلوم ہوگا - ہمارے قانون کے اصول عادت ہی پر مبنی ہوتے ہیں - عادت اور تقلید یہ دو ہی چیزیں ہیں جو ہم سے سارے کام کراتے ہیں ، خواہ وہ عملی ہوں یا علمی -

۷- جو شخص بد عادتوں کے پھندے میں پھنس کر اس کا مغلوب اور محکوم ہو جائے ، اس کو چاہیے کہ وہ اس قید سے اپنے تئیں آزاد کرے ، نہیں تو اس کو کوئی دانائی اور خوشی نہیں حاصل ہوگی - جو بری عادتوں کے اثروں کے مطیع چلے جاتے ہیں وہ وقت پر ہوشیاری اور دانائی سے اس موذی کے پنجے سے بچ کر بھاگ تو سکتے ہیں مگر اس کو گرفتار نہیں کر سکتے -

۸- عادتیں ایسی نامعلوم آدمی کو پڑ جاتی ہیں جیسے کہ جھیلوں اور تالابوں کے پانیوں سے دریا اور دریاؤں کے پانی سے کُنڈ نامعلوم بن جاتے ہیں[۱] -

۹- برف کے گالے جب پڑتے ہیں تو ہوا میں اچھی طرح نظر نہیں آتے مگر وہ اکٹھے ہو کر ایک برف کا ڈھیر لگا دیتے ہیں - پس اسی طرح زندگی کے روزمرہ کے کام بعد ایک دوسرے کے[۲] نامعلوم جمع

۱- یعنی غیر محسوس طور پر بن جاتے ہیں -

۲- اصل : ''پس اس طرح زندگی کے روزمرہ کا کام بعد ایک دوسرے کے اس طرح'' -

ہو کر عادت پیدا کر دیتے ہیں - برف کے ڈھیر پر اگر ایک برف کا گالا آن کر پڑے تو وہ اس میں محسوس نہیں ہوتا ، مگر جب اس کی طغیانی ہوتی ہے اور وہ پہاڑ پر سے ڈھلک کر نیچے آترتے ہیں تو ترائی کے باشندوں کو مغلوب و سرگرداں کرتے ہیں - پس اسی طرح آدمی کا ایک کام تو اس کی خصلت کو محسوس نہیں ہونے دیتا ، مگر جب انسان کے جذباتِ قلبی اپنی شرارتوں کو ، جو ان میں عادات نے پیدا کی ہیں ، اکٹھی کر کے حملہ کر دیتی ہیں تو وہ راستی اور نیکی کو پامال کر دیتی ہیں -

۱۰- انسانیت کے واسطے کلنک کا ٹیکا بد عادتیں ہیں - جس شخص کو عقلِ سلیم ہو وہ ان سے بچے ، گو اس کو یہ یقین ہو کہ وہ آدمی اور خدا دونوں سے چھپی رہیں گی اور کوئی سزا بھی ان کے واسطے عقبیٰ میں نہیں ملے گی -

۱۱- آدمی کو چاہیے کہ وہ ابتدائے عمر سے بری عادت سے گریز کرے ، کیونکہ پیپے میں جو عرق پہلے بھرا جاتا ہے ، اس کا رنگ مدتوں تک اس میں رہتا ہے -

۱۲- عادت کے باب میں چند احکام ہم لکھتے ہیں جن کے موافق عمل کرنے سے دل دانش مندانہ قاعدوں کی مشق سے عادت پیدا کرے گا - اول ہم کو چاہیے کہ ابتدا ہی میں نہ کسی بہت مشکل کام کی ، نہ بہت سہل کام کی عادت پیدا کرنے کا قصد کریں ، اس لیے کہ جب ہم اپنی بساط سے باہر کسی کام کو شروع کریں گے تو جو طبائع ایسی ہیں کہ وہ اپنے اوپر بہت بھروسا نہیں رکھتیں ، وہ مایوسی سے مردہ دل ہوں گی - اور جو طبائع اپنے اوپر بہت اعتماد کرتی ہیں آن میں یہ بات پیدا ہوگی کہ وہ آس کام کرنے کا وعدہ

کریں گی جس[1] کو پورا نہیں کر سکتیں - اس سے کسالت[2] ان میں پیدا ہوگی - غرض دونوں طرح کی طبیعتوں اور مزاجوں میں تجربہ کرنے سے مایوسی پیدا ہوگی ، جس سے دل حیران ، پریشان ، افسردہ ، آزردہ ہوگا - اور اگر کسی خفیف و سہل کام سے عادت کا آغاز ہوا تو کُل ترقی کے مجموعے میں اس سے نقصان عائد ہوگا -

دوم ، کسی کام میں عادت ڈالنے کے لیے قُواء کے استعمال میں دو وقتوں پر بہت خیال رکھنا چاہیے ؟ ایک وہ وقت جس میں دل اس کام کی طرف اچھی طرح شاغل و مائل ہو - دوم وہ وقت جس میں اس کو رغبت و میلان نہ ہو - اول صورت میں ہم ترقی خوب طرح سے خود بخود کر سکیں گے اور دوسری صورت میں بڑی محنت و مشقت سے دل کی رکاوٹوں کو روکے اور گرہوں کو گھسیں گے جس کے سبب سے ہمارا بیچ کا وقت ان دونوں وقتوں کے درمیان چین اور آرام سے بسر ہوگا -

سوم ، ارسطو کا یہ حکم ہے کہ ہم اپنی ساری قوت اور سکت اپنے میلانِ طبعی کی اشیا کے مقابلے میں لگائیں - جیسے کہ دھار کی مخالف سمت میں (کشتی) کھیتے ہیں یا لکڑی کی کجی کے سیدھا کرنے میں مخالف جانب میں ہم زور کرتے ہیں -

چہارم ، ایک قاعدۂ کلّیہ ہے جس کے سچ ہونے میں کچھ شبہ نہیں کہ آدمی کا دل اَن کاموں کی طرف زیادہ رغبت اور پسند سے مصروف ہوتا ہے جن کا خود حاصل کرنا ہمارا عینِ مقصود نہیں ہوتا بلکہ وہ اَور کاموں کے پورا کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں - پس عادت پیدا کرنے میں اس قاعدۂ کلّیہ پر عمل ہو - اسی طرح کے بہت سے

۱- اصل : جن کو پورا کرنے - ۲- کسالت = سستی ، تکان -

احکامِ عادت کے انتظام کے لیے فائدہ مند ہیں ۔ عادت اگر سلیقے اور دانائی سے پیدا کی جائے تو وہ طبیعتِ ثانیہ ہے اور اگر نادانی اور بدسلیقگی سے پیدا کی جائے تو وہ میمون[1] طبیعت ہے جو اس کی نقلیں بے ڈھنگی اور بُری طرح سے آتارتا ہے اور منہ چڑاتا ہے ، جس سے کچھ فائدہ نہیں حاصل ہوتا ۔ ارسطو کا قول یہ ہے کہ روحانی عادت کا نام نیکی ہے ۔

۷۔ تعصّب

۱۔ لفظِ تعصّب کے بہت سے معانی عربی میں ہیں ۔ آن میں سے ایک معنی حمایت کرنے کے ہیں اور اصطلاحی معنی یہ کہ آدمی کسی چیز کو بے دلیل مانے ، باوجودیکہ آس کی رد میں دلائلِ صحیحہ موجود ہوں ۔ اس کو ہٹ کرنا یا ہٹ دھرمی بھی کہتے ہیں ۔ مگر جس انگریزی لفظ کا ترجمہ تعصّب کیا جاتا ہے ، اس کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ کسی بات میں آدمی اپنی رائے پہلے سے قائم کر لے ، بغیر کامل یا سخت طور پر سوچنے کے ، خواہ یہ رائے صحیح ہو یا غلط ۔ جب تک یہ نہ تحقیق ہو کہ وہ کس بنا پر قائم ہوئی ہے تو یا وہ غلط ہوگی یا بغیر شہادتِ مناسب کے ۔ بہت سی صورتوں میں تعصّب ایسی رائیں ہوتی ہیں جو کسی سبب سے آدمی کو خوش کرتی ہیں ۔ مگر اس کو ان کے سچ ہونے کا یقین نہیں ہوتا ، اس لیے وہ ان کی تحقیق و امتحان سے خائف ہوتا ہے کہ کہیں وہ جھوٹی نہ ثابت ہو جائیں ۔ تعصّبات کی[2] رائیں بے وجوہ کے ہوتی ہیں جو بعض اور سببوں سے — سوائے حق پرستی کے — قائم ہو جاتی ہیں ۔

۱۔ میمون = بندر ۔

۲۔ ”کی“ اضافہ مرتّب ۔

جس سبب سے وہ پیدا ہوتی ہیں وہ اسی کی قسم سے موسوم ہوتے ہیں۔ یہ سبب یا تو خرسندی، معصومی، معاشرت یا بغض، حسد، کینہ ہوتے ہیں۔

۲- ہر شخص[1] یہ شکایت کہ اَوروں کو تعصّب کیسا گمراہ کر رہا ہے، اس طرح سے کرتا ہے کہ گویا یہ اس عیب سے بالکل پاک صاف ہے اور کوئی اس کا اثر اس میں نہیں ہے۔ یہ اعتراض تعصّب پر سب طرف سے یکساں ہوتا ہے اور یہ بات بالاتفاق مانی جاتی ہے کہ وہ آدمی کی ایک خطا ہے اور علم کے واسطے ایک بڑی روک ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ اس کا علاج سوائے اس کے کوئی اور نہیں ہے کہ اَوروں کے تعصّبات سے قطع نظر کر کے آدمی فقط اپنے تعصّب کا امتحان کرے۔ کوئی شخص دوسرے کو الزام لگا کے خود اپنے الزام سے بری نہیں ہو جاتا۔ آدمی ایک دوسرے پر بہتان و تہمت ایک ہی قاعدے سے لگاتے ہیں، اس لیے وہ اس سے بری نہیں ہوتے۔ اس تعصّب کی جہالت اور غلطی کے بڑے سبب کو دنیا سے یوں ہی مٹا سکتے ہیں کہ ہر ایک شخص بغیر کسی جانب داری کے اپنا امتحان کرے۔ اگر[2] اور لوگ اپنے دل کے ساتھ معاملہ راست بازی کے ساتھ نہیں کرتے تو یا اس سے میری خطائیں درست و صحیح ہو جائیں گی یا ان خطاؤں کے ساتھ[3] مجھے محبت پیدا ہو جائے گی اور ان کو میں اپنے دل کے ساتھ چسپاں کر لوں گا۔ اگر اَور شخصوں کو اپنی آنکھوں پر جالا رکھنا پسند ہو تو کیا میں اس سبب سے اپنی آنکھوں پر سے جالا، جب کہ میں

۱- اصل: ہر شخص کی یہ شکایت۔

۲- اصل: کہ اگر۔

۳- اصل: ان خطاؤں کے ساتھ اس سے۔

اُتروا سکتا ہوں ، نہیں اُترواؤں گا ؟ جو شخص کہتا ہے کہ اندھا ہونا بُرا ہے اور اُن چیزوں کا وہ شوق نہیں رکھتا کہ جن سے آنکھوں کی روشنی کم ہو یا دن کی صاف روشنی اُن سے دور ہو ، وہی امرِ حق اور علم کی طرف جا سکتا ہے ۔ بہت سے مسئلے، مقولے مشتبہ اور جھوٹے ہوتے ہیں ۔ ان کو لوگ صحیح اور سچ یقین کرتے ہیں ۔ اس سے وہ گمراہ ہوتے ہیں اور تاریکی میں پڑتے ہیں ۔ تعلیم اپنے گروہ کی طرف‌دار ہے ۔ ادب و لحاظ ، وضع و طرز ، خود غرضی اور اِسی قسم کی اور باتوں سے تعصبّات پیدا ہوتے ہیں ۔ انسان اپنے بھائی کی آنکھ میں ذرے کو دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ میں شہتیر کو نہیں دیکھتا ۔ گو ہر شخص اپنے عیبوں کے دیکھنے میں اندھا ہے مگر اس پر واجب ہے کہ مستعد ہو کر اپنے اصول کی خوب چھان بین کرے اور یہ دیکھے کہ وہ امتحان اور آزمائش کے متحمّل ہو سکتے ہیں یا نہیں ۔ صرف یہی ایک بات ہے جو آدمی کو علم اور صداقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے ۔

تعصّب بڑا اندیشناک ، مکّار ، چال باز ہے ۔ وہ ہمیشہ اپنے تئیں راست بازی کے لباس میں دکھاتا اور صداقت کی شباہت بناتا ہے ۔ بڑی مہربانی اور شفقت سے آنکھوں پر پٹّی باندھ کے تاریکی کے اندر لے جاتا ہے اور ایسا آدمی کو دم میں لاتا ہے کہ وہ اندھا بنا ہوا اس تاریکی کو بڑی روشنی سمجھتا ہے ۔ پس جو لوگ اس کی بیخ و بُن اُکھیڑنی چاہتے ہیں اُن کے واسطے یہ مضمون لکھا جاتا ہے کہ وہ اپنے تعصّبات سے آگاہ ہو کر جانیں کہ وہ ہمارے علم و راستی کی بڑی سدِّ راہ ہے ۔ اگر ایک شخص کسی معاملے میں رائے مستقل رکھتا ہے اور زبان سے کہتا ہے ”میں نے اپنی رائے براہینِ مستحکم پر قائم کی ہے ، یہ رائے میری خیالی نہیں ہے اور میرے میلانِ طبع

کے سبب سے نہیں پیدا ہوئی بلکہ جب اس کے واسطے مجھے بڑی عمدہ شہادت ملی ہے تو اس کو اختیار کیا ہے" لیکن کیسی ہی دلائلِ حقّہ اُس کی رائے کے خلاف پیش کی جائیں اُن پر وہ کان نہیں لگاتا ، دوسری جانب کی طرف وہ کسی طرح سے نہیں جھکتا ، تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس پر تعصّب مسلّط ہے ۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس میں کوئی خلل نہ پیدا کرے ۔ یہ کسی شہادت کے سبب سے سچ کا ماننا نہیں ہے ، بلکہ کاہلی سے پہلے سے ایک بات کا سوچ لینا ، یوں ہی کسی اپنی عزیز بات کو فرض کر لینا اور اپنے تئیں تحقیق کی تکلیف سے بچانا ہے ۔ اگر کوئی بات سچّی شہادت سے ثابت ہو اور رائے مستحکم دلائل پر مبنی ہو تو پھر اس کو خوف کیا ہے کہ وہ معرضِ امتحان و ثبوت میں آئے ۔ اگر کسی شخص کی رائے مستحکم بِنا پر قائم ہو اور جو دلائل کہ اس کو سہارا دیتی ہیں اور اس کی مقبول ہیں ، صاف اور سچّی اور اچھی اور یقین دلانے والی ہوں تو پھر کیوں آدمی گُھنّا پن[1] ان کے ثبوت اور عدمِ ثبوت میں اختیار کرے ۔ جو شخص ایک بات بغیر شہادت کے قبول کرتا ہے اور زیادہ تر اُس کے ساتھ گرویدہ ہوتا ہے ، وہ یہ بتلاتا ہے کہ میں اس میں تعصّب کرتا ہوں ۔ اور جب وہ اپنی کسی مخالف بات کو سنتا ہی نہیں تو وہ اپنے تعصّب کو خوب ظاہر کرتا ہے اور گویا یہ کہتا ہے کہ میں نے جو اپنی خوشی اور شوق کے لیے یہ رائے قائم کی ہے ، جو دلائل اس کے برخلاف قائم ہوں ، بغیر سنے اور امتحان کیے ان پر[2] لعنت بھیجتا ہوں ۔

۱۔ گُھنّا پن = کسی بات کو جانتے ہوئے انجان بن جانا ۔

۲۔ اصل : اس پر ۔

۳۔ جو شخص علمِ مناظر جانتا ہے ، وہ سمجھتا ہے کہ چیزوں کے دیکھنے اور ان کے دکھائی دینے کے کیا کیا روپ ہیں ۔ آنکھوں پر جس رنگ کا شیشہ لگاؤ ، اسی رنگ کی سب چیزیں اپنا رنگ بدل کر دکھاویں گے ۔ اسی طرح جب ہم اپنی رائے کے شیشے میں اشیا کو دیکھتے ہیں تو وہ سب اپنا رنگ بدل کر ہماری رائے کے رنگ میں دکھائی دیتی ہیں ، اور پھر ہمارے خیال کی روشنی ان کو وسیع ، مضاعف[1] ، مختصر ، معکوس اور ہزار طرح کی ایسی صورتوں میں بدل لیتی ہے ۔

۴۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں اپنے تئیں تعصّب سے یوں باز رکھتا ہے کہ اَوروں کی رائے کے استناد اور استشہاد کو نہیں مانتا اور ان کا مقابلہ کرتا ہوں ، تو اپنے آپ پر یکتا ہونے کے غرور کا ، برخود غلط ہونے کا ، خودپرستی کا اور بہت سی برائیوں کا دروازہ کھولتا ہے ۔ ناحق کے جھگڑے اور مباحثے کھڑے کرتا ہے ۔ وہ یہ جانتا ہے کہ لوگ میری طرف آئیں اور میں ان کی جانب نہ جاؤں ۔ ہم کو ان کی رائے پر اطمینان نہیں کرنا[2] چاہیے ، خواہ وہ کیسا ہی دعویٰ کریں ، جب تک اَور لوگ ان پر شہادت نہ دیں ۔

۵۔ مقتضائے عمر تعصّب ہوتا ہے ۔ بڑھاپے میں یہ تعصّب ہوتا ہے کہ پہلا زمانہ اچھا تھا اور اب زمانہ برا ہے ۔

۶۔ ہم کو بہت سے تعصّبات ایسے ہوتے ہیں کہ ہم اپنی محنت و سعی کے امتحان اور اندازہ کرنے میں اندھے ہو جاتے ہیں ۔ مثلاً لڑکپن میں جو ہم عبارتیں لکھتے ہیں اُن سے ہم اس لیے خوش ہوتے ہیں کہ وہ ہماری ایامِ طفلی کی یادگار ہیں اور اس کے بعد جو

۱۔ مضاعف = دو چند ۔

۲۔ اصل : اطمینان نہیں کہنا چاہیے ۔

کچھ لکھا ہے ، اس لیے اس کی خوشی سے قدر کرتے ہیں کہ وہ ہماری ترقی کی معیار ہے ۔ اس کے بغیر ہم کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہم نے کبھی ترقی کی ۔ جو کچھ ہماری قلم سے بے ساختہ نکل جاتا ہے ، اس پر ہم واہ واہ کہہ کر فریفتہ ہو جاتے ہیں ۔ وہ ہماری قوتِ عقل و رائے کی خوشامد کرتے ہیں ۔ اور جو بہت محنت و مشقّت سے خونِ جگر پی کر لکھتے ہیں ، اس لیے ناپسند نہیں کرتے کہ اس سے ہماری محنت اکارت جاتی ہے ۔

۷۔ ہر شخص کو یہ خیال ہے کہ میری عقل کو کمال ہے :

هر کس عقلِ خود را بکمال مے داند[1]

جن رایوں کو وہ اقرار کرتا ہے[2] اُن سے چمٹا چلا جاتا ہے ، حالانکہ تقریباً کُل آدمی اَوروں کی رایوں کی رہ نمائی پر چلتے ہیں ، نہ اپنی سمجھ پر ۔ سچ یہ ہے کہ بہت کم آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ کوئی رائے آپ پیدا کرتے ہیں ، بلکہ سارے کے سارے اَوروں کی رایوں کو اختیار کرتے ہیں ۔ دایہ ، مربّی ، معلّم اور سب سے زیادہ معلّمِ اعظم رسم و رواج ہمارے خیالات کو مدد دیتے ہیں ۔ ان کے بنانے میں ہماری رائے کو کچھ دخل نہیں ۔ وہ چپ چاپ دل کے اندر ایسے چلے جاتے ہیں جیسے کہ خارجی چیزوں کے تصوّر ۔ غرض ہمارا تعصّبِ تعلیم ، رسم و رواج سے پیدا ہوتا ہے ۔ اسی سے یہ عادت ہم کو پڑتی ہے کہ ہم وہی خیال کرتے ہیں جو اَور پہلے سے خیال کرتے چلے آئے ہیں ۔ اور اس کا علم ہی نہیں ہے کہ کیونکر کوئی

۱۔ یعنی ہر شخص اپنی ہی عقل کو کامل سمجھتا ہے ۔

۲۔ یعنی جو آرا وہ خود قائم کرتا ہے ان کو دوسروں کی آرا سے افضل جانتا ہے ۔

خیالِ جدید پیدا کیا کرتے ہیں - ہمارا حافظہ اَوروں کے خیال سے لادا جاتا ہے اور سمجھ کو مشق کے لیے جگہ نہیں ملتی - اور اگر وہ مشق کرتی ہے تو ایسے حال میں جو اسے روکتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہاں یہاں قدم رکھ - آخر کو یہ باتیں ، جو مصنوعی ہوتی ہیں ، ہماری ایک قسم کی طبیعت ہو جاتی ہیں - پھر آدمی کا دل ان سے ہٹ کر دوسری طرف نہیں جاتا - یہ بات بہت سی صورتوں میں صحیح ہے مگر انوکھی بھی ہے - جیسے جاہل آدمی کے واسطے علم کی راہ جیسی آسان اور مختصر ہے ، اُس شخص کے واسطے نہیں ہے کہ جو اغلاط میں مبتلا ہو - جاہل کو فقط ایک کام سیکھنے کا ہے اور دوسرے کو سیکھنے اور بھلانے کے دوہرے کام ہیں ، اور بھلانے کا کام بہت سی صورتوں میں نہایت دشوار ہے -

۸- جب آدمی کوتاہ نظر مثلِ مگس ہوتا ہے تو اُس کو آنکھوں کے آگے بہت کم نظر آتا ہے - اس سبب سے تعصّبات پیدا ہوتے ہیں - جیسے کُل بڑی عمارت کو مکّھی نہیں دیکھ سکتی ، ایسے ہی متعصّب تمام تدابیر کے منصوبوں کو نہیں دیکھ سکتا - ناہمواری اس کی نظر کو روکتی ہے اور تعصّب پیدا کرتی ہے -

۹- خواہ ایک شخص ہو یا ایک قوم ہو ، دونوں کی برائیوں بھلائیوں کے اندازہ کرنے کا طریقہ ایک ہی ہے - ہم دیکھتے ہیں کہ جب قومیں ایک دوسرے کی لیاقتوں کو تشخیص کرتی ہیں تو اس میں عدالت کو کام میں نہیں لاتیں - تعصّب کو زیادہ دخل دیتی ہیں - میزانِ عدالت کے پلڑوں میں برائیوں اور بھلائیوں کو رکھ کر نہیں تولتیں - برائیاں بتلا کے ڈنک لگاتی ہیں مگر نیکیوں کو فراموشِ خاطر کرتی ہیں - پس دوسری قوموں کی نیکیوں کے بھلانے نے دنیا میں ایک قیامت برپا کر رکھی ہے - اسی سے سارے جھگڑے قضیّے

کھڑے ہوتے ہیں ، اصولِ عامہ میں درہمی برہمی ہوتی ہے ، حب الوطنی زہر بن جاتی ہے ۔ انسان کی مسرّت سے جن آدمیوں کو ذرا سی بھی محبت ہو ان کو یہ بات خوب جاننی چاہیے کہ ہم اپنے تعصّب کو ، جو نہایت زبوں اور مضر ہے ، کیونکر کام میں لاتے ہیں ۔ جو شخص بے تعصّب ہو کر اَوروں سے برادرانہ ملتا ہے اُس کو شاذ و نادر ہی کسی دشمن سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے ۔

۱۰۔ تعصّب کے ساتھ جب کوئی اَور صفت لگائی جاتی ہے تو مختلف طرح کے خیالات ان کی نسبت پیدا ہوتے ہیں ۔ مثلاً تعصّبِ قومی ، تعصّبِ مذہبی ، تعصّبِ تعلیم ، تعصّبِ معاشرت ، تعصّبِ وطن ۔ بعض آدمیوں کے نزدیک تعصّبِ قومی ایک نیکی ہے ۔ وہ نیکی جب ہے کہ اپنے اعتدال کی حد میں رہے ۔ وہ حقیقت میں ایک محبت ہے ۔ لیکن اگر وہ حدِ اعتدال سے تجاوز کرے تو پھر نیکی نہیں رہتی ہے ۔ مثل مشہور ہے کہ سخاوت پہلے اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے ۔ پس کوئی شخص اپنے عزیز و اقربا کے ساتھ سخاوت کرے تو نیکی ہے ، مگر یہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ گھر سے باہر سخاوت وہ نہ کرے ۔ آدمی اپنی قوم کے ساتھ بھلائی کرے ، اچھا ہے ، مگر اس کے ساتھ وہ یہ جانے کہ اَور دنیا کے آدمی بھی اس کے ہم وطن اس اعتبار سے ہیں کہ دنیا میں دونوں رہتے ہیں ۔ وہ جس ملک میں ، جس شہر میں ، جس محلے میں رہتا ہو اُس پر مہربانی کرنے کو وہ ترجیح اَوروں پر دے ۔ مگر اس کو سارے آدمیوں کے ساتھ مہربانی اور لطف و کرم کے ساتھ پیش آنا چاہیے ، اور یہ سمجھنا چاہیے کہ دنیا بھی میرا بڑا شہر ہے ۔ گو ایک شخص میرا ہم زبان ، ہم لباس ، ہم وضع نہ ہو مگر ہم منزل ضرور ہے ۔ دونوں دنیا میں تھوڑے دنوں کے لیے سفر کرنے آئے ہیں ۔ بعض قوموں کا تعصّب بہت بڑھ

جاتا ہے۔ وہ اپنے ہم قوم کے ساتھ محبت کرتے ہیں، دوسری قوموں سے نفرت۔ اور اپنی قوم کو دنیا کی کُل قوموں پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اپنی ہی روشنی کو دیکھتے ہیں، دوسرے کی روشنی کو تاریکی جانتے ہیں۔ تعصّبِ مذہبی بھی تعصّبِ قومی سے کم نہیں ہوتا۔ یہ دونوں تعصّب اندیشے سے خالی نہیں ہوتے۔ اس کے بعد تعصّبِ تعلیم ہے: جیسی آدمی تعلیم پاتا ہے، اُس کا بڑا طرف دار ہوتا ہے۔ ساری عمر اس کا تعصّب رہتا ہے، یہاں تک کہ اگر ایک شخص چوری میں چوروں سے تعلیم پائے تو اس تعلیم کو وہ اَور ساری تعلیموں سے اچھا جانے گا۔ اگر اس کو چوری کا مجرم کہیے تو وہ یہ ثابت کرے گا کہ چوری جرم نہیں ہے۔

۸- بچّوں کو نصیحت در بابِ گفتگو

اے بچو! میں تم کو گفتگو کے باب میں چند نصیحتیں اس لیے کرتا ہوں کہ آدمی جو باتیں کیا کرتے ہیں اُن کے بُرے بھلے معنی لگائے جاتے ہیں اور اس کے موافق ان کا بہت کچھ برا بھلا ہو جاتا ہے۔ جس بات کو تم جانتے ہو یا یقین کرتے ہو کہ وہ جھوٹ ہے، اُس کو کبھی ایسے پیرایے میں نہ بیان کرو کہ وہ سچ معلوم ہو۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک جھوٹ بولنے کے برابر کوئی گناہ نہیں۔ اللہ میاں نے زبان سچ بولنے کے لیے دی ہے، جھوٹ بولنے کے لیے نہیں۔ قطع نظر اس گناہ کے یوں بھی جھوٹ بولنا انسان کے حق میں مضر ہے۔ جب ایک آدمی دوسرے آدمی سے دروغ بولے تو کیسے ان کی سوسائٹی میں سلامتی اور خیریت رہ سکتی ہے۔ کذب سے دل ایسا پاجی اور کمینہ ہو جاتا ہے کہ بے ضرورت جھوٹ بولتا ہے اور سچ بولنا مشکل ہو جاتا ہے، اور سچ بولے تو کوئی اعتبار نہیں کرتا۔

اس کو عادت کے سبب سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔

تم کو جھوٹ بولنے سے پرہیز ہی نہیں چاہیے بلکہ اس کے سایے سے گریز۔ اگر کوئی بات تمھاری رائے یا قیاس کے موافق ہو یا تم کو اس کی اطلاع ہوئی ہو تو اس کو یوں نہ بیان کرو کہ وہ قطعی اور یقینی اسی طرح ہے۔ ہمیشہ مختصر الفاظ میں باتیں کیا کرو، خصوصاً اجنبی اور بزرگوں کے سامنے، کیونکہ وہ موقع ایسا ہوتا ہے کہ اس میں تم بزرگوں یا اجنبی آدمیوں کی باتیں سن کر اپنا علم و تجربہ بڑھاؤ اور عقل مندی حاصل کرو۔ نہ یہ کہ بکواس کرو جس سے تمھارا ضعفِ عقل ظاہر ہو اور علم و ادب سیکھنے کا موقع ہاتھ سے جائے۔ ایسے مواقع پر بولنا گستاخی سمجھی جاتی ہے اور خاموشی بہتر ہوتی ہے۔ گفتگو میں درشتی اور طُمطراق نہ ہو۔ مخالفوں کو استدلال اور براہین سے ساکت کرو، نہ یہ کہ اپنے غل شور مچانے سے۔

جب کوئی دوسرا شخص بول رہا ہو تو اس کی بات نہ کاٹو۔ پہلے اس کی پوری بات سن لو گے اور سمجھ لو گے تو پھر اس کو جواب خاطر خواہ دے سکو گے۔ جب کوئی بڑا ضروری کام درپیش ہو تو اس میں بولنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے۔ اور جو کچھ بولو، پہلے اس کے معانی خوب سمجھ لو۔ کوئی طعن و طنز اس میں ایسی نہ ہو کہ وہ کسی کو ناگوارِ خاطر ہو اور باعثِ رنجیدگی ہو۔ جو کچھ کہو ادب و حیا کے ساتھ۔ عاقل بولنے سے پہلے سوچتا ہے اور احمق بولنے کے بعد۔

کوئی شخص زراعت خوب جانتا ہے اور کوئی تجارت، کوئی علومِ ریاضیہ۔ غرض جو شخص جس فن کا ہو اس سے تم باتیں اسی فن کے متعلق کرو۔ اس سے تمھاری معلومات بڑھے گی۔ اس طرح کی

معلومات بہت کام آتی ہے۔

جب تم اوچھے، اوباش، بیہودہ، شوخ آدمیوں کی صحبت میں بیٹھو تو زبان کو لگام دو اور بہت احتیاط سے بولو، اور اپنا برتاؤ ان کے ساتھ ایسا رکھو کہ کوئی برائی ان کی تم کو نہ لگ جائے۔

اگر کسی شخص کو تم جانو کہ وہ سچا، سنجیدہ، متین آدمی ہے، اور وہ تمھارے سامنے عجیب و غریب باتیں بیان کرے تو تم ان کو یقین نہ کرو اور نہ اَور لوگوں کو ان کو سناؤ۔ مگر یہ بھی نہیں کہ تم ان کے ساتھ بحث و تکرار شروع کرو کہ یہ باتیں نہیں ہو سکتیں۔ مگر ہاں تم کو اپنی اظہار رائے کی اجازت ملے تو اس کو نہایت ادب و لحاظ سے ظاہر کرو۔ غرض ایسی باتیں کرو کہ نہ دوسرے کو رنج ہو، نہ تمھاری احمقانہ سریع الاعتقادی ظاہر ہو۔ کبھی کوئی لفظ اپنی تعریف کا زبان پر نہ لاؤ۔ اگر اپنی تعریف آپ کرو گے تو اس سے معلوم ہوگا کہ تمھاری شہرت بہت تھوڑی ہے اور ایسی تعریف، اپنے منہ سے میاں مٹھو، لوگوں کو ناگوار ہوتی ہے اور رنجیدہ خاطر کرتی ہے اور تم کو ڈبوتی ہے۔ تم کسی کی غیبت نہ کرو جب تک وہ اس کا مستحق نہ ہو اور اس کی ضرورت نہ ہو۔ باتیں کرنے میں نہ قسم کھاؤ، نہ مثل اس کے اَور ایسے الفاظ کہو کہ ہم سچ کہتے ہیں یا ہماری عادت جھوٹ بولنے کی نہیں۔ اگر جھوٹ بولیں تو مرتے وقت ایمان نصیب نہ ہو اور علیٰ ھذا القیاس۔

جن آدمیوں میں قدرتی عیب و نقص دیکھو تو ہنسی کی باتوں میں ان کی خاک نہ اڑاؤ، بلکہ ان سے دل میں متأثر ہو کر نیکی پیدا کرو۔ کبھی ایسی گفتگو نہ کرو کہ جس کے الفاظ لوگوں کا کلیجا چھیدیں اور چھاتیوں میں برچھیاں لگائیں اور اَوروں کی تذلیل و

تحقیر و تخویف کا باعث ہوں - اچھے الفاظ دوست بناتے ہیں ، برے الفاظ دشمن - آدمی کو چاہیے کہ جتنے دوست دیانت کے ساتھ پیدا ہو سکیں ، پیدا کرے - پھر جب دوست ایسے ارزاں چند الفاظِ شیریں میں ہاتھ لگیں تو ان کو کیوں چھوڑے - اس سے زیادہ کوئی حماقت نہیں کہ تم کسی شخص کو اپنا دشمن بنا لو جس سے اپنے تئیں کچھ فائدہ بھی نہ ہو - جب چھوٹوں سے خطائیں سرزد ہوں تو بزرگوں کو ان کی اصلاح ضرور ہے - مگر یہ اصلاح بغیر تلخ کلامی اور درشت زبانی کے[1] ہو تو بہتر ہے - درشت زبانی خطاوار کو ڈھیٹ کر دیتی ہے اور ملامت کرنے پر ملامت کرتی ہے - اگر کسی شخص کو غصہ بہت آتا ہو اور[2] وہ تم سے بری طرح بولے تو تم اس پر رحم کر کے معاف کر دو ، غصّے نہ ہو - تم خوب جان لو کہ خاموشی اور شیریں کلامی انتقام کے لیے لعنت ملامت سے بہتر ہے - وہ فوراً دوسرے کے غصے کو فرو کر دیتے ہیں اور وہ اپنی حرکت پر نادم ہونے لگتا ہے ، اور یوں سخت سزا اس کو اپنی خطا کی مل جاتی ہے - کبھی قسم نہ کھاؤ ، کسی کو کوسو نہیں - قسم کھانا ، کوسنا پاجی کمینوں کی عادت ہوتی ہے - بعض برائیاں چھوٹے آدمی بڑے آدمیوں سے سیکھتے ہیں ، بعض برائیاں بڑے آدمی چھوٹے آدمیوں سے سیکھتے ہیں - پس یہ قسم کھانا اور کوسنا شریف ، رذیلوں سے سیکھتے ہیں - یہ دونوں برائیاں ایک سی پاجی پنے کی ہیں - خدا کی قسم کھانا اور یہ کسی کو کہنا کہ خدا تجھ کو جہنّم میں ڈالے ، ایک ہی بات ہے - کیا ناخدا پرستی ہے کہ آدمی

۱- اصل : زبانی کی ہو -

۲- ’’اور‘‘ اضافہ مرتب -

جن اپنے اعضا اور جان کی سلامتی چاہتا ہے اُن سے محرومی کے لیے دوستوں اور عزیزوں کو کوستا ہے۔ جو اَوروں پر لعنت کرتا ہے اس پر خود لعنت ہوتی ہے۔ جو خود فوّارۂ لعنت بنتا ہے اس پر لعنت خود پڑتی ہے۔

۹۔ خاکساری کے ساتھ زندگی بسر کرنی

جو بزرگ کہ خاکساری و فروتنی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، وہ اپنے تئیں دنیا کے تمام جھگڑوں اور بکھیڑوں سے بچاتے ہیں۔ نہ خود حاسد ہوتے ہیں، نہ کسی کے محسود بنتے ہیں۔ نہ خود کسی کی آداب اور کورنش بجا لاتے[۱] ہیں، نہ اَوروں سے اپنی تعظیم و تکریم کراتے ہیں۔ اگر کوئی یک رنگ، بے ریا دوست مل گیا تو اُس کے ساتھ ایسے مقامات میں پھرتے ہیں کہ نہ کوئی ان کو جانے، نہ وہ کسی کو جانیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم جگت آشنا ہوں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنا دروازہ کھول دیں کہ لوگ آن کر ہماری تضییعِ اوقات کیا کریں اور اپنے پیچھے روزانہ لوگوں کی ہرزہ درائی کی وبا لیں۔ وہ اس میں اپنی عزت نہیں سمجھتے کہ ان کو بہت لوگ جانیں، اور جب وہ راہ میں چلیں تو لوگ اُنگلیوں سے ان کو اشارہ کر کے بتائیں۔ یہ بات تو اُن چیزوں کو بھی حاصل ہے جو قدرتی یا مصنوعی عجیب و غریب ہوں۔ جو شخص اونچی دکان لگا کے دوائیں جھوٹی تعریف کر کے بیچتا ہے، اس کو بہ نسبت حاذق حکیم کے اور جو شخص پھانسی دیتا ہے، اُس کو بہ نسبت جج کے لوگ زیادہ جانتے ہیں، اور راستے میں

۱۔ اصل: کورنش بجاتے ہیں۔

آنگلیوں کے اشارے سے بتاتے ہیں - نیک نامی بے شک اچھی چیز ہے کیونکہ وہ نیکی کا سایہ ہے - اور سایہ بھی وہ نہیں ہے کہ آدمی[1] کے ساتھ رہنے سے اس کو فائدہ نہ پہنچائے بلکہ وہ ایسا مؤثر ہے کہ اَوروں کو فائدہ پہنچاتا ہے - وہ سب سے زیادہ شان و شوکت دیانت کے پرتو کو جانتے ہیں ، گو اس سے زندگی میں کچھ فائدہ نہیں پہنچتا ، اور مرنے کے بعد بھی معلوم نہیں کہ کیا ہو - غرض وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کھانے پینے کو پاس ہو اور ہر کام اعتدال کے ساتھ ہو ، دو چار یک رنگ دوست بات چیت کرنے کے لیے ہوں اور چند ہمسائے کے آشنا ان کو اچھا جانتے ہوں ، اور کوئی برا ان کو نہ کہتا ہو ، اور اس دنیا سے بغیر پیرانہ سالی کی[2] تکلیفیں آٹھانے کے چل بسیں ، تو دنیا کے بڑے بڑے امیروں اور بادشاہوں سے اچھے ہوں -

۱۰- شرافتِ نسب پر فخر

۱- آدمی کو نکوکاری بلندی پر چڑھاتی ہے اور بدکاری پستی میں گراتی ہے - پھر اس سے کیا مطلب ہے کہ کوئی شخص کسی نسل سے پیدا ہوا ہے ، اور اس میں کیا بدنامی ہے کہ اس کی نسل اچھی نہ تھی - زشت کرداری کے واسطے باپ دادا کی شرافت عذر نہیں ہو سکتی - وہ پاجی پنے کی دلیل ہو سکتی ہے - کوئی شخص باپ دادا کے سبب سے نہ خدا کے نزدیک ، نہ انسان کے نزدیک سربلند ہو سکتا ہے - اگر کوئی شخص عالی نسب ہو یا بدنسب ، اس کا ہاتھ جو ضرر پہنچائے گا اس میں کوئی بات ایسی نہیں پیدا ہوگی

۱- اصل : شخص کے ساتھ - ۲- اصل : کے -

کہ لوگ اس کو آسانی سے برداشت کر لیں ، اور اگر وہ مہربانیاں کرے گا تو اس کے قبول کرنے میں کوئی انکار نہیں کرے گا ۔ لیاقت اور قابلیت جائداد کی طرح ورثے میں نہیں آتیں ۔ اگر آتی ہوتیں تو پیغمبروں کی اولاد میں سے پیغمبری کیوں جاتی ۔ اگر کوئی شخص بڑے نواب ، خان اور دولت مند کے ہاں پیدا ہو تو اس کے سر میں دماغ پُر فروغ نہیں ہو جائے گا اور دل میں سچّائی نہیں پیدا ہو جائے گی ۔ ان خوبیوں کے پیدا ہونے کا سببِ اعلیٰ تو اَور ہی ہوتا ہے ۔ کسی شخص کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ اپنی دولت مندی اور شرافتِ نسب کے سبب سے دوسرے لائق شخص کو[1] ، جو اُس سے کمتر ہو ، حقارت سے دیکھے ، کیونکہ ایک شخص بڑا اپنے دادا کی لیاقت کے سبب سے ہے ، یہ دوسرا اپنی ذاتی لیاقت کے سبب سے ۔ اب تمھی انصاف کرو کہ ان دونوں میں بڑا جواں مرد کون ہے ؟ جو لوگ اپنی شرافت پر مغرور ہوتے ہیں وہ یہ کہا کرتے ہیں کہ کیا ہم کو یہ فخر کی جگہ نہیں ہے کہ ہماری نسل میں نسلاً بعد نسلٍ[2] اتنی مدت سے لائق فائق دولت والے چلے آتے ہیں ؟ ان کو یہ سمجھانا چاہیے کہ ہر شخص کے ، ہر خاندان کے ، ہر سلطنت کے ، ہر ریاست کے لیے[3] یہ ضروری امر ہے کہ اس کی ابتدا ہو ۔ پس جو شخص اُس کی ابتدا کرے گا ، اُس کا حال ایسا ہی ہوگا جیسا کہ ایک نودولت شخص کا ۔ پس جس طرح اس نو دولت پر اعتراض ہوتے ہیں ، اُسی

۱۔ اصل : شخص پر ۔

۲۔ اصل میں ”نسلاً بعد نسلاً“ چھپا ہے جو غلط ہے ۔

۳۔ اصل میں جملہ یوں تھا : ”ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر شخص کی ، ہر خاندان کی ، ہر سلطنت کی ہر ریاست کے لیے یہ ضروری امر ہے کہ . . . ۔“

طرح ان کے باپ داد میں سے اُس شخص پر بھی ہوئے ہوں گے جس نے ابتداءً امارت کی بنیاد ڈالی[1] - پس جس شخص کے سبب سے ہم کو یہ عزت و آبرو حاصل ہوئی اُس کا حال ایسا ہی تھا جیسا کہ اُس نو دولت کا ہے - پس ایک شخص جو اپنے باپ دادا کی لیاقت سے معزّز ہوا ہے اور ایک اپنی ذات سے ، ان دونوں میں دوسرا آدمی زیادہ شریف ہے - اس نے دولت اپنی لیاقتِ ذاتی سے پیدا کی ہے - اگر شرافت کا مدار نیک افعالی پر رکھا جائے تو کوئی خاندان شریف نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ نیک کردار نہ ہو - اور نکوکاری نسل میں نہیں چلتی - ہاں بعض آدمی یہ کہیں گے کہ یہ قدرتی قاعدہ ہے کہ اولاد اپنے باپ دادا کی عزّت و آبرو کا پاس کرتی ہے اور اُنھی کی سی لیاقت پیدا کرنے میں سعی و کوشش کرتی ہے - پس اس سے معلوم ہوا کہ لیاقت اور نیکی کچھ نسل کے سبب سے نہیں آتی بلکہ محنت اور کوشش و سعی پر منحصر ہے ، یعنی تعلیم پر - تعلیم کا اثر بڑا زور آور ہے اور انسان کے اعمال اور افعال پر بڑا اثر رکھتا ہے - اس کے آگے شرافتِ نسب ، نیک کرداری پیدا کرنے میں کچھ دخل نہیں رکھتی -

۲- بہت سے اربابِ علم نے بڑی خوبی و لطافت سے یہ بات لکھی ہے کہ ذاتی صفت اور نیکی پر فخر زیبا ہے - وصفِ اضافی ، جو

۱- یہ جملہ اصل نسخے میں بہت الجھا ہوا ہے جس کی شکل یہ ہے :
''اس لیے اس پر جو اعتراض ہوتے ہیں وہ ان کے باپ دادا میں سے اس شخص پر جس نے ابتداء امارت کی بنیاد ڈالی اعتراض ہوئے ہوں گے -''
مرتّب نے ''اس لیے'' کی بجائے جملہ ''پس جس طرح'' سے شروع کیا اور مجبوراً دوسری تبدیلیاں بھی کیں -

آبا و اجداد کی شرافت سے حاصل ہوتا ہے ، اُس پر فخر نازیبا ہے - مگر ہمارے نزدیک ایسے بیانوں اور دلائل میں مبالغہ ہے - ہم کو چاہیے کہ جن لوگوں نے اپنے ملک کی عزّت و آبرو و قوّت و نیک نامی بڑھائی ہے یا اپنی قوم میں نیکی و دانائی کی افزائش کی ہے ، ان کی تعظیم و تکریم دل و جان سے کریں - اشراف زادوں کے خون میں بہ نسبت اجلاف[1] زادوں کے شرافت کا زیادہ دَورہ ہوتا ہے[2] - پس ایسا شخص جو عالی نسب ہو ، وہ اُس اپنے ہم لیاقت آدمی پر شرف رکھتا ہے جو اچھے خاندان کا نہیں ہے - بلکہ جو شخص کوئی اور خوبی و ہنر سوائے شرافتِ نسب نہیں رکھتا ، وہ بھی ادب و تعظیم کا مستحق بہ نسبت اَور عوام الناس کے ہے - بعض آدمیوں کو اس شرافتِ نسب پر بڑا غرور ہوتا ہے اور وہ اپنا بڑا ادب لوگوں سے چاہتے ہیں - ان کو یہ جاننا چاہیے کہ جہالت و بدکاری شرافتِ نسب کے پیراہن پر داغ لگا دیتی ہے اور نالائق کام دنیا کی نظروں میں ایسا ہی ذلیل کر دیتے ہیں جیسے کہ شرافتِ نسب ان کو سربلند اور

۱- اجلاف = اشراف کی ضد ؛ رزیل ، کمینے -

۲- جدید تحقیقات نے اس دعوے کو غلط ثابت کر دیا ہے کہ انسانی شرافت اور رزالت کا تعلق خون سے ہے - تجربتہً انتہائی شریف اور انتہائی رزیل خاندانوں کے دو نوزائیدہ بچوں کی تربیت ایک جیسے ماحول میں کی گئی - جب یہ بچے جوان ہوئے تو دونوں کی عادات و خصائل میں رتی برابر فرق نہیں تھا - چنانچہ ثابت ہوا کہ بچے کے مستقبل پر صرف اس کا ماحول اثر انداز ہوتا ہے - معاشی طور پر تباہ حال خاندان جہالت کی وجہ سے اچھائی اور برائی کے روایتی تصورات سے آشنا ہوتے ہیں لہٰذا ہر اخلاقی برائی ایسے خاندانوں کا مقدّر بن جاتی ہے - جہالت کی اس دلدل میں پروان چڑھنے والے بدنصیب انسانوں کو ہر برائی ان کے ماحول سے ملتی ہے - خون کا ان برائیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا -

عظیم الشان بناتی ہے - بعض آدمیوں کی یہ رائے ہے کہ جو کوئی نیا شخص بڑا صاحبِ لیاقت ہو تو اس کی عزّت ایسی ہی کرنی چاہیے جیسے نالائق شریف زادوں کی جن کے باپ دادا نے کبھی زمانے میں لیاقت کے کام کیے ہوں - غرض یہ لوگ ایسے آدمی کی حقارت کرتے ہیں جو لیاقت میں شریف خاندان کے بانیِ اول کے برابر ہے -

۳- فخرِ نسب تعصّب سے پیدا ہوتا ہے - اپنی ذات کی محبّت جب حماقت و غرور کے ساتھ اِزدواج[۱] کرتی ہے تو اس سے فخرِ نسب پیدا ہوتا ہے - انسان کو بڑا فخر اس سے اپنی پیدائش پر چاہیے کہ جسم قوی اور دماغ عالی ، فہم مستقیم ، رائے بلند ، دل روشن ہو ، نہ اُس خاندانی شجرے پر جس کے ثمر سب مرجھا کر بے مزہ ہو گئے ہیں - جو لوگ عالی نسب ہوتے ہیں وہ کہا کرتے ہیں کہ جو شرافتِ نسب خود نہیں رکھتے وہ اس کی قدر نہیں کرتے[۲] - وہ بے چارے کیا جانیں کہ شریفوں کے بدن میں شرافت کا خون دورہ کرتا ہے جس سے بڑے نیک کام ہوتے ہیں - رزیل آدمیوں کے رگ پٹھوں میں وہ خون ہوتا ہی نہیں جو جوش میں آ کر شریف کاموں پر آمادہ کرے - شرافتِ نسل تو وہ چیز ہے کہ جانوروں میں بھی دیکھی جاتی ہے - گھوڑوں اور کتّوں کی قیمت نسل کے سبب سے لگائی جاتی ہے - مگر یہ شریف نہیں جانتے کہ ایسا شرافتِ نسل کا دعویٰ تو ہر شخص یوں کر سکتا ہے کہ وہ کہے کہ میرا باپ وہ ہے جو سب سے اول آدمی تھا جس کی اولاد یہ سب انسان ہیں - غرض انسان کو اپنے نفس سے بڑی محبت ہے ، وہ یہ ناحق فخر و مباہات کراتی ہے -

---

۱- اِزدواج = دو چیزوں کا ایک ہونا ، مل جانا -
۲- اصل : نہیں رکھتے -

۴۔ گو غلاموں کو فقط غلام کے نام سے شرمندگی ہوتی ہے مگر وہ نیک چلن ہوں تو آزادوں سے ان کا درجہ کچھ کم نہیں، کیونکہ فقط غلام کے نام سے کوئی برا نہیں ہوتا۔ بہت سے غلام تو آزادوں سے اچھے ہوتے ہیں۔ فقط نام غلاموں کو بدنام کرتا ہے ورنہ[1] ان کا دل بہت آدمیوں سے، جو غلام نہیں ہیں، زیادہ آزاد ہے۔ غلام کا گوشت وہی ہوتا ہے جو اَور آدمیوں کا۔ وہ پیدائش سے غلام نہیں ہوتا، قسمت سے غلام ہو جاتا ہے۔ بڑا شریف عالی نسب وہی ہوتا ہے جو نیک خُلق ہو۔ بدخُلق خواہ کیسا ہی عالی خاندان ہو، کمینہ ہوتا ہے، اس لیے شرافتِ نسب کی وقعت میری نظر میں کچھ نہیں ہے۔

۱۱۔ دنیا کی نعمتوں کی شکر گزاری

دنیا میں ہزاروں مصائب ہیں۔ پس جس مصیبت سے تم بچو اس پر خدا کا شکر بھیجو۔ بیماریاں دیکھتے ہو کہ کتنی ہیں کہ کوئی پتھری کے مارے تڑپ رہا ہے، کوئی گھٹیا سے کٹھیا پر لگ رہا ہے، کوئی ہاتھ پاؤں سے اپاہج پڑا ہے۔ پس جب ہم تندرست اور امراضِ جسمانی سے خالی ہوں تو خدا کا ہزار ہزار اور اگر امراضِ روحانی میں مبتلا نہ ہوں تو لاکھ لاکھ شکر ہم کو بھیجنے چاہئیں۔ کسی ایک مصیبت سے بچے رہنا خدا کا ایک نیا فضل و کرم ہمارے حال پر ہے۔ بہت سے آدمی کھاتے پیتے ہیں، ہنستے ہیں، چین سے رہتے ہیں، گاتے ہیں، آرام سے اپنی نیند سوتے ہیں۔ دوسرے روز جاگتے ہیں اور تازہ دم ہو کر پھر وہی کام کرتے ہیں جو پہلے روز کیے تھے۔ ان آدمیوں کو وہ نعمتیں حاصل ہیں جن کو دولت مند اپنی ساری

۱۔ اصل میں ''ورنہ'' کی بجائے ''مگر'' ہے۔

دولت خرچ کر کے بھی نہیں مول لے سکتے ہیں - ہم بعض دولت مندوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ رات دن دولت جوڑنے کی فکر میں گرفتار رہتے ہیں کہ ان کو ہنسنے تک کی بھی فرصت نہیں ہوتی، اور انھوں نے اس دولت کے کمانے کے لیے اپنی کُل زندگی وقف کر دی ہے - حضرت سلیمان[ع] کے اس قول پر عمل ہے کہ دولت اُس کے واسطے ہے جو محنت کرتا ہے - ہاں یہ بات سچ ہے کہ آدمی کا خوش کرنا دولت کے اختیار میں نہیں ہے - کیا خوب ایک حکیم نے یہ لطیفہ کہا ہیں کہ دولت کے ورے پرے دونوں طرف مصیبتیں برابر ہیں - خدا وہ فقر و فاقہ تو دے نہیں کہ جس سے کمر ٹوٹ جائے، مگر اتنا دے کہ مایحتاج[1] کو کافی ہو تو پھر قناعت کر کے خدا کی شکرگزاری میں زندگی بسر کرنی چاہیے - آدمی کو نہیں چاہیے کہ وہ اس کی شکایت کرے کہ عطّیاتِ الٰہی غیر مساوی، انسانوں میں تقسیم ہوئے ہیں -

جب تم کسی شخص کو دیکھتے ہو کہ وہ دولت و مال سے مالامال ہے تو اس کی[2] ظاہری حالت کو دیکھتے ہو - اور اس کے تردّدات کو، جو حفاظتِ دولت کی کُنجی ہیں، نہیں دیکھتے، خدا ہی جانتا ہے - دولت مندوں کی کمربندوں میں دولت وہ بوجھ ہے جو چلنے نہیں دیتا - دولت مندوں کی ظاہری خوش حالی سب دیکھتے ہیں اور یہ چند ہی آدمی سمجھتے ہیں کہ ان کا حال ریشم کے کیڑے کا سا ہے کہ اندر ہی اندر وہ اپنے معدے سے مادہ نکال کر ریشم تنتا ہے اور خود تحلیل ہوا جاتا ہے - ایسے ہی دولت مند دولت کے فکر و تردّد سے اندر ہی اندر گُھلے جاتے ہیں - خدا کا بڑا شکر انسان کو

۱- مایحتاج : ضروریاتِ زندگی - جن چیزوں کی انسان کو احتیاج ہو -

۲- اصل : اس کو ظاہری حالت -

بھیجنا چاہیے کہ اس نے دولت کے فکروں سے بچایا ہے اور تندرستی کے ساتھ کھانے پینے کو کافی دیا ہے - بہت سے آدمی جن عطیاتِ عامہ الٰہی کو روزانہ دیکھتے ہیں ان کے شکریے کا خیال نہیں کرتے اور نہ کچھ ان کی قدر کرتے ہیں - اگر ایک ہی دفعہ گھنٹے بھر کے لیے اندھے کی آنکھوں کو خدا تعالیٰ کھول دے اور وہ آفتاب کو دیکھے تو اس کی عظمت و شان وہ آنکھوں میں سمائے گی کہ پھر کسی دوسری چیز کی طرف ، خواہ وہ کیسی ہی خوب صورت ، فرحت افزا ہو ، نظر ڈالنے کو جی نہیں چاہے گا اور متحیّر ہو کر اس کی تعریف کرے گا - پس ایسی نعمت پر جیسے کہ آفتاب ہے اور جس کو تم روز دیکھتے ہو ، شکر نہ بجا لاؤ تو بڑی کافر نعمتی ہے - آفتاب کے سوا اَور عطیّات اور انعاماتِ الٰہی ، جیسے ہوا و پانی وغیرہ ہیں ، جو عام ہیں ، ان پر شکر بھیجنا لازم ہے - غرض کہ خدا نے ہمارے لیے آفتاب کو بنایا ہے - وہی ہماری حفاظت کرتا ہے ، وہی مینہ برساتا ہے ، پھول کھلاتا ہے ، معدہ بناتا ہے ، اس کے لیے غذا مہیا کرتا ہے ، قناعت و فراغت ہمارے چین کے لیے دیتا ہے - اس کا شکر لاکھ لاکھ بھیجنا چاہیے -

۱۲- بڑا کتب خانہ

۱- میں ایک کتب خانے میں جا نکلا - وہاں جو کتابوں کے انبار کے انبار دیکھتا ہوں تو میری عقل حیران ہے کہ میں کس حیرت کدے میں آ گیا جہاں ساری دنیا کی ذہانت کا ذخیرہ جمع ہے - کبھی اس کو دیکھ کر میرا دل شکستہ ہوتا تھا کہ میں کب ان سب کا مطالعہ کر سکتا ہوں - کبھی میرا دل شگفتہ ہوتا تھا کہ جس علم کی تحصیل میں تکمیل چاہوں گا ، اس میں میری مدد

کرنے کے واسطے یہ سامان موجود ہے۔ اس کتب خانے کی کتابیں حضرت سلیمانؑ کے اِس قول کی تصدیق کرتی تھیں کہ نئی کتابوں کے لیے انتہا نہیں۔ خدا نے انسان کو وہ ذہن دیا ہے کہ ہمیشہ کام کرتا رہتا ہے۔ چُھپی ہوئی سچی باتوں کو کاوش و پژوہش کرکے منکشف کرتا ہے۔ فرصت میں تجربوں سے ایجاد کرتا ہے۔ اگر خدا نخواستہ یہ ذہانت کا کام دب جاتا تو انسان کے حق میں نہایت مُضر ہوتا۔ ذہنوں کا حال شمعوں کا سا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو روشن کرتی ہیں۔ انسان جو کچھ اپنے سوچ بچار، غور و خوض سے اپنے نزدیک سچی باتیں معلوم کرتا ہے وہ کاغذ کے حوالے کر دیتا ہے۔ کیا یہ کتابوں میں تسخیر و اعجاز نہیں ہے کہ ہم جس قدیمی لائق عالم اور قابل فاضل کو بلاتے ہیں، وہ ہمارے سامنے آ موجود ہوتا ہے اور اس کے سامنے اپنے تمام شبہات بیان کرکے رفع کر لیتے ہیں۔ دنیا کے جس کونے سے چاہتے ہیں عمدہ حکیم، طبیب، ولی اللہ بلا لیتے ہیں اور ان کے سامنے اپنے تمام سوال بیان کرکے جواب ایسے سن لیتے ہیں کہ خاطر جمع ہو جاتی ہے۔ کیا عجیب یہ خاموش معلّم ہیں کہ جب ان کے چہرے پر نظر ڈالیے، وہ کچھ نہ کچھ سبق پڑھا دیتے ہیں۔ کوئی قانون ایسا نہیں ہے کہ مجھے سارے کتب خانے کے پڑھنے پر مجبور کرے۔ مگر ہاں جتنا میں زیادہ کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں اور ان کو ہضم کرتا ہوں، یعنی سمجھتا ہوں، اُتنا ہی زیادہ ان کو پسند کرتا ہوں۔ یہ کتابیں نہیں ہیں بلکہ ہدایت کے لیے چراغ روشن ہیں۔ اب اگر کوئی تاریکی کی شکایت کرے تو اُس کو اندھا کہنا چاہیے۔ خدا اُن پر رحمت بھیجے کہ جنھوں نے اپنا دل و دماغ، جگر، جان ساری زندگی ان بیش بہا کاموں میں صرف کر دی اور اپنے دل و دماغ کو چراغ اَوروں کی روشنی کے لیے بنا دیا۔

سکندر نے اپنے کتب خانے کا نام معالجِ روحانی رکھا تھا - یہ نام کیا اسم بامسمّٰی ہے -

۲- کتابیں نئے نئے منظر سامنے لاتی ہیں - ہم کو سکھاتی ہیں کہ کس طرح زندگی بسر کریں - غم زدوں کی غم زدائی[1] وہ کرتی ہیں - متمرّدوں کو تنبیہ کرتی ہیں، احمقوں کو نصیحت کرتی ہیں، غافلوں کی خرد افزائی کرتی ہیں - وہ سب کی مدد کرتی ہیں - وہ بدنصیبوں کو برباد ہونے سے بچاتی ہیں - کسی مصیبت زدہ سے وہ کندھا نہیں چراتیں - وہ مغروروں اور خود غرضوں اور سنگ دلوں کی طرح حاجت مندوں سے ترش رُوئی اور بے رخی نہیں کرتیں - یہ اُن میں کیا خوبی ہے کہ وہ جو چیزیں بادشاہوں کو دکھاتی ہیں، وہی غریبوں کو - وہ روحانی امراض کا علاج بتلاتی ہیں، عقل کے مفلسوں کو خیالات کا خزانہ دیتی ہیں، وہ آتشِ غیظ و غضب کو بجھاتی ہیں - روح کے امراضِ مُزمنہ کی حُکمی دوا بتلاتی ہیں - خواہ دردِ سر ہو یا دردِ دل ہو، وہ دونوں کا درمان کرتی ہیں - وہ چپ چاپ ہیں، کوئی آواز ان میں نہیں نکلتی مگر ساری زندہ باتیں ان میں موجود ہیں - جو چیزیں زندہ نہیں رہتیں، اُن کا مدفن اپنے اندر بنا کے زندگیٔ جاوید اُن کو دیتی ہیں - زمانۂ آیندہ کی قوموں کو نصیحت و تعلیم و خوش کرتی ہیں - خدا کے فضل نے یہ انسان ہی کو سکھایا ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ کی تصویر کا ٹھپّا کتابوں میں اس طرح لگائے کہ وہ قائم رہے - چرند پرند آمنے سامنے جب موجود ہوتے ہیں، باتیں کرتے ہیں مگر انسان دور دور بیٹھے ہم کلام ہوتے ہیں - کتابوں کی تصنیف میں مصنّف خونِ جگر

۱- متمرّد = سرکش -

کھاتے ہیں اور جگر کو خون کرتے ہیں تاکہ زمانے میں ان کی تعریف ہو اور شہرت مدت تک رہے ۔ تصنیفات بھی ان کی اولاد ہوتی ہے جس کو وہ بہت محنت و مشقّت سے پیدا کرتے ہیں اور بڑی خبرداری سے پالتے پوستے ہیں تاکہ وہ ان کی یادگار رہے ۔ کتابیں ایسے بزرگوں کی مدفن ہیں جو مرنے کے بعد بھی نہیں مرتے ۔ اُن کے سر پر شہرت کا تاج رکھا جاتا ہے ۔

۳۔ **پرانی کتابوں کی ناقدری اور نایابی :** بہت سے مصنّف ایسے تھے کہ وہ اپنے زمانے میں بڑے ناموز تھے اور ان کی تصنیفات کا ذکر ان کے معاصرین کی کتابوں میں بہت تحسین اور آفرین کے ساتھ ہوتا تھا ۔ اب کبھی ان کا نام بھی نہیں لیا جاتا ۔ تصنیفات ان کی کہیں دیکھنے میں نہیں آتیں ۔ اور اگر کہیں کسی کتب خانے میں وہ پڑی ہوتی ہیں تو ان کو کوئی اُٹھا کر پڑھتا نہیں ۔ ردی کی طرح نکمّی پڑی رہتی ہیں اور یاد دلاتی ہیں کہ انسان کو امیدیں کیا کیا فریب دیتی ہیں اور عزّت کا حاصل ہونا کیسا نامحقّق ہے ۔ ان ناموروں کی گم نامی کے اور ان کی تصنیفات کی ناقدری کے' یہ سبب ہوتے ہیں :

اول یہ کہ جو ناموری ان کو کسی زمانے میں حاصل ہوئی وہ اس کے مستحق نہ تھے ۔ دوستوں کی مہربانی سے اور خوشامدیوں کی خوشامد سے ان کی شہرت کا آوازہ بلند ہوگیا ۔ نکتہ شناسوں نے ان پر توجہ نہیں کی ۔ جو آدمی بڑے اور ہردل عزیز ہوتے ہیں اُن کی تصنیف کی تعریف بڑی شدّ و مد سے ہوتی ہے ، مگر پھر ان کے نام کی گونج آدمی سنتے سنتے تھک جاتے ہیں کہ ایک ہی نام ہزاروں ہونٹوں سے ایک ہی دفعہ نکلتا ہے ۔

دوم ، بعض مصنّفین کی ناموری میں بٹّا یوں لگ گیا اور اُن کی سخت محنت کا صلہ یوں خاک میں مل گیا کہ اُن کو ناموری و صلہ

دونوں بہت جلد حاصل ہوئے ۔ زمانۂ حال کے واقعات پر ، جن کا چرچا ان کے زمانے میں بہت پھیل رہا تھا ، آن پر وہ حاوی ہوئے اور اس میں انھوں نے مضامین تحریر کیے ، جو لوگوں کی طبائع کے موافق تھے ۔ جس کے سبب سے ان کو جلد نام وری حاصل ہوگئی ۔ مگر جب وہ واقعات نہ رہے اور نہ وہ لوگ رہے ، جو ان سے علاقہ رکھتے تھے تو پھر ان کی یہ ساری تحریریں ردی ہو گئیں ۔ جب معلول نہ رہا تو علّت آپ ہی جاتی رہی ۔ زمانے کے انقلاب سے واقعاتِ زمانہ بدلتے رہتے ہیں ۔ اب نئے نئے واقعات رونما ہوئے ۔ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے ۔ پھر پہلے مصنّفوں کی تصنیفات کی تقویمِ پارینہ کو کون پڑھتا اور دیکھتا ہے ۔

جو تصنیفات کہ اصولِ عامہ پر لکھی جاتی ہیں اور ان میں حقائقِ عامہ کا بیان ہوتا ہے تو البتہ ان کی نسبت یہ اُمید ہو سکتی ہے کہ وہ مدّتوں تک پڑھی جائیں ، کیونکہ وہ ہر زمانے میں اور ہر ملک میں ایک ہی اثر رکھتی ہیں ۔ وہ زمان و مکان کے ساتھ مخصوص و مقیّد نہیں ہوتیں کہ ان کے بدلنے سے وہ نکمّی ہو جائیں ۔ اُنھی چیزوں سے انسان کو مدت تک محبت رہتی ہے جو عقل پر مبنی ہوتی ہیں ، نہ اُن چیزوں سے جو جذبات پر مبنی ہوتی ہیں ۔ جو مشہور تصنیفات بادشاہوں کے جذباتِ نفسانی کے خوش کرنے کے لیے لکھی گئیں ، وہ اُنھی کے ساتھ دفن ہوگئیں ۔

۴۔ فاضل عالم جیسے سب سے یہ شکایت کرتے ہیں کہ متقدّمین کی کتابیں زمانے نے برباد کر دیں ، ایسی وہ کوئی اَور شکایت نہیں کرتے ۔ ان کو دلی قلق اور رنج ہے کہ قدیمی شائستگی اور تہذیب کے زمانے میں جو مصنّف نامور اور مشہور تھے ، سوائے اُن کے نام کے اب کوئی ان کی تصنیفات باقی نہیں رہی ۔ ان ناموں سے وہ

آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں جو کبھی پوری نہ ہوں گی اور وہ رنج پیدا ہوتے ہیں جن کی کبھی تسکین نہیں ہوگی ۔ مگر اس کو وہ غنیمت نہیں جانتے کہ اگر متقدّمین کی تحریرات برابر زمانے میں باقی رہتیں اور سکندریہ[1] کا کتب خانہ اور بڑے بڑے کتب خانے فنا نہ ہوتے تو بتلائیے کہ نئی تصنیف کوئی کیسے کر سکتا اور زمانے میں نیا مصنّف کون مشہور ہوتا ۔ اوّل تو ان کتابوں کے مطالعے ہی سے فرصت نہ ہوتی اور اگر کوئی جرأت کر کے کچھ تصنیف کرتا تو یہی کہا جاتا کہ اس نے اَور تصنیفات سے نقل کر دی ہے ۔ غرض کسی کا چراغ متقدّمین کے سامنے فروغ نہ پاتا ۔ اس زمانے میں جو مصنّف شہرت اور اپنی محنت کا صلہ پا رہے ہیں وہ ہرگز نہ ہوتا ۔ پہلی تصنیفات کے مٹ جانے نے یہ شہرت کرائی اور صلہ دلایا ۔

۱۳- علم کی تحدید[2]

علم کا حال دریا کا سا ہے ۔ اگر اس کو وہاں جا کر دیکھو جہاں سے نکلتا ہے ، یعنی منبع پر ، تو نہایت تنگ ہوتا ہے اور خوب اچھی طرح نظر آتا ہے ۔ پھر آگے نکل کر وہ بڑھتا جاتا ہے اور اپنے

۱- سکندریہ : مصر کا مشہور شہر اور بندرگاہ جس کی آبادی دس لاکھ کے قریب ہے ۔ اس شہر کو سکندر اعظم نے ۳۳۱ قبل مسیح میں آباد کیا تھا ۔ عہدِ بطالسہ میں تجارتی اور ثقافتی مرکز ہونے کی وجہ سے یہ دنیا کے عظیم شہروں میں شمار ہوتا تھا ۔ ۳۰ قبل مسیح میں آگسٹس نے اسے فتح کر کے رومی سلطنت میں شامل کر لیا اور پھر یہ شہر مشرق میں مسیحیت کا عظیم مرکز بن گیا ۔ عربوں نے اس شہر کو ۶۳۵ع میں فتح کیا ۔

۲- تحدید = حد بندی ۔

کناروں کو بناتا جاتا ہے جس پر سرسبز درخت اور شاداب سبزہ زار اور رنگ برنگ کے پھول سیر دکھاتے ہیں - پھر آگے چل کر وہ بہت چوڑا اور گہرا ہو جاتا ہے اور آخرکار سمندر میں ، جس کی تھاہ کا پتا نہیں ، جا ملتا ہے - یہاں پانی ہی پانی نظر آتا ہے ، کہیں کنارہ نہیں دکھائی دیتا - اب ہم دریا کا بہتیرا سراغ لگائیں مگر وہ کہیں نہیں لگنے کا - پس علم میں بھی جب ہم مادی اشیا کی تشریح کرتے ہیں اور ان کے سبب دریافت کرنے کے وسائل ہم رکھتے ہیں تو ہم خوش ہوتے ہیں - لیکن جب علمِ الٰہیات میں جاتے ہیں یا قدیمی باتوں کی تحقیقات کے درپے ہوتے ہیں اور خدا کی وہ باتیں ، جن کا الہام خود اس نے نہیں کیا ، تحقیق کرتے ہیں تو ایک ایسے سمندر میں جا پڑتے ہیں جو ایسا گہرا ہے کہ اس کی تہہ تک انسان کے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی - اپنی ذہانت سے انسان کچھ حصہ دریافت کرتا ہے مگر زیادہ تر حصہ نامعلوم ہی رہتا ہے - دل اس کی جستجو میں حیران و پریشان ہوتا ہے اور ذہن کی آنکھیں اس کے دیکھنے میں دھندلی اور خیرہ ہوتی ہیں -

۲- عالم اور معلوم کے درمیان جو علاقہ ہوتا ہے اس کا نام علم ہے - اس میں تین باتیں ہوتی ہیں ؛ ایک بالاستقلال یقین - دوم کیا حق ہے ؟ سوم وجوہ - اگر ایک شخص اقلیدس کے ثبوتوں میں شبہہ کرے تو ہم یہ کہیں گے کہ وہ نہیں جانتا کہ اقلیدس نے شکلوں کو ثابت کیا ہے - اور اگر اس کو ایسی بات کا یقین ہے کہ جو حق نہیں ہے تو کہیں گے کہ وہ جاننے میں غلطی کرتا ہے - اگر دو آدمیوں میں سے ایک کو یہ یقین ہو کہ چاند میں آبادی ہے اور دوسرے کو یہ یقین ہو کہ نہیں ہے ، تو گو ان دونوں رایوں میں سے ایک سچ ہو مگر ہم یہ کہیں گے کہ دونوں سچ نہیں جانتے ،

اس لیے کہ ان کے پاس کافی ثبوت نہیں ہے۔

۱۴۔ رفاہِ خلائق کے مُتدعی

یہ رسم اور عادت پڑ گئی ہے کہ جو لوگ عوام کی اصلاح اور ان کے امراض کی اطلاع دیتے ہیں وہ نہایت متانت اور سنجیدگی سے یہ اظہار کرتے ہیں کہ ہم سب تکلیف جو اپنے اوپر گوارا کرتے ہیں، وہ سب غیروں کے فائدے کے لیے ہے اور خود ہمارے اغراض ان سے کچھ متعلق نہیں۔ بعض نہایت عمدہ چُغتے اور عمامے اور لباسِ رعونت زیب تن فرما کر اپنی خودستائی میں تر زبان اور خود فروشی میں گرم نفس ہوتے ہیں کہ ہم کیا سستا سودا بیچ رہے ہیں کہ اپنے جواہرِ مضامین کو کوڑیوں کے بدلے میں دے دیتے ہیں۔ مگر ہم ایسے بکواسیوں کو نہایت ذلّت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کو عوام کو اطلاع دینی چاہیے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں اس سے مطلب اور غرض اپنی آسودگی ہے۔ عوام کی خدمت گزاری سے روپیہ پیدا کرنا ہمارا مقصدِ اعظم ہے۔ ہم جو راتوں کو اپنا دماغ دُودِ چراغ سے پریشان کرتے ہیں تو اس سے یہی مطلب ہے کہ عوام سے روپیہ ہم کو ملے تاکہ باطمینانِ تمام خاص و عوام کی خدمت ہم کریں۔ ہماری ساری عمر علم میں بسر ہوئی ہے اس لیے ہم کچھ اَور پیشہ سوائے قلم کے[1] نہیں کر سکتے۔ ہم اَوروں کی خدمت اس قلم سے اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہماری خدمت روپے سے کریں۔

۱۔ اصل: ''اس لیے ہم کچھ اور پیشہ سوائے قلم کے کچھ اور نہیں کر سکتے۔''

۱۵۔ ہنسنا

۱۔ یہ سمجھنا کہ ہنسی کیوں آتی ہے، ہنسی کھیل نہیں ہے بلکہ ہنسنا بھی ایک فلسفی مسئلہ ایسا مشکل ہے کہ آج تک کسی حکیم سے حل نہ ہوا کہ وہ بتاتا کہ ہنسی کیا چیز ہے۔ معلوم نہیں کہ انسان کے دل میں وہ کیا جذبہ ہے جس کا نام کوئی نہیں بتا سکتا۔ جب وہ اُٹھتا ہے تو چہرے کی ہیئت کو بدل دیتا ہے جس کو ہم ہنسنا کہتے ہیں۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ خوشی سے، کیھتّی اور چُہل[1] کی باتوں سے، اپنی فتح یابی اور کامیابی سے ہنسی آتی ہے۔ مگر تجربہ اس کے خلاف شہادت دیتا ہے کہ انسان کو مصیبت اور ناخوشی میں بھی ہنسی آتی ہے، جس میں کوئی بات اوپر کی باتوں میں سے نہیں ہوتی۔ اسی سبب سے شکرخند، زہرخند، کھسیانی ہنسی مشہور ہیں۔ پھر یہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو چیز ہم کو ہنساتی ہے اگر وہ باسی ہو جاتی ہے اور بار بار پیش آتی ہے تو اس پر ہنسی نہیں آتی۔ جس چیز کی ہم اُمید نہیں کرتے یا نئی چیز ہوتی ہے تو اُس پر آدمی کو اکثر ہنسی آیا کرتی ہے۔ خصوصاً اُن لوگوں کو زیادہ تر جو اپنے ہر کام کی تھوڑی خوبی پر تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اُن کاموں پر ہنسا کرتے ہیں جو ان کی امید سے ذرا بھی زیادہ اچھے ہو جاتے[2] ہیں۔ وہ اپنے کھتّی اور چُہل کے چٹکلوں پر زیادہ ہنسا کرتے ہیں۔ آدمی کو جو دفعۃً اپنی قابلیت اور لیاقت کا خیال آتا ہے تو ہنستا ہے۔ اور اپنی لیاقت کو بہ مقابلہ دوسرے شخص کی نالایقی اور ناقابلیت کے دیکھ کر بھی آدمی ہنستا ہے۔

۱۔ کیھتّی و چُہل: ہنسی مذاق، ٹھٹھا مخول۔

۲۔ اصل: اچھی ہو جاتی ہیں۔

آدمی کو جو چُہل اور کیھلّی کی باتوں پر زیادہ ہنسی آتی ہے، اُس کا سبب یہ ہے کہ اس طریقے سے دوسرے آدمی کی بیہودگی ذہن میں جلد منتقل ہو جاتی ہے اور دوسرے کی بیہودگی اور نالایقی کا خیال دفعتہً اپنی لیاقت اور قابلیت کے ساتھ آ جاتا ہے۔ جب اپنے ساتھ یا اُس گروہ کے ساتھ جس کی ذلّت میں ہم کو بھی شریک ہونا پڑے، کوئی چُہل اور کیھلّی کرتا ہے تو ہنسی نہیں آتی۔ پس اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہنسی کا سبب یہ ہے کہ ہم کو اپنی بزرگی اور قابلیّت کا خیال دفعتہً دوسرے کی نالائقی یا اپنی ہی گزشتہ نالائقی کے ساتھ آئے۔ آدمی کو اپنی پہلی حماقتوں پر، جو بالفعل بے عزتی کا سبب نہ ہوں، ہنسی آیا کرتی ہے۔ انسان کو اپنی فتح یابی پر ہنسی شدّت سے آتی ہے۔ جو ہنسی بے رنج کے ہوتی ہے وہ اَوروں کی بیہودگی اور نالائقی پر ہوتی ہے۔ صحبت میں جب آدمی اکیلا ہنستا ہے تو اس سے اَور لوگ کشیدہ خاطر ہو کر اپنے تئیں دیکھتے ہیں کہ وہ کیوں ہنستا ہے۔ اَوروں کی ذلّت اور نالائقی پر اس سبب سے ہنسنا کہ وہ ہم میں سے نہیں ہیں یا ہم اُن سے بہتر ہیں، ایک سُبک حرکت ہے۔ یہ کچھ کام کی بات نہیں ہے کہ آدمی دوسرے کی نالائقی کو اپنی فتح و ظفر سمجھے اور اس پر فخر کرے۔

۲۔ اگر یہ مانیں کہ چہرہ آدمی کے دل کا عنوان ہوتا ہے تو ہم ہنسی سے آدمی کے دل کی بہت سی باتیں دریافت کر سکتے ہیں۔ پہلے ہم کو یہ دریافت کرنا چاہیے کہ کس کس بات پر اس کو ہنسی آتی ہے؟ وہ کیوں کر آسانی سے ہنسایا جا سکتا ہے؟ وہ کون سی راہیں ہیں کہ پسندیدہ طور پر ہنسی آنے کے اندر جا سکتی ہیں[1]۔

۱۔ اصل: جا سکتی ہے۔

ہنسنا ایک ظاہری علامت خوش دلی کی ہے - ہنسنے سے یہ معلوم ہوگا کہ اس کی طبیعت کن کن باتوں سے خوش ہوتی ہے - اس سے اس کا مزاج معلوم ہو گا - ہنسنا[۱] فقط انسان کے ساتھ مخصوص ہے ، اَور حیوان تو اس سے محروم ہیں - جو آدمی ذہین اور ظریف اور گنبھیر ہوتے ہیں ، ان کا ہنسنا بناوٹ اور تکلّف سے خالی نہیں ہوتا - برخلاف بھولے اور کم عقل آدمیوں کے کہ وہ بے تکلّف بغیر کسی مکر و فریب کے قہقہے لگاتے ہیں - قاعدہ ہے کہ خالی ظرف میں سے بڑی آواز نکلتی ہے -

۳- ہنسنے کے ادا اور انداز بہت سے ہیں - شاعروں کے کلام کو دیکھیے تو معشوق کے تبسّم اور خندۂ زیر لبی سے کیا کیا کام وہ لیتے ہیں - کبھی اس سے عاشقوں کو قتل کرتے ہیں ، کبھی نہال کرتے ہیں ، کبھی اس کے کلکِ ادا سے عاشقوں کو تختۂ جفا بناتے ہیں ، کبھی اسے گلِ تازہ بنا کے فرحت افزا ، کبھی مسکرانے سے غضب ڈھاتے ہیں ، کبھی عاشقوں کی منظوری کی دلیل بناتے ہیں - کبھی ہنسنے کو معشوقوں کا وہ ناز و انداز بتاتے ہیں جس کے آگے خندۂ سحر و خندۂ صبح شرمندہ ہوتے ہیں - جو چیز شگفتگی پیدا کرے وہ خندہ ہے - غرض یہ ہنسی کا مضمون بھی شاعروں کے ہاتھ خوب لگا ہے کہ وہ سینکڑوں ادا سے اس کو ادا کرتے ہیں -

۴- ہنسنا بھی انسان کی صحت کے حق میں نہایت مفید ہوتا ہے - اس لیے کہ ہنسی خوشی کی علامتِ ظاہری ہے - پس جب آدمی ہنستا ہے تو اس کی جسمانی اور روحانی دونوں حرکتیں ہوتی ہیں جن سے اس کی قوتِ ہاضمہ بڑھتی ہے ، خون کا دورہ ہوتا ہے ، پسینہ

۱- اصل : ہنسنا تو فقط -

خوب آتا ہے - غرض ہر عضو میں شگفتگی اور خندیدگی آ جاتی ہے -

۵- آدمیوں کے ہنسنے کے طریقے مختلف ہیں - کوئی منہ ہی منہ میں ہنستا ہے ، کبھی دانت نہیں دکھاتا - کوئی مسکراتا ہے ، خندۂ زیرلبی کرتا ہے - غرض تھوڑے ہی آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو ہنسنا وہ آتا ہے جس کو ہنسنا کہتے ہیں - بعض آدمی ہنسی میں وہ آواز نکالتے ہیں کہ اس پر ہنسی آتی ہے - جس شخص کو بالکل ہنسی نہ آئے وہ خدع[1] اور سازشوں کے کام کرنے کی بڑی لیاقت رکھتا ہے کیونکہ خود اس کی زندگی ہی خدع اور فریب ہوتی ہے -

۶- جو شخص بات کہنے سے پہلے ہنستا ہے وہ شوخی اور حماقت کے درمیان زہر کھاتا ہے -

۷- ہنسنے کے سبب: خوشی کی تحریک سے اکثر ہنسی آتی ہے - ذرا ذرا سی باتوں پر آدمی کو ہنسی آتی ہے - زندہ دلی ، چُہل بازی ، سردی ، درد جس کی نوبت نالہ و فغاں تک نہ پہنچے ، گُدگُدی ، دیوانگی ، خود ستائی ، فتح یابی کا خیال خواہ اپنا یا دوسروں کا ، محبتِ دلی - فحش ، ذلیل اور ممنوع چیزیں - اور بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ جن سے آدمی کو ہنسی آتی ہے - زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ اپنی عزت اور دوسرے کی ذلّت کے ٹکرانے سے ہنسی کی آواز نکلتی ہے -

۸- ہنسنا کہاں چاہیے ؟ اگر حالت اور وقت اور موقع کا مقتضا نہ ہو تو جن چیزوں پر کوئی آزاد طبع ہنسے گا ، وہ اس کی کچھ کند ذہنی پر دلالت کرے گا - ذکاوت کا استعمال مثلِ تلوار چاہیے کہ اپنی حفاظت کے واسطے وہ میان سے باہر نکلے - جو دغاباز ، مکّار ہیں اُن کے صحیح صحیح بتلانے میں ذہانت کو کام میں لانا چاہیے -

---

۱- اصل میں "خداع" ہے جو درست نہیں ہے -

قوانینِ انصاف کا اقتضا یہ ہے کہ کسی آدمی کے نقص و عیب پر، جس کا وہ خود اقرار کرے، ہنسنا نہیں چاہیے - مگر ہاں جو اپنے عیبوں کو ہنر جانے تو اس پر ہنسنا چاہیے - اگر کوئی ڈرپوک نامرد اپنی جواں مردی کی ڈینگ مارے یا کوئی کم علم اپنے علم کی شیخی مارے تو اس پر ہنسی آتی ہے - اس سبب سے نہیں کہ نامردی اور ضعفِ فہم قابل ہنسی کے ہیں، بلکہ فقط اس سبب سے کہ جو نامرد ہے وہ اپنی لیاقت کو جواں مردوں کی برابر جانتا ہے اور جو کم فہم ہے وہ عالی فہموں کا ہم پلہ اپنے تئیں سمجھتا ہے - پس جو شخص ان باتوں کے سوا ہنسے، وہ سنجیدہ اور متین آدمیوں کے گروہ سے خارج کرنے کے قابل ہے - ایک شخص کو ہنسنے کی عادت بہت تھی - اس نے کہا ''کوئی شخص اس کی وجہ بتا سکتا ہے کہ میں زیادہ کیوں ہنستا ہوں؟'' اس پر ایک لطیفہ سنج نے جواب دیا: ''اگر ہنسنا منہ کے کھولنے اور پیٹ میں معدے کے ہلانے کا نام ہے تو یہ سبک حرکت ہر شخص اپنے اعضا کی کر سکتا ہے - چہرہ جس طرح چاہے بنا سکتا ہے - مگر ہنسنا اس کا نام نہیں ہے - وہ ایک نہایت سنجیدہ اور متانت کا کام ہے - تم عمر بھر کبھی نہ ہنسے ہو گے اور نہ شاید آیندہ ہنسو گے - تم کو ایک بدن ہلانے والی بیماری کا دورہ رہتا ہے -''

بعض آدمیوں کے جسم کی بناوٹ ایسی ہوتی ہے کہ ان کو اپنی نیک مزاجی کے سبب سے بہت باتوں پر ایسی ہنسی آتی ہے جیسے کہ اَوروں کو بعض کی تحقیر پر -

١٦- انسان کی مصیبتوں کا ذکر

سُقراط کا کیا خوب مقولہ ہے کہ اگر انسانوں کی تمام مصیبتوں

کا لا کر ایک جگہ ڈھیر لگایا جاتا اور پھر سب کو کہا جاتا کہ تم برابر برابر حصّے کر کے انھیں بانٹ لو تو جو شخص اپنے تئیں سب سے زیادہ مصیبت زدہ سمجھتا تھا اس کو اس تقسیم سے ایسی مصیبت ہاتھ لگتی کہ وہ اپنی پہلی مصیبت کو غنیمت گنتا ۔ اس مضمون کو اور زیادہ لطف کے ساتھ ایک رومی شاعر نے یوں ادا کیا ہے کہ اگر آدمیوں میں ایک شخص دوسرے شخص سے اپنی مصیبت کو بدل سکتا تو اس مبادلے سے اَور زیادہ مصیبت میں گرفتار ہوتا اور پہلی مصیبت کو غنیمت گنتا ۔

۱۷- قبرستان

۱- جب میں قبرستان میں بڑے آدمیوں کی قبریں دیکھتا ہوں تو حسد کی ساری تحریکیں مجھ میں مٹ جاتی ہیں ۔ اور جب حسینوں کی گوروں کے کتبے[1] پڑھتا ہوں تو تمام میری بے ٹھکانے آرزوئیں مر جاتی ہیں ۔ جب اولاد کی قبروں کی لوحوں پر پڑھتا ہوں کہ کیا کیا ماں باپوں نے اپنا دردِ جاں گُزا ان میں ظاہر کیا ہے تو مارے رنج کے میرا کلیجا کانپنے لگتا ہے ۔ مگر جب ان کے[2] والدین کے مدفنوں کو دیکھتا ہوں[3] تو دل میں کہتا ہوں کہ ناحق انھوں نے اپنے تئیں اندوہ و الم میں گُھلایا ۔ وہ تو چند روز میں اپنی اولاد کے پاس آ بسے ۔ جب میں بادشاہوں کی قبریں اُن کے پاس دیکھتا ہوں جنھوں نے اُن کو معزول کیا تھا اور رقیبوں اور حریفوں کو پاس پاس لیٹا ہوا دیکھتا ہوں ، جو ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے ، اور

۱- اصل : کتابے ۔
۲- اصل : ان کی والدین ۔
۳- اصل : دیکھتا تھا تو دل میں کہتا ہوں ۔

اُن اولیا اور مقدّس بزرگوں کو پیوندِ زمیں دیکھتا ہوں جنھوں نے اپنے اقوال اور رایوں کے اختلاف سے انسانوں میں باہم قطع و فصل کا کھیت بویا تھا ، تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ کیوں دنیا میں یہ سارے مباحثے ، مناظرے ، گفتگوئیں لوگ کرتے ہیں - کسی قبر پر مرنے کی تاریخ کل کی اور کسی پر چھ سو برس کی لکھی ہوئی تھی جس سے میرے دل میں خیال آتا تھا کہ قیامت کے دن ہم سب ہم عصر ہو کر آپس میں جمع ہوں گے -

۲- ہر قوم کا قبرستان اپنے[1] عالمِ خاموشی میں اُس قوم کے[2] خصائل کو بتلاتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے بزرگوں کو کس طرح یادگار رکھتے ہیں - کیسی کیسی عمارتیں اُن کے مقبروں کی بناتے ہیں ، کیسے کیسے کتبے[3] اور لوحیں لگاتے ہیں - قبرستان کو بہت آدمی دیکھ کر بڑے غم زدہ اور اندوہ ناک ہوتے ہیں مگر جو عاقل ہیں وہ اس سے عبرت کا سبق لیتے ہیں - اور سمجھتے ہیں کہ یہی حالت ایسی ہے کہ جس میں امیر ، غریب ، گدا ، بادشاہ ، جاہل ، عالم ، عاقل ، احمق سب مٹی میں مل کر برابر ہو جاتے ہیں - وہ قبریں کھُدتی دیکھتے ہیں کہ اُن میں مُردوں کی ہڈیاں نکلتی ہیں مگر یہ نہیں پہچانی جاتیں کہ وہ کس کی ہیں - بعض مزاروں کی لوحوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ ایسی زبانوں میں لکھی ہیں کہ ہزار میں سے ایک بھی ان کو پڑھ کر نہیں سمجھ سکتا کہ کیا ہے - جیسے کہ مسلمان اپنی قبروں پر قرآن شریف کی آیتیں کندہ کرتے ہیں جن کو سینکڑوں

۱- اصل : اپنی عالمِ خاموشی - ۲- اصل : قوم کی خصائل -

۳- اصل : کتابے - ممکن ہے کسی زمانے میں قبر کے کتبے کے لیے ”کتابے“ بھی استعمال ہوتا رہا ہو کیونکہ اس سے پہلے بھی یہ لفظ ”کتابے“ ہی لکھا گیا ہے -

مسلمانوں میں شاید ایک دو سمجھتا ہوگا کہ کیا لکھا ہے ۔ بعض اشعار جو قبر کی لوح پر کندہ ہوتے ہیں ، ان میں ایسا مبالغہ ہوتا ہے کہ اگر مردہ قبر میں سے اٹھ کر پڑھے تو سخت نادم ہو اور کہے ''جو اشعار لوح پر میری قبر سے وابستہ ہیں ، وہ مجھ سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے'' ۔ بعض بے کمالوں کی قبروں پر لوحیں ایسی لکھی ہوئی ہیں کہ مُردوں کو صاحبِ کمال بتلاتی ہیں اور بعض صاحب کمالوں کی قبریں بے لوح پڑی ہیں ۔ غرض قبرستان بھی عاقل کے واسطے بڑی دلچسپ عبرت کی کتاب مطالعے کے لیے ہے ۔

۱۸۔ مرزا کا خواب

بغداد[1] میں مرزا ایک بڑا نیک مرد اور متقی رہتا تھا ۔ ہر چاند کی پانچویں تاریخ کو وہ تمام کاروبار چھوڑ کر سارے دن اپنے باپ دادا کے طریقے کے موافق عبادت کیا کرتا تھا ۔ ایک دفعہ اس تاریخ کی صبح کو نہا دھو کر اس نے نماز پڑھی اور بغداد کے بلند پہاڑوں پر چڑھ گیا کہ وہاں رہ کر نماز و عبادت میں سارا دن بسر

۱۔ بغداد : عراق کا دارالحکومت جسے کبھی دارالسلام بھی کہتے تھے ۔ دریائے دجلہ کے کنارے واقع ہے ۔ ۱۹۵۲ء میں اس کی آبادی پانچ لاکھ کے قریب تھی ۔ اس کے آثارِ قدیمہ میں اکادیہ ، سماریہ ، اشوریہ ، بابلیہ اور کلدانیہ کے آثار مشہور ہیں ۔ خلفائے بنو عباس میں سے منصور نے سب سے پہلے اس کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور پھر ہارون الرشید نے اس کو تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کا مرکز بنا دیا ۔ ''الف لیلہ'' کے قصے اس کے حسن و جمال اور عظمت کے شاہد ہیں ۔ یکے بعد دیگرے اس شہر کو بنو بویہ ، سلاجقہ ، مغول ، تاتاری ، صفوی اور عثمانی تاخت و تاراج کرتے رہے یہاں تک کہ علم و ادب اور تہذیب و تمدن کے اس مرکز کی شان و شوکت اور عظمت و شکوہ کا سورج گہنا گیا ۔

کرے - یہاں ہوا کھا رہا تھا کہ اس کے دل میں انسان کی زندگی کی[1] نا پایداری کے خیالات پیہم آنے لگے اور یہ معلوم ہونے لگا کہ آدمی مثل سایے کے ہے اور حیات اس کی خواب ہے - ان خیالات سے دل بہلا رہا تھا کہ قریب کے پہاڑ کی چوٹی پر جو نظر پڑی تو ایک آدمی نظر آیا کہ گڈریے کا لباس پہنے ہوئے تھا اور ہاتھ میں اس کے نےَ[2] تھی - جب مرزا نے اس کی طرف دیکھا تو وہ نےَ بجا رہا تھا - اس نےَ سے وہ صدائے جاں فزا نکلتی تھی کہ مرزا نے کبھی سنی نہ تھی - اس کی آواز اَور سب آوازوں سے انوکھی تھی - اس کے سُر اور دُھن ہی نرالی تھی - اس کو سن کر مرزا نے جانا کہ بہشت میں جب نیک آدمیوں کی روحیں داخل ہوتی ہیں تو آسمان سے فرشتے ان کے استقبال کے لیے اُترتے ہیں اور ایسے باجے بجاتے ہیں کہ جن کی صَوت[3] موت کے رنجوں کو، جو انھوں نے اٹھائے تھے، بُھلا دیتی ہے - پس یہ وہی روح پرور آواز ہے -

مرزا یہ بھی سن چکا تھا کہ اس پہاڑ پر ایک جِنّ نےَ نواز رہتا ہے - جو یہاں آتا ہے وہ بانسلی کے نغمے سنتا ہے، مگر یہ اب تک نہیں سنا کہ اس نےَ نواز کی شکل کسی نے دیکھی ہو - جب مرزا کے دل میں اس آواز نے یہ شوق پیدا کیا کہ اس نےَ نواز کی باتوں سے فیض یاب ہوجیے تو[4] مرزا کو حیرت زدہ دیکھ کر نےَ نواز نے بھی انگلی سے اشارہ کر کے اپنے پاس بلایا - مرزا اس کے پاس نہایت ادب اور شوق سے گیا اور جاتے ہی اس کے پاؤں پر سر رکھ دیا اور رونے لگا - جِنّ نے شفقت کر کے اس کا سر

۱- اصل : زندگی کے ناپایداری -

۲- نےَ = بانسری یا اسی قسم کا کوئی ساز -

۳- صَوت = آواز -   ۴- ''تو'' اضافہ مرتّب -

پاؤں پر سے اپنے ہاتھ سے ہٹایا اور مسکرا کر دیکھا اور ہاتھ پکڑ کر کہا کہ ”مرزا ! میں نے تیری ساری باتیں جو ُتو اپنے دل میں کرتا تھا ، سن لیں“ - مرزا کو پہاڑ کی چوٹی پر ایک جگہ ِجنّ لے گیا اور کنگرۂ کوہ پر بٹھا دیا - اور کہا کہ مشرق کی طرف دیکھ اور جو کچھ نظر آئے وہ مجھ سے کہہ - مرزا نے اس طرف ایک گھاٹی ُپر نشیب دیکھی کہ اس میں بڑے زور شور سے پانی کی سیل[1] رواں ہے - اس پر ِجنّ نے کہا کہ ”یہ جو گھاٹی دیکھتا ہے وہ غم کی گھاٹی ہے اور یہ پانی کی سیل ابد کی بڑی سیل کا ایک حصہ ہے“ - پھر مرزا نے اس سے پوچھا ”یہ کیا وجہ ہے کہ میں جو اس سیل کے اول اور آخر حصے کو دیکھتا ہوں تو نہایت گھری کُہر سے شروع ہوتا ہے اور اسی پر ختم“ - ِجنّ نے کہا کہ ”جو حصہ ُتو دیکھتا ہے وہ ابد کا ایک حصہ ہے جس کو ہم وقت کہتے ہیں ، جس کا پیمانہ آفتاب ہے - وہی اِس عالَم کی ابتدا اور انتہا ہے - اب بتا کہ اس سمندر کے دونوں سروں پر جو تاریکی چھائی ہوئی ہے اس کے اندر کیا دیکھتا ہے ؟“ مرزا نے کہا کہ ”میں اس کے اندر ایک ُپل دیکھتا ہوں جو َسیلِ آب کے وسط میں بنا ہوا ہے“ - ِجنّ نے کہا کہ ”یہ ُپل انسان کی زندگی ہے - اب ذرا اَور غور کرکے دیکھ“ - مرزا نے اسے خوب گُھور کرکے دیکھا کہ اس ُپل کی ستّر محرابیں ہیں اور ان کے ساتھ کچھ ٹوٹی پھوٹی اَور محرابیں بھی ہیں - یہ دونوں طرح کی محرابیں مل کر َسو کے قریب ہوتی ہیں - مرزا محرابیں گِن ہی رہا تھا کہ ِجنّ نے اس سے کہا کہ ”پہلے اس ُپل کی ہزار محرابیں تھیں مگر ایک طوفانِ عظیم میں

۱- پانی کی َسیل = پانی کا سیلاب - مصنّف نے آگے چل کر اسے سمندر کہا ہے -

اس کا بڑا حصہ بہہ گیا اور اس کا یہ شکستہ حصہ جو تُو دیکھ رہا ہے، باقی ہے ــ مرزا! کچھ اَور بھی بتاؤ جو تم نے دیکھا ہو۔" مرزا نے کہا کہ "میں دیکھتا ہوں کہ پُل پر سے بہت سے آدمی عبور کرتے ہیں، اور اس کے دونوں سروں پر ایک ابرِ سیاہ چھا رہا ہے اور لوگ پُل پر چل رہے ہیں۔ ان میں سے بعض سیلِ آب میں، جو پُل کے نیچے چل رہی ہے، گر پڑتے ہیں۔" اور جب اَور غور کی نگاہ سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ سقفِ پُل میں بہت سے دریچے ہیں۔ جس کا پاؤں کسی دریچے پر آ جاتا ہے، وہ سیل میں گر کر فنا ہو جاتا ہے۔ یہ پوشیدہ دریچے پُل کے اس سرے پر بہت تھے۔ آدمیوں کا ازدحام بادلوں کی تاریکی سے نکل کر پُل پر قدم رکھتا تھا تو ان میں سے بہت سے ان دریچوں پر قدم رکھ کے گر پڑتے تھے۔ یہ دریچے بیچ میں کم تھے مگر پھر آخری سرے پر وہاں زیادہ ہو گئے تھے جہاں دَرّوں کی محرابیں ثابت تھیں۔ بہت تھوڑے راہ رَو ایسے تھے جو اب آگے دَرّوں کی ٹوٹی محرابوں پر چلتے تھے، جن کو ہر وقت خوف لگا رہتا تھا کہ اب گرے اب گرے۔ آخر کو سب اِس لمبی رہ گزر کو طے کر کے تھک گئے اور گر پڑے۔

پس یہ سماں دیکھ کر مرزا کے دل میں خیالات کا جوش اٹھا اور بہت سے مضامین دل میں آئے۔ مرزا کا دل غم و اندوہ سے بھر گیا کہ بہت سے آدمی خوشی اور مسرّت کی حالت میں دفعۃً گرتے ہیں اور ہر چند سہارے کی تلاش کرتے ہیں کہ اس کو پکڑ کر رک جائیں مگر کوئی نہیں ملتا اور وہ فنا ہو جاتے ہیں۔ بعضے آسمان کی طرف دیکھتے تھے اور نہایت غور و تأمّل کرتے تھے مگر وہ ڈوبتے ہی نظر سے غائب ہو جاتے تھے۔ ایک گروہِ کثیر ایسا

تھا کہ وہ چھاؤں[1] جو اپنی آنکھوں کے سامنے چمکتی ہوئی دیکھتے تھے ، اُس[2] کی طرف دوڑتے تھے مگر جب وہ اپنے نزدیک ان کے پاس پہنچ جاتے تھے ، ان کا قدم پھسلتا تھا اور وہ نیچے گر کر فنا ہو جاتے تھے - جب جِنّ نے دیکھا کہ مرزا کو یہ غم انگیز حالت دیکھتے ہوئے دیر ہو گئی ہے تو اُس نے اس سے کہا کہ تم کو پُل دیکھتے ہوئے دیر ہو گئی ہے ، اب تم نگاہ کو اُس سے ہٹا لو اور کچھ اَور تماشا دیکھ کر مجھ سے بیان کرو - مرزا نے جو نظر اٹھائی تو بہت سے پرندوں کی ٹکڑیاں پُل کے اوپر اُڑ رہی تھیں اور بار بار اُس پر بیٹھتی تھیں - ان میں کرگس ، گِدھ ، زاغ ، زغن اور بہت سی قسم کے پرند تھے - اور بعض پردار چھوٹے پَر کے پُل پر جیسے اڈے پر بیٹھتے ہیں ، بیٹھے ہوئے تھے - جِنّ نے یہ کہا کہ یہ حسد ، حرص و ہوس ، باطل پرستی ، مایوسی ، عشق اور اسی قسم کے اَور اخلاقِ بد ہیں جو مرنے سے پہلے آدمی کو نوچ نوچ کر کھانا چاہتے ہیں - یہ دیکھ کر مرزا نے ایک آہِ سرد بھر کر کہا کہ خدا نے انسان کو کیوں بے فائدہ بنایا - زندگی میں یہ غم و اندوہ ، موت کے بعد وہ تکلیف و رنج ، اس کی جان کے پیچھے ہزاروں بلائیں لگی ہوئی ہیں : ع

آسودگی حرفیست نہ یاں ہے نہ وہاں ہے[3]

۱- اصل میں ''چھانوں'' ہے - اگر یہ لفظ چھاؤں ہے اور سائے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے تو اس کا چمکنا سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ چھاؤں تو چمک کی ضد ہے - اگر اس سے مراد کچھ اور ہے تو واللہ اعلم -

۲- اصل : ان کی طرف -

۳- اُردو اور فارسی سے مرتّب یہ مصرع اصل میں اسی طرح چھپا ہے - مرتّب نے فقط اتنی ترمیم کی ہے کہ لفظ ''یہاں'' کو ''یاں'' بنا دیا ہے تاکہ مصرع موزوں ہو جائے - مطلب یہ ہے کہ آسودگی ایک ایسی نایاب چیز ہے جو نہ دنیا میں میسّر ہے اور نہ آخرت میں -

یہ حالِ زار مرزا کا[1] دیکھ کر جِنّ کو بھی رحم آیا اور کہا کہ اب پُل کی طرف نظر نہ کر - یہ تو انسان کی ہستی کی اول منزل ہے جو اس کو ابد کی طرف لے جاتی ہے - اب اُس تاریک گھر کی طرف دیکھ جہاں سیل میں قومیں ڈوبی پڑی ہیں - مرزا نے حکم کے موافق وہاں نظر لگائی - معلوم نہیں کہ جِنّ نے اپنی کرامت سے مرزا کی قوّتِ باصرہ کو زور دے دیا یا کُہر کو پراگندہ کر دیا، غرض وہ کُہر مرزا کی نظر کو مانع نہ ہوئی - مرزا نے دیکھا کہ وادی کا دوسرا سرا کشادہ ہے اور وہاں ایک بحرِ ذخّار رواں ہے اور اُس کے اندر ایک ہیرے کا پہاڑ ہے جو سمندر کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے - اُس کے ایک جانب میں ایسی کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی کہ کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا، مگر دوسری جانب مطلع صاف تھا - سمندر شفّاف تھا جس میں بے شمار جزیرے تھے، جن[2] میں پھول اور شجرِ باردار لگے تھے اور اُن کے گِرد چھوٹی نہریں چمک رہی تھیں - پھر ان جزیروں میں آدمی تھے جو امیرانہ لباس پُرتکلّف پہنے تھے - سروں پر پھولوں کے سہرے لٹکتے تھے - کوئی کیاریوں میں گلگشت کرتا تھا، کوئی ندی کے کنارے پر سوتا تھا، کوئی پھولوں کی سیج لگائے تھا، کوئی جانوروں کی نغمہ سرائی سنتا تھا - پانی جھرنوں میں جھر رہا تھا - آدمی سریلی آوازوں سے گاتے تھے اور باجے بجاتے تھے - جب فضائے دل کشا اور روح افزا دیکھی[3] تو مرزا کا دل باغ باغ ہوا - وہ چاہتا تھا کہ کاش میرے بازو عقاب کے سے ہو جائیں کہ میں اُڑ کر ان جزائر میں چلا جاؤں - مگر جِنّ

۱- ''کا'' اضافۂ مرتّب - ۲- اصل : جس میں -
۳- اصل : فضائے دل کشا اور روح افزا دیکھا -

نے کہا کہ ان جزائر میں سوائے موت کے دروازے سے[1] جانے کے کوئی اور رستہ نہیں ہے - تم نے پُل پر ہر لمحے اس دروازے کو کھلا ہوا دیکھا ہوگا - یہ سرسبز و شاداب جزیرے جن سے سارا سمندر پٹا پڑا ہے اور تیری نظر کے سامنے ، جہاں تک وہ جاتی ہے ، نظر آتے ہیں ، وہ تعداد میں سمندر کی[2] ریت کے ذرّوں سے بھی زیادہ[3] ہیں - اور پھر ان کے پیچھے ، جن کو تُو دیکھ رہا ہے ، اَور کروڑوں جزیرے ہیں جن کو نہ تُو دیکھ نہ خیال کر سکتا ہے - وہ اہلِ خیر کے مسکن موت کے بعد ہیں - وہ اُن کو اُن کی نیکی کے موافق ملتے ہیں - جس قسم کی اور جیسی ان کی نیکیاں ہوتی ہیں ، اُتنی ہی ان کو ان جزیروں کی نعمتیں ملتی ہیں - وہ مختلف قسم کی ہوتی ہیں اور اُن لوگوں کے مذاق کے موافق ہوتی ہیں جو ان میں رہتے ہیں - ہر ایک جزیرہ ایک بہشت ہے جو اس کے رہنے والوں کی طبیعت کے موافق مرتّب ہوتا ہے - یہ مساکنِ بہشت ایسے نہیں ہیں کہ آدمی اُن کو نہ حاصل کرے - اِس پُل کا رستہ کیا برا ہے جس پر چل کر آدمی کو یہ نعمتیں ملیں - موت میں کیا خوف ہے جو تجھے ایسی بہشت میں لے جائے - زندگی میں مصیبت ہے جو ایسی راحتِ جاوداں دلائے - پس تُو اپنے اس خیال کو بھلا دے کہ خدا نے انسان کو کیوں بیکار پیدا کیا ہے - مرزا ان جزائر کے دیکھنے سے ایسا خوش ہوا کہ وہ بیان نہیں ہو سکتا - اب اس نے جِنّ سے بہت عجز و نیاز سے کہا کہ وہ راز کی چیزیں بتاؤ جو اِس ہیرے کے پہاڑ

۱- اصل : سوائے موت کے دروازے کے جانے کے -
۲- اصل : سمندر سے ریت -
۳- ''زیادہ'' کے بعد ''شمار میں'' کے الفاظ زائد تھے جنھیں حذف کر دیا گیا -

کے اس طرف ہیں[1] جہاں ظلمات[2] ہی ظلمات ہے۔ جنّ نے اس سوال کا جواب کچھ نہیں دیا۔ پھر مرزا نے دوبارہ سوال کیا تو اسے معلوم ہوا کہ جنّ اس پاس سے چلا گیا۔ اب جو وہ دیکھتا ہے، نہ وہ سیل ہے، نہ پُل ہے، نہ وہ جزائرِ فرحت افزا ہیں۔ غرض وہاں سوائے بغداد کے کُہسار کے کچھ اور نہیں جس پر بیل، بھیڑیں، اونٹ چر رہے ہیں۔

۱۹- خوشامدی و خوشامد

"خوشامدی" فارسی لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے آدمی کی ایسی تعریف کرے کہ وہ خوش ہو جائے۔ خوشامدی وہ شخص ہے[3] جو خوشامد کرے، مگر جس انگریزی لفظ کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے اس کے حقیقی معنی بے وجہ قبول کرنے والے کے ہیں اور مجازی معنی جھوٹی تعریف کرنے والے کے۔ خوشامد میں یہی ہوتا ہے کہ خوشامدی دوسرے آدمی کی سب باتوں پر آمنّا و صدّقنا کرتا ہے اور کسی بات سے انکار نہیں کرتا، یا جھوٹی تعریف کرتا ہے۔

۱- خوشامدی سب مکّاروں کا سردار ہوتا ہے، اس سے ہوشیار رہو۔ وہ تجھے احمق و ناقص بناتا ہے۔ وہ تیرے نقصوں کو کامل کرتا ہے۔ تمام برائیوں کے کرنے پر تجھے ہمّت دلاتا ہے۔ کسی بات میں تیری اصلاح نہیں کرتا، وہ مکر و فریب سے تیری بدکاریوں پر وہ رنگ چڑھا دیتا ہے کہ نیکی و بدی کی تمیز میں تیری عقل اندھی ہو جاتی ہے۔ انسان سب سے زیادہ آپ اپنی خوشامد کرتا ہے اور اس سے اپنا دل خوش کرتا ہے۔ جب اَوروں کی خوشامد کا اس

۱- اصل: ہے۔

۲- ظلمات ہی ظلمات = تاریکی ہی تاریکی۔ ۳- "ہے" اضافہ مرتّب۔

پر اضافہ ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خوشامدیوں کے ساتھ ، جو حقیقت میں ہمارے[1] دشمن ہیں ، محبت[2] و مہربانی کرنے لگتا ہے - اور یہی ہماری محبت ہم کو بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں پر مہربانی کرنا حق اور انصاف ہے جو ہماری باتوں کو ایسا اچھا سمجھتے ہیں اور ان کی اتنی قدر کرتے ہیں - کبھی آدمی کو اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنی نہیں چاہیے - اس سے آدمی احمق شیخی باز معلوم ہوتا ہے - جب ایمان دار اور راست باز تمھاری وہ تعریف کریں جس کے تم مستحق ہو اور وہ تم کو تمھاری خطائیں بھی بتلائیں تو تم خوش ہو - خوشامدیوں میں کوئی نیکی نہیں ہوتی - کوئی دنیا میں ان کی برابر کمینہ نہیں ہوتا ، مگر وہ شخص جو خوشامد پسند ہوتا ہے - خوشامد کا شوق کمینہ اور نالائق سببوں سے پیدا ہوتا ہے - جیسا کہ خوشامد کرنے والا کمینہ پاجی ہوتا ہے ، ایسا ہی جو خوشامد کی خواہش رکھتا ہے ، وہ پاجی کمینہ ہوتا ہے - خوشامدی ہم میں وہ اوصاف بتاتا ہے جو درحقیقت ہم میں نہیں ہیں ، مگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہم میں معلوم ہوں - اس شوق کے سبب سے اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کو دیتے ہیں اور ان کی باتیں دل کو بھاتی ہیں - یہ نہیں سمجھتے کہ خوشامدی ایک ایسا جانور ہے کہ ہنس ہنس کر ہم کو کاٹتا ہے - بقول حضرتِ یشعیاہ[3] نبی کے کہ جو تمھاری تعریف کرتے ہیں وہ تم کو خراب کرتے ہیں اور تمھارے قدموں کے آگے کا رستہ بگاڑتے ہیں - وہ جب اَوروں کے اوصاف تم

۱- اصل : ہماری دشمن ہیں - ۲- اصل : وہ محبت و مہربانی -

۳- یشعیاہ : یہ غالباً یشوع بن نون ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم اور ان کے خلیفہ تھے - یہ عبرانیوں کو کنعان میں لے آئے اور محاربۂ عمالقہ میں ان کے لشکر کی قیادت کی - عیسائی انھیں نبی مانتے ہیں-

میں لگاتے ہیں تو وہ ایسے ہی ناموزوں ہوتے ہیں جیسے دوسروں کے کپڑے، جو تمھارے بدن پر ٹھیک نہیں آتے، ناموزوں ہوتے ہیں۔ حضرت داؤد[ع] کی دعا ہے کہ خوشامدی کی زبان خدا کاٹ لے۔ حقیقت میں اس کی زبان رنگین سانپ کا پھن ہوتا ہے جو مقدس خلوتوں میں پھولوں کے اندر مخفی ہوتا ہے۔ ایک بڑی مشکل آن کر یہ پڑتی ہے کہ خوشامدیوں اور دوستوں کی باتیں ایسی ملتی جلتی ہیں کہ ان میں تمیز کرنی مشکل ہوتی ہے۔ ہیرے اور شیشے کی سی مشابہت ان میں ہوتی ہے۔ خوشامدی بِن دُم کا بندر ہوتا ہے کہ کھلاڑیاں اور تماشے دکھلا کے دل کو خوش کرتا ہے، مگر نہ کتے کی طرح گھر کی حفاظت کرتا ہے، نہ بیل کی طرح بوجھ اٹھاتا ہے، نہ گھوڑے کی طرح سواری دیتا ہے۔

۲۔ حضرت سلیمان[ع] کا قول ہے کہ جو شخص اپنے لبوں سے تمھاری خوشامد کرتا ہے، اُس کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ خوشامدی کا کچھ اعتبار نہیں۔ خوشامد پر ذرا خیال نہ کرو۔ وہ نیکی کو مردہ کر دیتی ہے۔ خودی[۱] جو انسان کی تباہ کرنے والی چیز ہے، اس کو اُبھارتی اور جگاتی ہے۔ وہ تم کو چھچھورا بنا دے گی۔ جہاں خوشامدیوں کا مجمع ہوتا ہے وہاں شیطان کی خوب دعوت ہوتی ہے۔ خوشامدی، لوگوں کو جال میں پھنساتے ہیں۔ اُن کے دلوں پر بڑا خوفناک نقش جماتے ہیں، خیالات کو بہلاتے ہیں، چھچھور پن اور شیخی کی ضیافت کرتے ہیں اور اپنے ہی سے کام کرنے اَوروں کو سکھاتے ہیں۔ خوشامد وہاں کرتے ہیں جہاں انھیں نفرت ہوتی ہے، سر وہاں جھکاتے ہیں جہاں سر پر قدم رکھنا چاہتے ہیں۔ خوشامد

۱۔ یہاں خودی سے مراد خود پسندی اور خود پرستی ہے۔

ایسے پھول ہیں جو بُرائی کے بُت پر چڑھتے ہیں اور اسی کے مندر کو خوشبودار کرتے ہیں۔

۳۔ ایمان دار، راست باز کبھی خوشامد نہیں کرتا۔ چاپلوسی تو شریروں کی ذہانت کا ایک فعل ہے کہ تملّق کر کے، لوگوں کو احمق بنا کے اپنا کام بناتے ہیں۔ اگر کسی کی طبیعت خوشامد کے لیے موزوں ہو تو وہ بادشاہوں کے دربار میں چلا جائے، وہاں اس کی بڑی قدر ہوگی۔ یہ بادشاہوں کی قسمت میں لکھا ہے کہ کوئی خالص علم، جب تک وہ اوروں کی آنکھوں اور کانوں میں نہ گزر لے، اُن تک نہیں آتا، جس کے سبب سے اس میں خوشامد کی چاشنی اور خود غرضی کی شیرینی خوب شِیر و شکر کی طرح مل جاتی ہیں۔

۴۔ سچّی تعریف کرنی بہ نسبت جھوٹی تعریف یا خوشامد کرنے کے بہت آسان ہے۔

۵۔ جب ایک شخص سے یہ کہا جائے کہ تیری طبیعت خوشامد پسند نہیں ہے اور وہ کہے کہ ہاں یہ بات مجھ میں ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بڑا ہی خوشامد پسند ہے۔ خوشامد ایک چھ حرفوں کا مجموعہ ہے جس کا رواج ہم میں ہو گیا ہے۔ وہ ایک ہلکا سکّہ ہے جو ہم میں چلتا ہے۔ ایک چمکیلی اور بھڑک دار تعریف ہے۔ خوشامد سے بدتر کوئی بداخلاقی نہیں۔ اگر کسی تمام گروہ کی تعریف کی جاتی ہے تو کوئی خوش نہیں ہوتا، اور ان میں سے ایک دو کی خوشامد کرو تو باقی سب کو ناگوار ہوتی ہے۔ خوشامد کی چِکنی چُپڑی باتیں بےوقوف کیا کرتے ہیں یا شریر، جب ان کو کسی کے شکار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ راست بازی کے لیے زیور و لباس کی ضرورت نہیں۔

۶۔ خوشامد بھی ایک عالَم پر فرماں روا ہے۔ اُس کو گالیاں

بھی دیتے ہیں اور اُس کی خوشامد بھی کرتے ہیں۔ اُس پر تبرّا[1] بھی بھیجتے ہیں، اس سے تولّا[2] بھی کرتے ہیں۔ آدمی کے دل میں اپنی تعریف بھری ہوئی ہے۔ خوشامد اس کی گونج کو سینے کے اندر بڑھا کر جادو کا سا اثر کرتی ہے۔ یہ خوشامد کا کام ہے کہ تیوری پر سے بل کو اُتار دے، چہرے پر سے غصّے کو مٹا دے، خاموش غضب کو بُولا دے، ظالم کے ہتھیار اُتروا دے، باپ کے عتاب کو دور کر دے، کنجوس منحوس کی جیب سے پیسا دلوا دے۔ جہاں جو کام سونا نہ کر سکے وہ یہ کر کے دکھا دے۔ خود کی آنکھوں میں سے دیکھ کر آدمی وہ کام نہیں کر سکتا جو اس کے نرم اور ملائم الفاظ کر سکتے ہیں۔ اس کے راگ میں آدمی کو وہ مزہ آتا ہے کہ نہ کسی خوش گلو کے گانے میں، نہ کسی باجے کی خوش آیند آواز میں۔ جیسا وہ دل کو پگھلا کر نرم کر دیتی ہے، ایسی کوئی اَور چیز نہیں کرتی۔

۷۔ خوشامد ایک منقّش ہتھیار ہے جو دیکھنے کے سوا کسی کام کا نہیں۔ خوشامد شریروں کی ماں ہے۔ نیک کاموں کے لیے زہر[3]۔ نیکی کی زمین کے اندر قاتل ہاتھوں سے اس کے زہریلے بیج بوئے جاتے ہیں اور غرور ان کو نشو و نما دے کر امیدوں کے سُکھا دینے اور بہارِ زندگی کے کھو دینے کے اناج پیدا کرتا ہے۔

۸۔ خوشامد کی قیمت میں جب عقل و نیکی دی جاتی ہے تب وہ مول لی جاتی ہے۔ یہ خریداری کیسی مہنگی ہے کہ ایسی بیش بہا

۱۔ تبرّا = اظہارِ بیزاری۔ نفرت، تنفّر، لعن طعن۔ وہ ناملائم الفاظ جو کسی مخالف کی نسبت بطورِ لعنت زبان پر لائے جائیں۔

۲۔ تولّا = محبت رکھنا۔

۳۔ اس کے بعد دو لفظ نقصِ طباعت سے درست نہیں پڑھے جا سکے۔

چیزوں کے عوض میں یہ ناچیز چیز خریدی جاتی ہے - پس دعا مانگو کہ درندے حیوانوں میں ظالم سے اور انھی[1] جانوروں میں خوشامد سے خدا تعالیٰ بچائے - ہمارے پیچھے خوشامد کی بیماری خدا نہ لگائے۔ وہ بڑا مہلک مرض نفسانی ہے - وہ ایک ایسا مادۂ فاسد پیدا کر دیتا ہے جو ہر بدی کی وبا کو پھیلاتا ہے -

۹- **خوشامد کی اصل :** اربابِ بصیرت خیال کرتے ہیں کہ ہر ایک ملک میں ایک زمانہ ایسا گزرا ہے کہ سب آدمی وہاں برابر تھے - اُن میں کوئی کمتر تھا نہ برتر - نہ ان میں کوئی درجہ و مرتبہ رکھتا تھا ، نہ کوئی دولت و مال کے ساتھ مخصوص تھا - پس جب یہ حالت ہو تو اس کا یقین کرنا قرینِ عقل ہے کہ ہر شخص سے محبت اتنی ہوگی جتنی وہ اپنی محنت ، لیاقت ، ہنر سے مایحتاجِ ضروریہ[2] بہم پہنچاتا ہوگا - پس ایسی حالت میں نہ نفرت ، نہ رغبت تلوّن کے ساتھ تھی - وہاں مہربانی فائدوں کا معاوضہ تھا — لیکن جب قوّت ، حکمت ، دانش ، دولت ، مال و بزرگی داخل ہوئی تو بہت سے آدمی چند آدمیوں کی خدمت کے لیے اور اُن کے اسبابِ آسائش کے بہم پہنچانے کے واسطے مجبور ہوئے - پس جب دولت و مال ضرورتوں سے زیادہ پاس ہونے لگا تو انھوں نے اپنے فضول مال کو اپنے عیش و نشاط میں صرف کرنا شروع کیا - پس جو لوگ کسی خدمت کے سبب سے ان کے دوست نہ بن سکے تو انھوں نے اپنے مطلب حاصل کرنے کے واسطے خوشامد کی باتیں پیدا کیں کہ جن سے وہ ان کے درباروں میں داخل ہو کر ان کی خوشی زیادہ کریں - انسان کی آرزوئیں جتنی ہوتی ہیں وہ سب نہیں حاصل ہوتیں - انسان کے تصوّر

۱- اصل نسخے میں یہ جملہ اسی طرح چھپا ہوا ہے جو بے معنی ہے -

۲- مایحتاجِ ضروریہ = ضروریاتِ زندگی -

کا عالم ایسا فراخ ہے کہ جو اس میں سوچتا ہے وہ سب حاصل نہیں ہوتا - اسی واسطے بہت سے آدمی اپنے مقسوم سے راضی نہیں ہوتے - اور جو شخص اپنی حالت کو دوسرے کی مہربانی سے بہتر کرنا چاہتا ہے اور اپنے میں وہ اعلیٰ درجے کی لیاقتیں نہیں دیکھتا کہ اپنے رقیبوں پر سبقت لے جائے تو وہ اَور تدبیروں میں کوشش کرتا ہے جن سے کہ وہ پسندیدہ ہو جائے ، گو بزرگ نہ بنے - اور بہ تدریج وہ فن اَوروں کے خوش کرنے کا[1] سیکھتا ہے ، یعنی خوشامد ، اور اسی فن کو بزرگ ترین تحصیلِ علم و ہنر میں جانتا[2] ہے -

یہ فن اُتنا ہی لوگ سیکھتے ہیں جتنا وہ فائدہ پہنچاتا ہے - اس لیے یہ فن وہیں سرسبز ہوا جہاں اس کی قدر و منزلت زیادہ ہوئی اور اہلِ فن کو منفعت زیادہ پہنچی - یہی وجہ ہے کہ حکومتِ شخصی جہاں تھی ، وہاں وہ بہت محنت و شوق سے سیکھا گیا ، کیونکہ وہاں ساری دولت ، عزّت ، حکومت شخصِ واحد کے ہاتھ میں ہوتی ہے - یہ اصل خوشامد کے پیدا ہونے کی ہے -

۲۰- قومی ساکھ

میں ایک دن[3] اِدھر اُدھر گشت کرتا پھرتا تھا کہ ایک بنک پر جا پہنچا - اس کے عالی شان کمرے میں داخل ہوا - وہاں ڈائرکٹر حسابوں کی جانچ پڑتال کر رہے تھے - سیکرٹری بہی کھاتے کھولے بیٹھے تھے - کلرک قلم برابر چلا رہے تھے - یہ حال دیکھ کر میں بہت خوش ہوا اور مجھے وہ ساری تدبیریں ، جو قومی ساکھ کے بحال ہونے کی سنا اور پڑھا کرتا تھا اور یہ اپنی رائے کہ ان

۱- اصل : خوش کرنے کا وہ سیکھتا ہے - ۲- اصل : چاہتا ہے -
۳- "دن" اضافۂ مرتّب -

تدابیر میں ناکامی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہر گروہ اپنے نفع اور اپنی طرف داری کے اصول پر ان کو مبنی کرتا ہے ، یاد آ گئیں - غرض سارے دن میں اسی خیال کی آدھیڑ بن میں رہا کہ رات کو جب سویا تو خواب میں پھر مجھے یہ نظر آیا کہ میں وہاں پھر اسی عالی شان کمرے میں آ گیا ہوں - وہاں وہ کارکن تو موجود نہ تھے مگر صدر مقام میں ایک زریں تخت بچھا ہوا ہے اور اس پر ایک مہ پارہ جلوہ افروز ہے - لوگوں نے اس کا نام قومی ساکھ بتایا - کمرے کی دیواروں پر نقشوں[1] اور تصویروں کی بجائے قوانینِ شاہی اس نازنین کی[2] نگاہ کے روبرو لٹک رہے ہیں - ان کو وہ دیکھ دیکھ کر مسکراتی ہے اور خوش ہوتی ہے - مگر جب کوئی چیز ان قوانین میں خلل انداز اس کو معلوم ہوتی ہے تو اس کے چہرے پر آثارِ[3] ملال نمایاں ہوتے ہیں - وہ اپنی نزاکت کے سبب سے ڈرپوک بڑی تھی - ایک شخص جو اس کا خیرخواہ نہ تھا ، یہ کہتا تھا کہ اس کو ایک مرض دماغی ایسا ہے کہ اس کو شکلیں نظر آتی ہیں - ہر ایک بات کے سننے سے وہ چونک چونک[4] پڑتی ہے اور چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے - اس کی برابر کوئی دائم المریض عورت نہیں دیکھی - طُرفۃ العین میں اس کی حالتیں بدلتی رہتی ہیں - اس کے جسم کی تر و تازگی دم بھر میں پژمردہ ہو جاتی ہے - چہرے پر ایک رنگ آتا ہے دوسرا جاتا ہے - ابھی خاصی بھلی چنگی بیٹھی تھی کہ دفعۃً مردے کی صورت ہو گئی - میں اس تغیّرِ حالت کی سیر کر رہا تھا کہ اس کے پاؤں کے پاس دو سیکرٹری بیٹھے نظر آئے جن کے پاس دنیا کی چاروں طرف سے چٹّھیاں آتی تھیں اور وہ اس نازنین

۱- اصل : نقشے اور تصویروں - ۲- اصل : نازنین کی نگاہ کے سامنے روبرو -
۳- اصل : آثار و ملال - ۴- اصل : چوک چوک -

کو پڑھ پڑھ کے سناتے تھے - کسی چٹھی کے سننے سے اس کے چہرے پر اداسی چھا جاتی تھی ، جان پر بن جاتی تھی - پھر کسی دوسری چٹھی کے سننے سے اس کی جان میں جان آ جاتی تھی - تخت کے پیچھے ایک انبار روپیوں کی تھیلیوں کا چھت تک لگا ہوا تھا - دائیں بائیں سونے کی اینٹوں کے مینار چنے ہوئے تھے - میں اس نازنین کی یہ صفت سن کے اور متعجّب ہوا کہ وہ جس چیز کو چھوتی ہے ، سونا بنا دیتی ہے - گویا کہ سنگِ پارس ہے - قاعدہ ہے کہ خواب کے اندر کچھ سرگرانی بھی ہوا کرتی ہے ، وہ مجھے بھی ہوئی - کیا دیکھتا ہوں کہ کھٹ سے دروازہ کھلا اور کمرے میں ہلچل مچی - چھ مہیب دیو دو دو کی صف باندھے ہوئے داخل ہوئے - ان کی دہشت ناک شکل میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی - گو ان کی ظاہری صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان میں اختلاطِ دلی ہوگا مگر دو دو ساتھ ساتھ ناچتے تھے - ایک صف میں ظلم و بدعملی ، دوسری صف میں تعصّب اور اِلحاد ، تیسری صف میں سلطنتِ جمہوری - اور ایک نوجوان بائیس برس کا ، جس کا نام میں نہیں جانتا ، اس کے ہاتھ میں تلوار تھی جو قانونِ بندوست پر وہ ناچنے میں بار بار چلاتا تھا - اور ایک شہر کا باشندہ مجھ سے کہتا تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں اسفنج تھا جس سے وہ قومی قرض کو صاف کرنے کا ارادہ رکھتا تھا - یہ وہ ہیبت ناک صورتیں تھیں کہ اگر ایک بھی اس پاکیزہ نازنین کو دکھائی دیتی تو دم نکل جاتا - اب یہ تو ایک گروہ تھا ، ان کے دیکھتے ہی غش آ گیا - رخساروں کے گل زرد ہوگئے ، روح فنا ہوئی - اس کے دم نکلتے ہی ایک عجیب انقلاب ہوا کہ وہ روپیوں کی تھیلیوں کا جو پہاڑ لگا ہوا تھا ، اس کا بہت سا حصہ اڑ گیا - کوئی دسواں حصہ باقی رہا ہوگا - مگر

تھیلیاں ہوا سے بھر گئیں اور بدستور جگہ گھیرے رہیں - سونے کے مینار کاغذوں کے ڈھیر بن گئے -

یہ تباہ حال دیکھ کر میں چیخیں مارنے لگا تو سماں بدل گیا اور وہ سارا سامان میری آنکھوں سے غائب ہوگیا - پھر ایک اور تماشا نظر آنے لگا کہ پریوں کا ناچ ہو رہا ہے - ان میں ایک آزادی تھی جس کے دائیں ہاتھ کی طرف بادشاہی تھی - دوسری طرف اعتدال تھا جس کے ساتھ مذہب تھا - اور ایک شخص تھا جس کو میں نہیں جانتا ، اس کے ساتھ گریٹ برطانیہ تھا[۱] - ان کے آتے ہی اس باکرہ نازنین میں پھر جان آ گئی - تھیلیوں کا انبار اور سونے کے مینار بدستور ہوگئے - یہ دیکھ کر ایسا خوشی کا جوش مجھ میں اٹھا کہ آنکھ کھل گئی - مجھے افسوس ہوا کہ میں کیوں جاگ اٹھا - کاش پھر سو جاؤں اور یہ خواب دیکھوں -

۲۱- دنیا میں راست بازی و دیانت پر ذہانت و ذکاوت کو ترجیح دی جاتی ہے

سورج کے نیچے دنیا میں کوئی برائی اس کی برابر نہیں ہے کہ آدمی اپنی سمجھ کو بری طرح کام میں لائے - مگر افسوس ہے کہ دنیا میں اس برائی کی برابر کسی دوسری برائی کا رواج نہیں ہے - میں نے عورت مرد اور سب صفت کے آدمیوں کو خوب دیکھا کہ ان میں کوئی مشکل سے ایسا آدمی ملے گا کہ وہ اپنی عقل و ذہانت کی شہرت سے اپنی صداقت و دیانت کی شہرت کو بھلا جانتا ہو - یہی اصل بہت سی برائیوں کی انسان میں ہے کہ وہ عاقل ہونے کو بہ نسبت راست باز ہونے کے اور ذکی ہونے کو بہ نسبت نیک کردار

۱- اصل : برطانیہ تھی -

ہونے کے زیادہ چاہتے ہیں - ذہین آدمیوں کی تصنیفات اور ان کی اندھی تقلید سے آدمیوں کے دلوں پر یہ جھوٹے نقش منقّش ہوئے ہیں - بعض صاحبِ کمال اور پرلے درجے کے ذہین ایسے ہوتے ہیں کہ وہ کُل اپنے واقعاتِ متعلقہ پر ایسی نازک خیالیاں ظاہر کرتے ہیں کہ وہ بدنامی اور سزا کے سزاوار ہوتے ہیں - وہ اَوروں کو بھی ایسی نصیحتیں کرتے ہیں جیسی کہ خود ان کو دل نے کی ہیں اور جس نے ان کی عقل کی تیز دھار کو کند کر دیا ہے - وہ برائی اور حماقت کو دیکھ کر ایسے پریشان خاطر نہیں ہوتے جیسے کہ غباوت[1] اور کودن پن کو - ایک شخص کی رائے ہے کہ ایسے ذہین آدمیوں کو پھانسی دینی چاہیے کہ جن کی ذہانت سے برائی پھیلے - کوئی شیطان ان کی برابر نہیں - ان کا حال مفلوج کا سا ہے کہ آدھا جسم ان کا مُردہ ہے - اگرچہ وہ اپنی دولت، جاہ، تصنیف (؟) سے مزے اڑاتے ہیں مگر وہ نیک نیّتی، محبّت، دوستی، عصمت کے مزوں سے نا آشنا ہیں - یہ لوگ اس شریر فقیر سے بدتر ہیں جس نے اپنی ٹانگ اس لیے توڑ ڈالی تھی کہ بھیک میں مزے مزے کے کھانے ملیں - دنیا میں رہنے کا لطف یہ ہے کہ سب آدمیوں کے ساتھ چلے اور ہر ایک آدمی ایسا بڑا کام کرے جس سے سب کا بھلا ہو - گو کوئی کام بے پروائی سے کیا جائے مگر وہ بہ مقتضائے عقل اور بہ فحوائے شرع و شرافت ہو - بغیر اس کے آدمی کی چال درست نہیں - وہ چلتا نہیں، پُھدکتا ہے - عقل چاہے کہ ہوائے نفسانی و جذباتِ روحانی کو منضبط کرے اور ان پر فرماں روا ہو مگر ہم اس کے برعکس محکوم دیکھتے ہیں - کچھ ضروری نہیں کہ جو عاقل ہو، وہ نیک افعال

۱- اصل میں 'عبادت' غلط ہے - غباوت = کند ذہنی -

بھی ہو - یہ حال کچھ خاص آدمیوں کا نہیں ہے بلکہ وہ تو کنویں کی بھنگ[1] ہے جس میں سب مبتلا ہیں - یہ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ زمانہ جتنا خلیق ہوتا ہے اتنا ہی نیکی سے خالی ہوتا ہے - اس کی وجہ یہ[2] ہے کہ انسان پر یہ حماقت چھائی ہوئی ہے کہ ذکاوت و علم کو فی نفسہ لیاقت جانتے ہیں اور یہ کچھ نہیں دیکھتے کہ وہ کن کاموں میں کام آتی ہے - یہ ایک دستور پڑ گیا ہے کہ ہم یہ زیادہ دیکھتے ہیں کہ کوئی کیا کرتا ہے ، بہ نسبت اس کے کہ وہ کس طرح کرتا ہے - یہ بڑی شرم اور ذلّت اور ڈوب مرنے کی جگہ ہے کہ آدمی اپنی عمدہ ذکاوت ، لیاقت ، قابلیت کو اس طرح کام میں لائے کہ اَور آدمیوں کو ان کی برائیوں اور بدکاریوں میں خوش کرے - نیچر عقل آدمی کو ایک طرف اپنی راہ چلنے کا حکم دیتی ہے ، جذبہ مزاج دوسری طرف اپنے طریقے پر - یہ پچھلا طریقہ ایسا بے حد و نہایت ہے کہ کسی طرف ختم نہیں ہوتا اور بہت پیچ دار ہے - پہلی طرف کی راہ نہایت خوش نما ، دل افزا ہے - جس مقصد پر پہنچنا چاہو ، آسانی سے پہنچ سکتے ہو - لوگ اپنے انداز اور وضع داری پر ایسے مرتے ہیں کہ عقلِ مستقیم اور مذہب کی طرف کچھ خیال نہیں کرتے - انسان کے سب کاموں کی بنا عدالت و خدا پرستی پر قائم ہونی چاہیے - اس کے برخلاف وہ اپنے دل کی خواہش پر رکھتا ہے اور اس سے خوش ہوتا ہے اور اسی کو مستحسن جانتا ہے - تم کسی چیز کو تحسین و آفرین کے قابل نہ جانو جب تک

۱- اصل : ”کنوے کی بھنگ“ - صحیح ”کنویں کی بھنگ“ - یعنی جس طرح کنویں میں بھنگ ڈال دی جائے تو اُس کے پانی سے سبھی لوگ برابر مدہوش ہوتے ہیں ، اسی طرح ان لوگوں کا حال ہے -

۲- ”یہ“ اضافہٴ مرتّب -

کہ نیچر تم کو اس کا حکم نہ دے ؛ مثلاً سب قسم کے بزرگوں کی تعظیم کرو ، یہ ایک نیچر کا حکم ہے ، مگر تم دیکھتے ہو کہ جوان بوڑھوں کی کیسی مٹی عزیز کرتے ہیں اور کیسی اُن کی ہنسی اُڑاتے ہیں ۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایتھنز میں ایک تماشا تھا ۔ اُس میں ایک بوڑھا دیر کر کے آیا ۔ اپنے لیے جگہ ڈھونڈتا تھا کہ ایتھنز کے نوجوانوں نے اشارہ کیا کہ آپ ہمارے پاس آئیے[1] تو جگہ دیں ۔ جب یہ کہن سال اُن نوجوانوں کے پاس گیا تو وہ اور پھیل کر بیٹھ گئے اور بڑے میاں پر ہنسنے لگے ، جگہ نہ دی ۔ وہاں سے وہ پھر کر اہلِ سپارٹا کی بنچوں کی طرف گیا تو وہ اس کی تعظیم کے لیے سرو قد کھڑے ہوئے اور بڑی آؤ بھگت سے بٹھایا ، جسے[2] اہلِ ایتھنز دیکھ کر سخت نادم ہوئے ۔ دل میں اہلِ سپارٹا کی نیکی کا اثر ہوا ۔ پیرِ دیرینہ سال نے پکار کر کہا کہ ایتھنز والے نیکی کو سمجھتے ہیں اور اہلِ سپارٹا اس کو کرتے ہیں ۔ کسی زمانے میں بڑی عمر کے آدمیوں کی ایسی عزت و تعظیم ہوتی تھی کہ اگر کوئی نوجوان بوڑھے کے لیے اپنی جگہ نہ خالی کرتا تھا تو وہ ناخدا پرست سمجھا جاتا تھا ۔

۲۲۔ جلسے و صحبتیں

کبوتر با کبوتر باز با باز
کند ہم‌جنس با ہم‌جنس پرواز[3]

۱۔ اصل : آئے تو جگہ دیں ۔ ۲۔ اصل : جس سے ۔

۳۔ اصل نسخے میں یہ شعر اسی طرح چھپا ہوا ہے ۔ عام لوگ اسے یوں بھی پڑھتے ہیں :

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

۱- شیر شیروں کے ساتھ اور ریچھ ریچھوں کے ساتھ مل کر اپنی حفاظت اور آوروں پر حملہ کرتے ہیں - انسان مدنی الطبع ہے - اس کو جب موقع ملتا ہے وہ اپنی صحبتیں ، جلسے ، کلب قائم کرتا ہے - جب کوئی گروہ ہم طبع ، ہم جنس آدمیوں کا جمع ہو جاتا ہے تو وہ اپنی صحبت و جلسے کا کوئی وقت اور کوئی دن مقرر کرتے ہیں کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ ان میں آپس میں مماثلت و مشابہت ہے - ان جلسوں میں کوئی غیر جب شریک ہوتا ہے تو بارِ خاطر ہوتا ہے - ہندوستان میں بہت سے کلب ایسے ہیں کہ وہ مخصوص انگریزوں کے ساتھ ہیں - ان میں ہندوستانیوں کو نہیں شریک کرتے ، اس لیے کہ وہ ان سے غیر جنس ہیں[1] - کوئی ہندوستانی ان میں شریک جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان کا ہم جنس اپنے تئیں بنا لے -

۲- لڑکوں کی کوئی بدنصیبی اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ کمینے اور پاجی آدمیوں کی صحبت میں بیٹھنے لگیں[2] - جو لڑکا اپنے سے کمتر آدمیوں میں بیٹھنے لگے گا ، وہ نیچا ہوتا جائے گا اور آخر کو ایسا ڈوب جائے گا کہ پھر تیر کر نہیں اُبھرے گا - تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ جیسا آدمی کا دل جلد فساد پر آمادہ ہو جاتا ہے ، ایسا جلد وہ صلاح پر نہیں آتا - جیسا کہ ایک اشراف کو پاجی بننا آسان ہے ، ایسا پاجی کو اشراف بننا سہل نہیں ہے - بُری صحبت کا اثر ایسا ہوتا ہے جیسے کہ دیگ کی کالک کا اثر کپڑوں پر آسانی سے ہوتا ہے اور مشکل سے چھوٹتا ہے - ایسے ہی بُری صحبت کا اثر جلد آسانی سے ہوتا ہے اور دشواری سے جاتا ہے - بعض لڑکوں کی طبیعت میں کمینگی ہوتی ہے - ان کو بالطبع رزیلوں کی صحبت پسند

۱- اصل : غیر جنس ہے -   ۲- اصل : بیٹھنے لگے -

ہوتی ہے - خواہ اُن کو کیسی تعلیم دی جائے ، وہ مدرسے میں بھی جائیں گے تو رزیل قوموں کے لوگوں کو اپنا یار بنائیں گے[۱] - بعض کو تعلیم نہیں ہوتی اس لیے وہ بری صحبت میں بیٹھتے ہیں - بعض کو غرور ایک قسم کا ہوتا ہے کہ وہ اگر اپنے ہمسروں میں بیٹھیں تو ان کی عزت وہ نہیں ہوتی جو ذلیلوں میں بیٹھنے سے ہوتی ہے ، اس لیے وہ اُن کی صحبت کو اختیار کرتے ہیں -

۲۳- بد صورتی

بد صورت کو بناؤ سنگار زیبا نہیں

ہم اپنی صورتِ جسمانی آپ نہیں بناتے - وہ قدرت ہی سے بری یا بھلی بنتی ہے - انسان کو اس پر افسوس نہیں ہونا چاہیے کہ ہائے کیوں میں بدصورت یا ناقص الاعضا پیدا ہوا - اس میں اس کی کچھ خطا نہیں ہے - یہ اس کی راست بازی بڑی تحسین کے قابل ہے کہ وہ اپنی بدصورتی کا قائل ہو اور اپنی صورت کے عیبوں اور نقصوں کو دیکھ کر شرمندہ نہ ہو - اُس کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ اپنی بد صورتی کے مٹانے کے لیے گھنٹوں آئینہ رکھ کر سو سو طرح بناؤ سنگار میں تضییعِ اوقات کرے - اس کو اپنی صورتِ زشت پر قناعت و صبر چاہیے اور کبھی کوئی خیال اس قسم کا دل میں نہ آنے دے جس سے رنج ہو - نامعقول آدمیوں کا قاعدہ ہے کہ جہاں انھوں نے دیکھا کہ کسی کی آنکھیں بیٹھی ہوئیں ، ناک چپٹی ، ہونٹ موٹے ، دانت نکلے ہوئے ، منہ ٹیڑھا ، قد لمبا بانس سا یا چھوٹا بالشتیا تو وہ بے اختیار ہنستے ہیں - ایسی حالت میں بدصورت کو چاہیے کہ وہ ان

۱- اصل : اپنا یار بنا کے کھائیں گے -

کے ساتھ ہنسی میں شریک ہو جائے اور اپنی صورت کی ہجو خود بنائے - پھر نہ کوئی اس پر ہنسے گا ، نہ اس کی صورت کو کوئی عیب لگا کے بے ہنگم بتائے گا۔ بد صورتوں پر لوگوں کو جب ہنسی آتی ہے کہ اپنے تئیں خوب صورتوں میں گنتے ہیں اور طرح طرح سے اپنی بدصورتی پر زیبائش اور آرائش کا ملمع کرتے ہیں کہ ہم خوب صورت پری نزاد معلوم ہوں - یہ حماقت ان کی قلعی کھول دیتی ہے اور ان پر بہ نسبت بد صورت[1] کے لوگوں کو زیادہ ہنسی آتی ہے - ان کو چاہیے کہ خدا نے جیسی صورت بنائی ہے ویسی رہنے دیں اور یہ سمجھ لیں کہ زنگی[2] کی سیاہی برف سے تھوڑی جا سکتی ہے - اپنی بد صورتی کا تسلیم کرنا ایسا حسنِ سیرت ہے کہ زشت صورتی کے عیب کو مٹا کے خوب صورت سے بھی اچھا بنا دے گا -

۲۴- مذہب[3] ، طبابت ، وکالت کے پیشے

۱- اِتنی جگہ کہاں ہے کہ ہر شخص اپنے دوست کو لا کر بٹھا سکے - اس خیال سے دل گھبراتا ہے کہ مذہب ، وکالت اور طبابت کے پیشہ وروں کی کیسی کثرت ہے - مذہبی پیشہ وروں —— مولوی ، مُلاّ ، واعظ ، امام ، مؤذن ، پِیر ، فقیر ، گوشہ نشین ، —— میں ایسی کٹاچھنی[4] رہتی ہے کہ ایک دوسرے کو بھوکا مارتا ہے - سب کو پیٹ بھر کے روٹی مشکل سے ملتی ہے -

پھر وکلا اور مختاروں کی وہ کثرت ہے کہ ان کی گنتی مشکل

۱- اور اس پر بہ نسبت صورت کے - ۲- زنگی = حبشی -

۳- اصل میں : "مذہب" کے بجائے "مذہبی" چھپا ہوا ہے جو موزوں نہیں معلوم ہوتا -

۴- کٹا چھنی = لڑائی بھڑائی ، مار پیٹ ، کشت و خون ، بَیر ، دشمنی -

ہے - زیادہ تر ان میں سے فضول معلوم ہوتے ہیں - وہ ایک ایسی سپاہِ کثیر ہو گئی ہے کہ ان کو اپنے ہتھیار چلانے کے لیے جگہ نہیں ملتی - وکیل دو قسم کے ہوتے ہیں : ایک جھگڑالُو ، دوسرے[1] صلح جُو - پھر ان قسموں کی بھی کئی کئی قسمیں ہیں - ایک جھگڑالُو وہ ہیں کہ اپنے موکلوں سے محنتانے پر جھگڑتے ہیں - اپنے غصے ہونے اور گالیاں دینے کی بھی اُجرت موکلوں سے لے لیتے ہیں - گھر پر تو جھگڑا ہوتا ہے مگر کچہری میں حاکم کے روبرو منہ پر مُہر لگ جاتی ہے - دوسرے جھگڑالُو وہ ہیں کہ ناحق کے جھگڑے بکھیڑے درپردہ کھڑے کرتے ہیں اور پھر بظاہر صورت سوال بنتے ہیں کہ وکالت نامے پر دستخط ہوں - اب صلح جُو ایک قسم کے وہ ہیں جو نوجوان ہیں - رات دن قانون کا مطالعہ ہے - ان کی قانونی لیاقت جیسی حاکم بننے کے لیے مناسب پیدا ہو جاتی ہے ، وکالت کے لیے ویسی نہیں ہوتی - اگر کوئی مقدمہ گھر بیٹھے آ گیا تو کچہری میں چلے گئے ورنہ کچھ پروا نہیں - دوسری قسم کے صلح جُو اکثر نوجوان ہوتے ہیں - کبھی وہ قانون کو پڑھتے ہیں مگر زیادہ تر کھیل تماشوں میں مصروف رہتے ہیں - کچھ ان کو اپنے کام کی طرف رغبت نہیں ہوتی -

حکیموں اور طبیبوں کی کثرت ہے - سب کے پاس بیمار نہیں جاتے - وہ خالی بیٹھے مکھیاں اُڑاتے ہیں - یا اگر کوئی بیمار مل جاتا ہے تو اس کے گرد ایسے جمع ہو جاتے ہیں جیسے کہ پکے پھوڑے پر مکھیاں - اس فرقے سے لوگ ڈرتے ہیں - یہ ایک دانش مند کا مقولہ مشہور ہے کہ جس قوم میں طبیبوں کی کثرت ہوتی ہے ، اس

۱- اصل : دوسری صلح جُو -

میں آدمیوں کی قلّت ہوتی ہے۔ تجربے سے ہر جگہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن قوموں میں سے سپاہ میں نوجوان قوی، توانا، تندرست بھرتی ہوتے آتے ہیں، ان میں طبیب دوا کو نہیں ملتا۔ طبیبوں کا حال ہندوؤں کی قدیمی سپاہ کا سا ہے کہ کچھ رتھوں میں بیٹھ کر، کچھ پیدل چل کر دشمنوں کو قتل کرتے تھے۔ ان میں سے دوسرے بہ نسبت پہلوں کے قتل کم کرتے تھے۔ اس لیے کہ وہ تُرت پُھرت جلدی ہر جگہ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ان قواعد داں سپاہ کے سوا آخور[1] کی بھرتی، گھٹیل[2] سپاہی ہوتے تھے جن کے نام سپاہ کی فہرست میں نہیں ہوتے تھے۔ وہ بھی دو ایک راہ چلتوں کو سنگوا[3] لیا کرتے تھے۔

بعض اطبّا کو جب مریض نہیں ملتے تو وہ کیمیا کے نسخے بنانے میں اور معجونوں کے پکانے میں دل لگاتے ہیں اور اپنا وقت سُرموں کے پیسنے میں صرف کرتے ہیں۔ ان تینوں قسم کے پیشہ کرنے والوں کی کثرت سے ملک میں بڑی خرابیاں پھیل رہی ہیں۔ یہ تینوں پیشے ایسے دشوار اور مشکل و معزّز و معظّم ہیں کہ اگر ان کے کرنے والوں کی تعداد سمندر کی ریت کے ذروں کے برابر ہو جائے تو بھی ان میں صدفِ بے بہا دو چار ہی نکلیں گے۔

۲۔ اشراف بھلے مانسوں کو اکثر شوق ہوتا ہے کہ وہ اپنی

۱۔ آخور کی بھرتی = نکمّے اور نالائق آدمیوں کا جتّھا۔ نکمّے مضامین کی کثرت۔ ناکارہ چیزوں کا جمع کرنا۔

۲۔ گھٹیل: کم قیمت، کم درجہ، ادنیٰ، کمینہ، ادنیٰ ذات کا، نیچ۔

۳۔ سنگوانا: یہ لفظ لغات میں نہیں ملا۔ مراد یہ ہے کہ کم درجے کے سپاہی بھی حسبِ توفیق ایک آدھ راہ چلتے دشمن کو موت کے گھاٹ اتار ہی دیتے تھے۔

اولاد کو ان تین پیشوں میں سے کسی پیشے کو سکھائیں اور ان کو معزّز بنائیں - مگر اکثر وہ اپنی امیدوں میں ناامید ہوتے ہیں - ان پیشوں کے میدانوں میں اتنے دوڑنے والے ہیں کہ بہت ہی تھوڑے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں آگے نکل جاتے ہیں - مقدّمات اور نالشیں اتنی نہیں ہوتیں کہ وکلا و مختاروں کے واسطے کافی ہوں - نہ بیمار اتنے ہیں کہ طبیبوں کے لیے کام موجود ہو - غرض اس کثرت نے ان پیشہ وروں میں طرح طرح کے عیب پیدا کر دیے ہیں - وہ اپنے معمولی قواعد سے کام نہیں چلا سکتے - وہ اپنی تعریفوں کا اشتہار اخباروں میں چھپواتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اَوروں کی نسبت سستا کام کرتے ہیں - غرض جیسے اَور سوداگر اور ادنٰی اہلِ حرفہ و پیشہ اپنے کام چلانے کے لیے کام کرتے ہیں ، وہی یہ معزّز پیشے والے کرتے ہیں - عدالت میں ایک مقدّمہ آتا ہے تو[1] ایک وکیل کہتا ہے کہ ہم کو چالیس روپے دو تو دائر کر دیں گے - دوسرا کہتا ہے کہ بیس ہی دے دیجیے - طبیب ہیں ، دوائیں بیچنے کے لیے سر پر لیے پھرتے ہیں اور دکانیں لگائے بیٹھے ہیں - گاہکوں کو پکارتے ہیں ، جھوٹے اشتہاروں کو مشتہر کرتے ہیں - جو خاندانی طبیب تھے ، اُن کے شجرۂ خاندان میں اَور پیشوں کی قلمیں لگتی چلی جاتی ہیں[2] - حکیم زادے اَور نوکریاں کرتے جاتے ہیں - گو اِن پیشوں میں اہلِ پیشہ کی کثرت نے ان کی قدر و منزلت کم کر دی ہے مگر بعض ان میں ایسے کامیاب نظر آتے ہیں کہ اَور اہلِ پیشہ کو رغبت یہ ہوتی ہے کہ اپنی اولاد کو یہ پیشے سکھا کر جنٹل مین بنائیں - مگر اکثر ان

۱- اصل : آتا ہے کہ ایک وکیل -

۲- یعنی خاندانی طبیبوں کی اولاد دوسرے پیشوں کو پسند کرنے لگی ہے اور طبابت کا پیشہ چھوڑ رہی ہے -

میں ایسے ناکام رہتے ہیں کہ اولاد ماں باپوں کو بددعا دیتی ہے کہ ہم کو ''ازیں سُو رانده و زاں سُو مانده[1]'' بنایا ہے۔ کوّا چلا ہنس کی چال، وہ اپنی چال بھی بھولا۔

۲۵- هجو و مذمّت

۱- جب بدطینت آدمیوں میں ذہانت اور مذمّت کرنے کی لیاقت ہوتی ہے تو وہ بڑا ستم کرتے ہیں اور زہر اگلتے ہیں۔ یہ بدنہاد اپنے قریب کے رشتہ داروں، معزّز خاندانوں، نیک نام نام‌آوروں کی ہجو میں فصاحت و بلاغت خرچ کر کے دل آزاری کرتے ہیں، اور اپنے تئیں چھپا کر وہ زہریلے تیر نیک آدمیوں پر لگاتے ہیں کہ وہ اُف نہیں کر سکتے۔ اندر ہی اندر اُن کا کلیجا ایسے زخموں سے چھدتا ہے کہ جن کے اچھے ہونے کی اُمید نہیں ہوتی۔ ایسی وحشیانہ ذہانت پر لعنت ہے کہ کسی خاص آدمی کی دل آزاری کرے۔ یہ ستم شعار اُن لوگوں کی ہجو کرتے ہیں جو مدح کے قابل ہوتے ہیں۔ وہ جو عیب اور برائیاں ان میں بیان کرتے ہیں وہ ہرگز ان میں نہیں ہوتیں۔ جو خرابیاں تاریکی میں اس تیرافگنی سے پیدا ہوتی ہیں وہ بیان نہیں ہو سکتیں۔ یہ پاجی، بدنہاد آدمیوں کے دلوں میں ایک مخفی شرمندگی اور آزردگی پیدا کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ یہ پاجی نہ کسی کا مال چراتے ہیں، نہ کسی کو قتل کرتے ہیں مگر دنیا میں بہت سے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو اپنی بدنامی اور ہنسی اڑانے سے ایسا رنج ہوتا ہے کہ دولت کے چوری جانے یا جان کے جانے سے نہیں ہوتا۔ جب مضرّت پہنچائی جائے تو ضرر کا اندازہ ضرر رساں کے خیال کے

۱- یعنی نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔

موافق نہ کیا جائے بلکہ ضرر رسیدہ کے خیال کے موافق - یہ بدنہاد اپنی تیغِ زباں سے بزرگوں کی عزت کا خون بہاتے ہیں - ان کی زبان سانپ کی زبان کی طرح لہراتی ہے اور نیش زنی کرتی ہے - بعض آدمی ایسے متحمّل و بُردبار ہوتے ہیں کہ وہ اپنی ہجو سن کر چہرہ نہیں بناتے ، مگر اُن کے دل میں رنج و اندوہ ہوتا ہے - سلاطین اور اُمرا کی ہجو میں جب شعرا یا اَور فصحا اپنے[۱] آبِ حیات کو زہر آب بناتے ہیں تو وہ ان کا علاج بمقتضاے زمانہ کرتے ہیں - بعض اُن میں سے ان موذیوں کو بڑے بڑے انعام و اکرام دے دیتے ہیں - ''دہنِ سگ بلقمہ دوختہ بہ[۲]'' پر عمل کرتے ہیں تو وہ پھر ان کی ہجو نہیں کرتے بلکہ اپنی پہلی لکھی ہوئی ہجووں کو ملیامیٹ کر دیتے ہیں یا بدل دیتے ہیں - بعض دفعہ وہ انعام اس کام کے لیے مقرر کرتے ہیں کہ کوئی ہماری ہجو کرنے والے کو بتلا دے[۳] ، کیونکہ اکثر ہجو گم‌نام لکھی جایا کرتی ہیں - جب وہ پکڑے آئے تو اُن کی زبان نکلوا دی ، دست و پا بُریدہ کر دیے ، غرض کیفر کردار کو پہنچا دیا - ایسی باتیں قدیم زمانے سے ہوتی آئی ہیں - ان بدشعار آدمیوں میں یہ ایک اور بُری بات ہوتی ہے کہ وہ جب کسی اپنے دوست سے رنجیدہ ہو جاتے ہیں تو تمام اپنی فصاحت اُس کی ہجو کرنے میں خرچ کرتے ہیں - وہ اس اپنی حرکت کو شرافت سے بعید نہیں جانتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہی ایک حربہ ہمارے پاس ہے جس سے ہم اپنا انتقام لیتے ہیں - جو صرف بدطینت ہوتے ہیں وہ تو اپنے دشمنوں کو ضرر و گزند پہنچاتے ہیں ، لیکن جب اس بدطینتی کے ساتھ فصاحت

۱- اصل : اپنی آبِ حیات -
۲- کتّے کا منہ لقمے ہی سے بند کرنا مناسب ہے -
۳- یعنی ہجو کرنے والے آدمی کی نشان دہی کر دے -

و ظرافت کی لیاقت جمع ہو جاتی ہے تو پھر دونوں دوست دشمن کی خبر لیتے ہیں اور ہنسی ہنسی میں اُن کی خاک اُڑاتے ہیں ۔ ان کی نقل وہی ہوتی ہے کہ تالاب کے کنارے لڑکے گئے ، جو مینڈک سر نکالتا ، اس کے پتھر تاک کے مارتے ۔ اس پر ایک مینڈک نے کہا کہ اے لڑکو ! جو تمھارا کھیل ہے ، وہ ہماری موت ہے ۔ ایسے ہی جو اُن کی ظرافت ہے ، وہ اَوروں کی ذلّت ہے ۔

۲۔ خدا پرستوں اور نیک حکما کی کوئی مذمّت کرے تو اس سے ان کو تکلیف نہیں پہنچتی ۔ وہ حق جوئی میں ایسے مصروف ہوتے ہیں کہ ان کو اپنی ہجو و مذمّت پر توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی ، اور اگر اس کو سنتے ہیں تو جواب بڑے لطف و کرم کے ساتھ دیتے ہیں ۔ ایک حکیم کی ایک شخص سخت ہجو کر رہا تھا تو اس نے کہا کہ تیری اس ہجو کا یقین لوگ ایسا ہی نہیں کرتے جیسے کہ میں تیری تعریف کروں تو اس کا یقین کوئی نہیں کرے گا ۔ ارسطو پر ایک شخص لعنت کرتا تھا تو اس نے اس شخص سے کہا کہ اَوروں کی لعنت ملامت سے تجھے ہمیشہ تکلیف پہنچتی رہی ہے ، اس لیے تُو مجھے خوشی خوشی لعنت ملامت کرتا ہے ، اور میں نے کسی پر کبھی تبرّا نہیں کیا ، اس لیے اس کے سننے سے میں ناخوش نہیں ہوتا ۔ ایک بڑے گوّیے کی ایک شخص نے یہ مذمّت کی کہ تیرے گانوں پر تو لڑکوں کو ہنسی آتی ہے ، تو اُس نے ہنس کر کہا کہ مجھے اچھا گانا اب آ جائے گا ۔ افلاطون کا مقولہ نہایت عمدہ ہے کہ لوگوں نے اس سے کہا کہ تیرے دشمن تجھ کو بہت بُرا کہتے ہیں ، تو اس نے کہا کہ اب میں اس طرح زندگی بسر کروں گا کہ لوگوں کو اُن کے کہنے کا یقین نہیں آئے گا ۔ دوسرا مقولہ یہ ہے کہ جب لوگوں نے اس سے کہا کہ تیرے دوست تجھے

بُرا کہتے ہیں تو اس نے کہا کہ اس سے بہتر کوئی تدبیر بدگویوں کی نیش زنی سے بچنے کی نہیں ہے۔ ایک دانش‌مند کا مقولہ ہے کہ اگر کوئی شخص تم کو بُرا کہے تو تم کو یہ سوچنا چاہیے کہ اس میں کتنا سچ ہے۔ پس اسے سن کر اپنی اصلاح کرو۔

۲۶۔ حفظِ صحت میں زیادہ اہتمام

ایک دائم المریض اپنا حال یوں کہتا ہے کہ میرے جسم و جان کے پیچھے علمِ طب کے پڑھنے سے روگ لگے ہیں۔ جب میں نے اول ہی ایک طب کی کتاب کو مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ نبض میری بے‌قاعدہ چلتی ہے۔ طب کی کتابوں میں جن امراض کا حال پڑھتا تھا یہ جانتا تھا کہ میں ان امراض میں گرفتار ہوں۔ جب ایک فاضل کی کتابیں سِل کے بیان میں پڑھیں تو مجھے اپنے اوپر گمان ہوا کہ مجھے یہ مرض ہو گیا ہے۔ مگر جب میں بہت موٹا ہو گیا تو میں اپنے شبہے کے غلط ہونے سے بہت شرمندہ ہوا۔ پھر میں نے اپنے میں سوائے اور درد کے گٹھیا کی علامتیں دیکھیں۔ جب اُستادوں کی کتابیں دیکھ کر اس کا علاج کیا تو استحالہ[۱] مرض ہوا کہ گٹھیا جاتی رہی، پتھری ہو گئی۔ غرض جب میں امراضِ متعدّدہ میں مبتلا ہوا تو نہایت عمدہ عمدہ اطبّا کی کتابیں جمع کر کے قوانین کو مرتّب کیا، اور ان کا تجربہ اور مشاہدہ اس طرح کیا کہ ایک کرسی ایجاد کی جس میں کمانیاں قواعدِ ریاضیہ کے موافق ایسی لگائیں کہ وہ وزن بتانے کے لیے ترازو کا کام دینے لگی۔ میں تین برس تک اسی کرسی ہی پر پڑھتا، بیٹھتا، سوتا رہا۔

۱۔ استحالہ = حالت بدلنا، ایک حالت سے دوسری حالت میں چلے جانا۔ ایک ماہیت سے دوسری ماہیت ہو جانا۔

میں نے تجربے سے دریافت کر لیا کہ کتنی خوراک[1] پسینوں کی راہ نکل جاتی ہے، کتنی جزوِ بدن ہوتی ہے، کتنی فُضلوں میں نکل جاتی ہے - پس اپنا وزن حالتِ تندرستی میں مقرّر کر کے اُسی کے موافق ہمیشہ اپنا وزن رکھتا تھا - پسینوں کے آنے اور فُضلوں کے نکلنے سے جتنا وزن کم ہو جاتا تھا، اُتنا ہی میں پنیر اور روٹی کھا کر بڑھا لیتا تھا - میں نے اپنے کھانے کا وقت کسی گھنٹے پر نہیں مقرر کیا تھا بلکہ اُسی کرسی کے وزن بتلانے پر - سال بھر تک میں رجسٹر میں اپنے وزن کا حال لکھتا رہا -

اس دائم المریض کے حال سے اس مقولے کی تصدیق ہوتی ہے کہ موت کا خوف موت کا سبب ہوتا ہے - جو اپنے تئیں موت کے ہاتھ سے بچانے کی تدابیر کرتے ہیں، وہ جلد اس کے پنجے میں گرفتار ہوتے ہیں - مؤرخوں نے لکھا ہے کہ میدانِ جنگ سے جو سپاہی جان بچانے کے لیے بھاگتے ہیں وہی زیادہ مارے جاتے ہیں - پس یہی حال اُن وہمی مریضوں کا ہے جو اپنی جان کے واسطے دوا کی فکر میں رہتے ہیں - جتنا وہ موت سے بھاگتے ہیں اُتنا ہی وہ ان کو پکڑتی ہے - غرض جو لوگ فقط جینے ہی کو اپنی زندگی کا مآل جانتے ہیں اور رات دن صحت ہی کی فکر میں رہتے ہیں اور قوانینِ طب کے خلاف کسی کام کو نہیں کرتے ہیں، وہ بڑے دوں طبع ہیں اور انسانیت سے خالی - عالی طبع ایسے کاموں کے کرنے سے مرنے کو اچھا جانتے ہیں - سوائے اس کے جس آدمی کو اپنی جان اور صحت کی ہر وقت فکر پڑی رہتی ہے وہ تمام لذائذِ جسمانی سے محروم ہوتا ہے - ساری دنیا میں ایک اندھیری چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے - یہ ناممکن ہے کہ

۱- اصل : خوراک کتنی پسینوں -

جس چیز کو ہم یہ جانیں کہ وہ اب گئی ، اُس سے کوئی احتظاظ و التذاذ حاصل ہو سکے - کوئی ہماری غرض اس بیان سے یہ نہ جانے کہ ہم صحتِ جسمانی کی تدابیر کو ، جو مناسب ہوں ، منع کرتے ہیں - نہیں ، جو معقول تدابیر ہوں وہ صحت ، نشو و نمائے جسم کے لیے اور دل کی تفریح کے لیے ضرور کرنی چاہئیں[1] - ہم تو اس کو منع کرتے ہیں کہ جینے اور صحت کی[2] فکر میں ہر وقت غم و الم میں مبتلا ہو اور کوئی ہدایت آدمی اپنے دل کو نیکی کی طرف نہ کرے - فقط دنیا میں آنے کا مطلب یہی جانے کہ جسم و جان تندرست رہیں - جو صحت کی فکر زیادہ کرتے ہیں وہ یہ جانتے ہی نہیں کہ کیونکر تندرست رہتے ہیں - جان کی حفاظت کو عرض اور دل کی ہدایت کو جوہر جاننا چاہیے - خوشی اسی میں ہے کہ نہ موت کو چاہیں ، نہ اس سے خائف ہوں - ہم نے جو ایک دائم المریض شخص کا حال نقل کیا ہے کہ اس نے اپنی کرسی ہی کو اپنا طبیب بنایا تھا اور فقط اپنے جسم کے وزن ہی پر صحت کا مدار رکھا تھا ، قدرتی بھوک پیاس ، ورزش کو بالائے طاق رکھا تھا ، اس کے مناسبِ حال یہ نقل ہے کہ جیوپیٹر (یونانیوں کا دیوتا) ایک کسان کے حال پر جب مہربان ہوا تو اُس سے کہا کہ جو تُو مجھ سے مانگے گا میں تجھے دے دوں گا - کسان نے درخواست کی کہ مجھے موسموں پر اختیار مل جائے - یہ درخواست اس کی منظور ہو گئی - اس نے اپنی زمین کی قابلیت کے موافق مینہ ، برف ، جاڑے ، گرمی میں سے جس کی ضرورت ہوئی اُس سے مانگا - وہ اس کی مرضی کے موافق ہو گیا - مگر سال کے آخر میں اس نے اپنے کھیت کی پیداوار کو دیکھا اور

۱- اصل : کرنی چاہیے -   ۲- اصل : صحت کے فکر میں -

اپنے آس پاس کے کسانوں کے کھیت کی پیداوار سے کم پایا تو اس نے اپنے دیوتا سے یہ دعا کی کہ مجھ سے یہ اختیارات لے لیے جائیں، نہیں تو میں جلدی برباد ہو جاؤں گا۔

۲۷- حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت

عورتوں کے حسن کو جو چیزیں دوبالا کرتی ہیں اُن کے باب میں عقلا کے یہ مقولے ہیں: اول حسن کی تائید کے لیے حسنِ گفتار بھی ضروری ہے۔ یہ کلام کی ظرافت، لطافت، خوب صورتی کو دوبالا کر دیتی ہے۔ دوم، حسنِ صورت کو نخوت گرہن لگا دیتی ہے۔ تصنع اور بناوٹ حسن کے لیے چیچک سے زیادہ دشمن ہیں۔ سوم، حسین عورت میں بے وفائی کی قابلیت معشوق کی آن و شان کو بڑھا دیتی ہے۔ چہارم، جو دوست میں بات مکروہ ہو وہ عورت کے لیے بدصورتی کی برابر ہے۔ جب یہ اصول تسلیم کر لیے جائیں تو یہ بات خود ثابت ہوتی ہے کہ عورت سر تا پا اپنے تئیں نیک صفات کے زیوروں سے زیب و زینت دے۔ حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت جو دلبری و دل ربائی پیدا کرتا ہے، وہ کوئی اور چیز نہیں کرتی۔ کمھار کے آوے میں جیسے برتن برے بھلے بنتے ہیں، ایسے ہی مٹی کے خمیر سے آدمی خوب صورت اور بدصورت بنتے ہیں۔ نیک سیرتی، خوب صورتوں کو چمکا اور بدصورتوں کے عیب کو چھپا دیتی ہے۔ یہ خیال کرنا کہ عورتوں کی خوب روئی فقط قوّتِ باصرہ کے احتظاظ کے لیے ہے، غلط ہے۔ یہ حسنِ صورت ان کا، جب حسنِ سیرت اس کے ساتھ ہو، دل کے احتظاظ اور التذاذ کے واسطے بنایا گیا ہے۔ وہی انھیں زیادہ عزیز اور پیارا بناتا ہے۔ خدا پرستی، خوش مزاجی، راست بازی حسن کی جان ہیں۔ ایک حسین عورت کی

قبر پر یہ کیا خوب مضمون کندہ تھا کہ اِس پتھر کے نیچے حسنِ صورت ، جو مردہ ہو سکتا تھا ، دفن ہے اور حسنِ سیرت ، جو زندگی میں حسنِ صورت کو تقویت دیتا تھا ، زندہ ہے ۔

۲۸۔ ظرافت

ظرافت سے مراد ہماری اُس کلام سے ہے جو ایسی فصاحت اور لطافت سے بیان کیا جائے کہ جس سے لوگوں کا دل مسرور ہو ۔ خواہ وہ کوئی لطیفہ ، چُٹکلا ، نقل و حکایت ہو یا کوئی اور بات ہو ۔ اب ظرافت اور ظریف دو قسم کے ہیں : ایک سچّے ، دوسرے جھوٹے ۔ اُن دونوں میں ایسا فرق ہے جیسا بندر اور آدمی میں ۔ جھوٹے ظریف ، بندر کی سی کھلاڑیاں اور تماشے کرتے ہیں اور بھانڈوں کی سی نقّالی ۔ وہ اپنی نقّالی اور بھانڈ پن پر ایسے اِتراتے ہیں کہ ان کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ ہمارے بیان سے برائی و بھلائی ، بے وقوفی و دانائی ، شادی و رنج ، طمع و افلاس ایک ہوئے جاتے ہیں ۔ وہ کم بخت اُس ہاتھ کو کاٹتے ہیں جو ان کو کھلاتا ہے ۔ جس ہانڈی میں کھاتے ہیں ، اُسی میں چھید کرتے ہیں ۔ وہ چٹکلوں سے دوست دشمن دونوں کو چٹکیوں میں اُڑاتے ہیں ۔ ان میں ذہانت ایسی کم ہوتی ہے کہ اس کو سمجھتے[1] ہی نہیں کہ ظرافت میں ہم کو کیا کرنا چاہیے ۔ جو کچھ کرتے ہیں اس سے خوش ہوتے ہیں ۔ ان کا بیان حقیقی اور تحقیقی دلائل سے خالی ہوتا ہے اور جو اُن کی منطقی دلائل ہوتی ہیں وہ مسخرا پن ہوتا ہے ۔ وہ کوئی تعلیم و نصیحت و پند کی بات نہیں کہتے ۔ ان کا مقصود فقط یہ ہوتا ہے کہ کوئی بات ہم ایسی شوخی و شگفتہ بیانی سے

۱۔ اصل : سمجھتی ہی نہیں ۔

کہیں کہ سننے والے ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ جائیں - ان کو منہ چڑانا خوب آتا ہے ، پھبتیاں خوب کہتے ہیں ، شخصی طعن و طنز کی عادت ہوتی ہے - وہ بڑے آدمی اور بڑے مصنف پر اعتراض کریں گے - کچھ بڑائی اور تصنیف پر نہیں - انھیں خود عزت پیدا کرنے کا خیال ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ اوروں کی عزت کو خاک میں ملا کے ذلیل کرنے کا - سچے ظریف ، دل چسپ خیالات کو خوش نمائی سے ادا کرتے ہیں اور ایسی تیزی اور بے باکی سے باتیں کرتے ہیں کہ کبھی کند ذہنی اور دیر فہمی کا داغ اپنے تئیں نہیں لگنے دیتے - وہ پرانی باتوں کو پسند نہیں کرتے بلکہ نئے نئے ایجاد و اختراع کرتے ہیں اور عجیب عجیب رنگِ سخن دکھاتے ہیں - اگر کسی کو دلائل سے نہیں قائل کر سکتے تو اپنے لطائف و ظرائف سے اسے بند کر دیتے ہیں - جو بات کہتے ہیں ، اِس خوبی و لطافت کے ساتھ کہ لبوں پر تبسم آئے بغیر نہیں رہتا - سب اپنے کان ان کی باتوں کی طرف لگا دیتے ہیں اور ایک واہ واہ کا غل مچا دیتے ہیں -

۲۹- نکمّے آدمی و کاہلی

۱- ایک بڑا گروہ نکمّے آدمیوں کا ہے کہ جو فقط اِسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ ہم آدمیوں میں شمار کیے جائیں - ان کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ کوئی ایسا[1] کام کریں کہ آدمیوں میں ممتاز و سرفراز ہوں - وہ وقت کو کسی کام میں نہیں لگاتے ، بالکل عبث و ضائع کرتے ہیں - نہ گزشتہ پر افسوس کرتے ہیں ، نہ آیندہ

۱- "ایسا" اضافۂ مرتب -

کی فکر رکھتے ہیں - اپنی ساری زندگی فقط آنِ موجودہ کو جانتے ہیں اور اس سے بھی متمتّع نہیں ہوتے - جب ان میں سے کسی کو دولت ہاتھ لگ جاتی ہے تو وہ اپنا وقت پلنگ پر یا گھوڑے کی پیٹھ پر صرف کرنے لگتا ہے - کبوتر اور مرغیاں پال کر ان کی حفاظت کتّے بلیوں سے کرتا ہے -

۲- ایک آدمی وہ ہیں کہ سارے دن پڑے رہتے ہیں - نہ کوئی بُرا کام کریں نہ بھلا - اشرافانہ کاہلی میں دن بسر کر دیتے ہیں - دوسرے وہ لوگ ہیں کہ اپنے وقت کو شرارت اور فساد کے کاموں میں بسر کرتے ہیں - خدا پرست خواہ اول قسم کے آدمیوں کو کچھ ہی خیال کریں مگر ان کا حال دوسری قسم کے آدمیوں سے بدتر ہے - اس لیے کہ بدی کا علاج تو ہو سکتا ہے مگر سُستی کا کچھ نہیں - شرارت اور برائیوں سے آدمی سیر ہو کر خود چھوڑ دیتا ہے - اکثر جوانی کے نشے میں ایسے کام ہوتے ہیں مگر جہاں یہ نشہ اُترا ، پھر وہ کام بھی نہیں ہوتے - مگر کاہلی تو روز بروز خالی رہنے سے قوی ہوتی جاتی ہے - کاہلی میں جو تکلیف اور بے چینی ہے وہ کسی اَور کام میں نہیں - کاہل آدمی کو ہر ایک کام ایک شیر معلوم ہوتا ہے جو اس کی جان لینے کے لیے موجود ہے -

۳- سب سے بدتر وہ کاہل ہیں جو بظاہر کام کرنے والے معلوم ہوتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم بہت کام کرتے ہیں - اور کام ہی کرنے کی جلدی میں مضطربانہ اِدھر اُدھر پڑے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کام کرتے ہیں - جو شخص آرام سے بیٹھا ہے اور پلنگ پر پڑا ہے تو وہ جتنا اپنے تئیں دھوکا دیتا ہے ، اُتنا ہی اَوروں کو وہ یہ جانتا ہے کہ میں کچھ کام نہیں کرتا - اس کو روز

کاہلی کے گھنٹے فقط[1] اپنی زندگی بسر کرنے کے طریقوں کی تبدیلی سکھاتے ہیں - کچھ نہ کرنا ندامت دلاتا ہے اور بہت کچھ کرنا آدمی کو ناراض کرتا ہے اور خوف دلاتا ہے - صدہا ترکیبیں ایجاد کی گئی ہیں کہ حرکت بے محنت کے پیدا ہو اور کام بے تردّدات کے کیا جائے - جن پر دولت نے کرم کیا ہے ان میں سے اکثر اپنی مرضی کے موافق کام کرتے ہیں اور جن کو حاجت نے ہل چلانے یا اَور کسی مزدوری کرنے پر مجبور نہیں کیا ہے وہ زندگی بھر بے اصل کام کیا کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ ہم کیا کام کرتے ہیں - وہ کام کرنے والوں کی نقل آتارتے ہیں اور ان میں ہر قسم کے آدمی موجود ہیں - بعض آن میں سے ہر نیلام میں موجود ہیں مگر کسی چیز کے خریدنے کے ارادے سے نہیں آئے - بعض آدمی ہیں ، ہر وعظ میں ، ہر مباحثے میں ، ہر جلسے میں موجود ہیں لیکن اس سے کچھ غرض مطلب نہیں - ہر میلے میں جاتے ہیں مگر اس سے کچھ مسرّت و انبساط غرض نہیں - جبکہ ان کو یہ خالی کام کرنے کے لیے نہیں ہوتے تو ان کا دل گھبراتا ہے -

۴- کاہلی کی برابر کوئی برائی نہیں ہے جو آدمی کو معاشرت کے لیے سب طرح سے نکمّا کرتی ہے - صحیفۂ مخلوقات میں کاہل آدمی کورا صفحہ ہے - وہ کسی کام کے لیے نہیں بنایا گیا اور نہ کسی مقصد کے لیے اس کی زیست ہے - وہ کسی کام کرنے کا اقرار نہیں کر سکتا ، اس لیے کہ اس کی طرف وہ متوجہ نہیں ہوتا - وہ کسی کام میں کامیاب نہیں ہوتا ، اس لیے کہ وہ اس کے کرنے کے درپے نہیں ہوتا - وہ بُرا خاوند ، بُرا باپ ، بُرا رشتہ دار ہے ،

۱- اصل : اس کو روز کاہلی کے گھنٹے فقط اس کو -

اس لیے کہ نہ وہ بیوی کے لیے ، نہ بچوں کے لیے ، نہ کنبے کے لیے روٹی کماتا ہے کہ ان کو بھوکا نہ مرنے دے ۔ وہ دوست بھی اچھا نہیں ہوتا ، اس لیے کہ وہ اپنے ہاتھ کو چھاتی سے جدا نہیں کرتا کہ دنیا کو غارت ہونے سے بچائے ۔ اگر وہ مفلس پیدا ہوا ہے تو وہ عمر بھر غریب ہی رہے گا ۔ اگر تاجر ہے تو دیوالہ نکالے گا ۔ اگر دولت مند ہے تو اس کے اہل کار مال دار ہو جائیں گے اور وہ خود کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جائے گا ۔ یہ یاد رکھو کہ نیچر نے ہم کو کمال کی حالت میں نہیں پیدا کیا مگر ایک قوّت ہم کو عطا کی ہے کہ ہم ترقی کر سکیں ، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم کو لائق اور قابل بننے کے لیے محنت ضرور چاہیے ۔ بہت تھوڑے ہی ایسے غبی ، کودن اور کند ذہن ہوتے ہیں کہ وہ کسی کام میں سخت محنت کریں اور کچھ نہ کچھ لائق نہ ہو جائیں ۔ اور ایسے ہی بہت تھوڑی طبائع تیز ذہن اور ذکی ہوتی ہیں کہ جن کو محنت کی ضرورت نہ ہو ۔ کاموں کے سرانجام دینے میں محنت و توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کیسی کیسی دشواریاں اور مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں ۔ دنیا میں کوئی حیوان ایسا نکمّا نہیں جیسا کہ کاہل بھلا مانس ۔ آس پاس جائداد ہوتی ہے ، اس لیے وہ علم حاصل کرنے میں محنت نہیں کرتا ۔ اور وہ کسی پیشے کے لیے محنت نہیں کرتا ، اس لیے وہ کوئی کام نہیں کرتا ۔ مگر نیچر میں کوئی محض مخفی فضیلت نہیں ہے ۔ کوئی محض کاہل نہیں ہو سکتا ۔ جو نیکی نہیں کرتا وہ ضرور بدی کرے گا ۔ اگر انسان کا دل فائدہ مند علم کا مخزن نہیں ہے تو وہ بے معنی اور لغو اور بیہودہ علم کا خزانہ ہوگا ۔ اگر ایک بھلا مانس عقل کے کام نہیں کرے گا تو بے وقوفی کے کرے گا ۔ اگر کوئی شخص اس سبب سے کوئی کام نہیں کرتا کہ کوئی کام اس پاس کرنے

کو نہیں ہے تو وہ بدی و شرارت کے کام کرے گا یا ذلّت یا مسخرگی کے۔

کوئی اس سے زیادہ افسوس ناک واقعہ نہیں ہے کہ کوئی شخص نیک دل اور قدرتی لیاقتیں اور قابلیتیں رکھنے والا ایسا ہو کہ جس کی ساری لیاقتوں کو کاہلی نے برباد کر دیا ہو۔ باوجودیکہ اس میں سب قابلیتیں ایسی موجود ہیں کہ وہ اوروں کو خوش کر سکتا ہے اور اپنے تئیں ممتاز اور سرافراز، مگر وہ اپنے دوست آشناؤں کے لیے وبا کا حکم رکھتا ہے۔ یہ مقولہ جو ہے کہ کاہل آدمی کسی کو تکلیف نہیں دیتا، مگر اپنے تئیں، صحیح نہیں ہے۔ جس شخص کا دل و دماغ درست ہو اور وہ کاہل اور غافل ہو کر بیہودہ اوضاع و اطوار اختیار کرے تو وہ دوستوں اور عزیزوں کو بہت تکلیف پہنچاتا ہے۔ جو شخص اپنے لیے عدالت نہیں کرتا، وہ ضرور اوروں کے حق میں نا انصافی کرے گا۔

فقط بے گناہی کے خیال سے نیکی نہیں دیکھی جاتی کہ وہ کسی کو ضرر نہیں پہنچاتی، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ بھلائی کیا کرتی ہے۔ طائی طیس نے جب ایک دن کوئی بھلا کام نہیں کیا تو اس نے کہا کہ آج کا دن بے کار کھویا۔ اگر ہم اپنے دنوں پر اس طرح خیال کریں تو معلوم نہیں کتنے دن[1] یوں ہی رائگاں گئے ہوں گے۔ اگر ہم اس کمپاس[2] سے زندگی کے دنوں کا اندازہ کریں تو ہماری زندگی بہت چھوٹی ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں

۱۔ اصل: کتنے دنوں۔

۲۔ کمپاس: زمین کی پیمائش کا آلہ، قطب نما، قبلہ نما۔ یہاں فقط پیمانہ مراد ہے۔

زندگی کے دن وہی شمار کرنے چاہئیں کہ جن[1] میں نیک کام کیے ہوں - اسی حساب کے موافق ایک بوڑھے آدمی کی قبر پر لکھا تھا کہ وہ پانچ سال جیا - یہ عمر جب سے شمار ہوئی کہ اس نے برے کاموں سے توبہ کی - اگر قبرستانوں میں قبروں پر اس طرح عمر کا حساب کر کے لکھا جایا کرے تو بڑا اثر لوگوں کے دلوں پر ہو کہ یہ شخص جو یہاں ایسی نیند سوتا ہے کہ پھر نہیں اٹھے گا ، اس کی عمر نواسی برس کی تھی مگر بچہ تھا - غرض عمر کے دن وہی شمار کیے جائیں جن دنوں[2] میں کوئی کام بھلائی کا کیا ہو - جو دن کاہلی میں یا شرارت میں بسر کیا ہو ، وہ خارج کیا جائے - قبروں پر بجائے اس کے کہ یہ مردہ فلاں تاریخ پیدا ہوا ، فلاں تاریخ مر گیا ، یہ لکھا جایا کرے کہ اتنی عمر ہوئی اور اس میں اتنے دنوں زندہ رہا جن میں اس نے نیک کام کیے ، تو قبرستان بڑی دلچسپ کتاب نیکی کی تعلیم کے لیے ہو جائے -

۳۰- عیش و طمع

۱- دنیا میں استراحت کی مُحبت نے اور عسرت کی دہشت نے اکثر پیشے ، حرفے ، تجارتیں ، زندگی بسر کرنے کے طریقے پیدا کیے ہیں - جب استراحت کی محبت زیادہ ہو جاتی ہے تو عیش پیدا ہوتا ہے اور جب عسرت کی دہشت بڑھ جاتی ہے تو طمع پیدا ہوتی ہے - یہ دونوں کارکن متضاد و مخالف راہوں میں آدمی کو لے جاتے ہیں - فارسی زبان میں اس مضمون کو اس طرح لکھا ہے کہ ایک نوجوان صبح کو پلنگ پر بے خبر سوتا تھا کہ طمع نے اسے للکارا

۱- اصل : کرنی چاہیے کہ جس میں -
۲- اصل : جس دن -

کہ کیوں تُو پڑا اینڈ رہا ہے ؟ اُٹھ کھڑا ہو ۔ ہرچند اس نے عذر اپنے سونے کے لیے کیے مگر طمع نے ایک نہ سنا ۔ ناچار نوجوان کچھ جھومتا ، کچھ اونگھتا پلنگ سے اُٹھا ۔ طمع سے عرض کی کہ جو حضور کا حکم ہو ، وہ میں بجا لاؤں ۔ طمع نے کہا کہ سنو ، دریاے جیحون[1] میں جہاز جانے والا ہے ۔ تم جھٹ پٹ انگور ، بید انجیر ، سیاہ مرچ اور گرم خوشبودار مصالحے غلاموں سے اونٹوں کی پیٹھ پر لدوا کر وہاں لے جاؤ اور جہاز میں لے کر روانہ ہو اور خوب جھوٹ بول کر تجارت کرو ۔ پیسے پیسے پر قسم کھاؤ ۔ تجارت میں ایسے گناہ خدا معاف کر دیتا ہے ۔ جنّت کا دروازہ ان کے کرنے سے بند نہیں ہوتا ۔ یہ حکم سن کر جب نوجوان چلنے کو تیار ہوا تو عیش نے اسے سمجھایا کہ کیوں دیوانہ ہوا ہے ۔ راحت کو چھوڑ کر زحمت اُٹھاتا ہے ۔ بحری سفر میں ہزاروں بلائیں ہوتی ہیں ۔ کیوں ان کو سر پر لیتا ہے ؟ زندگی جو عیش و عشرت کے ساتھ نہ ہو ، وہ کیا خاک زندگی ہے ۔ دنیا میں استراحت ہی جنّت ہے ۔ پس تُو چین آرام کر ۔ دن عید ، رات شب برات منا ۔ مطربِ خوش‌نوا سے گوا ، خوشبوؤں سے مکانوں کو مہکا ، ان کا سارا سامان موسموں کے موافق جمع کر ، باغوں کی سیر کر ۔ دنیا میں موت پیچھے لگی ہوئی ہے ، اس کے بعد پھر دنیا میں آنا نہیں ۔ جتنا عیش کیا جائے کر ۔ غرض ایسی پٹّیاں عیش نے پڑھائیں کہ اس نے گھر سے باہر قدم نہ نکالا ۔ یہ عیش وہ بد بلا ہے کہ جب کوئی سلطنت فتح یاب ہوتی ہے اور اپنے زبردست دشمنوں کو زیر کر لیتی

۱- دریاے جیحون : خراسان کا ایک دریا جس کی لمبائی ۱۸۵۰ کیلومیٹر ہے ۔ آمو دریا بھی اسے کہتے تھے ۔ اس کا قدیم نام آکسس تھا ۔

ہے اور کسی دشمن کا خوف نہیں رہتا کہ وہ اس پر حملہ آور ہو تو اس کی طبیعت کا مقتضا یہ ہے کہ وہ عیش و عشرت میں ڈوبتی ہے، دولت کے مزے لوٹتی ہے، خوب گلچھرّے اڑاتی ہے - عیش کے بندے اپنے نشاط و طرب کے لیے اَوروں کی دولت پر دست درازیاں کرتے ہیں - اب یہ دونوں — عیش اور طمع — کے معاملات مل کر بڑے پیچ در پیچ ہو جاتے ہیں - روز بروز سامانِ عشرت کو عیش دوست بڑھاتے جاتے ہیں - مؤرخوں نے لکھا ہے کہ جب روے زمین کی تمام بڑی بڑی سلطنتوں کو رومیوں نے فتح کر لیا اور کہیں دشمنوں کا کھٹکا باقی نہ رہا تو اس سلطنت میں دو برائیاں پیدا ہوئیں : ایک استراحت، دوسری طمع - اراکینِ سلطنت سے بڑے بڑے ظلموں کے ساتھ اَوروں کی دولت طمع چھنواتی تھی اور اس کو اِسراف کے ہاتھ سے عیش اڑواتا تھا - جو حال اس سلطنتِ روم کا ان دو برائیوں کے ہاتھ سے ہوا، وہ اَور بہت سی سلطنتوں کا ہمیشہ زمانے میں ہوتا رہتا ہے - جب کسی سلطنت کی ایسی صورت بنتی ہے تو اراکینِ سلطنت میں ہر ایک کو یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ اپنی ظاہری شان و شکوہ اور عیش و عشرت میں اَور سب پر سبقت لے جاؤں - کچھ ان کو خوف اس بات کا نہیں ہوتا کہ دشمن پیچھے لگے ہوئے ہیں - وہ اپنے حتی المقدور سوائے عیش و طرب کے کوئی کام اور نہیں کرتے - اس سبب سے ان کو دولت و مال کی طمع دامن گیر ہوتی ہے - اسی مضمون کو ہم تشبیہات کے طور پر بیان کرتے ہیں -

۲- دو بڑے قہرمان ظالم، جن میں سے ایک کا نام طمع اور دوسرے کا نام عیش تھا، ہمیشہ ہنگامۂ جنگ گرم رکھتے تھے - ہر ایک قلم روِ دل کا خواست گار تھا اور یہ چاہتا تھا کہ وہ میرے ہی

ہاتھ تلے رہے - عیش کے بڑے جنگی سپہ سالار یہ تھے : استراحت ، نشاط ، شان و شوکت ، خوش وضعی - طمع بھی کچھ عیش سے قوّت میں کم نہ تھی - اس کے پاس بھی بڑے بڑے سردار یہ تھے : محنت مشقّت ، احتیاط ، حفاظت ، بھوک - وزیر اعظم جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا ، وہ افلاس تھا - سارے کاموں کا مدار اس وزیر اعظم کی صلاح و مشورے پر منحصر تھا - عیش کا وزیر اعظم تونگری تھا - اسی کی صلاح و مشورے سے وہ اپنے سارے کام کرتا تھا - کبھی ایک دم اپنی نگاہ سے اسے غائب نہیں ہونے دیتا تھا - تمام تدابیر اسی کی مرضی کے موافق ہوتی تھیں - غرض یہ دونوں دشمن اپنے ان سپہ سالاروں کو ساتھ لے کر معرکۂ رزم گرم کرتے تو فتح کا کوئی طور و ڈھنگ نہ تھا - کسی دل کو عیش نے فتح کر لیا ، کسی دل کو طمع نے - باپ اگر طمع کے عَلم کے نیچے کھڑا ہے تو بیٹا عیش کے نیزے کے سائے میں بیٹھا ہے - میاں ایک طرف ، بیوی دوسری طرف - بلکہ ایک ہی آدمی جوانی میں ایک جانب اور بڑھاپے میں دوسری جانب - لیکن جو دانش مند تھے وہ نہ کبھی اِس طرف ہوئے ، نہ اُس طرف - مگر ان کی تعداد بہت نہ تھی - جب یہ دونوں لڑتے لڑتے ہار کر تھک گئے تو آپس میں یہ قرار پائی کہ دونوں کی ملاقات ہو ، مگر آپس میں کوئی وزیر ساتھ نہ ہو - جب یہ دونوں آپس میں ملے تو اول عیش نے گفتگو شروع کی - آزادی سے ، جو اس کی طبیعت کا مقتضا ہے ، یہ کہا کہ ہم تم دونوں بڑے سچّے دوست ہوتے اگر تم کو تمھارا وزیر افلاس نہ بہکاتا اور تمھارے کان خوف اور تعصّب سے نہ بھرتا ، وہ بڑا موذی ہے - اس کا جواب طمع نے یہ دیا کہ یہی خیال مجھے بھی تمھارے وزیر تونگری کی طرف ہے - وہ میرے وزیر افلاس سے بھی زیادہ ستیاناس ملانے والا ہے کیونکہ

وہ[1] ہمیشہ استراحت اور عشرت کی صلاح دیتا ہے اور کوئی ضروری احتیاط آیندہ احتیاجوں کے لیے نہیں کرنے دیتا - اس طرح سے وہ اُن تمام اصول کو، جن پر میری سلطنت کی بنا قائم ہے، برباد کرتا ہے - بعد اس مباحثے کے دونوں میں اِس بات پر صلح ٹھہری کہ اپنے اپنے وزیروں کو دونوں برطرف کر دیں - جب اس صلح کے موافق وزیر موقوف ہو گئے تو جو اُن میں اختلافات چھوٹی چھوٹی باتوں میں تھے، مٹ گئے اور پھر وہ آپس میں نیک دوستوں کی طرح رہنے لگے - جو کچھ فتوحات ہوتیں، وہ آپس میں تقسیم کر لیتے - یہی وجہ ہے کہ عیش و طمع دونوں ایک دل میں رہتے ہیں اور ایک ہی آدمی کو وہ آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں - طمع بجائے تونگری کے عیش کراتی ہے اور عیش بجائے افلاس کے طمع بڑھاتی ہے -

۳۱- کتابوں میں ذہن کی کجی

ذہن کی کجی نے تصنیفات کے محاوروں کو ایسا سرگرداں کیا ہے کہ جن کے سر پاؤں ملے ہوئے اور چوتڑوں[2] سے کان گتھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں - ان کی پریشانی بیماروں کے خواب کی پریشانی سے زیادہ ہے - ان کا حال ایسی تصویروں کا سا ہے کہ جن میں خوبصورت عورت کے ساتھ مچھلی کی دُم لگی ہوئی اور گھوڑے کے دھڑ پر آدمی کا چہرہ بنا ہوا - چوپایوں کے ہاتھ پاؤں پر پَر لگے ہوئے اور پرندوں کے پَروں کے نیچے چوپایوں کے ہاتھ پاؤں جڑے ہوئے - پس جیسی ان تصویروں کے دیکھنے سے ہنسی آتی ہے اور مصوّر پر دیوانگی کا احتمال ہوتا ہے، ایسے ہی تصنیفات پر ہنسی اور

۱- اصل : جو ہمیشہ -   ۲- اصل : جوتروں -

مصنف کے سودائی ہونے کا خیال ہوتا ہے۔

۳۲۔ ناموری اور برتری کی خواہش و عزت کی طلب

۱۔ کیا تعجب ہے کہ حضرتِ انسان باوجود ضعیف البنیان[۱] اور ناتوان اور ناقص و ناکامل ہونے کے دل سے خواہاں اپنی تعریف کے ہوں، اور اس کے لیے حتی المقدور سعی اور کوشش کریں، اور اپنی خباثت، جہالت، مصیبت زدگی و نقص کی تعریف کے لیے جھگڑا کریں۔ انسان کا حال ایسا ہے کہ فی نفسہٖ اس میں کوئی بات فخر کی نہیں؛ مگر ہاں، جب وہ اپنا اَور حیوانوں کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے تو ان کی نسبت اپنے عیب و نقص کم پاتا ہے۔ اس وصفِ اضافی کے سبب سے وہ اپنے تئیں اشرف المخلوقات جانتا ہے اور اس پر فخر و مباہات کرتا ہے۔ غرض گو اس میں ذاتی کمال نہیں ہے مگر اضافی کمال ضرور اس میں ہے۔ اس بات کو احمق اور عاقل جدا جدا خیال کرتے ہیں[۲]۔ دانا خود بالذّات منوّر ہونا چاہتا ہے، احمق اَوروں کے نور سے چمکنا چاہتا ہے۔ دانش مند اپنے عجز و ناتوانی کو دیکھ کر متکبّر ہوتا ہے، احمق اَوروں کی عاجزی کو دیکھ کر متکبّر ہوتا ہے۔ عقل مند اپنی ضرورتیں اور احتیاجیں دیکھتا ہے، نادان اپنے پاس ضرورت سے زیادہ چیزوں کی افراط دیکھتا ہے۔ عاقل جب خوش ہوتا ہے کہ خود دل اس کا تعریف کرے، احمق جب مسرور ہوتا ہے کہ اَور لوگ اس کی تحسین و تعریف کریں۔

انسان کے دل میں جو اپنی تعریف و ستائش کا جذبہ اٹھتا ہے، گو وہ بیہودہ اور برخلافِ عقل ہو مگر وہ انسان کے حق میں ایسا

۱۔ ضعیف البنیان = جس کی بنیاد ضعیف ہو۔

۲۔ ''ہیں'' اضافۂ مرتّب۔

مُضر نہیں کہ بالکل معدوم کر دیا جائے ۔ وہ اس کو پاجی اور سِفلے پنے کی باتوں سے روکتا ہے ، شاندار اور معزّز کاموں کی طرف متوجہ کرتا ہے ۔ گو اس کی اصل ناقص ہے مگر اس کے نتیجے اچھے پیدا ہوتے ہیں ۔ اگر ناموری کی تمنّا ایسی باتوں میں بہ مقتضاے عقل ہو کہ قابلِ تحسین ہو تو وہ صفاتِ انسانی میں حسانت پیدا کر دیتی ہے اور اگر بہ مقتضاے خودنمائی اور حماقت وہ ہو تو خراب و خستہ کر دیتی ہے ۔

۲- ہر فرقے کی شہرت و نیک نامی و نام آوری جدا جدا ہوتی ہے ۔ اول جلیل القدر ، عالی ہمّت ، والا نہمت شجاعوں کا فرقہ ہے ؛ اس کی نیک نامی مہمّاتِ عظیم کے سر کرنے میں ہوتی ہے ۔ اس کی ناموری وہ درخشندہ ہوتی ہے کہ خواہ لوگ کتنے ہی بے صبر ہو کر اور تکلیف اٹھا کر اس کو تاریک کرنا چاہیں مگر وہ تاریکی کا سایہ تک بھی اس پر نہیں ڈال سکتے ۔ دوم معزّز اشرافوں کا فرقہ ہے کہ جن کی نیک نامی ، انسانیت اور شرافت کے کاموں کے کرنے سے ہوتی ہے ۔ ان کی شہرت بھی مستقل ہوتی ہے ۔ لوگوں کو پسند نہیں ہوتا کہ کوئی ان کو برا کہے اور ذلیل سمجھے ۔ جو ان کی بدگوئی کرتا ہے ، اکثر آدمی اس سے منہ پھیر لیتے ہیں ۔ سوم ، تاجروں کا فرقہ ہے جن کی ساری نیک نامی ان کی ساکھ پر موقوف ہے ۔ مثل مشہور ہے کہ "جائے لاکھ ، رہے ساکھ" ۔ ان کی نیک نامی کا قیام نازک ہوتا ہے ۔ جیسے ایک ٹھگ ہاتھ میں چراغ اور خنجر لے کر کسی کو زخمی کر سکتا ہے ، اِسی طرح ادنٰی آدمی ساہوکار کی ساکھ پر صدمہ پہنچا سکتا ہے ۔ تاجر اپنی دولت کو بہت دور دور پھیلاتا ہے تاکہ وہ اوروں کی دولت سمیٹ کر اپنے وطن میں لائے اور وطن کی دولت بڑھائے ۔ اس قوم کی دولت بڑھانے والے کو وہ

پاجی خبیث ، جو ننگِ قوم ہے ، گزند پہنچا سکتا ہے اور ایسی خبریں مشہور کر سکتا ہے کہ جس سے اس کی ساکھ اور دولت دونوں میں کمی آئے ۔

۳۔ اگر روح کو جذبات سے خالی تصوّر کریں تو وہ ایک بے حِس و حرکت ، مُردہ سی ہو جاتی ہے ـــ ارادوں میں سست ، کاموں میں کاہل ۔ ان جذبات ہی کا یہ کام ہے کہ وہ روح کو ابھارتے ہیں ، کام پر آمادہ کرتے ہیں ، سمجھ کو بیدار کرتے ہیں ، ارادوں میں زور پیدا کرتے ہیں ۔ غرض انسان کو اپنے منصوبوں کے سرانجام دینے میں وہی طاقت ور اور اولوالعزم بناتے ہیں ۔ یہ کام تو عام سب جذبات کرتے ہیں مگر جاہ طلبی کا جذبہ خاص ان کاموں کی جان ہے ۔ وہ دل کو ایسے کاموں پر آمادہ کرتا ہے کہ جن سے عزت ، شہرت ، نیک نامی ، ناموری حاصل ہو ۔ غرض ان خیالات کو زیادہ وسعت دیں تو انتظامِ الٰہی کے مقاصدِ بزرگ اس جذبے کے دل میں رکھنے کے معلوم ہو جائیں گے ۔

اس دنیا کے لیے ضرور ہے کہ علم و ہنر و فن ایجاد کیے جائیں اور ان کو ترقی دی جائے ۔ کتابیں تصنیف ہوں اور متأخّرین کے وہ حوالے کی جائیں ۔ قومیں فتح کی جائیں اور شائستہ بنائی جائیں ۔ ان کاموں کے واسطے اور اور کارہائے بزرگ کے لیے اگر یہ جذبۂ جاہ فقط نیک دل ہی آدمیوں میں پیدا کیا جاتا تو دنیا کی بہت کم ترقی ہوتی ، اس لیے کام کرنے کے لیے یہ جذبۂ جاہ طلبی ، یعنی نیک نامی اور شہرت کی خواہش کا ، ہر شخص کے دل میں رکھا گیا ہے ۔ اسی کی بدولت بہت سے عطیّاتِ الٰہی ، جو انسان کو حاصل ہیں ، نکمّے نہیں پڑے رہتے ۔ اس کے سبب سے بہت سے بدکار آدمی ایسے کاموں کے کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ جن سے ان کو عزت ،

حُرمت اور شان و شوکت ، ناموری و شہرت حاصل ہوتی ہے - جن آدمیوں میں اعلیٰ درجے کی لیاقت ہوتی ہے ، اُنھی کے دل میں حُبِ جاہ کام کرتی ہے - اس کے برخلاف جن کے دل میں کمینگی اور سفلگی ہوتی ہے ، ان پر اس کا اثر بہت کم ہوتا ہے - یا ان کی عقل و ہوش میں یہ قابلیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ ایسے کام کرنے پر آمادہ ہوں کہ جن سے شہرت و نیک نامی حاصل ہو ، یا وہ اپنے اغراض اور آرام کے لیے ایسے خیالات بھی نہیں کر سکتا کہ جن سے کوئی بھلائی اور بہبودی ان کی ہو ، یا مشیّتِ ایزدی نے اس کی روح کو ایسا بنایا ہے کہ اس میں یہ جذبہ ہی نہیں بنایا جو دنیا کے لیے بے فائدہ اور اپنے لیے باعثِ تکلیف ہو -

یہ جاہ و شہرت کا جذبہ انسان کے دل میں ایسا ہی قوی ہے کہ وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا ، گو اس کے حاصل ہونے میں نہایت مشکلات پیش آتی ہیں اور جب حاصل ہو جاتا ہے تو اس کے جاتے رہنے کا ہر وقت سانسا[1] و خوف لگا رہتا ہے - ایسے صاحبِ ہمّت دنیا میں بہت تھوڑے ہیں کہ جن کو لیاقت ایسے کاموں کے کرنے کی ہو کہ جن پر ساری دنیا متحیّر و متعجّب ہو کر تعریف کرنے لگے - انتظامِ الٰہی نے ہم سب کو ایک ہموار جگہ پر بٹھایا ہے اور ایک قسم کا تناسب وہ ملحوظ رکھا ہے کہ اگر کسی کو ایک فضیلت میں کامل بناتا ہے تو دوسرے میں ناقص رکھتا ہے - ہر شخص کو کمینگی اور پاجی پنے سے بچانے میں وہ احتیاط اور اہتمام زیادہ کرتا ہے ، بہ نسبت اس کے کہ ایک فردِ انسانی کو سب سے زیادہ معزّز و ممتاز بنا دے جس پر لوگوں کو تعجّب ہو - جن عالی ہمّتوں میں خداداد بڑی لیاقتیں اور قابلیتیں موجود ہیں اور

۱- سانسا = فکر ، اندیشہ ، خوف ، خطرہ ، دھڑکا ، ہَول -

انھوں نے ان کو اپنی محنت اور جاں فشانی سے درجۂ کمال پر پہنچایا ہے ، میں پوچھتا ہوں کہ ان میں کے ایسے ہیں کہ جن کی نیکیوں اور خوبیوں کی روشنی کو آدمی دیکھیں اور اپنی جہالت ، تعصّب ، حسد سے ان کے تاریک کرنے میں سعی نہ کریں ؟

بعض آدمی تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو شرافت اور پاجی پنے کے کاموں میں تمیز کرنے کی لیاقت ہی نہیں ہوتی - بعض بد نیّت خبیث ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اَوروں کے بھلے کاموں کو ہمیشہ بدنیّتی اور خود غرضی پر محمول کیا کرتے ہیں - بعض بالقصد ان کاموں کو غلط بیان کیا کرتے اور ان کے مقاصد کو غلط سمجھتے ہیں - یہ سب باتیں ایسی جمع ہو جاتی ہیں کہ جتنی اُن پر غور کی جاتی ہے اُتنا ہی یہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جتنی آرزو نیک نام و نامور ہونے کی کرتا ہے ، اُتنا ہی وہ ناکام رہتا ہے - کے ٹو[1] کی سب سے زیادہ تعریف اسی بات کی ہے کہ جتنا وہ نام آوری سے گریز کرتا تھا ، اُتنا ہی وہ زیادہ نیک نام ہوتا تھا - آدمی کا دل جن باتوں کو زیادہ چاہتا ہے ، اُنھی پر اَور آدمی جرح قدح کرنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں اور خبیثانہ اپنا دل خوش کرتے ہیں - جب وہ عالی ہمّت اور والا نہمت آدمیوں میں دیکھتے ہیں کہ ان کو ناموری اور جاہ طلبی کی بڑی خواہش ہے تو بجائے تعریف کے حسد کرتے ہیں یا ان کی ستائش میں بخل اور خاموشی اختیار کرتے ہیں - وہ جب ان کی تعریف

۱- کے ٹو : پورا نام مارکس پورکئیس کاٹو - کے ٹو المحتسب کے نام سے مشہور ہوا - رومی مدبّر ، معلّم اخلاق اور کاشتکار جو ۲۳۴ قم میں ٹس کلم میں پیدا ہوا اور ۱۴۹ قم میں روما میں فوت ہو گیا - یہ یونانی طب اور فلسفے کا سخت مخالف تھا - فلاحت پر اس کا رسالہ مشہور ہے - (مقدمہ تاریخ سائنس جلد اول ، ص ۲۹۴)

سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ لوگ اپنی مہربانی سے ان کے حق میں یہ کلماتِ خیر فرماتے ہیں ورنہ وہ کسی تعریف کا استحقاق نہیں رکھتے - جن کی طبیعت اس خباثت سے خالی ہے وہ بھی زیادہ تر تعریف سننے سے کان اپنے کھڑے کرتے ہیں اور خوف کرتے ہیں کہ وہ کہیں اَوروں کے خیال میں ان سے زیادہ معظّم اور بلند پایہ نہ ہو جائیں - یہ تعریف و مدح کی آرزو ہر عالی ہمّت سے بڑی خفیف حرکتیں ضرور کراتی ہے جس سے اس کی نیک نامی میں بٹّا لگتا ہے - اس کو بڑا خوف یہ لگا رہتا ہے کہ لوگ میرے کاموں پر یہ گمان نہ کریں کہ میں اپنی ذات کے لیے کرتا ہوں جن سے میرے حقوق دنیا میں تلف ہو جائیں اور جس تعجّب و حیرت سے لوگ میری تعریف کرتے ہیں اس میں نقصان نہ آ جائے - ان وجوہ سے وہ خالی بڑی شیخی اور نمود کی باتیں بناتا ہے اور اپنے کاموں کو بڑی دھوم دھام اور جوش و خروش سے مشتہر کرتا ہے - ہمیشہ گفتگو اپنی جانب داری کی کرتا ہے اور ساری گفتگو میں اُس کی ایسے[1] رموز اور کنایے ہوتے ہیں کہ جن سے اس کے کاموں کی مدح مترشّح ہوتی ہے ، اَوروں کے کاموں کی مذمّت - جب کام بڑے معظّم و معزّز نہیں ہوتے تو وہ ان کی روشنی کو زیادہ وسعت میں پھیلاتا ہے جس سے وہ مدھم ہو جاتی ہے - جن آدمیوں کو عالی جاہ ہونے کی تمنّا ہوتی ہے اُن میں ، ہر ایک میں ، یہ قدرتی ضعف ہوتا ہے کہ جن سے وہ باتیں کرتا ہے اُن کی حقارت و ذلّت دل میں ہوتی ہے - اور یہی خصلت جس کے سبب سے وہ آگے بڑھنا چاہتا ہے ، اس کی تعظیم لوگوں کے دلوں میں نہیں پیدا ہونے دیتی -

---

۱- اصل : ایسی رموز اور کنائے -

دنیا میں ہنر بینی سے زیادہ عیب بینی کا رواج ہے جو خودنمائی پر ملامت کرتی ہے اور اس کے بڑے کام کو بھول جاتی ہے - سچ ہے کہ اعلیٰ درجے کے آدمیوں میں شہرت کی خواہش کی وجہ سے ایک سُبک حرکت اور سفلہ پن معلوم ہوتا ہے - جس کے دل میں اصلی اور مستحکم عظمت اور بزرگی ہوتی ہے تو وہ دنیا کی مدح و ذم کی پروا کچھ نہیں کرتا اور زبان کی نرم آوازوں اور فساد کی باتوں کے جھگڑوں سے اپنے تئیں پرے رکھتا ہے - انھی آدمیوں کی تعظیم اور تکریم، ادب و لحاظ زیادہ ہوتا ہے کہ جو ہم سے اوپر، نیکی کی راہِ بزرگ میں باقاعدہ چلتے ہیں اور کچھ اِس کی پروا نہیں کرتے کہ ہم ان کی نسبت اچھی یا بری رائے رکھتے ہیں -

ہم کو بے غرضانہ انسان سے محبت کر کے کام اس طرح کرنے چاہئیں کہ جس سے ہمارے کردار اور پروردگار کی عظمت و شان نمایاں ہو - جو لوگ اپنی خود غرضی اور ناموری کے لیے عمدہ کارہائے عظیم کرتے ہیں، ان سے کرنے والوں کی دلیری، بہادری اور کوئی نیکی نہیں ظاہر ہوتی - اسی سبب سے یہ تمام رائے اور فیصلہ جو لوگوں کی عادت میں داخل ہے کہ وہ آدمیوں کی نیک نامی اور ناموری کے کاموں کو خودنمائی اور خود غرضی پر حمل کرتے ہیں، وہ بالکل بے اصل نہیں ہوتا - خلاصہ اوپر کے بیان کا یہ ہے کہ نیک نام اور نام ور ہونا بڑا مشکل ہے - خاص کر اُس شخص کا جو اس کی تمنّا رکھتا ہو - اس لیے کہ بہت سے آدمی تو اپنی خباثت کے سبب سے اس کی جاہ طلبی کو خود نمائی سے محمول کرنے سے باز نہیں رہنے کے، اور اس کی خود نیک نامی کی تمنّا ایسی حرکاتِ ناشائستہ خود نمائی کی کرائے گی کہ جس سے اُس کی عزّت اور ناموری میں بٹّا لگے گا اور اس کی عالی تمنشی میں خفّت اور سُبکی نمایاں ہوگی -

شہرت اور عزّت دونوں بہت آسانی سے جاتی رہتی ہیں - جیسا اُن کا حاصل ہونا دشوار ہے ، ایسا حاصل ہونے پر ان کا باقی رکھنا اور سنبھالنا مشکل ہے - اس مطلب کو ہم آگے بہت تفصیل سے لکھتے ہیں -

۴- دنیا میں جب کسی کو چڑھتا بڑھتا دیکھتا ہے[1] تو انسان اپنی ایک قدرتی خباثت کے سبب سے اس کے پیچھے پڑتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ کوئی عیب اس میں ایسا نکالوں کہ لوگوں میں بجائے اس کی قدر و منزلت کے اس کی خواری و ذلّت ہو جائے - دنیا میں جو لوگ اس کی ہم حالت پیدا ہوئے ہیں اور سب طرح سے اس کی برابر سمجھے جاتے ہیں ، وہ جب اسے اپنے سے بلند دیکھتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ اس کی ٹانگ گھسیٹ کر پھر اپنی برابر کھینچیں - اس غرض سے کبھی تو اس کے کسی گزشتہ کام کی مذمّت کرتے ہیں ، کبھی حال کی لیاقت اور قابلیت کے کاموں کا خاکہ اُڑاتے[2] ہیں - ایسے ہی اُن لوگوں کا حال ہے کہ جو اس کو پہلے اپنے سے نیچا دکھاتے ہیں تو حسد کرتے ہیں اور خوف کرتے ہیں کہ وہ کہیں ہم سے زیادہ بلند نہ ہو جائے - اس لیے اس کی لیاقت اور قابلیت کے کاموں کو خاک میں ملاتے ہیں - غرض ہمسر اور برتر دونوں اس کی عزّت کے کم تر بنانے کے در پے ہوتے ہیں -

جب کوئی آدمی برتری حاصل کرتا ہے اور اپنی لیاقت اور قابلیت کے جوہر دکھاتا ہے تو اس کے سارے کاموں کی طرف لوگوں کی نظریں لگی رہتی ہیں اور اس کے ذرا ذرا سے کاموں پر عیب گیری اور نکتہ چینی ہوتی ہے - اور جہاں کسی کام میں اس کو ضعیف[3]

۱- اصل : چڑھتا بڑھتا دیکھتے ہیں -   ۲- خاکہ اُڑانا = مذاق اُڑانا -
۳- اصل : ضعف -

دیکھتے ہیں تو بڑی خوشیاں مناتے ہیں اور جب اس کی لیاقت کی تعریف اور نیک نامی سنتے ہیں تو بعض آدمی اس کی مخالفت پر کمر باندھتے ہیں اور اس کو جھٹلاتے ہیں اور اس کے خصائل کی بدیوں کی خبروں کو اڑاتے ہیں - اپنی خباثت کے سبب سے جو اس میں برائیاں معلوم ہوتی ہیں ، ان کو مغرورانہ شائع کرتے ہیں - اور اپنی رائے اور فیصلے کی بڑی تعریف کرتے ہیں کہ دیکھو ہم نے وہ بات دریافت کر لی جو سب کی نظروں سے مخفی تھی - جس کی تعریف تمام دنیا کر رہی تھی اس کی غلطی پکڑ لی - بعض آدمی یہ آہوگیری اور عیب بینی اس لیے کرتے ہیں کہ اس سے اُن کے دل کو ایک چین اور آرام ملتا ہے - جن عیبوں اور خطاؤں سے وہ اپنے تئیں بری سمجھتے ہیں اور اُن کو دوسرے شخص میں دیکھتے ہیں تو ان کے اشتہار دینے سے درپردہ اپنی اِس خوبی کا اظہار بھی مد نظر ہوتا ہے کہ ان برائیوں سے ہم بری ہیں - گویا اُس کی ہجو کرنی اپنی مدح کرنی ہوتی ہے - اور اس خود نمائی پر وہ بڑے پھولتے ہیں کہ جو ایک بڑے نامور مشہور آدمی میں عیب و نقص ہیں وہ ہم میں نہیں ہیں ، اس سبب سے ہم اس سے برتر ہیں -

بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ برائیاں اور عیوب ، جو اپنے میں ہوتے ہیں ، وہ کسی جلیل القدر نامور میں بتلاتے ہیں تاکہ دونوں کے اندر عیوب میں مساوات ہو جائے - اس کا خیال نہیں کہ اگر ہم کسی بڑے آدمی کے برابر ہوگئے تو اس میں کیا فخر ہے - کیا فقط اس ڈینگ پر مرتے ہیں کہ ہم میں اگر عیب ہیں تو ایسے ہیں جو بڑے بڑے آدمیوں میں ہوتے ہیں ؟ وہ نہیں جانتے کہ اس طرح وہ برائی کے الزام سے بری نہیں ہو سکتے ، مگر وہ اپنے تئیں خیالی ہمسر ایک بڑے آدمی کا اس طرح بنا لیتے ہیں - معززین کے بے عزت

کرنے کے یہ آلات ہیں جن کو لوگ کام میں لاتے ہیں مگر اپنے کام میں کامیاب نہیں ہوتے - کسی صاحبِ لیاقت کے نالائق بنانے میں جو ذہانت صرف کرتا ہے وہ اپنی خاک آپ اُڑاتا ہے - جو معمولی آدمی ہیں اُن کی ہجو کو لوگ ایسی توجہ سے نہیں سنتے جیسے کہ کسی عالی مقام ، والا جاہ کی مذمت کو جس کی خوبیوں اور لیاقت کی ایک دھوم مچ رہی ہے - مگر اس کے لیے بڑی لیاقت اور ہنر درکار ہیں کہ کسی صاحبِ لیاقت کی ، جو ہجو کے قابل نہ ہو ، ایسی مذمّت کرے کہ جس سے وہ ہجو سننے والوں کے[1] برابر یا ان سے کم تر ہو جائے -

اس اوپر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ معزّز آدمی کے بے عزّت[2] اور بدنام کرنے کے کیسے باریک پیچ دار طریقے ہیں اور کتنے خبیث جاسوس اس کے عیبوں اور نقصوں کی[3] مخفی جاسوسی کر رہے ہیں ، جن کی اُس کو خبر نہیں کہ وہ ان کا تدارک کرے - قاعدہ ہے کہ جب ہم کو کسی جلیل القدر ، والا جاہ ، صاحبِ کمال کی قربت حاصل ہوتی ہے اور ہم اُس سے خوب واقف ہو جاتے ہیں تو اس کی لیاقت کی مدح جس تعجّب و حیرت کے ساتھ پہلے کرتے تھے ، پھر نہیں کرتے - یہ واقفیت اس کی قدر و منزلت[4] ہماری نگاہ میں کم کر دیتی ہے - ہم بہت ہی کم کسی نامور کا حال سنتے ہیں کہ جس کے ساتھ اس کے چھوٹے چھوٹے عیبوں اور نقصوں کی فہرست نہ لگی ہو - اس کی وجوہ یہ ہیں : اول ، اس کے[5] چال چلن میں ذرا سی لغزش بھی بہ نسبت کسی اَور شخص کے بڑی نمائش سے

۱- اصل : کی برابر -
۲- اصل : آدمی کے لیے عزت -
۳- اصل : کے مخفی -
۴- اصل : اس کی قدر و منزلت اس کی -
۵- اصل : اس کی چال چلن -

نمایاں ہوتی ہے اور وہ اُس کی خصلت سے جدا معلوم ہوتی ہے۔ دوم، ناممکن ہے کہ کسی انسان کے[1] زندگی بھر کے چھوٹے چھوٹے اور بڑے بڑے کاموں کو ایک ہی وقت میں کوئی شخص دیکھ لے۔ اس لیے بڑے آدمی کی چھوٹی لغزشوں پر جب نظر ہوتی ہے تو اس کے بڑے کام پیشِ نظر نہیں ہوتے۔ سوم، جیسا ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ بلند نظری آدمی سے خود ہی ایسی خفیف حرکات شہرت حاصل کرنے کے لیے کراتی ہے کہ جو اس کی خصائل سے متضاد ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو جلیل القدر بڑی دھوم دھام کی عمدہ لیاقتیں رکھتے ہیں، ضرور ہے کہ ان میں چھوٹے چھوٹے لوث[2] کے سیاہ دھبّے ہوں گے، مگر وہ ان کے بڑے کاموں کی روشنی میں مخفی ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی معاملۂ اعظم میں ناموری حاصل کرنے کی راہ میں چھوٹا قدم اٹھائیں گے تو سارا منصوبہ ان کا خاک میں مل جائے گا اور بڑی مایوسی ہوگی۔ اور ایسا بڑا سیاہ داغ لگے گا کہ اس کے سارے کاموں کی سفید روئی کا منہ کالا کر دے گا اور پہلے کارہائے بزرگ کی روشنی کو مدھم یا تاریک بنا دے گا۔ جب ناموری اور نیک نامی حاصل ہو جائے تو کیسا مشکل اس کا سنبھالنا ہوتا ہے، کیونکہ ہمسر اور برتر چھوٹے چھوٹے عیبوں اور نقصوں پر رائے قائم کر کے اور فیصلہ کر کے ان کو بڑے مبالغے کے ساتھ اعلان اور شائع کرتے ہیں، جو طبیعت کو نہایت ناگوار گزرتا ہے۔ اگر اَوروں کے مزاج میں یہ خُبث بھی نہ ہو کہ وہ مشاہیر کی مذمّت کریں اور خود ان میں بھی کوئی بداطواری ایسی نہ ہو کہ جو اُن کی شہرت کو بٹّا لگا سکے، تو بھی اس نیک نامی کے حاصل کرنے

۱- اصل : انسان کی۔

۲- لوث = ملاوٹ، آلودگی، آمیزش، داغ، دھبّا، عیب۔

کے بعد اس کے قائم رکھنے میں کچھ تھوڑی تکلیفیں نہیں ہیں۔ اس کے قائم رکھنے کے واسطے چاہیے[1] کہ عمدہ کاموں کا ایک سلسلہ برابر جاری رہے کہ تا دمِ مرگ ناموری قائم رہے۔ اس واسطے کہ جب شہرت ایک دفعہ تھم کر ٹھہر جاتی ہے تو وہ ضرور پژمردہ اور ضعیف ہو جاتی ہے۔ آدمی میں جو کسی کی تعریف کا جذبہ تعجّب کے ساتھ اٹھتا ہے، وہ تھوڑی دیر رہتا ہے اور پھر اس میں جان نہیں رہتی، جب تک از سرِ نو بڑے کاموں کے[2] معجزات سے غذا اس کو نہ دی جائے۔ پس نامور جب ہی آدمی ہو سکتا ہے کہ زندگی بھر متواتر کارہائے نمایاں کرتا رہے۔

۵- بعض آدمی یہ خیال کریں گے کہ آدمی کے دل میں جو یہ جذبہ شہرت اور ناموری حاصل کرنے کا اٹھتا ہے، اس میں کوئی بڑی خوشی ہوتی ہوگی کہ اس کے حاصل کرنے میں ایسا جبر اپنے اوپر اٹھاتا ہے۔ مگر اس میں تھوڑی خوشی ہے؛ اور پھر آدمی کو اس سے اور بھی تعجب ہوتا ہے کہ باوجود ایسی قلیل خوشی کے اس کے پیچھے لوگ اس کثرت سے پڑے ہیں اور سعی اور کوشش بے حدّ و نہایت کرتے ہیں۔ بلند نظری دل میں ایک جھگڑا اٹھاتی ہے اور ایک خیالی بھلائی کی طرف دل کو متوجہ کر دیتی ہے اور اس میں بڑی جلدی کراتی ہے۔ نہ اس کے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ اس خیالی بھلائی کو کم کر دے اور نہ اس کو حاصل کرانے میں اطمینان دلا دے۔

دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی طلب میں ہم بے تاب ہوتے ہیں۔ مگر ان کے واسطے صبر کر سکتے ہیں یا بالکل

۱- اصل: قائم رکھنے واسطے چاہیے۔ ۲- اصل: کی معجزات۔

ان کی طلب کو دور کر سکتے ہیں ، یا تھوڑی دیر کے واسطے اس کو ٹھہرا سکتے ہیں - مگر یہ شہرت و ناموری کی طلب ایسی ہے کہ اس میں کامیابی ہمارے اختیار سے پرے ہے - وہ تھوڑی دیر کے لیے دل میں جوش پیدا کر دیتی ہے ، مگر اس کے ساتھ ہی اس خوشی کے لیے جی کو بے چین اور بے قرار کرتی ہے - ابھی اس کی ایک خواہش پوری نہیں ہوتی کہ ایک دوسری خواہش پیدا کرتی ہے ، اور دل کو نئی مہمّات کے واسطے آمادہ کرتی ہے - بہت ہی تھوڑے ایسے بلند نظر عالی ہمّت دنیا میں ہوئے ہوں گے کہ جن کو حسبِ مراد خاطر خواہ شہرت و ناموری حاصل ہوئی ہو - جب وہ مشہور اور نامور بھی ہو جاتے ہیں تو اور زیادہ مشہور ہونے کی ہوس ان کے دل میں ایسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ گمنامی کی حالت میں تھی - قیصرِ روم کی سب سے زیادہ تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ اکثر اپنے گھر پر کہا کرتا تھا کہ وہ اپنی زندگی اور شہرت سے خوش ہے -

۶- آدمی جو شہرت حاصل کرنے کے خیال کو چھوڑ دیتے ہیں ، اس کے یہ سبب ہوتے ہیں : یا تو ان کو بالکل مایوسی اس سے ہو جاتی ہے یا ان کو تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خوشی کم ہے ، یا ان کو زیادہ صحیح آگاہی ہو جاتی ہے ، یا بڑی عمر کے ضعف کے سبب سے - کوئی مشہور نامور آدمی ایسا نہیں ہوا ہے کہ اس نے اس خیال کو اس سبب سے چھوڑا ہو کہ پوری نام وری خاطر خواہ حاصل ہو گئی ہے - صرف شہرت ہی دل کو بے اطمینان نہیں کرتی بلکہ دل کو اس کی خواہش بہت سی تکلیفات دیتی ہے - ان تکلیفوں سے وہ لوگ بری ہیں جو اس شہرت کے بہت در پے نہیں ہوتے - عالی ہمّت ، بلند نظر بہت دفعہ نیچا دیکھتے ہیں اور جہاں ان کو تعریف کی توقع ہوتی ہے وہاں وہ مایوس ہوتے ہیں - بعض

دفعہ ان کے دل کو قلق اس سبب سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے کاموں کی جس اعلیٰ درجے کی تعریف چاہتے تھے ، وہ نہیں ہوئی ۔ کیونکہ بہت تھوڑے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی رائے ان کے کاموں کی طرف ایسی ہو جیسی کہ خود ان کی ۔ تعریف کی کمی کی صورت میں دل کے قلق کی کیفیت یہ ہو تو معلوم نہیں کہ دل پر جب کیا گزرتی ہوگی کہ کاموں کی مذمّت اور بدنامی ہوتی ہوگی ۔ انسان کی جو طبیعت شہرت کی خواہش پیدا کرتی ہے وہی مذمّت سے نفرت دلاتی ہے ۔ جیسے[1] آدمی بے حد تعریف سے خوشی کے مارے پھولا نہیں سماتا ، ایسے ہی[2] وہ مذمّت سے بے دل اور اداس ہوتا ہے ۔ اس وجہ سے سمجھو کہ ایک عالی ہمّت ، بلند نظر کی خوشی جاہ طلبی میں کیسی کم ہے کہ وہ ہر شخص کا محکوم اس طرح بنتا ہے کہ اس کے برے بھلے کہنے پر اس کی رنج و خوشی موقوف ہے ، اور ہر خبیث کی زبان کو اختیار ہے کہ اس کی مذمّت کر کے جتنا رنج چاہے اس کو پہنچائے ۔

۷۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ وہ عیب گیری اور عیب بینی بہ نسبت ہنر بینی و صواب اندیشی کے زیادہ کیا کرتی ہے ، اور انسان میں خود برائیاں بھلائیوں سے زیادہ ہوا کرتی ہیں ۔ پس ان دونوں صورتوں میں مدح کی طلب سے کیسی دل کو کم خوش ہونے کی امید ہو سکتی ہے ۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ آدمی کو اپنی نیک نامی کے جاتے رہنے کا جتنا رنج ہوتا ہے ، اتنی اس کے حاصل ہونے سے خوشی نہیں ہوتی ۔ پس اس خیالی خوبی کی موجودگی کی صورت میں ہم کو ایسی خوشی نہیں ہوتی جیسے اس کی عدم موجودگی میں رنج ہوتا ہے ۔ اس لیے کہ جب کوئی چیز ہم کو حاصل ہوتی ہے تو

۱۔ اصل : جب آدمی ۔ ۲۔ اصل : ایسی وہ ۔

ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خوش کرنے کی قابلیت کتنی ہے ، مگر اس کی محرومی و مایوسی کے رنج کا اندازہ اس اصل کیفیت سے تو نہیں کر سکتے ، مگر اپنے خیال اور تصوّر سے جو اس کو بہت بڑھا دیتا ہے -

پس معلوم ہوا کہ شہرت ، نیک نامی ہم کو خوش کم کرتی ہے اور رنج زیادہ دیتی ہے - اس کی آرزوؤں میں ایسی آگ لگا دیتی ہے[1] جو اس کے ہونے سے ایسی بجھتی نہیں جیسی نہ ہونے سے وہ بھڑکتی ہے - اس سے جو تھوڑی خوشی حاصل ہوتی ہے وہ بھی اَوروں کی مرضی پر موقوف ہے ، اور جو رنج اس کا ہے وہ بے ٹھکانے ہے - ہم کو فقط مذمّت ہی سے قلق نہیں ہوتا بلکہ اُن لوگوں کی خاموشی سے بھی مایوسی ہوتی ہے اور رنج پہنچتا ہے جن سے کہ توقع نہ تھی کہ وہ ہماری تعریف میں زبان پر مُہر لگائیں گے -

۸- سچی عزت و برتری جڑ کی طرح پھیلتی ، پھولتی ، پھلتی ہے - جھوٹی عزت و عظمت پھولوں کی طرح جلدی گر کر خاک میں لوٹتی ہے - سچی عزت نیکی کا سایہ ہے - اگر نیکی معلوم ہو تو وہ اس کے ساتھ معلوم ہوتی ہے - سچے ہی معزّز و معظّم کی لوگ عزت کرتے ہیں ، اس کو معتمد جانتے ہیں - تعجب و حیرت کے ساتھ تعریف کرنے میں وہی ان باتوں کا مستحق ہوتا ہے -

۳۳- تصنیفات کی قسمت

مسلمانوں کی عادت ہے کہ وہ جب کوئی لکھا ہوا کاغذ راہ میں پڑا دیکھتے ہیں تو اس کو اُٹھا کر کسی کونے میں یہ سمجھ

۱- "ہے" اضافہ مرتب -

کر رکھ دیتے ہیں کہ اس پر خدا کا نام یا قرآن شریف کی آیت نہ لکھی ہو۔ پس جو لوگ پڑھنا جانتے ہیں اُن کو بھی یہی کرنا چاہیے کہ جب کوئی ایسا کاغذ لکھا ہوا ملے تو ضرور اسے پڑھا کریں اور عبرت پکڑیں کہ زمانے کا انقلاب ایک دن تمام مصنّفوں کی تصنیفات کا یہی حال بنائے گا کہ ان کے اوراق خاک میں رلتے پھریں گے۔ ان میں پنساری، عطار پُڑیاں باندھیں گے اور آتش باز ان کے پٹاخے بنائیں گے اور لڑکے ان کو آگ لگا کے چھوڑیں گے۔ کاغذیوں کے ہاتھ میں ان کی ردی پڑے گی جو اس کو پھر پانی میں گھول کر کاغذ بنائیں گے۔

۲۔ تصنیفات کی چوری و مصنّف : جو مصنّف بڑے نیک اور عالم ہوتے ہیں وہ کوئی اور پیشہ نہیں سیکھتے جس سے ان کو اَوروں پر ترجیح ہو۔ اگر ان میں سے وہ فائدہ چھین لیا جائے جو تصنیفات سے ان کو حاصل ہوتا ہے تو پھر تنگیِ معاش کے سبب سے ان کا جینا مشکل ہو جائے۔ علم سیکھنے میں، بہ نسبت اَور پیشوں کے، صرفِ زر بھی زیادہ ہوتا ہے اور محنت و مشقّت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ علم کی تلاش میں جو سفر کیا جاتا ہے، اس میں خرچ بہت ہوتا ہے۔ بہت ہی کم یہ علم کے مسافر اپنی علمی تجارت میں ایسے کامیاب ہوتے ہیں کہ وہ بندرگاہ میں صحیح سلامت اتریں اور اپنی ساری چیزوں کو مناسب قیمت پر فروخت کر کے فائدہ حاصل کریں۔ پس اگر کوئی ان کی حفاظت نہ کرے بلکہ ان کو لوٹ لے تو کیسا ستم ہے۔ پس مصنّفوں کی تصینفات کی چوری سے زیادہ کسی اور چوری میں جور و جفا نہیں ہے۔

۳۔ جیسا مصنّف نیک نہاد اور عالی دماغ ہوتا ہے، ایسی ہی اس کی تصنیفات بقاے دوام رکھتی ہیں۔ وہ ایسی بیش بہا ہوتی ہیں

کہ ہرگز ان کی قیمت ادا نہیں کی جا سکتی۔ وہ گوہرِ بے بہا ہوتے ہیں جن کے عوض میں خر مُہرہ[1] دیے جاتے ہیں۔ مصنّفوں کی بڑی جائداد اُن کا دماغ ہوتا ہے جس کی پیداوار ان کی تصنیفات ہوتی ہیں جس سے وہ ایسا ہی فائدہ اُٹھاتے ہیں جیسے کہ زمیندار زمین کی پیداوار سے۔ ان کی اس جائداد کا مقابلہ باہم مثل اَور جائداد کے ہوتا ہے۔ ان کی ایک ایک کتاب سے آمدنی ایسی ہوتی ہے جیسے کہ کسی گاؤں سے یا کسی اَور جائداد سے۔ جو مصنّف ایسے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ اِس زمانے میں لوگ کن باتوں کو پسند کرتے ہیں اور ان سے خوش ہوتے ہیں، تو وہی باتیں اپنی کتابوں میں لکھ کر وہ شائع کرتے ہیں جس سے ان کی آمدنی معقول ہو جاتی ہے۔ تمام صنّاع و اہلِ پیشہ اپنے ایجاد اور اختراع کی مشقّت و ریاضت سے ثمرہ پاتے ہیں، کوئی ان پر حملہ آور نہیں ہوتا۔ لیکن مصنّف جو اپنے تئیں سب سے علیحدہ ہو کر مخلوق کے عجائبات کو سوچتا ہے، جذباتِ انسانی کے منضبط و مغلوب کرنے کی تدابیر بتلاتا ہے، انقلاباتِ عالم کے سبب بیان کرتا ہے، جس تحقیقات میں اس کی عمر بسر ہوتی ہے اس کے نتیجے اَوروں کے سامنے بیان کرتا ہے، اُس کے سارے سرمایے کو لوگ چُراتے ہیں۔ مگر ان چرانے والوں کو کسی قانونی سزا کا خوف نہیں ہوتا۔ نہ ان کا کوئی کچھ کر سکتا ہے، نہ ان کو کچھ کہہ سکتا ہے۔ ادھر کوئی کتاب نظم و نثر، وعظ و پند میں شائع ہوئی، اُدھر انھوں نے اس کو چھوٹی جلد میں چھپوا کر ایسا ارزاں بیچنا شروع کیا جیسے کہ چوری کا

۱۔ خر مُہرہ: خر = گدھا۔ مُہرہ = کوڑی۔ یعنی وہ رنگین کوڑیوں کا ہار جو گدھے کی گردن میں ڈالا جاتا ہے۔ مجازاً کوڑی۔

مال سستا بکتا ہے - ایسے آدمیوں کا نام قزّاق ، راہ زن ، ٹھگ ، چور ، ڈاکو جو کچھ رکھا جائے مناسب ہے -

۳۴- ادب اور تعظیم میں ریا

تعظیم و تکریم اور ادب کے قاعدے رسم و رواج کے موافق ایسے پڑ گئے ہیں کہ ان کے لیے جو الفاظ زبان سے کہے جاتے ہیں ان کے معانی دل میں ذرا بھی نہیں ہوتے - ان کی پابندی کے سبب سے دل میں جتنی محبت اور اُلفت کسی کے ساتھ ہوتی ہے ، اس سے بہت زیادہ الفاظ میں ظاہر کی جاتی ہے - اس سبب سے وہ ہماری زبان کو جھوٹا بناتے ہیں - لیکن اگر کوئی شخص دوسرے آدمی کی جتنی تعظیم دل میں ہو ، اُتنی کرے اور جتنی محبت دل میں ہو ، اُسی کو ظاہر کرے تو وہ نہایت ناشائستہ اور نا معقول گنوار جانا جائے گا - اس لیے ہم کو بہ مجبوری یہ ریا کاری کرنی پڑتی ہے - مگر ریا کاری کو یوں سمجھنا چاہیے کہ انفاظ کا حال سکّوں کا سا ہے کہ جب ان کی قیمت مقرر ہو جاتی ہے اور وہ رائج ہو جاتے ہیں تو کوئی ان میں دھوکا اور فریب نہیں کھاتا - ایسے ہی یہ الفاظ جب ایسے محل پر بولے جاتے ہیں تو سب آدمی ان کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ ان کے معانی سے غرض نہیں ہوتی - مثلاً ایک مسلمان جو دوسرے مسلمان کو سلام علیکم کہتا ہے تو اس کے معانی کا خیال دل میں یہ نہیں ہوتا کہ میں اس کو یہ کہتا ہوں کہ ’تو دین و دنیا دونوں کی برائیوں سے بچا رہے - نہ دوسرا یہ سمجھتا ہے کہ اس نے مجھے یہ دعا دی ہے - غرض یہ رسوم تعظیم کی ہم کو ریا کار بناتی ہیں - مگر یہ ریا ہم کو نیکی کا لباس پہناتا ہے جس کے پہننے میں ہم کو اس سے کچھ کم تکلیف نہیں ہوتی جو اصل نیک بننے میں ہوتی - اب

مشکل ہے کہ اگر ریا کاری کو ہم چھوڑیں تو ناشائستہ اور بیہودہ بنتے ہیں ، اگر ریا کار بنتے ہیں تو اپنی زبان کو جھوٹا بناتے ہیں۔ لیکن عقل کا مقتضا یہ ہے کہ ایسی ریا کاری بےادبی اور بیہودگی سے اچھی ہے۔

۳۵۔ شرمِ افلاس

بہت سے آدمی اپنی مفلسی کے ظاہر ہونے سے شرماتے ہیں اور بہت سی تدبیریں اس کے چھپانے کی کرتے ہیں۔ خاص کر وہ صاحبِ جائداد کہ پہلے دولت مند تھے مگر اب ان کی تمام جائداد قرض میں مکفول[1] اور مستغرق ہے۔ لاکھوں روپے کی جائداد ہزاروں کے بدلے میں برباد ہو رہی ہے۔ یہ لوگ اپنی جائداد کو بدستور رکھتے ہیں۔ اس کا کوئی حصہ اس لیے نہیں بیچتے ہیں کہ لوگوں میں کم دولت نہ معلوم ہوں۔ سارے خرچ اپنے بدستور رکھتے ہیں ؛ وہی مکان کی آرائش و زیبائش ہے ، وہی دسترخوانِ فراخ ہے۔ شادی کی تقریبوں میں جو وہ پہلے خرچ کرتے تھے ، اب بھی خرچ کرتے ہیں۔ اگر پہلوٹھی[2] کے لڑکے کی چھٹی میں چھ سال کی آمدنی خرچ کی تھی تو اب بھی ہر سال بچے کے پیدا ہونے میں چھ سال کی آمد کو خرچ کرتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ ہم اس حرکت سے شریف فقیروں کی تعداد بڑھاتے ہیں۔ اس شرم کے مارے کہ ہم جیسے اصل میں مفلس ہیں ، لوگوں کو نہ معلوم ہوں ، سارے اپنی امیری کے ٹھاٹھ بدستور رکھتے ہیں۔ مگر اس سے ان کا دل خوش نہیں ہوتا۔ ظاہر میں شادی کرتے ہیں مگر دل میں

۱۔ مکفول : زیر کفالت ، کفالت میں دیا گیا ، گیرو رکھا گیا ، مرہون۔
۲۔ اصل : پلوٹھی۔

غم کھاتے ہیں ۔ دوستوں کے ساتھ جلسوں میں شریک ہوتے ہیں ، کھاتے پیتے ہیں ، مگر کسی چیز میں ان کو لطف و مزہ نہیں آتا ۔ افلاس کی شرم ان کے دل میں کانٹے چبھوتی ہے ۔ ان کے تمام کارخانوں پر اداسی چھا جاتی ہے ۔ مفلسی برسنے لگتی ہے ۔ غرض ایک لوگ تو یہ ہیں کہ مفلسی کی شرم ظاہر ہونے کے سبب سے یہ خود نمائی و فضول خرچی کرتے ہیں ۔ دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں کہ افلاس کے خوف کے مارے محنت مشقّت کرتے ہیں ، پیسے پیسے کے لیے جان دیتے ہیں ، ہر کام میں خسّت کرتے ہیں ، اور اَوروں کی مزدوری کرتے ہیں اور اپنے بھی آپ مزدور ہوتے ہیں ۔ غرض یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قسم کے آدمی افلاس کو بہت ہی برا جانتے ہیں ۔ ایک لوگ ظاہر ہونے کی شرم سے وہ حرکتیں کرتے ہیں جو اُن کو اَور افلاس کے قریب لیے جاتی ہیں اور دوسرے لوگ افلاس کے خوف کے سبب سے وہ کام کرتے ہیں جو اُن کو مفلسی سے بہت دور لے جاتے ہیں ۔ مگر افراط تفریط کسی کام میں اچھی نہیں ہوتی ۔ اعتدال سب میں اچھا ہوتا ہے ۔ پس اِسراف اچھا ہے نہ بُخل ۔ آدمی کو چاہیے کہ جو عقل آدمی کے واسطے اعتدال کا درجہ مقرر کرے ، اس کے موافق عمل کرے ۔ ہم اپنے ملک میں ہزاروں جائداد والوں کو دیکھتے ہیں کہ فقط افلاس کے ظاہر ہونے کی شرم سے اپنے تئیں برباد کر دیتے ہیں ۔

۳۶۔ قیافہ و بُشرہ

۱۔ بعض فن ایسے ہیں کہ آدمی کو بِن سیکھے آتے ہیں ۔ ان کی تحصیل میں کچھ محنت نہیں کرنی پڑتی ؛ مثلاً نحو و منطق ہے کہ آدمی اُن قواعد سے ، جو مدوّن ہو کر کتابوں میں لکھے گئے ہیں ،

بالکل ناآشنا ہوتا ہے ، مگر صحیح گفتگو اور ٹھیک استدلال کرتا ہے - پس ایسا ہی حال فنِ قیافہ کا ہے - گو کوئی کتاب اس کی نہ پڑھی ہو مگر فقط لوگوں کے چہروں کو دیکھ کر ان کے دل کی باتوں کو اور ان کی خوش نصیبی و بد نصیبی کو جان لیتے ہیں - ایک شخص کو ہم کچھ جانتے پہچانتے ہی نہیں لیکن اس کے چہرے کو دیکھ کر ہمارے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مغرور ہے ، متین و سنجیدہ ہے ، خوش اخلاق اور نیک نہاد ہے - جب انجان آدمیوں کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو پہلے اس سے کہ ہم ان میں سے کسی کی ایک بات بھی سنیں یا ان کو جانیں کہ وہ کون ہیں ، ہماری طبیعت میں خود بخود بعض کے ساتھ رغبت ، نفرت ، بعض کی حقارت ، عزت پیدا ہوتی ہے -

جب آدمی کے دل میں کسی جذبے کا جوش اٹھتا ہے تو اس کے آثار چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں - آنکھوں ہی کی چتونیں کتنے حال دل کے بتلاتی ہیں - التفات ، قہر ، غضب ، حقارت ، عزت میں سے جو دل میں ہوتا ہے ، اس پر وہ مطلع کرتے ہیں - عاشقوں کے واسطے تو چہرہ ایسا خاموش تماشاگاہ ہے کہ وہ اسے دیکھ کر مایوس ، بے جان ، ناراض ، خوش ہوتے ہیں - جب آدمی کسی کو ترش اور سرکہ جبیں دیکھتا ہے تو اس کی بیوی کے حال پر رحم کرتا ہے - جب کسی کو خندہ پیشانی سے دیکھتا ہے تو جانتا ہے کہ اس سے تمام اس کے دوست ، آشنا ، عزیز و اقربا خوش رہتے ہوں گے - ایک بڑے نامور عاقل کے پاس ایک شخص کھڑا تھا - اس نے اس عاقل سے کہا کہ کچھ بولو تو میں جانوں کہ تم کیا ہو - اس نے جواب دیا کہ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ ہمارا حال ہمارے چہروں کے آثار سے جیسا معلوم ہوتا ہے ، ایسا الفاظ سے نہیں - جیسا کہ آسانی

سے آدمی اپنی زبان کی تلبیس[1] کر سکتا ہے ایسے چہرے کے آثار کی نہیں کر سکتا۔ غرض چہرے کے آثار جیسا دل کا حال بتاتے ہیں ایسے اس کے خط و خال نہیں بتلاتے، کیونکہ چہرے کے آثار تو دل ہی کے حال سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ تو دل کی حالتوں کے آئینے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ کتاب کا عنوان ٹائیٹل پیج[2] ہوتا ہے، ایسے ہی دل کا عنوان چہرہ ہوتا ہے۔

جن لوگوں نے قیافے کو ایک فن بنایا ہے اور آدمی کے چہرے کی بناوٹ کو دیکھ کر اس کی طبیعت اور مزاج کے حال دریافت کرنے کے قواعد منضبط کیے ہیں، وہ چہرے کے خط و خال اور بناوٹ سے طبیعت کا حال ایسا نہیں دریافت کر سکتے جیسے کہ چہرے کے آثار سے وہ لوگ جو اس فن سے ناآشنا ہیں۔ ایک بڑا قیافہ داں لکھتا ہے کہ آدمی کے چہرے کا سانچا ایک مشابہتِ بعیدہ بیل، شیر، سئور، بھیڑ یا کسی اَور مخلوق سے رکھتا ہے۔ پس جیسے اس کے چہرے کو ان جانوروں میں سے کسی چہرے سے مشابہت ہوتی ہے، ویسی اس کے دل کو بھی اس کے دل سے مشابہت ہوتی ہے، اور اس میں وہی صفات پائی جاتی ہیں جو اس جانور میں ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص کا چہرہ شیر کا سا ہو تو اس میں شجاعت اور بہادری بھی شیر کی سی پائی جائے گی۔ اصول یہ قرار پایا ہے کہ ایک قسم کی روحیں ایک قسم کے[3] مسکن میں رہتی ہیں۔ مگر یہ اصول غلط ہے، اس لیے کہ نہ امر آدمی کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنے چہرے کی علامات کے خلاف اپنی عادات بنا لے۔ چہرہ اس جانور کے

۱- تلبیس = لغوی معنی: مکر و فریب کا پوشیدہ رکھنا۔ اصطلاحی معنی: دغا، فریب، جعل، دھوکا۔

۲- اصل: پیچ۔ ٹائٹل پیج = سرورق۔ ۳- اصل: کی مسکن۔

چہرے کے مشابہ ہو کہ جو مکّار ، ظالم ، شریر ہوتا ہے مگر وہ اپنے تئیں صادق ، بے ریا ، عادل ، نیک مزاج بنا سکتا ہے جو بالکل ان قدرتی علامات کے خلاف ہوں - اور اس طرح سے اہلِ قیافہ کی تشخیص کو جھوٹا بنا دے - یہ اکثر ہوتا ہے کہ آدمی نہ اپنی صورت پر غصّے ہوتے ہیں ، نہ اوروں کی صورت پر حسد کرتے ہیں بلکہ اپنی تہذیب و تعلیم سے وہ حسنِ سیرت پیدا کرتے ہیں کہ حسنِ صورت سے زیادہ پائدار اور پسندیدہ ہوتا ہے - گو اُن کا چہرہ لنگور کا سا ہو مگر وہ حسینوں سے زیادہ اپنی نیک مزاجی کے سبب لوگوں کو عزیز ہوتے ہیں - ایسے آدمی دو چند تعریف کے مستحق ہوتے ہیں کہ جو جسم برائی کے واسطے قدرتی بنایا گیا تھا ، وہ نیکی سے آراستہ کیا گیا -

بہت صورتیں ایسی دیکھی ہیں کہ اُن میں سیرت اور صورت دونوں ساتھی نہیں معلوم ہوتیں - سقراط اس کی نہایت عمدہ مثال ہے - اُس کے زمانے میں ایک شخص علمِ قیافہ میں مشہور صاحبِ کمال تھا - وہ چیزوں کو دیکھ کر طبیعت اور مزاج بتلا دیتا تھا کہ کن کن باتوں کی طرف ان کا میلان ہے - سقراط کے شاگردوں کے دل میں آیا کہ استاد کو اس قیافہ شناس کے پاس لے چلیے اور اس کا امتحان کیجیے - وہ سقراط کو اس کے پاس لے گئے - اس نے پہلے کبھی اس حکیم کو دیکھا نہ تھا - اب اس نے اس کے چہرے کو خوب دیکھ کر کہا کہ یہ شخص بڑا نفس پرست ، مست ، شرابی بوڑھا آدمی ہے - یہ سن کر شاگردوں نے قہقہہ لگایا اور سمجھے کہ آج ہم کو یہ تحقیق ہو گیا کہ یہ علم بالکل جھوٹا اور لغو ہے - لیکن سقراط نے کہا کہ جو برائیاں اس قیافہ داں نے مجھ میں بیان کیں ، وہ بالطبع واقعی مجھ میں تھیں لیکن میں نے ان کو اپنے علمِ حکمت

کے زور سے معدوم کر دیا اور میں ان کا محکوم نہیں ہوا - پس اس سے آدمی کو چاہیے کہ وہ علمِ قیافہ کی علامات کا اعتبار نہ کرے کیونکہ آدمی ان سے بالعکس اپنی طبیعت و عادت بنا سکتا ہے - مگر یہ یاد رکھو کہ جذباتِ دلی کے سبب سے چہرے پر جو آثار ظاہر ہوتے ہیں وہ غلط نہیں ہوتے ، کیونکہ وہ تو دل کی کیفیت اور حالات ہی سے پیدا ہوتے ہیں - ان کو آدمی نہ چھپا سکتا ہے ، نہ بدل سکتا ہے -

۲- کم ین لا صاحب ایک بڑا صاحبِ کمال علمِ قیافہ میں تھا - وہ اپنے اس علم کے زور سے آدمیوں کے چہروں کو دیکھ کر ان کے خصائل کو اور دلی میلانوں کو بتلایا کرتا تھا - سوائے اس کے اس میں یہ اَور کمال تھا کہ وہ جس شخص کا حال قیافے سے جاننا چاہتا تو اپنے چہرے اور سارے بدن کو اُسی کے چہرے اور بدن کے موافق ایسا بناتا کہ یہ نقل مطابقِ اصل معلوم ہوتی - پھر اس طرح تحویلِ شکل سے وہ سمجھتا کہ میرا دل بھی مثل اُس کے دل کے ہو گیا - پس جب یوں دونوں جسم اور دل ایک سے ہو جاتے تو وہ اپنے تئیں جانتا کہ میں وہ آدمی بن گیا - جو میرے دل کے خیالات اور حالات ہیں ، وہی اس کے ہوں گے - اس حکمت سے وہ اَوروں کے دلوں کا حال ایسا تحقیق سے[1] دریافت کرتا کہ گویا کہ وہ منقول عنہ بن گیا - اکثر یہ واقع ہوتا ہے کہ جب آدمی کسی غضب ناک ، حلیم ، خوف زدہ ، بہادر آدمی کے چہرے کی نقل اُتارتا ہے تو خود بخود اس کے[2] دل میں یہ جذبات اُٹھنے لگتے ہیں - غرض جس قسم کے آدمیوں کی صورت کی تقلید کرتا ہے ویسے ہی اس کے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں -

---

۱- "سے" اضافہ مرتب - ۲- اصل : اس سے -

اگر کسی غضب ناک آدمی کی شکل بناتا ہے تو دل میں اس کے غصّہ بھر آتا ہے - ایسی صورتوں کی نقل میں ان کے جذبات کا دور کرنا مشکل ہو جاتا ہے - انسان کے جسم و روح میں وہ تعلّقات ہیں کہ ایک دوسرے کے رنج و خوشی میں بغیر شریک ہوئے نہیں رہ سکتے - اوپر جس قیافہ شناس کا ذکر ہوا وہ اپنی توجہِ دلی کو جسمانی تکلیفات سے ہٹا کر دوسری طرف متوجہ کرنے پر ایسا قادر تھا کہ اگر اس کو شکنجے میں کھینچو تو اس کو بہت کم تکلیف معلوم ہوتی تھی - یہ تجربہ تو تھوڑی تکلیفات میں سب کو ہوتا ہے کہ جب آدمی اپنے دل کو اُن سے ہٹا کر دوسری طرف متوجہ کرتا ہے تو وہ تھوڑی دیر کے لیے معلوم نہیں ہوتیں - اب اس کے برخلاف اگر جسم کو کسی وساطت سے ہم ایسا بنا لیں کہ اس میں وہ حرکتیں نہ پیدا ہوں جو اُن جذبات کے اُٹھنے کے وقت پیدا ہوا کرتی ہیں تو وہ جذبہ ہی کبھی نہیں اُٹھنے کا ، خواہ اس کا سبب کیسا ہی اثر کرے - جیسا کہ تم افیون اور شراب کے نشے میں دیکھتے ہو کہ وہ برعکس ہماری تمام کوششوں کے غم یا خوف یا غصّے کے عماوں کو معطّل کر دیتے ہیں - اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ نشہ جسم کو ایسا بنا دیتا ہے کہ جو ان جذبات سے اس میں حرکتیں پیدا ہوا کرتی ہیں ، نہیں پیدا ہوتیں -

۳- انسان کی حسانت میں قیافے کو بڑا دخل ہے - چہرے کی نزاکت ، لطافت ، خوبی یہ سب دل کی نیکیوں کو بتلاتی ہیں ، جن کے سبب سے یہ کیفیتیں چہرے میں پیدا ہوتی ہیں - یہ جسمانی خوبیاں روحانی خوبیوں کی ترجمان ہوتی ہیں -

۴- پہلے جن حکما نے اس فن کو مدوّن کیا تھا تو اس کی بِنا آدمی اور حیوانوں کے اعضا کی مشابہتوں پر رکھی تھی - مثلاً ایک شخص

شتر گردن ہو تو اس آدمی کو شتر کینہ جانیں گے ، یا کوئی گھڑ موہا ہو تو اس میں گھوڑے کی صفات بتائیں گے ۔ کسی کے بدن پر بال ریچھ کے سے ہوں تو اس میں ریچھ کی سی خصائل ۔ لیکن اب جو اس فن کی بنا رکھی گئی ہے ، وہ قوموں کے چہروں کی مشابہت پر رکھی گئی ہے ۔ مثلاً کسی شخص کی صورت شکل کسی قوم کی صورت سے ملتی ہوگی تو اسے کہیں گے کہ اس میں وہ خصائل ہوں گی جو اس کی قوم میں ہیں ۔ غرض بہر نہج یہ فن کبھی سائنس نہیں بن سکتا[1] ، اس لیے کہ تعلیم ، تربیت ، تادیب آدمی کی طبیعت کو بالکل بدل دیتی ہیں ۔

۳۷۔ تصنیفات

۱۔ نیک صفات مصنّف یہ چاہتے ہیں کہ ہم جس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں ، اس کی اصلاح ایسی کریں کہ حال کے زمانے سے آیندہ زمانہ اچھا ہو جائے ۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ علم کتابوں میں قید ہو کر کتب خانے کی الماریوں کے قید خانوں میں پڑا رہے ، بلکہ وہ اس کو یہ چاہتے ہیں کہ وہ زبردستی لوگوں کے دلوں میں اپنا گھر بنائے ، میزوں اور کارنسوں پر پڑا نہ رہے ۔ وہ یا تو اپنی تصنیفات کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اشاعت کرتے ہیں یا ایک کتاب میں سب کو مجتمع کر کے شائع کرتے ہیں ۔ ان کا حال طبیبوں کا سا ہوتا ہے کہ کوئی ان میں سے اپنے مریضوں کے واسطے ایک لمبا چوڑا نسخہ لکھتا ہے جس میں بہت دوائیاں ہوتی ہیں جس کے سبب سے مریض کو ایک

۱۔ قیافے کا تعلق بھی انسانی نفسیات سے ہے اور علمِ نفسیات نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ یہ علم اب ایک باقاعدہ سائنس کی شکل اختیار کر گیا ہے ۔

ملغوبے کا قدح پینا پڑتا ہے۔ کوئی فقط کسی عرق کے دو چار قطرے بتا دیتا ہے یا دوا رتی دو رتی کھلاتا ہے۔ پس جو مصنّف پہلے طبیبوں کی طرح اپنی تصنیفات کی بڑی کتاب بناتے ہیں ان پر یہ یونانی ضرب المثل صادق آتی ہے کہ ''ایک بڑی کتاب عذابِ جان ہوتی ہے۔'' جو مصنّف کہ تصنیفات کے[1] اجزا پھیلاتے ہیں، جیسے کہ اخباروں اور موقّت[2] رسالوں میں، تو ان کا حال دوسرے طبیبوں کا سا ہے۔ اگر ان کی تصنیفات کے یہ اجزا گروہ ہا گروہ آدمیوں کو یہ فائدہ پہنچاتے ہیں کہ ان کی عقل بڑھاتے ہیں، ان کے فہم کو صاف کرتے ہیں، ان کی گرانیِ غم کو مسرّت سے ہلکا کرتے ہیں، تو اُن پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ دانائی باہر کھڑی پکار رہی ہے، بازاروں اور گلیوں میں آواز دے رہی ہے، شہروں میں چلّاتی ہے۔ اُن مکانوں کے دروازے کھٹ کھٹاتی ہے جہاں آدمیوں کا مجمع ہے کہ اے میرے بھولے بھالے! کب تک تم سادہ لوح اور احمق رہو گے، علم سے عداوت رکھو گے، جہالت کو پیار کرو گے، اپنے تئیں جلاتے رہو گے۔

۲۔ ارسطو کا قول ہے کہ خیالاتِ الٰہی کی نقل دنیا ہے اور دنیا کی نقل خیالاتِ انسانی ہیں۔ اب اس پر یہ اضافہ ہونا چاہیے کہ خیالاتِ انسانی کی نقل الفاظ ہیں اور الفاظ کی نقل تحریر اور چھاپہ ہے۔ جیسے جیسے خیالاتِ الٰہی مخلوق میں منطبع ہوتے ہیں، ایسے ہی خیالاتِ انسانی کتابوں میں۔ چھاپے نے، جو زمانۂ حال کا ایجاد ہے، کتابوں کو چاند سورج کی طرح دیرپا کر دیا ہے۔ وہ قیامت ہی کے دن

۱۔ اصل: کی اجزا۔

۲۔ موقّت=پابندِ اوقات۔ وقتِ مقررہ پر شائع ہونے والے رسائل و اخبارات۔

زمین آسمان ستاروں کے ساتھ دفن ہوں گی ۔ انسان کے دل میں جو
خیالات آتے جاتے ہیں ، ان کی بقائے دوام کے لیے کوئی اور تدبیر
سوائے کتابوں کے ہو ہی نہیں سکتی ۔ انھی کے ذریعے سے وہ آیندہ
نسلوں تک پہنچ سکتے ہیں ۔ اس عالم میں جب مصنفّوں کا جسم
اَور مادوں کے ساتھ مل جائے گا اور روح عالمِ ارواح میں چلی جائے گی
تو ان کے علم کا ورثہ بنی آدم کو ان کی تصنیفات ہی کے ذریعے سے
پہنچ سکتا ہے جو نسلاً بعد نسلٍ زمانۂ دراز تک چلا جائے گا ، اور
اَن کو فائدہ پہنچائے گا جو اب تک نہیں پیدا ہوئے ۔ انسان کے لیے
کوئی یادگار کتاب سے زیادہ دیرپا نہیں ہو سکتی ۔ عمارات ، بُت ،
تصاویر وغیرہ ایک عرصے کے بعد فنا ہو جاتی ہیں ۔ کتاب کی جتنی
نقلیں چاہو اُتر سکتی ہیں ۔ ان کو جہاں چاہو ، پہنچا سکتے ہو ۔ یہ
نقل اصل کا کام دیتی ہے ۔ برخلاف اَور یادگاروں کے کہ وہ ایک
جگہ مقیّد ہوتی ہیں ۔ دوسری جگہ ہل کر نہیں جا سکتیں ۔ جیسے
اَور صنّاع اپنی صنعت کی چیزوں سے دولت کماتے ہیں ، مصنّف دولت
کی جگہ بقائے دوام اور شہرتِ عام پاتے ہیں ۔ پس جب تصنیفات
کو یہ مداومت ہو کہ وہ ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں جاری
رہتی ہوں تو مصنّف کو اپنی تمام عقل و دانش اس میں صرف کرنی
چاہیے کہ میں کوئی خیال ایسا نہ لکھوں کہ وہ بنی آدم کے اخلاق
کے حق میں زہرِ ہلاہل ہو اور وبا کی طرح ان میں پھیل کر ہلاک
کرے ۔ بعض عیسائیوں کا یہ مذہب ہے کہ جو مصنّف بُری کتابیں
لکھ جائیں گے ، ان کی روحیں عالمِ برزخ میں جب تک رہیں گی کہ
ان کی تصنیفات کا برا اثر لوگوں کے دلوں پر ہوتا رہے گا ۔ غرض
تصنیفات کا اثر بُرا اور بھلا دونوں ہوا کرتے ہیں ۔ بہت سے ملحد
ایسی کتابیں لکھ گئے ہیں کہ وہ انسانوں میں الحاد کو پھیلاتی ہیں ۔

پس اچھی تصنیفات اچھی یادگار مصنّف کی ہے اور بُری بُری۔

۳۔ مصنّف کا کام یہ ہے کہ یا تو وہ باتیں سکھائے جو اوروں کو معلوم نہیں یا جو پہلے سے معلوم ہیں، ان کو نئے پیرایے میں آراستہ پیراستہ کر کے اس طرح بتلائے کہ اس سے لوگوں کا دل زیادہ خوش ہو، اور روزمرہ کی معمولی چیزوں کو ایسی نئی روشنی میں رکھ کر دکھائے کہ وہ ایسی بدل جائیں کہ لوگوں کو بڑی دلکش اور حیرت انگیز معلوم ہوں، اور ان سے عقل کی افزائش ہونے لگے، اور آدمی اُن چیزوں کو دیکھنے لگیں جن کی طرف وہ نظر اٹھا کے نہیں دیکھتے تھے۔ مصنّف کے واسطے یہ دونوں کام مشکل ہیں کہ کوئی نیا امر اختراع و ایجاد کرے یا پرانی بات کے پیرایے کو بالکل خوبصورت و حسین بنا کے دکھاوے۔ آدمیوں کو چاہیے کہ وہ مصنّفوں کی غلطیوں ہی کو نہ دیکھا کریں بلکہ جو باتیں صحیح لکھی ہیں، ان سے مستفید ہوا کریں اور یہ سمجھا کریں کہ جن مصنّفوں نے تصنیفات لکھی ہیں، وہ ہم سے زیادہ جاننے والے تھے۔ انھوں نے اپنا سارا وقت تصنیفات میں صرف کیا ہے اور مشقّتِ شاقہ اٹھائی ہے، ان کی قدر کرنی چاہیے۔ مگر ایک فرقہ ایسا ہے کہ وہ اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں یا دل لگی جانتے ہیں کہ کسی علمی کتاب کی اشاعت نہیں ہونی چاہیے اور اُس کے روکنے کی سو سو ترکیبیں نکالتے ہیں۔ گویا وہ شہرت کے دروازے پر سنتری بنے پہرہ دے رہے ہیں کہ اس کو باہر نہیں نکلنے دیتے۔ ان کا دل کینوں سے اور دماغ غلطیوں اور جہالتوں سے بھرا ہوا ہے۔ جہاں کوئی جدید تصنیف شائع ہوئی، اُن کے بُغض و حسد کو ایک نیا شکار ہاتھ لگا۔ بعض مصنّف ''دھنِ سگ بہ لقمہ دوختن بہ'' پر عمل کر کے بدنہاد عیب بینوں سے اپنا پیچھا چُھٹا لیتے ہیں۔ ان کو تحفہ

تحائف وہ دے دیتے ہیں یا ان کو کوئی خوشامد کا افسانہ ایسا سنا دیتے ہیں کہ وہ ان کی طرف سے سو جاتے ہیں۔ مگر جو کامل نیک نہاد مصنّف ہیں وہ یہ دونوں کام نہیں کرتے ، اس لیے ان عیب بینوں اور بدگویوں کی زبان درازیوں سے ان کو نجات نہیں ہوتی۔

۳۸- بیماری کی شکایت

زندگی وہی زندگی ہے جس کو صحت کی نعمت میسّر ہو۔ اگر کوئی عمر رسیدہ ، جو اپنی عمر کا جو گزر چکی ہے ، اس طرح خیال کرے کہ عمر وہی ہے جس میں زندگی خوشی سے بسر ہوتی ہے ، تو اس کی خوش حالی میں اتنی کم عمر گزری ہوگی کہ اس حساب سے وہ اپنے تئیں بچہ سمجھے گا ، گو وہ بوڑھا ہی ہو۔ اس کا بڑا حصہ عمر کا بیماری ، بدمزگی ، کاہلی نے چرایا ہے۔ اس لیے ہر ایک آدمی پر فرض ہے کہ مزاج ایسا بنائے کہ وہ خوش و خرّم رہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم آدمیوں کو دیکھتے ہیں کہ جتنا زندگی بسر کرنے کا علم ان کا زیادہ ہوتا جاتا ہے ، وہ اَور زیادہ غم زدہ اور افسردہ ہوتے جاتے ہیں۔ سچّی خوشیوں پر ان کی نظر نہیں ہوتی۔ اَوروں کی جھوٹی خوشیوں پر خیال کرتے ہیں۔ پس یہ آدمی حقیقت میں دائم المریض ہیں۔ ان کو صحبتِ احباب سے ایسا بچنا چاہیے جیسے کہ مریض کو ہوا سے۔ بعض آدمیوں کی عادت ہے کہ جب وہ صحبتِ احباب میں بیٹھیں گے تو اپنی علالتِ مزاج کی شکایت کا دفتر کھول بیٹھیں گے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ دوست طبیب نہیں ہیں کہ علاج کر دیں گے۔ دوستوں کو چاہیے کہ وہ مجلسِ احباب کی مسرّت کو اَور زیادہ کریں ، نہ یہ کہ اپنی علالت کے ذکر سے ان کو سچ مچ ملول کریں ، یا ان سے چہرے ملالت آمیز بنوائیں۔

ایسے آدمی نہ خود خوش رہیں اور نہ اَوروں کو خوش کریں - سوائے شکایت اور رنج و مصیبت کے کوئی اور بات ہی وہ نہیں کرتے تو ان کے دوست یہاں تک تنگ ہو جاتے ہیں کہ وہ جب اپنے دردِ سر کا بیان کرتے ہیں تو دوست پوچھتے ہیں کہ آج کی ڈاک میں کیا کیا خبریں آئیں - جہاں وہ مجلس میں آئے ، انھوں نے اپنے امراض کا ذکر چھیڑا - صاحبِ خانہ نے نوکر کو آواز دی کہ لالٹین لا کر ہمارے اس دوست کو گھر پہنچاؤ ، اور ان کو صلاح دی کہ بہتر ہوگا کہ آپ اس وقت آرام فرمائیں - یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ دوستوں کی[1] مجلسِ عیش کو ایسی غمگین باتوں سے منغّص[2] نہیں کرنا چاہیے - جو دائم المریض ہوں ، ان کو اول ایسے جلسوں میں جانا نہیں چاہیے اور اگر جائیں تو جب تک مجلس نہ ختم ہو ، کوئی بات اپنی علالت و غم کی زبان سے نہیں نکالنی چاہیے - ان کو یہ باتیں جاننی چاہییں کہ اول تو بیماری ایسی چیز نہیں جس کے سبب سے آدمی روئے - کوئی شخص ہمیشہ تندرست نہیں رہ سکتا - انحطاط کی حالت میں علالت ضرور ہے - بعض خدا پرست اس علالت کو خدا کی نعمت و برکت سمجھتے ہیں اور فانی ہونے کو بھول جاتے ہیں - وہ دنیا میں پیدا ہونے کو اپنی بقا جانتے ہیں - موت کو معمولی سونے سے بھی کم سمجھتے ہیں اور اپنی حیات میں اس کو مخل نہیں جانتے - غرض وہ اپنی زندگی مسرّت و انبساط سے بسر کرتے ہیں - نہ علالت سے غمگین ہوں ، نہ موت سے خوف گزیں - یہ امر یقینی ہے کہ حیات و صحت کو ایک مدامی[3] ضیافت خیال کرنے میں مسرّت و انبساط ہے ، مگر آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے دل کی کیفیت کو ایک حال

۱- اصل : کو -
۲- منغّص = بدمزہ -
۳- مدامی = ہمیشہ کی -

پر رکھے - نہ یاوریِ بخت پر ایسا خوش ہو کہ پھولا نہ سمائے ، نہ بدنصیبی سے ایسا ملال کرے کہ دم گھٹ جائے - غرض ایک حالت میں ہنسنا اور دوسری حالت میں رونا دونوں جواں مردی اور مردانگی سے بعید ہیں اور طبیعت کی دنائت[1] اس سے ظاہر ہوتی ہے - ایک حکیم نے لکھا ہے کہ ہماری حیات کیا ہے ؟ ایک دَور ہے چھوٹے چھوٹے ذلیل کاموں کا - سوتے ہیں ، جاگتے ہیں ، کپڑے پہنتے ہیں ، ننگے ہوتے ہیں ، کھاتے ہیں ، بھوکے ہوتے ہیں ، کچھ کام کرتے ہیں یا کھیلتے ہیں ، تھک جاتے ہیں ، پڑ کر سو جاتے ہیں - پھر وہی دَور پہلے روز کا سا شروع ہوتا ہے - اس طرح ہم میں اور وحشی حیوانوں میں کچھ فرق نہیں ہے کہ وہ کسی اصطبل یا کھیت میں سو رہے ، ہم بستر پر سو رہے - انسان کو جو شرف حیوان پر ہے ، وہ فقط عقبیٰ کے خیال کے سبب سے ہے - دنیا میں انسان کے خیال کرنے کی چیز کوئی عقبیٰ سے زیادہ نہیں - اگر عقبیٰ کی نعمت پانے سے انسان مایوس ہوا تو اس کا حال یہاں اور اہلِ دنیا کا سا رہا - اس کو کوئی زیادہ تکلیف نہیں ہوئی - اگر کامیاب ہوا تو سعادتِ ابدی ہاتھ لگی -

۳۹- عیش و طرب

۱- جہاں عیش و طرب کا غلبہ ہوتا ہے وہاں اعلیٰ درجے کی نیکیاں مغلوب ہوتی[2] ہیں - ناز و نعم کی رغبت ہمیشہ دل کو عیش و طرب کی حرص دلاتی ہے اور اسی کو مقصدِ عظیم زندگی کا ٹھہراتی ہے - یہ عقل و فراست کی جڑ کاٹتی ہے اور ان کی جگہ خیالاتِ پریشان

۱- دنائت = کمینگی -

۲- ''ہوتی'' اضافہ مرتب -

اور خواہش ہائے پراگندہ پیدا کرتی ہے - زنانی صحبتوں میں عیش و طرب کو زیادہ دخل ہے - بعض دفعہ جھوٹی بدکار عورتیں ہاتھ تلے سے نکل جاتی ہیں ، یا ہاتھ نہیں آتیں ، پھر اُس وقت اِن عیش اُڑانے والوں سے پوچھو کہ کیا زندگی تلخ ہوتی ہے - شاید کوئی کم بخت سخت مجرم بھی ایسا نہ ہوگا جس کی ایسی قلق کے ساتھ گزرتی ہوگی جیسی اِن کی - اگر وہ پھر ان کو مل جاتی ہیں تو چند روز میں ان سے دل بھر جاتا ہے اور پھر رغبت نہیں رہتی - تواترِ عیش و طرب ان کے عیش کے مزے کی قابلیت کو ضعیف کر دیتا ہے اور آخر کو ان میں عیش کی لذّت اُٹھانے کی قابلیت نہیں رہتی - اور عادت ان کو ناز و نعمت کی ایسی پڑ جاتی ہے کہ وہ کوئی محنت کا کام نہیں کر سکتے - کسی نیک کام کرنے کی فرصت ان کو عیش نہیں دیتا - تلوّن مزاجی ، تاخیر کے ساتھ کام کرنا ان کی عادت میں داخل ہو جاتا ہے - دن کو جو عیش کرتے ہیں ، اُس کا خیال رات کو خوش نہیں کرتا - رات کی گراں خوابی سے جو اُٹھتے ہیں تو طبیعت میں نہ چستی ہوتی ہے ، نہ عقل و فہم میں درستی - غرض یہ عیش جس لطف و حظ کے واسطے کیا جاتا ہے وہ احتظاظ اور التذاذ کی قابلیت کو کھو دیتا ہے - اِسراف دولت مندوں کو مفلس بنا دیتا ہے ، تاجروں کا دیوالہ نکلواتا ہے - اولاد کے لیے ورثے میں امراض و تمسّک ، رہن نامے چھوڑتا ہے - شاید تم یہ پوچھو گے کہ جب عیش کا یہ حال ہو تو پھر کیوں عاقل اور ہوشیار اس کے جال میں پھنستے ہیں ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عیش کے سامان ایسے خوب صورت ، دل کش ہوتے ہیں کہ لوگ اس کی طرف خواہ نخواہ چلے جاتے ہیں - جب ان کا امتحان کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ کیا ہم نے کیا - ہم کیا سمجھتے تھے اور کیا نکلا -

۴۰- سپاہیانہ جرأت

کسی قسم کے آدمیوں کی گفتگو اور تقریر میں وہ لطف و مزہ نہیں ہوتا جو سپاہیوں کی باتوں میں ، جن میں وہ شجاعت و دلیری کے[1] واقعات و حادثات اپنے[2] چشم دیدہ ایک دل کش انداز سے ادا کرتے ہیں - گو کہیں کہیں ان کا بیان غیر مربوط ہو جاتا ہے مگر یہ غیر مربوط ہونا بھی ان کے حسنِ کلام کا ایک جوہر ہے جو مربوط کلام میں بھی نہیں ہوتا - جو لوگ کبھی کیمپ (کمپو میدانِ جنگ) میں نہیں گئے ان کو بڑا تعجب اس پر ہوتا ہے کہ میدانِ جنگ میں موت کا خوف کیوں کم ہو جاتا ہے - تمام سپاہی ، دشمنوں کی پلٹنوں کی صفوں کے روبرو بڑی پھرتی اور تیزی سے جاتے ہیں ، بغیر اس کے کہ ان پر کوئی جبر جانے کے لیے کیا جائے - یہ لوگ اگر کیمپ میں جا کر تھوڑے دنوں رہیں تو ان کا تعجب جاتا رہے گا - وہ سمجھ جائیں گے کہ یہ کیمپ خود ہی ایسی ویسی نسل کے آدمیوں میں ایک مصنوعی دلیری ایسی[3] پیدا کر دیتا ہے کہ ان کی جماعت بہادری کے کام کرنے لگتی ہے - یہ سپاہی بہت سے آدمیوں کو دیکھتے ہیں کہ مر کر گر گئے لیکن اس کے ساتھ ہی مُردوں سے زیادہ زندوں کو دیکھتے ہیں - اس سے اُن کی آس بندھی رہتی ہے کہ ہم ان زندوں ہی میں رہیں گے - سپاہیانہ زیست نہایت خوشی و خرّمی و شادمانی اور دل لگی کے ساتھ بسر ہوتی ہے کہ اس کے سبب سے یہ مصائبِ جنگ ، جو تھوڑی دیر رہتے ہیں ، کچھ نہیں معلوم ہوتے - ان کو جنگ کے خوفوں کی ذرا پروا نہیں ہوتی -

---

۱- اصل : کی واقعات - ۲- اصل : اپنی چشم دیدہ -
۳- اصل : ایسا پیدا کر دیتا ہے -

جہاں پانچ چار دفعہ میدانِ جنگ سے زندہ سلامت آئے ، پھر ان کے دل سے یہ خیال ہی جاتا رہتا ہے کہ میدانِ جنگ میں ہماری جان جائے گی - یہ خیالات سپاہِ کارکن کے ہوتے ہیں - عام سپاہیوں میں ایک مصنوعی دلیری پیدا ہو جاتی ہے مگر مہم میں کوئی کارِ عظیم ان سے انصرام نہیں ہوتا - کارہائے بزرگ کے کرنے والے وہی افسر ہوتے ہیں جن کی ذات میں ذاتی جوہرِ شجاعت ہوتا ہے - وہ میدانِ جنگ میں جب کھڑے ہوتے ہیں تو وہ منصوبے ایسے باندھتے ہیں کہ جن سے اپنے ملک کا ، اپنی قوم کا علمِ فتح بلند ہو - گو ان کے منصوبے محقّق نہیں ہوتے ہیں ، مگر ان کا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ منصوبہ بندی ایسی کریں - وہ اپنے مرنے جینے کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دیتے ہیں - خوف کا خیال ان کو ذرا نہیں ہوتا ہے - وہ جانتے ہیں کہ جب موت قریب آ جائے تو اس سے خوف کرنا عبث ہے - وہ فوجوں کا مقابلہ بہادرانہ کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس سے بھاگ کر ہم بچ نہیں سکتے - میدانِ جنگ میں وہی بہادری دکھا سکتے ہیں کہ جن کو اپنی جان کی ذرا پروا نہ ہو - اگر ان کو ذرا بھی خوف ہوگا تو عزت اور عظمت معرکۂ کارزار میں نہیں حاصل کر سکتے - اس خوف کا نہ ہونا اور اپنی جان سے بے پروا ہونا اپنے سپاہیوں کی جان بچاتا ہے ، اپنے ملک کو نیک نام کراتا ہے - اُس کی محبتِ قومی اور ملکی کو ثابت کرتا ہے - سپاہیانہ زیست میں وہی خرّمی و شادمانی ہے جو کسی اَور طریقۂ زیست میں ہو سکتی ہے - اِسی پر تمام ملک کی شان و شوکت موقوف ہوتی ہے - جو افسر نیک نہاد ، بہادر ، جواں مرد ہوتے ہیں وہ سپاہیوں کو بھائی جانتے ہیں ، اس لیے کہ وہ انھی کی نوع کے ہوتے ہیں - اور جو افسر ماتحت ہوتے ہیں ان کو اپنا دوست اور اپنا ساتھی سمجھتے ہیں ، کیونکہ وہ سب

شرافت و نجابت میں شریک ہوتے ہیں - سپاہی کا کام اپنے تئیں خوش رکھنا ہے ، اس لیے وہ دشمنوں کی خوں ریزی اور ان کے ملک کی ہر طرح کی بربادی پر ذرا رحم نہیں کرتا - اُن کے لوٹنے مارنے کو اپنا ایمان جانتا ہے اور اسی سے شاد ہوتا ہے -

۴۱- پیری میں جوان بننا

قدرت نے جیسی ہر چیز کی حد مقرر کی ہے ، ایسی ہی زندگی کی بھی حد مقرر کی ہے - بڑھاپے پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے - پس جب ہماری آرزوئیں خاطر خواہ پوری ہوئی ہوں تو بڑھاپے کی تکان سے بچنا چاہیے -

کوئی شریف یا تعلیم یافتہ بوڑھا ، جوان بننا چاہے تو اُس کی برابر کوئی حماقت دنیا میں نہیں ہے - بوڑھوں کو جوان بننے کی خواہش اکثر اُس وقت ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنی جوانی کی محبوب چیزوں کو دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہم ان کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں برت سکتے جو پہلے برتتے تھے ؛ تو اس سے وہ دل میں ذلیل ہوتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ وہ پہلے ہی برتاوے شرم آلودہ تھے - یہ چاہنا کہ ہماری جوانی اور طاقتِ جسمانی عود کرے اور ہمارے رگ پٹھے ایسے مضبوط ہو جائیں جیسے کہ جوانی میں تھے ، بالکل حُمق اور بچپنے کی نشانی ہے - پیری میں رگ پٹھوں کے قوی ہونے کی خواہش ایسی ہے جیسے جوانی میں سانڈ اور گھوڑے کی برابر طاقت چاہنی - یہ دونوں آرزوئیں نیچر کے خلاف ہیں جو انسان کو اُن چیزوں کی طرف ہمیشہ رہنمائی کرتی ہیں جو عدالت ، قانون ، عقل کے خلاف ہیں - جو جوان کھلے بازار اپنی شہوت پرستی کا اعلان کرتے ہیں ، اُن کو موت نہ آئی تو ضرور ان کا بڑھاپا ذلّت

و خواری سے بسر ہوگا - جب بوڑھا آدمی اپنی جوانی کے عیشوں کو یاد کر کے ہاتھ ملتا ہے تو اس کے دل کو میلان اِس طرف ہوتا ہے کہ جو چیزیں میرے پاس سے چلی گئی ہیں ، وہ پھر آ جائیں - مگر اُن کا پھر آنا انتظامِ الٰہی کے خلاف ہے . وہ جتنا بن ٹھن کر اپنے تئیں جوان بناتے ہیں اُتنا ہی وہ لوگوں کو اپنے اوپر ہنسواتے ہیں - جو لوگ جوانی کی ہوائے نفسانی کو نہیں دور کرتے وہ بڑھاپے میں اپنے اعضا سے شہوت پرستی نہیں کر سکتے مگر ان کے خیالات اسی میں بسے رہتے ہیں - اب ذرا ہم کو یہ سوچنا چاہیے کہ پیری میں ہم سے کیا چھن جاتا ہے - سالوں کے گزر جانے سے ضرور ہماری جوانی کی اُمنگیں جاتی رہتی ہیں - جوانی میں جو ہمارے جذبات کے جوش و خروش ہوتے تھے وہ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور ان سے جو کام پہلے ہوتے تھے اب نہیں ہوتے - لیکن ان کی بجائے بڑھاپے میں عقل میں اتنا زور آ جاتا ہے کہ وہ جذبات کو بے جا کام نہیں کرنے دیتی - آگاہی زیادہ ہو جاتی ہے ، عقبیٰ کا خیال زیادہ ہوتا ہے ، نیک نامی کا خیال ہوتا ہے ، متّقی پرہیزگاروں کے ساتھ صحبت میں زیادہ دل لگنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے - اگر جوانی نیک بختی اور سعادت مندی کے ساتھ گزری ہے تو اس کی یاد دل کو خوش کرتی ہے اور اگر شرارت کے ساتھ بسر ہوئی ہے تو اب اس کی یاد دل کو تسلی دیتی ہے کہ وہ بدکاری اب ہم نہیں کرتے - جب بڑھاپا آ جائے تو آدمی یہ جانے کہ سفر کی شام آ گئی اور آفتاب ہمارے سر پر سے ڈھل گیا - جوانی میں زندگی ایک بخار تھا جس کے اندر عیش بمنزلۂ خواب کے تھا - پس اس موسمِ زندگی کے عود کرنے کی آرزو ایسی عبث ہے جیسے کہ تندرستی میں اس کا افسوس کہ میں اپنی نیند میں خواب کے اندر جو سونے چاندی کے ملمع کے محل ،

معشوقوں کے جلوے ، سبزہ و گلزار کی بہار دیکھ رہا تھا وہ سب مجھ سے چھن گئے -

پیری و جوانی کی حالتوں میں نفعے نقصان یکساں ہیں ، اس لیے ان کے بدلنے کی آرزو کرنے سے کچھ فائدہ نہیں - جوانی اور پیری کا تعلق موت سے یکساں ہے - نہ بوڑھا کہہ سکتا ہے ، نہ جوان کہ میں آج رات کو ضرور زندہ رہوں گا - جوان جلد بیمار ہوتے ہیں ، ان کے امراض میں تشدّد ہوتا ہے ، تندرست ہونا بھی مشتبہ - جوان جتنے زیادہ دنوں تک جینے کی امید کر سکتا ہے ، اتنے دنوں کی بوڑھا نہیں کر سکتا - مگر یہ جوان کی امید عقل کے خلاف ہے ، اس لیے کہ جو امر تحقیق نہ ہو ، اس کی امید کرنی لغو ہے - بوڑھے کو ایسی امید کرنے کی ضرورت نہیں ، اس لیے کہ وہ تو زیادہ دنوں تک جی چکا ہے - اس اعتبار سے وہ جوان سے بہتر ہے - ایک زیادہ جینے کی امید کرتا ہے ، دوسرا زیادہ دنوں تک جی چکا ہے - جس شے کی ایک کو امید ہے وہ دوسرے کو حاصل ہو چکی ہے -

افسوس ہے کہ انسان کے پاس کوئی چیز ایسی نہیں جس کے دیرپا ہونے کی امید کی جائے - جو چیز ختم ہونے والی ہو اس کے جاری رہنے کی قدر کچھ نہیں ہو سکتی - سال و ماہ و ساعت گزرے جاتے ہیں مگر آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کس سال ، کس مہینے ، کس ساعت میں مروں گا - تماشاگر کی یہ خوبی ہے کہ وہ ہر تماشا گاہ میں اچھا تماشا کرے - ایسے ہی عاقل اپنی ہر منزلِ عمر میں نیک طریقوں پر چلے - اگر اس کی تھوڑی عمر نیک بختی اور سعادت مندی کے ساتھ بسر ہو تو اس کو وہ کافی جانے اور زیادہ جینے کی پروا نہ کرے -

۴۲- تشفّی و تسلّی

جو تیرے رنج و قلق کو دور کر کے راحت پہنچائے تو اس کا احسان مان کر شکرگزار ہو - خوشی کی تحقیقات کرنی اور اس کے حاصل کرنے کے قواعد جاننے انسان کے لیے ایسے فائدہ مند نہیں ہیں جیسے کہ قلق و رنج میں اپنے تئیں سنبھالنے اور دوسروں کے غم و الم دور کرنے کے قواعد جاننے اور تحقیق کرنے سود مند اور ضروری ہیں - اس امر پر انسان کو غور و خوض کرنا ضرور ہے کہ میں اس وقت اور آیندہ کس طرح آرام سے رہ سکتا ہوں - دنیا میں ساری خوشیاں جو آدمیوں میں پھیلی ہوئی ہیں ، سمیٹ کر ایک آدمی کو دے دی جائیں تو وہ بہت خوش نہیں ہوگا - لیکن برخلاف اس کے اگر دنیا کے سارے مصائب جمع کر کے ایک آدمی کو دے دیے جائیں تو وہ بہت مصیبت زدہ بن جائے گا -

انسان کو عشق میں سب سے زیادہ رنج و قلق ہوتا ہے اور اس کا علاج بھی کچھ نہیں ہے - اس لیے کہ عشق انسان کے دل کو اپنے تابع کر کے ایسا کمزور کر دیتا ہے کہ اس میں غم و الم کے مقابلے کی قابلیت ہی جاتی رہتی ہے - اَور قسم کے رنجوں میں دل میں ایسی قوّت ہوتی ہے کہ وہ استقلال اور صبر سے ان کے صدموں کو اُٹھا سکتا ہے ، مگر عشق میں تو سرے سے دل ہی میں طاقت نہیں رہتی ، مقابلہ کس طرح کرے - اس کی جڑ ہی اُکھڑ جاتی ہے - وہ اُن حادثات کے بوجھ کے نیچے دب جاتا ہے جو اس کے دل کو پسند نہیں ہوتے - ایسے رنج و مصیبت کی حالت میں کوئی تو اخلاق کی کتابوں کو پڑھ کر اپنا علاج کرنا چاہتا ہے - ایسی کتابیں اس کے دل کے گرد ایک حصنِ حصین بنا دیتی ہیں کہ وہ رنج و الم

کے حملوں کی برداشت کرتا ہے ۔ کوئی ظرافت و لطافت و فصاحت کی کتابوں کے مطالعے سے غم غلط کرتا ہے ۔ کوئی ایسی کتابیں ہاتھ میں لیتا ہے کہ جن میں مصائبِ عظیمہ کا حال اور ان میں انسان کی طبیعت کی کیفیت بیان ہوتی ہے ۔ اُن سے اپنی مصیبت کو مقابلہ کر کے دل کو تسلی دیتا ہے ۔ غرض ان کتابوں کا پسند کرنا طبائع پر موقوف ہے ۔ بعض آدمی ، جب اُن کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ رنج و بلا کا بوجھ ان کو پِیسے ہی ڈالتا ہے اور آنکھ سے آنسو نکلے ہی آتے ہیں ، کسی طرح تھمتے ہی نہیں ، تو وہ ایسے نیک اور لائق آدمیوں میں جا بیٹھتے ہیں جو خود بڑے مصیبت زدہ ہوتے ہیں ۔ اگر ان کے رنج خفیف ہوتے ہیں تو وہ ان کے بھاری رنجوں سے مقابلہ کر کے تسلی پاتے ہیں ۔ مال کا تھوڑا نقصان ، بیماری کی غشی ، دوست کی موت ، یہ رنج اُن مصائب کے مقابلے میں خفیف ہیں کہ کوئی شہر جل کر خاکِ سیاہ ہو ، خاندان تہِ تیغ ہوں ، ہزاروں قید خانے میں پڑیں ، اور اس قسم کے اَور غم ناک حادثات جو انسان پر واقع ہوتے ہیں ۔ پس یہ خیال کر کے کہ ہم ان میں گرفتار نہیں ہیں ، اپنے خفیف رنجوں پر منہ بگاڑ کے اپنی خفّتِ عقل کو نہیں ظاہر کرنا چاہیے ۔ مثلاً کسی کو اپنے عاشق کے مرنے کا رنج ہو تو اس کو یہ سوچنا چاہیے کہ اِس وقت دنیا کے مختلف حصّوں میں کہیں جہاز کے تباہ ہونے سے آدمی ڈوب رہے ہوں گے ، کہیں بستر پر آدمی نزع کی حالت میں لوٹ رہے ہوں گے ، کوئی اپنے جرموں کی سزا میں شکنجے میں کھنچ رہا ہوگا ، اور اِسی طرح کے رنجوں کے تصوّر سے دل میں یہ خیال آئے گا کہ میرا رنج ان رنجوں کے مقابل میں خفیف ہے ۔ دل کو خدا کی طرف لگائے ، عبادت میں مصروف ہو تو بھی رنج میں خفّت ہو جائے گی ۔

۴۳- تلوّن مزاجی

اصل گناہ بھی انسان کو خلق کی نگاہ میں ایسا ذلیل و خوار نہیں کرتے جیسا کہ متلوّن[1] ہونا مذہب میں یا اپنے فریق میں - جب آدمی مذہب یا اپنے فریق کو یہ سمجھ کر بدلتا ہے کہ میں اپنے فرض کو ادا کرتا ہوں تو وہ جن کو چھوڑتا ہے وہ اس سے نفرت کرتے ہیں - جن میں جاتا ہے وہ اس کی دل سے عزت نہیں کرتے - اِن دونوں باتوں میں انسان کا اعتقاد اور یقین بڑا پکا چاہیے - اس میں جہاں تک ممکن ہو، فائدۂ دنیوی اور طمع و لالچ کو دخل نہ دے - دنیا کے اندر لوگوں کے دلوں میں ایسی خباثت بھری ہوئی ہے کہ وہ جب آدمی کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی طرفیں بدلتا ہے، ڈِھل مِل ہے، کبھی کسی طرف جھکتا ہے کبھی کسی طرف، تو اس کو یہ سمجھتے ہیں کہ یا تو اس کی طبیعت خسیف[2] ہے جو یہ خفیف حرکتیں کرتا ہے یا دنیاوی اغراض دامن گیر ہیں -

جو آدمی ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتے ہیں یا تارک المذہب ہوتے ہیں اُن کو اس بات کا بڑا لحاظ چاہیے کہ وہ دنیا پر ثابت کریں کہ اِن کاموں کو نیک نیتی سے کیا ہے - خواہ اُن کا دل اور ان کے ہم مذہب اس حرکت کو کیسا ہی اچھا جانیں مگر وہ یہ خوب جان لیں کہ سب نیک آدمی ان سے نفرت کرتے ہیں اور عوام ان کو بدنام کرتے ہیں اور ان پر ہنستے ہیں - ہم اپنی زندگی بسر کرنے کے واسطے جو تدابیر انتخاب کرتے ہیں اُن کی پیروی استقلال کے ساتھ نہیں کرتے - اس میں تلوّن اختیار کرتے ہیں - یہی ہماری نا خوشی اور رنجوں کا بڑا سبب ہوتا ہے -

---

۱- متلوّن = رنگا رنگ - ۲- خسیف = گھٹیا، کمینہ -

بلند نظری ہم کو ایک طرف کشش کرتی ہے ، خود غرضی دوسری طرف گھسیٹتی ہے ، میلانِ خاطر اَور طرف لے جاتا ہے ، عقل ان سب طرفوں کے خلاف اَور سمت میں بلاتی ہے ۔ جو اِن سب طرفوں میں چلنا چاہتا ہے ، اپنا وقت بری طرح ضائع کرتا ہے ۔ جب آدمی کے لیے ایسی بوقلموں ترغیبیں پیش ہوں تو بہتر ہے کہ پہلے اِس سے کہ بڑھاپا آئے یا موت کا پیغام آئے اور اَور آدمیوں کی طرح مر جائے ، وہ قطعی فیصلہ کر کے ان میں سے ایک کو پسند کرے ۔ اِسی کو مقصدِ اعظم اپنا بنائے اور تا دمِ مرگ اس کی پیروی میں سعی کرے ۔ اگر ہم احکامِ عقل کا محکوم ہونا ، بغیر خیالِ دولت اور نیک نامی وغیرہ کے ، پسند کریں تو اپنی زندگی خوشی سے بسر کریں گے ۔ اگر ہم ڈانواں ڈول رہیں گے تو فقط نیک ہی ہونا نہیں چاہیں گے بلکہ دولت مند ہونا بھی ، ہر دل عزیز ہونا بھی اور اَن اشیا کا حاصل کرنا بھی جن کی دنیا قدر کرتی ہے ، تو ہماری زندگی تلخ گزرے گی ۔ انسان میں یہ تلوّن کا عیب ایسا ہے کہ اس سے باز رہنے کے اندر آدمی کو نہایت خبرگیری اور احتیاط چاہیے ۔

دنیا میں قدرتِ الٰہی نے انسان کی برابر کوئی چیز تغیّر پذیر نہیں بنائی ۔ ہماری سمجھ ایسی ہے کہ ایک ہی رائے کو کبھی قبول کرتے ہیں ، کبھی رد کرتے ہیں ۔ انسان سے برتر مخلوق فرشتے ہیں اور کمتر حیوان ہیں ۔ ان دونوں میں ایسے تغیّر نہیں ہوتے جو انسان میں ہوتے ہیں ۔ حیوانوں میں تو سرے سے رائے ہی نہیں ہے ، یا ہے تو وہ ایک ہی ہے ، اس میں کبھی تبدّل نہیں ہوتا ۔ فرشتے کی سیرت میں بھی تلوّن نہیں ہے ۔ ہم اپنے ارادے سے گناہ کرتے ہیں ۔ کبھی اُس سے اپنے تئیں بری کرتے ہیں ، کبھی خدا کو ناراض کرتے ہیں ، کبھی راضی کرنے میں کوشش کرتے ہیں ۔ اپنے گناہوں کے عفو کی

دعا مانگتے ہیں - کبھی نفرت کے قابل ، کبھی رغبت کے قابل کام کرتے ہیں - اس تلوّن میں ساری زندگی اسی طرح گزرتی ہے - کوئی زندگی کی حالت انسان کے واسطے ایسی نہیں کہ جس میں دل کے اندر تغیّر نہ پیدا ہو - لڑکپن کے خیالات کی صورت جوانی میں کچھ اور ہی ہو جاتی ہے - بعض ان میں سے بالکل جاتے ہی رہتے ہیں - بڑھاپے میں پھر آدمی پیرِ نابالغ ہو جاتا ہے - بچوں کے سے خیالات کرنے لگتا ہے - ایک عمر کے خیالات دوسری عمر کے خیالات سے مختلف ہوتے ہیں - جب کوئی نیا خطاب ملتا ہے یا کوئی نعمتِ غیرمترقبہ مل جاتی ہے تو ہم اپنے آپے سے ایسے باہر ہو جاتے ہیں کہ معلوم نہیں ہوتے کہ ہم وہ خود رہے ہیں - گھٹا کے دن تھوڑی سی دھوپ بہت سے آدمیوں پر ایسا اثر کرتی ہے جیسے کہ اصلی نعمتیں اور مصیبتیں - ایک خواب ہماری ہستی کو بدل دیتا ہے - بیماری اور صحت کے سوا ہر ایک جذبہ ہمارے جسم اور دل کو ایسا بدل دیتا ہے کہ ہم ایک اور ہی مخلوق معلوم دینے لگتے ہیں - پس ملائک اور حیوانوں میں انسان کی تمیز اس تلوّن کے عیب کے سبب سے ہوتی ہے - تو جو بنی نوع آدم میں اپنے تئیں ایسا بنائے کہ وہ تلوّن کے عیب سے پاک ہو اور جو آج ہو وہ وہی کل ہو اور کسی تغیّر کا سایہ اپنے اوپر نہ پڑنے دے ، اس کو سمجھو کہ ایسا صاحبِ کمال ہے کہ اعجاز کرتا ہے -

۴۴- نیک طینتی

ہر شخص کے مزاج کا متحمّل ہونا ، جن سے گفتگو کرنی اُن کے میلانِ طبائع کے ساتھ موافقت کرنی ، کبھی اپنے تئیں اوروں سے برتر نہ دکھانا ، یہ سب اطوار ایسے ہیں کہ جو کوئی اختیار کرے ، وہ تعریف کے قابل بغیر حسد کے ہو سکتا ہے - گو قدرت کی طرف سے

انسان کے پیچھے سینکڑوں رنج و تکالیف لگی ہوئی ہیں مگر ہم ان پر بھی آپس کی ظالمانہ مُدارات سے اَور مصائب کا اضافہ کرتے ہیں - اور اپنے حسد ، حقد ، دغا بازی ، اپنے ہمسایوں کے ساتھ نااتفاقی سے اَور اپنے سر پر ان تکلیفوں کے وزن کو زیادہ بوجھل کرتے ہیں - بڑا بھاری یہ ایک طوفان کُل بنی آدم پر آیا ہوا ہے جس میں وہ باہم ٹکراتے ہیں - اگر نوعِ بشر رحم دلی ، فیّاضی ، تواضع با یک دگر اختیار کرے تو رنج و مصیبت آدھے سے بھی کم رہ جائیں - یہ بات جب ہو سکتی ہے کہ نیک طینتی اپنے میں اور اَوروں میں پیدا کریں جس سے حماقت اور گستاخی کی برداشت ہو - نیک طینتی کی گفتار وہ انداز دکھاتی ہے کہ ذکاوت سے زیادہ لطف و پسندیدگی پیدا کر دیتی ہے - چہرے میں وہ ایک آن نمایاں کرتی ہے کہ جو خوبصورتی سے زیادہ بھلی لگتی ہے - وہ نیکی کے نُور کو چمکاتی ہے کہ بدی کی تاریکی مٹ جاتی ہے - دنیا میں تمام صحبتیں ، جلسے ، آپس کی باتیں قائم ہوتی ہیں یا اُن چیزوں سے جو اس کے مشابہ ہوں یا قائم مقام ہوں - اس لیے آدمی ایک مصنوعی نیک طینتی اپنے میں پیدا کرتا ہے ، اور اس کو اصلی نیک طینتی کی نقل بناتا ہے یا اس کا قائم مقام ، اور اس کا نام خوش خلقی رکھتا ہے - دنیا میں سب جگہ یہ خوش خلقی جو عبارت مروت ، آدمیّت ، ملائمت سے ہے ، نیک طینتی کی نقل اُتار رہی ہے - اگر ظاہری بناوٹ اور انسانیت کی بِنا نیک نہادی پر ہو تو اس سے انسان ہر دل عزیز ہو جاتا ہے - اگر یہ نہ ہو تو وہ مذہبی ریاکاری بن جاتی ہے - جب اس تقدّس کی صورت برہنہ ہو جاتی ہے تو وہ ناخدا پرستی سے بھی زیادہ حقارت کے قابل ہو جاتی ہے - اکثر نیک طینتی انسان کے ساتھ پیدا ہوتی ہے - صحّت ، آسودہ حالی ، اہلِ دنیا کی نیک التفاتی یہ سب اس کو نشو و نما دیتی ہیں - اگر وہ خود نہ پیدا

ہو تو پھر کوئی چیز اس کو زبردستی پیدا نہیں کر سکتی - تعلیم اس کو رونق دے سکتی ہے مگر پیدا نہیں کر سکتی - خدا کو عدالت، انسان کو رحم پسند ہے - جو شخص اپنے کسی قصور کو معاف نہیں کرتا وہ اَوروں کو ان کے افعال کے موافق صلہ دے گا - نیک طینت آدمی ایسے ویسے مقدّمات میں اور خفیف مقدّمات میں قصوروں کو معاف کر سکتا ہے - خطاؤں سے چشم پوشی، مگر سلطنت کی[1] انتظامی عدالتوں میں یہ نہیں کر سکتا، اس لیے کہ[2] ان میں ایک پر رحم کرنا دوسرے پر ظلم کرنا ہے -

یہ ایک بات عوام میں ضرب المثل مشہور ہے کہ نیک طینت آدمی اکثر بہت ذکی نہیں ہوتے - نیچر میں تو کوئی بات ایسی نہیں جو اس بات کی تصدیق کرے - اور یوں مشاہدے میں بھی آتا ہے کہ بہت سے آدمی، جو[3] نیک طینت ہوتے ہیں، وہ بڑے ذہین بھی ہوتے ہیں - مگر اس بات کے مشہور ہو جانے کی دو وجہ معلوم ہوتی ہیں: اول، عوام الناس شرارت کی باتوں ہی کو ذکاوت سمجھتے ہیں - جب کوئی شریر، بدنفس مضرّت رساں بات کہتا ہے تو لوگ بڑی رغبت سے سنتے ہیں اور اس سے ان کے دل خوش ہو جاتے ہیں، وہ اس پر ہنستے ہیں - کہنے والے کو کہتے ہیں ''کیا وہ بے باک ہجو کرتا ہے - بلا کا بنا ہوا آدمی ہے - کیا کھرتل سناتا ہے -'' غرض عوام میں تمیز شرارت اور ذکاوت کی نہیں ہے - شریر لڑکوں کو ذہین کہا کرتے ہیں - وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ذکاوت کا اقتضا ہی شرارت ہے - دوسری وجہ یہ ہے کہ نیک طینت آدمی جب اَوروں

۱- اصل : کے انتظامی -   ۲- ''کہ'' اضافہ مرتّب -

۳- ''جو'' اضافہ مرتّب -

کی ناتوانی اور بدنصیبی دیکھتا ہے تو رحم کرتا ہے ۔ آن پر وہ آن لوگوں کی طرح جو ذکی مشہور ہونے کے لیے باتیں بناتے اور ہنستے ہیں ، نہ باتیں بناتا ہے ، نہ ہنستا ہے ۔ شریر بڑی کاوش سے اَوروں کے عیبوں اور نقصوں کا افشا کرتا ہے ، اپنی ذہانت دکھاتا ہے ۔ نیک طینت اَوروں کے عیبوں پر پردہ ڈال کر چھپانے میں کوشش کرتا ہے ۔ شریر آدمی اَوروں کی برائیوں پر قہقہے اڑاتا ہے ۔ نیک طینت آدمی ان کے لیے عذر کرتا ہے ۔ بدنفس ان خیالات کو بیان کرتا ہے جن کو نیک طینت آدمی گلا گھوٹ کر بند رکھتا ہے ۔ شریر اپنے دوستوں و دشمنوں سے بے پروائی ظاہر کرتا ہے ۔ اپنے مُحسنوں کو آٹھا کے پھینک دیتا ہے ۔ غرض وہ کسی ایسی بات کی طرف متوجہ نہیں ہوتا جس سے اس کی ذکاوت نہ معلوم ہو ۔ پس ایسی حالت میں شریر و بدطینت ، نیک طینت آدمیوں سے زیادہ ذکی عوام کو معلوم ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں ۔ جو شخص ہیر پھیر کی تدبیریں کرتا ہے اور پیچ در پیچ معاملات سرانجام دیتا ہے وہ غالباً بڑا دولت مند ہو جاتا ہے ، گو سچّا نہ ہو ۔

۴۴- خوشی و رنج

ابتدائے آفرینشِ عالم سے دو خاندان چلے آتے تھے جن کے اندر آپس میں ایسا نقیض و تضاد تھا جیسے کہ روشنی اور تاریکی میں ۔ ان میں سے ایک بہشت میں رہتا تھا جس کی اولاد ، سب سے چھوٹی ، خوشی تھی جو سعادت کی دختر تھی اور سعادت نیکی کی بیٹی تھی اور نیکی دیوتاؤں کی بیٹی تھی ۔ یہ سب بہشت میں خوش و خرّم رہتے تھے ۔ دوسرا خاندان دوزخ میں رہتا تھا جس کی اولاد ، سب سے چھوٹی ، رنج تھا جو مصیبت کا بیٹا تھا اور مصیبت بُرائی کا بچہ تھا اور بُرائی

طیش و غضب کی اولاد تھی - یہ سب دوزخ میں رہتے تھے - ان دونوں — دوزخ اور بہشت — کے درمیان میں زمین تھی جس میں مخلوق ایسی رہتی تھی کہ وہ نہ ایسی نیک تھی جیسے بہشت کا خاندان تھا ، نہ ایسی بد تھی جیسا کہ دوزخ کا خاندان تھا - متوسّط دونوں میں تھی - جیوپی‌طر نے سوچا کہ یہ مخلوق جس کو آدمی کہتے ہیں ، وہ بہت نیک ہونے کو مصیبت ناک اور بہت برا ہونے کو مسرّت ناک جانتا ہے - بہتر ہے کہ میں اس کو نیک و بد کی تمیز کراؤں - اس لیے اس نے ان دونوں خاندانوں کی سب سے چھوٹی اولاد رنج اور خوشی کو حکم دیا کہ وہ انسان کی طبیعتوں پر ، جو تم دونوں کے درمیان متوسّط ہے ، مسلّط ہوں اور آپس میں اتفاق کر کے انسانوں کو آپس میں تقسیم کر لیں - اس حکم کے بہ موجب وہ دونوں نئے مسکن میں آئے اور آپس میں یہ ٹھہری کہ نیک آدمیوں پر خوشی تسلّط کرے اور بد آدمیوں پر رنج - مگر جب ان کو نیک و بد آدمیوں کی ، اپنے اپنے قبضے میں لانے کے لیے ، تلاش ہوئی تو ایک شخص بھی ان کو ایسا نہ ملا کہ وہ ایسا نیک ہوتا کہ اس میں کچھ برائی نہ ہوتی ، نہ کوئی ایسا بد ملا کہ اس میں کچھ نیکی نہ ہوتی - غرض کوئی ان کو اپنے پرانے اہلِ وطن کی مثل نہ ملا - مگر ان کو تحقیقات کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ بہت برے آدمی کے دل پر خوشی سویں حصّے پر مسلّط ہونے کا حق رکھتی ہے اور بہت نیک آدمی کے دل پر دو تہائی قبضہ پانے کا رنج مستحق ہے - مگر اس طرح قبضہ پانے پر ان کے درمیان بڑے جھگڑے کھڑے ہوتے ، اس لیے انھوں نے آپس میں یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم آپس میں بیاہ کر لیں - پس اسی طرح یہ رنج و خوشی میاں بیوی ہو کر توام رہنے لگے - وہ انسان کے دل میں یا دونوں ساتھ آتے ہیں یا بعد ایک

دوسرے کے ۔ اگر رنج پہلے آیا تو اس کے بعد خوشی آئی ، اگر خوشی پہلے آئی تو اس کے بعد رنج آیا ۔ ان میں بہت بُعد کبھی نہیں ہوتا ۔ اگرچہ یہ دونوں آپس میں شادی کر کے خوش ہو گئے مگر جیوپی ٹر کا مطلب جو انسان کے درمیان ان کے بھیجنے کا تھا وہ نہ حاصل ہوا ، اس لیے اس نے دونوں خاندانوں کی مرضی لے کر یہ فیصلہ کیا کہ جب ہر آدمی مرے ، اگر اس میں زیادہ تر نیکیاں ہوں تو اس کو خوشی بہشت کے لیے راہ داری کا پروانہ لکھ دے کہ وہاں وہ نیکی ، سعادت اور دیوتاؤں کے ساتھ رہے ، اور اگر اس میں بُرائیاں زیادہ ہوں تو رنج جہنّم کے لیے پروانۂ راہداری لکھ دے کہ وہاں جا کر مصیبت ، برائی ، غضب و قہر کے ساتھ رہے ۔

۴۶۔ ذہانت

انسان کے لیے ذہانت بھلے کام کرے تو اس سے زیادہ کوئی مفید نہیں ۔ اگر برے کام کرے تو اس سے زیادہ کوئی مضر نہیں ۔ عدلت اور عقل کے موافق ذہانت کی قدر و منزلت کرنی چاہیے ۔ ایک وکیل کی اس وقت قدر و عزت کرنی چاہیے کہ وہ اپنی ذہانت سے مظلوم کی داد رسی کرائے ، ظالم کو سزا دلائے ۔ جو ناحق قرض لے ، اس کو قیدخانے بھجوائے ۔ اگر برخلاف اِس کے اس کی ذہانت جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنائے تو قابلِ حقارت ہے ۔ عطیّاتِ قدرت اور کمالِ صنعت جب ہی بیش بہا ہوتے ہیں کہ وہ نیکی کی خاطر کام میں لائے جائیں ۔ کوئی عالی دماغ جب تک اپنی طبیعت و ذہانت کو نیک کام میں نہ لائے ، معزّز نہیں ہو سکتا ۔ اگر شاعر اپنی ذہانت کو نام وروں کی مذمّت میں کام میں لاتا ہے تو کودن سے بدتر ہے ۔ جو ذہین اپنی ذہانت کو شرارت میں کام

میں لاتے ہوں ، ان[1] سے پرہیز اور گریز چاہیے - رند اور اوباش وضع اپنی ذہانت کو ایسی بری طرح کام میں لاتے ہیں جیسے بعض حسین عورتیں اپنی حسانت اِس طرح دکھاتی ہیں کہ اگر ان کی آنکھیں نرگسی ہوں تو وہ اپنے عاشقوں کی طرف بھینگی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور اگر چہرہ ان کا پری کا سا ہو تو وہ منہ ِچڑاتی ہیں جس سے چہرہ بگڑ جاتا ہے -

۴۷- لاٹری[2]

حکیمانہ ظرافت سے حکما نے یہ لکھا ہے کہ اگر گھاس کے دو گٹھے ایک صورت شکل اور وزن کے رکھے جائیں جن کی[3] گھاس کی رنگت ، بُو ایک سی ہو اور ان کے[4] بیچو بیچ میں گدھا کھڑا کیا جائے جس کی آنکھوں کو گھاس کا رنگ اور بُو دونوں گٹھوں میں یکساں محسوس ہو اور کوئی وجہِ ترجیح نہ ہو ، کہ وہ ایک گٹھے پر منہ ڈالے ، تو گدھے کو بڑی دقّت پیش آئے گی - اس گھاس کے ہونے سے تو نہ ہونا بہتر ہوتا کہ افراطِ طعام میں گرسنگی نہ ہوتی - اب اس کا حال تو اُس مقناطیس کا سا ہوگا جو دو لوہوں کے عین وسط میں رکھا ہو کہ نہ اِدھر جا سکے نہ اُدھر - اب اس امر کا فیصلہ کرنا تو گدھا پن ہے کہ گدھا بھوکا مرے گا یا کسی گٹھے پر منہ ڈالے گا ، وجہِ ترجیح کو چھوڑے گا - مگر ہم آدمیوں کے باب میں فیصلہ کر سکتے ہیں جب اُن کو یہ صورت پیش آئے - لاٹری میں

۱- اصل : اس سے -
۲- اصل : لوٹری - اسے ہر جگہ الف سے ''لاٹری'' بنا دیا گیا ہے کیونکہ عام طور پر اس کا تلفّظ الف سے کیا جاتا ہے -
۳- اصل : جن کے گھاس - ۴- اصل : ان کی -

آدمیوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ جتنی چٹھیاں[1] ہوتی ہیں ، اُن پر کسی نمبر کو ترجیح نہیں ہوتی کہ وہ جیتے گا - سب پر جیتنے کا احتمال یکساں ہوتا ہے - ایسے ہی سب چٹھی ڈالنے والوں کی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ سب برابر ہوتے ہیں - صرف قسمت کا سہارا ہوتا ہے - بعض آدمی ان نمبروں کے پسند کرنے میں عجیب عجیب حماقت اپنی دکھاتے ہیں - کوئی تو سنہ عیسوی کا نمبر لیتا ہے کہ وہ مبارک ہوگا کہ خداوندِ مسیح کی ولادت کا سنہ ہے - کوئی اَور نمبر لے گا جس کو وہ مقدّس سمجھتا ہے - کوئی اپنی عمر کے سالوں کی تعداد کے موافق نمبر لے گا - غرض یوں اپنی حماقتیں دکھاتے ہیں اور روپیہ لگاتے ہیں - قسمت جسے چاہتی ہے ، ہراتی جتاتی ہے - تعجب یہ ہے کہ نجومی ، جوتشی ، فال گو اور اَور قسم کے غیب گو ان لاٹریوں پر متوجہ نہیں ہوتے کہ کوئی اپنے علم کی بِدھ ملا کے ایسے نمبر کی چٹھی نہیں لیتے جس میں جیت ہی جیت ہو ، اور نہ اَور چٹھی ڈالنے والے ان سے پوچھتے ہیں - اگر ان لوگوں کا علم سچّا ہوتا تو وہ اس لاٹری اور اَور جوؤں میں نہال ہو جاتے - ہمیشہ انھی کے پو بارہ ہوتے -

۴۸- امرا کی لیوی

سب جانتے ہیں کہ جب بڑے بڑے حکام اور اُمرا کی لیوی ہوتی ہے تو بڑے بڑے آدمی بڑی بھڑک کی پوشاکیں پہنتے ہیں اور بن سنور کر وہاں جاتے ہیں - یہ لیوی کیا ہے ؟ وہ یہ ہے کہ ایک جمِّ غفیر اِس امر کا اقرار اور اظہار کرے کہ ہم ایک آدمی کو

۱- چٹھیاں = لاٹری کے نمبروں کی وہ پرچیاں یا کوپن جن پر انعام نکلتا ہے -

عاقل ، فیّاض ، شجاع ، صاحبِ قدرت مانتے ہیں - کسی ظریف کا قول ہے کہ ثروت میں عقل جاتی رہتی ہے - سو یہ صاحبِ ثروت جو لیوی لیتا ہے ، وہ فقط لیوی ہی سے خوشی کے مارے پھولا نہیں سماتا ، بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھ میں اَور آدمیوں سے زیادہ عقل و حواس نئے آ گئے ہیں اور میری قابلیتیں اور لیاقتیں ایسی ہو گئی ہیں کہ اَور آدمیوں کی عقل ان کا[1] اندازہ نہیں کر سکتی - یہ انسان کی عقل اور سمجھ کا اوچھا پن ہے - لیوی میں کیا ہوتا ہے ؟ یہ ہوتا ہے کہ گروہ ہا گروہ آدمی اپنی آزادی کو بالائے طاق رکھ کر اپنی غلامی دکھاتے ہیں اور ایک آدمی کی عقل کھوتے ہیں -

۴۹- مباحثوں میں تکرار و فساد

۱- مُہندس[2] مسائلِ ہندسہ میں ، منطقی اشکال و حدود میں ، طبیب علاج و پرہیز میں ، پیر ارشادات میں ، وکیل مقدّمات کی وجوہ میں ، غرض ہر اہلِ فن اپنے فن میں گفتگو و مباحثہ کرے تو مضائقہ نہیں ہے - مگر غضب تو یہ ہے کہ ایک اہلِ فن دوسرے اہلِ فن سے ، جن کے فن کو وہ بالکل نہیں جانتے ، مباحثے کو تیار ہوتے ہیں اور ان کے دلائل کو کاٹتے ہیں ، یہاں تک کہ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگتے ہیں - ایک کپتان اپنی مہمات کی وجوہ بیان کرتا ہے ، وکیل صاحب اس پر جرح و قدح کو موجود ہیں - ادھر کپتان صاحب کی آستینیں چڑھتی ہیں ، آدھر وکیل صاحب بھی بے حیائی سے سامنے کھڑے تو ہیں مگر دل کا خدا ہی حافظ ہے - غرض ایسے مباحثوں میں طرفین طیش و غضب میں بھر آتے ہیں اور اپنے تئیں ناحق رنج

۱- اصل : ان کو اندازہ -　　　۲- مہندس = علم ہندسہ کا عالم -

پہنچاتے ہیں - آدمی کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو بحث و تکرار سے ، جس میں فساد ہو ، پرہیز کرے - آدمیوں میں مباحثے تین وجہ سے ہوتے ہیں : ایک یہ کہ ان میں ہر ایک کو اپنی فتح یابی مدِ نظر ہو - دوم ہر ایک کو اپنی نیک نامی ، سوم ایک امرِ حق کی تحقیق - تینوں حالتوں میں مباحثے کے لیے ذکاوت سے زیادہ خوش مزاجی اور نیک اخلاق کی ضرورت ہے - آدمی کو جب بہ مجبوری دلائل بیان کرنے کی ضرورت ہو تو ان کو نہایت نرمی اور سہولت سے بیان کرنا چاہیے - اسی طرح سامعین کے دلوں پر ان کا اثر ہوگا اور نقش جمے گا - سب سے اچھا طریقہ مباحثہ و مناظرہ کا سقراط کا ہے کہ جب جانبِ مقابل کسی دلیل کا قائل نہ ہو تو ایک سلسلہ براہین کا اس کے ثابت کرنے کے واسطے ایسا قائم کیا جائے کہ جانبِ مخالف کو سوائے ماننے کے کوئی اور چارہ ہی نہ ہو - مباحثہ محض اپنی فتح یابی کی نظر سے کہ دوسرے کو زک دے دیں ، مکروہ معلوم ہوتا ہے - اس میں بھی خفگی اور طیش میں آ جانے کی برابر کوئی حماقت نہیں - یہ کیا عقل ہے کہ ہم کسی دوسرے آدمی سے اس بات پر خفا ہو جائیں کہ اس کی رائے وہ نہیں ہے جو ہماری رائے ہے - یہ وجہ ایسی ہے کہ جس کے موافق تم جیسے خفا اس سے ہوتے ہو ، وہ تم سے خفا ہو - آدمیوں کی اغراض ، طریقۂ تعلیم وسائل علم سیکھنے کے ایسے جدا جدا ہیں کہ ممکن نہیں کہ سب ہم خیال و ہم رائے ہوں - تم ذرا ٹھنڈے ہو کر اور غصّے کو تھوک کر سوچو کہ اگر ہماری اغراض اور تعلیم جانبِ مخالف کی سی ہوتیں تو ہماری رائے کیا ہوتی - اگر مباحثے سے فقط فتح یابی منظور ہو اور تم اس میں غیظ و غضب میں بھر آؤ تو اس سے زیادہ کوئی بات تمھارے لیے مضر اور دشمن کے لیے مفید نہیں ہے کہ جب

مباحثہ ختم ہو جائے گا تو تم کو معلوم ہوگا کہ اس غصّے نے تم کو برانگیختہ کرکے کن کن دلائلِ قاطع کو تمھاری کاٹ دیا ہے۔ ہمیشہ گفتگو نرمی سے کرنی چاہیے۔ ایسی حالت میں شکست و فرار میں بھی عافیت ہے۔ کسی آدمی پر اس سبب سے غصّہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ تمھاری دلائلِ قوی کو نہیں مانتا اور اپنی ضعیف دلائل کو مان کر ان کے مقابل میں پیش کرتا ہے۔ اگر مباحثے سے غرض اپنی نیک نامی ہو تو جو لوگ تمھاری دلائل کو نہ سمجھیں تو ان پر بجائے غصّے کے رحم چاہیے اور خدا کا شکر بھیجنا چاہیے کہ اس نے تم کو فہمِ مستقیم اور طبعِ سلیم عنایت کی ہے۔ کوئی تمھارا ہم سر تمھارے غصّے کو خیال میں نہیں لائے گا، وہ تمھارے لیے خود سزا بن جائے گا۔ یہ عقل سے بعید ہے کہ جب کسی احمق اور شریر سے تم کو پالا پڑے تو تم غصّے ہو کر اپنے تئیں سزا دو۔ اگر مباحثے سے صرف[1] امرِ حق کی تحقیق مدنظر ہے تو وہ تمھارے غصّے کو خود روک دے گا کیونکہ غرض[2] امرِ حق کا دریافت کرنا ہے۔ آسے تم تحقیق کرو یا دوسرا دریافت کرے، ایک ہی بات ہے۔

جب دو آدمیوں میں مباحثہ و تکرار دیکھو تو کسی کے جانبدار نہ ہو بلکہ طرفین میں سے جو امورِ حق ہوں، اُن کے طرف دار ہو اور اُن کی خوب چھان بین کرو۔ یہ کرو گے تو کوئی تمھارا دشمن نہ ہوگا۔ ایک بات اَور یاد رکھو کہ جب تم مباحثے میں فتح یاب ہو تو بہت اِتراؤ اور پُھولو نہیں۔ اس سے لوگ فقط تمھاری فتح یابی ہی

۱۔ اصل: ''صرف غرض امرِ حق کی تحقیق مدنظر ہے۔'' لفظ ''غرض'' حذف کر دیا گیا۔

۲۔ ''غرض'' اضافۂ مرتّب۔

کے قائل نہیں ہوں گے بلکہ نیک مزاجی اور فراخ حوصلگی کے بھی۔

۲۔ بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص دوسرے شخص کے کلام کو نہیں سمجھتا یا اس کے فعل کے اصل مقصود کو نہیں پہنچتا یا کسی بات کے سمجھنے میں اس کی فہم غلطی کرتی ہے تو وہ اپنی غلط فہمی کو نہیں سمجھتا۔ اُس کے دل پر اِس لغو خیال کی تاریکی چھائی ہوئی ہے کہ مجھے ہر شخص کے مقابلے میں تیار ہونا چاہیے اور ہر شخص سے بحث کرنا میری بڑی لیاقت ہے، اور دخل در معقول دینے سے لائق آدمیوں کی نظر میں میرا رسوخ ہوگا۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھتا کہ میری اس غلط فہمی سے تو عالموں کی نظر میں وقعت گھٹ جائے گی۔ نقصانِ فہم کے سبب سے رائے ساقط الاعتبار خیال کی جائے گی۔ اہلِ نظر کی نظر سے گر جائے گا۔ کبھی وہ یہ کرتا ہے کہ جس شخص کے قول کی تردید منظور ہوتی ہے اُس کے معانی اپنی طرف سے ایسے ناحق گھڑ لیتا ہے کہ جن کا باطل کرنا آسان ہو۔ اس کی رد میں دو چار صفحے بڑے طمطراق سے لکھ دیے۔ ڈھول بنا کے لائے جس میں فقط آواز ہی ہے اور اندر سے خالی ہے۔ اس کا یہ رد کرنا ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی دشمن کا پُتلا پھوس کا بنا کر کھڑا کرے اور اُس پر تیر لگا کر خوش ہو جائے کہ میں نے اس کو شکست دے دی۔ اگر احمقوں نے اس پر جھوٹی واہ واہ کر دی تو یہ شور سچی واہ واہ کی آوازِ موزوں سے زیادہ اس کے کانوں کو بھلا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوتا ہے، یا وہ کوتاہ نظر ہوتا ہے کہ اس کو حق اچھی طرح نہیں دکھائی دیتا۔

۵۰- گھر میں جاسوس نوکروں کا ہونا

جس گھر میں ایسے نوکر ہوں کہ جو گھر کی جاسوسی اور مخبری کرتے ہوں تو اُس گھر سے عافیت رخصت ہوتی ہے - یہ جاسوس آقاؤں کی عمدہ خدمات کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ان کی خوش مزاجی اور آزاد منشی کو اس شوخی و بے باکی اور لفّاظی سے بیان کرتے ہیں کہ گھر میں سب عزیز و اقارب میں بدگمانیاں آپس میں پیدا ہو جاتی ہیں - جلی کٹی باتیں آپس میں ہونے لگتی ہیں - سچے وفادار ملازم مشتبہ ہو جاتے ہیں - جھوٹے بے وفا نوکر منہ چڑھ جاتے ہیں -

۵۱- عبادت

آدمی کو مذہب کا پابند ہونا چاہیے اور توہماتِ باطلہ سے بچنا - یہ ایک نہایت عمدہ بات ہے کہ بچپنے ہی میں مذہب و عبادت کا نقش دل پر جمایا جائے - وہ کبھی تادمِ مرگ مٹنے کا نہیں - گو کبھی کبھی دنیا کے کاموں کی کثرت ، جوانی کی حرارت ، برائیوں کی طرف رغبت اُس کو دلائیں گے لیکن مٹا نہیں سکیں گے - جب عمر بڑھے گی ، مصیبت آئے گی ، ہوش درست ہوں گے - پھر مذہب کے خیال کا نقش جیسا تھا ویسا ہی پھر ابھر آئے گا - اس کا حال آگ کا سا ہوتا ہے کہ اگر اسے دہکا کر اس پر انبار لگائیں تو وہ بالکل بجھنے کی نہیں -

عدالت ، پرہیزگاری ، متانت اور ساری نیکیاں بغیر عبادت کے بے مزہ اور پھیکی ہوتی ہیں - وہ مذہب سے پھر کچھ تعلق نہیں رکھتیں بلکہ فلسفہ و حکمت سے متعلق ہو جاتی ہیں - کوئی لذّتِ جسمانی عبادت کی لذّت کو نہیں پہنچتی - کوئی علم و حکمت انسان کے خیالات کو وسیع اور عالی ایسا نہیں بناتا جیسے کہ عبادت دل میں تحریک اور

حرارت وہ پیدا کرتی ہے کہ کوئی دنیا کی عشرت وہ نہیں پیدا کر سکتی۔ بعض علما کی رائے ہے کہ عقل مابہ الامتیاز انسان اور حیوان کے درمیان ایسی نہیں ہے جیسی کہ عبادت۔ اس لیے کہ وحشی سے وحشی حیوان میں کچھ نہ کچھ عقل کے آثار پائے جاتے ہیں مگر عبادتِ الٰہی کا شائبہ جانور میں ذرا بھی نہیں ہوتا۔ عبادت کی طرف میلانِ طبع انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ جب کوئی مصیبت اور آفت پڑتی ہے تو وہ خدا سے اپنی مدد کی دعا مانگتا ہے۔ جب کوئی نعمتِ غیرمترقبہ مل جاتی ہے تو اس کا شکر بھیجتا ہے۔ اس کی ذات کے[1] کمالات کی حمد کرتا ہے۔

آسمان کے نیچے جتنی قومیں رہتی ہیں، ان سب کا عبادت پر اتفاق ہے۔ اس کے تین سبب بتلائے جاتے ہیں:

اول، یہ کہ خالقِ اکبر نے اپنے کلام سے انسان کے دل میں عبادت کا خیال پیدا کیا ہو۔

دوم، اس نے انسان کی خلقت اور جبلّت میں یہ خیال پیدا کیا ہو۔

سوم، عقل و دانش نے یہ خیال دلایا ہو۔

خواہ تینوں سبب یا ان میں سے ایک سبب پایا جاتا ہو تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس تمام عالم کا خالق واجب الوجود ہے۔ مگر اس عبادت کے پیچھے دو آفتیں لگی ہوئی ہیں:

اول یہ کہ جب عبادت حدِ اعتدال سے تجاوز کرتی ہے اور عقل کی حد سے پرے نکل جاتی ہے تو وہ انسان کے دماغ میں مالیخولیا[2] پیدا کرتی ہے، اور امراضِ روحانی نخوت وغیرہ۔ جب اس عبادت

۱- اصل: کی کمالات۔ ۲- مالیخولیا = ایک دماغی عارضہ۔

کا جوش اُٹھتا ہے تو آدمی دیوانہ ہو جاتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ اشتعالِ عبادت میری طرف سے نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے - یہاں تک کہ[1] وہ اپنی خودی کو بھول جاتا ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میرے اور خدا کے درمیان مکالمہ و مکاشفہ و[2] مشاہدہ ہونے لگا ہے - مجھے ضرور نہیں کہ اب میں دنیا کے مذاہبِ[3] مروجہ میں سے کسی کا سب طرح سے پابند رہوں - پس وہ مذہب کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے - دیوانہ پن کی باتیں کرتا ہے -

دوسری آفت یہ ہے کہ عبادت کی کثرت سے توہّماتِ باطلہ میں مبتلا ہوتا ہے - صدہا اوہام و وسوسے ناحق کے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں - بیسیوں باتوں کو ، جو مذہب سے کچھ تعلق نہیں رکھتیں ، وہ اپنے اوپر فرض جاننے لگتا ہے - غرض مذہبی عبادت میں پُرجوش و شوق ہونا سرکش گنوار بننا ہے اور توہّماتِ باطلہ میں گرفتار ہونا یا ایک بے مزہ درباری بننا ہوتا ہے - عبات میں اعتدال چاہیے - اس کی افراط میں ایک صورت میں دیوانگی اور دوسری صورت میں حماقت ہے -

۵۲- عورتوں کی مذمّت

دنیا میں سب سے بڑی نعمت اچھی بیوی اور سب سے زیادہ مصیبت بُری بیوی ہے - ہر زمانے میں مصنّف عورتوں کا حال لکھتے آئے ہیں - کسی نے مدح سرائی میں ، کسی نے ہجو پیرائی میں دفتر کھولا ہے - کسی سارے گروہ کو برا کہنا معیوب ہے - کسی گروہ

۱- "کہ" اضافۂ مرتّب -

۲- مکالمہ ، مکاشفہ اور مشاہدہ کے درمیان واؤ کا اضافہ مرتّب نے کیا ہے -

۳- اصل : مذہب مروجہ -

میں سب آدمی یکساں نہیں ہوتے -

دنیا کی ساری عورتوں کی مذمّت کرنی اہلِ تہذیب پسند نہیں کرتے لیکن عوام الناس اس سے خوش ہوتے ہیں - ایک قدیمی شاعر نے عورتوں کی ہجو بڑے لطف کے ساتھ لکھی ہے - ہم اس کا ترجمہ کرتے ہیں :

خدائے تعالیٰ نے ابتدائے آفرینشِ عالم میں بہت سے مختلف طرح کے مادے ایک جگہ جمع کیے اور ان سب کو ملا کر عورتوں کی ارواح کا خمیر بنایا ، اور ان کے لیے جدا جدا عورتوں کا جسم مسکن بنایا[1] - اس طرح جتنی قسم کی عورتیں پیدا ہوئیں ان کی تفصیل یہ ہے :

اول ، ایک قسم کی عورتیں اُن مادوں سے بنائیں جن سے کہ سورنی بنائی تھی - اس طرح کی عورتیں سراسر غلیظ و ناپاک رہتی ہیں - ان کا جسم ناپاک ، خوراک پوشاک غلیظ ، بچے غچلی[2] ، گھر نجاست سے بھرا ہوا ڈلاؤ[3] کی برابر - غرض سب طرح سے نہایت بدسلیقہ و پھوہڑ گھر میں ، اور بہت کھانے والی دسترخوان پر -

دوم ، اُن مادوں سے بنائیں جن سے کہ لومڑی بنائی - اس طرح کی عورتیں بڑی باخبر و ہوشیار ، چالاک ، ہر بات کی تہہ پر پہنچنے والی - غرض ان میں کچھ برائیاں کچھ بھلائیاں ہوتی ہیں -

سوم ، اُن مادوں سے عورتیں پیدا کیں جن سے کہ کُتیا کو بنایا - اس نوع کی عورتیں وہ کام کرتی ہیں جو کُتیا کرتی ہے - بڑی لڑاکا - کام کرتی جاتی ہیں بھونکتی جاتی ہیں - جو رستے میں آئے اس کی ٹانگ

۱- یعنی الگ الگ عورتوں کا جسم ان مادوں کا مسکن بنا -

۲- غچلی = گندے -   ۳- ڈلاؤ = غلاظت پھینکنے کی جگہ -

لیتی ہیں - ہمیشہ گھر میں دانتا کلکل مچاتی رہتی ہیں -

چہارم ، زمین سے بنائیں جو ہمیشہ مری مٹی رہتی ہیں : کاہل ، سست ، جاہل - سارے جاڑے میں آگ تاپیں ، کھانے کے سوا کسی اور کام میں دل نہ لگائیں -

پنجم ، سمندر سے بنائیں - ایسی عورتیں گھڑی میں کچھ ، گھڑی میں کچھ - کبھی طوفان برپا کریں ، کبھی خاموش ہو کر دھوپ کی سی چمک دکھائیں - جو اُن سے ناآشنا ہوں وہ ابھی ان کے تبسّم اور خاموشی کو دیکھ کر یہ جانیں گے کہ ان کی نیک مزاجی ایک کرامت ہے کہ دفعۃً وہ یہ دیکھیں گے[1] کہ اُن کا مزاج بدل گیا ، بات چیت کچھ سے کچھ ہو گئی - آندھی کی طرح غل شور مچانے لگیں - وہ طیش و غضب میں بھریں کہ کسی طرح سنبھالے سنبھلتی نہیں -

ششم ، اُن اجزا سے قوام پایا جن سے کہ گدھی بنتی ہے - ایسی عورتیں اگرچہ سست و کاہل ہوتی ہیں مگر خاوند کی ڈانٹ ڈپٹ سے اُس کی مرضی کے موافق ہر ایک کام جفاکشی اور محنت سے کرتی ہیں مگر مردوں کی صحبت و معاشرت سے بہت خوش ہوتی ہیں -

ہفتم ، بلّی کی قسم کی - ان کی اقسام طرح طرح کی ہیں[2] : غم‌زدہ ، چیں بہ جبیں ، نامرغوب طبع - وہ ایسی محبت سے نفرت کرتی ہیں کہ خاوند کی ہم آغوشی سے نکل کر بھاگ نہ جائیں - خاوند کی مقاربت کی ذرا پروا نہ کریں - کچھ مکر ، کچھ چوری ، کچھ اُٹھائی گیراپن بھی کرتی ہیں -

ہشتم ، خچّر کی قسم کی جس کے بال اور سیلی بہت خوب صورت ہو - ایسی عورتیں خاوندوں سے بے پروا مگر سارا دن اپنا بناؤ سنگار

۱- اصل : دیکھیں گی - ۲- ''ہیں'' اضافہ مرتّب -

کریں ، نہائیں دھوئیں ، لباس پُرتکلّف پہنیں ، خوشبوئیں ملیں ، بالوں کو سَو سَو طرح سے بنائیں ، عطر میں بسائیں ، پھول رنگ برنگ کے خوش نما ان پر لگائیں - ایسی عورتیں اجنبی آدمیوں کے دیکھنے کے لیے اچھی ہوتی ہیں - ہاں بادشاہ ، بادشاہزادے کے واسطے بھی یہ کھیلنے کے کھلونے اچھے ہوتے ہیں مگر خاوندوں کے واسطے ذات الجنب[1] ہوتی ہیں -

نہم ، بِن ُدم کی بندریا کی قسم کی - اس قسم کی عورتیں بدمزاج ، سب طرح سے بدصورت و زشت سیرت - باوجودیکہ ایک چیز بھی اپنے میں خوبصورت نہیں ہوتی مگر سب کی بدصورتی پر وہ ہنستی ہیں اور اُن سے نفرت کرنے پر تیار ہوتی ہیں -

دہم ، شہد کی مکّھی کی قسم کی - سب سے بڑا خوش نصیب وہ خاوند ہے جس کو اس قسم کی بیوی خدا دے - وہ سب عیبوں سے پاک ہوتی ہے - کوئی عیب اس میں نہیں ہوتا - وہ خاوندوں سے محبت کرتی ہیں - سارا کنبہ ان کا پُھولتا پھلتا ہے اور ترقی کرتا ہے - اَور عورتوں میں ممتاز ہوتی ہیں - سرتاپا خوبصورت ہوتی ہیں - لُچّی شُہدی عورتوں سے وہ ہم کلام نہیں ہوتیں - ان کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتیں - ان میں نیکی اور عقل مندی کوٹ کوٹ کے بھری ہوتی ہے - پس اس سے زیادہ اچھی بیوی کوئی نہیں ہوتی -

۵۳- کاغذ کی ہجو

حکما کے دو فرقے ہیں : ایک فرقے کا مذہب یہ ہے کہ دنیا میں ساری چیزیں بہتری اور بھلائی کے واسطے پیدا ہوئی ہیں - دوسرے

۱- ذات الجنب = ایک بیماری جو پہلو کے درد سے متعلق ہے - یعنی ایسی بیوی اپنے خاوند کے لیے پہلو کا درد ہوتی ہے -

فرقے کا یہ مذہب ہے کہ دنیا میں ساری چیزیں بُرائی اور بدتری کے لیے بنائی گئی ہیں - پہلا فرقہ کاغذ کو علم کے فرشتے کے پر بتلاتا ہے - دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ اگر یہ سچ ہے تو وہ فرشتہ وہ ہوگا جس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہشت سے نکلوایا تھا اور موت کو دنیا میں لایا تھا - اس لیے کہ دنیا میں شیطان سے کم ظلم وستم کاغذ نے نہیں کیے - کسی جفا کار سے وہ دل شکنی نہیں ہو سکتی جو کاغذ سے ہو سکتی ہے - اس کے تختوں نے بہت سی سلطنتوں کے تخت اوندھے کیے ہیں - سینکڑوں عمدہ انتظاموں کو اس نے پریشان کیا ہے - اب تک نہ انسان کی ذہانت نے ، نہ شیطان کی شیطنت نے کاغذ کے برابر کوئی غارت گر آدمی کے لیے پیدا کیا ہے -

۵۴- خیالات کی قوّت

خیالات میں بھی کیا قوّت ہے کہ کوئی قوّت اس کے سامنے حقیقت نہیں رکھتی - تمام کلوں[1] کی قوّت کے ناپنے کا پیمانہ گھوڑے کی قوّت ہے ، مگر وہ خیالات کی قوّت کے آگے ہیچ ہے - جو گھوڑے کی قوّت دھوئیں کے زور سے آٹھ سات روز میں جہاز کو سمندر پار لے جا سکتی ہے ، وہ خیال کی قوّت چند سیکنڈ میں اس کے پار لے جا سکتی ہے - یہ خیالات ہی کی قوّت ہے کہ جس نے نئی دنیا کو دریافت کر لیا - عیسائیوں کی سلطنت کو دنیا میں پھیلا دیا - گھوڑے کی قوّت کو بھی خیال کی قوّت نے پیدا کیا ہے -

۵۵- ذہین

جب تک ذہین آدمی زندہ رہتا ہے دنیا اس سے نفرت کرتی

۱- یعنی ''ہارس پاور'' کا پیمانہ -

ہے ، اس لیے کہ وہ گروہ ہا گروہ آدمیوں کے خیالات میں اضطراب و اضطرار پیدا کرتا ہے۔ وہ ان کی ہستی کے ساکن پانی پر پتھر پھینک کر اس میں تلاطم اُٹھاتا ہے جو اُن کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب وہ مر جاتا ہے تو سب کہتے ہیں : "اللہ اکبر ! وہ تو ہمارا نبی تھا"۔

۵۶۔ مُصلحانِ قوم

اے نوجوان پُر شوق حکیم ! تُو مُصلحِ دنیا بننا چاہتا ہے تو اس بات سے آگاہ ہو کہ اگر تُو نے اپنی ساری زندگی میں کوئی ایک خطا اور قصور چھوٹا سا بھی کیا ہوگا ، یہاں تک کہ اگر تُو نے مدرسے میں لڑکپن کے اندر یا تیرے کسی دور کے رشتہ دار نے کوئی گناہ کیا ہوگا ، تو وہ سب تیرے دِق کرنے کے لیے جمع کریں گے اور تجھے ستائیں گے اور کہیں گے کہ "واہ ! یہ مصلحِ قوم بنے ہیں جنھوں نے مدرسے میں ایک جھوٹ بولا تھا ، ایک پَر کا قلم چرایا تھا ، دیوالہ نکالا تھا۔ جن کے پردادا کے پانچویں چچا کے بھائی کی بیوی نے پھانسی پائی تھی۔ اس لیے تجھ کو پہلے اصلاح اپنی چاہیے۔ سچ یہ ہے کہ عمدہ مصلحت یہی ہے کہ ہر ایک آدمی اپنی اصلاح کے درپے ہو۔ اِسی سے ساری دنیا کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی۔ پھر حکما کی ضرورت نہیں رہے گی۔

۵۷۔ شاعر و عابد

نہ وہ شاعر ہے جو شعر کہتا ہے ، نہ وہ عابد ہے جو نماز پڑھتا ہے اور زبور گاتا ہے۔ بلکہ عابد و شاعر وہ ہیں کہ جن کا سینہ صاف ہو ، دل پاک ہو ، اُس میں اثر ہوتا ہو ، اس میں شوق و جذبے اُٹھتے ہوں۔

۵۸۔ ہاجی[1]

جو ہاجی ہجو لکھتے ہیں ، جتنا وہ اپنے تئیں عاقل اور ہوشیار جانتے ہیں ، اُس سے وہ آدھے بھی نہیں ہوتے ۔ وہ اناج کو پھٹکنا جانتے ہیں مگر کھاتے بُھس ہیں ۔ قاعدہ ہے ، جو لوگ اَوروں کو پرکھتے ہیں وہ اُن کے ساتھ بُرائی بھی کرنے کو تیار ہوتے ہیں ۔ اَور آدمیوں کی ذکاوت و نیک سیرتی دریافت کرنے کے لیے پہلے خود اپنے میں ذہانت و نیک سیرتی ہونے کی ضرورت ہے ۔ مگر اَوروں کی برائیوں کے ادراک کرنے میں سوائے کینے اور اپنے تئیں فریب دینے کی لیاقت کے کسی اَور لیاقت کی حاجت نہیں ۔ صاحب کمالوں کے کمالوں کی قدر و تعریف بزرگ منش صاحبِ کمال کرتے ہیں ، اور جتنے ہاجی ہیں اُن کی ہجو کرتے ہیں ۔ یہ تعریف اور خوشامد بھی کسی کی جب کرتے ہیں کہ ان کو کسی کا جلانا منظور ہوتا ہے ۔ زید کی تعریف اِس لیے کرتے ہیں کہ بکر کا جلانا منظور ہوتا ہے ۔ غرض اِس تعریف اور خوشامد میں بھی وہ اپنے منہ سے خباثت کا زہر اُگلتے ہیں ۔ جو نیک آدمی ہجو کرتے ہیں تو وہ بُرائی کو بُرا کہتے ہیں ، کسی شخص کو برا نہیں کہتے ۔ وہ آدمیوں کی غلطیوں اور خطاؤں کی ابتری بتاتے ہیں ، آدمی پر تبرّا نہیں بھیجتے ۔ یہ احمق شریروں کا کام ہے کہ ہجو سے لوگوں کے دلوں کو آزردہ کرتے ہیں ۔ ہجو لکھنے کی خوبی یہ ہے کہ گناہوں اور جرموں کو اس طرح بیان کرے کہ نیک مزاج ان کو سن کر طیش میں بھر آئیں اور برائی سے دل میں نفرت ہو جائے ۔

۱۔ ہاجی = 'ہجو' سے اسمِ فاعل ، یعنی ہجو کرنے والا ، کسی کی برائی یا مذمّت کرنے والا ۔

۵۹- شرافتِ[1] امرا

جن لوگوں کو ذاتی لیاقت نہیں ہے ، اگر باپ دادا کی شرافت کے سبب سے خطاب مل جائیں ، وہ ایسے ہیں جیسے کہ کھوٹی دھاتوں پر بادشاہی سکّے لگ جائیں - خاندانی خطاب ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہو جاتے ہیں مگر وہ صفات جو بزرگی اور شرافت کی جان ہیں ، نسل میں منتقل نہیں ہو سکتیں - آدمی جیسے زمین کو اپنی اولاد کو ورثے میں دے سکتا ہے ، اگر ایسے ہی وہ اپنی نیکیوں اور علموں کو بھی اُن کو دے سکتا تو اولاد کے برابر کوئی فائدہ مند چیز نہ ہوتی - غرض اگر شرافت کے ساتھ وہ نیک افعال اور فیّاضانہ اعمال اُمرا میں نہ ہوں جن کے سبب سے وہ شرافت کے ساتھ ممتاز ہوئے تھے تو وہ شرافت ایک خیالی چیز ہے -

٦٠- عالِم

عالم کا حال اناج کے درختوں[2] کا سا ہوتا ہے کہ جب زمین سے نکلتے ہیں اور ان میں اناج نہیں ہوتا تو سر اونچا کرتے ہیں - لیکن جب اُن میں اناج کی بالیں نکل آتی ہیں تو سر کو نیچا کر کے خمیدہ ہو جاتے ہیں -

٦١- عشق و ہوس

یونانیوں کی زبان میں[3] میتھالوجی[4] ایک علم ہے کہ اس میں

۱- اصل میں ہر جگہ ''شرافت'' کی بجائے ''اشرافت'' چھپا ہوا ہے -
۲- یہاں درختوں سے پودے مراد ہیں -
۳- ''میں'' اضافہء مرتّب - یہاں لفظ ''زبان'' کا استعمال محلِ نظر ہے - ''عاوم'' ہونا چاہیے - یونان سے یونانِ قدیم مراد ہے -
۴- اصل : میتھی لوجی -

سب قُوا و جذباتِ انسانی کو ایک مجسّم دیبی یا دیوتا سے تعبیر کیا ہے اور ان کے واسطے وہ نشانیاں مقرر کی ہیں جو ان کی شان کے شایاں ہیں۔ مثلاً عشق ہے، اس کو خوبصورت اندھے بچے کی شکل کا بنایا ہے اور اس کو تیر و کمان سے سجایا ہے۔ وہ چاروں طرف یوں ہی اناپ شناپ، بے نشانہ باندھے، تیر پھینکتا ہے۔ جس میں یہ رمز پائی جاتی ہے کہ معشوق کوئی ارادہ رنج و تکلیف پہنچانے کا نہیں رکھتا، بلکہ حُسن خود دل کو ایسا لبھاتا اور اپنی طرف کھینچتا ہے جیسا کہ خوبصورت بچہ، گو بچے کو یہ خبر نہیں کہ مجھ میں کوئی خوبی ایسی ہے کہ جس کی قیمت ہم نے اپنی فیّاضی سے زیادہ لگا رکھی ہے۔ برخلاف اس کے ہوس کی شکل آدھی بکری کی سی اور آدھی آدمی کی سی بنائی ہے۔ جس میں یہ رمز ہے کہ ہوس ناک آدمی آدھے کام آدمی کے سے اور آدھے کام حیوان کے سے کرتا ہے اور انسان ہو کر حیوان سی شہوت رکھتا ہے، اور اُن راہوں اور بٹیوں[1] میں پڑا پھرتا ہے کہ جہاں گڈرنیاں پریوں کی طرح آتی جاتی ہیں۔ اُن جھیلوں اور ندیوں کی سیر کرتا ہے کہ جہاں حسین پاکیزہ عورتیں[2] آمد و رفت رکھتی ہیں۔ پس اسی طرح ہوس ناک کی شہوت پرستی صاحب عصمتوں کے پیچھے پڑی پھرتی ہے۔ اور ایسی ایک نامعقول بات اس میں ہوتی ہے کہ جب وہ ان کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ بھی اس کی مثل ہو جاتی ہیں۔ عشق تو ایک بچے کی طرح گریہ و زاری کرتا ہے اور اپنی بے کسی ایسی دکھاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدد مانگتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ کس غذا

۱۔ اصل : کذا۔ ''باٹوں'' ہونا چاہیے۔

۲۔ لفظ ''عورتیں'' مرتّب کا اضافہ ہے۔ اس کے بغیر جملہ نامکمل تھا۔

سے میری اشتہا رفع ہوگی - برخلاف اس کے ہوس ایک ہوشیار چور ہے کہ اپنا شکار پکڑتا ہے اور اپنی تشفّی اور تسلّی کے واسطے پھندے لگاتا ہے - وہ چُراتا نہیں بلکہ مار ڈالتا ہے - پس ان دونوں مجسّم تصویروں سے عشق اور ہوس میں اور عاشق اور ہوس ناک میں فرق سمجھ لو کہ کیا ہے -

٦٢- دنیا کی خباثت

دنیا میں ایسی بدنیّتی اور خباثت پھیل رہی ہے کہ نیک آدمیوں کی بدنامی بہ نسبت نیک نامی کے زیادہ شہرت پاتی ہے - ان کی ایک خطا کی مذمّت جتنی ہوتی ہے ، آتنی آن سارے نیک کاموں کی مدح نہیں ہوتی - اس لیے ملامت سے بچنا بہ نسبت تعریف حاصل کرنے کے مشکل ہے - عمر بھر میں آدمی ایک بڑا کام کرے تو تعریف حاصل ہو جائے گی ، مگر مذمّت سے جب بچاؤ ہوگا کہ عمر بھر میں کوئی بُرا یا احمقانہ کام قولاً اور فعلاً نہ کرے -

٦٣- نکتہ چینی

جیسے خوردبین ذرّات ، دانوں اور چھوٹی چیزوں کو خوب صحت سے دیکھ لیتی ہے مگر کُل چیز کے تمام اجزا کی ترکیب ، تناسب اور مناسبت کو وہ نہیں دیکھ سکتی ، پس ایسے ہی نکتہ چیں جزئیات کی غلطیوں اور عیبوں کو خوب دیکھ کر بتاتے ہیں مگر کلیّات کی خوبیوں کو ، نیکیوں کو نہیں دیکھ سکتے ہیں -

٦٤- انسان میں نیکی کے مختلف درجے ہوتے ھیں

ایک حکیم انسان کے تین درجے بہ اعتبار عقل کے یہ مقرر کرتا ہے : اول ، وہ جو اپنے قُوائے عقلیہ سے صحیح و درست و مناسب

امور کو دیکھ سکتے ہیں اور کام کی تہہ پر پہنچ سکتے ہیں ۔ دوم ، وہ جو دوسرے کے سمجھانے سے عیب و صواب کو جان سکتے ہیں ۔ سوم ، وہ جو نہ خود سمجھیں نہ دوسرے کے سمجھانے سے سمجھیں ۔ نہ آپ خود چل سکیں نہ دوسرے کے چلانے سے چلیں ۔ اس قسم کا آدمی بڑا ہی کم بخت اور نکمّا ہوتا ہے ۔

پس اسی طرح نیکی کے اعتبار سے آدمیوں کی تفریق تین طرح ہو سکتی ہے : اول وہ جن کا اعتقاد اور یقین خدا پر ایسا ہے کہ وہ کوئی کام خدا کے حکم کے خلاف کرنا نہیں چاہتے ۔ ان کی ساری خوشی اسی میں ہوتی ہے کہ احکامِ الٰہی کو بجا لائیں ۔ اس کی اطاعت و عبادت کے خلاف کوئی حرکت نہ کریں ۔ دوم ، وہ جو برائی اور بھلائی میں ہم وزن ہیں ۔ اِدھر دنیا میں دولت ، عیش و عشرت سے وہ اپنی ہوائے نفسانی کو پورا کرتے ہیں اور اُدھر عقبیٰ کی سزا و جزا کا بھی خیال رکھتے ہیں ۔ غرض دنیا کے سیانے اور دین کے دیوانے ہوتے ہیں ۔ سوم ، وہ جو بالکل شہواتِ نفسانی میں ڈوبے ہوئے کوئی بھلائی کرنی نہیں چاہتے ۔ اپنے نفس کے بندے ہوتے ہیں ۔ اپنے چین اور آرام سے پرے خیالات کو نہیں لے جاتے ۔

دوسری قسم کے آدمیوں کی ایسی کثرت ہے کہ اگر یہ کہیں کہ ساری دنیا انھی سے بھری ہوئی ہے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا ۔ تیسری قسم کے آدمی کم ہوتے ہیں اور اول قسم کے کمتر ۔ آدمی کی دو حالتیں ہیں ؛ یا تو وہ اس کا یقین کرتا ہے کہ نیکی کرنے سے خوشی ہوتی ہے یا یہ کہ خوش ہونے کے لیے نیکی کرنا لازمی نہیں اس لیے وہ خود اپنی مطلب برآری و خود کامی پر نظر رکھتا ہے اور باقی سب باتوں کو چھوڑ دیتا ہے ۔ یہ بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کا یقین ایک جانب ہو اور اس کا عمل دوسری جانب ہو ،

اور جس شخص نے راہِ مستقیم کو دیکھ لیا ہو وہ اس کو خود آنکھیں بند کر کے چھوڑ دے اور اس میں یہ سمجھے کہ میں آرام پاؤں گا۔ مگر ہر ساعت یہ بیہودہ باتیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ بڑے بڑے عاقل عمدہ آدمی اپنے فرائضِ مسلّمہ سے انحراف کرتے ہیں اور جب ہی تک اچھے بنے رہتے ہیں کہ برے کاموں کی ترغیبیں ان کے سامنے نہیں پیش ہوتیں اور ان کی ہوائے نفسانی کا جوش نہیں ہوتا اور ان کی رائے کسی سبب سے پلٹ نہیں جاتی۔ یہ تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم بعض نیکیاں اختیار کرتے ہیں اور بعض کو چھوڑ دیتے ہیں، اور برے بھلے ایک خاص درجے تک ہوتے ہیں۔ بعض آدمی ظاہر میں غافل اور بدافعال معلوم ہوتے ہیں مگر اندر ان کے ایک مخفی نیکی ہوتی ہے جو تربیت اور تعلیم سے بہت پھیل سکتی ہے۔ ایک چنگاری ان کے دل میں خدا نے دبا دی ہے کہ گو وہ چھپی ہوئی ہے مگر بجھی ہوئی نہیں۔ وہ پند و نصائح اور صلاح و مشورہ کے پھونکنے سے روشن ہو سکتی ہے۔ یہی حال نیک آدمیوں کا ہے کہ خواہ وہ کیسے ہی سب طرح سے اچھے معلوم ہوتے ہوں مگر پھر بھی ان میں کوئی مخفی برائی ہوتی ہے۔ غرض انسان کو نہ بدی میں نہ نیکی میں کمال حاصل ہو سکتا ہے۔ بعض خالص نیکیاں مشابہ بدیوں کے اور بعض بدیاں مشابہ نیکیوں کے ہوا کرتی ہیں، اس لیے آدمی جو ظاہری حال پر ہمیشہ فیصلہ کیا کرتا ہے، اس کو چاہیے کہ وہ جلدی سے ایسا نتیجہ نہ نکالا کرے کہ جس سے نیکی برباد گناہ لازم ہو جائے۔

ہر شخص خواہ کسی رتبے کا ہو؛ وہ یہ چاہا کرتا ہے کہ اس کے لوگ مقلّد ہوں یا وہ اپنے مقلّد بنانے میں کوشش کیا کرتا ہے۔ ایسے آدمی کو لازم ہے کہ آپ خود ایک اچھا نمونہ بنے اور خود گناہوں اور جرموں کے کرنے سے پرہیز ہی نہ کرے بلکہ ان کی

ظاہری صورت سے بھی بھاگے ، اور ایسے کام نہ کرے کہ جسے دیکھ کر لوگ گمراہ ہوں - اور نیکی ہی فقط نہ کرے بلکہ اس کے ساتھ نیکی کی تعریف اور حمایت کرے -

۶۵- کسی شخص کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ میری زندگی تھوڑی ہے

جن آدمیوں کو غور و خوض کی عادت نہیں ہوتی وہ حکیمانہ رائیں اور مقولے سن کر ان کو بار بار زبان پر لایا کرتے ہیں ، اور جانتے ہیں کہ ان میں کوئی بڑا فائدہ کام کرنے کا رکھا گیا ہے - اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ کچھ ان کو خود تو علم ہوتا نہیں ، وہ ان حکیمانہ باتوں کے دہرانے میں اپنی عزت جانتے ہیں - ان کی روح ایک نے اور ساز ہے کہ جس میں سے آوازیں نکلتی ہیں مگر وہ سمجھتے نہیں - وہ الفاظ کہتے ہیں مگر ان کے معانی پر خیال نہیں کرتے - منجملہ ان مقولوں کے یہ ایک مقولہ ہے کہ زندگی بہت تھوڑی ہے - اس بات کو سننے والے بڑی توجہ سے سنتے ہیں لیکن اس کا اثر دل پر کچھ نہیں ہوتا - اور جب تک آدمی مرتا نہیں ، اس کو یقین نہیں ہوتا کہ زندگی بہت تھوڑی ہے - جتنا آدمی بوڑھا ہوتا جاتا ہے ، اپنے طولِ امل کو بڑھاتا جاتا ہے - پس اگر زندگی کے تھوڑے ہونے کا یقین ہو تو چاہیے کہ جتنی زندگی گھٹتی جائے اتنا ہی وہ بڑے بڑے منصوبوں کے باندھنے میں کمی کرتا جائے - مگر وہ اس کے خلاف کام کرتا ہے - وہ ایسے منصوبے بڑے بڑے باندھتا ہے کہ جن کے ختم ہونے کے واسطے ایک مدتِ دراز کی ضرورت ہوتی ہے - امید میں جو خوشی ہوتی ہے وہ اس کے حاصل ہونے میں نہیں ہوتی اس لیے بوڑھے آدمیوں کو اپنے طولِ امل میں بڑی مسرت ہوتی ہے - وہ باغ

لگاتے ہیں جس کے درختوں کے سایے میں پھرنے سے خوش ہوتے ہیں اور پھل کھانے کی اُمید سے اور زیادہ مسرور ہوتے ہیں ۔

بعض حکما کا مذہب یہ ہے کہ جو وقت موجود ہے اس کے لیے خوشی کا سامان مہیّا رکھنا چاہیے ۔ آیندہ زمانے کی خبر کس کو ہے ۔ گل کی خوشبو کا گھنٹہ بہت جلد گزر جاتا ہے اور اس کی جگہ کانٹا رہ جاتا ہے ۔ پس آدمی جیسا کہ وہ اپنے عیش و آرام کے واسطے زمانۂ حال ہی کو جانتا ہے ، ایسا ہی وہ نیک کام کرنے کے لیے فقط زمانۂ حال ہی کو سمجھے ۔ اگر ایک شخص ایک ہزار روپیہ خیرِ جاری کے لیے جمع کرے تو فوراً دے دے ، وقت کا انتظار نہ کرے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس انتظار میں موت آ جائے اور یہ نیک کام رہ جائے ۔ نیک آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے فنا ہونے کا خیال ہمیشہ پیشِ نظر رکھے ۔ یہ جانے کہ جو نیک کام مجھے کرنا چاہیے وہ آج ہی کر لوں ، معلوم نہیں کل جیوں یا نہ جیوں ۔

جو لوگ غافل پڑے سوتے ہیں ، وہ بُری طرح محنت کرتے ہیں ۔ وہ اس بات کو بالکل بھولے ہوئے ہیں کہ زندگی تھوڑی ہے ۔ نکمّے پڑے ہوئے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ابھی بہت وقت کاہلی کی مکافات کے لیے پڑا ہوا ہے ۔ بعض آدمی زندگی کو تھوڑا سمجھ کر تھوڑی مدت میں سب کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ موت ان دونوں کا انجام ایک سا کر دیتی ہے ۔ ان میں ایسا فرق ہوتا ہے کہ ایک جانور اُڑ رہا ہو اس کے گولی لگ جائے اور دوسرا جھاڑی میں بیٹھا ہوا مارا جائے ۔

اس زمانے میں جہاں علم و ہنر کی ترقی ہوئی ہے وہاں عمر کی قیمت کا پورا پورا صحیح حساب کیا گیا ہے جس کے موافق جان کے بیمے ہوتے ہیں اور لاکھوں روپے کمائے جاتے ہیں ۔ غرض یہ

حساب تجارت کے لیے ہے ، کچھ اخلاق کے واسطے نہیں - وہ دولت حاصل کرنے کے واسطے درست ہے مگر دانائی کے لیے نہیں - انسان کے دل میں اس مغالطے نے جگہ پکڑ لی ہے کہ زبان سے تو یہ کہتا ہے کہ زندگی تھوڑی ہے ، اس کا بھروسا کیا ہے ، دم آیا یا نہ آیا ، مگر کام اس طرح کرتا ہے جیسے اس کو یقین ہے کہ وہ کبھی مرنے کا نہیں - اس مغالطے کو نہ علم ، نہ تجربہ دور کر سکتا ہے - خوف و رجا اس کی تائید کرتے ہیں -

٦٦- فاضلوں کی حقارت جب ھی اکثر ھوتی ھے کہ وہ اس کے مستحق ھوتے ھیں

جو آدمی اپنی لیاقتِ علمی اور استعدادِ عقلی کی نسبت ایسی اپنی رائے رکھتے ہیں کہ اُس سے دولت یا عزت و سرافرازی پیدا ہو ، وہ ہر زمانے میں اپنے مصائب بیان کرتے آئے ہیں کہ ان کو زمانے کی جہالت و وحشت و جھوٹے مذاق سے اُٹھانے پڑتے ہیں[1] - اور اہلِ زمانہ کی نااحسان مندی کی شکایت و سعایت[2] کرتے چلے آئے ہیں - اور کہتے ہیں کہ انسان کی جبلّت میں داخل ہے کہ وہ اپنے ہادی اور منعم کے ساتھ کافر نعمتی کرتا ہے - وہ غصّے و طیش میں بھر کر جہاں تک ان سے ہو سکا ، انھوں نے اپنی قوم کو ، اپنے ملک کو گالیاں دیں - اکثر ان کا غرور اس بدگوئی کا سبب ہوتا ہے - خواہ زمانے نے کیسی ہی ان کی خاطر داری اور آؤ بھگت کی ہو مگر انھوں نے اسے اپنے درجے سے کم ہی جانا اور اَور لوگوں کو

۱- اصل : اُٹھانی پڑتی ہے -

۲- سعایت = چغل خوری ، بدگوئی ، کسی کی عدم موجودگی میں اُس کی برائی کرنا ، غیبت -

بھی کہا کہ وہ ہماری علمی لیاقتوں پر حسد کرتے ہیں - مگر انصاف کا یہ سچا اور صحیح قاعدہ چلا آتا ہے کہ آدمی کی بات کا اُس کے اپنے معاملات میں یقین نہیں کیا جاتا - پس ان فاضلوں اور عالموں نے جو اپنی ذات کی کم قدری کے سبب سے زمانے کی سعایت و شکایت کی وہ قابلِ تسلیم نہیں -

زمانے کی ناقدری کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ بہت ہی تھوڑے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ جن احکام کی تعمیل وہ اَوروں پر فرض بتائیں اُن میں وہ خود پورے اُتریں - اس لیے ہم کو تعجب کرنا نہیں چاہیے کہ آدمی اپنا غصّہ اُن عالموں پر زیادہ تر ظاہر کریں جو جان بوجھ کر احکام کی تعمیل میں قصور کریں - چونکہ کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا کہ اس میں عمل کرنے کی قوّت، خیال کرنے کی قوت کے برابر ہو اس لیے جو فقط سوچنے والے آدمی ہوتے ہیں اور کتابی علم رکھتے ہیں، ان کی مذمّت بہ نسبت اَور آدمیوں کے زیادہ کی جاتی ہے، کیونکہ لوگوں کو ان سے نیک کاموں کی زیادہ توقع ہوتی ہے -

اگر ان عالموں کی تصنیفات ایسی ہیں کہ جن سے اہوائے نفسانی کم ہوتی ہیں، شہواتِ جسمانی مغلوب ہوتی ہیں تو وہ بے شک بہت آدمیوں کے لیے مفید ہوتی ہیں، گو مصنّف کا خود چال چلن اُن کے قاعدوں کے موافق نہ ہو - ان کی تصنیفات کا اثر اُن ضلعوں میں شائع ہوگا جہاں کے لوگ یہ نہیں پوچھیں گے کہ مصنّف نیک تھا یا بد - اُس زمانے میں وہ اپنا اثر دکھائیں گی جس میں مصنف کی تمام بے وقوفیاں اور خطائیں دنیا بھول گئی ہوگی - اور ہزاروں اور لاکھوں دلوں میں وہ شعلہ روشن کریں گی جو مصنّف کے خود سینے میں بہ سبب عفونتِ جذبات اور رطوبتِ جُبن کے دھندلا چمکتا تھا - برخلاف اس کے جو بڑے بداخلاق کے مصنّف ہیں اُن کا حال اُس

شمع کا سا ہے کہ پیچ دار ہوائے نفسانی کی بھول بھلیوں میں روشن کی جائے - وہ اپنی روشنی بہ نسبت حرارت کے زیادہ پھیلاتی ہے اور اُنھی کو راہ دکھلاتی ہے جو اس کے سامنے ہوں اور اُن کو جلاتی ہے جو اس کے نہایت قریب ہوں - پس ایسے مصنّف جن کے خیالات سے آدمیوں کی اصلاح ایسی نہ ہو جیسی ان کے اعمال سے برائی ہو تو وہ کب تعظیم و تکریم کے مستحق ہو سکتے ہیں - کسی کی تعریف جو تعجب کے ساتھ ہوتی ہے، وہاں ہوتی ہے جہاں واقفیت نہیں ہوتی - اس کے دوست دور ہوتے ہیں مگر دشمن پاس ہوتے ہیں -

زمانے کے ظلم اور حماقت کی شکایت تو جب بجا ہوتی کہ وہ اپنی تصنیف سے دانائی اور نیکی پھیلانے میں کوشش کرتے - وہ خود اوباش تھے، ان کی تصنیفات رندانہ تھی، اس نے خلائق کے دلوں کے لیے گمراہی اور تباہی کی راہ کو ہموار کیا - اس میں خطاؤں کے خاروں کو پھول بنا کر لگایا - بری ترغیبوں کے راگ دل لبھانے والے بنائے - حیا کو گھٹایا اور بے شرمی کو بڑھایا -

ایسے مصنّف تو بدمست شرابیوں اور اوباشوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں، اس لیے کہ ان کی بدکاریوں کا اثر اتنی وسعت میں نہیں پھیلتا جتنا کہ ان مصنّفوں کی تصنیف کا - وہ تو زہر کا پیالہ پی کر اپنے ہی اوپر اثر کرتے ہیں مگر یہ تصنیفات وبا کی طرح ہزاروں کو قتل کرتی ہیں - پس جو برے مصنّف ہیں وہ اور برے آدمیوں سے بھی زیادہ برے ہیں - ہر طرح تحقیر کے قابل ہیں -

٦٧- کاہلی

بہت سے رسالے اطبّا اور حکما نے لکھے ہیں جن میں انھوں نے ہر پیشہ و حرفہ و کام سے جو بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، بیان کی ہیں -

مثلاً کیمپ ، سمندر ، کان میں رہنے سے جو امراض پیدا ہوتے ہیں اُن کو لکھا ہے ۔ وہ سب بالاتفاق یہ کہتے ہیں کہ پیشہ و کام خواہ کیسا ہی خطرناک ہو اور صحت کے لیے مضر ہو مگر اس میں بھی کاہلی سے زیادہ خوشی و تندرستی ہوتی ہے ۔ انسان کے جسم کی بناوٹ کو دیکھو تو اس کے لیے کام کی ضرورت معلوم ہوتی ہے ۔ قطع نظر اس سے تمام دنیا کا تجربہ دیکھو کہ جو لوگ امیر ، دولت مند ، فارغ البال ہیں اور ان کو روپیہ کمانے کے واسطے محنت کی ضرورت نہیں ہے ، انھوں نے بھی سیر و شکار اور اَور شغل ایسے نکال لیے ہیں کہ جن میں ویسی ہی محنت کرنی پڑتی ہے جیسی کہ مزدوروں کو ؛ گو اس میں محنت کی ایسی مجبوری نہ ہو جیسی کہ کاشت کار اور بیلدار کو ۔ شکار کے لیے وہ صبح اُٹھتے ہیں ۔ اس کی تلاش میں وہ پڑے پھرتے ہیں ۔ سب طرح کی وہ جوکھوں اُٹھاتے ہیں ۔ دریاؤں کے پار جاتے ہیں ، پہاڑیوں پر چڑھتے ہیں ، جنگلوں میں پھرتے ہیں ۔ کبھی زخمی ہو جاتے ہیں ، کبھی جھاڑیوں ، کانٹوں سے کپڑے پھٹ جاتے ہیں ۔ اور کوئی ان کی گرم جوشی کا تحریک کرنے والا اور کوئی سپہ سالار ان پر حکم چلانے والا نہیں ہوتا کہ جس کی عدول حکمی اور کسی سزا کا خوف ان کو ہو ۔ نہ ان کو کسی عزت اور صلے کی اُمید ہوتی ہے ۔ باوجود ان سب باتوں کے وہ اپنے ہمراہیوں اور اپنی رعیّت کی اس تعریف سے کہ خوب شکار کھیلا ، خوش ہوتے ہیں ۔

غرض انسان کی جسمانی ترکیب کا مقتضا محنت کرنا ہے ۔ محنت خود اپنا آپ انعام ہے ۔ اس کے لیے کسی اور ترغیب کی ضرورت نہیں ۔ اسی سے بہت خوشی حاصل ہوتی ہے اور اسی سے مصیبت اور آفت سے بچاؤ ہوتا ہے ۔

آدمی اپنی بے حس و حرکت زندگی سے آرام چاہتا ہے مگر آرام تو خوشی اور رنج کی درمیانی حالت کا نام ہے - جو شخص اپنے رگ پٹھوں کو سخت بناتا ہے اور اپنے اعضا کو حرکت دیتا رہتا ہے اور سردی اور گرمی کے سامنے جسم کو لاکھ آون کی برداشت کی عادت ڈالتا ہے ، اسی کے واسطے اہتزازِ روحانی و قوّتِ جسمانی ، مہمات عظیم کے واسطے مستعدی ہے - جس آرام سے خوشی نہیں حاصل ہوتی وہ آخر کو دکھ ہو جاتا ہے - جب آدمی اپنے اعضا کو حرکت نہ دے گا تو وہ مست ہو جائیں گے اور دکھ درد پیدا کریں گے - زندگی کے واسطے غذا اور محنت میں ہمیشہ ایک نسبت ہوتی ہے - غذائے بدل ما یتحلّل[1] ہونی چاہیے - وہ کاہلی سے ہوتی نہیں - اگر کاہل آدمیوں کی عمر بھی دراز ہوتی ہے تو بڑی مصیبت سے کٹتی ہے -

گو ورزشِ جسمانی ہم کو موت سے تو نہیں بچا سکتی مگر جب تک جسم وروح میں صحبت ہے وہ اس کو خوش رکھتی ہے - اور یہ غالباً ان میں جدائی بھی آسانی سے کرا دے گی - متقدّمین کا یہ مقولہ تھا کہ امراضِ شدید تو آسمان کی طرف سے آتے ہیں اور امراضِ مُزمنہ ہم خود پیدا کرتے ہیں - موت کا تیر تو آسمان کی طرف سے لگتا ہے لیکن زہر میں ہم اس کو اپنی بدچلنی سے بُجھاتے ہیں - مرنا تو انسان کی قسمت میں ہے مگر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا اس کی بے وقوفی ہے -

اس دنیا میں ہماری تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ جسم و روح دونوں کام کرتے رہیں - دونوں کے قُوا میں سے کوئی ایک بھی کاہل نہیں رہنا چاہیے اور ان سے کام لینا چاہیے - نہ جہالت کی اطاعت سے صحت مول لینی چاہیے ، نہ صحت کو خرچ کر کے علم کو خریدنا

۱- غذائے بدل ما یتحلّل = یعنی ایسی متنوع غذا جو ہضم ہو سکے -

چاہیے - طلبہ کو اس پر فخر و ناز ہوتا ہے کہ ہم کو علمی خوشی کافی ہے - یہ اُن کی غلطی ہے کہ وہ اور کھیل تماشوں کو کہ جن سے جسم کو تر و تازگی اور روح کو مسرّت حاصل ہوتی ہے، ناپسند کرتے ہیں - یہ ان کی بے ہنری ہے کہ وہ گیند کو ہاتھ نہ لگائیں اور گرنے کے خوف سے دوڑیں نہیں - جو ایسے خوف رکھتے ہیں، وہ ضرور ذلیل ہوتے ہیں -

جو عالم فاضل اپنے تئیں مطالعے کی محنت سے تھکاتے ہیں اور ورزشِ جسمانی سے گریز کرتے ہیں، وہ خود اپنے تئیں کاہل اور مریض بناتے ہیں - اسی لیے تعلیم میں ریاضتِ جسمانی داخل کی جاتی ہے کہ جب آدمی روحانی محنت سے تھک جائے تو جسمانی محنت میں مصروف ہو کر روح کو آرام پہنچائے - مہذّب ملکوں میں اس لیے عورتوں کے واسطے تعلیم کے اندر یہ بات مقرر کی گئی ہے کہ خواہ کسی درجے اور رتبے کی عورتیں ہوں، وہ ضرور کوئی لیاقت کا کام سیکھیں کہ جس میں ان کی ورزشِ جسمانی ہو - حکیموں کا ایک پرانا مقولہ ہے کہ خلا محال ہے[1] - پس اس کے موافق دل خالی نہیں رہتا بلکہ وہ کاہلی کی حالت میں بڑی شرارت کے منصوبے باندھتا ہے - ہر ایک آدمی جانتا ہے کہ جب وہ خالی ہوتا ہے تو کیا کیا خیالاتِ پریشان اور وحشیانہ آرزوئیں اور تصوّراتِ باطل پیدا ہوتے ہیں - اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ دونوں ــ جسم و جان ــ کو کام میں مصروف رکھے اور کبھی کاہل نہ ہونے دے -

٦٧- کمال بغیر محنت کے نہیں حاصل ہوتا

۱- ہم مخلوقات میں دیکھتے ہیں کہ جو خلقت زیادہ پائدار و

۱- قدیم حکمائے فلسفہ کا یہ مقولہ یا قاعدۂ کلیہ اب غلط ثابت ہو چکا ہے -

استوار اور دیرپا ہوتی ہے وہ بہت سہج سہج بڑھ کر مدتوں میں بالغ و پختہ ہوتی ہے - جو اچھی مضبوط لکڑیاں ہوتی ہیں اُن کے درخت بہت دیر کر کے بڑھتے ہیں - اور جانور جو بڑی عمر کے ہوتے ہیں، وہ اپنی ماں کے پیٹ میں بہت دنوں رہتے ہیں - پس یہی حال انسان کے دل اور دماغ کی اولاد کا ہے - جو انشا پرداز اپنے مضامین کے لکھنے میں جلدی کرتے ہیں، وہ اپنی رنگینی کے سبب سے پھولوں کی بہار دکھاتے ہیں اور التفات کی نظروں سے دھوپ کی طرح روشنی چمکاتے ہیں، مگر موسم کے بدلنے کے بعد تھوڑے دنوں میں نہ یہ بہار قائم رہتی ہے، نہ چمک - اول ہی نکتہ چینی کے جھونکے میں پژمردہ ہو جاتے[1] ہیں اور بے التفاتی کا پالا اُن کو مار جاتا ہے - پھر نہ کوئی ان کو پڑھتا ہے اور نہ دیکھتا ہے - جب ایک مصنّف پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ تم برسوں تک اپنی تصنیفات پر سینکڑوں دفعہ نظر ثانی کرتے ہو اور پھر اس کے بعد ایک چھوٹی سی کتاب نکالتے ہو تو اُس نے یہ مختصر جواب دیا کہ میں ایک ایسی تصویر بناتا ہوں جو ہمیشہ قائم رہے -

غرض جو انشاپرداز محنت نہیں کرتے اور نامور ہونے کے لیے عجلت کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے ہم جنسوں میں جواب نہیں رکھتے تو وہ کیسے خیال کر سکتے ہیں کہ ان کے کلام پر، جو بےساختہ ان کے منہ سے نکل گیا ہے، لوگ[2] توجہ اور التفات کریں گے اور آئندہ زمانے میں وہ یادگارِ روزگار رہے گا - یہ سچ ہے کہ بعض آدمیوں کو خداداد استعداد ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنی ادنٰی توجہ سے جو تصنیفات کرتے ہیں، وہ اس رتبے اور شان

۱- اصل : ہو جاتی ہے - ۱- اصل : اس پر لوگ -

کی ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا[1] اس کو برسوں کی محنت اور جانفشانی اور غور و مطالعہ کے بعد بھی نہیں کر سکتا - ان کا حال تو اُس قطعۂ زمین کا سا ہوتا ہے کہ جس میں خود رَو پیداوار کی وہ طاقت ہو کہ کسی دوسری زمین میں محنت و تردّد و آب پاشی کے بعد بھی نہ ہو - مگر ایسے آدمی شاذ و نادر ہوتے ہیں - بہت سے جھوٹے[2] مدّعی ان کی قائم مقامی کا دعویٰ کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہم بے محنت و مشقّت کے نامور ہو جائیں گے - ان کا حال ایسے کسان کا سا ہے کہ جو اپنی[3] زمین کو یہ سمجھے کہ وہ بغیر بوئے جوتے ایسے پھل پھول پیدا کرے گی جو دنیا میں بے نظیر ہوں گے -

زمانے میں علم کے اندر بزرگی اس وجہ سے بھی حاصل ہو جاتی ہے کہ اس میں علم کم ہو - پس تھوڑے علم کا عالم بھی وہاں بے نظیر ہوتا ہے - کوئی اس کی برابر نہیں ہوتا - جہاں روکھ نہیں وہاں ارنڈ ہی برکھش ہے - پس وہ اپنے تئیں بے نظیر سمجھ کر صاحبِ کمال جانتے ہیں اور اس پر خوب اُپھرتے ہیں - یہ نہیں جانتے کہ صاحبِ کمال ہونا اَور بات ہے اور جاہلوں اور نالائقوں میں علم کی وجہ سے ممتاز ہونا اَور بات ہے - ان کے ذہن میں کمال کا مفہوم صحیح نہیں ہوتا - جو صاحبِ کمال کمال کے معنی جانتا ہے وہ اپنے تئیں ناقص سمجھتا ہے - جب وہ اپنی تصنیفات کو کمال کے معیار پر کستا ہے تو اس میں نقص پاتا ہے - ایک شاعرِ بے مثال نے کہا ہے[4] کہ میرے شعر سب کو کامل معلوم ہوتے ہیں مگر مجھے ناقص - ایک اور شاعر ، جس کی برابر دنیا میں تھوڑے ہی شاعر گزرے ہیں ، مرتے وقت کہتا تھا کہ یہ حسرت میں اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں کہ

۱- اصل : کوئی دوسرا اور -
۲- اصل : جھوٹی مدّعی -
۳- اصل : اپنے زمین -
۴- "ہے" اضافۂ مرتّب -

میں نے ہزار اپنی جان ماری مگر کبھی ایک شعر کامل نہ کہا گیا - ایک مصوّر بھی ، جو اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا ، مرتے وقت یہ افسوس کرتا تھا کہ ساری عمر میں ایک دائرہ بھی کامل نہ کھینچ سکا -

غرض پہلے زمانے میں جیسے علم و ادب میں صاحبِ کمال گزرے ہیں ویسے پچھلے زمانے میں نہیں ہوئے - اس کا سبب کچھ تو یہ تھا کہ انھوں نے صحیفۂ فطرت کے پڑھنے میں ایسی کوشش اور محنت کی کہ کوئی بات سوائے اس کے متاخّرین کے لیے چھوڑی نہیں کہ وہ اُنھی کی نقل بُری بھلی کیا کریں - ہمیشہ وہ ایک علم کی طرف توجہ کرتے تھے اور اسی کے اسرار جاننے میں محنتِ شاقّہ اُٹھاتے تھے - اگر شاعر بننا چاہتے تھے تو نثر سے ہاتھ اُٹھاتے تھے اور اگر نثر میں کمال پیدا کرنا چاہتے تھے تو شعر نہیں کہتے تھے - اس لیے پہلے زمانے میں بہت ہی تھوڑے ایسے انشاپرداز گزرے ہیں کہ جن کو نظم و نثر دونوں میں کمال حاصل ہو - بلکہ نظم میں بھی وہ ایک قسم کی شاعری پر توجہ کرتے تھے - اِس زمانے کی طرح پہلے زمانے میں ہفتہ وار اور ماہوار اور روزانہ اخبار نہ نکلتے تھے کہ جھٹ پٹ ان کی تصنیفات شائع ہو جاتی - اس لیے برسوں وہ ان کے گھر میں پڑی رہتی اور اس کی اصلاح کا موقع ان باتوں سے ہاتھ لگتا - دشمنوں اور دوستوں کی رائے سے نئی نئی معلومات اور خیالات معلوم ہوتے - جب ذہن محنت سے آرام پاتا ہے تو ازسرِ نو پھر اس میں تازگی اور توانائی خیالات کرنے کی پیدا ہو جاتی ہے - فرصت اور فراغت میں خود سوچنے سے خیالات کی درستی ہو جاتی ہے - غرض ان کی تصنیفات برسوں کی محنت و مشقّت کا نتیجہ ہوتا تھا - پس جو لوگ کمال حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنی تصنیفات

کو کامل بنانا ، تو ان کو چاہیے کہ وہ برسوں محنت کیا کریں اور طرح طرح سے اپنی تصنیفات کی جانچ پڑتال کیا کریں - یہ خبط خیال میں نہ جما لیا کریں کہ جو بات ہم کو رات کو سوجھتی ہے اور دن کو ہم اسے شائع کرتے ہیں وہ صحیح اور درست ہی ہوتی ہے - اس طرح ان کے خیالات بہت تاریک شائع ہوں گے اور جلد لوگوں کی نظروں سے تصنیفات گر جائے گی - فقط ان کے دس پانچ دوست ہی ان کی تصنیف کی تعریف کچھ دنوں تک کریں گے - ان کی زندگی ہی میں ان کی تصنیفات مردہ ہو جائیں گی -

کمال حاصل کرنا بڑی محنت اور جاں کاہی کا کام ہے - برسوں کی محنت و مشقّت سے بھی حاصل ہو جائے تو بہت غنیمت ہے - کمال حاصل کرنے میں بہت سہج سہج وقت اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا ہے - جو پھول پتّے سائے میں خشک ہوتے ہیں وہ بہت دنوں تک اپنے رنگ اور سرسبزی کو قائم رکھتے ہیں ، اور جو دھوپ اور آگ کے سامنے آتے ہیں وہ جلد جھلس جاتے ہیں - پس اِسی طرح جن ذہانتوں کی تعلیم فرصت میں ہوتی ہے وہ زیادہ دیرپا ہوتی ہیں - وہ دفعۃً کی سختی اور زبردستی سے پختہ نہیں ہوتیں بلکہ وقت اور استقلال سے -

۲- ایسے شخص کو کمال حاصل ہو سکتا ہے جو بے ریا دوست اور سخت دشمن رکھتا ہے - اس لیے کہ دوستوں کی نصیحت سے وہ اپنی خوبیوں پر اور دشمنوں کی فضیحت سے اپنے عیبوں پر آگاہ ہوگا -

۳- ہر چیز کے اندر کامل ہونے میں لوگ قصد کرتے ہیں مگر اکثر چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں کبھی کمال حاصل ہو ہی نہیں سکتا - جو کمال حاصل کرنے کا قصد کرتے ہیں اور اس میں بڑی محنت و جانکاہی کرتے ہیں ، وہ کمال کے نزدیک بہ نسبت اُن لوگوں

کے پہنچ جاتے ہیں جو اپنی کاہلی اور مایوسی کے سبب سے کمال کا خیال اِس وجہ سے چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم اس تک پہنچنے کے نہیں۔

۴۔ اگر تم وہ کمال حاصل کرنا چاہتے ہو جو تم میں نہیں ہے تو کبھی حالتِ موجودہ پر راضی نہ ہو۔ اس لیے کہ[1] جس حالت سے تم اپنی خوش ہو جاؤ گے، وہیں ٹھہر جاؤ گے۔ جہاں تم نے کہا کہ مجھے کافی کمال حاصل ہو گیا، وہیں سے زوال شروع ہو جائے گا۔ "ہر کمالے را زوالے" کے معنی یہی ہیں کہ جہاں آدمی نے یہ سمجھا کہ میں کامل ہو گیا، وہیں زوال شروع ہوا۔ ہمیشہ کچھ زیادہ کرو، ہمیشہ آگے بڑھو۔ ایک جگہ نہ کھڑے رہو۔ نہ اُلٹے جاؤ، نہ بھکو۔

۵۔ ہنر کو کمال قدرشناسی سے ہوتا ہے۔ "قدرِ مرد است بعلم و قدرِ علم بکمال[2]"۔ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا میں جن سلاطین اور اُمرا نے علم و ہنر کی قدر شناسی کی، وہ زمانہ مخزنِ کمالات بن گیا۔ ہندوستان میں شہنشاہ اکبر کی قدر شناسی کے سبب سے اہلِ کمال کا جمگھٹ اس کے دربار میں لگا رہتا تھا۔ جن علموں اور ہنروں کی یہاں قدر شناسی ہوتی رہی، اُن کے جاننے والے با کمال ہوتے رہے۔ جب قدر شناسی نیست ہو گئی تو وہ علم و ہنر بھی مٹ گئے۔

یورپ میں فقط سلاطین کی قدر شناسی سے کمال کو ترقی نہیں ہوئی بلکہ عوام و جمہور کی قدر شناسی سے۔ یہ عوام بادشاہ سے بھی زیادہ قدر شناسی کر کے علم و ہنر سے ملک کو گلستانِ پُر بہار

۱۔ "کہ" اضافۂ مرتب۔

۲۔ یعنی آدمی کی قدر علم سے ہوتی ہے اور علم کی قدر اس کے کامل ہونے سے۔

بناتے ہیں۔ اِدھر ایک کام کو کسی نے بزورِ طبیعت ایجاد کیا، اُدھر عوام نے اس کا انعام دیا، جس سے مُوجد کو تقویت ہوئی اور ایجاد کو کمال ہوا۔ سلسلۂ فطرت میں ہر چیز کا کمال اس کی انتہا پر منحصر ہے۔ ابتدا میں کوئی ایسا ایجاد، موجد نہیں کرتا کہ اس میں کوئی اصلاح نہ ہو سکے یا اُس میں ترمیم اور تکمیل کا موقع نہ ملے۔ ہمارے ملک میں جب کوئی ہندو یا[1] مسلمان ایجاد کرتا ہے تو اس کی ابتدائی حالت کو انتہا کا سمجھ کر اُس پر اپنی کم فہمی سے پست فطرت اعتراض کرتے ہیں اور جہاں تک ہو سکتا ہے، مُوجد کی دل شکنی کرتے ہیں۔ اسی سبب سے ہمارے اہلِ وطن بے ہنری کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وہ کبھی اس بات کی فکر نہیں کرتے کہ اپنی قوم کو کسی تدبیر سے علم و ہنر کا لباس پہنائیں اور ترقیِ کسبِ کمال سے آراستہ کریں، اور کمالات کی سچّی قدر شناسی کر کے لوگوں کے دلوں میں اس کی عزّت بٹھلائیں۔ بلکہ بجائے اُس کے اُن کی جانب سے وہی ناقص قدردانی ظہور میں آتی ہے کہ مُوجد پر ہمیشہ طعن و تشنیع کے واسطے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ[2] ان کی قوم کی ناموری ہو، اپنی ناموری کا خیال اس کی بدنامی سے چاہتے ہیں۔ موجد کو بجائے سچّا صلہ دینے کے تکلیف اور ایذا کا صلہ دیتے ہیں، جس سے وہ بجائے حوصلہ بلند کرنے کے حوصلہ پست کرتا ہے۔ ان کو ذرا بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ اپنی قوم کی ذلّت عین اپنی ذلّت ہے اور اس کی بے ہنری اور بے علمی اپنی بدنامی ہے۔ ہنر کی ترقی اور کمال کا عروج ہمیشہ اس بات پر موقوف ہے کہ زمانے کے لوگ، خواہ سربرآوردہ خواہ عوام، اس کی قدر کریں اور اہلِ کمال کی توقیر اور عزّت اور

۱۔ ''یا'' اضافۂ مرتّب۔ ۲۔ ''کہ'' اضافۂ مرتّب۔

سلوک میں بہ دل ساعی ہوں - اس ملک میں یہ سمجھ ہی نہیں کہ اہلِ کمال کی قدر و منزلت سے کیا نتیجہ ہے اور ملک کو اس سے کیا فائدہ ہے - وہ یہ سمجھتے ہی[1] نہیں ہیں کہ کون سا کمال کس قدر و منزلت کے لائق ہے - اس قسم کا مذاق ہی جاتا رہا ہے - وہ اہلِ یورپ کو دیکھیں کہ ان کی قدردانی اور جوہر شناسیِ علم و ہنر نے ان کے ملکوں کو دنیا کے پردے پر بے نظیر بنا رکھا ہے - علم و فضل کے روبرو روپے کی بے انتہا مقدار کو ذلیل و خوار سمجھتے ہیں -

۶۸- دفعۃً دولت ملنے سے آدمی پر کیا اثر ہوتا ہے

یہ ایک بڑا پرانا تجربہ چلا آتا ہے کہ آدمی کی جیسی دولت مندی بدلتی ہے، ویسی ہی اس کی حالت بدلتی ہے اور اس کے رنگ ڈھنگ، اوضاع و اطوار متغیّر ہوتے ہیں - اگرچہ یہ ٹھیک بتلانا نہایت مشکل ہے کہ کسی غریب آدمی کو دفعۃً دولت و حکومت ہاتھ لگ جائے تو اس کی کیا حالت ہوگی مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ بہت ہی کم آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ جو دفعۃً دولت اور حکومت پائیں اور ان کے اخلاق بہتر ہو جائیں - جب گلستانِ دل پر دولت کا آفتاب چمکتا ہے تو حماقت کے کاموں کے درخت خوب پُھولتے پھلتے ہیں - مگر نیکی کی کلیاں کِھلنے نہیں پاتیں کہ مرجھا کر گر جاتی ہیں - یہ رائے نو دولتوں کے باب میں اس قدر مشاہدوں کے بعد قائم ہوئی ہے کہ اس کے برخلاف مشاہدے ایسے کبھی نہیں ہوں گے کہ وہ اس کو منقطع کر کے برباد کر دیں - بہت سے آدمی ہر حالت میں خراب ہوتے ہیں - ان کی اعلیٰ اور ادنیٰ حالت میں

۱- اصل : وہ یہ سمجھتے نہیں - "ہی" اضافہ مرتّب -

جو فرق ہوتا ہے ، وہ یہ ہے کہ اعلیٰ حالت میں وہ اپنی خواہشوں کو زیادہ پورا کر سکتے ہیں اور ادنیٰ حالت میں کم ، یا آدمیوں کی مذمّت کے خوف سے زیادہ رک سکتے ہیں ۔ بہت سے آدمی دولت پا کر اپنے سچّے قواعدِ اخلاق کو بگاڑ دیتے ہیں ۔ اور تعجّب یہ ہے کہ مکر اور جبر سے جو دولت حاصل کرتے ہیں ، اُس کو ظلم اور فضولی میں کھو دیتے ہیں ۔ مگر یہ بھی یاد رکھو کہ گو ظاہری فائدوں کے سبب سے انسان کے دل کا قصور وار ہونا اکثر یہ ہوتا ہے مگر وہ ایسا کلیتہً نہیں ہوتا جیسے بعض آدمی بُغض اور کینے کے سبب سے یا تقریر کے جوش میں اُن کو بُرے لفظوں میں بیان کرتے ہیں ۔ جو نو دولت اپنے ہمسروں میں زیادہ سرافراز ہوتا ہے ، اس کی دولت و ثروت پر حسد کی نگاہ زیادہ تر پڑتی ہے ۔ اُس بے چارے نو دولت کا بہت جلد فائدوں کا حاصل کر لینا اُن لوگوں کی نسبت جو اُس کی برابر محنت مشقّت کرتے تھے اور لیاقت رکھتے تھے ، اس کا جرم سمجھا جاتا ہے ۔ جو لوگ اس کے ساتھ معاملاتِ زندگی میں برابر دوڑ کر رہے تھے ، اب وہ ان سے ایسا آگے بڑھ گیا کہ اس کے ساتھ والوں کو کچھ امید ہی باقی نہیں رہی کہ وہ اس کو کسی طرح پکڑ لیں گے ۔ یہ مایوسی ان کے دل میں حسد پکاتی ہے اور حسد یہ کھواتی ہے کہ اس کے دولت حاصل کرنے کے وسائل ناجائز تھے ۔ اس کے کام حماقت اور غرور کے تھے ۔ غرض جس کی ترقی کو وہ روک نہیں سکتے اُس کے تنزّل کی بیٹھے دعائیں مانگا کرتے ہیں اور فالیں نکالا کرتے ہیں ۔

نو دولت خواہ کیسا ہی پاک طینت اور صاف باطن ہو مگر بد بیں اُس کے اُن عیبوں کو ، جو مخفی تھے اور کسی کو غرض اُن کی تلاش سے نہ تھی ، ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکال لیتے ہیں ۔ وہ کیسا

ہی سب کے ساتھ بہ مدارات پیش آتا ہو اور مستقل مزاج ہو مگر اس کے ناپسند کرنے والے بہت لوگ ہوتے ہیں جن کی ملامت اور مذمّت سے وہ نہیں بچ سکتا - غرض نو دولتوں میں ثروت سے اِتنی برائیاں نہیں پیدا ہوتیں جتنی لوگوں کے دلوں میں حسد سے پیدا ہوتی ہیں - اکثر نودولتوں پر غرور کا الزام لگایا جاتا ہے - اس میں شک نہیں کہ جب کوئی آدمی اپنے کاموں میں کامیاب ہوتا ہے تو اپنی لیاقتوں اور قابلیتوں کی نسبت نیک رائے رکھتا ہے - جس شخص کی ترقی ہوتی ہے وہ اِس بات کو مشکل سے مانتا ہے کہ اس میں بخت و اتفاق کا، دوستوں کی عنایت کا اور اَور ہزاروں باتوں کا، جو ہر واقعے میں ایسی پیش آتی ہیں کہ جن میں تدبیر کو ذرا بھی دخل نہیں ہوتا، کوئی حصہ ہے - وہ ساری کامیابی کو اپنی حسنِ لیاقت سے منسوب کرتا ہے اور اپنی خیالی لیاقتوں سے بڑے بڑے دعوے کرنے لگتا ہے - اور اپنی قدر و قیمت دولت کے اعتبار سے لگاتا ہے، نیکیوں کے اعتبار سے نہیں - پس اِسی اعتبار سے لوگ اس کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور حسد و رشک سے اُس کی اچھی باتوں کے بھی برے معنی لگاتے ہیں - اُس کی آزادی کو اَکھڑّ پن، اُس کی متانت و سنجیدگی کو تصنّع و کشیدگی، اس کی ظرافت کو خطا و قصور، تواضع اور تعظیم کی ملاقات کو حماقت، اس کے بے تکلّف ملاپ جلاپ کو گستاخی و بےادبی، غرض ہر حرکت پر اعتراض -

قاعدہ ہے کہ جتنی ناگہانی اور دفعۃً تبدیلیاں ہوتی ہیں، وہ اندیشناک ہوتی ہیں - ایسی ہی اس تبدیلی میں بھی سلامتی نہیں کہ دفعۃً مفلسی سے آدمی بڑا دولت مند ہو جائے - جن عیش و عشرت کی چیزوں کو حسرت کی نگاہ سے مدّتوں تک دیکھتا رہا ہو اور اُن تک رسائی نہ ہوئی ہو، وہ دفعۃً ہاتھ لگ جائیں تو نہایت مشکل

ہے کہ آدمی ایسے اعتدال پر طبیعت کو رکھے کہ وہ عقل کو سلامت رہنے دے۔ مشہور ہے "کلُ جدیدٍ لذیذٌ" جو چیز نئی ہاتھ آتی ہے وہ عزیز ہوتی ہے۔ اشتہا ہر تفریح کو بڑھا دیتی ہے اور اصلی قیمت سے زیادہ اس کا تخمینہ کراتی ہے۔

نودولتوں اور پُشتینی دولت مندوں میں صاف فرق نظر آتا ہے۔ نودولت کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے کال کے مارے کو روٹی ہاتھ لگے۔ وہ اپنی دولت سے عیش و عشرت کرنا بہت جلد چاہتا ہے۔ لباس کی بھڑک، سواری اور اسبابِ خانہ کی رونق، دسترخوان کی پُر الوانی، غرض یہ ساری باتیں اپنی شان و نمود کے لیے بڑے کرّ و فر سے دکھاتا ہے۔

ہزاروں پرانی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو[1] کثرتِ ممارست[2] سے نظر میں بے قدر ہو جاتی ہیں اور ان پر ذرا توجہ نہیں ہوتی، مگر اس کے برخلاف نئی چیزوں کا حال ہوتا ہے۔ امریکہ میں ورجینیا کے بادشاہ کو فرنگیوں نے دروازے میں قُفل کُنجی سے لگا کے دکھایا تو وہ یہ دیکھ کر کہ میں کیا آسانی سے اشیا کو کھول مُوند سکتا ہوں، صبح سے شام تک قفل کنجی سے وہ کھیلا کرتا تھا۔ لوگ اس بادشاہ کی نادانی پر ہنسیں گے، مگر اس مضمون کے پڑھنے والوں میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو اس بادشاہ کی طرح ادنیٰ سی نئی چیزوں کی خوبی پر گھنٹوں مصروف نہ رہا ہو۔

جب کسی آدمی کو دولت کا جھونکا ایسے مقام پر پہنچا دیتا ہے کہ جہاں کی چمک دمک، جو پہلے کبھی نظر نہ پڑتی تھی، آنکھوں کو چندھیاتی ہے اور وہ نعمتیں اشتہا بڑھاتی ہیں جن کا مزہ کبھی نہ چکھا تھا، تو وہ ضرور تن پروری کرے گا۔ عجب نہیں

۱- اصل: وہ کثرت۔ ۲- ممارست = تکرار، لگاتار کوئی کام کرنا۔

کہ وہ اس نودولتی میں ایسا مست ہو کہ لوگوں کو اپنے خیال میں نہ لائے - اپنی رائے کو وہ بے خطا جاننے لگے اور یہ چاہے کہ لوگ اس کو الہام کی طرح ماننے لگیں - خوشامدی اِس سودے[1] کو اُس کے دماغ میں اَور پکا دیتے ہیں - اول تو اس کے کان میں کوئی آواز ہی اس کی حماقت اور خطا کے کام کی نہیں جاتی ہے اور اگر کسی اتفاق سے پہنچ جاتی ہے تو خوشامدی اس کو یوں ہی اُڑا دیتے ہیں - جب وہ اپنے ہمسروں میں رہتا تھا تو دوستوں کی نصیحت سے اور دشمنوں کی فضیحت سے فائدہ اُٹھاتا تھا ، مگر اب وہ اس سے محروم ہوگیا - بہت سی جماعتیں اس کے گرد ایسی جمع ہو جاتی ہیں کہ بُرے کام کراتی ہیں - گو نودولت اس طرح بگڑ جاتے ہیں مگر یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ان کی یہ حالت بہت دنوں نہیں رہتی - جلد اس مستی کا نشہ اُتر جاتا ہے اور وہ اپنے ہوش و حواس درست کر کے پھر خوش اطوار ہو جاتے ہیں - اور غرور و تکبّر سے لوگوں کے ساتھ پیش آنے میں سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم کو اَوروں کی احتیاج ہے اور کوئی خوشی اَوروں کی شرکت بغیر نہیں حاصل ہوتی - بدی ایسی نامرد ہوتی ہے کہ وہ سازشوں اور جماعتوں کی اعانت ڈھونڈتی ہے اور نیکی جواں مرد ہوتی ہے کہ بذاتِ خود بے اعانتِ غیر قائم ہوتی ہے - پس نودولت ، جو بدی کی طرف جاتے ہیں ، وہ ایک گروہ کو اپنے ساتھ ضرور رکھتے ہیں -

٦٩- آدمی کو بہت سے فائدے ایک ساتھ نہیں مل سکتے

بہت سی نعمتیں آدمی چاہتے ہیں اور ان میں تھوڑی سی ملتی

۱- سودا=خبط -

ہیں - اس واسطے اکثر آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بجائے شکر کرنے کے شکایت کرتے ہیں - اور ہمّتِ و استقلال سے اپنی حالت کو بہتر کرنے کے عوض میں اُس حالت میں ٹھہر جاتے ہیں جس سے خوش نہیں ہوتے - مشیّتِ ایزدی نے انسان کی خوشیوں کی ایک سرحد نہایت مستحکم مقرر کر دی ہے جو کسی طرح اپنی جگہ سے ٹل نہیں سکتی - اُس نے انسان کی خوشیوں کو باہم ایک دوسرے سے ایسے دراز فاصلوں پر رکھا ہے کہ اس کی قدرت سے باہر ہے کہ وہ سب کے پاس جا سکے - ہر انسان کو یہ قانون سمجھ لینا چاہیے کہ متضاد چیزیں یک جا جمع نہیں ہو سکتیں - جن چیزوں کو قدرت نے الگ الگ ایسا بنایا ہے کہ وہ جمع نہیں ہو سکتیں ، ان کے ملانے میں اپنی عمر ضائع نہ کرے ، نقیض صفات کے پیدا کرنے کا قصد نہ کرے ، متضاد کے متفق کرنے میں اپنی زندگی برباد نہ کرے - جو چیزیں آدمی کے متضاد اطراف میں رکھی ہوں تو یہ امر ناممکن ہے کہ آدمی ایک چیز کے نزدیک جائے اور دوسری سے دور نہ ہو جائے - خواہ کیسا ہی کوئی سوچ بچار کرے اور منصوبے باندھے وہ ہاتھ نہیں آ سکتیں ، مگر ہاتھ سے جا سکتیں ہیں - ان دونوں کا آپس میں مقابلہ کرکے فیصلہ کرے کہ کس کو ترجیح ہے - جس کو ترجیح ہو ، اُس کی طرف چلے - پھر دوسری جانب رخ کرنا عقل کے خلاف ہے - خواہ وہ کیسی ہی قدرت ، ہماری آنکھوں کو اپنی بہار دکھانے کی اور خیالات کے روشن کرنے کی ، رکھے - جو شخص ناجائز خوشیوں کی ترغیب میں آ کر ان کی جانب مڑے گا ، وہ نیکی کی راہ میں کبھی سلامتی کے ساتھ نہیں چلے گا -

انسان بڑی غلطی یہ کرتا ہے کہ وہ اُن حالتوں سے خوش نہیں ہوتا جن کے اندر اس کی اصل خوشی موجود ہوتی ہے - وہ علم کی

خوبیوں سے آگاہ ہے ، وہ صحت کی کُل منفعت کو سمجھتا ہے ، تونگری کے آراموں کو جانتا ہے ، مگر اس یقین کا اثر دل پر کچھ نہیں - بہت سے آدمی علم کی تعریف بھی کرتے ہیں ، اس کی تحصیل کا شوق بھی ظاہر فرماتے ہیں مگر کاہلی کا تکیہ لگا کے ایسے سوتے ہیں کہ علم کی آوازوں سے بیدار نہیں ہوتے - ذرا سا بہانہ ان کو کھیل تماشے کا مل جائے تو وہ کتابوں کو بالائے طاق رکھتے ہیں - ان کو مطالعۂ کتب میں ، بہ نسبت کسی اور شغل کے ، دن کا کاٹنا ناگوار گزرتا ہے - خواہ کیسی ہی دانش افزا اور خرد آموز ان کے سامنے تقریر کی جائے ، وہ اس کو ایسی رغبت سے نہیں سنتے جیسی کہ قصّے کہانیوں اور زٹّل قافیوں کو -

بیمار صحت کی قدر جانتا ہے کہ حالتِ بیماری میں کوئی چین آرام دل کو خوش نہیں کر سکتا ، مگر ہر روز دیکھ لو کہ انسان اپنے بیمار ڈالنے کے لیے کیا کیا بے اعتدالیاں کرتا ہے - دعوتوں ، ضیافتوں اور روزمرہ کے کھانوں میں فقط زبان کے مزے کے واسطے کیا کیا بد پرہیزیاں کرتا ہے - وہ جان جان کر مرغّن کھانے ، ثقیل ، دیر ہضم کھاتا ہے جس سے آخر میں مرضوں میں گرفتار ہوتا ہے - اس لیے کوئی گھر ایسا نہ ہوگا کہ جس میں کسی نہ کسی کو ، یا سب کو ، کسی مرض کی شکایت نہ ہو - کون ایسا ہے کہ دولت کی قدر اور افلاس سے حذر نہیں کرتا - وہ اُن کاموں سے بھی آشنا ہے کہ جن سے دولت برباد جاتی ہے اور افلاس کی مصیبت سر پر آتی ہے - وہ خوب سمجھتا ہے کہ جو خرچ سے آمد کو زیادہ رکھے گا وہ آخر کو محتاج ہو جائے گا - غرض یہ ساری برائیاں گو کیسی ہی ظاہر ہوں مگر سینکڑوں مُسرف اپنے عیش و عشرت میں دولت کو اڑاتے ہیں اور روز بروز مفلس ہوتے جاتے ہیں ، اور آخر کو

تباہ ہونے کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ مگر وہ اپنی خرمستی میں ایسے مدہوش ہوتے ہیں کہ کچھ خبر نہیں ہوتی۔

بہت سے آدمی زندگی کے مصائب و آفات کی شکایتیں کیا کرتے ہیں، اور اس میں شک بھی نہیں کہ بعض مصائب ایسے ہیں کہ وہ کاہل و محنتی پر، غافل و ہوشیار پر، نیک و بد پر یکساں پڑتے ہیں۔ مگر بہت سی مصیبتیں اور بلائیں ایسی ہیں کہ انسان خود اپنے آپ سر پر لاتا ہے اور اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مارتا ہے۔ روز کا تجربہ اور عقل کی ہدایت اس کو متنبہ کرتی ہے کہ ان شکایتوں کا کرنا انسان کا حق نہیں ہے۔

دنیا میں بہت سے آدمی اپنی حالت سے ناراض اور ناخوش رہتے ہیں اور اپنی حالت کے بہتر کرنے کی قدرت رکھتے ہیں مگر اس کا ارادہ نہیں کرتے۔ وہ اپنے نیک و بد پر غور نہیں کرتے کہ ان میں سے ایک کو چھوڑیں اور دوسرے کو اختیار کریں۔ وہ غفلت اور بے پروائی میں پڑے رہتے ہیں اور بخت و اتفاق پر بھروسا کیے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اور کچھ کوشش و سعی نہیں کرتے۔ آخر کو روتے ہیں کہ ہائے ہم نے یہ نہیں کیا، وہ نہیں کیا۔

۷۰۔ ہم کن آدمیوں کو ہنسی میں اڑایا اور بنایا کرتے ہیں

ہر آدمی میں دو طرح کی صفات ہوتی ہیں: ایک وہ جو سب آدمیوں میں مشترک ہیں اور اس کو ممیّز از حیوان بناتی ہیں۔ دوسری وہ صفات جو اس کو اپنے نوعِ بشر میں ممتاز کرتی ہیں اور خاص اس کی طبیعت کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔ پس اپنی ان صفات کی، بشرطیکہ وہ انسانیت کے قوانینِ عظیم کی مخالف نہ ہوں، نہایت احتیاط

مستقل طور پر رکھنی چاہیے -

بہت ہی کم مجالسِ نشاط ایسی منعقد ہوتی ہوں گی کہ جن میں کوئی نہ کوئی آدمی ایسا نہ ہوتا ہو کہ جس کو لوگ ہنسی میں نہ اڑاتے ہوں - آدمی کی ، ہنسی میں ، خاک جب ہی اڑتی ہے کہ وہ اپنی اصلی خصلت کو بدل کر جعلی خصلت کے لباس میں دکھاتا ہے اور وہ چیز اپنے میں دکھانی چاہتا ہے جو نہ تعلیم و تربیت نے ، نہ قدرت نے اس میں پیدا کی ہے - غبی ، جاہل ، کودن سے کوئی خوش نہیں ہوتا مگر کوئی اس کی ذلّت اور خواری بھی نہیں کرتا جب تک کہ وہ اپنے تئیں عالم نہیں ظاہر کرتا اور علم میں 'دون'[1] کی نہیں لیتا - اکّھڑ اور بے ڈھنگے آدمی دلوں کو اس طرح تسخیر نہیں کر سکتے جیسے کہ خوش خُلق اور نرم مزاج ، مگر کوئی ان کو ہنسی میں نہیں اڑاتا جب تک وہ بگلا بھگت بن کے اپنے تئیں بڑا خلیق نہیں جتلاتے - بدصورت پر رحم زیادہ ، بہ نسبت حقارت کے ، لوگ کیا کرتے ہیں ، مگر جب وہ لباس اور زیب و زینت کر کے لوگوں کی نظروں میں خوب صورت بننا چاہتا ہے تو اس کو بنا کے ذلیل کرتے ہیں - بازار میں کھڑے ہو کر بھیڑ بھاڑ کو دیکھو تو بہت سے آدمیوں کی وضع طرح پر تم کو بے اختیار ہنسی آئے گی اور خواہ مخواہ وہ نظر میں ذلیل جچیں گے - اس کا سبب نہ کسی کی بیماری اور نہ کسی کا عیب و نقص ہے[2] جو مجبوری سے ہو ، بلکہ کسی کا اِترا اِترا کے چلنا ، کسی بانکے تیرچھے کا زنانہ پن ، کسی نامرد کا اوبچی[3] بننا ، کسی جاہل کا عالمانہ شملہ و دستار کا رکھنا ، غرض اس چیز کا

۱- دون کی لینا = ڈینگ مارنا - ۲- "ہے" اضافہ مرتّب -

۳- اوبچی = بانکا سپاہی ، ہتھیار بند -

دکھانا جو اس کی اصلی نہیں ہے ۔ ایسے آدمی اپنے تئیں خود بناتے ہیں تاکہ وہ بزرگی اور عزت پائیں اور لوگ تعریف کریں ۔ مگر ان کو یہ جاننا چاہیے کہ جن اربابِ کمال میں اصلی قابلیتیں اور لیاقتیں ہوتی ہیں ، اُن کی تحسین و آفرین میں تو لوگ مضائقہ کرتے ہیں ، اِن کی جعلی لیاقتوں کی کون تعریف کرے گا ۔ اس سے تو اُن کی خوب خاک اُڑے گی اور ذلّت ہوگی ۔

۷۱۔ دِوالہ

عالمِ تجارت میں سوداگروں کے دِوالے سے بڑا زلزلہ آتا ہے ۔ یہ دِوالیے اپنی صورتِ ظاہری بڑے دولت مندوں کی سی بناتے ہیں تا کہ ان کا اعتبار ایسا پیدا ہو کہ وہ اَوروں کے سرمایے سے تجارت کریں اور لوگوں سے قرض لیں ، جس کے ادا کرنے کی کوئی صورت سوائے اس کے نہ ہو کہ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹے ۔ غرض چند روز وہ اس طرح سے اپنی تجارت کے کارخانے وسیع بنا کے چلاتے ہیں لیکن دفعۃً وہ ڈوب جاتے ہیں اور اُن لوگوں کو بھی ساتھ لے ڈوبتے ہیں جو اُن کے[1] ساز و سامان کی شان بنانے کے معاون تھے ۔ آپ خود مفلس ہو جاتے ہیں اور اَوروں کو بھی مفلس کرتے ہیں ۔

۷۲۔ آدمی اپنے تئیں بڑا دھوکا دیتا ہے

اپنی لیاقت ، قدرت ، قابلیت کے اندازہ کرنے میں انسان کی رائے بڑی خطا کرتی ہے ۔ وہ یہ نہیں سمجھتا ہے کہ مجھے اپنا علم[2] جتنا زیادہ ہوگا اُتنا ہی خطاؤں ، گناہوں ، حماقتوں سے بچوں گا ۔ میری خود شناسی جتنی زیادہ ہوگی ، اُتنی خدا شناسی بڑھے گی اور اس سے

۱۔ اصل : ان کے بھی ۔ ۲۔ یعنی اپنی ذات کا علم ۔

میرے خیال و افعال مجموعۂ مسرّت بن جائیں گے - مشکل ہے کہ آدمی خود شناس ہو - جہاں دیکھو وہاں یہ نظر آتا ہے کہ آدمی اپنی نیکیوں کی جتنی قدر خود کرتا ہے ، اُتنی دوسرا کوئی اَور نہیں کرتا - وہ اپنی خوبیوں کی ایسی تعریف کرتا ہے کہ کوئی اُس کا عاشق بھی ان کی اُتنی ستائش نہیں کرے گا - یہ خود پسندی جو اس کے دل میں خیالی نیکیوں کو پیدا کرتی ہے ، اس کو لوگ ریاکاری اور تعریف و اعتبار کی جعل سازی جانتے ہیں - لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے - اس لیے جو اس طرح اپنی شہرت پھیلاتے ہیں ، پہلے وہ خود فریب اور دھوکا کھاتے ہیں ، اَوروں کو فریب نہیں دیتے ہیں - انسان کو اپنی ذات سے ایسی محبت ہے کہ نہایت مشکل ہے کہ وہ اپنے عیبوں اور برائیوں کو دیکھ سکے - محبت ہمیشہ محبوب کے عیبوں کے دیکھنے میں اندھی ہوتی ہے - وہی آدمی اپنے دل کا حال خوب صحیح جان سکتا ہے جو انسان کے دل کا حال خوب جانتا ہے - انسان اپنے میں اُس نیکی کی عادت کا یقین کرتا ہے جو اس نے ساری عمر میں ایک دفعہ کی ہو ؛ مثلاً کسی کنجوس نے اپنے ایک دوست کو قید سے کچھ روپے کی مدد کر کے بچایا ہو تو وہ صرف اِس ایک دفعہ کے سلوک کو یہ جانے گا کہ میری عادت ہے کہ میں دوستوں کے ساتھ دولت سے سلوک کیا کرتا ہوں - جب کوئی بخیل پر لعنت ملامت کرے گا تو مثال اپنی فیاضی کی پیش کر کے اپنے دل کو راضی کر لے گا - جیسے بعض شیشوں کی خاصیّت ہوتی ہے کہ اگر ان کے ایک سرے کو آنکھ سے لگاؤ تو وہ چیزوں کو بڑا کر کے دکھاتے ہیں اور دوسرے کو لگاؤ تو چھوٹا ، پس ایسے ہی مغالطوں سے برائیاں چھوٹی اور نیکیاں بڑی ہو جاتی ہیں -

بہت سے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ایسی[1] نیکیاں اپنے میں سمجھنے لگتے ہیں جو اَوروں کو کرنے کے لیے وہ سمجھاتے ہیں۔ فیّاضی، اعتدال، ایمان داری کا بیان جب وہ فصاحت سے کرتے ہیں تو جانتے ہیں کہ یہ نیکیاں ہم میں خود پیدا ہو گئیں۔ اس غلطی میں اکثر وہ لوگ پڑتے ہیں جن کا پیشہ نیکیوں کے سمجھانے کا ہے۔ وہ فقط اِس کو بیان کرنے پر اکتفا کر کے اپنے چال چلن پر متوجہ نہیں ہوتے کہ وہ کیسا ہے۔ ایسے آدمیوں کا بھی ایک گروہ ہے کہ وہ اپنے برے[2] چال چلن کو مذہبی پیمانے سے نہیں ناپتے بلکہ اَور لوگوں کے اطوار سے۔ اگر وہ خراب تر ہیں اور یہ خراب تو اپنے تئیں نیک جانتے ہیں۔ اگر اَور دس گناہ کرتے ہیں اور یہ نو تو اپنے تئیں بڑا نیک جانتے ہیں۔ غرض یوں ہم اپنے تئیں آپ دھوکا دیتے ہیں۔ اپنے تئیں نہیں جانتے۔ سینیکا کا قول ہے کہ موت اُس شخص پر بڑی سخت ہوتی ہے جو اپنے تئیں نہیں جانتا اور بہت سے لوگ اس کو جانتے ہیں۔ آدمیوں کو چاہیے کہ اپنے تئیں جانیں جس پر تمام نیکیاں موقوف ہیں۔

۷۳۔ بھلے آدمیوں کی قسمیں

جب ہم کسی شخص کی طبیعت میں شرارتِ ظاہری نہیں دیکھتے اور کوئی برا کام کرنا اس کا ہمیں نہیں معلوم ہوتا تو ہم اُس کو بھلا آدمی کہتے ہیں، گو وہ کوئی علم و ہنر نہ رکھتا ہو اور اعلیٰ درجے کا تعلیم یافتہ نہ ہو۔ ان بھلے آدمیوں میں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے اَور آدمیوں کو ایسی تکلیف پہنچتی ہے جیسے سونے والے کو چارپائی میں کھٹملوں سے۔ بعض ان میں ایسے ہوتے ہیں کہ

۱۔ "ایسی" اضافۂ مرتّب۔ ۲۔ اصل: اپنی بری چال چلن۔

جہاں انھوں نے کسی شخص کو ایسا کام کرتے ہوئے دیکھا کہ جس میں خدا پرستی اور نیکی نہ ہو، وہاں انھوں نے اس پر الحاد اور کفر کا فتویٰ دے دیا۔ ایک شخص کو نماز قضا کرتے دیکھا، اُس پر جہنّمی ہونے کا فتویٰ لگا دیا۔ بعض ان میں سے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ نصیحت ہی کرتے پھرتے ہیں۔ جہاں کسی دوست سے ملے، اُس کو سمجھانا شروع کیا کہ تم اُس شخص سے دوستی کر کے پستاؤ گے۔ اگر اُس سے معاملہ داد و ستد[1] کرو گے تو نقصان اُٹھاؤ گے۔ فلاں فلاں چیزیں ساتھ کھاؤ گے تو کوڑھی[2] ہو جاؤ گے۔ اُس ڈاکٹر کا علاج کرو گے تو مر جاؤ گے۔ بعض ان میں ایسے ہوتے ہیں کہ وہ جس شخص سے ملتے ہیں، اُس سے یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص تمھاری تعریف کرتا تھا اور فلاں شخص ہجو۔ معلوم نہیں کہ وہ تعریف کیوں کرتا تھا اور یہ ہجو کیوں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اَوروں کو تکریم و تعظیم و آداب کے لیے تاکید و تنبیہ کرتے رہتے ہیں۔ غرض یہ پانچ چھ قسم کے بھلے آدمی ہوتے ہیں جن کے یہ کام ہوتے ہیں۔

۴۷۔ گناہ

۱۔ خدا سے سرکشی کرنے کا نام گناہ ہے۔ کوئی چیز دنیا میں خدا سے ضد کرنے والی گناہ کی برابر نہیں ہے۔ خدا نور ہے، گناہ ظلمت ہے۔ خدا تعالیٰ حسن و جمالِ با کمال ہے، گناہ زشت و کریہ منظر ہے۔ خدا کبھی کسی طرح گناہ سے راضی نہیں ہوتا۔ خواہ گناہ کی صورت کیسی ہی شیریں آدمی بنائے مگر اس پر خدا تعالیٰ کبھی التفات نہ کرے گا۔

۱۔ داد و ستد = لین دین۔ ۲۔ اصل: کوڑی۔

۲- انسان اُن وسائل کی تلاش کے درپے اتنا نہیں ہوتا کہ جن سے اس کو معلوم ہو کہ کیا اس کو کرنا چاہیے ، جتنا وہ اُن کاموں کو کرنے ہو بیٹھتا ہے جن کو وہ چاہتا ہے - شہواتِ نفسانی اور جہالت اور تعصّب کا غلبہ انسان پر وہ غالب ہے کہ عقل ہرچند اس کو نیک کام کی طرف ہدایت کرتی ہے مگر وہ اس کی سنتا نہیں کہ کیا بکتی ہے - گناہ کا اصل اصول جہالت ، حماقت ، غفلت ہے - سمجھ میں ایک غلط مقدّمہ پہلے سے ایسا مرتّب ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ارادے کو غلط طور پر کام میں لاتا ہے - سر میں جب چکّر آتا ہے تو آدمی کا پاؤں لڑکھڑاتا ہے - انسان کسی کام کی تمام حالتوں پر غور نہیں کرتے - اگر غور کرتے ہیں تو عملاً اِس کا فیصلہ نہیں کرتے کہ یہ کام برا ہے ، بلکہ اس کے برخلاف یہ سمجھتے ہیں کہ یہ گناہ کا کام فائدہ مند اور مزے دار ہے - بُرا دل گو مقدّمات کو نیک مان لے مگر اُن کے نتیجے ہمیشہ اُلٹے نکالے گا - شہوتِ نفسانی قلب کو اُلٹا کر دیتی ہے - تحقیقِ حق میں تعصّب اور جہالت سے دل کو معمور کر دیتی ہے - سیاہ قلبی اور شہواتِ نفسانی میں ہمیشہ مصالحت رہتی ہے ، مغایرت[۱] ہوتی نہیں - جن کا قلب بےپروا ہوتا ہے اُن کا مذہب بھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کی شہوت پرستی کو بے لطف نہیں ہونے دیتا اور نہ شہوت پرستی ان کو دق کرتی ہے - جس کا قلب غافل ہو جاتا ہے وہ ظلمت کو نور سمجھتا ہے ، راستی کو جھوٹ جانتا ہے - جن باتوں کو چاہتا ہے یقین کرتا ہے - اُن باتوں کو یقین نہیں کرتا جن کو یقین کرنا اس پر فرض تھا - اس کے قلبِ سیاہ میں بھول بھلیّاں اور ایچ پیچ

۱- مغایرت=اجنبیت ، غیرت ، دوری -

کی راہیں اور کمینیں[1] ہوتی ہیں کہ جن میں شہواتِ نفسانی مخفی بیٹھی رہتی ہیں۔ گناہ گار اپنے گناہوں پر کبھی ریا کا، کبھی مذہب کا نقاب ڈالتا ہے۔ کبھی برے کام کا نام اچھا لیتا ہے، کبھی برے ارادے کا انجام نیک بتلاتا ہے، کبھی بدکاری کے سبب کو نیک ٹھہراتا ہے۔ اس کی شہوت پرستی جب کسی قانون اور قاعدے کے موافق نہیں ہوتی تو وہ آس[2] کے لیے قاعدے گھڑ لیتا ہے۔ پرانی غلطیوں کے صحیح ہونے کی نئی نئی دلیلیں بیان کرتا ہے۔ شہوت پرست گناہوں کے باب میں ایسے مباحثے اور دلیلیں لاتے[3] ہیں کہ جن سے بڑے گناہوں کا چھوٹا ہونا اور چھوٹے گناہوں کا بالکل گناہ نہ ہونا ثابت ہو۔ غرض یہ جہالت و غفلت گناہ کی اصلِ اصول ہیں۔

۳۔ گناہ گاروں کو گناہ پھسلاوے دیتا ہے اور زندگی میں[4] خوشی و فائدے دینے کے وعدے کرتا ہے۔ مگر وہ دیتا کیا ہے؟ موت، رنج، قلق دیتا ہے۔ پس جو گناہ کی اس دغابازی، مکّاری، جھوٹ کو سمجھنا چاہے وہ اس کے وعدہ اور ایفائے وعدہ کو دیکھ لے کہ کیا دینے کا وعدہ کرتا ہے اور کیا دیتا ہے۔ شکّر دینے کا وعدہ کرتا ہے اور زہر دیتا ہے۔

۴۔ آدمی کو چاہیے کہ اول ہی وہ گناہ کو دل میں داخل ہونے سے روکے اور اس کی ترقی نہ ہونے دے۔ گناہ کو ایک جگہ قرار نہیں ہوتا ہے۔ اگر تم اس سے پیچھے نہ ہٹو گے اور اس کے ساتھ آگے بڑھو گے تو اتنا ہی پیچھے پھر آنا دشوار ہوتا جائے گا۔

۱۔ کمینیں = کمین گاہیں، گھاتیں۔ ۲۔ اصل: ان کے لیے۔

۳۔ اصل: مباحثے اور دلیلیں کرتے ہیں۔ "لاتے" اضافۂ مرتّب۔

۴۔ "میں" اضافۂ مرتّب۔

یہ چھوٹے چھوٹے گناہ انسان کی زندگی میں ایک دھار ہے جو سہج سہج تم کو جہنّم کی طرف بہائے لیے جاتی ہے۔ اگر اس میں بڑے گناہ شامل ہوگئے تو اس دھار میں وہ طغیانی آئے گی کہ تم کو بہت تیز رفتاری کے ساتھ اس کا زور درِ دوزخ تک ایسا جلد پہنچا دے گا کہ کبھی چھوٹے گناہوں کی دھار نہ پہنچاتی۔ کبھی سینے میں گناہ کو جگہ نہ دو۔ اس کے دو متضاد اثر دل پر ہوتے ہیں ؛ یا وہ دل کو ڈراتا ہے یا "سن" کرتا ہے۔ اکثر دوسری صورت ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے گناہوں کے کرنے سے آدمی بڑے بڑے گناہ کرنے لگتا ہے۔ ان کا نہ کرنا حفظِ ماتقدّم بڑے گناہوں سے ہے۔ کوئی شخص عصیاں کاری اور شرارت میں دفعتہً کامل نہیں ہو جاتا۔ شیطان بڑا سیانا ہے۔ وہ پہلے بُری ترغیبیں چھوٹی چھوٹی دے کر اپنی راہ پر لاتا ہے، اس لیے آغاز ہی میں گناہ سے احتراز چاہیے۔ اس کی ابتدا میں ایسی شیرینی نہیں جیسی اس کی انتہا میں تلخی ہے۔ ابتدا میں اس کا کرنا جیسا سب طرح سے خوش معلوم ہوتا ہے، ایسا ہی انتہا میں وہ سب طرح سے رنج دیتا ہے۔ گناہ لوگ اپنے فائدے کے لیے کرتے ہیں مگر کبھی اس سے فائدہ نہیں پہنچتا۔ جب موت نظر آتی ہے تو یہی چھوٹے چھوٹے گناہ، جن کو کیڑوں کی طرح پاؤں تلے روندا تھا، اژدہے بن کر کاٹنے لگتے ہیں۔

۵۔ اگر گناہ کے چہرے پر کوئی نقاب نہ پڑا ہو اور کوئی روغن اور ملمّع نہ کیا گیا ہو تو وہ ایسا ڈراؤنا اور گھناؤنا نظر آئے گا کہ اس کی طرف رغبت کرنا ناممکن ہوگا۔ بلکہ ایسی نفرت اس سے ہوگی کہ کسی طرح اس کے پاس جانے کو جی نہیں چاہے گا۔ انسانوں، خاندانوں، قوموں، سلطنتوں، دنیاؤں میں کوئی خلل انداز گناہوں سے بڑھ کر نہیں ہے۔ دیکھ لو کہ سلطنتوں اور ریاستوں کے

برباد کرنے والا ، شریروں اور بدکاروں کے سوا اور کون ہے ۔ گناہ گار تو خالق اور مخلوق دونوں کا دشمن ہوتا ہے ۔

۶۔ گناہ جو تمھارے ساتھ سلوک کرتا ہے تم بھی وہی سلوک اس کے ساتھ کرو ۔ وہ تمھاری ہلاکت کے درپے رہتا ہے ، تم بھی اس کی ہلاکت کے پیچھے پڑو ۔ اِس سے پہلے کہ وہ تم کو ہلاک کرے ، تم اُس کو ہلاک کرو "قتل موذی قبل ایذا[1]" ۔ وہ تمھارے جسم کو کھا سکتا ہے ، سر کو قبر میں دفن کر سکتا ہے مگر وہ تمھاری روح کو اور تم کو فنا نہیں کر سکتا ۔ گناہ میں جو گرفتار ہوتا ہے وہ آدمی ہوتا ہے ۔ جو اس سے نادم اور غم زدہ ہوتا ہے وہ ولی ہوتا ہے ۔ اور جو اس کی شیخی مارتا ہے وہ شیطان ہوتا ہے ۔ اولیا اور شہدا بھی گناہوں سے پاک صاف ہو کر معصوم نہیں ہو سکتے ۔ ایک گناہ میں وہ زور ہوتا ہے کہ آدمی کی ساری قوّتیں اسے ہٹا نہیں سکتیں ۔ خدا ہی اس کو دور کر سکتا ہے ۔ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی کسی گناہ کی عادت ڈالے اور اس میں مداومت[2] کرے ۔ پھر وہ کسی طرح نہیں دور ہو سکتا ۔ آگ کا بجھانا چنگاری کے بجھانے سے زیادہ دشوار ہوتا ہے ۔ جس مرغی کے انڈے کو سانپ سیئے اور اُس سے جو جھوٹ موٹ کا سانپ پیدا ہو ، اس کا مار ڈالنا سانپوں کے مارنے سے بہت آسان ہے ۔ پیرانہ سالی میں گو جسم نہایت ضعیف و ناتوان ہو جاتا ہے مگر کوئی عضو معدوم نہیں ہوتا کہ اس کا گناہ معدوم ہو جائے ۔ داغ دھبّا جتنے دنوں

۱۔ یعنی قبل اس کے کہ موذی کوئی ایذا پہنچائے ، تم اس کو ختم کردو ۔ اصل میں یہ محاورہ اسی طرح چھپا ہے لیکن اس کی صحیح شکل یہ ہے : "اقتل الموذی قبل الایذا ۔"

۲۔ مداومت = تکرار ، کسی کام کو ہمیشہ کرتے رہنا ۔

زیادہ رہتا ہے اتنا ہی وہ گہرا ہو جاتا ہے ۔ جن کو گناہ کرنے کی عادت ہوتی ہے ، گو وہ عملاً اپنی جوانی کے سے گناہ نہ کریں مگر خیالاً وہ جوانی سے بھی زیادہ گناہ کرتے ہیں ۔ گناہ سوءے مزاج کا مربی" ہے ۔ گناہ گاری اچھے طبیبوں کو پیدا کرتی ہے ۔ ہمارے گناہوں کا حال ہمارے سائے کا سا ہے کہ عروج کے وقت وہ بالکل ظاہر نہیں ہوتے اور زوال کے وقت ، شام کو ، زیادہ بڑے معلوم ہوتے ہیں ۔ روحانی گناہوں سے زیادہ جسمانی گناہ ہم کو بدنام کرتے ہیں ، مگر نحوست و شامت میں دونوں برابر ہیں ۔ گناہ امید کو نا امیدی سے بدلتا ہے ، عاقلوں کو احمق بناتا ہے ، معصوموں کو عصیاں کار ۔ اس کا اثر زہر کا سا ہوتا ہے کہ تمام ُقوائے روحانی کو توڑ دیتا ہے اور سارے کاموں میں سرایت کر جاتا ہے اور ایسا زبردست اثر کرتا ہے کہ اس کا ازالہ خدا تعالیٰ ہی کرتا ہے ۔

۷۵۔ توبہ

۱۔ توبہ اس کام کے چھوڑنے کا نام ہے جس کو آدمی یقین کرے کہ میں نے اس کے کرنے سے خدا کو ناراض کیا ہے ۔ توبہ کرنا کیا ہے ؟ اپنے اوپر لعن طعن کرنا ، اپنے تئیں دوزخ کا مستحق جاننا ، خدا جو گناہ کی سزا دے ، اس کو عینِ عدالت سمجھنا ۔ گناہ کی ندامت کو ہمیشہ پیش نہادِ خاطر اور مدِ نظر اس طرح رکھنا کہ جس سے دل میں قلق پیدا ہو ۔ دائیں ہاتھ کو کاٹنا اور آنکھ کو نکالنا ، یعنی ان نشاط آمیز گناہوں کو چھوڑنا جو جان کی برابر عزیز تھے ۔ ان سے نفرت کرنا ، پھر ان کو نہ کرنا ۔ ایسا غارت کرنا کہ گویا ان کی طرف رغبت کرنا ہماری فطرت ہی میں نہ تھا ۔ توبہ ایک دلی ندامت ہے جس سے آیندہ کی زندگی پاک صاف

ہوتی ہے - توبہ میں معصوم بنانے کی قدرت ہے - گناہ کی ندامت کے سبب سے جو آنکھ سے آنسو نکلے وہ نیکی کو مقدّس بناتا ہے - مگر یہ آنسوؤں کی جھڑی برابر لگی رہے - اُس کے ایک دفعہ کے برسنے سے کام نہیں نکلتا ، کیوں کہ توبہ فقط ایک دفعہ کا کام نہیں ہے بلکہ وہ ایک متواتر سلسلہ ہے جو برابر جاری رہے - توبہ کے رنج و قلق میں جو لطف ہے وہ کسی خوشی میں مزہ نہیں - یہی رنج ایسا ہے جس پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں - توبہ ہی آدمی کو آئندہ کے لیے معصوم بناتی ہے - توبہ ہی زمانۂ ماضی کی قبر کو سبزہ و لالہ سے ڈھک دیتی ہے - گناہوں سے جھوٹی توبہ کرنی گناہوں پر اَور اضافہ کرنا ہے - توبہ کر کے پھر گناہ کرنا قے کر کے چاٹنا ہے جس سے معدہ اَور زیادہ خراب ہوتا ہے - سچّی توبہ وہ ہے جو آدمی اس سبب سے کرے کہ میں نے گناہ سے خدا تعالیٰ کو اپنے سے ناراض کیا ہے - نہ اِس خوف سے کہ خدا مجھے جہنّم میں ڈالے گا - توبہ میں رنج و غم غلام کا سا نہ ہو بلکہ بچّے کا سا - سچّی توبہ انسان کے افعالِ زندگی کو بدل دیتی ہے - خوف اور ندامت ایسی دامن گیر ہوتی ہے کہ بدکاری میں قدم نہیں رکھنے دیتی - گناہ سے دل ایسا غم زدہ ہوتا ہے کہ گناہ کرنے سے خوف کے مارے آدمی لرزتا ہے - ترکِ عصیاں کاری فتویٰ جنابِ باری کو بدل دیتی ہے -

۲- بعض آدمی توبہ کرنے کو فعلِ عبث جانتے ہیں - بعض توبہ کرنے میں غلطی کرتے ہیں - مگر اکثر توبہ کرنے میں تساہل کرتے ہیں اور اس تساہل کے سبب یہ دو مغالطے ہوتے ہیں ؛ اول مغالطہ یہ کہ آدمی خدا تعالیٰ کی رحمت پر خوردبین کا شیشہ لگا کے اُس کو بے حد و نہایت سمجھنے لگتا ہے اور جانتا ہے کہ کسی قانون اور قاعدے کی وہ پابند نہیں ہے - خواہ میں کیسے ہی

گناہ کروں وہ معاف کر دے گا ۔ وہ جانتا ہے کہ خدا کی رحمت بے آسروں کا آسرا ہے ، خوف زدوں کا مأمن[1] ہے ، زخموں کا مرہم ہے ، ناتوانوں کی توانائی ہے ، مُردہ دلوں کی روح افزائی ، ناآمیدوں کی اُمید گاہ ۔ غرض خدا کے لطف و کرم پر اعتبار کر کے توبہ کرنے میں تساہل کرتا ہے ۔ دوم ، خدا کی عدالت کے سمجھنے میں یہ غلطی کرتا ہے کہ اس کو یقین ہے کہ وہ گناہ نہیں بخشے گی ، سزا دے گی ۔ اس لیے وہ توبہ سے یہ نہیں جانتا کہ گناہ بخشے جائیں گے ۔ اس کو بالکل بخشائشِ گناہ سے مایوسی ہوتی ہے ۔ جب آدمی کسی قسم[2] کے گناہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان سمجھاتا ہے کہ وہ نہایت ضعیف و صغیر گناہ ہے ، خدا کی رحمت اس کو بخش دے گی ۔ اور جب وہ اس کو کر چکتا ہے تو اس کو سمجھاتا ہے کہ یہ ایسا بڑا گناہ ہے کہ خدا کی عدالت کبھی اس کی معافی کو جائز نہیں رکھے گی ۔ شیطان جھوٹوں کا بادشاہ ہے ، مگر معلوم نہیں انسان کیوں اس کی اس بات کا اعتبار کر لیتا ہے ۔ انسان یہ جانتا ہے کہ اب بھی زندگی بہت باقی ہے ۔ جب وقت آئے گا تو توبہ کر لیں گے ۔ ابھی تو گناہ کے مزے لوٹے جائیں گے ۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جب موت کا وقت آ جائے گا تو توبہ اس آخر وقت کی کس کام آئے گی ۔ جب ساری زندگی بدکاری میں کٹی ہو تو ایک دفعہ کے نیک کام کرنے سے اور چند الفاظ کے کہنے سے کیا ساری عمر کی بدکاریاں دھوئی جا سکتی ہیں ؟ جس نے ساری عمر اپنی چوری میں کاٹی ہو وہ اس آخر وقت میں توبہ کرنے سے ولیّوں کی موت پا سکتا ہے ؟

۳۔ یہ بات آسانی سے ثابت ہو سکتی ہے اور سب اس کو مانتے

۱۔ مأمن = جائے امن ۔ ۲۔ ”قسم“ اضافہ مرتب ۔

ہیں کہ انسان ضعیف البنیان کا مقصدِ اعظم یہ ہے کہ اپنے خالق کو راضی رکھے - اور یہ حیوانِ ناطق یہ بھی سمجھتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جتنے احکام اس کے لیے جاری کیے ہیں اُن کو وہ کماحقہ بجا لا نہیں سکتا - اس وجہ سے اس کو خوف ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ مجھے سزا دے گا اور راندۂ درگاہِ الٰہی ہوں گا - اس سزا کا بوجھ دل پر نہایت گراں معلوم ہوتا ہے ، اس لیے وہ اپنے گناہوں کا صدقہ اور فضلِ الٰہی سے مایوسی کا کفّارہ دیتا ہے - یہ دونوں باتیں ہر مذہب کی جزوِ اعظم ہیں -

تمام عالم میں گناہوں کے کفّارے اور صدقے دینے کے طریقے مختلف ہیں - اور بعض ان میں ایسے مکروہ اور زبوں ہیں کہ انسان کو انسانیت کے درجے سے گراتے ہیں - وہ حُمق اور خوف نے ایجاد کر دیے ہیں - مگر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب زمانوں اور ساری قوموں میں اس پر اتفاق ہے کہ خدا تعالیٰ بخشایندہ اور بخشندہ ہے - ہر مذہب اسی اصول پر مبنی ہے کہ خدا تعالیٰ بڑا غفورالرحیم ہے - وجودِ الٰہی کو فلسفہ ثابت کرتا ہے مگر جب تک اس کے ساتھ غفورالرحیم ہونا اس کا نہ تسلیم کیا جائے تو انسان پر فقط وجودِ الٰہی کا اثر کمتر ہوتا ہے - خدا کے لطف و کرم کا انسان کو کیا لطف آئے گا جب وہ یہ جانے گا کہ اگر میں ذرا بھی اس کے حکم سے سرتابی کروں گا تو وہ کبھی میری خطا کو اپنی عطا سے معاف نہیں کرے گا - پس وہ اپنا خیال خدا کی رحمت کی طرف سے اُٹھا کے یہ جانے گا کہ وہ ایسا حاکم ہے کہ عفو کرنے میں اور رضامند ہونے میں نہایت سخت ہے - اس کو وہ یہ جانے گا کہ ایسا دشمن ہے کہ جس میں بے انتہا کی دانائی ہے - نہ اُس کو کوئی دھوکا دے سکتا ہے ، نہ اُس سے بھاگ سکتا ہے ، نہ اس سے مقابلہ کر سکتا ہے -

قاعدہ ہے کہ جہاں اُمید نہیں وہاں سعی نہیں - انسان دنیا کے کاموں میں ایسا مصروف رہتا ہے کہ وہ خدا کی ایسی اطاعت[1] نہیں کر سکتا کہ جس میں کبھی قصور نہ ہو - پس اگر خدا کی بخشائش کی اُمید بندے کو نہ ہو تو یہ ناامیدی انسان کا قدرتی تنزّل ایک گناہ سے دوسرے گناہ کی طرف کرتی چلی جائے گی - اُمیدِ بخشائش ہی تو بندے کو نیکی کی راہ پر لے جاتی ہے - جس وقت ہوائے نفسانی کا جوش فرو ہو جاتا ہے تو انسان کو پھر از سرِ نو یہ اُمید تقویت دیتی ہے[2] اور جن دشواریوں نے اُسے مایوس کیا تھا اور جن غفلتوں نے حیران کیا تھا اُن کے دور کرنے کے لیے مستقل اور مضبوط بناتا ہے -

وہ ازمنہ اور سرزمینیں کہ کسی طرح کا تعلق اتّصال کا نہیں رکھتے اور کبھی ان میں تکلّم و ترسّل نہیں ہوا ، تجارت کا باب اُن میں وا نہیں ہوا ، وہ سب اس میں متفق علیہ ہیں کہ گناہوں کا کفّارہ اِس خوف کے سبب سے دیا جائے کہ گناہوں کی سزا سے نجات ہو - یہ یقین ہے کہ اس کفّارہ دینے سے خدا راضی ہو جائے گا - جو شخص اپنے گناہ کی سزاؤں کا اندازہ کرتا ہے وہ کفّارے کی تکلیفوں کو ان کے مقابلے میں ہیچ جانتا ہے -

۴- انسان بالطبع اپنے تئیں اچھا جانتا ہے - اپنی زشت افعالی کو چھپاتا ہے - اپنی بڑی خطاؤں کو چھوٹا جانتا ہے اور ان کے لیے معذرت کرتا ہے ، اور اُن چیزوں میں مصروف رہتا ہے جو اس کو خوش کرتی ہیں - اپنی شہوت پرستی میں دیوانہ بنتا[3] ہے گو اس کی پیروی میں ہلاک ہی کیوں نہ ہو جائے ، اس لیے وہ توبہ کی طرف

۱- اصل : طاعت اور اطاعت -   ۲- ''ہے'' اضافۂ مرتّب -

۳- اصل : بناتا ہے -

خیال نہیں کرتا اور رنج اور قلق اور ندامت کو اٹھانا پسند نہیں کرتا ، گو وہ توبہ کے اجزا نہیں مگر ملازم ہیں -

۷۶- مصنّفوں کی تحریر و تقریر میں فرق

مصنّفوں کی تحریر اور تقریر میں اور ان کے قول و فعل میں بڑا فرق دیکھا جاتا ہے - ملٹن[1] نے ایک اجنبی فاضل کو ، جو اس کی ملاقات کے لیے آیا تھا ، یہ لکھا کہ میں بہت اپنے تئیں مبارک باد دیتا ہوں کہ میرا دل کہتا ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ ملاقات میں وہی اپنی خصلت دکھائی جو میری تھی اور جو میری تصنیفات نے مشہور کر رکھی ہے - اکثر مصنّفوں کی صفاتِ ستودہ اور خصائلِ محمودہ کا خیال ، جو تصنیفات سے پیدا ہوتا ہے ، وہ ان کے حالات کے دریافت کرنے سے ایسا جاتا رہتا ہے جیسا بُلبلہ پانی کا ، جو چمک رہا ہو ، ہاتھ لگانے سے - جیسے بعض مشرقی بادشاہوں کا دستور ہے کہ وہ عوام الناس سے گو باتیں نہیں کرتے لیکن اپنے احکام سے رعایا کو اپنے حال سے آگاہی دیتے ہیں ، ایسے ہی مصنّفوں کو بھی اُن فرماں رواؤں کا سا حال بنانا چاہیے - کیونکہ کوئی شخص اُن آدمیوں سے کچھ سیکھنا نہیں چاہتا جن کو وہ جانتا ہے کہ مجھی جیسی حماقت اور ضعف اُن میں ہے - مصنّف کے گھر میں اگر کوئی شخص دفعۃً گھس جائے تو اس کا حال ایسا ہی پائے گا جیسا کہ محلّوں میں داخل ہونے سے بادشاہوں کا حال دیکھے گا کہ نہ وہ قانون پر مباحثہ کرتے ہیں ، نہ سپاہ کی اصلاح کرتے ہیں - عورتوں کے ساتھ دل بہلا رہے ہیں اور ان پر حکم چلا رہے ہیں - اس

۱- ملٹن : (۱۶۰۸ع — ۱۶۷۴ع) مشہور انگریز شاعر جس کی زندۂ جاوید نظم ''پیراڈائز لوسٹ'' (Paradiselost) کو عالم گیر شہرت نصیب ہوئی -

کی بہت سی وجوہ ہیں کہ ایک شخص کی تحریر میں اقوال اس کی زندگی کے افعال سے اچھے ہوں - پاک خیالات میں داخل ہونے کے بغیر کوئی منصوبہ باندھنا تو آسان ہے مگر اس کا کرنا مشکل ہے - جب ایک شخص زندگی بسر کرنے کی تدابیر بتاتا ہے تو نہ اس کو کوئی امید اکساتی ہے، نہ کوئی خوف ڈراتا ہے، نہ کوئی خواہشِ نفسانی محرّک ہوتی ہے - وہ ان سب باتوں سے الگ ہو کر اس طرح سکھاتا ہے جیسے کوئی زمین پر علمِ جہازرانی سکھاتا ہو جس کے نزدیک سمندر خاموش ہے اور ہوا موافق چل رہی ہے - علومِ ریاضی کا ماہر خوب جانتا ہے کہ علومِ بسیطہ میں جو نظریات ہوتے ہیں اور ان کے اعمال جب زندگی کے کاموں میں کیے جاتے ہیں تو مادے کے نقص کے سبب سے اور اَور اتفاقات کے پیش آنے سے وہ نظریات، عملیات میں کچھ اَور ہی نتیجے دکھاتے ہیں - یہی حال علومِ اخلاق کا ہے کہ اس میں خیالی نیکیاں بنا لینی تو آسان ہیں مگر ان کے عمل میں لانے کے لیے بہت سے موانع پیش آتے ہیں - جو خیالات گھڑتا ہے، فقط اس کو تو غلط استدلال کا خوف ہے لیکن جو ان کو اپنی زندگی کے کاموں میں عمل میں لاتا ہے، اس کے پیچھے بہت سے بکھیڑے لگے ہوئے ہوتے ہیں - اپنے نفس کے جذبات اور اَوروں کے نفس کی خواہشیں اور ایسے ہی سینکڑوں موانع و عوارض اس کے دق کرنے والے پیش آتے ہیں جو اس کو حیران کر کے چلنے نہیں دیتے - مجبور ہوتا ہے کہ بے سوچے اور امتحان کیے کام کرے - دفعتاً ساری چیزوں کی حالتیں بدل جاتی ہیں جن کے سبب سے ان کے ظاہری حال کے موافق اس کو کام کرنا پڑتا ہے اور اس کو اَوروں کی مرضی کے موافق اس وجہ سے چلنا پڑتا ہے کہ یا تو وہ مست ہوتا ہے یا تھک جاتا ہے - کبھی اس کو یہ اندیشہ کرنا پڑتا ہے کہ

حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے۔ بعض اوقات دشمنوں کو یا دوستوں کو دیکھتا ہے کہ اس کو دھوکے اور فریب دیتے ہیں۔

پس اس لیے ہم کو تعجب کرنا نہیں چاہیے جب ہم یہ دیکھیں کہ ایک شخص خلوت و عافیت میں، آسائش و آرام میں، ایسے دل سے جس میں کوئی جانب داری نہیں ہے اور ایسی آزادی سے جس کے لیے کوئی قید نہیں ہے، جو احکام و نصائح لکھے[۱] وہ خود جب بکھیڑوں اور جھمیلوں میں پھنسے تو ان[۲] کا پابند نہ ہو۔ بالفعل نہ آدمی کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ توقع کرتا ہے کہ جو اس کو حاصل ہو سکتا ہے۔ خواہ ہم کیسی ہی جان مار کے کوشش اور سعی کریں، ایک دن بھی خالص بے گناہی کے ساتھ نہیں کاٹ سکتے۔ جسمانی قفس میں ایسا دل پھنسا ہوا ہے کہ خیالی نیکیوں تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ یہ امر نہایت انصاف کے برخلاف مروج ہو گیا ہے کہ جو شخص بڑی سرگرمی سے نصیحت کرتا ہے، مگر اس کی تعمیل میں خود غفلت کرتا ہے، تو اس کو لوگ مکّار، ریاکار کہتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بالکل نفسِ امّارہ پر فرماں روائی کے فوائد سے خوب آگاہ ہو اور ان کے بیان کرنے میں بے ریا ہو مگر ابھی تک وہ اپنے نفسِ امّارہ پر کامل فتح یاب نہ ہوا ہو۔ جیسے کوئی شخص سفرِ بحری کے فوائد پر مطلع ہو، گو اس نے خود بحر میں سفر نہ کیا ہو۔ وہ اَور لوگوں کو اس سفر کی ترغیب دے، گو خود نہ کرے، تو اس میں کیا گناہ ہے۔ ان اقوال و افعال کی نقیض بتلانے سے اس گروہ کا بڑا مطلب نکلتا ہے جس نے اپنے اطوار کی اصلاح کے لیے دل کو پتھر

۱۔ اصل : لکھی۔ ۲۔ اصل : اس کا۔

بنا لیا ہے ۔ وہ یہ کہنے لگتے ہیں کہ خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت ۔ جو ہم کو حکم کرنے کے لیے دیتے ہیں وہ خود نہیں کرتے ۔ فقط مذہبی اور اخلاق مسائل میں وہ رایوں کا فیصلہ اعمال سے کرتے ہیں ۔ جس مصنّف کے افعال مطابق اقوال کے نہیں پاتے اُس کو الزام لگاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ وہ خود جن معاملاتِ دُنیوی کا فیصلہ اپنی رائے سے کر چکے ہیں اُس کے برخلاف کتنے کام کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ جو نیکی کے حامی ہیں اُن کے چال چلن سے نیکی کے احکام میں کچھ کمی و بیشی نہیں ہو سکتی ۔ دلیل سے دلیل ضعیف ہوتی ہے ، مگر اس کا زور کچھ اس سے کم نہیں ہوتا کہ جو شخص اس کو پیش کرتا ہے ، وہ اس کے یقین کو خود ظاہر نہیں کر سکتا ۔

یہ تعصّب خواہ کیسا ہی بے دلیل ہو ، ہمیشہ پھیلا رہے گا ، اس لیے جو نیکی کے سکھانے والے ہیں ، وہ اُس کا خیال رکھیں تاکہ وہ اپنی تفہیم و تدریس کے اثروں کو نہ روکیں ۔ جب آدمی یہ چاہے کہ میں اَوروں کو ایک بات پر یقین کراؤں تو اُس کو ثابت کرنا چاہیے کہ میں خود اس کا یقین کرتا ہوں اور جو کسی نیکی کی دلیل بیان کرتا ہوں اپنے تئیں اس کی مثال بنا کر اس کا ممکن ہونا خود دکھلاتا ہوں ۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس کو یہ ضرور کرنا چاہیے کہ وہ اُس نیکی کو اَوروں سے کم نہ کرے ، اس لیے کہ وہ اس کو اچھی طرح تحریر کرتا ہے ۔ اور ہرگز وہ یہ نہ خیال کرے کہ میں جو نیکی کی وجوہ بیان کرنے میں ذہانت خرچ کرتا ہوں ، اس سے میں مستحق اس کا ہو گیا ہوں کہ ادنیٰ درجے کے آدمیوں سے بھی زیادہ اس نیکی کے کرنے میں غفلت کروں ۔ علومِ طبیعیہ کی تحقیقات میں ایک چیز کی حد غایت لکھی

جاتی ہے - ایسے ہی علمِ اخلاق میں ہم ایک نیکی کی قطعی خوبی کو اپنے آگے رکھتے ہیں اور اس کی بلندی کی جو حد غایت ہے وہ لکھتے ہیں اور اس پر چڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں ، مگر کبھی اس کی چوٹی تک پہنچتے نہیں - بعض آدمی اسی لیے اپنے تقدّس کو ، جو مذہب کی پابندی سے ہوتا ہے ، مخفی رکھتے ہیں تاکہ مذہب کے خلاف کام کرنے سے کوئی بڑی شرمندگی نہ اٹھانی پڑے جس سے مذہب کی اہانت ہو - پس اسی طرح مصنّف کو چاہیے کہ وہ اپنی تصنیفات کے اقوال کو اپنے افعال سے جب تک ثابت نہ کر سکے تو اپنا نام نہ لکھے اور یوں اپنے تئیں مخفی رکھے - بعض مصنّفوں کا مطلب نہ برائی کی اہانت سے ہوتا ہے ، نہ نیکی کی عظمت سے بلکہ فقط اپنی لیاقت اور استعداد کی ترقی اور اپنی ذہانت و ذکاوت اور قوتِ بیان و قدرتِ زبان کا دکھانا منظور ہوتا ہے - ان کو کچھ اپنی رائے اور فیصلے کی صداقت کا اظہار منظور نہیں ہوتا - ایسی تصنیفات تعریف کے قابل ہوتی ہیں مگر مصنّفوں کی صحبت نفرت کے قابل -

اکثر آدمی اس عمر میں علم حاصل کرتے ہیں جس میں اخلاق و اوضاع و اطوار خوب درست و مہذّب کر سکتے ہیں - مگر جب اُن کو علم اِتنا حاصل ہو جاتا ہے کہ لوگ ان کی تعظیم و تکریم کرنے لگتے ہیں تو وہ اُن خفیف کاموں کو چھوڑ دیتے ہیں جن سے وہ خوش ہوتے تھے - پھر جب وہ جوان ہوتے ہیں ، اگر اُن کا مزاج نرم ہوتا ہے تو اپنے عیبوں اور نقصوں کو دیکھ کر شرماتے ہیں اور اگر مزاج میں اولوالعزمی ہوتی ہے تو اپنی لیاقت پر پھولتے ہیں اور اَوروں سے مباحثے پر سرگرم ہوتے ہیں اور اپنی فتح یابی کے لیے جلدی کرتے ہیں - اکثر ایسے آدمیوں کی تقریر منجھ جاتی ہے اور خوبیاں اس میں پیدا ہو جاتی ہیں ، مگر تصنیفات کے لیے جو

خوبیاں درکار ہیں ، ان میں وہ کامیاب نہیں ہوتے - اور بعض آدمی اپنے مطالعے کو تصنیفات کے لیے جاری رکھتے ہیں اور وہ خوبیاں پیدا کرتے ہیں جو تصنیف میں ہونی چاہئیں - ایسے مصنّفوں سے باتیں کرنی اور تصنیفات کا پڑھنا ایسا ہے جیسا کہ کسی بڑے شہر کو دور سے دیکھ کر ہم اُس کے اندر داخل ہوں - دور سے اُس کی بڑی بڑی عالی شان عمارات و مکانات اور رفیع برج و مینار دکھائی دیتے تھے ، مگر جب اس کے اندر دروازے سے داخل ہوئے تو تنگ گلیاں و بازار ، جھونپڑے ، موریاں اور بیس طرح کی ایسی چیزیں پیش ہوتی ہیں کہ جن سے دل مکدّر ہوتا ہے - پس ایسے ہی جو اخلاق کی خوبیاں اُن کی تصنیفات سے معلوم ہوئی تھیں ، وہ ان کی باتوں سے ، ملاقات میں ، نہیں معلوم ہوتیں -

۷۷- جسمانی و روحانی خوشی

ایک فرقۂ حکما زاہدانہ بڑی شدّ و مد سے یہ حکم کرتا ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی خوشی و مسرّت کو خارجی چیزوں کے اثر سے مصیبت نہ بنائے - یہ حکم اُن کا خواہ کسی رتبے کا ہو مگر اس پر عمل کرنا انسان کی شرطِ زندگی کے خلاف ہے - دانش مند آدمی سے ممکن نہیں کہ وہ اپنے جسمانی رنج و راحت کو بالکل اپنے سے دور کر دے - اِسی وجہ سے دوسرا فرقۂ حکما اس حکم کو بے دلیل و نامعقول بتاتا ہے - ہر لحظہ و لمحہ و ساعت کا تجربہ اس کو غلط ثابت کرتا ہے اور قوائے نیچریہ اس کے بالکل برخلاف شہادت دیتے ہیں - اب ہم کو تحقیق کرنا ہے کہ پہلا حکم جو اعلیٰ درجے کا ہے ، اُس کی تعمیل کرنے کی قدرت ہم میں کہاں تک ہے اور کس حد تک ہم خارجی چیزوں سے ایسا اجتناب کر سکتے ہیں

کہ وہ ہمارے دل پر اثر نہ کریں اور ہماری عافیت میں خلل نہ ڈالیں۔ گو بالکل اُس سے آزادی کی شیخی مارنی ہنسی کے قابل ہے مگر جسمانی آرام کا مغلوب ہو جانا اور جس طرف وہ موڑیں مڑ جانا، دل سے بعید ہے، خواہ وہ کیسا ہی ضعیف اور محروم ہو۔

۷۸۔ ماضی و استقبال کے خیالات

اِس عالَم میں یہ بڑے بڑے مادی ٹکڑے پھرتے ہوئے جو ہم دیکھتے ہیں ان میں سے سخت ٹکڑے میں اتنے مسامات ہیں کہ اگر اُن کو دبا کر کامل سخت جسم بنائیں تو وہ چند مکعب فیٹ میں سما جائیں۔ اسی طرح اگر زندگی کے تمام کام جمع کیے جائیں تو وہ چند ہفتے یا دن یا گھنٹے ہوں گے جن میں دل اُن کے کرنے میں مصروف رہا ہوگا۔ ہمارے جسمانی و روحانی کاموں میں ایسی نامساوات ہے کہ جو ہم دل میں لمحوں میں سوچتے ہیں وہ برسوں میں کرتے ہیں اور روح ہماری بے کار رہ کر ہمارے ہاتھوں اور پاؤں کی محنت کو دیکھتی ہے۔ ہمارے سب کاموں کی اصل ہمارے نفس میں ہوتی ہے، اس لیے اپنے خیالات کو خراب کرنا گویا سرچشمۂ اخلاق کو زہریلا بنانا ہے۔ اس لیے بعض اہلِ اخلاق نے لکھا ہے کہ جیسا بُرا کام کرنا گناہ ہے، ایسا ہی بُرا خیال کرنا گناہ ہے۔ نکوکاری کی بڑی حفاظت یہی ہے کہ آدمی ہمیشہ اپنے خیالات کی بڑی حفاظت کرتا رہے۔ جب خیالات میں بُرائی آنی شروع ہو تو اُسی وقت سے دوا کے درپے ہو۔ گزشتہ کی یاد آیندہ کے لیے بکار آمد ہوتی ہے۔

فیثاغورث کا قول ہے کہ آدمی جب تک سوئے نہیں، وہ روزِ گزشتہ کے سب کاموں میں اول کام سے لے کر اس طرح خیال نہ

کرے کہ کس جگہ میں اپنے استقلال سے باز رہا - کون سی باتیں مجھے کرنی چاہیے تھیں وہ نہیں کیں اور پھر اپنے اچھے کاموں سے خوش اور بُرے کاموں سے رنجیدہ ہو -

نیک آدمیوں کے دلوں میں بھی برے خیالات آتے ہیں مگر وہ یوں ہی چلے جاتے ہیں - کوئی دھبّا اور داغ دل پر نہیں لگا جاتے ہیں - ماضی اور حال کے خیالات میں وہ دشواریاں نہیں جو آیندہ کے خیالات میں پیش آتی ہیں کیونکہ خوف و رجا آیندہ کے خیالات پر موقوف ہوتے ہیں - اس کی کوئی حد نہیں مقرر ہوتی - ان میں بے شمار واقعات کا خیال کر سکتے ہیں اور وہ اپنی پسند پر موقوف ہیں - ہر چیز کے حاصل ہونے کا خیال کر لینا بہ نسبت حاصل کرنے کے بہت آسان ہے - جو آدمی اپنے کاموں کو نیکی کا پابند کرنا چاہتے ہیں ، اُن کو چاہیے کہ ہمیشہ خیالات وہ کیا کریں جو عقل کے موافق ہوں - اور خوب سمجھ لیں کہ دل میں خباثت کے خیالات کا بسانا برے کام کرائے بغیر نہیں رہے گا -

۹۷- علمی اور ملکی کاموں میں ایک سے خطرات ہیں

۱- ہر شخص کو اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے ، اس لیے وہ یہ خیال کرتا ہے کہ بعض صفات اس میں ایسی ہیں کہ وہ اَور بنی آدم سے نوع میں یا درجۂ عزّت میں اچھی ہیں - اپنے ظاہری عیبوں کے پلڑے کو اپنی مخفی خوبیوں کے پلڑے سے ہلکا خیال کرتا ہے - جو علم دوست آدمیوں کا فرقہ ہے وہ اپنے تئیں خوش حال اُن مدّبرانِ ملکی سے جانتا ہے جو ہمیشہ معاملاتِ ملکی کے افکار میں مبتلا رہتے ہیں ، اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کے عہدے بڑی محنتوں و م[illegible]ں اور جوکھوں کے اٹھانے کے بعد حاصل ہوتے

ہیں - اور پھر اُن میں استقلال نہیں ہوتا - اور اپنی اس بات پر پُھولتے ہیں کہ ہمارے پاس وہ ہتھیار ہیں کہ جو کبھی کند نہیں ہوتے اور کسی حکمت اور دشمن کی قوّت سے وہ چھن نہیں سکتے - ہندوستان میں ہاتھیوں کو لڑنا سکھاتے تھے جو میدانِ جنگ میں دشمنوں کو پامال کرتے تھے - لیکن اگر دشمن ان کے اول حملے کی برداشت کر جاتا تو پھر ان کو آسانی سے ایسا بھگا دیتا کہ اپنے ہی لشکر کو وہ روند ڈالتے تھے - پس ان ہاتھیوں کا سا حال اوپر کی دلیل کا ہے کہ جیسی وہ مدّبرانِ ملکی پر حملہ آور ہوتی ہے ، ایسی ہی اہلِ علم پر - علم کا حاصل ہونا اور اس میں نامور اور مشہور ہونا ایسا ہی نامحقّق ہے جیسا کہ میدانِ جنگ میں فتح یاب ہونا یا ملک کی فرماں روائی میں سرافراز ہونا اور تدابیرِ ملکی میں کامیاب ہونا - علم میں بزرگی حاصل ہونے کے واسطے وہی محنت و مشقّت چاہیے جو اَور معاملاتِ ملکی میں - ہر چیز کی بزرگی اس کی تحصیل کی دشواری اور محنت کے متناسب ہوتی ہے - علم و ذہانت کے عالم میں جن لوگوں کی عزّت اور بزرگی پائی جاتی ہے ، اُن کی آرزوئیں وہی ہوتی ہیں جو اَور قسم کے جلیل القدر آدمیوں کی ہوتی ہیں کہ اپنے حریفوں اور رقیبوں کو زیر کرنا اور ان کی بزرگی کو اپنی بزرگی کے مقابل میں کمتر کر دینا - کسی کو اپنی برابر نہ ہونے دینا - پھر اپنی ان آرزوؤں کے پورا کرنے کے واسطے ذلیل اور رزیل وسائل اور حکمتوں کو کام میں لانا - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی علم میں برتری ، بغیر اس کے کہ وہ زیادہ دانا یا نیک اُن لوگوں سے ہو جن کی جہالت کی وہ حقارت کرتا ہے ، کہاں تک حاصل کر سکتا ہے -

خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ علم کی خوشی کی عمارت جس بنیاد پر قائم ہوتی ہے اس کا بھی استحکام ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ اُن کے

مخالف متّدبرانِ ملکی کا - علم کے میدان کے جو غازی ہیں ، اُن کو وہی آفتیں اور دشواریاں پیش آتی ہیں جو میدانِ جنگ کے متّدبرانِ ملکی کو - اور ان دونوں پر یکساں حسد ہوتا ہے اور ان کو اپنی حفاظت اُن ہاتھوں سے یکساں کرنی پڑتی ہے جو ان کے برباد کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں - ہاں اہلِ علم کو یہ امید زیادہ ہوتی ہے کہ ان کی ناموری کی بقا عرصۂ دراز تک رہے گی اور حادثات کے ہاتھ سے بچی رہے گی - یہ اُمید بھی ان کی بے جا ہے ؛ اس لیے کہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے زمانے میں بہت سے بڑے بڑے مصنّف اور اہلِ علم گزرے ہیں کہ نہ جن کی تصنیف کا پتا ہے ، نہ نام کا - فقط یہ معلوم ہے کہ کبھی ان کا وجود تھا - اگر علم کی شہرت پر خیال کریں تو وہ ایک امرِ ناتحقیق ہے - تصنیفات کی شہرت بھی عجب عجب طرح سے ہو جاتی ہے - کبھی عوام کی جہالت سے ، کبھی اُمرا کی عنایت سے ، کبھی اس کے جدید ہونے سے - ایسے ہی شہرت کے مٹ جانے کی صورتیں ہوتی ہیں - مختلف مصنّفوں کی تصنیفات کی شہرت کی نسبت فقط یہ امر نہیں ہے بلکہ ایک ہی مصنّف کی تصنیفات کا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک کتاب اس کی بہت جگہ مشہور ہو جاتی ہے ، دوسری کتاب کو اس کی کوئی[1] پوچھتا نہیں - مصنّف جو بعض ایسے کاموں کو اختیار کرتے ہیں جن سے ان کی شہرت مٹ جاتی ہے ، اس کا سبب ان کی بے وقوفی نہیں ہوتی بلکہ بدنصیبی و کم بختی - اکثر یہ ہوتا ہے کہ مصنّفوں کو علمی اور ذکاوت کی کتابیں ایسے آدمیوں کی فرمائش و ہدایت کے موافق لکھنی پڑتی ہیں کہ جو ان کو انعام و اکرام دیتے ہیں - مصنّف اپنی پسند سے کوئی مضمون اس کتاب کے لیے نہیں تجویز کرتا ہے بلکہ بہ مجبوری اپنے

۱- "کوئی" اضافۂ مرتّب -

ولیِ نعمت کی مرضی کے موافق مضمون پسند کرنا پڑتا ہے۔ اس میں وہ آسانی ملحوظِ خاطر نہیں رکھتا اور نہ اس مضمون کا علم پہلے سے ہوتا ہے۔ نہ مطالعہ جو اس کے لیے ضروری ہے، وہ رکھتا ہے۔ نہ اتنی مہلت اور فرصت اس کو ملتی ہے جو اس کی تحریر کے لیے چاہیے ہے۔

ذکی اور عالم ہونے کا بڑا نتیجہ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ اس سے اُمرا اور سلاطین کے ساتھ تقرّب کی تقریب ہو جائے۔ جب کسی عالم کو اس پر فخر ہو کہ وہ ایسے اُمرا سے اتحّاد رکھتا ہے جن کو اپنے[1] نسب پر یا دولت پر یا اپنی بلند مرتبگی پر گھمنڈ ہے تو وہ ضرور اُن[2] کی مرضی کا تابع اپنے[3] مطالعۂ علمی میں ہوگا اور اپنے علم کو اپنی مطلب برآری اور اُن کے دل بہلانے میں صرف کرے گا۔ وہ جن کو خوش کر کے اپنے اوپر مہربان کرنا چاہتا ہے اور جن کی عنایت کو وہ اپنے لیے ضروری سمجھتا ہے، وہ کسی کتاب کی فرمائش کریں گے تو اس کو تصنیف کرنے ہو بیٹھے گا اور کچھ اپنی لیاقت پر خیال نہ کرے گا کہ اس کتاب کی تصنیف کی ہے یا نہیں۔

بعض دفعہ مصنّفوں کو کسی[4] امیر کے پھسلانے کی پروا نہیں ہوتی بلکہ خود ان کے دماغ میں یہ خبط سا جاتا ہے کہ ہم ہر قسم کی انشا پردازی کے قابل ہیں اور جمہور کے مختلف مذاقوں کے موافق رنگا رنگ کے مضامین لکھ سکتے ہیں۔ اکثر یہ خبط پیرانہ سالی میں زیادہ ہوتا ہے کہ جب ان مضامین کے پورا کرنے کے لیے فرصت نہیں ملتی؛ چند ہفتے کے بعد خود ان کو موت آ جاتی

۱- اصل: اپنی نسب۔ ۲- اصل: اس کی مرضی۔
۳- اصل: اپنی مطالعۂ علمی۔ ۴- اصل: مصنّفوں کو گو کسی۔

ہے اور نئی نسل کو ان کے قائم مقام بننے کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے -

ہم اپنی تصنیفات کے دیکھنے میں اپنے بہت سے تعصّبات کے سبب سے اندھے ہو جاتے ہیں - مصنّف اپنی جوانی کی تحریرات کو دیکھ کر اس لیے خوش ہوتے ہیں کہ وہ ان کی نوجوانی کی لیاقت یاد دلاتی ہے - بڑی عمر کی تصنیفات کی قدر اس لیے کرتے ہیں کہ اس خیال کو ناجائز جانتے ہیں کہ انھوں نے ترقی نہیں کی - جو کچھ ان کی قلم سے بآسانی و بے ساختہ نکلتا ہے ، اس کو وہ سمجھتے ہیں کہ سحر کا سا اثر کرتا ہے ، اور اس کو بڑی خوشی سے اس وجہ سے پڑھتے ہیں کہ وہ ان کی رائے اور استعداد اور قابلیت کی خوشامد کرتا ہے - اور جو کچھ محنت و مشقّت اور خونِ جگر کھا کر لکھتے ہیں اس کو وہ مردود نہیں بناتے تاکہ ان کی مشقّتِ شاقہ اکارت نہ جائے - لیکن پڑھنے والوں کے دل میں پہلے سے یہ خیالات نہیں ہوتے اس لیے ان کو تعجّب ہوتا ہے کہ مصنّف کی تصنیفات کیوں ان سے غیر مشابہ ہے - مگر وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ ایک ہی زمین میں مختلف طرح کے تردّد کرنے سے مختلف طرح کی پیداوار ہوتی[1] ہے -

۲- جب کوئی عالی جاہ بادشاہ مرتا ہے تو اس کے قائم مقام پر بارِ سلطنت اٹھانا اتنا ہی دشوار ہوتا ہے جتنا پہلا بادشاہ اچھا ہوتا ہے - بڑی مصیبت اس کو یہ پیش آتی ہے کہ خواہ وہ کتنی ہی کوشش سے کوئی کام کرے ، وہ پہلے بادشاہوں کے کاموں کے آگے کچھ وقعت نہیں رکھتا - اسی طرح جب مصنّف کسی بڑے مصنّف کا جانشیں ہوتا ہے تو اس کو دقّتیں پیش آتی ہیں کہ خواہ یہ کتنی

۱- اصل : مختلف طرح کا پیداوار ہوتا ہے -

ہی اپنی جان مارے[1] مگر وہ پہلے مصنّف کے آگے چمکتا[2] نہیں۔ باغ کے تمام پھل پھول وہ پہلا ہی مصنّف توڑ کر لے گیا ہے، فقط درختوں کا سایہ اس[3] کے لیے چھوڑ گیا ہے۔ جس کے اندر کوئی پڑا پڑایا، سڑا بُسا پھل اس کو ہاتھ لگ جاتا ہے۔

۸۰۔ جُبن و تہوّر اور فضائل کی افراط تفریط[4]

بعض غلطیاں اور خطائیں ایسی ہوتی ہیں کہ کرنے والوں کے حق میں زہر ہوتی ہیں۔ مگر انسانوں نے علی العموم ان کو مان رکھا ہے کہ کچھ قدر ان کی کی جائے اور اُن کرنے والوں کی بدنامی نہ کی جائے۔ اس کی ایک مثال تہوّر اور جُبن ہیں۔ جو شجاعت سے، جو ان کے عین وسط میں ہے، برابر فاصلہ رکھتے ہیں۔ نقصان دونوں سے یکساں ہوتا ہے مگر ان میں سے تہوّر کا بیان ایک قسم کی تعظیم و ادب کے ساتھ ہوتا ہے اور جُبن کا ذکر نفرت و حقارت اور مذمّت کے ساتھ۔ یہی حال اِسراف اور طمع کا اور اَور متقابل رذایل کا ہے کہ ایک بُرائی کا بیان ادب کے ساتھ کیا جاتا ہے اور دوسری[5] کا نفرت کے ساتھ۔ تفریط کی حقارت اور افراط کی عزّت کی جاتی ہے۔ اس افراط کی افضلیت کی وجہ یہ ہے کہ اُس میں اوسط داخل ہوتا ہے اور یہ امر بدیہی ہے کہ ہر فضول چیز کا دور کرنا نقصان کے پورا کرنے سے بہت آسان ہے۔ پس جو نیکی متوسّط سے گزر گئی ہے، اس سے امید ہو سکتی ہے کہ وہ پھر اس پر عود کرے۔ لیکن جو اس حد تک پہنچتی نہیں، اس کی کامیابی کی امید

۱۔ اصل : جان ماریں۔ ۲۔ اصل : چمکتے نہیں۔

۳۔ اصل : ان کے لیے۔

۴۔ افراط=زیادتی۔ تفریط=کمی۔ ۵۔ اصل : دوسرے کا۔

مشکل ہے - ایک صورت میں جو کمال چاہے موجود ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ دوسری صورت میں کمال تک پہنچنے میں نقص و کمی ہے - جو گھوڑا ایسا تیز رو ہو کہ وہ اپنے ساتھ کے گھوڑوں سے آگے بڑھ جائے ، اس سے امید ہو سکتی ہے کہ وہ ٹھہر کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلنے لگے ، مگر جو گھوڑا ساتھ چل ہی نہیں سکتا اور پیچھے رہ گیا ہو ، وہ تیز دوڑ کر اپنے ساتھیوں سے نہیں مل سکتا - ایک بڑا درخت کلھاڑی سے چھانٹنے سے جھاڑی کی برابر بن سکتا ہے مگر جھاڑی اس درخت کی برابر نہیں ہو سکتی -

۸۱- گھر میں خوشی و رنج زیادہ تر آدمی کو ہوتے ہیں

اہلِ کیمیا کا یہ قول سچّا ہے کہ چند عناصر کے ترکیب پانے سے دنیا کی ساری چیزیں بنی ہیں - ان میں سے جس چیز کو چاہو عناصر میں تحلیل کر لو - پس اِسی طرح انسان کی زندگی چند رنجوں اور چند خوشیوں سے مرکّب ہے اور ان میں سے ایک حصّہ تو مشیّتِ ایزدی سے ہمارے لیے مقرّر ہے اور باقی حصّہ انسان کی خود پسندی اور عقل مقرر کرتی ہے - آدمیوں میں جو خوش مزاج ہیں وہ خوش حال ہیں اور جو بدمزاج ہیں وہ بدحال ہیں - بہت تھوڑے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا رشتۂ حیات مہماتِ عظیم سے اور میدانِ جنگ کے[۱] کارہائے نمایاں سے اور سپاہیوں کی سپہ سالاری سے اور قوموں کی سرداری سے متعلق ہو - ایسے بزرگوں کا بھی بڑا حصہ زندگی کا اپنے گھر کے کاموں سے متعلق ہوتا ہے - ان کو خوشی و رنج کے معاملات زیادہ تر گھر ہی میں پیش آتے ہیں -

---

۱- اصل : کی کارہائے نمایاں -

جمہور انام کے کاموں کے لیے وہ اپنے گھر ہی کے کاموں سے نکل کر آتے ہیں۔ پلینی[1] کا یہ قول سچ ہے کہ جن کاموں کی طرف ہماری توجہ ہوتی ہے، جو اُن میں زیادہ شان و شکوہ کے ہوتے ہیں وہ ہمیشہ بڑے نہیں ہوتے۔ خارجی اور اتفاقی حالات سے جو ناموری اور شہرت ہوتی ہے، جس پر لوگوں کو تعجّب ہوتا ہے، وہ نیکی اور شجاعت سے علاٖحدہ ہیں۔ عالی مرتبگی اور خوش نصیبی، کاموں کی تاثیراتِ عظیم یہ سب مل کر خلائق کی نگاہ میں بزرگی پیدا کرتے ہیں۔ مگر استقلال و ثبات، حلم و صبر بغیر اپنے تئیں دکھلانے کے زندگی کے ہجومِ کار میں گزر جاتے ہیں اور بڑی قوّت اور استقلال سے مصیبت اُٹھاتے اور کام کرتے ہیں۔ مگر نہ ان پر کوئی رحم کرتا ہے، نہ ان کی کوئی تعریف کرتا ہے۔ غرض یہ حال سب کا ہے۔ کچھ اُن لوگوں کا نہیں جن کے کاموں کو سب دیکھتے اور سنتے ہیں۔ ہزاروں آلام انسان کے دلوں پر چپ چاپ حملے کرتے ہیں اور وہ بےشمار صدمے پہنچاتے ہیں کہ وہ منہ سے اُف نہیں کرتے۔ علیٰ ھذاالقیاس ہماری خوشیاں ہیں جو چپ چاپ ہمارے دلوں کو خوش کرتی ہیں۔ دل میں بہت سی آرزوئیں ہوتی ہیں جن کا اظہار کبھی نہیں ہوتا اور ان سے ہمارے[2] اوقات، تنہائی میں خوشی سے بسر ہو جاتے[3] ہیں۔

۱- پلینی یا پلینوس: (۲۳ع—۷۹ع) قدیم رومی حکیم جو علومِ طبیعیہ کا ماہر تھا۔ اٹلی کے قدیم شہر پومپائی کی زلزلے سے تباہی کے دوران میں یہ اپنے بعض دوستوں کی امداد کے لیے اس شہر میں گھس گیا اور لاوے میں بہہ گیا۔ ''تاریخِ طبیعی'' کے نام سے اس نے ایک کتاب لکھی جو قدیم حکما کے علوم و معارف پر بہترین تصنیف ہے۔ اس میں مصنّف کے ۳۷ سفروں کا ذکر ہے۔

۲- اصل: ہماری اوقات۔ ۳- اصل: بسر ہو جاتی ہیں۔

غرض انسان کی خوشیاں اور رنج اِن باتوں میں ہوتی ہیں : بہت چھوٹے چھوٹے کاموں اور واقعات میں اور ایسی آرزوؤں میں جو دیرپا نہیں ہوتیں ، ایسی مایوسیوں میں جو قاتل نہیں ہوتیں ، ایسے چھوٹے جانوروں کے کاٹنے میں جو ڈنک مارتے ہیں اور ایسی گستاخیوں میں جو اُن کے گرد تھوڑی دیر بھنبھناتی ہیں اور پھر سننے میں نہیں آتیں - ایسی خوشیوں میں جو شہابِ ثاقب کی طرح جلوہ دکھا کے غائب ہو جاتی ہیں اور ایسی شکر گزاری میں جو راگ کی طرح اِدھر اٹر ہوا اُدھر اُتر گیا ، دونوں شاکر و مشکور ، شکر کو بھول گئے - غرض انسان کی بڑی دانائی یہ ہے کہ آدمی اُن گھنٹوں میں خوش رہے کہ جن پر شوکت و عظمت کا ملمّع نہیں کر سکتا - جن کو شان و نمود کا زیور نہیں پہنا سکتا اور نہ کسی اور بڑائی کا بہروپ ان کو بنا سکتا ہے - گھر میں خوش رہنا انسان کے تمام کاموں کا مآل ہوتا ہے - وہ ایسے چین اور آرام کے لیے محنتیں اور مشقّتیں اٹھاتا ہے اور مہمّاتِ عظیم کو اختیار کرتا ہے -

گھر ہی کے آدمی انسان کی نیکی اور راحت کا ٹھیک تخمینہ کر سکتے ہیں - یہاں اس کو اپنی نمود منظور نہیں ہوتی جو وہ جھوٹی فیّاضی اور ملمّع کی عزت دکھائے - سوائے اپنے گھر کے اَوروں کے گھروں میں سلسلہ وار مکر و ریا اور برے کاموں کو اچھے پیرایے میں ظاہر کرنا پڑتا ہے - گھر ہی میں آدمی اپنا چال چلن جیسا ہے ، ویسا دکھاتا ہے - کچھ روک ٹوک اس کے لیے نہیں ہوتی - جو اس کے دل میں آتا ہے وہ کرتا ہے - اس لیے اس کے خصائل کے شاہدِ صادق اہلِ خانہ ہی ہو سکتے ہیں - جو شخص اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا ہے وہ حقیقت میں اچھا ہے - کوئی ریاکاری اور مکاری اس میں نہیں ہے - جس آدمی کی تعریف اس کے نوکر کریں ،

وہ نیک ہوگا ۔ اس لیے کہ نوکر اپنے آقا کے تمام کاموں اور اسرار سے واقف ہوتے ہیں ۔ وہ ان سے اپنی برائی بھلائی کا پردہ[1] نہیں کرسکتا۔

۸۲- غلامی

یہ سارا مضمون مغربی خیالات کے موافق لکھا گیا ہے۔

۱- غلامی کا مضمون بہت پیرایوں میں بیان ہو سکتا ہے۔ ایک پیرایہ اس کا تاریخی ہے جس میں یہ بیان کیا جائے کہ غلامی کی ابتدا کیونکر ہوئی ، دنیا میں ساری قوموں کے دلوں میں اس کی جڑیں کیونکر لگیں ، ان کی شاخیں کیا کیا پھوٹیں ، ان میں برگ و بار کیسے لگے ، کیسی ان پر بہار و خزاں آئی ۔ ترقی میں تنزل ہوا ۔ کیا کیا غلامی کی بوقلمونی نے اپنے رنگ دکھائے ۔ کیا کیا قوانین ، آئین ، دستور مقرر ہوئے ۔ کیا کیا ان میں ترمیمیں اور اصلاحیں ہوئیں ۔ بالفعل جو اس پر نزع کی حالت طاری ہو رہی ہے ، وہ کیونکر ہوئی ؟ دوسرا پیرایہ پولیٹیکل اکانومی[2] (سیاستِ مُدن) کا ہے جو بڑا عظیم الشان ہے ۔ اس میں یہ بتلایا جائے کہ غلامی نے قومی معاملات پر کیا اثر کیا اور اس کا اثر بہبودیِ اقوام پر کیا پڑا۔ تیسرا یہ کہ غلامی نے کیا کیا ظلم و ستم انسان سے انسان پر کرائے ۔ چوتھا ، غلامی ایک نکمّی اور بے ضرورت شے ہے ۔ اس سے انسان کا کام کوئی بھلا نہیں ہوتا ۔ پانچواں یہ کہ غلامی کے باب میں احکامِ مذہبی کیا ہیں ۔ چھٹا یہ کہ کسی قوم کے ساتھ یہ امر مخصوص نہیں ہو سکتا کہ وہ غلام ہی بنائی جائے ۔ سب قومیں

۱- اصل : اُن سے اپنی برائی بھلائی کا پردہ ان سے نہیں کر سکتا ۔

۲- اصل : اکانومی کا ۔

غلامی کے لحاظ سے ایک حکم رکھتی ہیں۔ ساتواں، دنیا سے غلامی ایسی مٹنی چاہیے کہ اس کا نام باقی نہ رہے۔ اگر ان سب باتوں کا مفصّل حال بیان کیا کروں تو معلوم نہیں کہ مجھے غلاموں کی طرح بے کار میں کتنی مدت تک مشقّتِ شاقہ اٹھانی پڑے، اس لیے جہاں تک ممکن ہے، میں اس کا مختصر بیان کروں گا۔

۲- خِرد کی بزرگی کو آدمی مانتا ہے اور اسی کے سبب سے اپنے تئیں اشرف المخلوقات سمجھتا ہے۔ دلائل سے وہ قائل ہوتا ہے۔ جیسا آفتاب کا اثر ہر شخص پر ہوتا ہے، خواہ وہ اندھا ہی کیوں نہ ہو، ایسے ہی سچّی دلائلِ عقلی کا اثر اس پر ہوتا ہے، خواہ وہ کیسا ہی ہیئے کا پھوٹا[1] ہو۔ دنیا کے سارے معاملات میں سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ سچّی دلائلِ عقلیہ کون سی ہیں، پس وہ بیان کر دینی چاہئیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ابطالِ غلامی کی سچّی دلائل بیان ہوں اور وہ انسان پر مؤثر نہ ہوں۔ گو دلائلِ باطلہ ان کی روشنی کو بجھائیں گی اور ان کی تیزی کو کُند کریں گی مگر ان میں عقل کا وہ زور ہے کہ جب اس کا ظہور ہوگا تو اس کے آگے نہ انسان کی خود غرضی، نہ نخوت، نہ جذبات ٹھہریں گے۔ پس بڑا کام ہمارا یہ ہے کہ اُن دلائل کو بیان کر دیں جن سے غلامی کا ابطال ہو جائے، جس سے یہ کام روحانی طور پر تو ختم ہو جائے گا، گو اس کے[2] عملی طور پر سرانجام دینے میں سر اور ہاتھ اور زبان اور قلم کو بہت سے کام کرنے باقی رہیں گے۔ خلائق کی خیرخواہی اور عدالت اصطلاحی ایک قدم آگے نہیں چل سکتی جب تک عقلِ دوربین کا

۱- ہیئے کا پھوٹا = ''ہیئے'' کے معنی دل کے بھی ہیں لیکن اس محاورے سے ایسا آدمی مراد ہے جو ذہنی طور پر بالکل گیا گزرا ہو۔ جس کی عقل پھوٹ گئی ہو۔

۲- اصل: اس کی عملی طور پر۔

عصا ان کے ہاتھ میں نہ ہو - اس لیے وہ دونوں جہاں عقل کی رہنائی پر نہ چلیں گے تو مغالطے میں پڑیں گے -

۳- غلام وہ شخص ہے جو دوسرے شخص کی مِلک سے ہو، یعنی دوسرے شخص کے بس میں - جس کو یہ استحقاق حاصل ہو کہ وہ جس طرح سے چاہے اُس کے ساتھ پیش آئے اور جس کام پر چاہے اُسے لگائے - غلامی کے حقیقی معنی تو یہ ہیں مگر اس معنی میں بہت سی ترمیمیں ہوئی ہیں -

غلامی کا تاریخی بیان : غلامی کا رواج قدیم زمانے سے چلا آتا ہے کہ کوئی قوم نہیں جس کی پرانے زمانے کی تاریخ کچھ موجود ہو اور اُس میں غلامی کا ذکر نہ ہو - غلامی عجب بہروپنی ہے - ہر قوم میں نیا ہی بہروپ بھرتی ہے - ایک قوم کی غلامی کے رنگ ڈھنگ دوسری قوم سے نہیں ملتے - یہودیوں کے ہاں جو غلامی کا طور تھا وہ یونانیوں کے ہاں نہ تھا - جو یونانیوں کے ہاں اس کا طریقہ تھا وہ رومیوں کے ہاں نہ تھا - مشرق میں اس کا کچھ اَور رنگ تھا ، مغرب میں کچھ اَور ڈھنگ تھا - جب نئی دنیا (امریکہ) دریافت ہوئی تو اُس نے پرانی دنیا سے اس نئی دنیا میں اپنا نرالا ہی ایک اور رنگ دکھایا جو پہلے کبھی نہ دکھایا تھا -

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کا آغاز غالباً اِس طرح ہوا کہ جب لڑائی میں دشمن گرفتار ہوئے تو وحشی قوموں نے اُن کے مارنے میں اپنا فائدہ اتنا نہ جانا جتنا اُن کو غلام بنا کر رکھنے میں - یہودیوں کو قانوناً اپنی قوم کے اور غیر قوموں کے غلام بنانے کی اجازت تھی - ان کی اپنی قوم کے غلام اکثر وہ ہوتے تھے جن کا دیوالہ قرضے کے سبب سے نکل جاتا تھا تو وہ افلاس کے سبب سے اپنے تئیں کسی شخص کے ہاتھ بیچ ڈالتا تھا - یا چور جو چوری کا

تاوان اور جرمانہ دے کر اپنے تئیں نہ چھڑا سکتا تھا تو وہ غلام بنایا جاتا تھا۔ شرعاً یہودیوں پر لازم تھا کہ وہ اپنے ہم قوم غلاموں کے ساتھ بہ نسبت غیر قوموں کے غلاموں کے نرمی کے ساتھ پیش آئیں۔ وہ اپنے تئیں غلامی سے آزاد کرا سکتے تھے اور اگر آزاد نہ کرائیں تو ابتدائے غلامی سے ساتویں سال وہ خود آزاد ہو جاتے تھے۔ سوائے اس کے پچاسویں سال عام طور سے تمام غلام آزاد ہو جاتے تھے۔

یونانیوں کے ہاں بھی غلامی کی رسم سے قدیم چلی آتی ہے۔ ہومر کی نظم میں اس کا بیان ہے۔ اکثر غلام وہی ہوتے تھے جو میدانِ جنگ میں اسیر ہوتے تھے اور دوسرے وہ لوگ بھی جو دغا فریب، دزدی سے پکڑ لیتے تھے۔ یونان میں کوئی حکیم بھی ایسا نہ ہوا کہ وہ اصولِ اخلاق کے اعتبار سے غلامی پر معترض ہوتا۔ ارسطو غلامی کو عینِ عدالت جانتا تھا کہ انسان مختلف نسل کے ہیں۔ ان میں تقسیم، غلام اور آزاد کی، خدا کی طرف سے ہے۔ افلاطون نے یہ کہا کہ صرف یونانی غلام نہ بنانے چاہییں۔ یونان میں ایک قسم کے غلام وہ تھے جو وہاں کے قدیمی باشندوں کی اولاد تھے اور محکوم اور مغلوب ہو گئے تھے۔ وہ کھیتی کرتے تھے۔ اُن کے آقا زمین ان کے واسطے مقرر کر دیتے تھے۔ وہ اس کا لگان دیتے تھے اور اپنے آقاؤں کے ساتھ لڑائیوں میں جاتے تھے۔ ان کے ساتھ بہت نرمی برتی جاتی تھی۔ ان کا حال ایسا تھا کہ جیسا زمانۂ متوسط میں یعنی ۱۴۹۴ع سے ۱۴۹۶ع[1] تک میں سرف کا حال تھا۔ یورپ[2]

۱- اصل میں سنین کی ترتیب اُلٹی ہے: یعنی "۱۴۹۶ع سے ۱۴۹۴ع تک"

۲- اصل میں "یورپ" کو قوس سے شروع کیا گیا ہے لیکن یہ قوس ختم کہیں نہیں ہوتی لہذا شروع کی قوس کو بھی حذف کر دیا گیا ہے۔

میں سرف ایک قسم کے غلام تھے جو اکثر ملکوں کے اصلی باشندوں کی اولاد تھے جن کو اَور قوموں نے فتح کر لیا تھا ۔ بعض ان میں ایسے بھی ہوتے کہ قحط کے سبب سے جنھوں نے اپنے تئیں بیچ ڈالا تھا ، یا کلیساؤں کو خود لوگوں نے اپنے تئیں حوالے کر دیا تھا ۔ ان کی حالت مختلف ملکوں میں ، مختلف زمانوں میں مختلف طرح کی رہی مگر ان کے ساتھ ملائمت بہ نسبت غلاموں کے ، رومیوں کے قانون کے موافق ، کی جاتی تھی ۔ خاص کر جو زمین کی کاشت میں لگا دیے جاتے تھے ۔ جب یہ سرف اصلی باشندوں کی اولاد ہوتے تھے ، اُن کو نیٹو کہتے تھے ، اس لیے بعض انگریزی تعلیم یافتہ نیٹو کہلانے سے چِڑتے ہیں ۔ سرف کو بعض استحقاق حاصل تھے ؛ اگر کوئی آقا کسی سرف کو جان سے مار ڈالتا تو خوں بہا بادشاہ کو دینا پڑتا ۔ یا ایسا مارتا کہ آنکھ پھوٹ جاتی یا کوئی دانت ٹوٹ جاتا تو وہ[1] آزاد ہونے کا مستحق ہو جاتا ۔ وہ دوسرے ملک میں بیچے نہیں جا سکتے تھے[2] اور نہ اپنے اہل و عیال سے جدا کیے جاتے ، بلکہ کسی قدر مال و جائداد بھی رکھنے کے مجاز تھے ۔ گھر کے کام کاج کے واسطے جو غلام خریدے جاتے تھے اُن پر آقاؤں کا سب طرح کا اختیار ہوتا تھا ۔ ان کو جب چاہیں بیچ سکتے تھے ۔ کورنتھ[3] اور ایتھنز میں اور اَور تجارتی شہروں میں ان کی کثرت تھی اور وہ اکثر وحشی قوموں میں سے ہوتے تھے ۔ کچھ ان سے خدمت گاری کا کام

۱- اصل : اُسے آزاد ہونے کا مستحق ہو جاتا ۔

۲- ''تھے'' اضافہ مرتب ۔

۳- کورنتھ : یونان کا ایک شہر جو ملک کے جنوبی حصے میں واقع تھا ۔ اسے موسیقی کی بدولت شہرت نصیب ہوئی ۔

لیا جاتا تھا - زیادہ تر نان پز[1] ، باورچی ، درزی کے یا اور ارزل پیشوں کے کام ان سے لیے جاتے تھے - کانیں کھودنے اور صنعت کے کارخانوں میں مزدوری کے لیے بھیجے جاتے تھے - اور آقا جو روپیہ ان کے خریدنے میں لگاتا ، اس کا سود و نفع ان کی محنت مزدوری سے وصول کرتا تھا - یہ غلام اکثر زر خرید ہوتے تھے - کچھ ان میں غلاموں کی اولاد بھی ہوتی تھی جو آقاؤں کے گھر میں پیدا ہوتی تھی - غلاموں کو اِزدواج[2] کی سخت ممانعت تھی - کچھ اس کا سبب یہ تھا کہ غلاموں کی تعداد لونڈیوں کی تعداد سے کہیں زیادہ تھی - یونانیوں کے غلاموں کی تجارت براے ایشیا مائینر کی اپنی آبادیوں کے ذریعے سے وسط ایشیا میں ہوتی تھی - سوائے اس کے غلام ان کو یوں بھی ہاتھ لگ جاتے تھے کہ اہلِ تھریس اپنی اولاد کو بیچ ڈالتے تھے - رومیوں کے ہاں بھی غلامی تھی مگر اس کی صورت یونانیوں سے جدا تھی - رومی مقنّن سمجھتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے سب انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے اور غلامی خدا کے قانون کے خلاف ہے ، مگر قومی قانون کے موافق لڑائی کے اس قیدی کا ، جو قتل نہ کیا جاتا ، اور اس شخص کا ، جو اپنے تئیں بیچ ڈالتا ، غلام بنانا جائز تھا -

غلامی میں سخت ظلم و ستم ہے - اس زمانے میں بعض آدمی یہ کہیں گے کہ غلامی میں جور و ستم ہونا ایسی بدیہی بات ہے کہ جس کے ثبوت کی کچھ ضرورت نہیں - مگر آدمیوں کا دل غلامی کی یک طرفہ دلیلوں کے سنتے سنتے ایسا پتّھر ہو گیا ہے کہ اگر ہم دوسری طرف کی سچّی دلائل بھی بیان کریں گے تو مشکل سے اثر

۱- نان پز = روٹی پکانے والے - نانبائی - ۲- ازدواج = شادی کرنا -

ہوگا - قاعدہ ہے کہ جب کوئی برائی وسعت کے ساتھ زمانۂ دراز تک پھیلی رہتی ہے تو لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم نے اس کے سب پہلو، جو باہر کھلے ہوئے تھے، دیکھ لیے ہیں - کوئی بات اس کے اندر ایسی نہیں ہے کہ جس پر غور کریں - وہ برائی انسانوں کے دلوں پر ایسی منقّش ہوتی ہے کہ اس کے برخلاف مضمون کو دل میں وہ آنے ہی نہیں دیتی، اس لیے ضرور ہے کہ ہم اُس جور و ستم کو بہ دلائلِ مفصّل بیان کریں تاکہ وہ دلوں پر سے زنگِ ضلالت کو صیقل کرے -

ہم بالفعل یہ نہیں بیان کرتے کہ یہودیوں نے غلاموں کے ساتھ کیا مُدارات کا طریقہ برتا، مگر یہ ضرور کہیں گے کہ عیسائیوں نے جو غلامی کو جائز رکھا اس کی دلیل وہی تھی جو یہودی اپنی کتبِ مقدّسہ سے بیان کرتے تھے -

کل یونانی اہلِ سپارٹا کی نسبت اپنے غلاموں کے ساتھ نرمی سے پیش آتے تھے، مگر دو باتوں میں اُن کے ہاں بڑا جبر و قہر تھا؛ اول یہ کہ ان کے ہاں غلاموں کی تعداد بہ نسبت لونڈیوں کے بہت زیادہ تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر لونڈی غلاموں کے ازدواج سے اولاد پیدا ہوتی اور وہ غلام رکھے جاتے تو اس کی پرورش کا خرچ بہ نسبت پلے پلائے غلاموں کے خریدنے کے بہت زیادہ ہوتا - اس طرح غلاموں کو ازدواج سے محروم کرنا بڑا ظلم تھا - دوم غلام سے شہادت بڑی اذیتیں اور تکلیفیں دے دے کر لی جاتی تھی - کاموں میں جو غلام کام کرتے تھے اُن کے پاؤں میں زنجیریں پڑی رہتی تھیں اس لیے اکثر ان میں سے مر جاتے تھے -

رومیوں کے ظلم کی تفصیل بلیر صاحب یہ بیان کرتے ہیں کہ قانون کے موافق آقاؤں کو غلاموں پر اختیار بے انتہا تھا اور اس کو

وہ کام میں لاتے تھے - ادنٰی ادنٰی ناراضی پر غلام کو گھونسا اور تھپڑ مار دینا کوئی بات نہ تھی - گھر کے کاروبار میں ادنٰی ادنٰی قصوروں پر لکڑی اور کوڑے لگائے جاتے تھے - جو اوقات کہ غلاموں کے واسطے خاموش رہنے کے مقرر تھے اگر ان میں کوئی بولتا یا کھانستا یا چھینک لیتا تو ظالم آقا بڑے کوڑے مارتا - بیگم صاحب اپنا بناؤ سنگار کرتیں اور لونڈی ان کی چوٹی میں بالوں کو بے ترتیب رکھتی تو خوب پٹتی - بیگم صاحب کا آئینہ دیکھنا لونڈی پر قہر برپا کرتا تھا - غلاموں کے ڈرانے اور چالاکی سے کام کرانے کے واسطے کوڑے اور تسمے لٹکے رہتے تھے - ادنٰی قصوروں پر تین سو کوڑوں کا لگ جانا تو کوئی بات نہیں تھی - بیڑیاں اور زنجیریں اکثر سزا اور قید کرنے کے لیے کام میں آتی تھیں - اُمرا کی ڈیوڑھیوں پر دربان پا بہ جولاں اس لیے رہتے تھے کہ وہ موجود رہیں ، کہیں چلے نہ جائیں - کچھ اس سے غرض نمود و شان نہیں ہوتی تھی - اکثر غلام کھیت کے کاموں میں پا بہ‌زنجیر رہتے تھے - بڈھے اور ناکارہ غلام جزیرۂ ٹائی بر میں چھوڑ دیے جاتے تھے جہاں وہ بھوکے مر جاتے تھے - رومیوں کے ہاں جو وقتاً فوقتاً غلامی کے باب میں قانون پاس ہوئے ان کے پڑھنے سے بے رحمیوں کا مفصّل حال معلوم ہوتا ہے - پہلے آقا کو اپنے غلام کی موت حیات اور سزا دینے کا اختیار نامحدود تھا - اس کو ہیڈرین اور اینٹی اونس نے منسوخ کیا - کونسٹن ٹن نے یہ قانون مقرر کیا کہ جو شخص غلام کے قتلِ عمد کا مرتکب ہوگا وہ اس جرم کا مرتکب سمجھا جائے گا کہ اُس نے کسی آزاد آدمی کو مارا ہے ، مگر یہ قانون خود اس نے اپنے ایک اَور قانون سے منسوخ کر دیا - گال کے اضلاع میں آقا جانتے تھے کہ ہم کو اپنے غلام کے مارنے کا اختیار ہے - بعض کونسل کلیسا نے غلاموں کے قتل کے انسداد کے واسطے

یہ قاعدہ مقرر کیا کہ جو آقا اپنے غلام کو قتل کرے گا وہ ایک مدت کے واسطے کلیسا سے خارج کیا جائے گا ۔ کلاڈیس نے یہ قانون مقرر کیا کہ اگر کوئی آقا اپنے بیمار یا ضعیف غلام کو راہ میں ڈال دے گا تو پھر اس کا کوئی حق اُس غلام پر در صورتِ صحت یابی نہیں رہے گا ۔ اور یہی قانون غلام بچّوں کے باب میں تھا ۔ پھر یہ قانون جاری ہوا کہ آقا اپنے غلاموں کو حیوانات سے نہ لڑائیں ۔ ہیڈرین نے قانون جاری کیا کہ کوئی شخص اپنے غلام کو اُن لوگوں کے ہاتھ نہ بیچنے پائے جو غلاموں کو آپس میں تلواروں سے لڑاتے تھے ، مگر ہاں جب جج سزا کے لیے یہ حکم دے ۔ کلاڈیس کے قانون کے موافق غلام کا قتل کر ڈالنا بمنزلۂ قتل کے سمجھا جاتا تھا ۔ اور غلاموں کی فروخت میں اس امر کی ممانعت تھی کہ وہ اپنے ماں باپ ، بہن بھائی ، اولاد سے جدا نہ کیے جائیں ۔ غلاموں کو شادی کرنے کا اختیار نہ تھا ۔ ان کی اولاد اور ان کے درمیان کوئی رشتہ ایسا نہیں سمجھا جاتا تھا کہ حقوقِ قانونی ان کو حاصل ہوں ۔ لونڈیوں کی اولاد ماں کی جگہ سمجھی جاتی تھی ۔ بھاگے ہوئے غلام کو پناہ دینا جرم سمجھا جاتا تھا ۔

یہ حال تو رومیوں کا اس حال میں رہا کہ وہ بت پرست تھے ۔ اب عیسائی مذہب پھیلا تو اُس نے گو درشتی میں کچھ نرمی کی لیکن وہ اس کا استیصال نہ کر سکا ۔ گو اس مذہب میں سراسر رحم و رأفت و شفقت ہے مگر غلاموں پر اُس نے بھی بے رحمی کو جائز رکھا ۔

غلامی کے لیے ایک نیا زمانہ آیا جس میں عیسائیوں کے ہاں اس نے ایک نیا رنگ اپنا دکھایا ؛ یعنی امریکہ کو کولمبس[1] نے

۱- کولمبس: (۱۴۵۱ع—۱۵۰۶ع) معروف بحری سیاح جو اٹلی میں پیدا ہوا
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

دریافت کیا جس سے غلاموں پر ظلم و ستم کا وہی دروازہ عیسائیوں کے ہاتھ سے کھلا جو پہلے مغرب و مشرق میں ان پر کھل رہا تھا۔ غلامی کا بازار ایسا گرم کیا کہ بعض جگہ غلاموں کو تعداد میں آزاد آدمیوں سے بڑھا دیا۔ غلامی کی وبا نے انسانوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اور اقالیم میں کیا تھا۔ لاس کیسس[1] اور ویریا نے دیکھا کہ امریکہ کے اصلی باشندے کمزور اور ضعیف ہیں اور ان سے کام محنت کے نہیں ہوتے، اس لیے ان کو ظلم سے بچایا، مگر غلامی کے مصائب نے ان کی جگہ لی۔ مصلحت یہاں یہی ٹھہری کہ غلاموں کی تعلیم نہ کی جائے۔ نہ ان کے درمیان حقوقِ رشتہ مندی سمجھے جائیں۔ آزاد ملکوں میں نہ جیل خانوں میں وہ سخت محنت مشقت ہے نہ اور مجرموں کے لیے سزائیں ہیں جو غلاموں کے لیے یہاں تھیں۔ باپ ایک شخص کا غلام ہے، اس کی بیوی بچے دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کیے جاتے تھے۔ قانون ان آزاد آدمیوں کو سزا دیتا ہے جو جرم کرتے ہیں، نہ ان کو جو گھر کے کاروبار میں خطا کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے غلامی ان خطاؤں پر سزا پاتی تھی جو روزمرہ کے خانگی کاموں میں ہوتی تھیں۔

جب کسی غلام کے کام کا حصہ گھر بار کا کام کاج ہو تو خواہ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

اور ہسپانیہ میں فوت ہوا۔ اس نے ہسپانیہ کی ملکہ اور بادشاہ کے تعاون سے تین بحری جہاز تیار کیے اور ہندوستان کا قصد کیا مگر بجائے ہندوستان پہنچنے کے سواحلِ امریکہ میں پہنچ گیا اور یوں اس نے بلا ارادہ امریکہ کو دریافت کر لیا۔ یہ واقعہ ۱۴۹۲ء کا ہے۔

۱۔ لاس کیسس: (۱۴۷۴ء — ۱۵۶۶ء) ہسپانیہ کے شہر اشبیلیہ میں پیدا ہوا اور میڈرڈ میں فوت ہو گیا۔ اس نے امریکہ کے ریڈ انڈین قبائل کے حقوق کے لیے اور ان پر ظلم و تعدی کے خلاف جہاد کیا۔

وہ کیسی ہوشیاری سے انجام دے ، پھر بھی سزا کے خوف سے نہیں بچ سکتا - اس لیے کہ اس کا اچھا برا ہونا مالکِ خانہ کے مزاج پر موقوف ہے ، خصوصاً جب مالکوں کو اس باب میں زیادہ اختیار حاصل ہو - آزاد آدمی کو تو جب خوف کوڑے کھانے کا ہوتا ہے کہ وہ جرم کرے مگر غلام کے سر پر بغیر کسی جرم کے[1] ہمیشہ تازیانے لٹکتے ہی رہتے ہیں - ادنٰی ادنٰی قصوروں پر سو سو کوڑے ان پر لگ جاتے تھے - غرض غلاموں کی سزا اور جرم میں کوئی مناسبت نہیں تھی - جہاں غلامی ہوتی ہے وہاں یہ امر لازمی ہے کہ جرم خفیف اور سزا شدید - غلاموں کو اگر آقا مہربان مل بھی جاتے[2] تو ان کو یہ خوف رہتا تھا کہ کہیں ہم ظالم آقاؤں کے ہاتھ نہ بِک جائیں - جب کوئی قانونی استحقاق ان کا نہیں ہوتا تو وہ مویشی اور مال اسباب کی گٹھڑیوں کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تلے جاتے ہیں - امریکہ میں مرد اور عورت ، جو لونڈی غلاموں کے آقا تھے ، ان کے ظلم و ستم کی تفصیل کے لیے ایک دفتر چاہیے - کوڑوں کے مارے اُن کی کھال اُدھیڑ ڈالنی تو کوئی بات نہیں تھی - پھر یہ ایک اور ستم تھا کہ لونڈیوں کی تعداد غلاموں کی تعداد سے ایک تہائی کے قریب تھی[3] - خاص ریاستوں میں چھ یا سات سو غلاموں میں

۱- اصل : غلام کے سر پر بغیر کسی جرم کے سر پر -

۲- اصل میں ''جاتے'' کے بعد ''ہیں'' بھی تھا جو حذف کر دیا گیا -

۳- اصل : ''غلاموں کی تعداد لونڈیوں کی تعداد سے ایک تہائی تھی'' جو غلط ہے کیونکہ اس جملے سے لونڈیوں کی اکثریت اور غلاموں کی اقلیت ثابت ہوتی ہے جبکہ صورت حال اس کے برعکس تھی اور اگلا جملہ اس کا شاہد ہے - حقیقت یہ ہے کہ غلام زیادہ تھے اور لونڈیاں کم تھیں -

ایک عورت نہیں تھی ۔ پھر اُن غلاموں کو جو تھوڑی دیر فرصت کام سے ملتی تو بھی اس میں وہ قُفلوں میں بند کر دیے جاتے ۔ کیوبا[1] میں اُن غلاموں کی موت دس فیصدی تھی جو ایکھ[2] بوتے تھے ۔ گویا دس سال میں سب غلام مر جاتے تھے ۔ غلاموں کے مرنے میں آقاؤں کا نقصان اس لیے نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان سے کام چوبیس گھنٹوں میں اِتنے گھنٹے لیتے تھے کہ اس کے نفع سے مرنے کا نقصان پورا ہو جاتا تھا ۔ دن رات میں ساڑھے چار گھنٹے کی اجازت سونے کی دیتے تھے ۔ غلاموں کی تعلیم کا یہ حال تھا کہ کیوبا کے پریسٹ نے حکم دے رکھا تھا کہ جو غلام کھیت کا کام کرتے ہیں وہ کبھی گرجا میں سوائے اصطباغ[3] پانے کے نہ جائیں ۔ جب فصل کٹ چکتی تو خاص آدمیوں کو گرجا میں جانے کی اجازت تھی مگر کام کے زمانے میں ہرگز نہیں ۔

ہاں یہ سچ ہے کہ بعض آقا رحم دل ایسے ہوتے ہیں کہ وہ غلاموں کو اپنا عزیز ، بھائی بند سمجھتے ہیں اور لطف و کرم سے پیش آتے ہیں اور کسی طرح کی سختی نہیں کرتے ہیں ۔ مگر اس سے اس قاعدۂ کلیّہ میں فرق نہیں آتا کہ غلاموں پر بحیثیتِ مجموعی سختی و درشتی ، جور و ستم بہت ہوتا تھا ۔

خلاصہ یہ ہے کہ امریکہ میں غلاموں کے کھانے پینے اور بود و باش کی خبرگیری ایسی کی جاتی تھی جیسی اور اہلی[4] جانوروں

۱۔ کیوبا : وسطی امریکہ کا ایک جزیرہ جو اب سو شلسٹ نظام کے تحت روس کے زیر اثر ہے ۔
۲۔ ایکھ بونا : قلمیں لگانا ۔
۳۔ اصطباغ : بپتسمہ دے کر عیسائی بنانے کی ایک رسم ۔
۴۔ اہلی جانور = پالتو جانور ۔

و مویشی کی - غلاموں کے مالکوں کا دل سخت بہ نسبت اور آدمیوں کے ہوتا تھا - غلاموں کی تجارت عیسائیوں نے اس خیال سے شروع کی تھی کہ ہم ان کو عیسائی بنائیں گے اور ان کی قیمت کے روپے کے عوض میں ان سے کام لیں گے - مگر رفتہ رفتہ غلام تو ایک گٹھڑی مال کی ہو گئے اور ایک جان دار سے بے جان چیزیں بن گئے جو بکتے پھرتے تھے -

غرض جو لوگ غلامی کو جائز اور اچھا جانتے ہیں وہ بھی ، اگر تعصّب کار فرما نہ ہو[1] ، تو غلاموں پر ظلم و ستم کے برپا ہونے میں ذرا شبہ نہیں کر سکتے - غلامی کی برابر کوئی چیز دنیا میں نہیں ہے کہ جس میں جور و جفا اس سے زیادہ برپا ہوتے ہوں - لڑائی سب سے زیادہ خوف ناک ظلم ہے - لڑائی اور اس کے بعد قحط اور وبا کا حال سب پڑھ کر مقابلہ کریں کہ غلامی میں زیادہ نفع نقصان ہیں یا لڑائی میں - اس میں کوئی شبہ نہیں کر سکتا کہ لڑائی سے انسان کی بھلائی بھی ہوتی ہے - شائستگی اور تہذیب لڑائی ہی نے پھیلائی ہے - مغرب میں مشرقی تہذیب و علوم و فنون کو جہادِ عشرہ ہی لائے ہیں - فتح مندی نے قوموں کو بڑھایا اور عالی رتبے پر پہنچایا ہے اور مفتوح قوموں کو بھی شائستہ بنایا ہے - مذہب کے لیے لڑائیوں نے بڑے بڑے کام کیے ہیں - بہادری اور شجاعت کو اسی سے رونق ہوئی ہے - غرض لڑائی میں بالکل نقصان ہی نہیں بلکہ فائدے بھی ہوتے ہیں - اب غلامی میں دیکھو کہ سوائے برائیوں کے بھلائی کون سی ہے - امریکہ والوں کو غلامی سے کیا فائدہ حاصل ہوا ، سوائے اس کے کہ روئی ، شکّر ، چانول وغیرہ ان سے بُوا کے پیدا کر لیے - سو یہ آزاد کام مزدوروں کے ہاتھ سے اور زیادہ

۱- اصل : تعصّب کو کارفرما نہ ہوں -

اچھی طرح وہ کرا سکتے تھے ۔ غرض کسی مذہب نے غلاموں کے استیصال کرنے کے احکام نہیں جاری کیے ۔

غلامی کی حاجت نہیں ، وہ ایک بے ضرورت شے ہے: جو لوگ کہ ہمارے اوپر کے بیان کو تسلیم کر لیں گے کہ غلامی میں سراسر ظلم و ستم ہے اور انسان کو بے رحم اور ظالم وہ بناتی ہے ، ان کو یہ امر ماننا دشوار نہیں ہے کہ غلامی ایک بے ضرورت شے ہے اور کوئی کام دنیا کا ایسا نہیں کہ وہ بغیر اس کے اٹکا پڑا رہے ۔ بعض آدمی کہتے ہیں کہ غلامی کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ کیوں قائم ہوتی ۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی کس کو ضرورت ہے ؟ آقاؤں کو ۔ اگر اعلیٰ درجے کی قومیں خود بعض کام نہیں کر سکتیں[1] اس لیے وہ غلام رکھتی ہیں[2] تو اُن کو غلام رکھنے کی ضرورت کیا ہے ؟ وہ ادنیٰ قوموں سے جو آزاد ہیں ، مزدوری دے کر اور خوش اخلاق سے پیش آ کر ، روپے کا لالچ دے کر ان کاموں کو کرا سکتی[3] ہیں اور اس وجہ سے وہ ادنیٰ قوموں کو بھی ترقی پر پہنچا سکتی[4] ہیں ۔

تہذیب اور شائستگی کا یہ مسئلہ مسلّمہ ہے کہ حکومت وہی ہے جس میں آسانی ہو ۔ اب آقاؤں کو تمام غلاموں کے کُل کاموں کا ذمہ اپنے اوپر لینا اور ان پر سخت جابرانہ حکومت رکھنی دشوار ہے ۔ کیا ضرور ہے کہ جانوروں کی طرح آدمیوں کے سارے کاموں کو اپنے ذمہ لیں ۔ اگر ہم جانوروں کو موٹا تازہ کرنا چاہیں تو جو ان میں فطرتی خاصیتیں ہیں ، اُن میں آزادی دیں ۔ پس اگر کوئی اعلیٰ قوم ادنیٰ قوم کو قوی کرنا چاہتی ہے ، اُن کو آزادی ، جو انسان کی ایک فطرتی خاصیّت ہے ، عطا کرے ۔ غرض غلام کوئی کام نہیں

۱۔ اصل : نہیں کر سکتے ۔
۲۔ اصل : غلام رکھتے ہیں ۔
۳۔ اصل : کرا سکتے ہیں ۔
۴۔ اصل : پہنچا سکتے ہیں ۔

کرتے جو اُن سے اچھی طرح دوسرے طور پر نہ حاصل ہو سکے، اس لیے نہ آقاؤں کو غلاموں کی ضرورت ہے، نہ غلاموں کو آقاؤں کی حاجت ہے۔

غلامی کے باب میں مذہبی احکام: جو لوگ غلامی کو اچھا جانتے ہیں اور اُس کے باقی رکھنے کے طرف دار ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر غلامی کوئی بداخلاق ہوتی تو مذہب میں سخت ممانعت ہوتی۔ اب بجائے ممانعت کے اس کی اجازت ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بدکاری نہیں۔ اگر غلامی کا حامی مذہب ہو تو پھر اس کے طرف داروں کو وہ قلعہ استوار ہاتھ لگتا ہے کہ جس میں سے نکالنا کسی ہتھیار سے سخت دشوار کیا بلکہ محال ہے۔ پھر اس کے مخالف ایسی مشکلات کی غلامی میں پھنستے ہیں کہ کسی طرح رہائی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس کے باب میں الہامِ ربّانی کیا ارشاد فرماتا ہے؟ انبیا کے افعال و اعمال کیا ہدایت کرتے ہیں؟ قدیم اور حال کے زمانے کے عقلا و حکما کیا حکم دیتے ہیں؟ کیونکہ یہی تینوں باتیں، خاص کر پہلی[1] بات، انسانوں کے دلوں کی بڑی فرماں روا اور کارفرما ہے[2]۔

یہ باتیں تم کو ضرور یاد رکھنی چاہئیں: اول یہ کہ ہمیشہ سے ایک الہام دوسرے الہام کو بدلتا آیا ہے اور انسان کی عقل و دانش کے موافق احکام دیتا رہا ہے۔ دوم یہ کہ کچھ ضرور نہیں کہ صاحبِ الہام کی رائے و خیالات تمام معاملاتِ دنیا میں یقینی صحیح اور قطعی درست سمجھے جائیں اور اس کے مقابل ایک امر، جو سائنس (علوم) سے انسان کی عقلِ روز افزوں نے تحقیق کر کے ثابت

۱- اصل: پہلے بات۔ ۲- اصل: کارفرما ہیں۔

کیا ہے ، وہ باطل جانا جائے - مثلاً الہامی کتابوں نے[1] زمین کو ساکن مانا ہے اور اس کے گرد آفتاب کا پھرنا لکھا ہے مگر سائنس سے یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ زمین آفتاب کے گرد دورہ کرتی ہے - یہ امر ایسا یقینی ہے کہ اس میں شک و شبہ کو ایسی جگہ ہے جیسے کہ خدا کے وجود میں - جو لوگ الہامی آیتوں کو غلامی کے باب میں پیش کرتے ہیں اور اس کے معانی اپنی طرف سے تاویلات سے بناتے ہیں ، اُن سب کو ملا کر دیکھیے تو سارا الہامی کلام غلامی کے خلاف یہ شہادت دیتا ہے کہ انسان آزاد ہے ، وہ کسی کا غلام نہیں پیدا ہوتا -

بعض آدمی یہ کہیں گے کہ اوپر کی مثال ، اور نیز اَور مثالیں ، جو صاف صاف کلامِ الٰہی کے برخلاف عیاں ثابت ہوئی ہیں ، وہ مادی اشیا کی ہیں ، اخلاق امور کی نہیں ہیں ، جن کے اندر ہدایت الہام کا خاص موضوع ہے - بے شک ہم بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ جو اعلیٰ درجے کے اصولِ اخلاق ہیں ان کا بیان الہام میں ایسا صحیح اور درست اور صاف ہے کہ اس سے آگے بڑھنے کے اندر کوشش کرنی دیوانگی ہے اور اس کے برخلاف کہنا کفر ہے ، مگر غلامی اس اصول سے متعلق نہیں ہے - ساری الہامی کتابوں میں جو اس کے باب میں قوانین بیان ہوئے ہیں ان سب کا رجحان غلامی کے خلاف ہے - سوائے اس کے غلامی ایسی ایک معجونِ مرکّب ہے کہ وہ ہر اقلیم میں ، ہر ملک میں ، ہر قوم میں ، ہر زمانے میں مختلف حالتوں میں پیدا ہوئی ہے - اب یہ کوئی کہے کہ اگر غلامی انسان کے اخلاق کے حق میں زہر قاتل تھی تو الہامِ ربّانی نے کیوں صاف صاف حکم اس کی ممانعت کے نہیں دیے ؟ ہم بھی کہتے ہیں کہ

۱- اصل : کتابوں میں -

اگر اس زمانے میں یہ غلامی انسان کے اخلاق کے حق میں زہرِ قاتل تھی تو ضرور الہامِ ربّانی سے اس کی ممانعت کے احکام صادر ہوتے - بائبل میں جو احکامِ مذہبی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودیوں کے غلام دو طرح کے تھے : ایک وہ جو خود غلامی اختیار کرتے تھے ، دوم وہ جو احکامِ الٰہی کے موافق شرعاً غلام بنائے جاتے ہیں - غیر قوم کے آدمی اور اُن کی اولاد خریدنے سے ان کے قبضے میں آتے تھے - خواہ وہ کسی طرح حاصل ہوں ، یہودیوں کی شرع کے موافق ان کو بہت سے استحقاق حاصل ہوتے تھے - وہ خدا تعالٰی کی عبادت میں سب کے ساتھ شریک ہوتے تھے - وہ تمام قومی اور خاندانوں کے تہواروں اور دعوتوں میں شریک ہوتے تھے - اخلاق اور مذہب میں ان کی تعلیم ہوتی تھی - جو اُن کی مدّتِ غلامی ہوتی اس سے وہ آدھی مدّت کے بعد آزاد ہوتے تھے - بنی اسرائیل کے خادموں کی شرعاً و قانوناً وہی حفاظت ہوتی تھی جو اُن کے آقاؤں کی - دینی اور دُنیاوی حقوق سب کے برابر ہوتے تھے - ان کے غلاموں کو اپنے آقاؤں کے بدلنے کا اختیار تھا اور اپنی مرضی کے موافق ان کو اپنے تئیں محفوظ کرنے کا اختیار تھا - اگر ان کے آقا اُن[1] پر سختی و تشدّد کر کے ضرر پہنچاتے تو وہ اپنے عہود سے بری الذمہ ہو جاتے - عبرانیوں کے ہاں مدّتِ غلامی چھ سال تھی - اس کے بعد وہ غلامی میں نہیں رکھے جا سکتے تھے ، بشرطیکہ وہ کوئی دوسرا عہد و اقرارِ غلامی نہ کرتے - اور جو غیر قوموں کے غلام ہوتے تھے اور جن پر یہودی بہت اختیار رکھتے تھے ، وہ قطعی ، جوبلی[2] کے روز ، سب آزاد ہو جاتے تھے (جوبلی[2] پچاسویں سال ہوتی تھی) -

---

۱- اصل : اگر ان کے آقاؤں پر -   ۲- اصل : جیوبلی -

اب عیسائی جو استدلال غلامی کے باقی رکھنے کا عہدِ عتیق سے کرتے ہیں ، وہ اپنے غلاموں کی حالت کو ملا کر دیکھیں کہ کوئی بات بھی ان کی نہیں ملتی - اب انجیل کو دیکھیے کہ اس میں صاف لکھا ہے کہ 'تو وہ ہمسائے کے ساتھ سلوک کر جو 'تو ہمسائے سے چاہتا ہے کہ وہ تیرے ساتھ کرے - اب کوئی عیسائیوں سے ، جو غلاموں کے مالک ہیں ، پوچھے کہ غلام ، جو تمھارے سائے میں ہمیشہ رہتے ہیں ، تمھارے ہمسایہ ہونے سے خارج ہیں جو تم اُن کے ساتھ خلافِ حکمِ انجیل سلوک کرتے ہو ؟ غرض نہ عہدِ عتیق نہ عہدِ جدید ، عیسائیوں کو غلاموں کو اس طرح سے رکھنے کی اجازت دیتا ہے جس طرح وہ رکھتے ہیں - انبیا کے اقوال[۱] اور کلامِ ربّانی کی شہادت اس مروج غلامی کی حمایت میں پیش نہیں ہو سکتی - اب دوسری بات یہ ہے کہ متقدّمین حکما و عقلا نے اس کو روا رکھا ہے - اس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانے کی عادات اور تعصّبات نے ان کی آنکھوں کے آگے ایسی اوجھل[۲] کر رکھی تھی کہ آنکھوں کی تیز نگاہی کو مانع تھی ؛ تنکے اوجھل پہاڑ اوجھل - مروج غلامی کو تو انھوں نے بالاتفاق روا نہیں رکھا - ہاں یونانیوں کے ہاں وہ غلامی جائز تھی جو بالفعل ہے - وہ اس کو قانونِ قدرت کے موافق بھی اور اپنے قانون کے موافق بھی جانتے تھے اور انسانوں کی نسلوں میں تفریق آزادی اور غلامی سے[۳] کرتے تھے - رومیوں کے ہاں غلامی قانونِ قدرت کے خلاف سمجھی جاتی تھی[۴] مگر ملکی قوانین کے موافق جائز تھی -

---

۱- اصل میں ''اقوال'' کے بعد ''کی'' کا لفظ تھا جو حذف کر دیا گیا -
۲- غالباً یہاں اوجھل سے پردہ مراد ہے -
۳- اصل : غلامی کے کرتے تھے - ۴- اصل : سمجھے جاتے تھے -

بڑے بڑے رومی عاقل بادشاہوں نے یہ چاہا کہ غلامی کی سختی کو دور کریں جس کا بیان ہم پہلے کر چکے ہیں - بہت سے رومی عقلا نے غلاموں پر سختی کا بیان کیا ہے اور اس کو ناروا اور ناجائز جانا ہے - سینیکا غلامی کا بڑا مخالف تھا - آگسٹس نے تو قانون غلاموں پر حدِ اختیارات کا بنا دیا تھا - غرض رومیوں اور یونانیوں میں جس طرح کی غلامی تھی وہ ان کے حسنِ اخلاق کو داغ لگاتی ہے - اِس زمانے کا کوئی عاقل[1] اس بنا پر کہ پہلے عاقلوں نے غلامی کو جائز سمجھا ہے ، غلامی کو روا نہیں رکھے گا - اس زمانے کے عقلا نے خوب تحقیق کر لیا ہے کہ غلامی ایک پرلے درجے کی بداخلاقی ہے جو[2] انسان کے حق میں مضر ہے - اس لیے اس کے استیصال میں جو کوششیں انھوں نے کیں اُن کا آیندہ بیان ہوگا - جو اعلیٰ درجے کے عاقل حکیم والا خرد اس زمانے میں ہیں ، وہ غلامی کے طرف دار نہیں - غرض ہم نے تینوں باتوں کو ، جو اول لکھی تھیں ، ثابت کر دیا کہ غلامی کی حمایت ان سے نہیں ہو سکتی -

غلامی جیسے غلاموں کے حق میں مضر ہے ، ایسی ہی آقاؤں کے حق میں : دولتِ سلطنت کے حقیقی معنی یہی ہیں کہ نہ وہ سونے میں ، نہ لوہے میں ، نہ کثرتِ آبادی میں ، نہ زمین کی شادابی میں ، نہ وسعتِ مملکت میں ، نہ عاقلانہ قوانین میں ہے بلکہ وہ غریب مزدوروں اور عوام الناسِ کثیر کی خوش حالی اور چین اور آرام میں ہے - دولتِ سلطنت قوتِ عملی میں ہے ، نہ قبضۂ اشیا میں - صرف دولتِ سلطنت زندہ دلی میں ہے - زندہ دلی میں بہت سی چیزیں شامل ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے متعلق ہیں -

---

۱- اصل : عاقل کوئی - ۲- ''ہے جو'' اضافۂ مرتّب -

جیسے کہ نقطۂ آتشی[1] کا حال ہوتا ہے کہ اُس پر شعاعیں جمع ہو کر حرارت پیدا کرتی ہیں ، اِسی طرح یہ زندہ دلی کل انتظامِ ملکی کے جسم کے لیے مرکزِ حرارت ہے ۔ اور یہ زندہ دلی فقط اُس قوّت میں موجود ہے جو قوموں کی ترقی کراتی ہے ، اور ترقی بھی ایسی جو مستقل اور متواتر ہو اور کبھی وہ ٹھہر نہ جائے ۔ اب اس زندہ دلی کو دیکھنا چاہیے کہ جہاں غلامی ہے وہاں رہتی ہے یا جہاں آزادی ہے ۔ جن ملکوں میں غلامی ہے وہاں آدمی چند ہیں اور باقی انسان مثل بار برداری کے حیوانوں کے ہیں[2] ۔ ہزاروں دل مثل مُردوں کے پڑے ہیں ۔ مصیبت اور آفت میں مبتلا ہیں ۔ کوئی کام ، جس سے ملک کی ترقی ہو ، نہیں کرتے ۔ ہاں بھاگ جانے کو تیار بیٹھے ہیں ۔

برخلاف اس کے جن ملکوں میں آزادی ہے وہاں لاکھوں دل ہیں جو مختلف کام کرا رہے ہیں ۔ اُن کی اغراض ہزاروں طرح کی ہیں ۔ اُن کی رائیں بہت طرح کی ہیں ۔ مختلف طرح کے مزاج ہیں ۔ اُن کا تلاطم اور آپس کی مخالفت زندہ دلی پیدا کر رہی ہے ۔ اب اُن ملکوں میں ، جہاں غلامی ہے ، کیا ہوتا ہے کہ بڑا گروہ غلاموں کا مایحتاج چیزوں کو پیدا کرتا ہے ۔ نہ وہ کوئی بات علوم و فنون میں ایجاد کرتا ہے ، نہ صناعت و حرفہ میں ۔ نہ وہ کسی ایجاد سے قوم کی خوشی بڑھاتا ہے ، نہ دولت سے[3] ۔ غلامی کی حالت میں انسان کے[4] فطرتی قُواء ، جن سے وہ ترقی کرتا ہے ، مردہ ہو جاتے ہیں ۔ وہ

۱۔ نقطہ آتشی : آتشی شیشے کا وہ نقطہ جس میں شعاعیں جمع ہو کر حرارت میں بدل جاتی ہیں ۔

۲۔ "ہیں" اضافۂ مرتّب ۔

۳۔ "سے" اضافۂ مرتّب ۔ ۴۔ اصل : انسان کی ۔

محنت میں بھی کاہل ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنے لیے نہیں ہوتی - جو ازدواج کا لطف ہے اُس سے وہ محروم ہوتا ہے - جانوروں کے ازدواج کی سی کیفیت اُس کی ہوتی ہے - وہ محبت و اُنس جو اولاد کی پرورش میں کام آتی ہیں اور اخلاق میں خوبی پیدا کرتی ہیں، معطّل ہو جاتی ہیں - ملکیت و قبضہ کی کوئی خوشی باقی نہیں رہتی - وہ خود اپنے مالک نہیں ہوتے، کوئی اَور چیز ان کی کیا ملکیت ہوگی - غلاموں کا ہونا ہی سلطنت کو اخلاق میں، عقل و دانش میں، جسمانی قُوا میں ضعیف کر دیتا ہے - سرکشی کے خوفوں کو پیچھے لگائے رکھتا ہے -

بحرِ اطلانتک[1] کے اس طرف یہ دیکھتے ہیں کہ جن آدمیوں کی مخالفت میں باتیں نہیں کہی جاتیں، وہ دانش مند اور عاقل نہیں ہوتے - کوئی بچے کے حق میں اس سے زیادہ برائی نہیں ہے کہ وہ اُن محکوم لوگوں میں تربیت و تعلیم پائے جن پر اس کو حکومتِ عظیم کرنی پڑے - جب لڑکے کو خود مختاری کی عادت بچپنے سے پڑے گی تو وہ خود مختار، سرکش ہوگا، اَوروں کے ساتھ ہمدردی نہیں کرے گا - جو لوگ اپنے تابعین کے اندر پرورش پاتے ہیں، اُن میں قابلیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ کسی مکر و فریب کی تہہ پر پہنچیں[2] - غرض غلامی ایسا دو دھارا ہتھیار ہے کہ جو چلائے اور جس پر چلائے، دونوں کو گزند پہنچائے - غلاموں کا ہونا دونوں — آقاؤں اور غلاموں — کو مضرّت پہنچاتا ہے -

جو باتیں اوپر لکھی ہیں وہ کُل نسلِ انسانی سے متعلق ہیں - کسی کے ساتھ مخصوص نہیں، کوئی نسل اُن سے خالی نہیں: بہت سی انسانی نسلوں کا امتحان غلامی اور آقائی دونوں میں ہوا - انھوں نے ان

۱- اصل: اطلنٹک -   ۲- اصل: تہہ پر پہنچے -

دونوں حالتوں میں اپنی نالائقی ظاہر کی - رومیوں کے ہاں سب طرح کی قوموں کے غلام تھے مگر وہ کسی قوم کے غلاموں کو اچھا نہ کہتے تھے - اینگلو سیکسن جو ایک بڑی چست و چالاک ، آزاد ، ہوشیار ، دور اندیش قوم ہے وہ غلاموں کے آقا ہونے میں کوئی اپنی خوبی نہیں چمکاتی - اہلِ یورپ جو مسلمانوں کے ملکوں میں غلامی میں رہتے ہیں ، وہ بڑے پاجی ، کمینے ، شریر ، بد ذات ہوتے ہیں -

حبشیوں کی قوم کو بہت سے آدمی اَور قوموں اور نسلوں سے جدا خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ غلامی ہی کے لیے موزوں اور موضوع ہیں - یہ بات دو حال سے خالی نہیں : سچ ہے یا جھوٹ - اگر سچ ہے تو فطرتِ انسانی میں وہ واقعاتِ عظیم میں سے ہے اور اگر جھوٹ ہے تو وہ شریر مُوذی آدمیوں کا ایسا تعصّب ہے جو کبھی سوتا نہیں - اس لیے جو لوگ حبشیوں کو غلامی ہی کے لیے موزوں سمجھتے ہیں ، وہ یہ کہتے ہیں کہ حبشی نسلِ انسانی سے نہیں ہیں - وہ ایک بن مانسوں کی قسم میں سے ہیں - ان میں خود مختار ہو کر رہنے کی قابلیت ہی نہیں - اس سبب سے بہت سے آدمی جو اَور طرح سے اچھے ہیں مگر تعصّب سے ان کو ایسا ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں کہ وہ حبشیوں کے ساتھ کھانے کو پسند نہیں کرتے ، اُن کے ساتھ سفر نہیں کرتے ، اپنے بچوں کو اُن کے بچوں کے ساتھ تعلیم نہیں دلاتے ، مجلسوں میں اُن کے ساتھ بیٹھتے نہیں ، نہ اُن کے ساتھ عبادت میں شریک ہوتے ہیں - غرض کسی طرح سے ان کی مجالست کو پسند نہیں کرتے -

بڑی غلطی ان لوگوں کی یہ ہے کہ وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ کسی نسلِ انسانی کی قابلیت و استعداد کے تخمینہ کرنے میں

اس کی حالت کو دیکھنا بھی ضرور چاہیے کہ وہ کیا ہے - اس پر سب عقلا کا اتفاق ہے کہ کوئی وحشی قوم شائستہ و مہذّب نہیں ہوئی جب تک اس کی خارجی امداد نہیں ہوئی - ہر وحشی قوم میں یہ قابلیت ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کی شائستہ و مہذّب ہو جائے - وحشی قومیں پہلے بھی شائستہ ہوئی ہیں اور اب بھی ہو سکتی ہیں - اب حبشیوں کی حالت کو دیکھنا چاہیے کہ کیا ہے - اگر کوئی یورپ کی قوم حبشیوں کی طرح رکھی[1] جائے کہ ابتدائے عمر سے کھیتوں پر کام اُس سے اس طرح لیا جائے جیسا کہ حبشیوں سے لیا جاتا ہے ، اُن کے ریوڑ بنا کے کھیتوں پر ہانکے جائیں ، دن بھر کام لیا جائے جس میں ہر دم کوڑے لگنے کا خوف دم کے ساتھ ہو ، پھر وہ کھیتوں سے گلوں کی طرح ہنکائے جائیں اور مکانوں میں بند کیے جائیں - پس جن آدمیوں کی یہ حالت ہو تو اُن کے دل کب ان تمام حقوق سے ، جو خدا نے ایک انسان کے دوسرے انسان کے لیے پیدا کیے ہیں ، واقف ہو سکتے ہیں - جب وہ خود ہی اپنا کوئی حق نہیں رکھتے تو دوسرے کا حق کیا جانیں گے - عقل کے کاموں کا ظہور اُن سے کیسے ہو سکتا ہے - اگر کوئی شخص عالی خاندان سا عالی خاندان ابتدائے عمر سے ایسی غلامی میں کسی آقا کے گھر میں رہے تو وہ ساری شرافت اس کی جاتی رہے گی - غرض جو حبشیوں کی نالائقی بیان کی جاتی ہے وہ ان کی نسل میں نہیں ہے بلکہ ان کی حالت نے ان میں پیدا کی ہے - اگر حبشیوں کو اُن کے اپنے ملک میں آزادی کی حالت میں دیکھو تو ان میں سب کاموں میں وہ لیاقتیں معلوم ہوتی ہیں جو شائستہ قوموں میں ہوتی ہیں - اُن کے

۱- رکھے جائے -

مکان ، اُن کی تعلیم ، اُن کی سپاہ ، اُن کے لڑنے کے طریقے ، اُن کی ہنگامہ آرائیاں سب سہتذب قوموں سے ملتی جُلتی ہیں ۔ اگر حبشی قومیں اہلِ یورپ کی قوموں کی سی شائستہ و مہذّب نہیں ہیں اور مثل اُن کے خود ایجاد و اختراع کی قابلیت نہیں رکھتی ہیں ، بلکہ مقلّد ہیں ، تو شائستگی اور تہذیب کا یہ اقتضا ہے کہ اُن تقلیدی بھائیوں کی تائید کرنی چاہیے ، جس سے نیک اخلاق کے اظہار کا موقع ملے ۔ گو حبشی کالے رنگ کے ہوں مگر اہلِ یورپ کے گورے رنگوں کے برابر شائستہ و مہذّب ہو سکتے ہیں ۔ بہت سی مثالیں ایسی موجود ہیں جو اِس اوپر کے بیان کی تصدیق کرتی ہیں ۔ بعض معترض یہ کہتے ہیں کہ گورے اور کالے رنگ کی قوموں کی فطرت میں ایک فرق ہے ۔ وہ ان خاص مثالوں اور مستثنٰی صورتوں سے نہیں مٹتا ۔ مگر تمام سائنٹفک تحقیقات اس کے خلاف شہادت دیتی ہے ۔ محقّقینِ حق شناس کا پلّہ اسی طرف بھاری ہے کہ انسان کی فطرت سب قوموں میں ایک ہی سی ہے ۔ قوائے ظاہری اور باطنی خدا تعالٰی نے سب کو ایک قسم کے دیے ہیں ۔ اب جو اُن میں یہ فرق معلوم ہوتا ہے وہ وطن کی آب و ہوا ، غذا ، طرزِ بود و باش و پرورش اور خارجی حالتوں سے ہوتا ہے ۔ غرض یہ خیال کہ حبشی یا کسی قوم کی فطرت میں غلامی داخل ہوتی ہے غلط ہے ۔ یہ ظاہری فرق کھلڑی کا کالا اور سفید ہونا دل اور روح میں فرق نہیں پیدا کر سکتا ۔ وہ سب انسانوں میں یکساں ہے ۔ غرض حبشیوں میں مثل اَور قوموں کے شخصی اور قومی قابلیتیں ہیں اور وہ شائستہ اور سہتذب اُسی طرح ہو سکتی ہیں جیسی اَور قومیں ہوئی ہیں ۔ جیسا کہ جرمی ٹیلر صاحب شریر و موذی آدمی کو جاتے ہوئے دیکھتے تھے تو کہتے تھے کہ یہ میرا نفس جاتا ہے ، اُسی طرح

جب ہم کسی حبشی غلام کو امریکہ میں دیکھیں تو یہ کہنا چاہیے کہ یہ ہمارا نفس جاتا ہے ، جس کی نہایت بری طرح مدارات کی گئی ہے - غرض اس خبط خیال کو دماغ سے نکالنا چاہیے کہ حبشیوں میں غلامی کے سوا اور کوئی لیاقت نہیں ہے - شائستہ قوموں پر فرض ہے کہ ان کو غلامی سے دور کریں اور ان کو شائستہ اور مہذّب بنائیں -

مہذّب قوموں میں غلامی کا دور ہونا : یہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ جب امریکہ کے اصلی باشندوں میں کمزوری کے سبب سے سخت کاموں کے کرنے کی برداشت نہ تھی تو حبشیوں کو ان کی جگہ اہلِ یورپ نے لے جانا شروع کیا اور ان کی تجارت کا بازار گرم کیا - اور جہازوں میں ان حبشی غلاموں کی وہ کھیپیں کی کھیپیں ڈھوئیں کہ بہت سے مقاموں میں غلاموں کی تعداد آزاد آدمیوں سے کہیں زیادہ ہو گئی - انگریزوں میں سب سے اول غلاموں کی تجارت میں سر برآوردہ سر جان ہاکنس تھے جن کا نام غلامی کا غلام ہمیشہ رہے گا - پھر اَور بھی ان کے ساتھی ہوئے اور غلاموں کی تجارت خوب ہونے لگی - یہ تجارت ایسی بے رحمی سے ہوتی تھی کہ جہازوں میں حبشی بھیڑ بکریوں کی طرح بھر دیے جاتے تھے اور رستے میں بہت سے ان میں سے مر جاتے تھے - یہ بڑی تعجب کی بات ہے کہ اہلِ انگلستان نے غلامی کی تجارت کو جائز رکھا جن کا خود ملک ایسا آزاد تھا کہ اس کا باشندہ ہی آزاد نہ تھا بلکہ دوسرے ملک کا غلام اگر وہاں آ جائے تو آزاد ہو جاتا تھا -

ہم پہلے لکھ آئے ہیں، کہ مذہب نے غلامی کی سختی کو گو کچھ کم کیا ہو مگر اس کو دور نہیں کیا - مگر زمانۂ حال کی تہذیب و شائستگی کے جوش نے رحیم اور نیک دل آدمیوں کے دلوں

میں یہ نیکی ڈالی کہ ان کو خیال آیا کہ غلاموں کی تجارت کو موقوف کیجیے - ہم نے تمہید میں لکھا ہے کہ عقل انسان کی بڑی فرماں روا ہے - سارے دلائلِ عقلی نے اب یہ سمجھایا کہ غلاموں کی تجارت کا اور خود غلامی کا موقوف ہونا ہر طرح سے ملکی اور قومی دولت اور بہبودی کے لیے ضرور ہے - غرض عقل نے وہ کام کیا جو مذہب نے نہ کیا - اول کوشش غلاموں کی تجارت کے موقوف کرنے میں ہوئی اور پھر غلامی[1] کے دور کرنے میں - سنہ ۱۷۸۷ع[2] غلاموں کی تجارت کے موقوف ہونے کے واسطے مقرر ہوا - اس میں سب سے زیادہ سر برآوردہ ولیم ولبر فورس صاحب تھے جن کی نیک نامی ہمیشہ یاد رہے گی - ان کی تائید وزیر اعظم پٹ صاحب نے بھی فرمائی - مگر ولیم ولبر فورس صاحب نے جو مسودہ اس تجارت کی[3] موقوف کے باب میں بنایا وہ ۱۷۹۱ع میں کھو گیا - مگر انگلستان کی قسمت میں یہ نیک نامی لکھی ہوئی تھی کہ وہ اس رحم دلی اور فیّاضی اور انسانیت کا کام کرکے دنیا میں ہمیشہ نیک نام رہے اس لیے کوشش برابر اس مُوذی تجارت کے موقوف کرنے میں قائم رہی - بیچ میں اس کی بہت سی صورتیں پیش آئیں - ۱۸۰۸ع میں غلاموں کی تجارت عموماً اور قطعاً موقوف ہوئی مگر بعض پاجی کمینہ طبیعت انگریزوں نے اس تجارت کو نہ چھوڑا اور پرتگیزوں کے جھنڈے کی آڑ میں اس تجارت کو جاری رکھا - ۱۸۱۱ع میں یہ قانون جاری ہوا کہ غلاموں کی تجارت سنگین جرم سمجھا جائے اور اس کی سزا چودہ

۱- اصل : اور پھر غلاموں کے دور کرنے میں -
۲- اصل : ۱۷۸۷ع میں غلاموں کی تجارت کے موقوف ہونے کے واسطے مقرر ہوئی -
۳- اصل : کے موقوفی -

برس کی قید مع جلا وطنی کے یا تین برس سے پانچ برس تک قید مع مشقتِ شاقہ دی جائے - اور ۱۸۲۴ء میں ایک اور قانون پاس ہوا کہ جس میں غلاموں کی تجارتِ بحری ٹھگی قرار پائی ، جس کی سزا حبسِ دوام مع جلاوطنی کے تھی - غرض جب ایسی کوششوں سے غلامی کی تجارت انگریزی عمل داری سے اٹھ گئی تو اس کے بعد فیاض اور خیرخواہِ خلائق انگریزوں کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ جو بالفعل غلام ہیں وہ بھی آزاد کرائے جائیں - غرض اس میں بھی سعی اور کوشش ان کی کامیاب ہوئی اور بیس کروڑ روپیہ مالکوں کو دے کر ان کے غلاموں کو آزاد کرایا - پھر اہلِ انگلستان کی ترغیب سے ساری مہذب قوموں نے بھی آئندہ غلامی کو موقوف اور حال کے غلاموں کو آزاد کیا - پولیٹیکل اکانومی کے اصول کے موافق جو اس آزادی سے قومی دولت کی ترقی ہوتی ہے ، وہ غلامی سے نہیں - یہ عقل کا کام تھا کہ جس نے مذہب سے زیادہ انسان کو ایسا مہذب و شائستہ بنایا کہ وہ غلاموں کے بنانے اور رکھنے کو سخت بد افعالی جاننے لگا - فقط تمت

۶ - اگست ۱۸۹۱ء

خاتمہ

مضامین لکھنے کا طریقہ جو میں نے اختیار کیا

جو مضامین اعلیٰ رتبہ رکھتے ہیں اُن کے لکھنے کے لیے ہزاروں دبیرانِ والا خِرد نے قلم اُٹھایا ہے اور صد ہا صفحوں کو اپنی تحریر سے مرقّع بنایا ہے - ان میں ہزار طور سے طبیعت پر زور ڈالیے ، ذہن کو دوڑائیے ، کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوتی - جتنی ان کے گرد راہیں ہیں ، سب پر رہروانِ کاملِ اِس کثرت سے چلے ہیں کہ وہ ان کے پاؤں کے تلے دب دبا کر مستحکم و استوار ہوگئی ہیں - کوئی اور راہ ؔرو نئی راہ ان کی نہیں نکال سکتا - اس لیے میں نے ان راہوں میں سے ، جو مجھے پسند آئی اپنے چلنے کے لیے مقرر کر لی اور باق سب راہوں کو چھوڑ دیا - جن مضامین کو ایسا عالی اور عمیق میں نے دیکھا کہ جن تک میرے ذہن کی رسائی دشوار تھی ، اُن کو یہ جان کر چھوڑ دیا کہ ان کے اندر قدم رکھنا سر تا پا ڈوبنا تھا ، اس لیے کنارہ کشی اچھی جانی - بہت سے مضامین گو بظاہر خفیف معلوم ہوتے تھے مگر ان کے اندر غور اور خوض کرنے سے ایسا مادہ مل گیا کہ وہ ایک اچھی صورت میں ڈھل گیا - کوئی مضمون ہو ، اُس کے بہت سے رخ اور پہلو ہوتے ہیں - میں نے ان سب کو دیکھا اور کچھ نہ کچھ اس کا بیان کیا - مگر ایک رخ پر بہت توجہ کی - اس کی ظاہری جِلد بھی دیکھی اور پھر جِلد ہٹا کر بھی دیکھا -

ہڈی تک سوئیوں کو چبھو کر آزمایا ، نشتر سے گہرا شگاف لگایا مگر چوڑا نہیں کیا ۔ غرض خوب آزما کر دماغ سے قلم کی نوک پر لایا ۔ مضامین کے وسیع دریا میں میرے انتخاب کی کشتی کا ناخدا میری اپنی رائے تھی ۔ خواہ وہ پُرخطا ہو یا صائب ۔ آزاد ہو یا متعصّب ۔ واللہ اعلم بالصّواب ۔

محمد ذکاء اللہ

٦ - اگست ۱۸۹۱ع

مقام دہلی

مجلس ترقی ادب لاہور